معذرت

پریس کی بعض ناگزیر مجبوریوں کی بنا پر نوائے ادب،
ری ۱۹۶۱ء کا شمارہ کافی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے
، مجبوریوں کے پیش نظر اس کا بھی امکان ہے کہ اگلے
ے کی اشاعت میں بھی کچھ دیر ہوجائے

ہم اپنے سرپرستوں سے معذرت خواہ ہیں اور ساتھ ہی
، یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تاخیر ایک عارضی مجبوری
، اسے ہمارا شعار نہ سمجھا جائے۔

پاکستان کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا
ہ اسٹیٹ بنک آف انڈیا، شاخ کراچی یا ڈھاکہ کے ذریعہ
فرمائیں۔ ممکن ہو تو دو یا تین سال کا چندہ ایک ساتھ
یں تاکہ بار بار زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

ادبی پبلشرز

شمارہ ۱

شذرات

یہاں ایک طرف ہم کو ہماری سیاسی آزادی اور مادی پیداوار کی دولت سے محروم کردیا تھا وہیں انہوں نے ہماری علمی و ذہنی تخلیقات کے خزانہ پر بھی بے دردانہ تاخت و تاراجی شروع کردی تھی. چنانچہ جوں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا انہوں نے اپنے افسروں کو جو ہندوستان میں ان کے نمائندے تھے ہدایت کی کہ وہ نہ صرف یہ کہ یہاں کی مادی دولت کو ان تک پہنچائیں بلکہ ہندوستان میں جو علمی ذخیرے ہیں ان کو بھی حاصل کرکے لندن بھیجیں اور یہ سلسلہ حصول آزادی تک جاری رہا. لندن میں یہ علمی خزانہ انڈیا آفس لائبریری کے نام سے موسوم ہے. اس کے علاوہ اس لائبریری میں وہ دستاویزیں زور نامچے اور دوسرے تاریخی کاغذات ہیں جو ہماری گذشتہ تاریخ کی صحیح دستاویز ہیں. چنانچہ سیاسی آزادی کے بعد ہی ہندوستان کی حکومت نے یہ کوشش شروع کہ انڈیا آفس لائبریری چونکہ خالص ہندوستانی ملکیت ہے اس لئے وہ ہندوستان کو لوٹا دی جائے، ہماری حکومت نے صرف خط و کتابت ہی نہیں کی بلکہ جب مولانا ابو الکلام مرحوم انگلستان گئے تو انہوں نے اس موضوع پر متعلقہ ذمہ دار لوگوں سے گفتگو کی پھر حال ہی میں ہمایوں کبیر صاحب لندن گئے تو انہوں نے پھر اس مسئلہ کو سنجیدہ اور پرزور طریقہ سے اٹھایا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ تقریباً سنہ ۱۹۵۸ء تک صرف ہندوستان اس سلسلہ میں اپنی موثر آواز بلند کررہا تھا لیکن اس کے بعد پاکستان نے بھی اس مطالبہ میں شرکت کی. اس سلسلہ میں بعض اخبارات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ ملکہ معظمہ انگلستان کی آمد کے وقت کتبخانہ کی واپسی کا مژدہ جانفزا ہم کو ملے اگر ایسا ہوا تو یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی اس سلسلے میں بہرحال ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ جو ذخیرہ بھی ہے وہ سارے ہندوستان کا ہے اس لئے اگر کتب خانہ تقسیم ہوا تو ہم کو یہ کوشش کرنا چاہئیے کہ جو کتابیں یا دستاویزیں ہم کو نہیں ملی ہیں ان کی مائیکرو فلم ضرور حاصل کی جائے اور اس طرح کتب خانہ مکمل رہے.

یوں تو ہمارے یہاں اردو ادب پر صحیح کام کرنے والوں کا قحط ہے پھر ایسی خواتین جن کا ذوق بلند، نظر وسیع، فکر صالح ہو اور جو نظر و فکر کے

ساتھ ساتھ کام کرنے کی خدا داد صلاحیت رکھتی ہوں شاید ایک ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہیں، ایسی حالت میں بیگم قدسیہ زیدی کا اچانک انتقال کر جانا ہمارے ادب کی علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے ایک بڑا المیــــہ ہے. بیگم صاحبہ مرحومہ بچوں کے ادب میں ممتاز درجہ کی مالک تھیں. پھر سنسکرت اور دوسری زبانوں کے ڈراموں کے ترجموں نے ان کو اس دنیا میں بھی بلند مقام عطا کیا تھا. اس کے علاوہ انھوں نے ہمارے اسٹیج کی زبوں حالی کے پیش نظر دہلی میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی. وہ مختلف تہذیبی، ادبی، تعلیمی اداروں کے ساتھ وابستہ تھیں. ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسانی دوستی اور عام ہمدردی تھی. ان کی وفات کی وجہ سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ شاید جلد پر نہ ہوسکے. بہر حال ہمارا فرض ہے کہ ہم ان تمام ادبی، علمی و تعلیمی کاموں کو جو انھوں نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے مکمل کرنے کی کوشش کریں. ہم کو اس سانحہ میں کرنل بشیر حسین زیدی اور ان کے خاندان سے دلی ہمدردی ہے

گذشتہ مہینے اور اس مہینہ مختلف ریاستوں میں اردو کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور فروری میں ایک کل ہند اردو اجتماع کانپور میں ہورہا ہے. یقیناً ان اجتماعوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک جگہ ایک علاقہ یا ایک ریاست کے حالات سے واقف ہوجاتا ہے لیکن یہ کانفرنسیں عام طور سے اپنے پیچھے کوئی دیرپا تعمیری اثر و جذبہ نہیں چھوڑتیں.

ہمارا خیال ہے کہ ایسی کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اس میں شریک ہونے اور عملی حصہ لینے والوں کو اپنے یہاں کے بعض مسئلوں سے متعلق ایک یادداشت مرتب کرلینی چاہئے. اور پھر ہر شریک بزم اپنے اپنے علاقہ کے حالات کی روشنی میں اپنے تعمیری خیالات پیش کرے. ہمارا خیال ہے کہ ان کانفرنسوں کا اس زمانہ میں انعقاد بڑی حد تک مردم شماری سے بھی متعلق ہے آج سے دس سال پہلے جو مردم شماری ہوئی تھی، اس سے متعلق یہ عام شکایت تھی کہ مردم شماری کرنے والوں نے اردو کے ساتھ انصــاف نہیں کیا اور یہی وجــہ ہے کہ اردو کے بڑے بڑے مرکزوں تک میں اردو بولنے والوں کی تعداد کاغذ پر بہت تھوڑی نظر آتی ہے. اب فروری میں مردم شماری ہورہی ہے اور اردو والوں کو موقعہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کریں کہ لوگ اپنی جو مادری زبان بتائیں وہی فارم میں بھی درج

کی جائے. خدا کرے کہ یہ کانفرنسیں اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوں. اس مرتبہ پھر کوئی شکایت نہ ہو اور ہم صحیح طور سے اردو بولنے والوں کی تعداد کا تعین کرسکیں.

ایک طرف ہمارے یہاں اردو دوستی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے اچھے ادب کا مطالعہ ہوتا ہے، بلند معیار ادبی و علمی رسائل کی مانگ ہوتی ہے. لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ایک طرف سے دوسری طرف تک خاموشی چھا جاتی ہے ہم اردو مدارس و مکاتب کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن ہم نے کتنے مدارس و مکاتب اس بارہ سال کے اندر قائم کئے. کیا ہم نے دار المصنفین، ندوۃ المصنفین، انجمن ترقی اردو جیسے مرکزی اداروں کی مطبوعات کو بڑے پیمانے پر خرید کر ان کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کی. اور پھر کیا ہم نے اچھے علمی رسائل کی خریداری قبول کرکے ان کو قبل از وقت کی موت سے بچایا ہمارے ملک میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی کمی نہیں لیکن اگر ایک طرف ایک ادارہ کی مدد اور دوسری طرف ایک فرد واحد کا وفادارانہ عزم شریک نہ ہوتا تو معارف و نگار ہماری بے توجہی کے شکار ہوچکے ہوتے اس لئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک رسالہ نے پچیس سال کی عمر طے کرلی ہے تو ہم کو بہت خوشی ہوتی ہے کچھ دنوں پہلے اسی بمبئی کے ایک رسالہ صبح امید نے اپنی سلور جبلی منائی تھی اور اب اسی شہر سے شائع ہونے والے دوسرے رسالہ شاعر کی اشاعت و ادبی خدمت کا سی سالہ جشن منایا جانے والا ہے. اس سلسلہ میں رسائل کی نمایش، ہند و پاک مشاعرہ اور مقالات جوابی کا بھی پروگرام ہے. اردو ادب و زبان کی خدمت کا اعتراف کام کرنے والوں کی ہمت بڑھاتا ہے. ہم کو امید ہے کہ یہ جشن ہر صورت سے کامیاب ہوگا.

اس سلسلہ میں شاید یہ تذکرہ مسرت بخش ہوگا کہ اس طرف بعض اچھے رسالے نکلنا شروع ہوئے ہیں. ان میں صبا کے علاوہ حیدر آباد کا مجلس پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کا رسالہ اردو نامہ قابل ذکر ہیں. پھر جامعہ جو عرصہ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ترجمان کی حیثیت سے علمی، تعلیمی، ادبی خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگیا تھا چہل سالہ جشن کے ساتھ ہی ساتھ پھر سے نکلنا شروع ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اپنی گذشتہ اعلیٰ روایات کو باقی رکھتے ہوئے مستقل طور سے علم و ادب کی خدمات انجام دیتا رہے گا.

ہم کو یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے رفیق کار جناب عبدالرزاق قریشی کی مرتبہ کتاب مظہر جان جاناں اور ان کا کلام چھپ گئی ہے اور فروری کے آخر تک فروخت کے لئے بازار میں آجائے گی.

نجیب اشرف ندوی٭

مراثی جوّاد

آج سے چند سال پہلے بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں چند قلمی کتابیں فروخت کے لئے آئی تھیں، انہیں میں جواد کے بارہ مرثیوں کا یہ مجموعہ بھی تھا نسخہ بہت خوش خط اور مذہب ہے۔ پہلے صفحہ پر گیارہ جنوری ۱۸۰۹ اور

Rev F Lazious
In 64 th Regiment
Cawnpore
5 Oct 1857

انگریزی میں لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ غدر کے زمانہ میں پادری صاحب کو ملا۔ مرثیوں سے پہلے مرثیوں کی فہرست ہے اس فہرست کے اوپر لکھا ہے:

فہرست مرثیہ تصنیف خانہ زاد آغا مرزا تخلص جواد سال ۱۲۴۲ ہجری

ہر مرثیہ کے خاتمہ پر آغا میر کے لئے دعا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جواد نے یہ مرثیے آغا میر کے لئے لکھے تھے اور اس وقت لکھے تھے جب معتمدالدولہ وزیر تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے دربار سے وابستہ رہے ہوں۔

معتمدالدولہ آغا میر سنہ ۴۲ ـ ۱۲۳۵ھ، تک نواب اودھ غازی‌الدین حیدر کے وزیر تھے۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں معزول ہوکر کانپور چلے آئے اور یہیں ۵ ذی‌الحجہ سنہ ۱۲۴۷ھ کو انتقال کیا۔

ہم ذیل میں مکمل فہرست دینے کے بعد ہر مرثیہ کے تین بند نقل کرتے ہیں پہلا بند ابتدائی ہے اور آخری دو بندوں میں سے پہلے میں شاعر کا تخلص ہے اور دوسرے یا آخری بند میں آغا میر کے لئے دعا۔

یہ مرثیے معتمدالدولہ کی وزارت کے آخری سال کہے گئے اور آغا میر کے ساتھ کانپور اور کانپور سے برسوں کا چکر کاٹتے ہوئے بمبئی آئے یہاں بھی ان کو پناہ نہیں ملی اور نہ معلوم اب کہاں ہیں۔

٭ نجیب اشرف ندوی، ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، دادا بھائی نوروجی روڈ، فورٹ، بمبئی

فہرست مرثیہ ہائے تصنیف خانہ زاد آغا مرزا تخلص جواد سال سنہ ١٢٤٢ ہجری

این مرثیہ در احوال	زندان میں عجب حال سکینہ تھا الم سے	جناب سکینہ علیہا السلام
این مرثیہ در احوال	جب چھد گیا اصغر کا گلا تیر ستم سے	شہادت جناب علی اصغر
این مرثیہ در احوال	جب بھانجے ٹکڑے ہوئے سلطان زمن کے	شہادت پسران زینب
این مرثیہ در احوال	نیزہ چھاتی پہ جو ہمشکل نبی نے کھایا	شہادت جناب علی اکبر
این مرثیہ در احوال	پیاس کے مارے سکینہ کا عجب عالم تھا	شہادت جناب عباس
این مرثیہ در احوال	مدینے میں جو حالی فاطمہ کا نامہ بر آیا	جناب فاطمہ صغرا
این مرثیہ در احوال	رخصت ہوا جو قاسم نوشاہ شاہ سے	شہادت جناب قاسم
این مرثیہ در احوال	تنہا جو رن میں حضرت شبیر ہوگئے	شہادت جناب امام حسین
این مرثیہ در احوال	دیکھا زینب نے کہ شبیر پہ غم طاری ہے	شہادت پسران زینب
این مرثیہ در احوال	گھر میں حارث کے جو آئے پسران مسلم	شہادت پسران علیہ
این مرثیہ در احوال	جب رضا شاہ سے لینے علی اکبر آیا	شہادت جناب علی اکبر
این مرثیہ در احوال	عزیز و جب رہا تنہا خلف ساقی کوثر کا	شہادت جناب امام حسین

یا فتاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[۱]

۱ زنداں میں عجب حال سکینہ تھا الم سے
تھم رہتے تھے آنسو نہ کبھی دیدۂ غم سے
کھاتی تھی نہ پیتی تھی وہ شبیر کے غم سے
فارغ تھی نہ ایک آن غم شاہ امم سے
اندوہ سے فرقت کے یہ حال اوسکے تھا جی کا
ہر بات پہ تھا نام حسین ابن علی کا

۵۷ سجاد ہوے کہکے یہ پھر راہیِ زندان
اور واں پہ یہ ماتم تھا کہ حس کا نہیں پایاں
طاقت نہیں کہنے کی جواد اب کے عنواں
کر عرض یہی روکے کہ اے شاہِ شہیداں!
کونین کی تو ذات تیری عقد کشا ہے
مقبول کر اوس کو بھی جو کچھ میری دعا ہے

۵۸ اے سبط نبی تم سے دعا ہے یہ بہ منت
تا حشر رہے معتمد الدولہ سلامت
آفاق کی ہے دم سے اسی شخص کی زینت
ہے روز بروز اسکی فزوں دولت و حشمت
ایسے کی صفت لکھی نہیں جاتی قلم سے
بے فکر جہاں کو ہے کیا اپنے کرم سے

[۲]

۱ جب چھد گیا اصغر کا گلا تیر ستم سے
اور باز وہ معصوم رہا آمد دم سے
صدمہ کوئی پوچھے وہ دل شاہ امم سے
سوراخ ہوا انکا جگر تیرِ الم سے
سینے سے بپا آہ تھی اور اشک رواں تھے
ایک حالت سکتے میں امام دو جہاں تھے

۴۹ پھر رن کو روانہ ہوئے وہ سبط پیمبر
جو جو کہ کہا ماہو نے تھا سب کیا جاکر
اب آکے رولاتا ہے مجھے بھی غم اصغر
بہتر ہے جواد اپنا قلم روک یہیں پر
رو رو کے مانگ لے یہ شاہ امم سے
محفوظ مجھے رکھنا زمانے کے الم سے

۵۰ یا شیر خدا تمسے دعا ہے یہی ہر دم
ہے معتمدالدولہ جو راحت دہِ عالم
اقبال کبھی اس کا نہ ہو حشر تلک کم
تم شیر الٰہی ہو تمہارا ہے یہ ضیغم
ارماں بر آویں سدا اس شخص کے جی کے
پوتے کی مدد لیجئیو صدقے سے نبی کے

[۳]

۱ جب بھانجے ٹکڑے ہوئے سلطان زمن کے
زخمی ہوئے بیٹے شہِ بیکس کی بہن کے
ہر چند کہ تلواروں سے ٹکڑے تھے بدن کے
پر تھا یہ سخن لب پہ ہر ایک غنچہ دہن کے
ہم دونوں ادا ہو گئے گو ماموں کے حق سے
پر کیا ہی قلق ہے ہمیں اماں کے قلق سے

۴۷ یہ کہکے گئے گنج شہیدان میں سرور
رکھ لاشے دئے اور شہیدوں کے برابر
کر چاک گریباں کو پھر پیٹ لیا سر
آگے نہ جواد حگر افگار رقم کر
بس طاقت تحریر بھلا تجھ میں کہاں ہے
اب قاسم نوشہ کی شہادت کا بیاں ہے

۴۸ دن رات دعا ہے یہ میری شاہ امم سے
با جاہ و حشم معتمد الدولہ کو رکھے
بے شبہ کہ ثانی نہیں دنیا میں ہے اسکے
سچ بھی ہے کہ کیونکر نہ یہ اس رتبے کو پہنچے
اولاد رضا کی ہے یہ پوتہ ہے علی کا
سر پر رہے بس اسکے سدا سایہ نبی کا

[۴]

۱ نیزہ چھاتی پہ جو ہمشکل نبی نے کھایا
وہ حقیقت میں حسین ابن علی نے کھایا
رنج و غم جیسا کہ حیدر کے وصی نے کھایا
مرگ فرزند سے ایسا نہ کسی نے کھایا
نور عین ایسا جو ٹکڑے ہوا دور آنکھوں سے
اس قدر روئے کہ زائل ہوا نور آنکھوں سے

۵۷ آنکھیں پھر کرنے لگا درہم و برہم اکبر
کہا بانو نے یہ کیا کرتے ہو صدقے مادر
چھوڑے جاتے ہو اکیلا مجھے تم اے دلبر
اب سنے کون کہ وہ خلد میں پہنچا جاکر
اے جواد آگے تو غم بانو کا تحریر نہ کر
خوب رقت ہوئی، اس دردکی تقریر نہ کر

۵۵ ہاں مگر خالق اکبر سے تو یہ مانگ دعا
رہے یہ معتمدالدولہ یہ اقبال سدا
دن بدن اس میرے آقا کا فزوں ہو رتبا
آج تک ایسا زمانے میں نہیں ہے نہ ہوا
فرق پر اس کے سدا سایۂ غفار رہے
حشر تک شیر خدا اس کا مدد گار رہے

[۵]

۱ پیاس کے مارے سکینہ کا عجب عالم تھا
منہ میں تھے کانٹے پڑے ہونٹوں پہ پہنچا دم تھا
شدت غم سے بہت بچی کو وقفہ کم تھا
چشم سے بہتا تھا خون حسم کا کرتا نم تھا
مانگتی جس سے تھی وہ شاہ کی جانی پانی
ہوتے تھے اہل حرم شرم سے پانی پانی

۵۴ آگے اس درد و الم کا نہیں ہو سکتا بیاں
سر پہ خاک اپنے اڑاتے تھے کھڑے شاہ زماں
اے حواد آگے نہیں کہنے کی بس تاب و تواں
کر دعا اٹھ پھر یہ بجناب یزداں
ہو نہ تازیست کسی غم سے سروکار مجھے
رکھیے گا فکر معیشت سے سبکسار مجھے

۵۵ آرزو سبط محمد سے یہی ہے ہر دم
ہے جو یہ معتمدالدولہ وزیر اعظم
اس کا حامی رہے ہر امر میں سلطان امم
کم نہ ہو حشر تلک اس کا ذرا جاہ و حشم
بلکہ ہر روز ترقی ہی پہ اقبال رہے
اس کا دشمن ستم چرخ سے پامال رہے

[۶]

۱ مدینہ میں جو خالی فاطمہ کا نامہ بر آیا
مزار احمد مختار پر با چشم تر آیا
ہوا سبط نبی ٹکڑے یہی لیکر خبر آیا
پریشاں حال آیا پیٹتا اور نوحہ گر آیا
کبھی صدقے رسول اللہ کے روضہ کے ہوتا تھا
کبھی قبر محمد سے لپٹ کے خوب روتا تھا

۵۳ اب آگے فاطمہ صغرا کی رقت کہہ نہیں سکتا
غم و اندوہ کی ساری حقیقت کہہ نہیں سکتا
پڑی جو کچھ کہ صغراء پر مصیبت کہہ نہیں سکتا
بیٹی تھی باپ کی چہیتی جو حالت کہہ نہیں سکتا
جواد اب غیر حالت ہے تری بھی غم کی شدت سے
شرف اندوز ہوں جلدی کہیں شہ کی زیارت سے

۵۴ دعا شبیر سے دن رات میری ہے یہ واللہ
رہے روز قیامت تک یہ ضیغم جنگ جو ذی جاہ
وہ ہو برباد جلدی جو کہ اس آقا سے ہو گمراہ
جو مطلب اسکے دل میں ہو سو بر آئے وہ خاطر خواہ
تمنا ہے کہ رتبہ اس کا دن بدن فراواں ہو
ستارہ دولت و حشمت کا جوں خورشید تاباں ہو

[۷]

۱ رخصت ہوا جو قاسم نوشاہ شاہ سے
سر دینے اپنا جانے لگا رن کو چاہ سے
جاری لہو تھا چشم شہِ دیں پناہ سے
تکتی تھی بنری دولہ کو نیچی نگاہ سے
ہر گام پر بنے کے وہ بیتاب ہوتی تھی
گھونگھٹ میں چپکے چپکے غرض خوب روتی تھی

۵۹ اس دل جلی سے کہنے لگے اتنے میں حسین
اے بھابھی خیر اچھا کیا جو کئے نہ بین
لے جاؤں لاؤ رن کو تمہارا یہ نور عین
پھر لاشہ رن کو لے گئے سرور بہ شور وشین
بس اے جواد کہنے کی طاقت نہیں مجھے
اب آگے لکھنے دیتی ہے رقت نہیں مجھے

٦۰ ہاں مانگ لے دعا یہ کہ اے سبط مصطفیٰ
دی جاہ رکھیا معتمد الدولــــہ کو سدا
ایسا سخی کوئی نہیں آج تک ہوا
مطلب بر آئے جس سے کہ سارے جہاں کا
سو وہ یہی ہے اس کا نگہباں ہو جیو
حامی ہر ایک امر میں ہر آں ہو جیو

[۸]

۱ تنہا جو رن میں حضرت شبیر ہوگئے
بے یار و آشنا شہ دلگیر ہوگئے
انصار ان کے سب تہ شمشیر ہوگئے
حرم یہ حال دیکھ کے بے پیر ہوگئے
غم ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا امام کو
دم لینا تھا محال شــــہ تشنہ کام کو

۷۰ گھوڑوں سے روندہ ظالموں نے لاشۂ امام
اب آگے میرے دل کو نہیں طاقت کلام
رقت سے حال غیر ہے اب لے قلم کو تھام
رو رو کے مانگ لے یہ دعا شہ سے یا امام!
مداح کرکے اپنا، طبیعت تو شاد کی
اب آرزو بھی جلد بر آوے جواد کی

۵۷ وہ آرزو یہی ہے مری اے شہ امم
دائم رہے یہ معتمد الدولہ با حشم
چشم فلک نے دیکھا ہے ایسا تو سخی کم
تیری نگاہ لطف رہے اس پہ دم بدم
آقا کو میرے تیری حمایت رہے سدا
اولاد و آل اس کی سلامت رہے سدا

[۹]

۱ دیکھا زینب نے کہ شبیر پہ غم طاری ہے
رفقا مرتے ہیں آنکھوں سے لہو جاری ہے
ہجر احباب سے فریاد ہے اور زاری ہے
بولی یہ دن میرے بھائی پہ بہت بھاری ہے
طور ماجائی کا بے طور نظر آتا ہے
آج سب خاتمہ بالخیر ہوا جاتا ہے

۵۹ روک خامہ کو اسی جا پہ جواد مضطر
طول یوں کرنا سخن کا نہیں ہرگز بہتر
یہ دعا مانگ لے اب ہاتھوں کو تو پھیلا کر
اے شہ ہر دوسرا شافع روز محشر
اپنے مداح پہ للہ یہ احساں کرو
مشکلیں میری جو ہیں جلد وہ آسان کرو

۶۰ اور تمنائے دلی ہے یہی ہردم یا شاہ
حشر تک معتمد الدولہ کو رکھیو ذیجاہ
رہے ہر لحظہ و ہردم اسے بس تیری پناہ
ستم چرخ سے پامال ہو اس کا بدخواہ
مرتبہ روز بروز اس کا دو چنداں ہووے
دولت و حشمت و اقبال فراواں ہووے

[۱۰]

۱ گھر میں حارث کے جو آئے پسرانِ مسلم
دونوں تھے لخت دل، راحت جان مسلم
سر سے لے تا قدم ان میں تھی شانِ مسلم
خوب رونے لگے وہ نام و نشان مسلم
ایک تو باپ کے چھٹ جانے کا غم کھاتے تھے
دو سرے اپنی وہ تنہائی سے گھبراتے تھے

۴۵ پہنچا سر لے کے وہ پھر حاکم کوفہ کے قریں
شام کو اس نے روانہ کئے سر دونو وہیں
آگے بیتاب ہے سینہ میں مری جان حزیں
بس جواد اب تو مجھے طاقت تحریر نہیں
کر دعا حق سے کہ ہووے میرا مطلب حاصل
جو جو دل میں ہیں تمنائیں وہ ہوں سب حاصل

۴۶ سب سے یہ میری تمنا ہے بڑی یا شبیر
حشر تک معتمد الدولہ رہے با توقیر
ذات اس کی ہے حسنِ خلق کی خاطر اکسیر
بخدا فیض ہے اس شخص کا اب عالمگیر
دولت و حشمت و اقبال رہے حشر تلک
میرا یہ آقا جواں سال رہے حشر تلک

[۱۱]

۱ جب رضا شاہ سے لینے علی اکبر آیا
اشک خوں دیدۂ شبیر میں تب بھر آیا
شہ نے فرمایا تو کیوں اے مرے دلبر آیا
چھوڑ کر مانو کو کیوں خیمے سے باہر آیا
بولا اکبر مجھے اب آپ پہ قربان کرو
بابا صاحب علی اکبر پہ یہ احسان کرو

۳ جس گھڑی ہوگیا ہمشکل پیمبر بے دم
شکر اللہ لگے کرنے امام پر غم
گرد اس لاش کے کرتے تھے ملائک ماتم
کوئی باقی نہ تھا جسکی نہ ہو چشم پر نم

اے جواد اب شہ بیکس کی شہادت ہوگی
بس خموش آگے بیاں وہ نہ مصیبت ہوگی

۴۰ حق سے دن رات یہی رہتا ہے بس اپنا سوال
حشر تک معتمد الدولہ رہے با اقبال
اس کا دشمن ستمِ چرخ سے ہووے پامال
نیرِ روح چمکتا ہی رہے سال بسال

دولت و حشمت و اقبال زیادہ ہوئے
جلد حاصل ہو جو کچھ اسکا ارادہ ہوئے

[۱۲]

۱ عزیزو جب رہا تنہا حلف ساقئی کوثر کا
رفیق اور دلربا ہر اک اس کا خلد کو پہنچا
یہ تنہائی کا عالم بھائی کی زینب نے جب دیکھا
بہت روئی سر اپنا پیٹ کے وہ غم زدہ دکھیا

دعا مانگی کہ ہے جینے سے زیست تنگ اے خالق
میرے بھائی سے اب موقوف ہوئے جنگ اے خالق

۵۱ چھڑایانوک پر نیزے کے سر جس وقت حضرت کا
زمانہ میں نشاں ظاہر ہوا اس دم قیامت کا
فلک نے خون برسایا ہوا سامان آفت کا
ہوا اب تک نہیں کوئی اور ویسا دن مصیبت کا

جواد اب کیا کہوں طاقت نہیں تحریر کی مجھکو
میسر ہو زیارت روضۂ شبیر کی مجھکو

۵۵ یہ سب کچھ اپنے تصدقے سے کیا ہے آپ نے حضرت
کھاتا ہے وزیر اعظم اب یہ آپ کی دولت
تمہارے صدقے تا محشر رہے اب یہ اس کی صورت
تمنا ہے شتابی سے پذیرا ہو میری منت

میں ہوں مداح حضرت کا بر آوے آرزو میری
یقیں ہے جو کرےگا یہ دعا مقبول تو میری

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ٭

اردو کا پہلا ڈراما نویس

ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ

مہاراشٹر جہاں سیاسی، سماجی اور تعلیمی حیثیت سے ایک اہم مقام کا مالک ہے وہیں ہندستان کی ادبی دنیا میں وہ خاص امتیاز رکھتا ہے . مرہٹی زبان کا ادب بڑا وسیع اور بڑا قدیم ہے علوم و فنون کا شاید ہی کوئی شعبہ ہو جس سے متعلق اہم تصانیف ان کے یہاں نہ ہوں. ایک بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس زبان میں انسائکلوپیڈیا ہی موجود نہیں ہے بلکہ قاموس مشاہیر کے بھی مختلف سلسلہ ہیں تاہم ان مشاہیر میں بھی بعض بزرگوں کا جنہوں نے ادب وفن کی ترقی میں کافی حصہ لیا ہے مفصل و مکمل طور سے نہیں کیا گیا ہے ابھی میں ہمارے آج کے موضوع ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ ہیں حالانکہ وہ اپنی لامحدود ذہنی اورفکری صلاحتوں اور علمی و ادبی مشغلوں کے



ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ

باعث اس منزل پر فائز تھے جہاں بہت کم ہندوستانی پہنچ سکے ہیں ڈاکٹر لاڈ کی صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے مفکر، مورخ اور ڈاکٹر اہم امور میں ان سے مشورہ کرتے تھے . حکومتِ ہند کے بعض شعبے اور خود گورنر اپنی مجالس میں مشورت میں ان کو شریک کرتے

٭ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، پالکا میشن ، بھنڈی بازار ، بمبئی نمبر ۳

ان کو اپنے ہمراہ تاریخی مقامات پر لے جاتے اور ان کی وسیع معلومات سے استفادہ کرتے تھے لیکن افسوس کہ ایسی اہم ہستی کے متعلق ان کے اہل وطن نے کچھ نہیں لکھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر لاڈ کی سوانح ابھی تک مرتب نہیں ہوسکی۔

ڈاکٹر لاڈ کو بمبئی تھیٹر سے کافی دلچسپی تھی اور کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر وہ بمبئی امیچورس اور غیرملکی تھیٹریکل کمپنیوں کے ڈرامے اور اوپراز دیکھنے کے لئے ضرور جاتے تھے اور ممکن ہے کہ اسی سلسلہ میں ان کی ملاقات جگناتھ شنکر سیٹھ سے ہوگئی ہو یہ تعلقات اسقدر بڑھ گئے تھے کہ ایک جان دو قالب کی طرح وہ ملکی و ملی خدمات دوش بدوش انجام دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔

سنہ ۱۸۴۰ء میں اگرچہ جگناتھ شنکر سیٹھ [1] کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی لیکن وہ بھاؤ دا جی لاڈ کی خداداد صلاحیتوں کے معترف تھے اور ہمیشہ ان کی سرپرستی فرماتے رہتے تھے۔ ۷ مارچ کو جب انہوں نے گورنر بمبئی اور ان کی لیڈی کو اپنے مرزعی مکان واقع تاردیو میں مدعو کیا تو لاڈ سے بھی ان کا تعارف کرایا جگناتھ شنکر سیٹھ نے اس دعوت پر بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا سر جیمس اور لیڈی کارنک [2] کے علاوہ ان کی صاحبزادیاں۔ لارڈ کینز [3] جنرل ڈیل ماوتھ [4] کمانڈنٹ آف دی گیری زن بریگیڈ ویلینٹ [5] کرنل ڈائی سین سن [6] کرنل وڈ [7] سرجان آڈرے [8] سر ہیری ری مر [9] اور دیگر اعلیٰ سول اور ملٹری عہدہ دار شریک تھے۔

بھاؤ داجی لاڈ سنہ ۱۸۲۲ء میں گوا کے ایک گاؤں مجرے [10] میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ وتھل ایک غریب محنتی مزدور تھا اور بت سازی سے اپنی روزی کماتا تھا۔ بھاؤداجی لاڈ کا اصل نام «رام کرشن» تھا لیکن وتھل پیار سے اسے بھاؤ

۱۔ نوای ادب بمبئی۔ جنوری سنہ ۱۹۶۰ ع اردو تھیٹر کا معمار۔ جگناتھ شنکر سیٹھ از ڈاکٹر نامی

2. Sir James and Lady Carnac,
3. Lord Keans,
4. General Dalmoth,
5. Brigadier Valiant,
6. Col. Diceinson,
7. Col. Wood,
8. Sir John Awdry,
9. Sir Henry Remer,
10. Manjare (Mandrem, Goa)

(بڑا بھائی) کہتا تھا. رام کرشن اپنے باپ کو «داجی» سے مخاطب کرتا تھا. اس طرح اس کا نام «بھاؤ دا جی» پڑ گیا جو اسقدر مشہور ہوا کہ اصل نام پر غالب آگیا.

رام کرشن کے ساتھ اُس کے باپ کی بھی قسمت نے یاوری کی. وہ سنہ ۱۸۳۲ء میں اپنے بال بچوں کو لے کر بمبئی آیا. بھاؤ کی عمر اس وقت لگ بھگ دس سال کی ہوگی لیکن وہ اپنے باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا. اسوقت ارل آف کلیر[1] بمبئی کا گورنر تھا اور شطرنج کا بیحد شائق تھا، رام کرشن بھی شطرنج کا اچھا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا اس لئے فطری طور پر وٹھل کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کے بیٹے کی رسائی گورنمنٹ ہاؤس تک ہوجائے. اس کی دعا قبول ہوئی اور بھاؤ داجی نے گورنر کو شطرنج میں مات دی اور استادی کے گُر بھی سکھلائے.

ارل ایک شریف انسان تھا وہ چاہتا تھا کہ بھاؤ کو اچھی تعلیم ملے اس لئے ایک دن اس نے وٹھل کو بلا کر ہدایت کی کہ اس کو اچھی تعلیم دی جائے. حبیب خاص سے بھی ایک معقول رقم دی[2]. بھاؤ داجی بحکم گورنر مرہٹی سنٹرل اسکول میں داخل کردیا گیا. یہ بھاؤ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ابتدا ہی میں نارائن شاستری جیسا رفیق شفیق استاد مل گیا جو اس کو دل لگا کر پڑھاتا اور اس کے گھر بھی جاتا تھا. بھاؤ بھی اپنے استاد کا بہت ادب کرتا تھا. جب گووند نارائن مڈگاونکر نے، جو ایک سوشیل ریفارمر تھے ایک بڑے اسکول کا افتتاح کیا تو بھاؤ جی بھی اس میں شریک ہوگیا. اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک اور سوشیل ریفارمر بال شاستری جم بھیکر سے ہوگئی جو آخر وقت تک اس کا سچا محب اور سرپرست رہا.

بھاؤ داجی لاڈ نے مرہٹی تعلیم کے اختتام پر اپنی توجہ انگریزی کی طرف مبذول کی اور «بمبے نیٹیو ایجوکیشن سوسائٹی» کے اسکول میں داخلہ لے لیا. لارڈ ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن اس انسٹی ٹیوشن کے سرپرست تھے اور ایک انگریز پروفیسر ولایت سے اپنے ہمراہ لائے تھے جو انگریزی کے علاوہ دوسرے مضامین بھی پڑھاتا تھا. بھاؤ نے اسی انسٹی ٹیوشن میں اپنی تعلیم پوری کی. سنہ ۱۸۵۴ء

1. Earl of Clare.
2. Dr. Bhau Daji Laud. G. G. M. C. Shrinivas Narain Karnataki, Bombay 1931 (Marathi).

میں جب کامیاب طلبہ کے نام ٹائمس میں شائع ہوئے تو اس کا نام سر فہرست تھا.

بھاؤ داجی لاڈ بیحد ذہین اور محنتی شخص تھا. اس کو ارتھمیٹک اور کمسٹری سے خاص شغف تھا وہ ان مضامین میں شروع سے آخر تک اسکالرشپ پاتا رہا تھا. اختتام تعلیم پر اس کو الفنسٹن اسٹی ٹیوٹ ہی میں پروفیسری مل گئی اور وہ کمسٹری اور فلاسفی پڑھانے لگا.

اس وقت اس کے باپ کا شمار اچھے سنگ تراشوں میں تھا [1] اور چونکہ ملازمت کے سلسلہ میں وہ ایلی فنٹا میں مقیم تھا اس لئے بھاؤ کو سال میں ایک بار اپنے باپ سے ملنے کے لئے وہاں جانا پڑتا تھا، اس آمد و رفت کے باعث اس کو سنگ تراشی سے دلچسپی ہوگئی. اس موضوع پر جس قدر کتابیں اس کو ملیں وہ سب اس نے پڑھ ڈالیں اور بڑے اطمینان سے اس موضوع پر بھی تقریریں کرنے لگا.

جسٹس سر ارسکن پیری جب ایلی فنٹا دیکھنے کے لئے گئے تو بھاؤ داجی لاڈ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے. اس طرح اس کا نام بھی جسٹس کے ساتھ سرکاری اعلانات اور اخبارات میں آنے لگا. سنہ ۱۸۶۹ ء میں جب ڈیوک آف اڈنبرا ہندستان آئے تو حکومت ہند نے اسی کو ایلی فنٹا دکھلانے کے لئے مقرر کیا. نواب سالار جنگ نے جب لارڈ نارتھ بروک کو اجنٹا دیکھنے کی دعوت دی تو اُسی کو گائیڈ مقرر کیا گیا.

ریورنڈ ڈاکٹر ولسن جو اپنے وقت کے ایک متبحر عالم تھے اور علمی مباحث سے خاص شغف رکھتے تھے اور ٹاؤن ہال میں لکچروں اور جلسوں کا انتظام کرتے تھے بھاؤ داجی لاڈ کی خداداد صلاحیتوں اور قابلیت کے معترف تھے اور سنسکرت لٹریچر پر اپنے یہاں تقریریں کراتے تھے.

سنہ ۱۸۴۷ ء میں جب انجینرنگ کالج طلبہ کی قلت کا شکار ہوگیا اور لا کلاسیں [2] بھی یکے بعد دیگرے بند ہوگئیں اور یہ خطرہ لاحق ہوا کہ میڈیکل کالج بھی اسی عدم توجہی کا شکار نہ ہوجائے تو جگناتھ شنکر سیٹھ نے بھاؤ داجی لاڈ کا نام بھی طلبہ کی فہرست میں شامل کرادیا.

---

1. Bombay and Western India, James Douglas, Vol II plage 198, London, 1893.
2. Law Classes.

سنہ ۱۸۳۵ء میں سر رابرٹ گرانٹ نے میڈیکل کلاسوں کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن سنہ ۱۸۳۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے دوستوں نے ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے «گرانٹ میڈیکل کالج» اس کا نام رکھا۔ اس وقت سال اول میں صرف بارہ طالب علم تھے۔ بھاؤ نے وہاں بھی اپنی ذہانت و ذکاوت کا ثبوت دیا۔ سرکاری رپورٹ میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے[1]۔»

«... بھاؤ داجی کی حیثیت ایک مری طالب علم ہی کی نہ تھی۔ وہ دفتر میں ملازمت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اپنی تعلیم اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اس نے وارش اسکالرشپ کے امتحان میں بھی شرکت کی۔ پاس کیا اور اسکالرشپ کی رقم غریب طلبہ میں تقسیم کردی»۔

سنہ ۱۸۵۱ء میں بھاؤ داجی کا نصاب ختم ہوگیا۔ سر ارسکن پیری چیف جسٹس نے آٹھ طلبہ جن میں تین ہندو، تین عیسائی اور دو پارسی تھے ۱۵ اپریل کو جی۔ جی۔ ایم۔ سی۔ کی اسناد عطا فرمائیں۔ کامیاب طلبہ میں سے تین کو اسسٹنٹ سرجن اور بھاؤ داجی لاڈ کو اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ نے یہ دیکھ کر مرہٹوں کو ان کی مادری زبان میں کتابیں نہ ہونے سے بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کئی طبی کتابیں انگریزی سے مرہٹی میں ترجمہ کیں۔

ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ نے کچھ عرصہ بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا ذاتی دواخانہ قائم کیا ڈاکٹر ولسن کا خیال ہے کہ ڈاکٹر لاڈ کا مقصد اس اقدام سے طبی تحقیقات جاری رکھنا اور غریبوں کی امداد کرنا تھا۔

ڈاکٹر لاڈ کی کامیاب زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے[2] لانسٹ لکھتا ہے «ڈاکٹر موصوف نے جو کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں ان کی مثال ہماری میڈیکل تاریخ کے اولین دس سال میں نہیں ملتی۔ ایک کامیاب سرجن کی حیثیت سے ڈاکٹر لاڈ نے ایک اہم مقام حاصل کرلیا تھا اور بعض بہت ہی اہم آپریشن کئے تھے[3]

ہندوستانیوں کے علاوہ یورپین حضرات، راجے، مہاراجے، نواب اور رئیس بھی ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کی خدا داد صلاحیتوں سے استفادہ کرتے تھے ڈاکٹر

1 Medical College Report, 1846-47.
2 Lancet, London, January 1855
3 Lithotomy, Cataract, Removal of Tumours and Midwifery.

موصوف سر نسروانجی چوکسی، آر. سی. منڈلک اور درجنوں صاحب ثروت خاندانوں کے فیملی ڈاکٹر تھے. ان کی فیس بھی یورپین ڈاکٹروں کی طرح دس روپیہ فی وزٹ تھی لیکن سرسوت برہمنوں سے کچھ نہ لیتے تھے. غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے دوائیاں، پھل اور خوراک بھی اپنے پاس سے دیتے تھے. طلبہ سے خاص رعایت کرتے تھے. اسکالرشپ کے علاوہ ان کو دوائیاں، کتابیں اور ضروری چیزیں بھی دیتے تھے. سر جیجی بھائی بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے. وہ لکھتے ہیں. «ڈاکٹر لاڈ غریبوں کا مفت علاج کرتا. اپنے پاس سے دوائیاں دیتا اور مستحقین کی دل کھول کر امداد کرتا تھا».

سر فیروز شاہ مہتا کا سوانح نگار رقمطراز ہے کہ جب وہ سات برس کا تھا تو بخار میں لاپرواہی کے باعث ایک سخت مرض کا شکار ہوگیا اور کئی روز تک بیہوش پڑا رہا. ڈاکٹر بھاؤ داجی نے نہ صرف ان کا علاج کیا بلکہ پیشن گوئی بھی کی کہ اگر یہ لڑکا زندہ بچا تو بہت بڑا آدمی بنے گا [1].

ڈاکٹر لاڈ کو تاریخ سے بھی دلچسپی تھی اور اس نے اس سلسلہ میں کشمیر، کلکتہ، مدراس، بردوان، پاٹلی پتر، اور دوسرے اہم تاریخی مقامات کی سیاحت بھی کی تھی اور بیتھون سوسائٹی [2] کے ایک جلسے میں مقالہ بھی پڑھا تھا. سر بارٹل فریر گورنر بمبئی نے بعض تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں اس کو جیسلمیر بھی بھیجا تھا. محکمہ تعلیم کے دو اسسٹنٹ مسمیٰ بھگوان اور پنڈو رنگ اس کے ہمراہ تھے. وہ السنہ مشرقیہ کی کافی کتابیں اور تصویریں اپنے ہمراہ لایا. سنہ ۱۸٦۷ء میں اس نے اپنی رپورٹ پیش کی. ایک تاریخ بھی مرتب کی. ہندوستان کی قدیم عمارتوں کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے جب گورنر بمبئی نے مورخین کی ایک کمیٹی تاسیس کی تو ڈاکٹر لاڈ کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا. سر اسکاٹ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جو تاریخ لکھی اس کے ابواب ـــ سنسکرت ادب ـــ عمارات اور تاریخ اسی سے لکھوائے تھے. ڈاکٹر نے جین مت کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس پر متعدد مضامین لکھوائے تھے [3].

ڈاکٹر لاڈ کو تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اور چونکہ الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ سے

---

1. Life of Sir Pheroze Shah Mehta, H. P. Mody.
2. Bethoon Society.
3. Arvachin Charitra Kosha, Siddheshwar Shashtri Chitrav. Poona. 1946. Page 539 (Marathi).

کافی عرصہ اس کا تعلق رہا تھا اس لئے سنہ ۱۸۵۱ء میں «اسٹوڈنٹس لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی» کی مجلس منتظمہ نے اس کو رکنیت بخشی۔ شوسائٹی کی پانچویں نشست منعقدہ سنیچر ۱۹ فروری سنہ ۱۸۵۳ء کو اس نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ہر ممکن قربانی سے گریز نہ کرے گا۔ اس احلاس کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۲ء میں ۲۱ مقالے مختلف عنوانات پر پڑھے گئے۔ ان میں ایک ڈرامہ پر بھی تھا [۱]۔

ڈاکٹر لاڈ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی لیکن دوشنبہ ۴ فروری سنہ ۱۸۵۶ء کو سوسائٹی کی سالانہ نمائش کے موقع پر جس کی صدارت وائیکاؤنٹس کیننگ [۲] نے کی اس کا تعارف معزز مہمان سے بہیں کرایا گیا۔ سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے مرہٹی طالبات کی تعلیم کے لئے ایک اسکول کے حملہ احراجات برداشت کرنے منظور کئے حو چالیس روپیہ ماہوار تھے۔ سوسائٹی کی محلس منتظم نے اس گرلس اسکول کا نام ڈاکٹر بھاؤداجی کے نام پر رکھا اور ڈاکٹر موصوف کو اس کا آنریری سپرنٹڈنٹ مقرر کیا۔ جب جگناتھ شنکر سیٹھ کے اسکول واقع گرگام کے طالبات کی تعداد ۸۰ تھی اور بھگوان داس پرشوتم داس کے گرلس اسکول واقع کالبا دیوی میں ۴۸ لڑکیاں پڑھتی تھیں ڈاکٹر لاڈ کے یہاں ۹۴ طالبات تھیں جو سنہ ۱۸۶۲ء میں بڑھ کر ۱۱۵ ہوگئیں۔

۱۶ مئی سنہ ۱۸۵۵ء کو سوسائٹی کے اینگلوورنا کیولر بوائز اسکول کے سالانہ انعامی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈریڈ [۳] نے ڈاکٹر لاڈ سے درحواست کی کہ وہ گجراتی زبان میں طلبہ کو حطاب کریں چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر میں ان لوگوں کو بہت سحت و سست کہا جو پس پردہ تعلیم نسواں کی مخالفت کرتے ہیں [۴]۔

چونکہ ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کا بیشتر وقت قومی و ملکی حدمت میں صرف ہوتا تھا اس لئے سوسائٹی نے اعلان کیا کہ «ڈاکٹر بھاؤداجی مرہٹی گرلس اسکول

1 "On the Restoration of Dramatic Representations among the natives of India".
2 Viscountess Canning.
3 Dr. Richard T. Reid, LL. D:, Bar-at-Law, Perry Professor of Jurisprudence.
4 Students' Literary and Scientific Society, Report for the year 1855-56, Page 21.

واقع لوہار چال » کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے چودہ ہزار سات سو روپئے فنڈ میں جمع ہوگئے [۱]۔

اسی سال سر بارٹل فریر نے سوسائٹی کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر لاڈ کو یقین دلایا [۲]۔ کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی خواتین کی کمی نہیں ہے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو اور مثال کے طور پر اہلیا بائی ہلکر اور بیگم بھوپال کے نام پیش کئے۔

جب ڈاکٹر لاڈ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے تو ان کے اسکول میں پڑھنے والی طالبات کی تعداد بھی کم ہوگئی۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں ۱۰۴ اور سنہ ۱۸۶۴ء میں ۱۰۳ [۳]۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں ۱۰۲ [۴]۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں ۱۰۰ [۵]۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں ۱۰۲ سنہ ۱۸۶۸ء میں ۹۵ [۶]۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں ۱۰۰ [۷]۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں ۸۱ [۸]۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں ۸۶ [۹]۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں ۸۹ [۱۰]۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں ۹۹ اور سنہ ۱۸۷۴ء میں ۱۰۰ [۱۱]۔ ہوگئی۔ ڈاکٹر موصوف کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں نے ان کی یادگار زندہ رکھنا چاہی اس لئے سنہ ۱۸۷۵ء میں اس کی طرف توجہ دینی شروع کی اور طالبات کی تعداد بہت جلد ۱۳۱ اور سنہ ۱۸۷۶ء میں ۱۸۴ [۱۲]۔ تک پہنچ گئی۔

سنہ ۱۸۵۲ء میں ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ ایشیاٹک سوسائٹی کے باضابطہ ممبر بنے اور سنہ ۱۸۶۴ء میں اس کے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ میکس ملر اس کے متعلق لکھتا ہے کہ ڈاکٹر کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنی علمی و ادبی خدمات سے اپنی زندگی ہی میں شہرت دوام حاصل کی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر موصوف نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ ہزاروں صفحات سے زیادہ باوقعت ہے۔

1 Students' Literary and Scientific Society, Report for the year 1862-63, Page 45
2 The Times of India, Tuesday Dec. 16, 1862
3 Students' Literary and Scientific Society, Report for the year 1862-63, Page 3
4 Students' Literary and Scientific Society, Report for the year 1865-66, Page 5
5 Ibid. 1866 - 67, Page 2.
6 ,, 1867 - 68, Page 2.
7 ,, 1868 - 69, Page 1.
8 ,, 1869 - 70, Page 2.
9 ,, 1870 - 71, Page 2.
10 ,, 1871 - 72, Page 2.
11 ,, 1273 - 74, Page 4.
12 ,, 1875 - 76, Page 3.

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے علاوہ ڈاکٹر صاحب دوسری بین الاقوامی انجمنوں کے بھی ممبر تھے۔ پہلا معزز عہدہ جو ان کو تفویض ہوا وہ « بورڈ آف ایجوکیشن سوسائٹی » کی فیلوشپ تھی۔ اس کے بعد وہ « سنڈیکیٹ آف آرٹ کے رکن بنے۔ دوبار بمبئی کے شیرف مقرر ہوئے (پہلی بار سنہ ۱۸۶۸ء میں) وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔

ڈاکٹر لاڈ مندرجہ ذیل اداروں سے وابستہ تھے:

ممبر	رائل ایشیاٹک سوسائٹی	لندن
»	ایشیاٹک سوسائٹی	پیرس
»	اورینٹل سوسائٹی	برلن
»	» »	امریکہ
»	میوزیم آف آرٹس اینڈ انڈسٹری	آسٹریلیا
»	مکینک سوسائٹی	ویانا
»	جاگریفیکل سوسائٹی	بمبئی
»	ایشیاٹک سوسائٹی	بنگال
فیلو	فلالوجیکل سوسائٹی	لندن
»	لیمسن سوسائٹی	»
سکریٹری	وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم	بمبئی
وائس پریسیڈنٹ	بمبے ایسوسی ایشن	»
»	نیٹیو جنرل لائبریری	»
پریسیڈنٹ	» »	»
»	فیمل نارمل اسکول	»
»	جووی نائل امپرومنٹ لائبریری	»

ڈاکٹر لاڈ کو سنسکرت زبان اور اس کے ادب سے بھی کافی دلچسپی تھی اور اس پر کافی تحقیق بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نے سنسکرت ادب کی سیکڑوں کتابیں جمع کی تھیں۔ یہ کتابیں اب ایشیاٹک سوسائٹی بمبی کے کتب خانہ میں « میموریل وال» حیثیت سے اپنی الماریوں کی زیب و زینت ہیں۔

ڈاکٹر لاڈ کو تھیٹر سے بھی کافی دلچسپی تھی اور « کالیداس الفنسٹن

کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ اس میں کالیداس کے ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے۔ ڈاکٹر لاڈ کی درخواست پر پروفیسر ولیم نے شکنتلا کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا جو کالج کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔

بمبے تھیٹر (قدیم) کے خاتمہ (سنہ ۱۸۳۵ ع) پر جب جگناتھ شنکر سیٹھ نے ایک نئے تھیٹر کی تعمیر کا مطالبہ کیا اور ۴۸۸ انگریزوں اور ہندستانیوں کے دستخطوں سے ایک محضر ۲۰ اپریل سنہ ۱۸۳۶ ع کو شیرف بمبئی کی خدمت میں پیش کیا تو اس میں ڈاکٹر کی کوششوں کو بھی دخل تھا اور سہ شنبہ مورخہ ۲۶ اپریل کو رائل ایشیا ٹک سوسائٹی. بمبئی برانچ. میں جو عوامی جلسہ طلب کیا گیا اس کو کامیاب بنانے کا سہرا بھی ڈاکٹر صاحب کے سر ہے۔

جب تک بمبے تھیٹر (جدید) تعمیر نہیں ہوا تھا وہ جگناتھ شنکر سیٹھ کی معیت میں کام کرتے تھے لیکن سنہ ۱۸۴۶ ع سے ۱۸۵۳ ع تک ہر دو اصحاب سیاسی اور تعلیمی کاموں میں اسقدر منہمک رہے کہ تھیٹروں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔

سنہ ۱۸۵۲ ع میں جب یہ سوال اٹھا کہ بمبے تھیٹر ــــ جو انگریزی تماشوں اور غیر ملکی تماشوں کے لئے وقف ہے بیٹو زبان کے تماشوں کےلئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں، جگناتھ شنکر سیٹھ اور ڈاکٹر بھاؤ دا جی لاڈ کو اس سلسلہ میں کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ زمین جگناتھ شنکر سیٹھ نے دی تھی۔ قرض کی ذمہداری بھی لی تھی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے بھی ممبر تھے اس لئے ان کو صوبائی زبان میں تماشے دکھلانے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر لاڈ کی نگرانی میں آٹھ مرہٹی تماشے بمبے تھیٹر میں دکھلائے گئے جو مالی اعتبار سے ناکامیاب ثابت ہوئے جگناتھ شنکر سیٹھ چاہتے تھے کہ ہندو ڈرامیٹک کور اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے تاکہ جو نقصان ان کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس سے ان کو چھٹکارا مل جائے لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب آمدنی معقول ہو۔

لیکن مرہٹی تماشوں کے لئے دشواری یہ تھی کہ انہیں صرف مرہٹے ہی دیکھتے تھے جو زیادہ تر مزدور اور ملازم پیشہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں کی قدامت پرستی انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اہل و عیال کے ساتھ بلا ردو قدح تماشوں میں شرکت کریں. مرہٹہ اداکار بھی کم آمدنی اور زاید اخراجات کے باعث دل برداشتہ

ہوگئے تھے ۔ جگناتھ شنکر سیٹھ بھی ان سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے چنانچہ کافی غور و خوض اور متعدد حضرات سے مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہندستانی (اردو) زبان میں تماشے دکھلائے جائیں اور گورنر بہ اجلاس کونسل سے درخواست کی جائے کہ وہ اُس کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ گورنر کی منظوری اور ضروری انتظامات کے بعد تھیٹر کا انتظام ڈاکٹر لاڈ کے سپرد کیا گیا۔

جس زمانے میں ڈاکٹر بھاؤ داجی اورینٹل لیجر کی قلمی کتابوں اور تصویروں کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو عربی و فارسی میں خاص استعداد رکھتے تھے ۔ ان میں محمد علی روگھے [1] آغا محمد رحیم [2] نواب اکبر علی خاں [3] مرزا علی محمد شوستری [4] محمد ابراہیم مقبہ [5] قابل ذکر ہیں ۔ مسٹر مقبہ سے ان کی اچھی شناسائی تھی کیونکہ گورنر کے انٹرپریٹر کی حیثیت سے تاریخ کی تدوین اور تراجم کے سلسلہ میں وہ اکثر بکار سرکار بلائے جاتے تھے ۔

ڈاکٹر موصوف نے سنہ ۱۸۵۳ ع میں «راجہ گوپی چند اور جلندھر» نامی ڈراما ہندوستانی (اردو) زبان میں لکھا ۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر نے کسی سے اس کی تصحیح کرائی ہو لیکن کمپنی کے سب ایکٹر مرہٹے تھے ۔ زبان چونکہ عام پسند تھی اس لئے ایکٹروں کو کوئی دشواری نہیں ہوئی ۔ یہ تماشا ۲۶ نومبر کو ممبے تھیٹر میں دکھلایا گیا اور اسقدر مقبول ہوا کہ ۳ دسمبر کو اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کیا گیا اور ۷ جنوری سنہ ۱۸۵۴ ع کو ہر دو حصے بیک وقت دکھلائے گئے ۔ پھر ٦ فروری سنہ ۱۸۵۵ ع کو ان کا اعادہ کیا گیا۔ ڈاکٹر لاڈ نے اس ڈرامہ کی مقبولیت کے بعد «سیتا کی شادی» لکھا جو ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ ع کو ممبے تھیٹر میں دکھلایا گیا۔

ڈاکٹر بھاؤ داجی جی کی زندگی اسقدر مصروف تھی کہ ان کو ہر وقت اپنی زندگی کا خطرہ در پیش رہتا تھا چنانچہ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا یعنی ۱۸۷۳ ع اکیاون سال کی عمر میں ان پر فالج گرا اور یہ حملہ اسقدر شدید تھاکہ وہ

1. Mahomed Ally Rogay,
2. Aga Mahomed Rahim,
3. Nabob Ackbar Ally Khan,
4. Meerja Ally Mahomed Soostry,
5. Mahomed Ebrahim Muckba,

حرکت بھی نہ کرسکتے تھے . گورنر بمبئی سر بارٹرفریر ان کی عیادت کو آئے اور علاج کا معقول انتظام کیا . اصل یہ ہے کہ مسلسل محنت نے ان کی جسمانی طاقت ختم کر دی تھی سترہ ماہ کی طویل مدت گدارنے کے بعد یہ خادم قوم و ملت ۳۱ مئی سنہ ۱۸۷٤ ع کو اس جہاں فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا مرحوم نے پس ماندگاں میں دو لڑکے چھوڑے (۱) وتھل راؤ اور (۲) دوارکا ناتھ وتھل راؤ کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی .

سنیچر ، یکم اگست کو ٹاؤن ہال میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت سر گس انعقاد پذیر ہوا . سر مائقل ویسٹ آپ . سر جیجی بھائی بیرونٹ ، پروفیسر رام کرشن گوپال بھنڈار کر . آرڈی ولس . ایس ایم حسٹس ویسٹ اسٹروک بے ڈاکٹر بھاؤ دا جی لاڈ مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی . کثرت باراں کے باوجود ٹاؤن ہال مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا .

نصیر الدین، ہاشمی ٭

کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو مطبوعات کا ایک جائزہ

(۲)

نواب سالار جنگ کو مثنوی میر حسن سے بڑی دلچسپی تھی. چنانچہ اس مثنوی کے (۸) قلمی نسخے کتب خانہ ھذا میں محفوظ ہیں جن میں کئی مصور بھی ہیں. مطبوعہ نسخوں کی صراحت حسب ذیل ہے

۱	سحر البیان	مطبع حیدری، بمبئی، سنہ ۱۲۷۳ ء
۲	سحر البیان	نول کشور پریس، لکھنؤ، سنہ ۱۹۴۵ ء
۳	»	قبل سنہ ۱۳۰۰ ء
۴	»	افضل المطابع قبل سنہ ۱۳۰۰ ء
۵	»	الہ آباد، سنہ ۱۹۱۹ ء

مثنوی گلزار نسیم، اور مثنوی گلزار ارم کے بھی ایک سے زیادہ نسخے ہیں. قصہ، « نل دمن » گل و صنوبر بھی موجود ہیں.

۴ - نثری افسانے، جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ نثری افسانوں کی (۱۷۲) کتابیں ہیں ان میں کئی ایک قابل تذکرہ ہیں بعض کا یہاں تعارف کرایا جاتا ہے

۱	انوار سہیلی	مترجمہ میاں محمد ابراہیم	مدراس	سنہ ۱۸۲۴ ء
۲	آرایش محفل	سید حیدر بخش حیدری	نول کشور	قبل ۱۹۰۰ ء
۳	شبستان سرور	مرزا رجب علی بیگ سرور	مطبع العلوم	۱۲۷۹ ھ
۴	مذہب عشق	نہال چند	« حسینی لکھنؤ	قبل ۱۹۰۰ ء
۵	گل صنوبر	نیم چند		۱۸۲۶ ء
۶	«	«	« گلدستہ نشاط بمبئی	۱۸۴۱ ء

میرامن کی باغ و بہار کے کئی نسخے ہیں جو مختلف سنین میں مختلف مطابع میں طبع ہوئے ہیں یعنی،

٭ نصیر الدین ہاشمی، کگل منڈی - حیدر آباد

۱	باغ و بہار	میرامن	فورٹ ولیم کالج کلکتہ	قبل سنہ ۱۸۵۷ ء
۲	"	"		۱۲۴۷ ھ
۳	"	"	مطبع حسینی لکھنؤ	۱۲۶۲ ھ
۴	"	"	" ابا پرشاد	۱۲۹۴ ھ
۵	"	"	" ابو العلائی آگرہ	۱۹۱۶ ء
٦	"	"	" اعظم اسٹیم پریس	۱۳۵۰ ف

بوستان خیال ، طلسم ہوش ربا ، داستان امیر حمزہ کی مکمل جلدیں موجود ہیں جو مختلف ناموں سے طبع ہوئی ہیں .

۵ ـ ناول ادبی کتابوں میں دواوین کے بعد ناول ہی زیادہ ہیں ناولوں میں شرر ، اور حکیم محمد علی کے ناولوں کے علاوہ مسٹریز آف کورٹ اف لندن کی مکمل جلدیں موجود ہیں . ناولوں میں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اور مصنفہ دونوں موجود ہیں . اگرچہ درمیان میں کچھ عرصہ تک اس کی رفتار کم ہوگئی تھی مگر اب پھر ناولوں کا رواج ہوچلا ہے سنہ ۱۹۴۸ ء کے بعد کے ناول کتب خانہ میں نہیں ہیں تاہم جو ذخیرہ ہے وہ ناول کی تاریخ کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے .

٦ ـ ڈرامہ ادبیات اردو میں ڈرامہ کا ذخیرہ بہت کم ہے اس لحاظ سے اس کتبخانہ میں بھی ڈرامہ کی کتابیں بہت کم ہیں یعنی قابل تذکرہ ڈرامے حسب ذیل ہیں .

۱	البرٹ بل	اعزاز علی	مطبع گنگا پرشاد	قبل ۱۹۰۰ ء
۲	بھول بھلیاں		مطبع العلوم	سنہ ۱۸۹۶ ء
۳	شمشاد و سوسن		مصطفوی پریس لاہور	۱۸۹۸ ء
۴	عبرت کدہ اسپین	سید محمد علی	شوکت اسلام پریس	۱۳۰۲ ھ
۵	لیلی مجنوں	مرزا محمد ہادی رسوا ـ	الناظر پریس لکھنؤ	۱۹۱۰ ء

۷ ـ مجموعہ کلام اس فن میں ایسی کتابوں کو رکھا گیا ہے جن میں مختلف شعرا کے کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے اس فن کی (۹۳) کتابیں ہیں جو قابل تذکرہ ہیں وہ یہ ہیں .

۱	چمن بے نظیر	محمد ابراہیم	مطبع نول کشور	سنہ ۱۸۸۵ ء
۲	زنانہ نظمیں	فاطمہ بیگم	خادم التعلیم پریس	سنہ ۱۹۱۶ ء

۳	ریاض فردوس	محمد حسین	نول کشور	سنہ ۱۲۷۶ ھ
۴	مجموعہ الاشعار	محمد عبد اللہ	مطبع احمدی بمبئی	قبل ۱۹۰۰ ء
۵	مجموعہ الاشعار	کریم بھائی	بمبئی	سنہ ۱۲۶۵ ھ
۶	مجمع الاشعار ہندی	کریم بھائی	مطبع حیدری بمبئی	سنہ ۱۲۸۰ ھ

۸ ۔ مراثی مراثی کی کتابیں بھی خاصی ہیں چنانچہ ان کی تعداد (۸۵) ہے اس فن کی پہلی کتاب کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ دوسری کئی ایک کتابیں قابل تذکرہ ہیں مگر طوالت کے مدنظر صرف چند کتابوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔

۱	اشعار شہادت	محمد عبدالرحیم صیاء	مطبع نظامی کانپور	۱۲۸۲ ھ
۲	مرقع غم	محمد رضا خان	نول کشور	۱۲۵۵ ھ
۳	مرثیہ حال شہادت	واحد علی شاہ	مطبع سلطانی قبل	۱۹۰۰ ھ

انیس کے مرثیے جو سنہ ۱۸۷۶ ع میں طبع ہوئے اور دبیر کے مرثیے جو سنہ ۱۸۹۹ ع میں طبع ہوئے ہیں یہ سب کتب خانہ میں موجود ہیں انیس کے وہ مراثی بھی موجود ہیں جن کو مولانا سید علی حیدر طباطبای المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے مرتب کیا اور نظامی پریس میں طبع ہوئے ہیں۔

۹ مختصر افسانے اردو میں مختصر افسانوں کی پیداوار صرف پچاس سال پہلے ہوئی ہے ان کی تعداد میرے خیال میں دو ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی مگر نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ان کی تعداد مختصر ہے یعنی صرف (۷۶) کتابیں ہیں، پریم چند، راشد الخیری، اپندر ناتھ اشک، ڈاکٹر نصیر الدین، ڈاکٹر شفیق، محمد حسین، ندیم، قاسمی، یم اسلم، عزیز احمد وغیرہ کے افسانے موجود ہیں۔

۱۰ ۔ ادبی مقالات یعنی «ایسے» کا فن قدیم ہے اور اس میں مختلف فن کے مقالے شامل ہوجاتے ہیں یعنی ادبی۔ معاشرتی۔ اور سماجی اور تاریخی مقالات کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان میں ایسے مقالات خصوصیت سے اہمیت رکھتے ہیں جو مشاہیر اردو کے کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً سر سید، محسن الملک، مولوی چراغ علی، علامہ شبلی، علامہ سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی وغیرہ ان سب کے مقالات کتب خانہ میں موجود ہیں انکے علاوہ اور مقالے قابل تذکرہ ہیں مثلاً۔

اشارات	جوش ملیح آبادی	دیال پریس دہلی	۱۹۴۰ ع
اقبال آصفیہ	سراج الدین احمد	چودھویں صدی پریس	۱۸۹۶ ع

تصریحات آزاد مولانا ابوالکلام آزاد پریم نرسنگھ پریس جموں ۱۹۳۵ ع
رسائل عمادالملک سید حسین بلگرامی عماد پریس ۱۹۱۱ ع
مقالات الہلال مولانا ابوالکلام آرٹ پریس لاہور مابعد سنه ۱۹۳۵ ع

۱۱ مزاح و طنز اردو میں مراحیه ادب کا آغاز نظیر اکبر آبادی اور غالب سے شمار کرنا چاہئے لیکن نطیر اور غالب کے بعد ایک عرصه تک یه شعبه تشنه رہا ہے پھر اوده پنچ کے ایڈیٹر اور ان کے رفقانے مراحیه اور طنز کے ادب میں اضافه کیا اس کے بعد سنه ۱۹۲۰ ع کے بعد سے اس فن میں زیاده سے زیاده کتابیں لکھی گئی ہیں نواب سالار جنگ کے کتب خانه میں اس فن کی صرف (۳۲) کتابیں ہیں جن سے بعض قابل تذکره یه ہیں۔

۱ رسالہ ظرافت نور پریس دہلی ۱۸۸۸ ء
۲ ظرافت کی چڑیا " قبل ۱۹۰۰ ء
۳ گلدسته ظرافت ملاقی داس " "
۴ نمک داں سخن شاہ محمد چند احسن صحیفه پریس حیدرآباد ۱۳۲۸ ء

۱۲ تاریخ ادبیات تاریخ ادبیات کا فن بھی اردو میں ایک جدید شعبه قرار دیا جاسکتا ہے اگرچه آبحیات لکھ کر آزاد نے تاریخ اور تنقید ادب کا دروازه کھول دیا تھا مگر عرصه تک کسی نے اس دروازه میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی سنه ۱۹۲۰ ع کے بعد اس شعبه کی جانب زیاده سے زیاده توجه کی گئی اس شعبه کی (۵۶) کتابیں کتب خانه سالار جنگ میں موجود ہیں۔

آبحیات کے نسخے سنه ۱۸۸۰ ع ۱۹۰۷ ع کے طبع شده موجوده ہیں۔

۱ اختر شاہنشاہی سید محمد اشرف اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ ء
۲ گنج شائگاں سید الطاف حسین کاظمی اسلامیه پریس لاہور ۱۸۹۲ ء
۳ عربی ادب کی تاریخ محمد عبدالاحد مطبع دہلی ۱۹۰۹ ء

۱۳ تنقید اگرچه کوئی جدید شعبه نہیں ہے مگر سنه ۱۹۲۰ ع کے پہلے تنقید کی جانب بحیثیت مخصوص فن کے توجه نہیں کی گئی تھی اگرچه شعرالعجم ایک تنقیدی کتاب بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر اس کو تاریخ ادبیات میں شمار کرنا چاہئے چنانچه ہم نے اس کو تاریخ ادبیات ہی میں شامل کیا ہے۔ تنقید کی (۵۶) کتابیں اس کتب خانه میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر کلیم الدین۔ ڈاکٹر زور۔

حامد حسن وغیرہ کی کتابوں کے علاوہ بعض قابل تذکرہ کتابیں حسب ذیل ہیں.

۱　الفرق　　مرزا عابد علی بیگ　　۱۸۰۱ ء

۲　تمصرہ ترتیب کلیات امیر خسرو محمد اسحاق خان　　انسٹی ٹیوٹ　　۱۹۱۵ ء

۳　ریویو شبلی کی کتاب الغزالی پر　　محمد غوث سعید　　مطبع شمسی حیدرآباد ۱۹۰۲ ء

۴　محاکمہ مرکز اردو　　سید احمد دہلوی　　شمسی دہلی ۱۹۱۱ ء

۱۴ ـ مکتوبات　　مکتوبات کا فن اردو زبان میں نیا نہیں ہے. لیکن جو مواد اس فن میں بہم دست ہوا ہے وہ کچھ زیادہ نہیں ہے. نواب صاحب کے کتبخانہ میں اس فن کی (۵۵) کتابیں موجود ہیں اردو معلی اور عود ہندی کے مختلف نسخے ہیں یعنی اردو معلی کے نسخے سنہ ۱۸۶۹ ء سنہ ۱۸۹۹ ء سنہ ۱۹۲۷ ء کے طبع شدہ یہاں ہیں ان کے علاوہ سنہ ۱۹۰۰ ء اور سنہ ۱۹۱۰ ء کے بھی ایڈیشن موجود ہیں. بعض دوسری قابل تذکرہ کتابیں یہ ہیں.

۱　انشاء بہار بے خزان　　غلام امام شہید　　نول کشور　　۱۸۸۶ ء

۲　انشا ہادی نسوان　　سید احمد دہلوی　　شمسی پریس دہلی　۱۹۱۰ ء

۳　پروفسر آرمنین ومبری کا خط　بنام نواب عبدالطیف مطبوعہ غوثیہ کلکتہ　۱۸۸۹ ء

۴　تاریخ غزالہ ملکہ غزالہ کے خطوط　　سید وصی بلگرامی　　مفید عام آگرہ ما بعد ۱۹۰۰ ء

۵　رقعات بیگمات　　محمد امتیاز علی خان　مطبع مورس فرخ آباد ۱۹۰۱ ء

۶　مکتوبات امام ربانی　　مرتبہ عبدالرحیم　　زور بازار پریس　۱۹۱۱ ء

۷　یادگار اصغری　　غلام سرور　　وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۱ ء

۱۵ ـ شرح کلام کو میں نے ایک خاص شعبہ بنایا ہے اس کی (۲۱) کتابیں ہیں، اس فن میں شرح حماسہ اور شرح متنبی، شرح مقامات بدیع قابل تذکرہ ہیں یہ تینوں عربی کی مشہور کتابیں ہیں ان کی شرح اردو میں لکھی گئی ہے ذوالفقار علی اور حکیم ولی احمد ان کے مترجم ہیں. سنہ ۱۳۰۶ ھ. سنہ ۱۳۱۰ میں ان کی طباعت ہوئی ہے.

غالب کے دیوان کی دو شرح ہیں یعنی علامہ سید حیدر طبا طبای اور محمد عبدالعلی والا کی مرتبہ ہیں. فارسی کے مشہور شاعر کاشی کے ہفت ہند کی شرح بھی موجود

ہے جو مطبع یوسفی دہلی اور مطبع اثناعشرہ میں طبع ہوئی ہیں۔
۱۶ ـ لکچر اور خطابت: اس فن کی (۱۰۱) کتابیں محفوظ ہیں چند قابل تذکرہ کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱	الخطبات الاحمدیہ	سرسید احمد خاں	نول کشور مابعد	۱۹۲۰ ء
۲	پہلا لکچر	محسن الملک	مفید عام آگرہ	۱۸۹۱ ء
۳	خطبہ صدارت ایجوکیشنل کانفرنس	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	انسٹی ٹیوٹ پریس	۱۹۲۳ ء
۵	خطبات ابوالکلام آزاد	مولانا آزاد	امرتسر پریس لاہور	۱۹۴۴ ء
٦	اطبائے یونان	امین جنگ	دارالطبع	۱۳۳۵ف
۷	لکچر کلیلہ دمنہ	سید علی بلگرامی	مفید عام پریس	۱۸۹۱ ء
۸	لکچروں کا مجموعہ	مولانا نذیر احمد	انصاری پریس	۱۸۹۱ ء

۱۷ ـ ادب اطفال: بچوں کا ادب اب ایک اہم شعبہ ہے اس فن کی ٦۳ کتابیں یہاں موجود ہیں۔

مدرسوں کے بچوں کے لئے اردو کی کئی کتابیں سنہ ۱۹۰۰ ء کے پہلے لکھی گئی ہیں ان میں سے اکثر کتابیں یہاں موجود ہیں مثلاً سید عبدالفتاح نے سنہ ۱۸٦۷ ء میں پہلی اور دوسری کتاب لکھی ہے ناظم انصاری نے سنہ ۱۹۲۱ ء میں چند کتابیں لکھی ہیں ادارہ ادبیات اردو کی کئی کتابیں اور خدیجہ بیگم کی تصنیفات بھی یہاں موجود ہیں۔

تاریخ

شعبہ تاریخ کو حسب ذیل ۱۳ فنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تاریخ عمومی۔ تاریخ اسلام، تاریخ دکن، تاریخ ہندوستان، تاریخ ایشیاء، تاریخ یورپ، تاریخ افریقہ، امریکہ کی کوئی تاریخ بہم دست نہیں ہوئی ہے اس لئے اس کا عنوان نہیں ہے۔ ان کے علاوہ سیرۃالنبی، سوانح، ادبی سوانح، تذکرہ، سفرنامہ اور جغرافیہ، اس شعبہ کے دوسری شاخیں ہیں۔ اب ان پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱ ـ تاریخ عمومی: تاریخ عمومی ۳۹ کتابیں شامل کی گئی ہیں۔ تاریخ کا فن ایسا ہے جس سے نواب سالار جنگ کو بڑی دلچسپی تھی اس لئے اس فن کی

کتابیں بہت زیادہ ہیں فن تاریخ اور اس کے متعلقہ شعبوں کی تمام کتابوں کی تعداد (؟) ہوتی ہے۔

تاریخ عمومی کی پہلی کتاب کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ بعض دوسری قابل ذکر کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱	تاریخ عالم		کرزن پریس دہلی مابعد	۱۹۰۰ء
۲	تاریخ عجیب	منشی حبیب الدین	مطبع مرتضوی دہلی	۱۸۸۱ء
۳	تاریخ التاریخ	محمد مرتضی	روز بازار امرتسر	۱۹۱۱ء
۴	مرات العالم	محمد معراج حسین	مطبع ریاض الرضا	سنہ ۱۸۹۹ء
۵	نظام الممالک	محمد اسمعیل	نول کشور	سنہ ۱۸۷۵ء

۲۔ تاریخ اسلام جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ تاریخ اسلام کی ۳۱۴ کتابیں ہیں ان میں سنہ ۱۸۸۳ء م ۱۳۰۰ ھ کے ماقبل چھپی ہوئی کتابیں کئی ایک ہیں بعض قدیم کتابوں کا نام پیش کیا جاتا ہے۔

۱	بہارستان تاریخ معروف گلزار شاہی	غلام سرور	نول کشور	سنہ ۱۲۹۴ھ
۲	تاریخ جدولیہ	حادم علی	«	سنہ ۱۸۷۱ء
۳	کشاف اسرار المشایخ		«	سنہ ۱۸۸۱ء
۴	تاریخ جنگ مابین روم و روس		بمبئی	سنہ ۱۸۷۸ء

۳۔ تاریخ دکن سالار جنگ کو دکن سے جو تعلق تھا وہ پوشیدہ نہیں ہے آپ کے جد اعلی مدینہ منورہ سے دکن (بیجاپور) میں آئے ہیں، اس کے بعد اورنگ آباد سے تعلق رہا پھر سلطنت آصفیہ سے جو تعلق رہا اظہر من الشمش ہے اس لحاظ سے نواب صاحب نے دکن کی تاریخ کا کافی مسالہ فراہم کرایا تھا۔ چنانچہ تاریخ دکن کی ۴۰۴ کتابیں موجود ہیں پہلی کتاب کے قطع نظر بعض دوسری قابل تذکرہ کتابیں یہ ہیں۔

۱	تاریخ رشیدالدین خانی	غلام امام خاں	مطبع خورشید جاھی	۱۲۸۱ھ
۲	تاریخ دکن	عبدالغفور خان	مفید عام	سنہ ۱۸۹۷ء
۳	خصوصیات حضور نظام	سیدافضل حسین کنتوری	مطبع شمسی آگرہ	۱۹۰۷ء
۴	عہدوزرات آسماں جاہ	فیروزیار جنگ	مطبع سفیر دکن	۱۳۰۸ھ
۵	گزیٹر	مرزا مہدی خاں	مطبع شمسی آگرہ	سنہ ۱۹۰۸ء
۶	یادداشت صدرمحاسب	مسٹر کرالی	دارالطبع	سنہ ۱۳۰۶ف

۴ ۔ تاریخ ہندوستان | تاریخ کی کتابوں میں بڑا حصہ تاریخ ہند کا ہے یعنی (۳۵۸) کتابیں ہیں ان میں کئی ایسی کتابیں ہیں جو سنہ ۱۳۰۰ ھ یعنی سنہ ۱۸۸۳ ء کے قبل طبع ہوئی ہیں چند کتابیں یہ ہیں .

۱	احسن التواریخ	سید آقا حسن بمبئی		سنہ ۱۸۶۳ ء
۲	آئینہ اقبال سکندری	گوکل پرشاد	مطبع نور کانپور	سنہ ۱۸۷۷ ء
۳	آثارالصادید	سیداحمد حان	مطبع سیدالاخبار دہلی	۱۸۴۷ ء
۴	تاریخ یدیع	منشی امیرالله تسلیم	مطبع حسینی رام پور	سنہ ۱۸۸۱ ء
۵	تاریخ قیصری	محمد اکبر علی	مطبع نصرت دہلی	۱۸۷۷ ء
٦	تاریخ مالک		مطبع دارالعلوم	۱۲۸۱ ھ
۷	تاریخ بعاوت ہند محاربه عطیم	کہیالال	نول کشور	۱۸۷٦ ء
۸	تاریخ اوده	کمال الدین حیدر	"	۱۸۷۹ ء
۹	تاریخ سیٹھورڈ	یم سی ملکر	سکندر پریس آگره	۱۸۵۵ ء
۱۰	تاریخ ہندوستان	ذکاء الله	مطبع مرتضوی	۱۸۷۵ ء
۱۱	تاریخ بعاوت ہند	"	مفید خلایق اگره	۱۸۵۹ ء
۱۲	ترحمه معاہدات و عہدو پیمان	حولا سہائے	مطبع منبع العلوم	۱۸٦۷ ء
۱۳	تاریخ ہندوستان	سیٹیفک سوسائٹی علی گڈه	مطبع انسٹیٹیوٹ علی گڈه	۱۸٦٦ ء
۱۴	اسباب بعاوت ہند	سرسید احمد حان	مصطفوی پریس لاہور	۱۷٦٦ ء
۱۵	قصص ہند	محمد حسین آزاد	سرکاری مطبع لاہور	۱۸۷۲ ء
۱٦	عبرات نگار	عبدالحق	اکمل المطابع	۱۸۷٦ ء
۱۷	گفتگو لارڈ کینگ	جی یف ابرونگ	سید احمد پریس	۱۸٦۳ ء
۱۸	واقعات ہند	کپٹن ہالدرائد	مطبع سرکاری لاہور	۱۸۷۱ ء
۱۹	حزن اختر	واجد علی شاہ	مطبع سلطان کلکته	۱۲۷٦ ھ
۲۰	تواریخ اوده	بت پرشاد	مطبع دلکشا فتح گڈه	۱۸۴۹ ء

آثارالصنادید کے کئی ایڈیشن موجود ہیں سنہ ۱۸۵۷ ء کی جنگ آزادی

کے متعلق کئی ایک کتابیں دستیاب ہوتی ہیں. عہد نامہ جات جو سنہ ۱۸۶۶ء میں طبع ہوئے ہیں مکمل جلدوں میں موجود ہیں. ان کے علاوہ کئی اور ایسی کتابیں ہیں جو اب نایاب کہی جا سکتی ہیں مثلا اختر شہنشاہی جو ہندوستان کے اخباروں کی تاریخ ہے اور خادم التعلیم پریس لاہور نے «فہرست اخبارات ہند» کے نام سے سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک کتاب شائع کی ہے. ان کے علاوہ تاریخ ہند کی اور بیسیوں ایسی کتابیں ہیں جو اگرچہ سنہ ۱۳۰۰ھ یا سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد طبع ہوئی ہیں لیکن اب وہ کمیاب یا نایاب ہوگئی ہیں. اور ان سے ایسا مواد مل سکتا ہے جو تاریخ ہند کے صحیح مرتب کرنے میں مد و معاون ہوگا.

نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں تاریخ کا بہت اچھا اور معتد بہ طبع ہے، نہ صرف اردو بلکہ فارسی تاریخیں بھی خاصی اہمیت رکھتی ہیں ان پر ریسرچ کرنے کے لئے بڑے وقت کی ضرورت ہے. تاریخ کے اسکالروں کے لئے بیش بہا سامان ضیافت مہیا ہے.

۵ ـ تاریخ ایشیا براعظم ایشیا جس قدر وسیع ہے اور اس براعظم میں جس قدر مشہور ممالک ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں. ہندوستان، ایران، چین جاپان، افغانستان وغیرہ سب کے سب ایشیا میں واقع ہیں ہندوستان، ایران، عراق کے تمدن، دنیا کے قدیم تمدن ہیں. اگرچہ ہندوستان کی تاریخیں علحدہ عنوان کے تحت رکھی گئی ہیں تاہم ایشیا کے دوسرے کئی ممالک ایسے ہیں جو تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں اس لحاظ سے یہاں کی تاریخیں بھی خصوصیت رکھتی ہیں ایشیا کی تاریخیں ۶۰ ہیں جو کتابیں قابل تذکرہ ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱	تاریخ ایران	سینٹیفک سوسائٹی علی گڈھ	انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ	۱۸۷۲ء
۲	تاریخ بابل و نینوا	محمد علی خاں عرشی	رنگین پریس دہلی	۱۹۰۰ء
۳	تاریخ ملک چین		مطبع پادری ٹامس کلکتہ	۱۸۵۲ء
۴	تاریخ خسروان عجم	مول چند	گنپت کرشنا جی پریس	۱۲۶۷ء
۵	تاریخ ایران	سرجان ملکم		۱۸۷۴ء
۶	سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی	رجب علی سرور	مطبع مسیحای	۱۲۶۸ھ
۷	صولت افغانی	محمد رازدار خاں	نول کشور	۱۸۷۶ء

۶ ـ تاریخ ممالک یورپ　براعظم یورپ کی تاریخیں اردو میں زیادہ نہیں ہیں تاہم ان میں سے ایک معتد بہ تعداد یہاں موحود ہے چنانچہ ۱۰۱ کتابوں میں سے چند کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے ۔

۱	اعمال نامہ روس	پندت رتن ناتھ	نول کشور لکھنو	۱۸۸۷ ء
۲	تاریخ بادشاہاں انگلستان	میحر سد رلینڈ	نول کشور لکھنو	۱۸۶۴ ء
۳	تاریح انگلستان	سیدالطاف حسین	مطبع احبار آصفی	۱۸۸۸ ء
۴	روس اور انگلستان	سید محمد حسین اغلب موہانی	انوری پریس	۱۸۸۸ ء
۵	یونان کے قدیم زمانہ کی تاریح	سینٹفیک سوسائٹی	سید احمد پریس	۱۸۶۵ ء

۷ ـ تاریح ممالک افریقہ　افریقہ کے ممالک میں مصر . مراکش . الجیریا ، اسلامی نقطہ نطر سے اہم حیثیت رکھتے ہیں اور اردو میں زیادہ تر ان ہی ممالک کی تاریحیں لکھی گئی ہیں . اس فن کی ۲۷ کتابیں ہیں . بعض قدیم کتابیں حسب ذیل ہیں .

۱	اقصائے معرب	حامد علی صدیقی	روزانہ اخبار پریس	۱۸۹۸ ء
۲	تاریخ مصر	سیدابوالحسن	نول کشور	۱۸۸۷ ء
۳	مصر کی قدیم تاریخ	سینٹفیک سوسائٹی		۱۸۷۰ ء
۴	محاربات مصر و سوڈان	امیر احمد	مطبع روزنامہ احبار دہلی	۱۸۹۹ ء

۸ ـ سیرۃالنبی　یہ امر نفس واقعہ ہے کہ دنیا کے پیغمبروں اور مصلحوں میں صرف ایک حضرت محمد مصطفی صلعم یعنی پیغمبر اسلام کی ذات والا صفات ایسی ہستی ہے حن کی زندگی کے پورے واقعات نہایت صحت کے ساتھ مرتب ملتے ہیں . عربی ، فارسی ، ترکی کے قطع نظر اردو میں بھی حو ذخیرہ سیرت پاک کا ملتا ہے وہ بیش بہا ہے . کتب خانہ سالار جنگ میں جو قلمی ذخیرہ ہے اس میں سیرۃالنبی سے متعلق ۳۰ قلمی کتابیں اور مطبوعات کی تعداد ۱۲۵ ہے کئی ایک کتابیں سنہ ۱۳۰۰ ھ کے قبل کی مطبوعہ ہیں حن میں سے بعض کا تعارف کرایا جاتا ہے .

۱	احیاءالقلوب	عبدالجلیل	مطبع رحمانی بمبئی	۱۲۶۱ ھ
۲	تواریخ حبیب الہ	مفتی عنایت احمد	« نظامی کانپور	۱۲۷۹ ھ

۳	ثمرۃالنا ظرین	«	محمدی بمبئی	۱۲۷۹ ھ
۴	فواید بدریہ	قاضی بدرالدولہ	« صفدری بمبئی	۱۲۹۹ ھ
۵	صادقہ	بشارت علی خاں	« نول کشور	۱۲۹۱ ھ
٦	مولود شریف	علام شہید	« الہی	۱۸٦۱ ء

۹ ـ سوانح عمری سوانح عمریوں کا بھی خاص ذخیرہ ہے نہ صرف ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں کے راہنما ادیب، شعرا اور بادشاہوں کے حالات ہیں بلکہ یورپ. افریقہ امریکہ کے مشاہیر کی سوانح عمریاں بھی موجود ہیں میں ہے سہولت کے مد نظر سوانح عمریوں کو دو نوعیت پر تقسیم کیا ہے. یعنی سوانح عمری اور ادبی سوانح عمری. ادبی سوانح عمریوں میں ان کو شامل کیا گیا ہے جن کو محض سوانح عمری نہیں کہا جاسکتا بلکہ ادبی حیثیت سے ان کو خصوصیت دیجا سکتی ہے.

دونوں قسم کی سوانح عمریوں کی تعداد ٦۱۴ ہوتی ہے ان میں کئی سنہ ۱۳۰۰ ھ (۱۸۸۳ ء) سے قبل کی کتابیں ہیں چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے.

۱	احسن الشیر	محمد اکبر خاں	مطبع آفتاب	۱۸۷۷ ء
۲	تذکرۃالمشاہیر	سدا سکھ لال	« نورالابصار	۱۸٦۰ ء
۳	تذکرۃالکاملین	رام چند	نول کشور	۱۸۷۷ ء
۴	سیرالمحتشم	غوث محمد خاں	مطبع سیرگلشن آباد جاورہ	۱۲٦۹ ھ
۵	سرگرشت نپولین	محمد عشاق حسین	نول کشور	۱۸۷۱ ء

۱۰ ـ ادبی سوانح اگرچہ یہ کوئی علحدہ فن نہیں ہے بلکہ سوانح میں شامل مگر ایسی سوانح عمریاں ہیں جن کو ادبی حیثیت سے بھی بلند معیار پر رکھا جاسکتا ہے. اس لئے ان کو خصوصیت سے ایک علحدہ فن کی تحت رکھا گیا ہے اس قسم کی (٦ ۱) کتابیں ہیں ان میں سے بعض قابل تذکرہ یہ ہیں.

۱	آئینہ داغ	محمد نثار علی	اسلامیہ پریس لاہور	۱۸۹۵ ء
۲	جلوۂ داغ	سید علی احسن	مطبع شمسی حیدر آباد	۱۹۰۲ ء
۳	حیات ذوق	احمد حسین خان	خادم التعلیم پریس لاہور	۱۸۹۵ ء
۴	حالات حسرت		دہلی	۱۲۳۷ ھ
۵	حالات سودا	احمد حسین خاں	خادم التعلیم پریس	۱۸۹۵ ء

مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حالی، مولانا عبدالرزاق وغیرہ کے مرتبہ سوانح سب کے سب موجود ہیں جو اسی فن میں شامل کئے گئے ہیں۔

۱۱ ۔ جغرافیہ فن تاریخ میں جغرافیہ بھی شامل ہے۔ اس فن کی (۲۲) کتابیں یہاں موجود ہیں اس فن کی چند کتابیں یہ ہیں۔

۱	علم جغرافیہ	سید عبدالفتاح	مطبع حیدری	بمبئی	۱۸۷۰ء
۲	عجائب روزگار	رام چندر	نول کشور		۱۸۷۲ء
۳	عجائب المخلوقات	نظر علی			۱۸۶۹ء
۴	مفتاح الارض		مطبع سرکاری	لاہور	۱۸۷۱ء
۵	ریاض الاسرار	رحمان علی	مطبع نامی نول کشور		۱۸۶۹ء

۱۲ ۔ تذکرہ تذکرہ کا عنوان ایسا ہے کہ سوانح کی کتابیں بھی آسکتی ہیں اس لئے تذکرہ اور سوانح عمریوں میں خلط ملط ہوسکتا ہے تاہم کوشش کی گئی ہے کہ تذکرہ سے سوانح عمری کو علحدہ رکھا جائے۔ شعراء اولیا۔ علماء سلاطین وغیرہ کے تذکرے آئے ہیں۔ مگر آخرالذکر کو تاریخ میں شامل کرسکتے ہیں بعض تذکروں کا یہاں تعارف کیا جاتا ہے۔

۱	تذکرہ طورکلیم	سید نورالحسن	مفید عام آگرہ	۱۲۹۱ ھ
۲	سراپائے سخن	سید محسن علی	نول کشور	۱۸۶۰ ھ
۳	گلستان بے خزاں	سید قطب الدین باطن	"	۱۸۸۴ ھ
۴	مراۃ خیال	درگاہ پرشاد	اکمل المطابع	۱۸۸۴ء
۵	گلشن بے خار	مصطفی خان	نول کشور	۱۸۷۴ء

۱۳ ۔ سفر نامہ سفر ناموں کو مختلف اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں مثلاً سفر نامہ جات حرمین و مقامات مقدسہ۔ سفر نامہ جات یورپ۔ سفر نامہ ہندوستان سفر نامہ امریکہ وغیرہ پھر ان کی دوسری تقسیم ترجمہ اور ذاتی تصانیف پر کی جاسکتی ہے

محولات

اس فن کو صرف پانچ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ۱۔ رپورٹ ۲۔ جنتری و تقویم۔ ۳۔ فہرستیں۔ ۴۔ علمی اور ادبی رسالے ۵۔ اخبارات۔

۱ ۔ رپورٹ کانفرنسوں، انجمنوں، اداروں وغیرہ کی رپورٹیں خاصی تعداد میں ہیں۔ چنانچہ ان کی تعداد (۱۷۶) ہے ان میں سے بعض کا یہاں تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱　ایڈریس اور اسپیچیس محمڈن کالج　محسن الملک　مطبع انسٹی ٹیوٹ ۱۸۹۸ء

۲　رپورٹ پنج سالہ　　علی گڈھ
مدرسہ آصفیہ　　سید محمد علی ملیح آبادی　اصح المطابع حیدر آباد

۳　روئداد (۱۹)ویں　　سر سید احمد حاں　سینٹیفک سوسائٹی

۴　رپورٹ سالانہ مدرسہ طبیہ دہلی　　مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۸ء

۵　روئداد مجلس حربیہ الصاعتہ سر سید احمد حاں　　۱۸۷[illegible] ء

۲ - رسالہ　علمی اور ادبی رسالوں کی تعداد خاصی ہے . اکثر رسالوں کو بلحاظ فائل شمار کیا گیا ہے . یعنی پورے سال کے فائل کو ایک نمبر دیا گیا ہے

سنہ ۱۸۸۵ ء (۱۳۰۲ ھ) یعنی کانگریس کے آغاز کے پہلے جو رسالے شائع ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں .

۱	رسالہ طبابت	حارج سمت	۱۸۵۷ ء
۲	رسالہ طبابت	ڈاکٹر فلیمس	قبل ۱۸۶۳ ء
۳	مظہر العلوم	پی سانڈرس	۱۸۷۵ ء
۴	تہذیب الاخلاق	سر سید احمد حاں	۱۲۹۶ ـــ ۱۸۷۹ ء
۵	رفیق دکن	محمد عزیز الدین	۱۸۸۴ ء
۶	مذاق سخن	محمد مشتاق احمد	۱۸۸۴ ء
۷	فنون	"	"
۸	پیام عاشق		"
۹	مخزن الفواید	سید حسین بلگرامی	۹۲ ـــ ۱۲۹۱ ھ

سنہ ۱۸۸۵ ء کے بعد سنہ ۱۹۰۰ ء کے قبل کے بیسیوں علمی ادبی رسالے موجود ہیں جن پر تفصیل سے کام کیا جاسکتا ہے .

اخبارات　رسالوں کے مقابلہ میں اخبارات کا حصہ کمتر ہے . قدیم اخبارات میں منشی سجاد حسین کی اخبار اودہ کی چند جلدیں موجود ہیں . سفر نامہ ہند امرتسر (۱۸۸۰) مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد کے چند فائل ہیں .

اس تفصیل سے واضح ہوسکتا ہے کہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں

اردو مطبوعات کا بھی کیسا اہم ذخیرہ ہے اور اس سے شایقین علم و فن استفادہ کرسکتے ہیں ۔

جنتری و تقویم اس فن کی بھی خاصی کتابیں ہیں ، چند قدیم کتابیں ہیں ۔

۱	بخشی جنتری	الہ بخش	نامی پریس کان پور	۱۹۰۱ ء
۲	تقویم العالم	خواجہ محمد ابوالحسن	مطبع یوسفی	۱۳۲۰ ھ
۳	جنتری اثنا عشرہ	سید سجاد علی	مطبع اثنا عشر	۱۹۰۹ ء
۴	علمی جنتری	سید عبداللہ	انتظامی پریس	۱۸۹۵ ء

فہرست کتب وغیرہ اس فن کی دس کتابیں ہیں ان میں چار فہرستیں کتب خانوں سے متعلق ہیں ۔

اس تفصیل سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ نواب سالارجنگ کے کتب خانہ میں اردو مطبوعات کا بھی اچھا بلکہ نایاب ذخیرہ موجود ہے جو تشنہ کامان علم کے ایک بیش بہا دولت ہے ۔

مضامین نوائے ادب

کی

ده ساله فهرست

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء تک

نوائے ادب کے مضامین کو گذشتہ دس برسوں میں جو علمی و تحقیقی مقبولیت حاصل ہوچکی ہے اس کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کے مضامین اور مضامین نگاروں کی مفصل فہرست الگ سے شائع کردی جائے تاکہ اردو سے متعلق کام کرنے والوں کو آسانی وسہولت ہو۔ امید کہ یہ اقدام مستحسن نظروں سے دیکھا جائے گا۔

نجیب اشرف ندوی

فہرست مضمون نگاران

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
	ظہیرالدین مدنی (ڈاکٹر سید)	گجرات کی مذہبی مثنویاں	٣	٣	٥
		ایضاً	٥	٣	٥
		حیات میر تقی میر (تبصرہ)	٦	٤	٧٤
٢٨	عابد رضا بیدار	ذوق کے بارے میں ایک ہم عصر اخبار کا تبصرہ	٩	٣	٤١
		اخبار سٹن ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ	١٠	٣	٤٥
٢٩	عالی جعفری	شہر بمبئی کے کتب خانوں میں دیوان ولی کے قلمی نسخے	٣	٣	٢٧
		شہر آرزو (تبصرہ)	١٠	٢	٧١
٣٠	عبدالحمید فاروقی (ڈاکٹر محمد)	امین گجراتی کی یوسف زلیخا	٦	١	٦
		ایضاً	٦	٢	٦
		ایضاً	٦	٣	٦
٣١	عبدالرزاق قریشی	اردو شاعری اور مسائل حیات	٢	١	٤٥
		ایضاً	٢	٢	٣٣
		اشعار مرزا مظہر جان جاناں رحمہ	٤	٢	٤٢
		ایضاً	٤	٣	٢٥
		حیات اجمل (نقد و تبصرہ)	٥	٤	٥١
		قاضی احمد میاں اختر	٦	٤	٧١
		پنڈت کیفی	٧	١	٥٥
		سیف طیب جی مرحوم	٩	١	٤
		لطائف السعادت (نقد و تبصرہ)	٩	٣	٥٤
		اردو کا قدیم ترین دیباچہ	٩	٤	٥٣
		ادب اور نظریہ (نقد و تبصرہ)	١٠	١	٦١
		اردو کی تمثیلی شاعری	١٠	٣	٣٨
٣٢	عبدالعلیم نامی (ڈاکٹر)	اردو تھیٹریکل کمپنیوں کے ابتدائی سفر	٢	٣،٤	٨٦

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	حلد	شمارہ	صفحہ
	عبدالعیم نامی (ڈاکٹر)	آغا حشر اور ان کے معاصرین	۴	۳	۳۵
		رونق بنارسی	۵	۴	۳۴
		ایضاً	۶	۱	۳۰
۳۳	عبدالغفور شکیل (پروفسر)	غم بنگلوری	۱۰	۴	۵۱
۳۴	عبدالقادر سروری (پروفسر)	غالب کی اخلاقی شاعری	۱	۱	۱۴
		ایضاً	۱	۲	۳۳
۳۵	عبدالودود (قاضی)	انتخاب دیوان اسد رام مخلص	۱	۴	۱۳
		کچھ انشا کے بارے میں	۲	۱	۲۸
		ایضاً	۴	۴	۶
		تذکرۂ یوسف علی خاں	۲	۲	۳
		خاتمۂ خلاصۃالافکار	۲	۳،۴	۵
		گلشن بیخار	۴	۲	۶
		آزاد بحیثیت محقق	۷	۲	۷
		ایضاً	۷	۳	۵
		ایضاً	۷	۴	۵
		فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا	۸	۲	۵
		اقتباسات سفینۂ خوش گو	۸	۳	۵
		سفینۂ ہندی	۸	۴	۵
		فہرست کتب خانۂ گارسان دتاسی	۹	۱	۵
		سرب سکھ دیوانہ	۹	۳	۵
		ایضاً	۹	۴	۵۱
		بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (نقدو تبصرہ)	۹	۴	۵
		ایضاً	۱۰	۱	۵
		ایضاً	۱۰	۲	۴۴
		ایضاً	۱۰	۳	۵
		ایضاً	۱۰	۴	۵

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۴۴	مبارزالدین رفعت (پروفسر)	منظوم شجرے	۱	۴	٦۵
		اورنگ آباد کی اردو اور فارسی مطبوعات	۸	۱	۴۱
۴۵	محمد حسین (پروفسر سید)	ایک مختلف فیہ مسدس	۸	۱	۲۸
۴٦	محمود شیرانی	حافظ محمود شیرانی کا ایک خط	۱	۱	۸۰
		نامۂ شیرانی	۲	۴،۳	۱۱۳
۴۷	محمود قادری (ابوالفضل سید)	ایک نایاب قلمی بیاض	۷	۲	۳۳
		ایضاً	۷	۳	۵۵
		ایضاً	۸	۱	۵۳
		ایضاً	۸	۲	۵۹
		ایضاً	۸	۳	۴۱
۴۸	مقیت الحسن	رافت سرہندی	۱۰	۳	۵۹
۴۹	مقبول احمد (شاہ)	میر محمد سلیم سلیم عظیم آبادی	۱۰	۲	۱۸
۵۰	منیژہ بانو	حالی بحیثیت مصلح	۳	۱	٦۰
		حالی اور ان کا تغزل	۴	۱	۱۸
۵۱	موہن سنگھ دیوانہ	حسرت موہانی وماثل دہلوی	۱	۱	۵۸
۵۲	مہدی حسن (ڈاکٹر)	چینی زبان کے الفاظ قرآن میں	۴	۳	۸۱
۵۳	مہیش پرشاد (مولوی)	مرزا غالب کے ایام میں نظام ڈاک	۲	۱	۳۹
۵۴	نجیب اشرف ندوی (سید)	ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی	۱	۴	۴۳
		خواجہ حسن نظامی	٦	۴	٦۹
		اودھ ریویو	۸	۴	۷۵
		کوکن کے اربعۂ عناصر	۹	۲	۵
۵۵	نذر مصطفےٰ	ولی کے احباب، تلامذہ اور ان کا وطن	۴	۴	۴۵
۵٦	نذیر احمد (ڈاکٹر)	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں علما و فضلا کی خدمات	۹	۳	۱۱

نمبر شمار	مضمون نگار	مضمون	جلد	شمارہ	صفحہ
۵۷	نصیر الدین ہاشمی	محمد امین زبیری کی سوانح نگاری	۱	۳	۴۴
		ایک صدی پہلے اردو میں سائنس کی تعلیم	۲	۲	۱۵
		کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد	۳	۱	۲۳
		دکن میں اردو کے ہندو شعرا	۳	۲	۲۸
		دکنی کلچر	۴	۱	۶
		نصرتی کا سن وفات	۵	۲	۴۹
		حیدر آباد کے عجائب خانہ کی اردو قلمی کتابیں	۶	۱	۴۲
		ایضاً	۶	۲	۴۱
		ایضاً	۶	۳	۱۹
		دکنی حکمراں اور دیسی بولیوں کی سرپرستی	۷	۱	۴۱
		سنٹرل ریکارڈ آفس کی اردو قلمی کتابیں	۷	۲	۴۸
		ایضاً	۷	۳	۳۳
		مدراس میں اردو کا کچھ نیا مسالا	۸	۲	۱۹
		کتب خانۂ نواب سالارجنگ کی نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہندی کتابیں	۱۰	۱	۴۱
۵۸	نعیم الدین (ڈاکٹر سید)	دکھنی زبان کی ایک کمیاب مثنوی	۸	۳	۳۳
		حضرت شاہ غلام حسین ایلچ پوری کی ایک نایاب مثنوی	۹	۲	۵۷
۵۹	نورالدین شیرازی (قاضی سید)	حکیم روح اللہ	۱	۲	۴
		ایضاً	۱	۳	۴
		گجراتی مسلمان اور گجری زبان	۸	۳	۵۴
۶۰	وحید قریشی (ڈاکٹر)	لکھنؤ کا دبستان شاعری پر ایک نظر	۳	۴	۴۱

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد	شمارہ	صفحہ
۲۰	اردو ہجا کی اصلاح کا ایک منصوبہ	ڈاکٹر صفدر آہ	۱۰	۴	۴۷
۲۱	استادِ غالب (ملا عبدالصمد)	مالک رام	۳	۱	٦۷
۲۲	اشعار مرزا مظہر جان جاناں رح	عبدالرزاق قریشی	۴	۲	۴۲
۲۳	ایضاً	ایضاً	۴	۳	۲۵
۲۴	اقتباسات سفینۂ خوش‌گو	قاضی عبدالودود	۸	۳	۵
۲۵	اکبرالہ‌آبادی	پروفسر سراج حسن نقوی	۱	۲	۴۰
۲٦	امین گجراتی کی یوسف زلیخا	ڈاکٹر محمد عبدالحمید فاروقی	٦	۱	٦
۲۷	ایضاً	ایضاً	٦	۲	٦
۲۸	ایضاً	ایضاً	٦	۳	٦
۲۹	انتخاب دیوان انند رام مخلص	قاضی عبدالودود	۱	۴	۱۳
۳۰	اودھ ریویو	نجیب اشرف ندوی	۸	۴	۲۵
۳۱	اورنگ آباد کی اردو اور فارسی مطبوعات	پروفسر مبارزالدین رفعت	۸	۱	۴۱
۳۲	ایک صدی پہلے اردو میں علم سائنس کی تعلیم	نصیرالدین ہاشمی	۲	۲	۱۵
۳۳	ایک کہانی چار شاعروں کی زبانی	نجیب اشرف ندوی	۱	۴	۴۳
۳۴	ایک مختلف فیہ مسدس	پروفسر سید محمد حسین	۸	۱	۲۸
۳۵	ایک نایاب قلمی بیاض	ابوالفضل سید محمود قادری	۷	۳	۳۳
۳٦	ایضاً	ایضاً	۷	۳	۵۵
۳۷	ایضاً	ایضاً	۸	۱	۵۳
۳۸	ایضاً	ایضاً	۸	۲	۵۹
۳۹	ایضاً	ایضاً	۸	۳	۴۱
۴۰	بادشاہ مدراسی	حامداللہ ندوی	۱	۳	۳۵
۴۱	ایضاً	ایضاً	۱	۴	۵۵
۴۲	باقر علی ترمذی	پروقسر محمد ابراہیم ڈار	۲	۳،۴	۱۰۳
۴۳	بام انشا پر شعرائے بہار کی پرواز	محمد بشیرالحق دسنوی	۸	۱	۳۵

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد	شمارہ	صفحہ
۴۴	بوہرے اور ان کا ادب	سلام حسین برہان پوری	۲	۲	۲۴
۴۵	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (نقدو تبصرہ)	قاضی عبدالودود	۹	۴	۵
۴۶	ایضاً	ایضاً	۱۰	۱	۵
۴۷	ایضاً	ایضاً	۱۰	۲	۴۴
۴۸	ایضاً	ایضاً	۱۰	۳	۵
۴۹	ایضاً	ایضاً	۱۰	۴	۵
۵۰	بہمنی ادب	ڈاکٹر سید محی‌الدین قادری زور	۱	۴	۴
۵۱	پروفسر محمد ابراہیم ڈار	مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی	۴	۳	۴۹
۵۲	تذکرۂ یوسف علی خاں	قاضی عبدالودود	۲	۲	۳
۵۳	ترجمۂ واگبھٹ و خیل‌نامۂ ہاشمی	سخاوت مرزا	۱۰	۴	۳۵
۵۴	جگ بیتی کیفی پر ایک نظر	مالک رام	۴	۴	۱۹
۵۵	جلال احمد آبادی	سید اکبر علی ترمذی	۲	۱	۵۳
	ایضاً	ایضاً	۲	۲	۵۰
۵۷	ایضاً	ایضاً	۵	۳	۵۶
۵۸	ایضاً	ایضاً	۵	۴	۲۶
۵۹	چینی زبان کے الفاظ قرآن میں	ڈاکٹر مہدی حسن	۴	۳	۸۱
۶۰	حافظ محمود شیرانی کا ایک خط	محمود شیرانی	۱	۱	۸۰
۱۶	حالی بحیثیت مصلح	منیژہ بانو	۳	۱	۶۰
۶۲	حالی اور ان کا تغزل	ایضاً	۴	۱	۱۸
۶۳	حسرت موہانی و مائل دہلوی	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	۱	۱	۵۸
۶۴	حضرت شاہ غلام حسین ایلچ پوری کی ایک نایاب مثنوی	ڈاکٹر نعیم الدین	۹	۲	۵۷
۶۵	حکیم روح اللہ	قاضی سید نورالدین شیرازی	۱	۲	۴
۶۶	ایضاً	ایضاً	۱	۳	۴

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد	شمارہ	صفحہ
۸۹	رافت سرہندی	مقیت الحسن	۱۰	۳	۵۹
۹۰	رونق بنارسی	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	۵	۴	۳۴
۹۱	ایضاً	ایضاً	۶	۱	۳۰
۹۲	ذوق کے بارے میں ایک ہم عصر اخبار کا تبصرہ	عابد رضا بیدار	۹	۳	۴۱
۹۳	سائل دہلوی	مالک رام	۳	۲	۴
۹۴	سرب سکھ دیوانہ	قاضی عبد الودود	۹	۳	۵
۹۵	ایضاً	ایضاً	۹	۴	۵۱
۹۶	سفینۂ ہندی	ایضاً	۸	۴	۵
۹۷	سنٹرل ریکارڈ آفس کی اردو قلمی کتابیں	نصیر الدین ہاشمی	۷	۲	۴۸
۹۸	ایضاً	ایضاً	۷	۳	۳۳
۹۹	سید شاہ فقیر محی الدین مقبل میسوری	محمد سخاوت مرزا	۵	۱	۸
۱۰۰	ایضاً	ایضاً	۵	۲	۵
۱۰۱	سید محمد حسینی الملقب بہ شاہ میر رائچوٹی	ایضاً	۴	۲	۲۴
۱۰۲	ایضاً	ایضاً	۴	۳	۶
۱۰۳	سیف طیب جی مرحوم	عبد الرزاق قریشی	۹	۱	۴
۱۰۴	صوفیائے گجرات کا ایک عجیب قلمی مجموعہ	سید مطیع اللہ راشد برہان پوری	۲	۳،۴	۲۸
۱۰۵	طالع یار خاں	سید جمیل الدین	۵	۴	۵
۱۰۶	عارف باللہ قاضی سید محمود بحری قدس سرۂ اور ان کی تصنیفات	سخاوت مرزا	۶	۳	۲۴
۱۰۷	ایضاً	ایضاً	۶	۴	۲۸
۱۰۸	ایضاً	ایضاً	۷	۱	۶
۱۰۹	غالب کی اخلاقی شاعری	پروفسر عبد القادر سروری	۱	۱	۱۴

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۱۰	غالب کی اخلاقی شاعری	پروفسر عبد القادر سروری	۱	۲	۳۳
۱۱۱	غالب کی مثنوی دعاے صباح کا مطبوعہ نسخہ	فضل اللہ فاروقی	۱	۲	۵۶
۱۱۲	غم بنگلوری	پروفسر عبد الغفور شکیل	۱۰	۴	۵۱
۱۱۳	فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا	قاضی عبد الودود	۸	۲	۵
۱۱۴	فانی بدایونی	قطب النسا ہاشمی	۴	۱	۳۳
۱۱۵	فہرست کتبخانۂ گارساں دتاسی	قاضی عبد الودود	۹	۱	۵
۱۱۶	قاصی احمد میاں اختر	عبد الرزاق قریشی	۶	۴	۷۱
۱۱۷	قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں	امتیاز علی عرشی	۹	۲	۲۵
۱۱۸	قطب مشتری میں گجراتی، کنڑ اور مرہٹی الفاظ	گرناتھ راج دیویکر	۳	۲	۶۵
۱۱۹	کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد	نصیر الدین ہاشمی	۳	۱	۲۳
۱۲۰	کتب خانۂ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ قدس سرہٗ	شیخ فرید الدین برہان پوری	۶	۴	۱۳
۱۲۱	کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہندی کتابیں	نصیر الدین ہاشمی	۱۰	۱	۴۱
۱۲۲	کشف الخلاصہ ـ فقیر کی فقہی مثنوی	پروفسر اس. اف. ادیب	۱۰	۴	۲۷
۱۲۳	کچھ انشا کے بارے میں	قاضی عبد الودود	۲	۱	۲۸
۱۲۴	ایضاً	ایضاً	۴	۴	۶
۱۲۵	کریمی لائبریری	حامد اللہ ندوی	۱	۱	۷۳
۱۲۶	کوکی کے اربعۂ عناصر	نجیب اشرف ندوی	۹	۲	۵
۱۲۷	کیفی (پنڈت)	عبد الرزاق قریشی	۷	۱	۵۵
۱۲۸	گجرات کی ایک غیر معروف اردو مثنوی	ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی	۱	۳	۸
۱۲۹	گجرات کی مذہبی مثنویاں	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۱	۱	۶۶
۱۳۰	ایضاً	ایضاً	۱	۲	۱۳

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۳۱	گجرات کی مذہبی مثنویاں	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۲	۱	۳
۱۳۲	ایضاً	ایضاً	۳	۳	۵
۱۳۳	ایضاً	ایضاً	۵	۳	۵
۱۳۴	گجراتی مسلمان اور گجری زبان	قاضی سید نور الدین حسین	۸	۳	۵۴
۱۳۵	گفتار ملک محمد	ضیاء الدین احمد ڈیسائی	۶	۳	۱۰
۱۳۶	گلشن بیجار	قاضی عبد الودود	۴	۲	۶
۱۳۷	لطائف السعادت (نقد و تبصرہ)	عبد الرزاق قریشی	۹	۳	۵۴
۱۳۸	لکھنؤ کا دبستان شاعری	وحید قریشی	۳	۴	۴۱
۱۳۹	مثنوی بلقیس و سلیمان مصنفہ نامی والا جاہی	سخاوت مرزا	۸	۲	۳۷
۱۴۰	مثنوی تحفۂ اعظم مصنفہ غلام علی کوکنی	ایضاً	۹	۳	۲۲
۱۴۱	مثنوی ریاض العارفین	ایضاً	۲	۳، ۴	۵۰
۱۴۲	مجمع علم و ہنر مدراس	ایضاً	۸	۳	۲۳
۱۴۳	محمد امین زبیری کی سوانح نگاری	نصیر الدین ہاشمی	۱	۳	۴۰
۱۴۴	محمود میاں رونق	پروفسر سید حسن	۵	۳	۳۳
۱۴۵	مختلف یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کاموں کی فہرست	—	۹	۴	۶۵
۱۴۶	مدراس میں اردو کا کچھ نیا مسالا	نصیر الدین ہاشمی	۸	۲	۱۹
۱۴۷	مرزا غالب اور امیر مینائی	قاضی احمد میاں اختر	۵	۴	۲۱
۱۴۸	ایضاً	مالک رام	۶	۱	۲۷
۱۴۹	مرزا غالب کا ایک شاگرد (میر فخر الدین حسین خاں سخن دہلوی)	قاضی احمد میاں اختر	۱	۳	۲۰
۱۵۰	مرزا غالب کے ایام میں نظام ڈاک	پروفسر مہیش پرشاد	۲	۱	۳۹
۱۵۱	مرزا مقیم مقیمی سلمی	پروفسر محمد اکبرالدین صدیقی	۸	۴	۴۴
۱۵۲	مرزا مقیم مقیمی سلمی	پروفسر محمد اکبرالدین صدیقی	۹	۱	۳۸

تبصرے

ا ۔ کتابیں

نمبر شمار	کتاب	مصنف	جلد	شمارہ	صفحہ
۲۰	باغ و بہار	میر امن	۹	۲	٦۳
۲۱	برگ سبز	ابومسلم صحافی	٦	۳	٦۴
۲۲	بستان المحدثین	(مرتبہ) مولانا عبدالسمیع	۹	۳	٦۳
۲۳	بیکار دن، بیکار راتیں	عزیز احمد	۲	۳،۴	۱۱۵
۲۴	پیام ساوتری	جگر بریلوی	٦	۱	۵۰
۲۵	پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو	(مرتبہ) سید ہاشمی فریدآبادی	۵	۲	۵۳
۲٦	پہلا پنج سالہ پلان	—	۵	۳	٦۵
۲۷	پیسہ اور پرچھائیں	ڈاکٹر محمد حسن	۷	۳	٦٦
۲۸	تاریخ ادبیات عربی	سید ابوالفضل	۷	۳	٦٦
۲۹	تاریخ مال کدہ	فیض الدین صدیقی	۷	۳	٦۴
۳۰	تاریخ مسلمانان پاکستان بھارت	سید ہاشمی فریدآبادی	۵	۲	۵۲
۳۱	تبلیغی دورے	قاری ودودالحئی ندوی	۷	۱	٦۲
۳۲	تحقیق الحراں	حکیم احمداللہ خاں دہلوی	۵	۳	٦۳
۳۳	تذکرۂ مرشدی	محبوب علی چیتا پوری	۹	۲	٦۸
۳۴	تری دنیا میں ہم	امیر علی امام	٦	۱	۵۱
۳۵	تصانیف جگن ناتھ آزاد	جگن ناتھ آزاد	۴	۱	۴۱
۳٦	تصویر جاناں	(مرتبہ) حمیدالدین شاہد	۹	۳	٦۱
۳۷	تلامذۂ غالب	مالک رام	۹	۳	۵۹
۳۸	تلخیص الاردو	(مرتبہ) سید ہاشمی فریدآبادی	۵	۲	۵۴
۳۹	تنقیدی اصول اور نظریے	حامداللہ افسر میرٹھی	٦	۱	۵۰
۴۰	ثنائے حبیب	بہزاد لکھنوی	٦	۳	٦۳
۴۱	ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو	۲	۲	۷۱
۴۲	جمہوریت اور مغربی تحریکیں	(مرتبہ) عبدالوہاب ظہوری	۲	۱	۷۳
۴۳	جوئے رواں	حامداللہ افسر میرٹھی	٦	۳	٦۲
۴۴	حسرت کی سیاسی زندگی	سید عبدالقوی دسنوی	۷	۳	٦۴

نمبر شمار	کتاب	مصنف	جلد	شمارہ	صفحہ
۴۵	حسرت موہانی	(مرتبہ) عبدالشکور	۵	۴	۶۰
۴۶	حضرت عثمان صرف تاریخ کی روشنی میں	(مترجمہ) عبد الحمید نعمانی	۹	۲	۶۴
۴۷	حیات ز، خ، ش	انیسہ ہارون بیگم شروانیہ	۶	۴	۷۸
۴۸	حیات وحید الزماں	محمد عبد العلیم چشتی	۹	۴	۶۰
۴۹	چندر بدن و مہیار	(مرتبہ) اکبرالدین صدیقی	۹	۳	۶۲
۵۰	چند نظمیں	پنڈت کیفی	۶	۲	۵۹
۵۱	خدائی وعدہ	(مترجمہ) معراج احمد	۹	۴	۶۰
۵۲	دکھنی ہندو اور اردو	نصیرالدین ہاشمی	۹	۴	۵۸
۵۳	دل رسوا	اختر انصاری	۶	۳	۶۴
۵۴	ذکر غالب	مالک رام	۶	۲	۵۹
۵۵	رباعیات الہام	ڈاکٹر آر۔آر۔ سکسینہ	۶	۲	۶۰
۵۶	رخسار سحر	کریم قدوائی	۷	۱	۶۳
۵۷	رضوان شاہ و روح افزا	(مرتبہ) سید محمد	۹	۳	۶۱
۵۸	رموز نظم	طالب مطاہری	۷	۳	۶۶
۵۹	روشنی کے مینار	جیلانی بانو	۹	۳	۵۹
۶۰	ریڈیوں کا بادشاہ، حکیم بابا	علی عباس حسینی	۷	۱	۶۳
۶۱	زینب ساحرہ	وحشی محمودآبادی	۷	۱	۶۳
۶۲	سچ کا پجاری	پرکاش پنڈت	۵	۴	۵۹
۶۳	سراپائے رسول	اعجازالحق قدوسی	۵	۴	۵۹
۶۴	سروش ہستی	شاد عظیم آبادی	۸	۳	۶۶
۶۵	سفینۃ النجات فی احوال جہارات	غلام غوث خاں	۵	۳	۶۳
۶۶	سیرت مولانا عبدالولی جون پوری	مولانا ابوالبشر جون پوری	۳	۱	۷۷
۶۷	سیرت مولانا کرامت علی جون پوری	مولانا عبدالباطن جون پوری	۳	۱	۷۷
۶۸	شبلی کی حیات معاشقہ	ڈاکٹر وحید قریشی	۲	۱	۷۲
۶۹	صحت حسن و مسرت	انوارالرحمن	۸	۴	۶۳

نمبر شمار	کتاب	مصنف	جلد	شمارہ	صفحہ
۷۰	صحیفتہ الغزل	صفی لکھنوی	٦	۳	٦۳
۷۱	طالب و موہنی	(مرتبہ) ڈاکٹر زور	۹	۱	٦۰
۷۲	طب فریدی	فرید الدین	۵	۳	٦۳
۷۳	طور رخشاں	(مرتبہ) طرفہ قریشی	۵	۴	٦۰
۷۴	عروس نیل	سلطانہ فیضی	٦	۴	۷٦
۷۵	علامۂ اقبال	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۸	۳	٦٦
۷٦	علی گڈھ	محمد امین زبیری	۲	۲	۷۱
۷۷	عورت اور اسلامی تعلیم	مالک رام	۳	۳	٦۹
۷۸	فردوسی ہند	صفدر آہ	۹	۴	٦۱
۷۹	فکر و ادب	دیوندر داس	۹	۳	٦۰
۸۰	فن شاعری	اخلاق دہلوی	٦	۱	۵۰
۸۱	فنون لطیفہ بہ عہد اورنگ زیب	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	۹	۱	٦۱
۸۲	قیامت صغریٰ	محبوب خاں طرزی	۷	۱	٦۳
۸۳	کارواں چلتا رہا	ریاض رؤفی	٦	۱	۵۱
۸۴	کپتان کا گڈا	(مترجمہ) حنیف رامے	۹	۲	٦۳
۸۵	گریہ و تبسم	صفیہ شمیم ملیح آبادی	۵	۱	٦۳
۸٦	لکھنؤ اور جنگ آزادی	———	۹	۲	٦٦
۸۷	مختصر تاریخ ہند	(مترجمہ) محمد یوسف کوکن	٦	۲	۵۸
۸۸	مستقبل کی تعمیر	———	۷	۱	٦۲
۸۹	مسدس بے نظیر	میر یار علی جان صاحب	۲	۱	۷۲
۹۰	مسئلۂ سود (حصہ دوم)	مولانا ابوالعلا مودودی	۴	۳	۸۷
۹۱	مشاہیر اسلام	ڈاکٹر حسن ابراہیم	۷	۱	٦۲
۹۲	مضمون نگاری (جلد اول)	اخلاق دہلوی	۳	۱	۷۹
۹۳	مطالعۂ غالب	اثر لکھنوی	۳	۳	٦۹
۹۴	معارف القرآن	ڈاکٹر محمد احمد صدیقی	۷	۳	٦۵

نمبر شمار	کتاب	مصنف	جلد	شمارہ	صفحہ
۱۱۸	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	۸	۴	٦۲
۱۱۹	یادگار فرحت	(مرتبہ) ڈاکٹر ، غلام یزدانی	۳	۱	۷٦

ب ۔ رسالے

نمبر شمار	رسالہ	جلد	شمارہ	صفحہ
۱	آج کل (ابوالکلام نمبر)	۹	۴	٦۳
۲	« (کشمیر نمبر)	٦	۴	۸۰
۳	ادب لطیف (سالنامہ)	۵	۳	٦۷
۴	البلاغ (سعور نمبر)	۷	۱	٦۴
۵	چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر)	۹	۴	٦۲
٦	ساقی (سالنامہ)	۷	۳	٦۸
۷	سویرا (خاص نمبر)	۵	۳	٦٦
۸	سویرا	۹	۱	۵۲
۹	شاعر (افسانہ نمبر)	٦	۱	٦۲
۱۰	شاعر (مشاعرہ نمبر)	۲	۱	۷۳
۱۱	شعلہ و شبنم	۱	۴	۷۱
۱۲	علی گڑھ میگزین (طنز ظرافت نمبر)	۵	۱	٦۳
۱۳	فاران (سیرت نمبر)	۷	۱	۲۵
۱۴	فانوس خیال	۹	۱	٦۲
۱۵	فیض الاسلام	۱	۴	۷۲
۱٦	فیض الاسلام (سیرت نمبر)	۷	۱	٦۵
۱۷	کاروان ادب	۱	۴	۷۲
۱۸	«	۷	۱	٦۴
۱۹	کریسنٹ	۱	۴	۷۱
۲۰	محمد حسن کالج میگزین (سہیل نمبر)	۵	۲	۵٦
۲۱	مشرب (سالنامہ)	٦	۱	۵۲
۲۲	مقام رسالت	۸	۴	٦۴
۲۳	نقوش (مکاتیب نمبر)	۹	۲	٦۵

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب، بمبئی

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱
نوعیت اشاعت	:	سہ ماہی
نام پرنٹر	:	حامد اللہ ندوی
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	۲، مسینا بلڈنگ، کلیر روڈ، بمبئی ۸
نام پبلشر قومیت پتہ	}	ایضاً
نام ایڈیٹر	:	نجیب اشرف ندوی
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	اندھیری، بمبئی ۶۹
نام، پتہ مالک رسالہ	:	انجمن اسلام ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی

میں حامد اللہ ندوی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

مقالـــه نمـا

مرتبین:

ڈاکٹر عالی جعفری، عبد القوی دسنوی، عبد الستار دلوی، علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱ آفتاب احمد خاں

تحت الثریٰ

(نقش الاسلام ۶۰ ستمبر ۲۹۔۳۱)

زمین کی اندرونی ساخت وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحت الثریٰ پر روشنی ڈالی ہے۔

۲ اجمل خاں

تحقیق معنی «العالمین»

(برہان ۶۰ اگست ۸۔۹۳)

قرآن میں آنے والے لفظ «العالمین» کے مختلف معنوں سے تحقیقی گفتگو کی ہے۔

۳ احمد حسین کمال

اشتراکی فتنے کا مقابلہ

(الفرقان ۶۰ ستمبر ۲۵۔۳۰)

الفرقان ۶۰ اگست میں اشتراکیت کے خطرات سے متعلق مولانا محمد اسحق سندیلوی کا مضمون چھپا تھا موجودہ مقالہ اس کی ہم نوائی کر رہا ہے۔

۴ اسرار احمد

مذہب کا عقلیاتی تصور

(تعمیر انسانیت، لاہور۔ ۶۰ جولائی ۱۷۔۲۰)

مذہبی عقائد کو تمامتر عقل کی کسوٹی پر کسنا غلط اور وجدانی ذریعہ علم سے کام لینا ضروری ہے

۵ اصلاحی، امین احسن

اسلامی قومیت کے عوامل

(میثاق ۶۰ جولائی اگست)

مذکورہ مضمون کی دوسری اور تیسری قسط۔

۶ اصلاحی، ضیاءالدین

خانۂ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

(میثاق ۶۰ جولائی ۳۲ اگست، ستمبر)

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب تفصیل کے ساتھ۔ پہلی دوسری اور تیسری قسط

۷ امام الدین ابومحمد

ہندو مذہب کے بعض اہم اور مستند معلومات

(زندگی رام پور ۶۰ اگست ۱۲۔۲۹)

تیسری قسط درج ہے

۸ امینی، محمد تقی

اجتہاد

(معارف ۶۰ جولائی اگست)

مذکورہ مضمون کی تیسری اور چوتھی قسط

۹ امینی، محمد تقی

فقہ کی جدید تدوین

(برہان ۶۰ ستمبر ۱۵۱،۱۶۴)

معاشرتی حالت اور ضبط وانگیر کے

تعلق کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ موجودہ حالت میں کس درجہ کی « تدوین » قابل قبول ہوسکتی ہے اور اس کا نقشہ کیا ہونا چاہئے۔

۱۰ بختیار کاکی محمد قطب‌الدین

بزم عرفان۔ شیخ منیر کے ایک الہامی مکتوب کا آزاد ترجمہ

(برہان ۶۰ جولائی ۲۶۔۳۶)

شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے ایک مکتوب کا آزاد ترجمہ ہے جس میں عقل کی کم اندیشیوں اور نفس کی خود فریبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۱ چشتی عبدالحئی

اسلامی فکر میں وحدۃ الوجود کا نظریہ

(معارف ۶۰ جولائی ۵۹۔۶۸)

معارف میں اس سے قبل اس عنوان سے ایک مقالہ چھپا تھا جس کی بحث سے موجودہ مقالہ نگار کے نزدیک غلطیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے انہیں کے ازالہ کی یہاں پہلی قسط درج ہے۔

۱۲ چشتی عبدالحئی

اسلامی فکر میں وحدۃالوجود کا نظریہ

(معارف ۶۰ اگست ۱۴۷۔۱۵۴)

دوسری قسط درج ہے۔

۱۳ شمس پیر زادہ

امت کو وصیت

(زندگی رامپور ۶۰ ستمبر ۱۶۔۲۱)

آن حضرت کی ایک نصیحت درج ہے کہ ان کے بعد لوگ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں اور بدعات سے بچیں۔ اسی سے متعلق ضروری باتیں درج ہیں۔

۱۴ شہیداللہ ڈاکٹر

حدیث کی صداقت

(چراغ راہ ۶۰ ستمبر ۱۶۔۱۸)

حدیث کی صداقت کے لئے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔

۱۵ صغیر احمد

قرآن اور عام حدید

(برہان ۶۰ ستمبر ۱۷۹۔۱۸۶)

ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب « قرآن اور علم جدید » کا تعارف و تبصرہ درج ہے۔

۱۶ عنایتی رفیع اللہ

اسلامی قانون ۔مولانا آزاد کی نظر

(برہان ۲۰ اگست ۱۱۷۔۱۲۲)

اسلامی قانون سے متعلق مولانا آزاد کے خیالات پیش کئے ہیں۔

۱۷ عبدالعلیم ڈاکٹر

البیان فی اعجازالقرآن

(معارف ۶۰ ستمبر ۲۱۹ ۲۲۰)

معارف بابت جون ۶۰ء میں خطابی کے « البیان فی اعجاز القرآن پر شائع شدہ تبصرہ سے متعلق چند معلومات درج ہیں۔

۱۸ عبدالغفار حسن

معارف و مزامیر کا شرعی حکم

(میثاق ۶۰ جولائی ۲۲-۳۱)

گانے بجانے کی حلت کے خلاف اس کی حرمت کے سلسلے میں تیسری قسط درج ہے۔

۱۹ عتیق الرحمن سنبھلی

وصیت ابراہیمی

(الفرقان ۶۰ جولائی ۷-۱۰)

طریق ابراہیمی سے متعلق مختصر تذکرہ درج ہے۔

۲۰ فریدی نسیم احمد

تجلیات مجدد الف ثانی مکتوب کے آئینہ میں

(الفرقان ۶۰ جولائی ۱۹-۲۶)

۱۸۹ - ۱۹۴ خط درج ہیں ان خطوط میں دینی اور مذہبی مسائل سے متعلق مجددالف ثانی کے خیالات درج ہیں

۲۱ فریدی، نسیم احمد

تجلیات مجدد الف ثانی — مکتوبات کے آئینے میں

(الفرقان ۶۰ اگست ۱۷-۲۶)

مذہبی مسائل سے متعلق مجدد الف ثانی کے آٹھ خطوں سے معلومات فراہم کی ہیں۔

۲۲ فریدی، نسیم احمد

تجلیات مجدد الف ثانی مکتوبات کے آئینے میں

(الفرقان ۶۰ ستمبر ۱۸-۲۷)

مختلف لوگوں کے نام سات خطوط ہیں جن میں مختلف دینی امور سے متعلق گفتگو کا ترجمہ و خلاصہ درج ہے۔

۲۳ قادری، سید احمد عروج

انسان کا اخلاقی وجود — مکارم اخلاق کی تکمیل

(زندگی رام پور ۶۰ ستمبر ۲۹-۴۷)

(۵۹ء ستمبر سے مسلسل) چھٹی قسط درج ہے۔

۲۴ کبیر احمد جائسی

حدیث نبوی اور مولانا عبدالسلام ندوی

(نگار جولائی ۶۰-۴۱-۴۸)

مولانا عبدالسلام ندوی نے انتقال سے کچھ دنوں پہلے حدیث نبوی سے متعلق ایک رسالہ مرتب کیا تھا جس میں حدیث نبوی سے متعلق انہوں نے اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا تھا۔ مضمون نگار نے اس رسالہ کا تعارف پیش کیا ہے۔

۲۵ منظور احسن عباسی

قرض وربا

(ثقافت لاہور ۶۰ اگست)

قرض وربا سے متعلق آیات و احادیث پر بحث کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ بنک انٹرسٹ ربا کے حدود میں نہیں آتا اس لئے وہ جائز ہے۔

۲۶ مودودی، ابوالاعلے

قرض و ربا - مذاکرہ سود [۲]

(ثقافت لاہور ۶۰ ستمبر)

نزول قرآن کے زمانہ میں تجارتی صنعتی، زراعتی اور ریاسی اعراض کے لئے قرض کا جو لین دین ہوتا تھا اس

کی نوعیت بیان کرنے کے بعد مختلف عقلی و نقلی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کمرشیل انٹرسٹ بہر حال سود ہے اور ناجائز .

۲۷ مودودی ، سید ابوالا علیٰ

سنت کی آئینی حیثیت

(ترجمان القرآن ۶۰ جولائی ۲۷-۵۵)

سنت کی آئینی حیثیت کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالودود (بزم طلوع اسلام) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مراسلت درج ہے .

۲۸ ندوی ، فضل قدیر

ماں باپ اور اہل قرابت کا حق

(بعث الاسلام ۶۰ اگست ۱۳-۱۸)

ماں باپ اور اہل قرابت کے حقوق کے بیان میں تفسری و تشریحی معلومات

۲۹ ندوی ، فضل قدیر

عہد اور قسم

(بعث سلام ۶۰ ستمبر ۱۳-۱۶)

عہد اور قسم سے متعلق تفسیر

۳۰ ندوی ، محب اللہ

اسلامی قانون اور عرف دعادت

(معارف ۶۰ ستمبر ۱۶۵-۱۸۷)

اسلامی قانون اور رسم رواج کی نوعیت و اہمیت کسے بیان کی پہلی قسط .

۳۱ وحید الدین خاں

مسرل کی طرف

(زندگی رام پور ۶۰ اگست ۳۰-۴۰)

آریہ سماج (الہ آباد) کی گولڈن جبلی کے موقع پر ۲۰ مئی سنہ ۶۰ء کو سرودھ سمیلن کے پروگرام کے لئے یہ مقالہ اس کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا کہ «مانو وکاس کے لئے آپ کے ہی دھرم کو ماننا کیوں آوشیک ہے »

۳۲ ابو علی

الہلال مورخہ ۱۳ ، اگست سنہ ۱۹۱۳ کا

اداریہ مشہد اکبر نمبر

اور مولانا سید سلیمان ندوی

(ماران کراچی ۶۰ ستمبر)

مختلف داخلی اور شہادتوں کو مدد سے ثابت کیا ہے کہ مذکورہ اداریہ سید سلیمان ندوی کا لکھا ہوا تھا

تذکرہ و سیرت نگاری

۳۳ ابولقاسم دلاوری

یحیی ابن فارس ساباطی

(تعمیر انسانیت ، لاہور ، ۶۰ جولائی ۲۹-۳۲)

بتایا ہے کہ یحیی ساطی ، جو خلیفہ معز کے دور خلافت میں مسیح موعود ہونے کا مدعی تھا ، کس طرح شعبدوں سے لوگوں کو دھوکا دیا کرتا تھا.

۳۴ ابوالقاسم دلاوری

مومن خاں اُچی

(تعمیر انسانیت ، لاہور ، ۶۰ اگست ۱۸-۲۰)

بابی پیشوا مومن خان اچی کے حالات
درج ہے

۳۵ ادارہ

حضرت نوفل بن حارث
(بیص الاسلام ۶۰ اگست ۲۹۔۳۰)
ابو حارث نوفل کے مختصر حالات .

۳۶ ادارہ

مولانا رشید احمد گنگوہی
(بیص الاسلام ۶۰ اگست، ستمبر)
مضمون کی پانچویں اور چھٹی قسط
درج ہے .

۳ـ ادارہ

حصرت طلیب بن عمیر
(بیص الاسلام ۶۰ ستمبر ۲۵۔۲۶)
ابو عدی طلیب بن عمیر کا مختصر
تدکرہ .

۳۸ ادارہ

مولانا مسعود عالم ندوی کے خطوط
(فاران کراچی ۶۰ اگست)
جناب وحید قیصر ندوی کے نام مولانا
مسعود عالم کے چار خطوط جو زیادہ تر
ذاتی نوعیت کے ہیں .

۳۹ اصلاحی، ضیاءالدین

امام ابن ماجہ اور ان کی سنن
(معارف ۶۰ جولائی ۵۰۔۵۸)
دوسری قسط درج ہے .

۴۰ اکمل یزدانی

مہسوں (پورنیہ) میں قدیم صوفیاے کرام
کے مزارات
(اشارہ، پٹنہ ۶۰ ستمبر ۳۷۔۴۲)
مہسوں کے تین بزرگان دین حضرت
تقی الدین سہروردی مہسوی، شیخ سلیمان
مہسوی اور حضرت مخدوم حسین غریب
پوش کے حالات کا سرسری تذکرہ کیا
گیا ہے .

۴۱ انوار الحسن

مولانا ذو الفقار علی
(بیص الاسلام ۶۰ ستمبر ۳۳۔۴۲)
مولانا محمود حسن عثمانی اسیر مالٹا
کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی عثمانی
کی مختصر سیرت اور کارناموں کا مختصر
تذکرہ ہے .

۴۲ خالد کمال (مرجم)

سمان محمد عبد اللہ
ابن موسیٰ خوارزمی
(برہان ۶۰ ستمبر ۱۷۳۔۱۷۸)
سلیم الجبر کے موجد، بانی اور موسس
محمد بن موسیٰ بن شاکر خوارزمی کے
فضل و کمال کا تذکرہ درج ہے .

۴۳ سعید احمد، اکبر آبادی

مولانا مطلوب الرحمن عثمانی
(برہان ۶۰ اگست ۶۶۔۶۸)
دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان کے
لائق و فایق فرد زبردست عالم اور پاکباز
دیندار آدمی تھے . ۱۷ جولائی ۶۰ء کو
انتقال فرمایا .

۴۴ شفیقی عہدی پوری

لاوزی اور لاوزیت

(ثقافت لاہور ٦۰ ستمبر)

ایک چینی مفکر لاوری کے حالات زندگی اور اس کے افکار کا تجزیہ۔

۴۵ صابر عبدہ ابراہیم

خطیب اول! سیدنا ابوبکر صدیق رض

(تعمیر انسانیت، لاہور ٦۰ اگست، ستمبر ۱۱-۱۷ اور ۲۵-۲۸)

سیدنا ابوبکر صدیق رض کی اسلامی زندگی کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔

(باقی)

۴٦ طالب محمد عباس

(نگار جولائی ٦۰ • ٦۷-۷۰)

صوفی فلاسفہ

اسلام کے صوفی فلاسفر اور ان کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۷ طالب محمد عباس صموی

(نگار ٦۰ • اگست ۱۳-۱٦)

صوفی فلاسفہ

امام غزالی

امام غزالی کی شخصیت اور فکر و خیال پر اظہار خیال کیا ہے۔

۴۸ طالب محمد عباس

صوفی فلاسفہ

(نگار ٦۰ • دسمبر ۳۸-۳۹)

شیخ المقتول کے متصوفانہ خیالات پر اظہار خیال کیا ہے۔

۴۹ عبدالحق، ڈاکٹر

(قومی زبان ٦۰ • اگست ۵-٦)

یادوں کے چراغ

ایام طالب علمی سے متعلق مختلف یادوں کا ذکر کیا ہے

۵۰ عبدالقوی دسنوی

(مہر نیمروز ٦۰ • اگست ۱۰-۳۰)

حیات سلیمان کی چند جھلکیاں

علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیا ہے۔

۵۱ غوری، شبیر احمد

(ثقافت لاہور ٦۰ • اگست)

فارابی کے سیاسی افکار

فارابی کے عہد کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد اس کے سیاسی افکار کا تجزیہ کیا ہے۔

۵۲ غوری، شبیر احمد

(معارف ٦۰ • ستمبر ۸۸-۲۰۰)

البرونی کی یادگار جلد پر ایک نظر دوسری اور آخری قسط ہے

۵۳ فاضل زیدی

تحقیق خاندان داغ

(پگڈنڈی امرتسر ٦۰ ستمبر)

لاڈلی بیگم داغ کی صاحبزادی (بیگم نواب سائل) کے بیانات کی روشنی میں خاندان داغ کے متعلق معلومات فراہم کئے ہیں۔

۵۴ فرحت اللہ بیگ

(پگڈنڈی امرتسر ۶۰ء اگست ۱۵-۱۸)
میری داستان
مرزا فرحت اللہ بیگ کی غیر مطبوعہ حود نوشت سوانح عمری کا ایک ورق. اس حصہ میں گلبرگہ کی سیشن ججی کا تذکرہ ہے.

۵۵ قاضی اطہر
امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی
(معارف ۶۰ء اگست ۱۱۹-۱۳۲)
ان کا نام اسرائیل تھا اور ان کے والد کا نام موسیٰ تھا مگر باپ کی کنیت سے مشہور ہیں. صاحب الحسن ہندی کے لقب سے بھی کتابوں میں ذکر آتا ہے. تبع تابعین میں سے ہیں اور زبردست عالم و محدث تھے.

۵۶ قاضی اطہر
امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی
(معارف ۶۰ء ستمبر ۲۱۱-۲۱۸)
دوسری قسط درج ہے.

۵۷ ماہ منیر خاں
شیر شاہ
(اشارہ پٹنہ ۶۰ء ستمبر ۳۳-۳۵)
حالات زندگی اور کارناموں کا مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے.

۵۸ ندوی، سید سلیمان
مکاتیب سلیمانی بنام مولانا ظفر احمد عثمانی
(معارف ۶۰ء جولائی ۶۹-۷۶)
دوسری قسط ہے جس میں چھہ خط ہیں. ان میں بھوپال اور تھانہ بھون وغیرہ سے متعلق معلومات ملتی ہیں.

۵۹ ندوی، سید سلیمان
مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم دیسنوی
(معارف ۲۲۲-۲۳۲)
آٹھ خط ہیں. ان میں خانگی زندگی کے علاوہ دارالمصنفین، ندوہ وغیرہ سے متعلق معلومات ملتی ہیں.

۶۰ وحید قیصر ندوی
حضرت شاہ علی بغدادی
(ثقافت لاہور ۶۰ اگست)
حضرت شاہ علی بغدادی کے حالات زندگی جو سولھویں صدی عیسوی میں بنگال میں آکر آباد ہو گئے اور تبلیغ دین فرماتے رہے.

۶۱ یوسف، محمد
ابن خلدون
(فاران کراچی ۶۰ ستمبر)
ابن خلدون کے حالات زندگی اور اس کی سیاسی و علمی خدمات کا تذکرہ

تاریخ و سیاسیات

۶۲ برہم ناتھ دت
نپولین اعظم ـــ ایک عظیم فاتح

(فیض الاسلام ۶۰ ، اگست ۴۱-۴۹)

چوتھی قسط درج ہے۔

۶۳ تمکین مہر افروز

الجزائر

(چراغ راہ ۶۰ ، ستمبر ۱۹-۲۲)

جنگ آزادی کی چند جھلکیاں پیش کی ہیں۔

۶۴ ثروت خاں

ممالک اسلامیہ میں شہروں کا ارتقاء

(چراغ راہ ۶۰ ستمبر ۷-۱۵)

اسلامی ممالک کے شہروں سے متعلق اعداد و شمار وغیرہ فراہم کئے ہیں۔

۶۵ خلیق احمد نظامی

عہد اورنگ زیب کی ایک اہم تاریخی دستاویز

(نگار ۶۰ ستمبر ۶-۱۶)

عہد اورنگ زیب کے فرانسیسی سیاح برنئیے کے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۶۶ شام لعل

گولکنڈہ کے ہیرے

(ہندوستانی ادب، حیدرآباد ۶۰ جولائی ۱۷-۲۰)

ہیرے کی کانوں، تجارت اور مشہور ہیروں کے بارے میں مختصر، تحقیقی مقالہ ہے (ماخوذ از آندھرا پردیش)

۶۷ عابد، سید امیر حسن ڈاکٹر

آج کے ایران کا سماجی اور انقلابی ادب

(صبا، آزادی نمبر ۱۴-۲۲)

جدید ایران کے سماجی اور انقلابی ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۶۸ غوری بشیر احمد خاں

بیرونی یادگار جلد پر ایک نظر

(معارف ۶۰ اگست ۱۰۶)

البیرونی کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والی یادگار جلد کے مسامحات سے بحث کی ہے۔ (جاری)

۶۹ فارق خورشید احمد

تاریخ الردۃ

(برہان ۶۰ جولائی اگست ستمبر)

مضمون کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں قسط۔

۷۰ قاضی اطہر

ہندوستان اور عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات

(ہندوستانی ادب، حیدرآباد، ۶۰ جولائی اگست ۹ سے ۱۶ اور ۹ سے ۱۳)

حال ہی میں حکومت کویت نے قاضی رشید ابن زبیر کی نایاب کتاب «الذخائر والتحف» شائع کی ہے۔ مضمون نگار نے اس کتاب سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے ہندوستان اور اسلامی عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ ماخوذ از معارف

۷۱ محمد عاصم

ارض القرآن کا سفر

(ترجمان القرآن ۶۰ جولائی ۵۶-۶۴)

۲ - بحرین سے جز تک کے سفر کے

حالات درج ہیں۔

۷۲ محمد عاصم

ارض القرآن کا سفر

(ترجمان القرآن ۶۰ ستمبر ۳۳-۵۱)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں کے سفر حج کے کوائف کی چوتھی جلد ہے جو ریاض سے متعلق ہے۔

۷۳ نذیر احمد

نادر العصر استاد احمد معمار تاج محل کے خاندان کے مصنفین کے مخطوطے علی گڑھ میں

(اورینٹل کالج ۶۰ مئی ۱-۹)

استاد احمد معمار تاج کے خاندان کے مصنفین کے مخطوطوں کا تعارف پیش کیا ہے جو علی گڑھ میں موجود ہیں۔

۷۴ نذیر احمد

محمود شاہ تغلق کے ایک فرمان کی بابت آزاد بلگرامی کی شہادت

(فکر و نظر، علی گڑھ، ۰ جولائی ۸۵ - ۹۶)

محمود شاہ تغلق کے ایک فرمان کی بابت «مآثرالکرام» سے آزاد بلگرامی کی شہادت پیش کرتے ہوئے اس سے تاریخی نتائج اخذ کئے ہیں۔

۷۵ نذیر احمد

ورقۂ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر

(فکر و نظر علی گڑھ، ۶۰ جولائی ۳۳ - ۵۸)

محمود پسیخانی نے ۸۰۰ھ میں نقطوی مذہب کی بنیاد ایران میں ڈالی۔ یہ مذہب ایران اور ہندوستان کی بعض اہم تحریکوں پر اثر انداز ہوا ہے۔ مضمون نگار نے اس مذہب کا مختصر تحقیقی جائزہ لیا ہے۔

تنقید ادب لسانیات

۷۶ ابواللیث صدیقی

حضرت احسن مارہروی کا علمی ذوق

(قومی زبان، ۶۰، اگست ۱۰ - ۱۳)

احسن مارہروی کے علمی ذوق پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۷ اعزاز نقوی

اختر شہنشاھی

(سب رس، حیدرآباد ۶۰، جولائی ۶ - ۱۰)

اختر شہنشاھی انیسویں صدی کی اردو صحافت پر ایک نادر کتاب ھے۔ مضمون نگار نے کتاب اور اس کے مصنف اشرف نقوی کا تعارف کراتے ہوئے کتاب کی اہمیت بتائی ھے۔

۷۸ اختر علی تلہری

بیخود موہانی مرحوم کی غزلیں

(فروغ اردو، ۶۰، ستمبر ۱۷ - ۲۵)

بیخود کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا ھے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے

نغمے انہیں بولوں میں ترتیب دئے ھیں جو اردو زبان ہی خاصے کی چیزیں ھیں۔

۷۹ ادارہ

طرزی نمبر

(فروغ اردو لکھنؤ، جولائی، اگست، ۶۰ء)

خان محبوب طرزی کے فن اور زندگی پر مختلف ادیبوں نے روشنی ڈالی ھے۔

۸۰ ارشد کاکوی

مکتوبات نیاز

(ندیم ڈھاکہ، ۶۰ء ستمبر ۴۱ - ۵۱)

مکتوب نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے نیاز کے مکتوبات کا جائزہ لیا گیا ھے۔

۸۱ اسحاق ایوبی

ملیالم کا ادب

(ہندوستانی ادب، حیدرآباد، ۶۰ء جولائی ۲۱ - ۲۳)

ملیالم ادب کے دورِ جدید کے ادیبوں اور موپلے مسلمانوں کے ادب کا سرسری تعارف کرایا ھے۔

۸۲ اسلوب احمد

فکر اقبال

(فکر و نظر، علی گڈھ، ۶۰ء جولائی ۱۰۱ - ۱۱۶)

خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب فکر اقبال پر تبصرہ۔

۸۳ اشرف علی

گنج خوبی۔ مولفہ میر امن

(قومی زبان، ۶۰ء اگست ۲۶ - ۳۸)

میر امن کی ایک نایاب تصنیف «گنج خوبی» کا تعارف ہے۔ جو ملا واعظ کاشفی کی مشہور فارسی کتاب اخلاقِ محسنی کا کامیاب اردو ترجمہ ھے

۸۴ اکبر الدین صدیقی

جگر کی عظمت

(سب رس حیدر آباد، ۶۰ ستمبر ۵-۶)

جگر کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کیا ہے۔

۸۵ اکبر علی

غالب کا ایک شعر

(مہر نیمروز ۶۰ جولائی ۲۴)

غالب کے شعر

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں، الخ کی تشریح پیش کی ہے

۸۶ امجد الطاف

ہمارے رومانی انشاء پرداز

(قومی زبان کراچی ۶۰ ستمبر ۲۲-۲۷)

یہ مضمون اردو کے رومانی انشاء پرداز (Essayist) کا ایک مطالعہ ہے۔

۸۷ امرت رائے

ہئیت اور مواد

(صبا آزادی نمبر ۷-۱۰)

فن پاروں میں مواد اور ہئیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۸۸ پیٹر ایولوی

اقبال اور تصوف ایران

(قومی آواز کراچی ۶۰ جولائی ۱۵-۱۷)

اس مضمون میں اقبال کے کلام میں تصوف پر بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے

که اقبال نے صرف ایران کے بڑے بڑے صوفیوں کے فلسفۂ محبت کی تعبیر و توضیح و تشہیر نہیں کی بلکہ وہ آج کی دنیا میں مذہب کی قوت اور اثر کے بڑے بڑے حامیوں میں سے تھے۔

۸۹ تبسم کاشمیری

سنہ ۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں لاہور میں

(قومی زبان ۶۰ جولائی ۱۲-۱۴)

لاہور کی قدیم دو ڈرامہ کمپنیوں کا تعارف پیش کیا ہے۔

۹۰ تبسم کاشمیری

سر سید احمد خان کے دو خط

(قومی زبان کراچی ۶۰ ستمبر، اکتوبر ۱۳-۱۵)

سنہ ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۴ء کو لاہور کے دو اخبار «وفا دار» اور «ملاں دو پیارہ» میں سر سید کے دو خط شائع ہوئے تھے۔ مضمون نگار نے ان خطوں کو منظر عام پر پیش کیا ہے۔

۹۱ تقی سید محمد

آزاد: تہذیب کہن کا عکاس

(ماہ نو کراچی ۶۰ جولائی ۱۷-۱۸)

آزاد کے ادب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس نے ماضی کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ اور ادبی روایات کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے ادبی رجحانات کو زندگی کے متغیر تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

۹۲ جعفر طاہر

حالی جادو بیان

(قومی زبان کراچی ۶۰ جولائی ۹-۱۱)

مضمون نگار نے حالی کی زندگی و شاعری کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔

۹۳ جعفر طاہر

محمد حسین آزاد

(قومی زبان ۶۰ جولائی ۱۵-۱۷)

محمد حسین آزاد کی حیات اور ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔

۹۴ جعفر طاہر

شعلۂ مستعجل — منصور احمد ندیم

(قومی زبان ۶۰ اگست ۱۸-۱۹)

منصور احمد ندیم کے مختصر حالات زندگی اور انتخاب کلام پیش کیا ہے۔

۹۵ جعفر طاہر

ایک خوش گو شاعر — میاں محمد شاہ دین ہمایوں

(قومی زبان ۶۰ اگست ۳۶-۲۱)

شاہ دین ہمایوں کے مختصراً حالات زندگی اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۹۶ جعفر طاہر

آغا حشر کی شاعری

(قومی زبان کراچی ۶۰ ستمبر ۱۱-۱۲)

حشر کی زندگی و شاعری مختصر سا مضمون ہے

۹۷ حمید عظیم آبادی
شاد کی ایک غزل
(مہر نیمروز ۶۰ جولائی ۱۷-۲۳)
شاد کی ایک غزل کی تشریح پیش کی ہے۔

۹۸ حمید الدین شاہد
لچھمی نارائن شفیق اور انکی مثنوی تصویر جاناں
(سب رس، ۶۰ حیدر آباد ۷-۱۵)
لچھمی نارائن شفیق کا تعارف کراتے ہوئے ان کی مثنوی تصویر جاناں پر تبصرہ کیا ہے

۹۹ خلیق احمد
نہج البلاغۃ
(فکر و نظر علیگڈھ ۶۰ جولائی ۱۰۵-۱۰۸)
نہج البلاغۃ کا ایک نسخہ جو ۵۳۸ ھ میں نقل کیا گیا ہے، مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مضمون نگار نے کتاب اور جامع کتاب کا تعارف کرایا ہے۔

۱۰۰ راز یزدانی
اردو داستانوں پر کام کا تجزیہ اور تبصرہ
(آجکل دہلی ۶۰ ۳۷-۳٤)
خواجہ عبدالرؤف عشرت کا مضمون «لکھنؤ کی داستان گوئی» تاریخ ادب اردو (سکسینہ) ہماری داستانیں (وقار عظیم) فن داستان گوئی (کلیم الدین) اردو کی نثری داستانیں (گیان چند) کا تجزیہ اور تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۰۱ رخشاں ابدالی
حضرت احقر بہاری
(مہر نیمروز ۶۰ اگست ۳۵)
احقر بہاری کی شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۰۲ رشید حسن خاں
فیض کی شاعری
(آجکل دہلی ۶۰ ستمبر ۳-۱۱)
فیض کی شاعری کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے بعض خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۰۳ رضا قاسم مختار
عظیم آباد کا شاعر اکبر آبادی مشہور ہوگیا۔
(اشارہ پٹنہ ۶۰ ستمبر ۱۵-۱۹)
نظیر اکبر آبادی کی پیدائش عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ حالات مختصراً پیش کراتے ہوئے ان کے مذہبی خیالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۰۴ رغیب حسین
سیستاں کا مشہور قصیدہ گو شاعر فرخی سیستانی
(برہان ۶۰ اگست ۱۰۳-۱۰۷)
حیات و کلام سے متعلق مختصر گفتگو۔

۱۰۵ رفعت جاوید
ہماری قومی شاعری کے تیور
(ماہ نو کراچی، ۶۰ اگست ۱۰-۱۵)
پاکستان کی قومی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۰۶ رونق جودھپوری
بیخود بدایونی
(جام نو کراچی ۶۰ جولائی ۱۵-۱٦)

عبدالحی بیخود بدایونی کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں ۔

۱۰۷ سلامت اللہ

مولانا محمد اسماعیل بچوں کے ادیب کی حیثیت سے

(آجکل دہلی ۔ ۶۰ جولائی ۳۵-۳۷)

مولانا نے سب سے پہلے بچوں کے ادب کو ایک مخصوص صنف ادب کا درجہ عطا کیا اسے اپنی ذہنی صلاحیت اور فنی مہارت کے شایان شان گردانا اور اس میں اپنی ذات کو پورے خلوص اور لگن کے ساتھ کھپایا ۔

۱۰۸ شاہد جمیل

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

(ماہ نو کراچی ۶۰ جولائی ۱۹-۲۲)

سید محمد گیسو دراز نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جو ارشادات و تعلیمات پیش کی ہیں اور زبانِ اردو کی تدوین میں ان کا جو حصہ ہے اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔

۱۰۹ شبنم رومانی

اعتبارالملک حضرت دل شاہجہانپوری

(مہر نیمروز ۶۰ جولائی ۲۶-۲۸)

دل شاہجہانپوری سے متعلق مختلف آراء کے تاثرات مرتب ہو گئے ہیں ۔

۱۱۰ طیبہ خاتون

مرثیے اور دبیر کی مرثیہ گوئی

(صبح نو پٹنہ ۶۰ ستمبر اکتوبر ، ۹-۱۶)

اردو میں مرثیہ کی تاریخ پیش کرتے ہوئے انیس کی شاعرانہ خوبیوں کو واضح کیا گیا ہے ۔

۱۱۱ ظفر احمد صدیقی

ادب اور نفسیات

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۰ جولائی ۵۹-۸۳)

ادب اور نفسیات کے تعلق اور ان کے باہمی استفادہ کے امکانات پر روشنی ڈالی ہے ۔

۱۱۲ عابد رضا بیدار

جدید اردو شاعری کی منفرد آوازیں

(شاعر بمبئی ۶۰ ستمبر ۱۳-۲۵)

تمہیداً کچھ ایسے شاعروں کا تعارف کرایا ہے جو اردو شاعری میں اپنی شخصیت کی چھاپ رکھتے ہیں اور اس کے بعد پانچ جدید شاعروں کے چیدہ اشعار پیش کرکے قارئین کو دعوت فکر دی ہے کہ ان شاعروں کے نام بتائیں ۔

۱۱۳ عابد سید عابد علی

ادب کی سماجی ذمہ داریاں

(قومی زبان کراچی ستمبر اکتوبر ۶۰)

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر ادیب کو اپنے ادب میں صحت مند معاشرتی کوائف کی ترجمانی کرنا چاہئے ۔

۱۱۴ عابد نظامی

اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض

(تعمیر انسانیت لاہور ۶۰ جولائی ۲۱ - ۲۲)

اقبال نے قرآنِ حکیم، سنت رسول، مولانا روم، حکیم سنائی، سعدالدین محمود شبستری، مولانا سید میر حسن، چند ہم عصر مشائخ اور حکمائے مغرب سے اکتساب فیض کیا ہے۔

۱۱۵ عبدالحق

حضرت احسن مارہروی مرحوم

(قومی زبان ۶۰ اگست ۹ - ۱۰)

مولانا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۶ عبدالحمید فاروقی ڈاکٹر

جدید ایرانی شاعری میں اشتراکیت

(نگار ۶۰ جولائی ۴۹-۶۰)

جدید ایرانی شاعری میں اشتراکیت کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

۱۱۷ عبداللہ سید

آتش خنداں

(ادب لطیف لاہور ۶۰ ستمبر ۶ - ۱۲)

ایک تیموری شہزادہ لبیب تیموری کے دیوان آتش خنداں کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس کی شاعری کے صوفیانہ داخلیت اور زبان کی تہذیب خاص عناصر ہیں۔

۱۱۸ عتیق صدیقی

اکمل الاخبار

(آجکل دہلی ۶۰ ستمبر ۲۷ - ۳۱)

۱۸۶۶ء میں یہ اخبار دہلی سے جاری ہوا تھا اس کے مالک اور روح رواں حکیم محمود احمد خاں تھے۔ یکم جنوری ۱۸۶۸ء کے شمارے سے اقتباس اور دلچسپ خبریں پیش کی گئی ہیں۔

۱۱۹ عزیز زبیدی

حدیث مصطفے اور اقبال

(فاران کراچی، ۶۰ جولائی، اگست ۱ و ۲)

اقبال کے کلام سے ثابت کیا ہے کہ اقبال منکر حدیث نہ تھے۔ بلکہ ان کے افکار کا سرچشمہ قرآن کے بعد حدیث ہی ہے۔

۱۲۰ غلام حسین ذوالفقار

اردو شاعری کا سیاسی پس منظر

(دلی کی آخری بزم)

(ادب لطیف لاہور ۶۰ اگست ۶ - ۲۶)

بزم آخر کا ماحول، بزم آخر اور اردو شاعری، عظمت رفتہ کا احساس؛ سیاسی ماحول کی ترجمانی، اجتماعی بیداری کے اثرات، معاشرتی روابط، معاشرتی اختلافات وسیع المشربی اور انسان دوستی کی تعلیم پہلوؤں پر شاعروں کے کلام کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲۱ غلام مصطفے خان

نکات احسن

(مہر نیمروز ۶۰ ستمبر ۱۵ - ۲۰)

زبان کے مختلف نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۲۲ غلام مصطفے منما
نطام اردو کی تشریح اضافه و تحقیق
کے ساتھ
(ماران کراچی، ۶۰ ستمبر)
آرزو لکھنوی کے رساله نطام اردو کا
تعارف ضروری تشریحات کے ساتھ

۱۲۳ فائق کلب علی خان
آبرو
(اورینٹل کالج میگزین، ۶۰ مئی ۱-۳۶)
مختلف تذکروں کی روشنی میں شاہ مبارک
آبرو کے حالات پیش کئے ہیں۔

۱۲۴ فائق کلب علی خان
آبرو
(اورینٹل کالج میگزین ۶۰ اگست ۳۷-۱۱۶)
شاہ مبارک آبرو کے کلام کا مختصر
انتحاب پیش کیا ہے۔

۱۲۵ فیض احمد فیض
کلچر اور ادب
(قومی زبان ۶۰ اگست ۷-۸)
ادب اور کلچر کے رشته پر اطہار
حیال کیا ہے۔

۱۲۶ قاضی عبد الودود
احبار الاخیار مطفر پور اور سید احمد خاں
(فکر و نظر علی گڑھ، ۶۰ جولائی ۲۴-۳۱)
اخبار الاخیار سائنٹفیک سوسائٹی صوبه
بہار کا پانزده روزه اخبار تھا۔ اس کے
چند شمارے کتبخانۂ ادارۂ تحقیقات اردو
پٹنه کی نمائش کے لئے مستعار دئے گئے
تھے۔ مضمون نگار نے ان کا مطالعه کرنے
کے بعد وہ چیزیں پیش کی ہیں جن کا
تعلق سر سید احمد خاں سے ہے۔

۱۲۷ قریشی عبد الرزاق
مرزا مظہر جان جاناں کی فارسی شاعری
(معارف ۶۰ جولائی ۴۰-۴۹)
دوسری قسط درج ہے۔

۱۲۸ قیصر بھارتی
خان محبوب طرزی کے ناول
(پگڈنڈی امرتسر ۶۰ ستمبر ۲۲-۲۴)
خاں محبوب طرزی کے ناولوں کا
سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۲۹ مالک رام
غالب کی فارسی تصانیف
(نگار ۶۰ جولائی ۹۸-۱۰۶)
غالب کی نظم و نثر کی فارسی تصانیف
کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۳۰ مالک رام
گل رعنا
(نگار ۶۰ جولائی ۲۳-۴۰)
غالب نے اپنے قیام کلکته میں جو
فارسی کلام کا انتخاب کیا تھا اس کا
تعارف پیش کیا ہے۔

۱۳۱ محمد احمد جیلانی
بے باک شاہجہاں پوری
(آجکل دہلی ۶۰ ستمبر ۳۳-۳۴)
سید حسین احمد میاں بے باک کے
حالات زندگی اور انتخاب کلام پیش

کئے گئے ہیں۔
۱۳۲ محمد احمد صدیقی
سرود زندگی پر نظر باز گشت
(جام نو کراچی، ۶۰ آزادی نمبر ۳۱-۳۶)
مضمون کی پہلی قسط جس میں «اصغر کا مسلک شعری» اور «رنگ سخن» سے بحث کی گئی ہے۔
۱۳۳ محمد حسین، ڈاکٹر
تحریر اور ادب میں اس کی صنفی حیثیت
(نگار ۶۰ اگست ۶-۱۲)
تحریر اور ادب میں اس کی صنفی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے
۱۳۴ محمد صادق ڈاکٹر
آزاد بحیثیت انشا پرداز
(ماہ نو کراچی ۶۰ جولائی ۹-۱۶)
مصنف نے مولانا محمد حسین آزاد کی انشاپردازی پر قلم اٹھایا ہے۔
۱۳۵ محی الدین قادری زور
علامہ اقبال اور حیدر آباد
(سب رس، حیدرآباد، ۶۰ جولائی ۳-۵)
اقبال اور حیدر آباد کے باہمی تعلقات کے بعض اہم اور تاریک گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔
۱۳۶ محی الدین قادری زور
دیوان شرف
(سب رس حیدرآباد، ۶۰ اگست ۴-۶)
آغا حجو شرف کے دو قلمی دیوانوں کا تعارف کراتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شرف کا مطبوعہ دیوان کئی دیوانوں کو ایک جگہ کرکے چھاپا گیا ہے۔
۱۳۷ محی الدین قادری زور
حضرت جگر مرادآبادی،
(سب رس حیدرآباد، ۶۰ ستمبر ۳-۴)
ڈاکٹر زور کے تاثرات جو جگر کی وفات کے فوری بعد آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے
۱۳۸ مسعود احمد
حضرت غمگین شاہ جہاں آبادی
(برہان ۶۰ جولائی ۴۵-۶۰)
تیسری اور آخری قسط ہے اس میں غمگیں سے غالب کے تعلقات و شاگردی اور غمگین کے دواوین کا مختصر تذکرہ درج ہے۔
۱۳۹ مشتاق حسین
اردو کا ایک قدیم غیر ملکی مصنف
(قدیم ڈھاکا ۶۰ اگست ۵۵-۶۰)
۔ حیمر کار کرن نامی ایک غیر ملکی صدر عدالت فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو مترجم کی خدمات انجام دیتا تھا۔ یہ شخص نہ صرف مترجم تھا بلکہ مصنف بھی تھا لیکن اردو ادب کے تذکروں اور تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ نثر اور نظم کے نمونے پیش کئے گئے ہیں
۱۴۰ مظفر ملک
ڈاکٹر اقبال بحیثیت مرثیہ گو
(ثقافت لاہور ۶۰ ستمبر)
مرثیہ کے محرکات اور اقبال کے اجتماعی

و ملی مرثیوں کا تجزیہ۔

۱۶۱ معنی تبسم

کلاسکیت

(سب رس، حیدر آباد ۶۰ ستمبر ۱۲-۱۵)

کلاسکی ادب سے متعلق مختلف رجحانات ادوار کے مختلف تصورات کو سمجھایا ہے۔

۱۶۲ مضمون کوثوی

چکبست لکھنوی اور ان کی شاعری

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۰ ستمبر ۳۱-۳۷)

چکبست نے غزل کو نئے لب لہجہ نئے انداز بیان نئے اسلوب اور نئے موضوع سے آشنا کیا ہے مختصرا ان کی شعری خوبیوں کو پیش کیا گیا ہے

۱۶۳ مناظر حسین

اردو غزل کا مستقبل

(جام نو کراچی ۶۰ جولائی ۱۱-۱۳)

غزل کے جدید رجحانات کے پیش نظر غالب کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے اس کے پر ہونے کی مستقبل قریب میں کوئی صورت نہیں ہے لیکن غزل کے ختم ہو جانے کے اندیشے درست نہیں۔

۱۶۴ مناظر حسین

ناول کے فن کا جائزہ

(جام نو کراچی ۶۰ آزادی نمبر ۲۳-۲۶)

ناول کے فن سے بحث کی گئی ہے۔

۱۶۵ منظر حسن دسوی

ادب میں ڈرامے کا مقام

(شاعر، بمبئی ۶۰ ستمبر ۲۶-۲۸)

مختلف ناقدان ادب و ماہرین نفسیات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسٹیج کے ڈرامے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے لئے ہوتے ہیں جو فنون لطیفہ کی اعلیٰ قسموں سے محفوظ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے

۱۶۶ میر ہاشم

یاس یگانہ چنگیزی (ایک جائزہ)

(نگار ۶۰ جولائی ۷۱-۷۴)

یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے

۱۶۷ نادم سیتا پوری

غالب کے متعلق چند غیر معروف روایات

(صبح نو پٹنہ ۶۰ ستمبر اکتوبر ۱۹-۲۲)

غالب سے متعلق چند روایات جو عام طور سے کتابوں میں نظر نہیں آتیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

۱۶۸ ندوی سید حسن مثنیٰ

نواب امداد امام اثر

(مہر نیمروز ۶۰ اگست ۳۱-۳۳)

امداد امام اثر کی علمی خدمات کا ذکر اور مختصراً حالات پیش کئے ہیں۔

۱۶۹ ندوی سید حسن مثنیٰ

مولانا احسن مارہروی

(مہر نیمروز ۶۰ ستمبر ۹-۱۴)

مولانا کی شخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۰ نذیر احمد

تذکرۂ خلاصۃ الاشعار اور عرفی و نظیری کے مختلف دور کی زندگی اور کلام پر ایک نظر

(معارف ۶۰ اگست ۱۳۳-۱۴۶)

تذکرۂ خلاصۃ الاشعار سے متعلق مختصر گفتگو کرتے ہوئے اس کی روشنی میں عرفی و نظیری کے ادوار کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ (جاری)

۱۵۱ نذیر احمد

تذکرۂ خلاصۃ الاشعار اور عرفی و نظیری کے مختلف دور کی زندگی اور کلام پر ایک نظر

(معارف ۶۰ ستمبر ۲۰۱-۲۱۰)

۲۔ دوسری قسط درج ہے۔

۱۵۲ نظر محمد انصاراللہ

غالب، ذوق اور ناسخ

(نگار ۶۰ جولائی ۶۱-۶۶)

غالب۔ ذوق اور ناسخ سے متعلق مشہور لطائف کی صحت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۵۳ نظر محمد انصاراللہ

ذوق کا استاد کون تھا؟

(نگار ۶۰ اگست ۲۰-۳۶)

مختلف تذکروں کی روشنی میں ذوق کے استاد پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۴ نظر انصاراللہ

قصائد ذوق

(بگذنڈی، ۶۰ جولائی ۱۶-۲۰)

یہ امر مسلم ہے کہ ذوق کے کلام میں تصرف ہوا ہے۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں کثرت سے تبدیلیاں ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر ذوق کے متعلق یا اس زمانہ کے بارے میں ہم جو رائے بھی قائم کریں اس کا ہمیشہ صحیح ہونا ضروری نہیں۔

۱۵۵ تقی احمد ارشاد

اردو کی چمن بندی میں طائفہ داروں کا ہاتھ

(شاعر بمبئی ۶۰ ستمبر ۲۹-۳۶)

درباروں میں طائفہ داروں کی رسائی اور اردو ادب پر ان کے اثرات بتاتے ہوئے بعض طوائفوں کے حالات اور کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۱۵۶ نہال حسن رضوی

خلیل جبران خلیل، ایک جائزہ

(نگار ۶۰ اگست ۱۷-۱۹)

عربی کے مشہور صاحب طرز ادیب خلیل جبران کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۷ وحید اختر

جگر ــــ غزل کا ایک دور

(سب رس، حیدرآباد ۶۰ ستمبر ۷-۹)

جگر کی شاعری اور شخصیت سے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۱۵۸ وقار احمد

مثنوی «قول غمین»

(نگار ۶۰ جولائی ۷۵ـ۸۱)

قولِ غمیں اور مومن کی دوسری مثنویوں پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۵۹ ہارون خاں شیروانی

سر سید کے تین غیر مطبوعہ خطوط

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۰ جولائی ۱۰۱ـ۱۰۴)

سرسید کے تین خط جو محمد سعید خاں مرحوم کے نام ہیں نواب مقصود جنگ سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ان خطوط کی نقلیں پیش کی ہیں۔

۱۶۰ ہاشمی نصیر الدین

حضرت سید یوسف راجو قتال کی دکھنی نظم

(قومی زبان ۶۰ جولائی ۵ـ۷)

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد سید یوسف راجو سے متعلق مختصراً معلومات پیش کرنے کے بعد ان کی دکھنی نظم کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۶۱ ہاشمی نصیر الدین

خواتین حیدر آباد دکن کی اردو مطبوعات

(قومی زبان ۶۰ ستمبر اکتوبر ۱۶ـ۱۸)

ناول اور افسانے کے فن میں حیدر آباد دکن کی خواتین نے جو اضافے کئے ہیں ان کی مکمل فہرست ہے۔

۱۶۲ ہاشمی نصیر الدین

خواتین حیدر آباد دکن کی اردو مطبوعات

(گذشتہ سے پیوستہ)

(قومی زبان کراچی ۶۰ ستمبر اکتوبر)

اس شمارے میں ادبی مقالات، تنقید، مکتوبات، مزاحیہ ادب، نظم اور تاریخ و سوانح میں حیدر آباد دکن کی خواتین کی ادبی کاوشوں کو پیش کیا ہے۔

۱۶۳ ہاشمی نصیر الدین

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ

(پگڈنڈی۔ امرتسر ۶۰ جولائی ۱۰ـ۱۳)

نواب سالار جنگ مرحوم (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں لطف النساء امتیاز کا ایک قلمی دیوان سنہ ۱۲۱۲ ھ کا مرتب کردہ محفوظ ہے مضمون نگار نے مختصراً شاعرہ اور اس کے دیوان کا تعارف کرایا ہے۔

۱۶۴ ہاشمی وحید الحسن

پاکستانی ادب کی تشکیل

(ماہ نو کراچی ۶۰ ستمبر ۲۱ـ۲۷)

مضمون نگار نے پاکستان کی ثقافتی، مذہبی اور سیاسی قدروں کو اسی ملک کے ادب کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱۶۵ ہنس راج رتن

رشید احمد صدیقی

(پگڈنڈی امرتسر ۶۰ ستمبر ۱۴ـ۱۷)

یہ مضمون انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ ہنس راج نے اسے ترجمہ کیا ہے۔ مضمون میں رشید صاحب کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۶۶ یکتا جودھپوری

ایک گمنام شاعر

(ماہ نو کراچی ۶۰ آزادی نمبر ۲۷ـ۲۹)

حضرت بیدل بدایونی کی زندگی اور
ان کی شاعری کا انتخاب پیش کیا گیا ہے

معاشرتی حالات

۱۶۷ عثمانی ش. ن،
جدید معاشرے میں فرد کا مقام
(زندگی رام پور ۶۰ ستمبر ۴۸-۵۳)
فرد و جماعت سے متعلق مغربی معاشرہ کے نظریہ کا بطلان ہے۔

۱۶۸ بیومیں کے ج.
پاکستانی جمہوریت کے بارہ سال
(چراغ راہ کراچی ۶۰ جولائی)
پاکستان میں جمہوریت کیوں ناکام رہی۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے

اقتصادیات

۱۶۹ صباح الدین عبد الرحمن
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پارچہ بافی کی صنعت
(معارف ۶۰ جولائی ۲۵-۳۹)
ہندوستان میں ہر جگہ کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پارچہ بافی کی صنعت کا اجمالی تذکرہ درج ہے

ایڈیٹر : نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸
میں چھپوا کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۲۹، دادا بھائی نوروجی
روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

نواے ادب بمبئی

جلد ۱۲ | اپریل ۱۹۶۱ ع | شمارہ ۲

شذرات

انسانی اعمال کا محرک وہ خیال ہوتا ہے جو دماغ میں پیدا ہو اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے خیالات ترقی پسند صالح، صحت مند اور انسان دوست ہوں تاکہ ہمارے افعال و اعمال بھی ان کا رد عمل ہوں تو یہ خیالات ہمارے انشا پرداز، مصنف، شاعر، صحافی ہی عوام کے دلوں میں پیدا کرسکتے ہیں اگر ہمارے ارباب قلم اور اصحاب فن اس نہج پر سوچیں تو ہمارے سارے مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تاریخ تہذیب، ثقافت زبان، و ادب ایک مشترکہ ورثہ ہے اس لئے اگر ہم اس ورثہ کی حفاظت، بقا اور ترقی و توسیع کے لئے متحدہ طور سے سوچ سکیں تو بہت سی تلخیاں ہی دور نہیں ہو سکتیں بلکہ ہم خوشگوار فضا کے پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہوسکتے ہیں۔ اور اپنے علمی، ادبی اور فنی معاملوں میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے اور ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں دراصل یہی غرض تھی جس کے تحت دہلی میں ادب و ثقافت کے ایک مشترکہ اجتماع کا سامان کیا گیا تھا اور ہندوستان نے بڑے خلوص و محبت سے پاکستان کو اس میں شرکت کی دعوت دے تھی۔ کانفرنس ہوئی، تقریریں ہوئیں مشاعرہ کا بھی حسب دستور ہنگامہ برپا ہوا لیکن جس جوش جس ولولہ اور جس خلوص کے تحت یہ بزم منعقد کی گئی تھی اس کا نتیجہ اتنا مسرت بخش اور نتیجہ خیز نہیں نکلا جس کی توقع تھی۔ پھر بھی ہم مایوس نہیں تقسیم ملک کے بعد یہ پہلی عملی کوشش ہے، پہلا پردہ اٹھ گیا ہے ہچکچاہٹ دور ہو رہی ہے اور فضا صاف ہوتی نظر آتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس اجتماع میں دونوں ملکوں کے ارباب علم بعض ایسے مسائل پر اظہار خیال کریں گے جس سے ادب و زبان سے متعلق بہت سے کاموں میں دوہری محنت دوہرے سرمایہ اور دوہرے وقت کے صرف کرنے کی ضرورت نہیں رہیگی۔ مثلاً لغت، انسائکلوپیڈیا قاموس مشاہیر، علمی و فنی اصطلاحات وغیرہ سے متعلق ہر ملک میں الگ الگ کام ہورہا ہے۔ اگر اس کو مشترکہ صورت میں انجام دیا جائے یا کام بانٹ لیا جائے تو بہت بہتر ہو۔ پھر یہ صرف اردو زبان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں بنگلہ سندھی اور پنجابی زبانیں بھی آجاتی ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور تقسیم کار سے متعلق ہماری معروضات پر غور کیا جائیگا۔

اسی دور کے دو اہم مسئلے کتابوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں

آزادانہ تبادلہ اور ایک ملک کی کتابوں کا دوسرے ملک میں غاصبانہ طریقہ پر چھاپ لینا بھی ہیں۔ ان کی طرف بھی عملی قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔

اردو زبان کا کوئی خاص علاقہ نہیں ہے وہ ہر ریاست میں بولی، سمجھی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ اس کے مصنف اور شاعر ہر ریاست میں موجود ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ جس طرح مرکزی حکومت اور اتر پردیش کی ریاست نے اردو تصانیف سے متعلق انعام مقرر کئے ہیں اسی طرح دوسری ریاستیں بھی اپنے یہاں اردو کے انعام مقرر کریں، مہاراشٹر ریاست اردو کا ایک بڑا مرکز ہے اگر وہ اس طرح عملی قدم بڑھائے تو اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا گجرات بھی جہاں تک اردو کا تعلق ہے بہت اہم ریاست ہے وہاں بھی اردو کو اسی سلسلہ میں جائز حق ملنا چاہئے۔

ریاست بمبئی کو ہمیشہ یہ عزت حاصل رہی ہے کہ اس نے بہت سے اچھے کاموں میں پہل کی ہے۔ چنانچہ اردو تصانیف سے متعلق یہاں کے کتابوں کے تاجروں نے ریاست سے شائع ہونے والی پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس مرتبہ انہوں نے دو کتابوں کو منتخب کیا ہے، کیا دوسرے صوبوں کے کتابوں کے تاجر اس طرف متوجہ ہوں گے۔

گذشتہ سہ ماہی کا ادبی حادثہ حکیم الشعراء سید امجد حسین امجد حیدرآبادی کا انتقال ہے وہ نہ صرف یہ کہ ایک بڑے اچھے شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ شاعری میں ان کو رباعی اور نظم سے خاص دلچسپی تھی، موجودہ عہد کے بلند پایہ رباعی گو مانے جاتے تھے۔ نثر میں گلستان امجد، حج امجد اور حکایات امجد وغیرہ خاص مقام کی حامل ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات نے ان کے دل میں درد و سوز پیدا کر دیا تھا اور اس کا اثر ان کی نظم و نثر دونوں میں ہے۔ اسی چیز نے ان کو تصوف کی طرف بھی مائل کیا وہ سادہ مزاج مخلص اور انسان دوست بزرگ تھے۔ وہ سنہ ۱۳۰۳ ھ میں پیدا ہوئے۔ مقامی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاصل کا امتحان پاس کیا، عملی زندگی کی ابتدا مدرسی سے کی اور انتہا صدر

محاسبی کی ملازمت تھی. اس احتساب وتعلیم نے اُن کو احتساب نفس اور صحیح تعلیم کی تلقین کی طرف متوجہ رکھا. ان کے والد رحیم علی صوفی منش بزرگ تھے سنہ ۱۳۲۶ ھ میں دریائے موسیٰ میں جو ہلاکت خیز سیلاب آیا تھا. اس میں ان کی والدہ ان کی اہلیہ اور ان کی بچی ہلاک ہوگئی اور اس کا اثر تمام عمر ان پر رہا جو ان کے کلام اور تحریر میں صاف نظر آتا ہے. افسوس کہ بزم دیرینہ کی شمعیں ایک ایک کرکے بجھتی جاتی ہیں اور بہت جلد کوئی ایسا چراغ باقی نہیں رہے گا. جو ہماری اس بزم کے کسی گوشہ کو بھی منور کرسکے. اللہ تعالے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے.

اس سال ساری دنیا میں ہمارے وطن کے مفکر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹگور کا صد سالہ یوم پیدائش منایا جارہا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹگور شاعر، انشاء پرداز، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مصوری، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ میں بھی دخل رکھتے تھے، لیکن سب سے بڑھکر جو چیز ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے عملی کارنامے ہیں. وہ ایک خاص فلسفے کے مفسر تھے اور انہوں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شانتی نکیتن قائم کیا اور اس سے دنیا کے مختلف ممالک متاثر ہوئے، خوش قسمتی سے ان کو ابتدا ہی میں ریونڈ انڈریوز وغیرہ جیسے اہل علم مل گئے جنھوں نے ان کو ترجموں کے ذریعہ دنیائے ادب سے متعارف کیا، اور انہیں ترجموں نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کے انشاء پردازوں کو بھی متاثر کیا پہلی جنگ عظیم کے وقت سے تقریباً ربع صدی تک اردو کے اکثر ادیبوں پر ٹگوری طرز انشاء، اسلوب بیاں اور اندازۂ فکر غالب رہا چنانچہ اس عہد کے ادبی رسالے نقاد، نگار، مخزن، نیرنگ خیال، ساقی وغیرہ بڑی حد تک اس دبستان تحریر کے نمائندے ہیں ٹگور سے متاثر ہونے والوں میں جناب نیاز، لطیف احمد، جوش اور بعض دوسرے آج کے چوٹی کے ادیبوں کا نام لیا جاسکتا ہے اردو کا دامن ٹگور کے ترجموں سے پر ہے. اب اگرچہ اردو کا انداز بیان بدل گیا ہے لیکن پیغام باقی ہے اور یہ انسان دوستی کا پیغام ہے، اس صد سالہ جشن کے موقع پر اگر ٹگور کے پیغام محبت و مواخات کو ہم موثر طور سے پیش کرسکیں تو حقیقی معنوں میں ہم اس احترام کا جو ٹگور سے متعلق ہمارے دلوں میں ہے اظہار کرسکیں گے.

° از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

وضع اصطلاحات

مصنف «وضع اصطلاحات» کی زندگی

مولوی سید وحیدالدین «سلیم» اپنے آبائی وطن پانی پت میں پیدا ہوئے. ولادت کی تاریخ معلوم نہیں. اس لیے عمر بھی ٹھیک نہیں بتائی جاسکتی. وفات ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ع کو ملیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں ہوئی جہاں مرحوم نے اپنی عمر کے اخیر چھے مہینے اپنے دوست، ڈاکٹر عبدالکریم پانی پتی کے مہمان اور زیر علاج رہ کر بسر کیے. «سلیم» بالطبع بہت بد پرہیز تھے، اور کوئی انہیں منع کرتا تو اسے طبّی بحث پر لاکر لاجواب کر دیتے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی حذاقت کے قائل اور ان کے خلوص کے نہایت مداح تھے. جب بیمار پڑتے اور مرض طول کھینچتا، تو سیدھے ملیح آباد پہنچتے اور تندرست ہوکر واپس جاتے. ڈاکٹر صاحب جو پرہیز بتاتے اس پر سختی سے کاربند رہتے.

اس آخری بیماری میں مولانا کے ایک اور مخلص و معتقد دوست، سید عبدالودود «درد» رئیس بریلی، ان کے پاس آگئے اور تیمارداری اور غمگساری کا فریضہ آخر دم تک بڑی مستعدی سے ادا کرتے رہے. اس سلسلے میں «درد» نے مولانا کی زندگی کے حالات بھی لکھ لیے اور منشی دیا نرائن نگم، ایڈیٹر «زمانہ» (کانپور) کو بھیج دیے، جو مولانا کی وفات پر اگست ۱۹۲۸ کے شمارے (ص ۹۹ - ۱۰۵) میں شائع ہوئے. ادارت کا حاشیہ (ص ۹۹): «یہ مضمون اب سے چند ماہ پیشتر وصول ہوا تھا. لیکن افسوس جب اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو مولانا سلیم دنیا [سے [1]] چل بسے. مرحوم تقریباً چھ ماہ سے بعارضۂ سرطان علیل تھے. آخر یہی نامراد مرض پیغام اجل ثابت ہوا اور ۲۹ جولائی سنہ ۲۸ع کو ملیح آباد میں آپ نے انتقال فرمایا.» علمی خبروں میں مدیر نے اسی تاریخ وفات

° ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سابق صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

(۱) یہ لفظ کاتب سے چھوٹ گیا تھا، اور آگے چل کے «پیغام» کی جگہ «بمقام» لکھا گیا تھا جو سہو ظاہر ہے

کا اعادہ کیا (ص ١٣١)، پھر نومبر ١٩٢٨ کے شمارے میں (ص ٢٥٦ کے مقابل) معذرت کہ بلاک بننے میں تاخیر کے باعث مولانا کی تصویر اگست میں نہ شامل ہوسکی تھی، اب شامل کی جاتی ہے (مقابل ص ٢٨٨).

صفر ١٣٤٧ ھ (اگست ١٩٢٨ ع کے «معارف» اعظم گڑھ (ص ٨٢ - ٨٣) میں مولانا سید سلیمان کے قلم سے: «ماہ رواں کے سب سے ہولناک علمی حادثوں میں دو نامور مسلمان مصنفین اور اہل قلم کی وفات ہے، ایک سید امیر علی بالقابہ اور دوسرے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی ... مولانا ... سلیم عربی اور اردو کے ادیب تھے ... «معارف» نام ایک علمی رسالہ انہوں نے علی گڑھ سے نکالا جس نے اہل علم میں بڑی عزت حاصل کی ... سنہ ١٩١٠ ع میں جب لکھنئو سے «مسلم گزٹ» نکلا ... تو مولانا شبلی مرحوم کے مشورے سے وہی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے نہایت خوبی سے اس فرض کو انجام دیا. «مسلم گزٹ» کے بند ہونے کے بعد وہ پھر خانہ نشین ہوگئے. اور آخر غالباً ١٩١٦ ع یا اس کے گرد و پیش زمانہ میں وہ حیدر آباد گئے اور جامعۂ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور اسی منصب پر اس مہینے انہوں نے ملیح آباد (ضلع لکھنئو) میں وفات پائی، مرحوم کی عمر ستر ٧٠ سال کے قریب ہوگی.

«مرحوم نے چھوٹے بڑے مضامین بیشمار لکھے، اور بڑے سے بڑے ہفتہ وار اخبار کو ایک رات میں بیٹھ کر پورا کر لیتے تھے... الفاظ کے تراشنے اور وضع کرنے میں ان کو پوری مہارت تھی. «علی گڑھ گزٹ» اور «مسلم گزٹ» کی ایڈیٹری کے زمانہ میں بہت سے اردو الفاظ وضع کرکے انہوں نے پھیلائے ہیں، منجملہ ان کے ایک لفظ «نمائندہ» جو آج اس قدر کثیر الاستعمال ہے، انہیں نے اس لفظ کو جدید فارسی اخبارات سے لے کر اردو میں «علی گڑھ گزٹ» کے ذریعہ سے رائج کیا. حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا».

ڈاکٹر عبد الحق نے اپنے پرانے کرم فرما اور اپنے بڑے بھائی کے بے تکلف دوست، مولانا «سلیم» کی موت پر جو ماتم نامہ لکھا ١٩٢٩ ع میں رسالہ «اردو» میں چھپا. اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

«انہیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لینا نہ تھا. گو ان کی عمر زیادہ تھی، شاید ارسٹھ کے لگ بھگ، لیکن ان کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں

اور جی سکتے تھے لیکن انھوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا. وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے. یہی ان کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا ». (« چند ہمعصر » طبع دوم، دہلی ۱۹۴۲ ع، ص ۱۰۳ = طبع پنجم، کراچی ص ۱۱۵).

ان اقتباسوں کا یہاں درج کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ان سے بعض شبہوں کا ازالہ ہوجاتا ہے. پارسال سید جعفر طاہر صاحب نے « قومی زبان » (کراچی، ۱۶ اگست و یکم ستمبر ۱۹۵۹ ع میں ایک مضمون « وحید الدین سلیم کی شاعری » شائع کیا جس میں لکھا ہے: « سال پیدائش ۱۸۶۹ ع . . . سال وفات میں اختلاف ہے. ڈاکٹر عبد الحق ۱۹۲۹ ع اور عبد القادر سروری ۱۹۲۸ ع بتلاتے ہیں. یاد رفتگاں[1] کے مصنف فرماتے ہیں کہ وفات کے وقت ان کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی مگر ان کا اندازہ کچھ صحیح نظر نہیں آتا ». معلوم ہوتا ہے طاہر صاحب نے سروری کی « جدید اردو شاعری » (حیدر آباد، ۱۹۳۲ ع، ص ۲۴۹) میں یہ سال پیدایش دیکھا اور بلا تامل مان لیا، حال آنکہ اگلے ہی صفحے میں ہے. « یہ ۱۸۶۹ع کے قریب پیدا ہوئے ». حقیقت یہ ہے کہ سلیم کا سال پیدایش کسی کو معلوم نہیں یہ بھی درست نہیں کہ « سال وفات میں اختلاف ہے ». غالباً صاحب مضمون نے ڈاکٹر عبد الحق کی « چند ہمعصر » میں « سلیم » کے نام کے نیچے ۱۹۲۹ ع» دیکھ کر اسے سال وفات مان لیا اگر وہ کتاب کی ورق گردانی کرلیتے تو یہ حقیقت ان پر کھل جاتی کہ عنوان کے تحت جو سال دیا گیا ہے وہ مقالے کے شائع ہونے کا ہے، جیسا کہ مولوی چراغ علی، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، نواب محسن الملک، مولانا حالی وغیرہ عنوانوں کے تحت سال وفات نہیں، بلکہ مقالے کی اشاعت کا سال ہے.

سید عبد الودود « درد » کا جو مقالہ « زمانہ » میں شائع ہوا تھا وہ بہت اہم ہے اس لیے کہ اس میں بعض تفصیلی حالات ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے. یہ مقالہ لکھا ان ایام میں گیا کہ مولانا سلیم مرض الموت کی شدتیں جھیل رہے تھے اور مقالہ نگار ہمہ تن تیمارداری میں مصروف تھے. اس میں سے چند ضروری باتیں

---

(۱) یہ ان تاسف ناموں کا مجموعہ ہے جو مولانا سید سلیمان نے وقتاً فوقتاً « معارف » میں لکھے تھے. اور اب کراچی میں شائع ہوا ہے.

یہاں مختصراً لکھی جاتی ہیں:

۱۔ «سلیم» کے والد حاجی فرید الدین پانی پت (کرنال) کے سادات میں سے تھے۔ ان کے دادا ملتان سے پاک پٹن آئے جہاں حاجی صاحب پیدا ہوئے، پھر پانی پت آکر بس گئے۔ حاجی صاحب شاہ بوعلی قلندر کے مزار کے متولی تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے وحید الدین۔ چھوٹے حمید الدین۔

۲۔ قصبے کی ایک شریف استانی آپا شمس النسا نے وحید الدین کو قرآن حفظ کرایا۔

۳۔ حاجی صاحب کے انتقال کے بعد وحید الدین کی تعلیم و تربیت کی نگرانی استھاواں (بہار) کے ایک بزرگ، سید غوث علی شاہ نے کی، جو پانی پت آکر مقیم ہوگئے تھے، اور ان کے تعلقات حاجی صاحب سے نہایت دوستانہ تھے۔

۴۔ وحید الدین کو اوائل عمر سے فارسی کا شوق تھا اور ذاتی کوشش سے فارسی کتابیں پڑھتے اور شرحوں کی مدد سے مشکلات حل کرتے۔ چودہ سال کی عمر میں ایسی مہارت بہم پہنچالی تھی کہ شاہ صاحب کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ ۱۰۱ بیت کا، عرفی کے ایک قصیدے کے جواب[1] میں کہا جسے سن کر لوگ حیران رہ گئے۔ وہ قصیدہ بطور شاہ صاحب کی کرامات کے[2] «تذکرۂ غوثیہ» میں نقل کیا گیا ہے۔ (تذکرۂ غوثیہ، طبع اول ص ۴۰۶ - ۴۱۲).

۵۔ مڈل تک تعلیم پانے کے بعد پانی پت سے لاہور گئے، عربی ادب اور تفسیر کی تعلیم مولانا فیض الحسن سے اور فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کی مولانا عبد اللہ[3] ٹونکی سے پائی۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے مغربی فلسفہ، طبیعیات، کیمیا، اور ریاضی پڑھی۔ مگر کوئی امتحان یونیورسٹی کا سوائے انٹرنس اور منشی فاضل کے نہیں پاس کیا۔ قانون کی جماعت میں داخل ہوئے لیکن فکر معاش سے مجبور ہوکر اس سے باز آئے اور بہاول پور کے ایجرٹن کالج میں نوکر ہوگئے۔

(۱) «جواب» نہیں کہہ سکتے۔ «عرفی» کا قصیدہ بحر مجتث میں ہے، اور «سلیم» کا بحر رمل میں ہاں قافیہ دونوں کا ایک ہے چمک، رنگ وغیرہ۔

(۲) ایک اور کرامت «درد» صاحب اوپر لکھ آئے ہیں حاجی صاحب... اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ حضرت کی دعا کی برکت سے حاجی صاحب کے ہاں دو فرزند نرینہ پیدا ہوئے»۔ «تذکرۂ غوثیہ» عجائب کرامات کا ایک خزانہ ہے۔

(۳) رسالہ «زمانہ» میں «عبد الاحد» صحیح نہیں، سہو کاتب ہے۔

« وہاں کی ، شش سالہ، ملازمت کے بعد ریاست رام پور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے لیکن یہ سلسلۂ ملازمت چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا، کیوں کہ جنرل عظیم الدین صاحب مرحوم جو مولانا کے قدرداں تھے اسی زمانے میں یکایک مارے گئے۔ ادھر مولانا مرض تشنج میں مبتلا ہوکر چھ سال تک صاحب فراش رہے۔ اس کے بعد...طب یونانی کا فن...ایک مشہور طبیب سے حاصل کیا اور پرایویٹ طور سے ڈاکٹری سے بھی واقفیت پیدا کرکے پانی پت میں مطب شروع کیا جو کئی سال تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس زمانے میں مولانا حالی صاحب مولانا کو...علی گڑھ لے گئے اور سرسید سے ملایا۔ سرسید کی مردم شناس آنکھوں نے اس جوہر فرد کو پہچانا اور بہ اصرار تمام مولانا کو اپنے پاس رہنے کے لیے آمادہ کرلیا اور مرتے دم تک انھیں اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیا » (ص ۱۰۰) یہ باتیں فی الجملہ صحیح ہیں، لیکن تاریخوں اور واقعات کی بدھ نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن دنوں میں مولانا «سلیم» کا یہ کارنامۂ حیات «درد» مرتب کررہے تھے، وہ ان کی تیمار داری میں ہمہ تن مصروف تھے اور یقیناً چاہتے ہوں گے کہ اس کام سے جلد فراغت ہو اور یہ اوراق منشی دیا نرائن نگم کو جلد پہنچ جائیں۔ اس باعث خیال نہ رہا کہ تاریخوں وغیرہ کو جانچ لیں، ورنہ یہ نہ لکھتے: «جنرل عظیم مارے گئے...مولانا تشنج میں...چھ سال...صاحب فراش رہے...طب یونانی...ڈاکٹری...الخ»

عظیم الدین خاں کا قتل جون ۱۸۹۱ ع میں ہوا اور سر سید احمد خاں کی وفات مارچ ۱۸۹۸ ع میں ہوئی۔ ان دونوں میں اتنا فصل کہاں کہ ۶ سال تشنج کے، اور کم سے کم ۵ سال طب و مطب وغیرہ کے، کل گیارہ بارہ سال اس میں سما سکیں۔ خود مولانا حالی فرماتے ہیں: « مولوی وحید الدین کو سید صاحب نے...اپنی پیش دستی میں لے لیا ہے اور تفسیر لکھنی پھر شروع کردی ہے۔ ان سے بہت خوش ہیں... از علی گڑھ ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۴ ع »۔ (مکتوبات حالی، حالی پریس و جامعۂ ملیہ دہلی ۱۹۲۵ ع ج ۲، ص ۱۸۵)۔

«درد» کا ایک اور بیان ہے۔ «سلیم» کی عمر بھر کی کارگزاریوں کو شرح و بسط سے گنانے کے بعد لکھتے ہیں: « مولانا کی عمر اس وقت تقریباً ۵۰ سال یا کچھ کم و بیش ہوگی» (ص ۱۰۳)۔ یہاں ایک یہ امکان ضرور ہے کہ کاتب

نے سہواً کسی اور ہندسے کی جگہ « ۵۰ » لکھا ہو۔

«تذکرۂ غوثیہ» سے استنباط کیجیے اور شاہ صاحب کی وفات کے وقت (مارچ ۱۸۸۰ع) میاں وحیدالدین کا سن ۱۴ برس فرض کیجیے تو ان کی ولادت ۱۸۶۶ اور عمر (۱۹۲۸) میں ۶۲ قرار پاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس پر بھی نظر رہے کہ یہ «تذکرہ» شاہ صاحب کے مرید شاہ گل حسن نے شاہ صاحب کی وفات کے ایک سال بعد لکھا اور تاریخی حیثیت سے کتاب میں اسقام بھی ہیں۔ بعض روایتیں اس میں اس درجہ مبالغہ آمیز ہیں کہ ان پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ تحریریں ہیں جو مولوی «سلیم» کی موت پر تاسف نامے کے طور پر ان کے دیرینہ احباب مثل ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے (جن کے بڑے بھائی مولوی وحیدالدین کے یاروں میں تھے) علی گڑھ اور پھر حیدرآباد میں بھی ایک ساتھ برسوں رہے۔ ۱۹۲۸ ع ہی میں مولوی عبدالحق ان کے جانشین ہوئے۔ اپنے تاسف نامے میں لکھتے ہیں: «انھوں نے اپنی فارغ البالی سے کچھ لطف نہ اٹھایا تھا گو ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، شاید اڑسٹھ کے لگ بھگ، لیکن ان کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے»[1] مولانا سید سلیمان ندوی، جو ان سے خوب واقف اور ان کے بڑے قدرداں تھے، کہتے ہیں: «مرحوم کی عمر ستر (۷۰) کے قریب ہوگی»۔[2] ایک اور بہت مستند ماخذ ہے جس کا ذاتی علم خود مجھے ہے۔ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کالج کی صدارت پر میرا تقرر ۲۳ ستمبر ۱۹۲۰ع کو ہوا۔ چند مہینے بعد کالج کے ان اساتذہ کی فہرست محکمۂ سرکار میں جانے کو تھی جو پچپن سالہ کی حد سے متجاوز ہونے والے تھے۔ میں مولوی «سلیم» کو مدت سے جانتا تھا، پوچھا کہ مولوی وحیدالدین صاحب کا نام اس میں کیوں نہیں ہے۔ دفتر کے اہلکاروں نے بتایا کہ وہ تو ساٹھ برس کے سن میں ہیں۔ چونکہ ان کا تقرر فرمان اعلیٰ حضرت کی بنا پر ہوا، اس لیے وہ اور چند اور اساتذہ عمر کی قید سے مستثنا ہیں۔ مولوی صاحب ۱۹۱۷ ع کے آخر میں یا ۱۹۱۸ ع میں وضع اصطلاحات کے کام کے لیے بلائے گئے تھے۔ ستمبر

(۱) ,,چند ہمعصر،، طبع دوم دہلی ۱۹۴۲ع ، ص ۱۰۳ ـــ طبع پنجم کراچی ، ص ۱۱۵ ، جس میں یہ تاسف نامہ ,,اردو،، جولائی ۱۹۲۹ع سے نقل ہوا۔

(۲) ,,معارف،، اعظم گڑھ اگست ۱۹۲۸، ص ۸۳

۱۹۱۹ع میں کالج کا افتتاح ہوا تو وہ کالج میں منتقل کیے گئے اور مجلس اصطلاحات کے رکن بھی رہے۔ اس لحاظ سے مولوی عبدالحق اور مولوی سلیمان دونوں کی تخمین حقیقت سے بہت قریب ہے۔

مولوی وحیدالدین کے ساتھ مولانا حالی کا برتاو بہت دوستانہ بلکہ مربیانہ تھا۔ اپنے اردو دیوان کے مقدمے کی تکمیل کے لئے مولانا ۲۷ مئی ۱۸۹۳ سے اواخر نومبر ۱۸۹۴ع تک علی گڑھ میں مقیم تھے، وہیں «حیات جاوید» کا بھی کچھ حصہ لکھا [1] اواخر جولائی یا اوائل اگست ۱۸۹۴ع میں مولوی وحیدالدین وہاں آئے اور مولانا کے ساتھ ٹھہرے۔ [2] سید صاحب نے دو ڈھائی مہینے تک ان کی قابلیت کا پوری طرح اندازہ کرنے کے بعد ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۴ع کو یا دو چار دن پہلے انھیں «اپنی پیشدستی میں لے لیا اور تفسیر لکھنی پھر شروع کردی» [3] تنخواہ جیسا کہ خود مولوی «سلیم» کہا کرتے تھے، پچاس تھی۔ سید صاحب پر افکار و امراض کا ۱۸۹۷ع میں ایسا ہجوم تھا کہ اس سال کے نصف اخیر سے ان کے علمی کام موقوف ہوگئے مگر مولوی وحیدالدین علی گڑھ ہی میں رہے۔ مولانا حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو جنوری ۱۸۹۸ع میں لکھتے ہیں: «اب تک تم کو یہاں سے جتنے کارڈ لکھ چکا ہوں مولوی وحیدالدین فی کارڈ ایک سلام کہتے ہیں»۔ [4] علی گڑھ سے مولوی «سلیم» کی ادارت میں ماہانہ رسالہ «معارف» جولائی ۱۸۹۸ع سے نکلنا شروع ہوا جسے ملک کے ادیبوں نے بہترین رسالہ تسلیم کیا۔ اڑھائی برس بعد مولوی صاحب پانی پت چلے گئے اور «معارف» وہاں سے نکلتا رہا۔ مالی دقتوں سے مجبور ہوکر دسمبر ۱۹۰۱ع میں رسالہ بند کرنا پڑا۔ [5]

سات برس بعد مولوی «سلیم» پھر علی گڑھ آتے ہیں سید صاحب نے علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ» ۱۸۶۶ع میں جاری کیا تھا اور زندگی بھر اس کے ایڈیٹر خود رہے۔ اخبار بڑی پابندی سے اور بڑی آب و تاب سے، پہلے ہفتہ وار پھر ہفتے میں

---

(۱) «مکتوبات حالی»، مرتبۂ خواجہ سجاد حسین، پانی پت ۱۹۲۵ع، ج ۲، ص ۱۶۱ ـ ۱۸۶۔
(۲) «مکتوبات»، ج۲، ص ۱۸۱۔
(۳) «مکتوبات»، ج ۲، ص ۱۸٤ و ۱۸۵۔
(٤) «مکتوبات»، ج ۲، ص ۲۳۹ ـ یہ فقرہ ظاہراً مولوی «سلیم» کا تھا جس کو مولانا نے لفظاً نقل کردیا ہے
(۵) «مقالات حالی»، ج ۲، ص ۱۸۱ (انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد، طبع دہلی ۱۹۳۶ع)

دو بار نکلتا رہا اور شمالی ہند میں بہترین اخبار مانا جاتا تھا [1] ان کے بعد اس کی حالت گرتی گئی، ادارت نا تجربہ کار ہاتھوں میں متواتر بدلتی رہی اور چند سال میں وہ کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ نواب محسن الملک کو اسے بہتر بنانے کی فکر تھی۔ جنوری ۱۹۰۷ ع کے آخر میں بعض انگریز اساتذہ کے برتاو سے عاجز آکر طلبہ نے ہڑتال کردی تو ایک اچھے اخبار کی ضرورت کا اور زیادہ احساس ہوا اور فروری میں انھوں نے مولوی وحید الدین کو بلوا کر سو روپئے ماہانہ پر انھیں سب ایڈیٹر مقرر کیا [2] خود نگراں رہے مگر وہ نگرانی مشاورت سے زیادہ نہ تھی، اس لیے کہ نواب صاحب ان کی قابلیت سے واقف تھے۔ مولوی صاحب نے، بقول ڈاکٹر عبدالحق اخبار کی «کایا پلٹ دی اور یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا یا دفعتہً زندہ ہوگیا» [3].

مولوی وحید الدین کی خدمت میں مجھے دسمبر ۱۹۰۷ ع میں نیاز حاصل ہوا پرانی سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اسی کے سامنے انسٹیٹوٹ کا چھاپے خانہ تھا، ایک اور کمرا قانون کے درس کے لیے مخصوص تھا، باقی عمارت قانون اور ایم۔ اے۔ کے طلبہ کی اقامت گاہ تھی۔ مولانا کی روش بڑی طالبعلمانہ تھی، تکلف اور تصنع سے بہت دور۔ اس لیے طلبہ سے بہت خوش تھے۔ مولانا کے کھانے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا جو سامنے رکھ دیا گیا نوش کرلیا۔ پان کھاتے تھے، مگر پاندان کا بکھیڑا کبھی مول نہ لیا۔ ایک تپائی پر کتھے چونے کی کھلیاں، پان، ڈلی تمباکو کا بتوا رکھا رہتا تھا۔ خود بناتے اور کھاتے اور کھلاتے بھی۔ اہتمام چائے کا البتہ ہوتا سبز «کشمیری» چائے بڑی تلاش سے منگواتے۔ اکثر خود بناتے، خوب پیتے اور پلاتے۔ میں تقریباً ہر روز تھوڑی دیر کے لئے حاضری دیتا۔ باتیں بہت دل چسپ اور سود مند ہوتیں۔ اسی زمانے میں مجھے اندازہ ہوا کہ کیسا عالی دماغ رکھتے تھے، علم کتنا حاضر، کس درجہ وسیع تھا۔ لسانیات سے فطرتی مناسبت تھی۔ زبان کے مسائل میں ان کا ذہن بہت کم خطا کرتا تھا۔ برسوں سے یہی دھن رہی تھی کہ اُردو زبان میں نئے الفاظ بنا بنا کر اسے وسعت دیجیے۔ مدتوں یہ دستور رہا کہ نئے لفظ گڑھ گڑھ کے

(۱) «حیات جاوید»، ۲، ص ۱۱۳-۱۱۶ (۲) «مکتوبات حالی»، ج۲، ص ۲۹۵ بعد (۳) «چند ہمعصر» طبع دوم، ص ۱۰۱ = پنجم ص ۱۱۲

«چپ چاپ» تحریر میں لائیے. کہا کرتے اور سچ کہتے تھے کہ اردو بولنے والی قوم لکیر کی فقیر ہے۔ ہر نیا لفظ بولنا یا لکھنا اس کے نزدیک ایسا سنگین گناہ ہے کہ کبھی معاف نہ ہوگا۔ مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے، صرف حرف پہچانتے تھے ویبسٹر کی ڈکشنری میں سے لفظوں کے معنی اور اشتقاق معلوم کر لیتے سکہ ڈھل جاتا جہاں شبہہ ہوتا اوروں سے پوچھنے میں اصلا تکلف نہ کرتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ آپ اس مبحث پر ایک مقالہ شائع کیجیے تو کچھ لوگ ضرور آپ کے ہم خیال ہو جائیں گے۔ بولے: واہ، میں نے ایسا کیا، تو جو دو چار لفظ لوگ اختیار کر لیتے ہیں وہ بھی ہاتھ سے جائیں گے۔ اب تو یہ ہے کہ یہ لفظ ایران یا مصر کے جریدوں سے مستعار ہوں گے، ان کا مضائقہ نہیں، لیکن جب خبر ہوگی کہ یہ تو ایک بیچری کے تجویز کے ہوئے ہیں، تو ایک طوفان برپا ہوجائے گا. یہ خیال ان کا ایک حد تک صحیح تھا۔

دسمبر ۱۹۰۸ع میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس امرتسر میں ہونے والی تھی۔ مولوی صاحب بیمار رہ چکے تھے۔ جاڑوں میں سفر کرنا نہ چاہتے تھے۔ میں جا رہا تھا۔ مجھ سے کہا ہمارے اخبار کے لئے کانفرنس کی روداد لکھ کر بھیجنا۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ امرتسر پہنچ کر دیکھا کہ «زندہ دلاں پنجاب» بہت اچھا انتظام کر رہے ہیں۔ پھاٹک کے پاس ایک کمرے پر انگریزی حرفوں میں «انکوائری آفس» کی تختی لگی ہوئی ہے۔ کارکن صاحب سے ملکر کہا ایک تختی پر «دریافت خانہ» بھی لکھوا کر لگا دیجیے۔ بولے یہ لفظ تو سنا نہیں۔ انھیں تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد راضی کیا اور تختی لٹکا دی گئی۔ کچھ دیر میں استقبالی مجلس کے صدر اُدھر سے نکلے دیکھ کر بہت برہم ہوئے، تختی اتر گئی خیر، جب روداد «علی گڑھ گزٹ» [1] میں چھپی تو اس کے شروع کی چند سطروں کے بعد یہ فقرہ تھا: «دریافت خانہ اسلامیہ اسکول کے دروازے پر ہے جہاں سے ہر قسم کی اطلاعیں مہمانوں کو دی جاتی ہیں»۔ «رضا کار» اور «تناول خانہ» اس سے پہلے آ چکے تھے۔ ان اخباروں نے بھی، جو ان نئے سکوں کے بہت خلاف تھے، اس روداد کو بلا تکلف نقل کیا۔ «سلیم» برابر اس طرح کے لفظ یاد داشت میں ٹانکتے رہتے تھے اور مناسب موقع پر انھیں اپنی تحریر میں لے آتے۔ ان میں سے کچھ رہ جاتے، بیشتر چل پڑتے، جیسے

(۱) مورخۂ ۸ جنوری ۱۹۰۹.

« پرند چشم نظارہ (Bird's-eye view) ، طیارہ ، عصرانہ (ایٹ ہوم) ، عید ملاپ جلسہ ، غبارچی (غبارے میں بیٹھ کر اڑنے والا) ، لا حکومی (حکومت کا دشمن گروہ یا شخص) ، وطن پرست (نیشنلسٹ) وغیرہ » . یہ سب انہیں دنوں گڑھے گئے اور جاری ہوئے . نہ کوئی بحث چھڑی نہ مولانا کو جواب دینا پڑا .

علی گڑھ کا یہ دوسرا قیام زیادہ زمانے نہ چلا . برسات ۱۹۰۸ ع میں لرزے بخار کی سخت بلا سارے صوبے میں پھیلی. مولانا بھی مبتلا ہوئے . جب بیماری سے نجات نہ ملی ، ملیح آباد [1] جاکر کئی ہفتے ڈاکٹر عبدالکریم کے ساتھ رہے ، تندرست ہوکر واپس آئے . بڑا علاج یہ تھا کہ طبیب ہر وقت نگراں ، بدپرہیزی سے باز رکھے جاتے . ۱۹۰۹ ع میں پھر بیمار پڑے اور پھر علی گڑھ سے چل دیے ، مگر اس بار واپس نہیں آئے ، پانی پت سے استعفا آیا .

علی گڑھ میں ان کے حالات انہیں کی زبان سے سنیے . بے تکلف بیان کرتے : بچپن کی شرارتیں ، لاہور میں طالبعلمی کا زمانہ ، اپنی کس مپرسی کی کیفیت ، مولانا فیض الحسن کی شفقت ، بہاول پور اور رام پوراور آخر میں سرسید کی صحبتوں کی روداد ، سب کچھ کہتے اور بڑی بیباکی سے ، لطیفوں کی چاشنی کےساتھ . مولانا نے جب ان کی زدہ حالت اور ان کی ذہانت اور محنت کو دیکھا تو ان کو اپنے گھر میں بلالیا ، کھانا اپنے ساتھ کھلاتے . اس سے پہلے حال یہ تھا کہ امتحان کا نتیجہ بہت اچھا رہا جس کے صلے میں وظیفہ ملا : مبلغ تین روپئے ماہانہ جس میں سے دو ثلث ماں کو بھیج دیتے ، ایک تہائی اپنے لیے رہنے دیتے . پوچھا : « ایک روپئے میں مہینا کیونکر کٹتا تھا ؟ » بولے : « سن لیجیے ، نانبائی پیسے میں دو موٹی روٹیاں ، چمچہ بھر چنے کی دال ان کے اوپر رکھ کے دے دیتا تھا ، دن میں دو وقت پیٹ بھرجاتا تھا . کبھی‌کبھی ایک وقت ناغہ کر دیا تو پیسا بچ رہتا . رات کو مسجد میں جا لیٹتا ، کبھی کبھار کسی دوست کے گھر . یہ صورت کئی مہینے رہی پھر مولانا نے اپنے پاس بلالیا » ذہانت کا برا ہو ، شوخی اور بیباکی ان سے بھی کر جاتے تھے ، لیکن وہ فرشتہ خصلت چشم پوشی کرتے اور طرح دے جاتے .

---

(۱) پانی پت میں کسی کو خبر نہ ہوئی مولانا حالی نے کسی سے سنا کہ مولوی ,,سلیم،، حیدر آباد میں ہیں . انہیں تعجب ہوا کہ ان کو نہیں لکھا مولانا نے مولوی عبدالحق سے پوچھا (مکتوبات ج ۱ ، ص ۸۳) .
[کہنے والے نے غالباً ,, ملیح‌آباد ،، کو ,,حیدرآباد ،، کہدیا ہوگا .]

ایک شخص نہایت آزاد منش، مغربی شمالی صوبے کے باشندے، «حسامی» تخلص لاہور میں رہتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک بار ان کو «تھیٹر» لے گئے۔ انھوں نے کبھی یہ تماشا کاہے کو دیکھا ہوگا۔ بڑے شوق سے ساتھ ہولیے۔ جب جا رہے تھے دیکھا «حسامی» بغل میں کچھ دبائے ہوئے ہیں۔ دل میں کہا ہو نہ ہو یہ بوتل ہے۔ تماشاگاہ کے قریب پہنچے تو پوچھا: «آپ کی بغل میں کیا چیز ہے؟» جواب ملا: «بھائی، میری عینک ہے، تھیٹر دیکھنے کی»۔ تماشے کا وقفہ ہوا، لوگ باہر آگئے «حسامی» نے اپنی حسام نکالی اور خوب پی، کھیے چڑھالی گھنٹی بجی، پھر سب جاکر بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد «حسامی» نے شور غل مچایا اور ایک دنگا ہوگیا۔ تماشے والوں نے انھیں باہر نکال دیا۔ میاں وحید ان کے ساتھ، مگر اب بوتل ان کے قبضے میں تھی۔ اُدھر سے چھپنے کی کوشش ناکام رہی۔ گھر قریب آیا، یہ دوڑکر اندر جا پہنچے۔ سویرا ہو رہا تھا۔ نوکر سے کہا دروازہ بند کرلو۔ بوتل الماری میں رکھ دی تھوڑی دیر بعد نوکر نے پوچھا: «میاں، اس بوتل میں کیا ھے؟» کہا: «سرکہ ہے، پیٹ کے درد میں فائدہ کرتا ہے» اتفاق کہ دو چار دن بعد مولانا کو شکایت ہوئی تو پوچھا: «سرکہ ہے»؟ نوکر نے کہا: «جی ہاں» اور وہی بوتل اٹھا لایا۔ تھوڑا سا پیا اور لیٹ گئے صبح کو میاں وحید نے مزاج پرسی کی۔ مولانا نے فرمایا: «تمھارے سرکے نے بہت نفع کیا، فوراً نیند آگئی۔» آپ نے کہا: «وہ سرکہ نہ تھا۔ وہ تو حسامی کی عینک تھی۔» مولانا نے تشریح چاہی۔ انھوں نے ساری کہانی سنادی۔ مولانا نے نوکر کو پکارا: «گرم پانی اور نمک لاؤ....»

سر سید کی خدمت میں پہنچے تو بہت خوش رہے، اور یقین ہوتا ہے کہ پہلے سے تیاری کرکے علی گڑھ آئے تھے، [1] اسی لئے بہت جلد سید صاحب کی تعلیمات کو اخذ کیا۔ اکثر کہتے: «مجھے تو سید صاحب نے انسان بنایا، ورنہ میں ذرا ملاّنا رہتا، کہیں میانجی گری کرتا یا کسی مسجد میں موذنی کرتا ہوتا» دیر تک ان کا تذکرہ کرتے اور آبدیدہ ہوجاتے۔ کبھی کہتے: «اُس سید والاتبار نے اپنا آرام قوم پر نثار کردیا۔ قوم نے اس کی قدر نہ پہچانی، اس کی دشمن بن گئی۔ یہ انھیں کی ذات تھی جس کا فیض تھا کہ سنی، شیعہ، وہابی اور مسلمانوں

---

(۱) «مکتوبات» ج ۲، ص ۱۸۴ پہلی چودہ پندرہ سطریں۔

کے سارے فرقوں کے بچے مل جل کر رہتے اور ایک مسجد میں نماز پڑھتے ہیں » . مولانا بڑے فخر سے اپنے کو « نیچری » کہتے تھے ، اور اس اصطلاح سے کئی نئی اصطلاحیں دوستوں میں بیٹھ کر اس انداز سے اپنی تقریر میں لاتے گویا کہ یہ صدیوں پرانے لفظ ہیں جو لغت کی پرانی کتابوں میں ضرور آئے ہوں گے. سننے والوں کو متحیر دیکھ کر مولانا ہنستے ، پھر تشریح کرتے . « سنچری : وہ نیچری جو سنی سے نیچری ہوئے ، شیچری : شیعہ نیچری ، وہچری : وہابی نیچری وقس علی ہذا » .

سیدھی سادی اُردو نثر کی صراط مستقیم ، رقعوں اور خطوں کی حد تک ، مرزا غالب کھول چکے تھے ، دو چار مناظرانہ تحریریں بھی ، « قاطع برہان » کے سلسلے میں ان کے قلم سے « سادہ و سرسری » اردو میں نکلیں ، لیکن وہ فارسی خوانوں کے دائرے سے باہر گویا آئیں ہی نہیں . ان کے کم عمر دوست سید احمد خاں میدان میں آئے ، تو اُن کے ساتھ اچھا خاصا ایک اکھاڑا : حالی ، محسن‌الملک ، شبلی نعمانی وغیرہ جن میں سے ہر پہلوان اپنے فن کا اُستاد نکلا . سید صاحب کے شاگردوں میں « سلیم » ، عنایت‌اللہ [1] ، عبدالحق [2] بہت نمایاں ہیں . سلیم کی آزادی پسند طبیعت اخبار نویسی کی طرف بڑھی . پہلے « معارف » (ماہانہ) نکالا جس کی اِدارت کا پہلا قدم تھا : ایڈیٹر کو مضمون نگاروں کی عبارتوں میں حک و اصلاح کا اختیار ہوگا. مولانا حالی ، نواب محسن‌الملک وغیرہ نے خوشی خوشی اِقرار نامے لکھ دیے . « علی گڑھ گزٹ » کے لیے جو مسودے آتے ، اُن پر « سلیم » کا اِصلاحی قلم بےدھڑک رواں ہوتا. یہ روش « مسلم گزٹ » میں اور تیز ہوگئی . اِس لیے کہ اب آزادی کا میدان زیادہ وسیع ملا . یہی حال « زمیندار » کے دور میں رہا ہوگا

« علی گڑھ گزٹ » میں بھی ، خاص کر ۱۹۰۸ع میں ، ایران اور ترکیا کے اِنقلابوں کے موقع پر بڑے جوشیلے مضامین لکھے تھے . جب ایران پر روسیوں نے نرغہ کیا ، تو اُن کے خلاف ، پھر ستّار خاں نے انقلاب کا جھنڈا اُونچا کیا . تو اُن کی حمایت میں لکھتے رہے . جوان ترکوں نے عبدالحمید ثانی کو خلافت کی مسند سے اُتار دیا تو جوان ترکوں کی ثنا و صفت میں وہ اِداریہ لکھا جس کا عنوان تھا :

(۱) سوانح عمری مولانا عنایت‌اللہ مرتبہ شیخ اسماعیل ، لاہور ۱۹۳۹ ع ، خصوصاً ص ۲۵ .

(۲) انھوں نے تو زندگی ہی اردو کی خدمت میں وقف کردی ـ اللہ اور برکت دے .

« قسطنطنیه میں آزادی کی صبح اول » اور جسے پڑھ کر اُن لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں جو اُس وقت تک سلطان عبدالحمید کا کلمه پڑھتے تھے ۔ لیکن عملی سیاسیات میں « سلیم » نے کبھی حصه نہیں لیا ، نه کسی سیاسی ادارے کے رکن بنے . کہا کرتے تھے : « اخبار نویس کو ان چیزوں سے الگ رہنا چاہیے . »

اگست ۱۹۱۲ میں میں بیرون ہند جارہا تھا . دوستوں سے رخصت ہونے لکھنئو گیا مولانا سلیم سے بھی ملا . اخبار کے کام میں ہمه تن مصروف اور بہت خوش تھے ، صحت بھی بہت بہتر . « درد » اور سید میر جان ، مالک اخبار سے تعارف ہوا جو مولوی صاحب کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گذارتے تھے .

اپنی حیات کا اخیر زمانه مرحوم نے حیدر آباد میں یکسوئی کے ساتھ ادبی علمی اور تعلیمی کام میں گذارا . اُن کی قدر بھی خوب ہوئی . سیدراس مسعود اور مولوی عبدالحق جن کی سعی سے جامعهٔ عثمانیه کی بنا ہوئی ، نواب صدر یار جنگ حبیب‌الرحمن خاں شروانی (ناظم امور مذہبی) جو ان کے ہمراہ تھے مولوی « سلیم » کی قابلیت اور ان کے کارناموں سے بخوبی واقف تھے . سر اکبر حیدری (بعد کو « حیدر نواز جنگ ») نے دو چار ہی ملاقاتوں میں « سلیم » کو پہچان لیا اور وه اکثر اُنھیں « ڈاکٹر جانسن » کے لقب سے یاد کرتے . تعلیمّیات کے ماہر ، جامعهٔ لکھنئو کے پہلے وائس چانسلر گتیندر ناتھ چکرورتی ، خاص کر جامعهٔ عثمانیه دیکھنے آئے . مولانا سلیم کے درس میں بھی گئے . باہر آکر بہت تعریف کی . حق یه ہے که « سلیم » نے جتنے کم عرصے میں اپنے شاگردوں میں علم کا شوق پیدا کر دیا اُس کی مثالیں کم ملتی ہیں .

علاوه « وضع اصطلاحات » کے ، متعدد مقالے ، مختلف مباحث پر ، لکھے جن میں سے بیشتر رساله « اُردو » کی جلدوں میں محفوظ ہیں [1] . اور رسالوں میں بھی اُن کی نظم و نثر شائع ہوتی رہی تھی . [2] جو نظمیں اُنھوں نے « مسلم گزٹ » اور

(۱) اصول وضع اصطلاحات اردو جلد ۱۹۲۱ ع (شماره اپریل) ص ۷۳ ـ ۸۳ ، (۲) « تلمیحات » ـ ج ۱۹۲۱ ، ص ۴۴۳ ـ ۴۶۷ اور ۱۹۲۲ ، ص ۸۵ ـ ۱۳۰ (۳) « تلسی داس کی شاعری » ـ ح ۱۹۲۵ ، ص ۳۷۷ ـ ۴۲۶ ، (۴) « عرب کی شاعری » ایضاً ۵۴۷ ـ ۵۹۴ ، (۵) « آینده کا خواب » (نظم) . ایضاً ص ۶۳۹ ـ ۶۴۳

(۲) ہندوستان کی عام زبان (« ہمایوں » لاہور مارچ ۱۹۲۳ ص ۱۶۷ ـ ۱۸۷)
« دکن میں ایک رباعی گو شاعر » (« زمانه » ، کانپور ، اپریل ۱۹۲۸ ، ص ۳۳۸ ـ ۳۴۴)
« جذبهٔ نو » ۱۱ بیت کی (نظم) (" مئی " ۴۳۹)

« زمیندار » میں وقتاً فوقتاً شائع کیں وہ ہمیشہ فرضی نام سے اخبار میں درج ہوئیں اور وہ اب ہاتھ بھی نہیں آسکتیں۔

ایک اور بڑی خوبی ان کے خصائل میں یہ بھی کہ طالب علمی دور میں حس بیدست و پائی سے دو چار رہے تھے اسے بھولے نہیں، بلکہ اس سے یہ سبق حاصل کیا کہ انسان کو کمانا چاہیے، تاکہ اوروں کو مدد دے سکے : نہ یہ کہ سب اپنے ہی پیٹ میں اتارتا چلا جائے۔ یہ بات ہر شخص کے سامنے کہتے تھے۔ جب عسرت کا زمانہ گذر گیا اور عشرت نے جلوہ دکھایا، تو بھی عمل وہی پرانا جاری رہا اپنی ذات پر کم سے کم صرف کرتے۔ بے تکلف احباب کو نصیحت کرتے : آرایش و زیبایش میں پیسا پھینکنا نہایت نازیبا بات ہے۔ شاید اس خصوص میں وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے، لیکن جو عادت سالہا سال کی تنگدستی میں پڑ گئی تھی اس کے چھوڑ دینے سے انھیں راحت نہیں مل سکتی تھی۔ پہلے جب آمدنی قلیل تھی اقربا کی خبر حتی‌الوسع لیتے رہتے مزاج کے تیکھے تھے۔ ذرا سی ناگواری پر نوکری کو ٹھوکر مار، بلا توقف پانی پت کی راہ لیتے اور جو کچھ تھوڑا بہت پس‌انداز کرلیا تھا اسی پر قناعت کرتے اور کوئی کاروبار کر لیتے یہاں تک کہ کوئی اور ملازمت گھر بیٹھے آجاتی بستر لپیٹ کے نوکری‌پر چل دیتے۔ ہر حال میں خوش رہتے۔

(۱) عثمانیہ کالج کے کئی طالب علموں نے سرکاری نوکریوں کے لیے درخواست دی صدر کالج نے ان کو سمجھایا کہ سب کی درخواستیں بھیجی تو جاسکتی ہیں لیکن ممکن ہے کامیاب ایک بھی نہ ہو۔ بہتر صورت یہ ہوگی کہ سب مل کر تدبیر کریں اور کوئی کارخانہ ایسا کھولیں کہ ملک کے مصنوعات کو ترقی ہو اور ان کی فروخت سے جو نفع ہو اس میں سے اگلے سال کے تخمینی اخراجات ایک رقم مد محفوظ میں جمع رہے، باقی منافع حصہ‌داروں پر تقسیم ہوں۔ تین چار نوجوان آمادہ ہوگئے۔ کام چل نکلا۔ لوگ حیرت میں تھے کہ لڑکوں نے ساجھے کی ہنڈیا خوب پکالی۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ مولانا « سلیم » نے کئی ہزار قرض، بے سود بٹے کے، دے دیا تھا اور رسید تک نہ لکھوائی۔

(۲) « شرر » کی یادگار میں انجمن ترقی اردو نے انعامی مضامین کی تجویز کی پہلا انعام دو سو روپے سالانہ کا مولانا نے اپنے ذمے لیا۔ (تفصیل

«چند ہمعصر» ص ۱۰۳).

(۳) ان کی وفات کے دس گیارہ برس بعد الہ آباد میں ایک نوجوان بی. ایس سی.، میں داخل ہونے آیا، مجھے ایک خط اپنے والد کا دیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ صاحبزادے مولانا سلیم کے ایک مخلص دوست کے بیٹے ہیں اور مولانا نے اپنی حیات میں ان دونوں بھائیوں کی تعلیم کی غرض سے ایک بیش قرار رقم محفوظ کردی تھی اور جیسا کہ بعد کو دریافت ہوا دونوں نے مغربی ملکوں میں پہنچ کر اعلیٰ تعلیمی مدارج حاصل کیے۔

ایک معکوس معاملت: علی گڑھ میں مجھے «سلیم» نے بتایا کہ ان کی اولاد فقط ایک لڑکی تھی. اس کی شادی کے سامان کی تیاری میں جو کچھ پاس تھا سب خرچ ہوگیا، تین سو کی ضرورت اور تھی. قرض کبھی لیا نہ تھا. دوستوں پر نگاہ دوڑائی. ڈھب کی اسامی شمس العلما نذیر احمد دہلوی خیال میں آئے. ان سے کہا روپیہ مل گیا. کئی مہینے بعد روپیہ واپس کرنے گئے. انھوں نے خفا ہوکر کہا: «لڑکی میری ہے. آپ کون ہوتے ہیں؟»

مولانا سلیم کی وفات کے بعد سنا گیا کہ بیٹی کےلیے تقریباً انھائیس ہزار نقد ترکہ چھوڑ گئے تھے.

« وضع اصطلاحات »

« وصع اِصطلاحات » کی تالیف ۱۹۲۱ ع میں حتم ہوئی. کتاب اسی سال انجمں ترقی اردو کو سپرد ہوئی، علی گڑھ میں چھپی. کتاب کے سر ورق پر ۱۳۳۹ ھ اور ۱۹۲۱ ع درح ہے (یعی یکم فروری اور ۳ ستمبر کے درمیان کسی وقت) مگر حقیقت میں اشاعت کی نوبت بہت بعد آئی. مصنف نے جو غلطامہ پہلے بنایا تھا ناکافی ثابت ہوا اور دوسرے غلطامے کے چھپوانے میں اور زیادہ تاحیر کا احتمال تھا، انھوں نے مزید اصلاح اپنے قلم سے کرکے چند نسخے صحیح کیے حں میں سے ایک نسخہ مجھے دیا اس فرمایش کے ساتھ کہ میں اسے غور سے مطالعہ کرکے کتاب کے بارے میں حو میرا خیال ہو اسے قلمبند کردوں حہاں تک یاد ہے یہ ۱۹۲۳ ع کا آغاز تھا، حبکہ حامعۂ عثمانیہ میں بی. اے کا پہلا امتحاں ہونے کو تھا اور اگلے تعلیمی سال کے آغاز میں ایم. اے کی تعلیم کا انتظام درپیش مولانا نے حود کہا کہ تبصرے کا کام فرصت ہونے پر رکھنا مناسب ہوگا. ۱۹۲۴ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی حدمت قبول کرکے، میں وہاں چلا گیا حس سے التوا کو کچھ اور طول ہوگیا. — اپریل ۱۹۲۶ میں تبصرہ ہوسکا اور میں نے ان کے حیدرآباد کے پتے پر حط بھیجا. اس کے حواب میں ان کا ۲۲ مئی کا لکھا حط آیا تو تبصرہ بریلی بھیج دیا. رسید ۱۴ جون کے خط نے دی. اس کے بعد کوئی خط نہ آیا. کئی مہینے گذر گئے تو اندیشہ ہوا کہ تبصرہ شاید پسند نہیں آیا.

کچھ دن انتظار کرکے میں نے انہیں لکھا کہ اگر تبصرے میں کوئی بات آپ کو پسند نہ ہو تو براہ کرم اس سے مجھے اطلاع دیجیے تاکہ میں کچھ عرض کر سکوں اس کے جواب میں ان کا تیسرا عنایت نامہ صادر ہوا. اگلے اوراق میں ان کے تینوں خط نقل کیے حاتے ہیں اور احیر حط کا عکس بھی.

دوسری اشاعت کی نوبت ۱۹۵۷ ع میں آئی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی. حجم ۳۱۸ صفحے. (بجائے طبع اول ۳۰۵ ص) غلطنامہ ندارد.

پہلی اشاعت کی کچھ غلطیوں کی تصحیح اس میں ہوگئی لیکن بیشتر باقی رہیں اور کچھ نئی غلطیاں در آئیں۔

اب چونکہ پہلی اشاعت کے نسخے نہیں ملتے اس لیے از سر نو ایک غلطنامہ ترتیب دیا گیا ہے جو ان اوراق میں شامل ہے اور اس میں صرف نئی (کراچی والی) اشاعت کے صفحوں کی گنتی سے کام لیا گیا ہے۔ اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ اس غلطنامے میں کل غلطیاں آجائیں۔

وضع اصطلاحات پر تبصرہ

(جو مصنف کی فرمایش پر ان کی خدمت میں ۱۹۲٦ ع میں بھیجا گیا تھا)

دیباچہ

ص ۲ ، س ۳ (۱ ، ۱۰)[1] : « ہیں » کے بعد مناسب ہوگا کہ ان نئے لفظوں کی ایک مختصر فہرست دی جائے جنھیں مصنف نے جاری کیا تھا اور وہ لفظ عام طور پر رائج ہوگئے .

ص ۴ ، س ۵ ـ ٦ (۳ ، ۱۸ ـ ۲۰) : « میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب آج تک نہ یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے ، نہ ایشیا کی کسی زبان میں » . اس عبارت کو زرا نرم کردیجیے اس لیے کہ یورپ کی بیشتر زبانوں میں اس مبحث پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ایشیا کی زبانیں بھی سراسر اس سے خالی نہیں ہیں .

متن کتاب

ص ۱ (عنوان) : « اصول اصطلاح سازی » کی جگہ اگر « اصطلاح سازی کے اصول » ہو تو کیا مضایقہ ہے ؟ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر میرے نزدیک بعضی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہم ہیں . کتابوں کے ناموں ، بابوں اور فصلوں کے عنوانوں تک کے لیے جب اردو ترکیبیں نہیں استعمال کی جاتیں تو اردو کی ترقی معلوم . سب سے بڑی خدمت ہماری زبان کی یہ ہوگی کہ اسے اپنے پانؤوں پر کھڑے ہونے میں مدد دیجیے . میں جانتا ہوں کہ آپ کی بھی یہی راے ہے اس لیے اور بھی آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی تصنیفوں کے نام ان کی فصلوں کے عنوان اور گنتی سب کچھ اردو ہی رکھیے . لوگ اکثر گنتی فارسی میں لکھتے ہیں : « فصل دوم » « باب پنجم » وغیرہ حالانکہ تھوڑی ہی دور چل کے فارسی گنتیاں بول جاتی ہیں ، اس لیے کہ فارسی کے بہت سے لفظ

---

(۱) قوسین کے اندر دوسری اشاعت کے معادل ہندسے ہیں .

« شانزدہم ، بیجدہم » وغیرہ اردو کے لیے ایک بار ہیں. خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنی کتاب کے مختلف حصوں (یا ٹکڑوں) کے ناموں میں فارسی ترکیب کو بہت کم دخل دیا ہے.

ص ۲ ، نیچے سے پانچویں سطر (۳ ، ٦) : « جب زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی... ہاتھ پاوں اور آنکھوں ... الخ » . لسانیات والوں نے اس مسئلے پر بہت کچھ بحث کی ہے کہ « زبان ایجاد ہوئی یا انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی »[1] مدتوں اس پر تقریر و تحریر ہوتی رہی اور اب لسانیات کا کوئی ماہر ایجاد والے نظریے کا قائل نہیں. عام طور پر جو نظریہ مقبول ہے وہ یہ ہے کہ « زبان انسان کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آئی گوکہ اس کے ابتدائی مدارج میں لفظوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور یہ کمی اکثر و بیشتر اشاروں اور مختلف اعضا کی خاص خاص حرکتوں سے پوری کی جاتی تھی ». پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان جملوں کے بعض لفظوں میں تھوڑی سی رد و بدل فرمادیں، مثلاً اس طرح پر : « جب انسانی زبان اپنی ارتقا کے ابتدائی مرحلوں کو طے کررہی تھی تو آوازوں کی جگہ اکثر و بیشتر اعضائی اشاروں سے کام لیا جاتا تھا اور ایک شخص اپنے دل کا مطلب دوسرے شخص کو ... الخ »

ص ۳ ، س ۱ (۱۲) : « جن جزائر کی وحشی ... آوازیں پیدا ہوگئی ہیں » . اس میں مجھے شبہہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی بھی ہے جس کے افراد کسی ایک آواز کے ادا کرنے سے بھی مطلقاً عاری ہیں. میری راے میں بہتر یہ ہوگا کہ اس فقرے میں بھی الفاظ زرا ادل بدل دیے جائیں؛ جیسے « جن وحشی قوموں میں آوازوں کا ایک نہایت نامکمل سا نظام بھی قائم ہوگیا ہے ، ان میں اشاروں کی کمی ... الخ ». زرا آگے بڑھ کے سطر ۱۳ (۴ ، ۳) میں پھر تھوڑی سی ترمیم ضروری معلوم ہوتی ہے. « الفاظ اس لیے ایجاد کیے گئے تھے » کی جگہ « الفاظ وضع ہوئے تھے » ہوجائے تو غالباً بہتر ہوگا. یا محض « وضع ہوئے » کی جگہ « وضع اور ایجاد ہوئے » کردیجیے تو بھی چنداں مضایقہ نہیں.

ص ٦، س ۱ (اخیر) : « الفاظ کی تاریخ » کی جگہ « الفاظ کی پوری تاریخ »

(۱) پرانے زمانے میں اس بحث پر عربی میں بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے (ملاحظہ ہو « مزہر »، سیوطی ، ج ۱، نوع اول ، نیز « خصائص »، ابن جنی ، ج ۱ ، طبع مصر ، ص ۳۹)

ہو تو زیادہ مناسب ہوگا. ص ۸، س ۱۲ (۹، ۱۷) « یورپ کی علمی زبان تمام ممالک یورپ کے لیے ایک بین‌قومی زبان ہے » یہ خیال صحیح نہیں کہ تمام ممالک یورپ کے لیے ایک مشترک علمی زبان ہے یا مشترک علمی اصطلاحیں سارے یورپ میں مستعمل ہیں. واقع میں صرف اس قدر ہے کہ لاتینی خاندان کی یورپی زبانوں میں علمی اصطلاحیں صورۃً مشترک ہیں، تلفظ کے لحاظ سے مشترک نہیں. اس لیے کہ ہر زبان کے بولنے والے ان لفظوں کا تلفظ اپنی اپنی زبان کے رواج کے مطابق کرتے ہیں مثلاً ایک ہی لفظ کا تلفظ فرانسیسی اور طرح سے کرے گا اور اٹیالی اور طرح سے۔ انگریزی زبان پر لاتینی کا اثر بہت وسیع اور بہت گہرا ہے اس لیے انگریزی اس خصوص میں بھی لاتینی زبانوں کے گروہ میں جا ملی ہے. مگر سوا انگریزی کے جتنی زبانیں جرمانی (یاتیوتونی) خاندان کی ہیں ان سب کے بولنے والوں نے اپنی اپنی زبان میں خاص اصطلاحیں بنالی ہیں اور لاتینی کے علمی اثر کے زمانے کی یادگار کے طور پر جو لاتینی یا یونانی اصطلاحیں باقی رہ گئی ہیں ان کو وہ اپنی زبان سے برابر خارج کرتے جاتے ہیں. چنانچہ جرمانی، ولندیری، ڈینی، سویڈی اور فلامی (یعنی فلیمش) زبانوں کا یہی حال ہے. ہاں یہ ضرور ہے کہ اہل علم چونکہ بیشتر لاتینی جانتے ہیں، لاتینی اصطلاحوں سے بھی واقف ہیں. لیکن عوام اپنی اپنی زبان کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں. علاوہ اس کے بعضے مضمونوں مثلاً فلسفے میں تقریباً تمام اصطلاحیں اپنی زبان کی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرمانی عوام بھی فلسفے کی کتابوں سے ذوق رکھتے ہیں اور یہی حال اور تیوتونی زبانوں کے عوام کا ہے. ص ۱۰، س ۹، ۱۰ (۱۱، ۱۸). « علاوہ ۰۰۰ کہ یورپ ۰۰۰ (نحو بالمقابلہ) ایک ہے ». یہ فقرہ بدل کے یوں کردیا جائے تو بہتر ہوگا: « علاوہ ۰۰۰ کہ نحو بالمقابلہ (کمپیریٹیوگرامر) کے لحاظ سے یورپ کی موجودہ زبانیں، لاتینی اور یونانی سے بعض خصوصیتوں میں مماثلت رکھتی ہیں »

ص ۱۱ (۱۳): دوسرے گروہ کے دلائل ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کیے جائیں تو بہتر ہوگا اس لیے کہ کتاب کی بنا انہیں دلائل پر ہے.

ص ۱۲، اخیر سطر (۱۴، ۱۹): «اصحاب‌الرائے». اس سلسلے میں، میں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر محض «صاحب رائے» کہا جائے تو کچھ مضایقہ تو نہیں، میرے نزدیک «صاحب رائے» اردو میں (مثل «مرد»، «آدمی»، «شخص» وغیرہ کے) واحد بھی ہے اور حالتِ قائم میں جمع بھی ہے. اس لیے

محض «صاحب رائے موجود تھے» کہا جائے تو کوئی حرج نہیں. البتہ دقت پڑے گی جمع محرّف کی حالت میں کہ اردو کے قاعدے کے مطابق — وں سے جمع بناتے ہیں اور «صاحب رایوں» ابھی تک فصاحت کے درجے پر شاید نہیں پہنچا ہے. میں تو ایسی حالت میں «صاحب رائے لوگوں» کہوں گا. بہت تکلف کیجیے تو «صاحب رائے حضرات» کہیے.

ص ۱۴، ۱۷ (۱۷، ۱) : «انڈو یوروپین» وغیرہ ناموں کے بعد، قوسین میں اردو نام بھی آجائیں تو بہتر ہو؛ اس طرح پر: انڈو یوروپین (یعنی ہند یورپی). انڈو جرمانک (یعنی ہندجرمانی)، انڈو کیلٹک (یعنی ہندکیلٹی).

ص ۱۵، س ۱۲ (۱۷، ۱۸) : «زند» کو یہاں سے نکال دیجیے تو بہتر ہوگا. زند کوئی زبان نہیں ہے، بلکہ اوستا کے متن کا کئی صدی بعد کی زبان میں ترجمہ ہے، اسی طرح پازند اس کی شرح ہے. لوگ غلطی سے زند اور پازند دونوں کو دو زبانیں سمجھ بیٹھے اور جہاں تک میں نے دریافت کیا یہ غلطی اولاً یورپی محققوں نے پھیلائی. مگر اب وہ اس غلطی کو خوبی سمجھ گئے ہیں اور اپنی تحریروں میں احتیاط سے کام لیتے گئے ہیں. البتہ اس فہرست میں آپ کردی کو داخل فرماسکتے ہیں. اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں تو بے محل نہ ہوگا کہ «پازند» میں جو «پا» ہے یہ قدیم فارسی کا سابقہ پتِ ہے (اوستا میں یہی لفظ پاءِتِ ہے اور سنسکرت میں پرَتِ). اس سابقے کے معنے ہیں «مقابل، جواب» چنانچہ پاسخ (وہ بات جو کسی بات کے مقابلے یعنی جواب میں ہو). اور پادست، پاسنگ، پاداش (= پہلوی پات دہِشن) میں پہلا جز یہی سابقہ ہے اور پا زہر (قدیم‌تر پاذ زہر) میں بھی یہی سابقہ ہے (قدیم ت بعد کی زبان میں «ذ» اور کچھ اور آگے بڑھ کر «د» ہوگئی ورنہ اصل میں پات زہر تھا، اور پاءِتِ یا پَتِ پہلوی میں پات ہوگیا تھا). اس نظر سے ص ۲۸ س ۶ میں ترمیم ضروری ہے (ص ۲۸ کی تعلیق بھی ملاحظہ ہو).

ص ۱۸ (۲۰): Free trade کو خارج کرنا بہتر ہوگا.

ص ۲۰ (۲۲) میں (اور اور جگہ بھی) کچھ انگریزی لفظوں اور ان کے یونانی یا لاتینی اجزا کی کتابت اردو، حرفوں میں کی گئی ہے. اس میں اکثر انگریزی «او» («o») کی جگہ الف لکھا گیا ہے. اگر بجائے الف کے واو

لکھا جائے تو اکثر و بیشتر اصل کے مطابق ہوگا اور انگریزی تلفظ سے بھی بعید نہ ہوگا، اس لیے کہ انگریزی تلفظ « o » کا نہ خالص الف نہ خالص واو، بلکہ دونوں کا مخلوط ہے مثلاً «ڈیماکریٹ» کی جگہ «ڈیموکراٹ» اور «لینواس» کے بجائے «لیتھوس» لکھنا بہتر ہوگا. اسی طرح «ہوموس» بجائے «نوماس» اور «گلوٹس» بجائے «گلاٹس» «موہو» بجائے «ماہو» زیادہ درست ہوگا.

ص ۲۱ (۲۴) « Extra assistant » کو نکال دیجیے تو بہتر ہوگا.

ص ۲۴ (۲۷) «آن» سے پہلے «اِک» (ایک) کے مرکبات کو داخل کرنا ضروری ہے: «اِک رحا» «اک رنگا»، «اکھا» (یک دہ) وغیرہ. اسی صفحے میں «بل ۰۰۰ آدمی وغیرہ» کو خارج کرنا بہتر ہوگا. فارسی میں نہ «بل» کوئی لفظ ہے (بمعنی بہت) اور نہ ہوس. اصل یہ ہے کہ عربی کے «ابو» کا الف اسی طرح گر گیا جیسے «آبا» اور «ابر» کا اور ناموں میں «ابو علی» کو «بوعلی» وغیرہ بولنے اور لکھنے لگے یہاں تک کہ «ابواسحق» کو «بسحاق» کرلیا. غالب نے برہان کے قول کو بجا رد کیا ہے. فرہنگ رشیدی کے مصنف نے بھی اسے مانا نہیں ہے.

ص ۲۸، س ۶ (۳۱، ۱۰) «پادست» کا یہ محل نہیں (دیکھیے تعلیق ص ۱۵، س ۱۲ پر)

«پادست» میں «پا» کے معنے «پانو» نہیں ہیں اور اسی لیے «پائدست» کا وجود زبان میں نہیں ہے. [پا کی قدیم‌ترین صورت پاد تھی جیسے بو کی قدیم ترین صورت بوذ (مجہول واو سے) تھی. بعد کو پای اور بوی اور پھر، آخری ی گر کر، پا اور بو بھی ایک شکل قرار پائی.]

پادست کی اصل ہے: پا = مقابل + دست. اور یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جیسے پسادست اور پسادست

ص ۲۹، س ۳ (۳۲، ۷): «(مخفف پانچ)» کے بجائے «(پانچ کا مخفف)» یقیناً بہتر ہوگا. اور چند سطر آگے بھی. [سنسکرت میں «پنچ» ہے (ساکن نون کے ساتھ). اس سے ہماری زبان میں تخفیف ہوکر پنچ (غُنہ کے ساتھ) ہوگیا اور پھر غنہ اڑ کر پچ رہ گیا.] ص ۲۹، اخیر سطر (۳۳، ۴) یہاں ایک حاشیہ دینا مناسب ہوگا: «پانچ کے بعد جب مرکب کا دوسرا لفظ ایسا آیا جس کا پہلا حرف چ کا ہم جنس تھا تو چ گرگئی جیسے پان چار، پان سات، پان سو، پان سیر

پھر حب ان مرکبوں سے اور لفظ مشتق ہوئیے تو پان مخفف ہوکر پن رہ گیا جیسے پسیری ، پنسیرا»۔ پنسورہ کو یہاں سے خارج کرنا چاہیے . اس لیے کہ اس کی اصل فارسی « پنجسورہ » ہے . ہندی کا پانچ اس کا جز نہیں. اس کے بعد ایک اور فقرہ بڑھانا چاہیے : « پن (ف ۵)۔ (فارسی پنج کا مخفف) پنسور پنشاخا (پانچ شاخوں والی مشعل) . »

[پنجشنبہ کا تلفظ اکثرو بیشتر پشنبہ ہی کیا جاتا ہے گوکہ لکھنے میں ج کو بحال رکھتے ہیں ، مگر پنجشاخہ مشکل ہی سے کوئی شخص بولتا ہوگا. سب پنشاخا ہی بولتے ہیں. رجب علی بیگ سرور نے « فسانۂ عجائب [1] میں لکھا بھی «پنشاخا » ہے]

ص ۳۱ ، س، ۴ ـ ٦ (۳۴ ، ۱۰): « پیش گو (وہ شخص ... پیش کرے) » . اس پر یہ حاشیہ دیا جائے تو مناسب ہوگا : « انگریزی Spokesman کا اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہوسکتا » .

ص ۳۱ ، س ۹ (۳۴ ، ۱۴): « تماسی» اصل کے لحاظ سے تو بالکل درست ہے. لیکن میں نے اس کا تلفظ « تواسی» زیادہ سنا ہے . اس کی مجھے تحقیق نہیں کہ دلی کے فصیح لوگ کیونکر تلفظ کرتے ہیں.

ص ۳۲ (۳۵ ، ۱۸) : دوسری سطر کے بعد « جگت » کو ضرور داخل فرمایئے « جگت آشنا ، جگت استاد ، جگت گرو ، وغیرہ » (سنسکرت کی «د» اردو میں «ت» ہوگئی ہے .)

ص ۳۲ ، س ۸ : امرود . جسے ہم «امرود» کہتے ہیں ایران میں ہوتا بھی ہے ؟ میں ہے جہاں تک تحقیق کی یہ میوہ ہندستان کے سوا کہیں نہیں ہوتا مگر « امرود » کا لفظ ہندستان کے مشرقی کنارے سے لے کر قریب مشرق تک بولا جاتا ہے فرق اتنا ہے کہ ہندستان سے باہر جہاں کہیں یہ لفظ بولا جاتا ہے اس سے «گلابی» یعنی «ناخ» «ناک» یا ناسپاتی مقصود ہوتی ہے . ترکی میں اس لفظ کو زیادہ تر قاب کے ساتھ «ارمود» بولتے ہیں مگر «امرود» بھی مستعمل ہے .

پس «خرامرود» کو « ایک قسم کی بےمزہ اور ناہموار ناشپاتی» سمجھنا چاہیے اور عجب نہیں اگر «بہی» کی کسی قسم کو کہتے ہوں. اس لیے کہ بہی ناہموار بھی ہوتی ہے اور بےمزہ بھی. یوں کھانے کے قابل نہیں ہوتی ، ہاں مربا اچھا ہوتا ہے . [2]

(۱) طبع کلکتہ ۱۲٦۲ ھ ، ص ۱۷٤ ، س ۲ .]
(۲) مزید تفصیل رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی ، لندن ، ۱۹۲۷ ع ص ٦۱ ـ ۵۵۹ میں .

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعضے «خر» والے مرکبوں میں «خر» کے معنے «بڑے» کے نہیں ہیں :

(۱) «خرمست» گدھے کی بے تمیزی ہمیشہ سے ضرب المثل چلی آتی ہے . میرا خیال ہے کہ «حرمست» کے اصلی معنے تھے «وہ مست جو اپنی مستی میں گدھے کی سی بےتمیزیاں کرے». مستی کے بھی تو مختلف درجے ہیں ؛ سرخوشی ، مستی ، مدہوشی ، حرمستی. اسی قبیل کا ایک دوسرا لفظ ہے ؛ «حرمت» («خرِبط»)

(۲) «حروار» (حربار) . (اتنا بڑا بوجھ جو ایک گدھا اٹھاتا ہے .) استعمال میں (یا محاورے میں) اس کے معنی («بڑے بوجھ») کے ضرور ہو گئے ہیں . اور «مشت» کے مقابلے میں «حروار» بہر حال بڑا ہی ہوگا .

(۳) «حرسنگ» : « بے ڈول کُڈھب یا ان گھڑ پتھر ». اور شاید «حرامرود » کا بھی یہی حال ہے «خرچنگ» حقیقت میں مرکب نہیں . یہ لفظ پہلوی «کرچنگ» ہے (اور «حر» پہلوی میں بھی «خر» ہی ہے ، « کر» نہیں ہے . اوستا میں گدھے کے لیے «حر» موجود ہے) یونانی میں «کیکڑا Karikinos (کرِکینوس» ہے). بہرحال «کرچنگ» پرانا لفظ ہے اور اسے «گدھے» سے کسی طرح کا لگاو نہیں ہے . بعد کی فارسی میں کاف ، ح سے بدل گیا ہے . اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ زبان میں بہت سے ایسے مرکب لفظ پیدا ہوگئے تھے جن کا پہلا ٹکرا «حر» تھا ، انھیں پر قیاس کرکے لوگوں نے شاید کاف کو غلط سمجھا اور ح کو صحیح تصور کیا .

« حرگاہ » میں بھی « حر » ، « بڑے » یا « گدھے » کے معنے نہیں رکھتا ، نہ اس طرح « حرگاہ » کی ترکیب درست ہوسکتی ہے . میری دانست میں یہ «حر» ایک صورت ہے خُرّہ (یا خَرّہ) کی جس کے معنے ہیں « شوکت ، جاہ و جلال ، فر ». اس طرح « حرگاہ » کے معنے ہوں گے « فرّ و شوکت کی جگہ ». اسی «خُرّہ» کی ایک شکل « خَوَرنَہ » بھی ہے جس سے آپ کا عربی « خَورنق » ہے . « خرمن » کے متعلق بھی مجھے شبہ ہے مگر میں اس وقت اس کا کوئی اشتقاق پیش نہیں کرسکتا . میرے شبہے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا تلفظ خ کے کسرے کے ساتھ بھی ہوتا ہے .

ص ۳۳ (۳۶) : « خوش » کے بعضے مرکب « ہلکے » یا « آزاد » کے معنے رکھتے ہیں . جیسے « خوش غلاف » ، « خوش باش » وغیرہ . ان کے معنوں

کی تشریح کردی جائے تو بہتر ہوگا،

ص ۳۴ (۳۷): «دو» (اور «دُ») کو بھی داخل کرنا چاہیے. ص ۳۴، س ۷ (ن س). «در بہشت» فارسی میں تو ہے نہیں. اردو میں ایک مٹھائی کو کہتے ہیں، یہ نہیں معلوم کیوں. پھر «در» کے معنے (اس لفظ میں) «میں» کے کیوں کر مان لیے جائیں؟

ص ۳۶ (۳۹): «سَر» اور «سِر» کو الگ الگ قائم کرنا بہتر ہوگا.

ص ۳۹، س ۳ (۴۲، ۷): «سمدھیانہ» میرے نزدیک «سمدھیانا» لکھا جائے تو اچھا ہے. اسی طرح «گھرانا» اور اس قبیل کے سارے ٹھیٹ اردو لفظ.

ص ۳۹، س ۵ (۴۲، ۹): «سِہ کرّر» میرے نزدیک «سِکرّر» ہونا چاہیے، اس لیے کہ یہ «مُکرّر» کا تابع مہمل معلوم ہوتا ہے، اسی طرح جیسے «مِلنا جُلنا»، «میل جول» میں «جلنا» اور «جول».

ص ۳۹، س ۱۳ (۴۲، ۱۷): «شہ مات» میں «شہ» کے معنے «بڑی» اس لیے نہیں ہوسکتے کہ اس کے مقابلے میں کوئی «چھوٹی مات» نہیں ہوتی؛ بلکہ مات تو اسی وقت ہوتی ہے جب «شاہ» پر ایسی زد پڑے کہ اس سے بچنے کے لیے اسے کوئی گھر نہ ملے. ہر زد جو «شاہ» پر پڑے اسے شطرنج کی اصطلاح میں «کِشت» کہتے ہیں. اور جب کِشت پڑتی ہے تو مخالف کھلاڑی «کِشت» یا «شہ» کا لفظ بلند آواز سے کہہ دیتا ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ «شاہ پر زد پڑرہی ہے، اسے بچاؤ». شہ کا لفظ پہلے تو تہدید کے لیے استعمال ہوا، پھر «کِشت» یا «زد» کا مرادف ہوگیا اور «مات» بغیر «کِشت» کے ہو نہیں سکتی. پس «شہ مات» اور «مات» ایک ہی چیز ہے. عربی میں «الشاہُ ماتَ» کہتے ہیں. بغیر شہ (کِشت) پڑے اگر بادشاہ کوئی معقول چال نہ چل سکے تو اسے «زِچ» ہوجانا کہتے ہیں. اس کو «مات» مشکل ہی سے کہہ سکتے ہیں. ایک صورت ہار کی یہ ہے کہ مخالف کے سب مُہرے مار لیے جائیں، صرف شاہ رہ جائے، اسے بھی «مات» نہیں کہتے، بلکہ «بُرد» کہتے ہیں. «قائم» یا «چومُہری قائم» کھیل کی اس آخری صورت کو کہتے ہیں جس میں دونوں کھیلنے والوں کے پاس صرف دو ہی دو مُہرے (مع شاہ کے) باقی رہ جائیں. یہ نہ ہار ہے نہ جیت، بلکہ دونوں کھیلنے والے اس میں برابر سمجھے جاتے ہیں. البتہ مات کی ایک قسم ہے جو معمولی مات سے زیادہ بڑی شکست سمجھی جاتی ہے. اسے «پیاد مات»

یا « پیدل مات » کہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں پیادے سے شہ دے کے مات دیتے ہیں. ایک اس سے بھی زیادہ ذلیل صورت ہار کی ہے، مگر وہ مات نہیں. اسے « شُتر گردش » کہتے ہیں. « کسی کو شہ دینا » کا محاورہ بھی اسی شطرنج کی اصطلاح « شہ » پر مبنی ہے.

« شاہ نشین » اور شہ نشین » میں بڑائی کے معنے کہاں ہیں؟. « وہ جگہ جہاں بادشاہ بیٹھے ». پہلے صرف شاہی مکان میں اس قسم کی ممتاز جگہ ہوتی تھی. پھر اسی قسم کی نشست گاہ اور مکانوں میں بھی بننے لگی تو اسے بھی «شہ نشین» کا نام ملا. اگر یہاں « شہ » بڑے کے معنے میں ہوتا تو مرکب « شہ نشست » ہوسکتا تھا نہ کہ « شہ نشین ».

« شاہ بدر » کو یقیناً یہاں سے خارج کرنا چاہیے. یہ اضافی مرکب ہے اور فکِّ اضافت واقع ہوا ہے. « شاہ رخ » بھی « بڑا رخ » نہیں. « رخِ شاہ » کے معنے رکھتا ہے.

ص ۴۲، س ۱۲ (۴۵، ۱۸). « میر شکار » کے دوسرے معنے کیوں چھوڑ دیے؟ یہ چونکہ صحیح معنوں میں اصطلاح ہے، اس لیے اصطلاحات کی بحث میں اس لفظ کا ذکر کرنا خلاف تہذیب بھی نہیں.

ص ۴۵ (۴۸)؛ « نو » (۹) کو بھی داخل کرنا چاہیے، جیسے « نورتن »، « نولکّھا » (ہار)، » نوگّا » وغیرہ.

ص ۴۸ (۵۲، ۱)؛ « یکلو (گنجفہ کا یکہّ) ». اردو میں اکثر، اِکاّ، اور «اِکلو» مگر ان دونوں کا مفہوم ایک نہیں. گنجفے میں چار باریوں کے اِکوّں کی قیمت « ایک عدد » ہے، باقی چار بازیوں میں اِکاّ قائم مقام دہلے کا ہے، یعنی ترتیب الٹ گئی. بخلاف اس کے « اِکلو » کھیل کے دوران میں بنتا ہے. جب گنجفے کے ۹۶ پتے (یا ورق) تینوں کھلاڑیوں پر بانٹ دیے جاتے ہیں، تو ہر کھلاڑی اپنے ۳۲ پتوں کو بازیوں کے لحاظ سے ترتیب دیتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کون کون سے پتے اِکلو ہیں اور کون سے کھیل کے دوران میں اِکلو بن سکیں گے. فرض کیجیے کہ اس کے ہاتھ میں ایک رنگ (یا بازی) کے مسلسل ۵ پتے (میر، وزیر، دہلا، نہلا، اٹّھا) ہیں. تو ان میں سے پہلے ۴ پتے اِکلو ہیں اور جب اس کھلاڑی کی باری آئے، اسے پہلے اِن چار پتوں کو

میدان میں ڈال دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو چاروں اِکلو سوخت ہو جائیں گے۔ ایک دوسری صورت لیجیے: کھلاڑی کے پاس ۴ پتے (وزیر، دہلا، نہلا، اٹھا) ہیں۔ کھلاڑی اٹھا سر کرے گا۔ حس کے پاس میر ہے، وہ اٹھے کو لے جائے گا۔ اب جو باری پہلے کھلاڑی کی آئے گی، اس کے تین پتوں میں سے اوپر کے دو اِکلو ہیں، وہ کھیلے جائیں گے۔

فارسی میں «لو» تہ یا پرت کے معنی پر آتا ہے۔ «یکلو» ایک اکہرے تار یا دھاگے کو کہتے ہیں؛ «کفشِ یکلو» وہ جوتا جس کا تلا اکہرا ہو یا جس میں استر نہ ہو۔ گنجفے کے اِکلو («یکلو») کی بنا یہی معلوم ہوتی ہے کہ اکاؤ گویا ایک اکہرے تار میں پروئے ہوئے ہیں۔

ص ۴۹ ـ ۵۲ (۵۲ ـ ۵۶) اور اور بھی کئی جگہ۔ جو انگریزی لاحقے لکھے گئے ہیں ان کا پہلا حرف بھی چھوٹا ہونا چاہیے۔

ص ۵۳، س ۶ اور ۱۳ (۵۷)۔ بجائے «امر» کے «مادّہ» یا «بِنا» زیادہ مناسب ہوگا۔

ص ۵۴، س ۲ (۵۸، ۷) «کھیدا»۔ «کھیدا» (بیای مجہول) چاہیے تھا۔ ہاتھی کے پکڑنے کے لیے گڑھا۔ س ۷۔ اس سلسلے میں «ڈیڑھ حما» (بیچہ) ضرور ہو۔ ترکیب کے عام دستور کے مطابق اس لفظ کی مجہول یے کو تخفیف کے ساتھ بولتے ہیں: «ڈِرھ حما»۔

ص ۵۵، س ۱۸ (۶۰، ۴)؛ اس میں مجھے شبہہ ہے کہ «پُچارا»۔ «پوچھنا» سے بنا ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ حکایت صوت پر مبنی ہے اور «پُچ پُچ» سے بنا ہے۔ جب کسی کپڑے یا روئی کی پوریری کو کسی رقیق چیز میں لت کرکے کسی چیز پر ماریے تو «پُچ پُچ» آواز نکلتی ہے، جیسے کباب کی سیخ پر گھی کا پُچارا دیتے یا دیوار کی پوتائی (نرم کونچی سے) کرتے وقت۔

ص ۵۶، س ۲۰ (۱۶، ۸): «بھڑاس» کو بھی داخل کرنا ہوگا۔

ص ۵۹ (۱۳) کا «الا» اور ۶۰ (۶۴) کا «الہ» دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ دونوں کے آخر میں الف چاہیے: «ہمالا» اور «شِوالا»۔

ص ۶۰، س ۱۹ (۱۵): «میان» کے ساتھ «مِلان» کو بھی آنا چاہیے۔

ص ٦٢، س ١٠ (٦٧، ٨): یوں چاہیے «انا (ہ) (ظرفیت) سرھانا، گھرانا، سمدھیانا، وغیرہ». («گھرانا» اور «سمدھیانا» میں مجموعے کے معنے بھی ہیں: گھرانا = کنبا، خاندان؛ سمدھیانا = سمدھی کا خاندان.)

ص ٦٣، س ۴ (٦٨، ٢): یہ میری سمجھ میں نہیں آیا. مقصود «برساو» ہے یا «رساءو»؟ یہ دونوں لفظ کچھ نامانوس سے ہیں. اگر «ـــ اءو» (فاعلیت کا) مقصود ہے تو اس کی مثالیں ہوں گی: اُڑاءو، کھاءو، کماءو. اِسی لاحقے کی دوسری صورت ہے «ـــ و» (یعنی جب مادّہ حرف علت پر تمام نہ ہو). اس کی مثالیں ہوں گی: اُجاڑو، جھپو، لاگو، بِکھٹّو. یہ مثالیں آپ درج کر ہی چکے ہیں (ص ٢٨). اگر اس مقام پر «ـــ و» یا «ـــ اءو» (مجہول «و» سے) مراد ہے تو وہ تو جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اس کا یہ محل نہیں ممکن ہے کتابت کا سہو ہو.

ص ٦٣، اخیر (٦٨، ١٩): «رساول» کا اضافہ ہونا چاہیے.
ص ٦۴، ۴ (٦٩، ٦): «صفاءی» کا اضافہ ضرور فرمایے.

ص ٦۴، ٢٠ (٦٩، ١٨): «دھوپ» کی پ غالباً «شوب» سے آئی اور اس کے بعد «دھوبی» سا اور «دھوبی» کی پسلی سے «دھوبن» نکلی. اگر «ڈوب» پر خیال دوڑایے تو اس کی ب اصلی ہے. اور کوئی مثال ہو تو دیجیے ورنہ پ کا لاحقہ، لاحقہ نہیں. ہاں «شبہ لاحقہ» کہیے تو عذر نہیں.

ص ٦٥ (٧٠): میری رائے میں «باڑا» اور «امام باڑا» اور «قسائی باڑا» لکھا جائے. «قسائی» کو ص سے لکھنا صحیح نہیں. غالباً اس کے ہم معنی لفظ «قصّاب» سے دھوکا کھاکر لوگوں نے یہ کتابت اختیار کی ہے. صحیح «قسائی» (سین سے) ہے اور «قساءَت»، «قساوت»، «قسی القلب» کی بنا پر یہ لفظ اردو میں رائج ہوا ہے. اس کی بنا (یا مادّہ) ہے (ق س و). محض اس لیے کہ «قصاب» میں بھی «ص» ہے اسے «ص» سے لکھنا روا نہیں ہوسکتا.

«باڑا» اور «باڑی» حقیقت میں نیم لاحقوں میں شمار ہونے چاہییں. یہ دونوں مستقل لفظ ہیں جو الگ بھی وہی معنے دیتے ہیں. البتہ «واڑا» اور «واڑی» کی یہ کیفیت نہیں ہے یا نہیں رہی.

ص ٦٥. (٧٠): «باز» کے ذیل میں ان کو ضرور ہونا چاہیے: (١) دکن

کی اصطلاح «بٹّے باز» (یعنی چٹّے بٹّے لڑانے والا «حقّہ باز» کے معنوں میں) «دھوکا دینے والا» (۲) «بیٹھک باز» (= چال باز، قابو چی، موقع پرست)، (۳) «چال باز»، «چال بازی» (۴) «چکمے باز». (۵) «دل لگی باز».

✓ ص ٦٦، س ۳ (۷۱، ۲): «نخرہ باز» اور «نخرہ بازی» کے بجائے «نخرے باز» اور «نخرے بازی» لکھا جائے، اور اسی طرح «طُرّے باز».

ص ٦۷ (۷۲): «کساری باف» کے نیچے خط کھینچنا ضروری ہے. «شال باف» لکھنؤ میں عموماً اس لال رنگ کے کپڑے کو کہتے ہیں جسے خود لکھنؤ کے مضافات میں «شال باف» نہیں بلکہ «ٹول» کہتے ہیں. دلی میں اسی کے لیے «قند» کا لفظ رائج ہے. حیدر آباد والے «مَدرْا» بولتے ہیں اور اس کے سوا کسی لفظ کو نہیں جانتے[1]. لکھنؤ اور دلی والے لفظوں کی بنا میری سمجھ میں نہیں آئی سوا اس کے لکھنؤ والوں نے ایک گھٹیا چیز کے لیے ایک باوقار لفظ استعمال کرنے کو خوش مذاقی اور نفاست تصور کیا اور دلی والوں نے کپڑے کے رنگ کو قندِ سیاہ کے مماثل پایا. «ٹاٹ بافی» (یعنی Needle work on canvas) کو ضرور داخل کیجئے.

ص ٦۹ (۷۴): جھنڈے بردار اور «سونٹے بردار» بولتے ہیں یوں ہی لکھنا بھی چاہیے (اس قسم کے مرکب لفظوں میں «جھنڈے»، «سونٹے» وغیرہ جمع نہیں بلکہ واحد ہی کی محرف صورتیں ہیں. اسی طرح «ناکے بندی» (ص ۷۰) «برداشتہ» کے ذیل میں «دُم برداستہ» بھی ہو.

ص۷۴ (۷۹): «پُرس» کے ذیل میں «ماتم پُرسی» (پرسا) کیوں نہ ہو؟

ص ۷۷، س ٦ (۸۲): «بادشاہت» کے نیچے لکیر ضروری ہے.

ص ۷۸، س ۱۰ (۸۳، اخیر): «خاص تراش» اب کم استعمال ہوتا ہے. اس کی تشریح کر دی جائے تو اچھا ہے. «قاش تراش» کی جگہ غالباً «قاشق تراش» ہونا چاہیے. «قاش» تو ترکی میں بھوں کو کہتے ہیں. شاید اسی لفظ کو فارسی والوں نے استعارۃً پھل کی قاش کے لیے استعمال کیا.

ص ۷۸ (۸۴): «جات» اصل میں فارسی نہیں. فارسی والوں کے ہاں «آں» اور مختفی ہ پر ختم ہونے والے لفظوں کے لیے «گان» تھا. عربی سے ان کو «آت»

[1] یہ لفظ سویدن اور ناروی کی زبانوں سے، غالباً پرتگالیوں یا فرانسیسیوں کے ذریعے دکن پہنچا.]

کا لاحقہ ہاتھ آیا، اس پر بھی انہوں نے وہی عمل کیا جو «آن» پر ہوتا تھا. اس فرق کے ساتھ کہ لاحقے کی عربی اصل کا خیال کرکے گ کو ج سے بدل دیا. یہ تصرف کچھ بیجا بھی نہ تھا، اس لیے کہ «گ» اصل لفظ کا قدیم جز تھا جمع اور حاصل مصدر وغیرہ میں باقی رہ گیا تھا. عربی لاحقے کی خاطر اسے ج سے بدل دیا جیسا کہ معرب لفظوں کا قاعدہ تھا («انبہ» = قدیم «انبگ» = معرب «انبج» جمع «انبجات» وغیرہ) کہنا چاہیے کہ فارسی کے معرب الفاظ جو «جیم» پر ختم ہوتے ہیں ان کی جمع کے ساتھ فارسی لفظوں کا الحاق کردیا

ص ۷۹ (۸۵) «چہ» کے ذیل میں «طاقچہ» بڑھا دینا چاہیے. «چی» کے تحت چلمچی بھی ہو.

ص ۸۱ (۸۶-۸۷). «چھاپےخانہ» بولتے ہیں. یوں ہی لکھا بھی جائے.

ص ۸۵ - ۸۶ (۹۱ - ۹۲): «بوٹی دار» اور «بوٹے دار» بڑھا دیجیے. «تھانے دار» اور «تھانے داری» اور «گُتّے دار» اور «گُتّے داری» لکھا جائے «روے دار» سے غالباً «روئیں دار» یا «رُویں دار» مقصود ہے.

ص ۸۷ (۹۲-۹۳): «باتےدار» اور لچک دار» چاہیے. آگے چل کے «ناکےدار»، «ناکےداری»

ص ۹۰ (۹۶): «دُوارا»، «گرو دُوارا»، «رام دُوارا» کے آخر میں ہ کی جگہ الف چاہیے.

ص ۹۴ (۱۰۰): «حالہ راد» کے نیچے بہ ہو تو بہتر ہے س ۱۰ (۱۱): «شاطر» سے یہاں مُراد ہے پھرتیلا خدمتگار، پیادہ یا ہرکارہ - ان معنوں میں اردو میں اب رائج نہیں. ایران میں اب بھی بادشاہ یا بڑے آدمیوں کی سواری کے ساتھ دوڑنے والے نوکر کو کہتے ہیں.

ص ۹۵ (۱۰۱): «آب زن» کو داخل کرکے اس طبی اِصطلاح کی مختصر تشریح بھی کر دی جائے.

ص ۹۶ (۱۰۲): آج کل کے اردو رسالوں نے کتاب کی اچھی لکھائی چھپائی کو «دیدہ زیب» لکھنا شروع کر دیا ہے. کیا فارسی دانی رہ گئی ہے!

ص ۹۷ (۱۰۳) «لوہ سار» «بھنڈ سار» کے نیچے لکیر چاہیے. «کھنڈ سار» کا اضافہ ہوسکتا ہے، جسے «کھسار» بھی بولتے ہیں اور طنزاً کہتے ہیں: «دو آنے

کے پیسے دے نکلتے تو کھنسار میں دھکا نہ لگ جاتا؟»

ص ۱۰۱ (۱۰۷): «شدہ» کے تحت «رجسٹری شدہ» کو ضرور داخل کیجیے گا.

س ۳ (نیچے سے): کیسے مان لوں کہ «گلشن» اور «روشن» کا «شن» ایک ہی چیز ہے؟ «گلشن» کا «شن» بلا شبہ ظرفیت کا ہے. تاریخ اس لفظ کی یوں ہے کہ اولاً شین (مجہول یے سے) تھا. بعد کو وہ مجہول یے الف سے بدل گئی (ایسے بہت سے لفظ فارسی میں ہیں جن کی یے، الف سے بدلی ہے) اسی زمانے میں جب «گاشن» «گلشان» تھا عربوں نے اسے اپنی زبان میں لیا تو «جُلّسان» «ل مشدد» معرب ہوا. اِدھر خود فارسی میں اصل لفظ سے الف گھٹ کر محض ایک حرکت بھر رہ گیا اور «گلشن» ہوا. بخلاف اس کے «روشن» میں اولاً «ش» ساکن تھا، چنانچہ اوستا میں یہ لفظ یوں ہے: «رَاُخ ش نَ». («اُ» کا ضمہ مجہول) یہ آواز «َ اُ» بعد کی زبان میں عموماً «او» (مجہول) ہوگئی؛ «روخ ش نَ» ہوا اور متواتر تین صحیح حرفوں کے آنے سے اخیر حرف کی حرکت لازماً، ماقبل کو چلی گئی اور «روخ شَ ن» ہوا۔ «خ ش» کی متحمل بعد کی فارسی نہیں رہی تھی اور قدیم زبان میں جہاں کہیں یہ مرکب آواز تھی اس کا پہلا جز جاتا رہا، دوسرا بچ گیا یوں «روخ شَ ن» سے «روشن» ہوگیا. یہی حال «روغن» کا ہوا کہ اوستا کی زبان میں «رَ اُ غ نَ» تھا اس سے («رو غ نَ») ہوکر «روَغن» ہوا.

ص ۱۰۳ س ۳ (۱۰۹): «طلب (ف)» کے متعلق ایک حاشیے میں تشریح کر دی جائے کہ فارسی والوں نے اس عربی مادے سے فارسی مصدر «طلبیدن» بنا لیا تھا. اس لیے اس کا امر فارسی ہے عربی نہیں.

ص ۱۰۶ (۱۱۲) «کار» کے تحت آپ نے بہت سی «کاریاں» بھی درج کی ہیں. «جوتے کاری» رہ گئی.

ص ۱۱۹، س ۶ (۱۲۴): «چھت گیری» اور «دیوار گیری» میں اردو «ی» کی یائے تانیث لگائی گئی ہے. اس لیے یہ نیا لاحقہ بن گیا جس کے مقابلے میں مذکر لاحقہ گیرا ہے اس کی مثالیں آپ نے دی ہیں مگر «گیر (ف)» کے ذیل میں: «نم گیرا، اٹھائی گیرا، گوں گیرا». بہتر ہو اگر «گیرا، گیری» الگ الگ قائم کیے جائیں.

ص ۱۲۱، س ۱۵ (۱۲۷، ۶): «م (ف)» اور «م (ہ)» کو جدا جدا کردینا چاہیے. اس سطر میں «پنجم» غالباً سہو کاتب ہے؛ «پنچم» چاہیے پنچم اور «مدھم» موسیقی اصطلاحیں ہیں. «ریشم» کو نکال دینا بہتر ہوگا؛ اس لیے کہ اس کا اشتقاق اب تک معرضِ بحث ہے.

ص ۱۲۱، ۱٦ (۱۲۷، ۸) : « بیگم » اور « خانم » میں جو میم ہے وہ سوائے ان دو لفظوں کے اور کہیں نہیں آتا. اس لیے ان کا ذکر کرنا کتاب کے مبحث کے لیے سودمند نہیں. خود ترکی میں سوائے ان دو لفظوں کے یہ « م » کہیں نہیں پایا جاتا بلکہ ترکی میں کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہیں ہے (نہ اسم میں نہ فعل میں).

ص ۱۲۲، ۵ (۱۲۷، ۱۹) : « مان (ہ) ـ جحمان، دھمان، ہومان وغیرہ » اضافہ کیجیے. « مہمان (مہ = بڑا) » ممکن نہیں. « بڑے کے مانند » سے « ضیف » کیونکر نکل آیا؟ اور اس کو مان بھی لیجیے تو اس کا کیا جواب کہ « مہماں » تو خود ہی مخفف « میہماں » کا ہے اور « میہ » بڑے کو نہیں کہتے، مِہ کہتے ہیں. ماں بھی یہاں « مانند » کے معنے نہیں رکھتا بلکہ « صاحب » کے معنے رکھتا ہے. « مہماں » میں جو ی کی تخفیف کی گئی ہے وہ بہت بعد کی چیز ہے. « میہماں » کے صحیح اِشتقاق کی رو سے معنے « میزباں » نکلتے ہیں، اس لیے کہ اوستا میں « مَ اِ ثَ نَ » گھر کے معنے میں آیا ہے، پہلوی میں یہ لفظ « م ے ہَ ن » ہوگیا. اس طرح « میہماں » کے لغوی معنے « صاحب خانہ » کے ہوئے. میرا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں ایرانیوں کے ہاں مہماں کو اخلاقاً « صاحب خانہ » کے مرادف لفظ سے خطاب کرنے کا دستور تھا. اب رہا « میزباں » سو یہ بالکل نیا لفظ ہے. خود « میز » ہی کا وجود قدیم زباں میں نہیں ہے اور اس زمانے میں میز پر کھانا کھانے کا دستور بھی ایران یا پڑوس کے ملکوں میں نہ تھا.

« آسمان » کے متعلق عرض ہے کہ انسان کی ابتدائی تاریخ پر لحاظ کیجیے تو پہلے اسے « آسماں » دکھائی دیا ہوگا، اور پھر کہیں صدیوں بعد چکی ایجاد کرنے کی نوبت آئی ہوگی. اس لیے یہ یقین کرنا درست نہ ہوگا کہ اس نے جب چکی بنا لی تب آسماں کے لیے نام تجویز کرنے کی فکر ہوئی اور « آسماں » کا نام « چکی » سے مستعار لیا. دوسرے قدیم فارسی میں « آسمان » میں دونوں الف کی جگہ صرف فتحہ تھا یعنی « اَسمَن ». پہلوی میں آکر « آسمان » ہوا. اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ « مان » (جو حقیقت میں « مَن » تھا) مانند کے معنے نہیں رکھ سکتا. « آس » مخفف ہے « آسیا » یا « آسیا و » کا اور یہ تخفیف غالباً پہلوی زمانے کے بعد کی فارسی میں ہوئی ہے. پہلوی میں صرف « آسیاو » ملتا ہے.

ص ۱۲۲ (۱۲۸) : « ن » کے متعلق جو قاعدہ بتایا گیا ہے وہ درست نہیں.

« بکرا، لڑکا، گھوڑا » کے آخر میں الف ہے مگر ان کی تانیث « ن » سے نہیں ہوتی۔ پس اس کو قاعدہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے علاوہ « چمار » سے « چمارن » « لوہار » سے « لوہارن »، « کمھار » سے « کمھارن »، « سیا » سے « سَینن »، «آم» سے « آمی »، « کساں » سے « کساس »، « تحصیلدار » سے « تحصیلدارن »، « تہاںےدار » سے « تہاںےدارن » وغیرہ، کی تانیث کا یہ قاعدہ یوں بنایا جائے تو ٹھیک ہوگا:

« مردوں کے جن لقبوں سے پیشہ، قوم، کارگزاری وغیرہ ظاہر ہوتی ہو، ان کی تانیث اکثر « اِن » یا « آن » سے بنتی ہے » مستثنیات: « ناگ » سے «ناگن» « آم » سے « آمی »۔ یہ دونوں مونث اس بنا پر ہیں کہ « ناگ » اور « آم » کو شخص فرض کرلیا، یعنی ان کو « شخصایا » ہے۔

ص ۱۲۳ (۱۲۸)۔ « پھسلن »، « رپٹن » میں اسمیت ہے ظرفیت نہیں ہے۔

ص ۱۳۶، ۷ (۱۴۱ - ۱۴۲)۔ « آری »۔ اس سلسلے میں « گُمری » «گمد - گمد - « گمر » کی تصغیر) اضافہ ہو، اور « معری » (یعنی گوٹ، پتلی سنجاف) بھی آجائے تو اچھا ہے

ص ۱۳۶، ۱۶ (۱۴۲، ۱۳)۔ « عربی میں جمع کو ... مگر اردو میں یہ قید نہیں الخ »۔ یہاں عرض کروں گا کہ « کرامات، طلسمات » وغیرہ تو اردو میں واحد ہی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، « دہات » (یا « دیہات ») بھی اکثر واحد کے طور پر بولا جاتا ہے « قصباتی » البتہ مناسب مقام ہے

ص ۱۳۷، اخیر (۱۴۳، ۱۶)۔ « کُتیا » کا لفظ، یہاں سے ہٹا کر اگلے فقرے میں شامل کردیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، اس لیے « کُتّا » کی تانیث « کُتی » ہے۔ « کتیا » تصغیر ہے « کتی » کی۔

ص ۱۳۸، سطر ۱ (۱۴۳، ۱۷): « یا (ہ) تصغیر ...» کے تحت « تعوذیا » (تعوید سے)، اردو میں تلفظ: « تاوِریا » (= کُرتے کے گریبان کی گوٹ جس میں ایک طرف بوتام، دوسری جانب کاج ہوتے ہیں) ضرور بڑھا دیجیے۔ تصرف اس میں کئی ہوئے ہیں، لیکن لفظ ٹکسال باہر نہیں۔

ص ۱۳۸، ۳ (۱۴۳): « انگیا » انگ سے بیشک ہے، لیکن « انگا » (انگرکھا) کی تصغیر ہے اور تانیث بھی۔ وصفیت اس میں نہیں، اور اگر ہے بھی تو غلبہ

اسمیت ہی کا ہے۔

« یا (ہ)۔ وصفیت » کے تحت « برفیا » (برف سانے یا بیچنے والا) اور «کمایا» نیز «ابیسیا» اور «دبیریا» کو لانا چاہیے۔

ص ۱۳۹، ہ (۱۴۴): « یار (ہ) .... میار (مڑین = چوڑی سے)»۔ منیار اصل میں « منہار » تھا۔ بعضے علاقوں کے لہجے میں ہ بدل کر ی ہوئی۔ اِس لیے اس لفظ کو لاحقہ (یار) کے تحت لانا درست نہیں۔ سنسکرت میں جواہر، موتی، زیور وغیرہ کو मणि (م ن ڑِ) کہتے تھے۔ منڑین (یا منڑیں) اُسی کی ایک شکل ہندی میں ہے اور ظاہرا اس سے ایک اور شکل پیدا ہوئی: « بنگڑی »[1] جو چوڑی کے پہلو بہ پہلو دکھن میں عموماً رائج ہے۔ اسے انگریزوں نے bangle کے روپ میں اپنایا ہے جو اب انگریزی کا ٹکسالی لفظ ہے۔ پھر کہیں کہیں منیاری یا منہاری (مَن ہاری) جوہری کے کاربار کو کہنے لگے اور ہر اس دکان کو جس میں طرح طرح کی خوشنما چیزیں بکتی ہوں « منیاری کی دکاں » چوڑیاں بنانے یا بیچنے کا پیشہ بھی اس زمرے میں آگیا تو جواہر اور زیور کا کاربار کرنے والوں نے « جوہری » کا اِمتیازی لقب اختیار کیا۔

۱۴۲ (۱۴۸): « ین (ف) .... آستین (اصل میں دستین ہے)»۔ مجھے اس میں تامل ہے۔ آستین، آستیم اور ان کا مخفف « آستی، استیم» یہ چار شکلیں کلامِ فُرس میں ملتی ہیں۔ « دستین » نظر سے نہیں گذرا۔

ص ۱۴۲ (۱۴۸): اس میں بھی کلام ہے کہ « آیینہ کی اصل آہینہ ہے۔ اس لیے کہ آہن کی شکل پہلوی میں « آسین » (بیای معروف) ہے۔ اور بہی کئی ایرانی زبانوں میں اس کا س اب تک برقرار ہے، جیسے کُردی میں (کہ وہ بھی ایک ایرانی زبان ہے) « ہاسِن، » « ہِیسن » اور آسن » ؛ بلوچی: « آسِن »۔ بخلاف اس کے « آیینہ » کے لیے پہلوی میں ہے: « آئیینک »۔ پہلوی حرفوں میں متشابہات بہت ہیں اور یہ لفظ «آدوَینک» (آ د و ی ن ک) وغیرہ بھی پڑھا جاسکتا ہے مگر اس کی صحیح قراءت غالباً «آدینک» ہے (اور قدیم «دال» جس کے ما قبل حرف علت ہو بعد کی زبان میں ہر جگہ « ی » ہوگئی ہے اور آخر کا

(۱) «بنگڑی» کی اور بھی شکلیں ہیں: بنگری، بنگلی، ونگلی جیسا کہ پلیٹس نے اپنی ہندستانی ۔ انگریزی لغات میں لکھا ہے۔

«ک» تو مختفی «ہ» ہو ہی گیا ہے). بلوچی میں آج بھی آئینے کو «آدینک»، اور «آدین» (مجہول «ے» کے ساتھ) بولتے ہیں. اب اس تمام تشریح کے بعد اگر پہلوی کے دونوں لفظوں «آسین» (یعنی آہن) اور «آدینک» یا «آئینینک» (= آئینہ) کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں. میری رائے میں تو «آیینہ» کو اس فہرست میں سے نکال ہی ڈالنا بہتر ہوگا. اس لیے کہ «آئینہ» اور «آہن» دونوں میں «ہن» اصلی ہے؛ اور «دیرینہ»، «روزینہ» وغیرہ میں نہیں. اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ «آئینہ» «آہن» سے مشتق ہے تو بھی صرف ہ لاحقہ تونیرتی ہے اور لاحقہ «ینہ» کے تحت اُسے لانا درست نہیں.

ص ۱۵۰، اخیر سطر (۱۵۶، ۷) : «جھٹالنا» میری دانست میں «جھوٹ» سے نہیں ہے، «جھوٹا» سے ہے، اس لیے کہ «منہ جھٹالنا» میں «جھٹالنا» منہ جھوٹا (یعنی آلودہ) کرنے کے معنے پر ہے. «جھوٹ» سے «جھٹلانا» ہے یعنی کسی کو جھوٹا قرار دینا، کسی کی بات کو جھوٹ ٹھیرانا.

ص ۱۵۱، اخیر سطر (۱۵۷، ۷). «سرد» سے «سردانا» ہے اور «سردی» سے «سردیانا» یعنی سردی کھاجانا، جیسے «آتش ناری سردیا گئی». اس کو بھی داخل کرنا بہتر ہوگا.

ص ۱۵۶ - ۱۵۸ (۱۶۱ - ۱۶۴). اردو میں آریائی زبان کے لفظ اگر صرف چار پانچ سو ہی ہوتے اور عربی کے پچاس ہزار تو بھی اردو سامی زبان نہ قرار پاتی بلکہ آریائی ہی رہتی. کسی زبان کی صرف‌نحو اور اس کے ابتدائی لفظوں اور مادّوں کی نوعیت کی بنا پر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ زبانوں کے کس خاندان کی رکن ہے یا ہو سکتی ہے.

ص ۱۶۱ (۱۶۷) : «گوٹا»، «ناجا» وغیرہ کو کاتب نے «ہ» سے لکھا ہے. الف سے لکھنا چاہیے تھا. کتاب میں اور بھی بعض جگہ اس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے.

ص ۱۶۱ (۱۶۸) : «یکـّہ» کے متعلق عرض ہے کہ یہ فارسی ہے اور «فرید، تنہا، بےنظیر» کے مفہوم میں اردو میں بھی مختفی ہ سے لکھا جانا چاہیے. لیکن «اِکاّ» اردو ہے (ایک سے نہ کہ یک سے) = «۱» ایک گھوڑے والی

پالکی گاڑی جو صرف شمالی ہند میں رائج ہے؛ (۲) گنجفے کا پتا جس پر ایک بندکی یا نشاں ہو؛ (۳) ایک بتی والی شمع یا فتیل‌سوز، (۴) ایک خاص قسم کا بازوبند جس پر (بخلاف جوشن یا بونگے کے) صرف ایک نڑانگ جڑا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے ڈبیا بنی ہوتی ہے جس میں عطر کی پھریری رکھ لی جاتی ہے. (یہ صرف ایک ہی اور اکثر بائیں بازو پر باندھا جاتا ہے).

ص ۱۶۲، اخیر سطر (۱۶۹، ۶): «رادِ راہ، تخمہ». کی جگہ چاہیے تھا: «زادِ راہ ـ تحما.»

ص ۱۶۳، س ۹: «قصائی» میں ص صحیح نہیں. تفصیل ص ۶۵ (۷۰) کی تعلیق میں گذر چکی.

ص ۱۶۴، س ۲ ن ـ س ـ (۱۷۱، ۵) «دَین» کے بعد (دِیں) کو بھی داخل کرنا چاہیے. اس کے معنی ویسے تو بہت سے ہیں مگر تین اہم ہیں اور انھیں تین معنوں کی جھلک باقی معنوں میں پائی جاتی ہے. (۱) حالت، نوعیت، عادت. (ان معنوں میں «دِین» ٹھیٹ عربی ہے). (۲) عدل، حساب جو عدل کی عرض سے کیا جائے. «یوم‌الدین» اسی سے ہے اور اسی سے ہے «دیّان» = عدل کرنے والا، قاضی، خدا کا ایک نام، اس لیے کہ وہی حقیقی قاضی اور منصف ہے. (ان معنوں میں «دیں» دخیل ہے اور آرامی سے جو ایک سامی زبان ہے، قدیم زمانے میں عربی میں آگیا تھا). (۳) مذہب (اس معنے میں بھی «دین» دخیل ہے اور قدیم زمانے میں فارسی سے عربی میں آگیا تھا. فارسی میں اس کی «ے» مجہول تھی، تعریب کی بنا پر معروف ہوگئی).

ص ۱۷۱، س ۶ ن ـ س (۱۷۸، ۱۰) «جرمنی». یہ لفظ انگریزی سے اردو میں آیا ہے. مراد اس سے وہ ملک ہے جہاں «جرمن German» بستے ہیں. «جرمن» صفت ہے اور اس ملک کے باشندوں کی زبان کو اور وہاں کے باشندے کو بھی کہتے ہیں. اردو میں آکر «جرمنی» کی «ی» نے خلطِ مبحث پیدا کر دیا. لوگ سمجھے کہ یہ اردو یا فارسی کی نسبتی «ی» ہے اور یہ غلطی بعضے ان صاحبوں کی زبانوں پر بھی ہے جو انگریزی میں اچھی استعداد رکھتے ہیں. اصل یہ ہے کہ لاتینی میں اس ملک کے بسنے والوں کو «گِرماُنس» اور خود ملک کو گِرمانیا کہتے تھے. انگریزی میں آکر «جرمن» اور ملک کے لیے «جرمنی» ہوگیا.

اردو میں یہی مناسب ہوگا کہ ملک کا نام «جرمانیا» ہو اور وہاں کے باشندے اور وہاں کی زبان وغیرہ کو «جِرمانی» کہیں. خود «جرمانیا» والے اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے یہ نام نہیں استعمال کرتے البتہ قدیم زمانے کے حرمانیوں کو «گرما س» (واحد: «گرمان گ اور نَ مجہول کسرے کے ساتھ) کہتے ہیں جن کو انگریزی میں Teuton یعنی («ٹیوتونی») کا نام دیا گیا ہے اور جن میں جرمانیوں کے علاوہ شمالی یورپ کی اور بہت سی قومیں: انگریز، ولندیزی، ڈینی وغیرہ شامل ہیں.

میری دانست میں بہتر ہے کہ ہم اردو میں Germany کے لیے «حرمانیا»، German کے لیے «جرمانی» اور Teuton اور Teutonic کے لیے «گرمانی» کہیں اور قدیم تیوتونیوں کا ذکر آئے تو ان کے ملک یا وطن کے لیے «گرمانیا» بولیں.

ص ۱۸۱، س ۲۰ (۱۸۹، ۷): «ستروان» کی جگہ «ستّرھواں» چاہیے (یعنی ۱۷واں) — اور ستّرواں = ۷۰واں.

ص ۱۸۲، س ۱۸ (۱۹۰، ۷): «معہ». «مع» بہتر ہوگا تاکہ «مع» اور «معہ» کا فرق اردو میں بھی عربی کی طرح نمایاں رہے.

ص ۱۸۵ (۱۹۳): اور آگے — مانا کہ کن وین شن اور اصطلاح کے لغوی معنے ایک ہی سے ہیں لیکن اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جس مفہوم میں یہ دونوں لفظ یہاں استعمال ہوئے ہیں اس کے لحاظ سے ان دونوں کی تعریفیں ان کے لغوی معنوں سے مختلف ہیں. امر زیر بحث میں جو لوگ کن ویں‌شن سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں ان کا مقصود اس لفظ کے برے معنے ہیں، یعنی اس طرزعمل سے جس کی بنیاد کسی اصول پر نہیں بلکہ محض قرار داد پر ہے اور اصطلاح کا یہ مفہوم نہیں کہ اس میں اصول کو دخل نہ ہو. کن‌ویں‌شن کے بھی مدارج ہیں. فرض کیجیے کہ تین مختلف گروہ اصطلاحیں طے کریں: ایک گروہ یہ قرارداد کرلے کہ ہم نہ تو لغت کی پروا کریں گے نہ صرف‌نحو کی نہ حسنِ مذاق کی، بلکہ چند آوازوں کو ملا کر لفظ بنائیں گے اور اس کی ایک تعریف بنادیں گے. دوسرا گروہ کہے کہ ہم صرف نحو یا حسن مذاق کا لحاظ نہ کریں گے، جو لفظ زبان میں موجود ہیں انہیں میں سے بعض کو ملا جلا کے یا گھٹا بڑھا کے نئے لفظ پیدا کرلیں گے، عام اس سے کہ ان کی ترکیب صرف و اشتقاق کے مطابق ہو یا نہ ہو. تیسرا گروہ ایسے لفظ بنائے جن میں لغت صرف و اشتقاق، حُسن مذاق تینوں کا لحاظ امکان بھر رکھا گیا ہو پہلے گروہ کا کن‌ویں‌شن

یقیناً معیوب ہے خواہ کتنے ہی بڑے بڑے علما وفضلا نے ایسی قرار داد کی ہو، زباں ایسی چیزکو قبول نہیں کرسکتی۔ اس کوین‌شن سے پرہیز لازم ہے۔ دوسرے گروہ کا کوین‌شن بھی پہلے کے لگ بھگ ہے۔ تیسرے گروہ کے طریقے میں کن‌وین‌شن کو بہت کم جگہ دی گئی ہے اس لیے وہ قابلِ عمل بھی ہے اور قابلِ قبول بھی۔ میرے نزدیک تو اس بات میں شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ اصطلاحوں کے وضع کرنے میں کن‌وین‌شن یا نری قرارداد سے جتنا کم کام لیا جائے گا اتنی ہی وہ اصطلاحیں زیادہ مناسب ہوں‌گی اور آسانی سے رائج ہوسکیں گی

ص ۱۹۴ (۲۰۱) « لِس » (less) بالکسر ہے۔ « anti » میں بڑا حرف (A) نہ چاہیے۔ اسی طرح اور سابقوں اور لاحقوں میں بھی پہلا حرف بڑا نہ ہو۔ سابقوں کے اخیر حرف کے معاً بعد اور لاحقوں سے پہلے ہائفن (hyphen) لگایا جائے۔

ص ۱۹۵ (۲۰۳) انگریزی سابقے اس طرح لکھے جائیں۔—

eph-, ep-, epi-, up-, super-, hyper-, over-

ص ۱۹۶ (۲۰۴) « All India National Congress » چاہیے۔

ص ۱۹۷، س ۵ (۲۰۵، ۷)۔ « اسم » سے نیا جملہ شروع ہوتا ہے؛ اس سے پہلے وقفے کا نشان چاہیے۔

ص ۱۹۹، س ۱۲ (۲۰۷): « باروسکوپ » چاہیے۔

ص ۲۰۰، س ۱۲ (۲۰۸): « بارپیما » اور « بارنگار » کے اشتقاق کی حاشیے میں تصریح کردی جائے، ورنہ اکثر پڑھنے والوں کو دھوکا ہوگا کہ « بارومیٹر » کے « بار » (bar) کو لے کر اس کی جگہ اس کے فارسی ہم آواز « بار » سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح آگے، ص ۲۰۶ (۲۱۵) میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ فارسی میں بھی ایک لاحقہ « ـِـ ین » ہے؛ جیسے « رنگین »، «ریشمین»، «خونین»، « نمکین » وغیرہ میں۔

ص ۲۰۱ (۲۰۹) « جراحی عملوں ... الخ۔ » یہ تجویز تکلف سے خالی نہیں۔ لاحقہ «چی» ہر جگہ مناسب نہیں ہوتا۔ خود انگریزی میں زیر بحث لفظ (لاحقہ ic- کے ساتھ) شاذ ہے۔

ص ۲۰۷، س ۳: « کفوربا » ہوسکتا ہے تو پھر « کپوربا » میں کیا حرج

ہے؟ میری دانست میں « کپورنا » بہتر ہوگا۔

ص ۲۰۷، س ۷ (۲۱۶، ۵): « الکٹروکیوٹ . . . بجلی سے پھانسی دینا [برقاسنا = (برق + پھانسی + نا)] . . . [برقیرنا =) برق + چیرنا)] »۔

اس تجویز سے مجھے سرِ مو اتفاق نہیں۔ (۱) ایکزیکیوٹ کے معنے حقیقت میں پھانسی دینا نہیں، بلکہ « حکم کی پوری تعمیل کرنا » ہے۔ کنایۃً سزائے موت کے حکم کی تعمیل کرنے کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ « گردن مارنا » ہو یا « پھانسی دے کر مارنا »۔ (۲) خود « پھانسی » سے اردو میں کوئی مفرد مصدر (یا فعل) موجود نہیں، بلکہ « پھانسی دینا »، « پھانسی پانا یا دیا جانا وغیرہ » بولتے ہیں اور « پھانسنا » میں یہ مفہوم ہے ہی نہیں۔ اگر برقی آلوں کی مدد سے پرندوں یا اور جانوروں کو زندہ پکڑ لینے یا جنگ میں دشمن کو اسیر کر لینے کے لیے « برقاسنا » تجویز کیا گیا ہوتا تو شاید زیادہ نامناسب نہ ہوتا۔ (۳) electrocute کوئی ایسی اہم اصطلاح نہیں جس کے لیے اردو میں ایک نئے لفظ کا بنانا لابدی ہو۔ (۴) اصطلاحوں کے بنانے میں تخمیف در تخفیف اور تصرف در تصرف سے بچنا ہر لحاظ سے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ نحت کے اصول کو برتنے میں بہت احتیاط لازم ہے۔ « برقیرنا » بھی اچھا نہیں۔

ص ۲۱۰ (۲۱۹) سے ۲۱۱ (۲۲۰) تک « اردو کے جدید مصادر » کے عنوان کے تحت جو لغات تجویز کیے گئے ہیں ان میں سے « تلفانا »، « درسانا »، « جلسانا »، « رقصانا »، « سرسمانا »، « کلسانا »، مظرانا »، « ہضمانا »، « ہندسانا »، « یرقانا » کو خارج کردینا بہتر ہوگا۔ « زلزلانا »، « طنطنانا » تو بولتے ہی ہیں، اور « نظرانا » بھی کوئی نئی چیز نہیں۔ « نظرائی دینا » (دکھائی دینا کے مفہوم میں) برابر بولا جاتا ہے؛ اس امر کی طرف اشارہ (حاشیے میں) کردیا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں بعضے ایسے لفظ بھی ہیں جو شاید زیادہ مفید مطلب نہ ہوں۔ وہ بھی اگر حذف کردیے جائیں تو اچھا ہو۔

ص ۲۱۳ (۲۲۲)۔ « برق » کے عنوان سے جو نئے لفظ تجویز کیے گئے ہیں تقریباً چار صفحے ان سے پُر ہیں۔ ان میں سے کچھ ضرور کم کیے جاسکتے ہیں۔

ص ۲۲۱، س ۲ (۲۳۰، ۱۱)۔ « بقرعید » (اصل میں بکر + عید یا بکرا + عید)

(یعنی « بکرید ») تھا. غالباً ادیبوں نے اسے عربا کے « بقرعید » بنایا ہے.

ص ۲۲۱ (۲۳۱) « ہندی ــــ عربی کا ملاپ » یہاں « دودھ شریکا بھائی » کے بعد « دودھ شریکی بہن » بھی آنا چاہیے. اور « کھن کھسوٹ » بھی.

ص ۲۲۱، اخیر سطر (۲۳۱، ۹) « دست خط » اب کون بولتا ہے؟ اب تو « دسخط » ہے. « فارعخطی » سے « فارحطی » دکن میں بلا تکلف بولا جاتا ہے.

ص ۲۲۲، س ۳ (۲۳۱، ۳) « گرم مصالحه » کے بجائے « گرم مسالا » چاہیے.

ص ۲۲۳، س ۱۳ (۲۳۳، ۱) « چھاپے خانہ » لکھنا چاہیے.

ص ۲۲۵ (۲۳۵) نشان (٦) کے متعلق عرض ہے کہ اس ذیل میں جو مثالیں دی گئی ہیں ان کی بنا زیادہ تر دو لفظوں کے اجتماع یعنی (« جکسٹا پوزیشن ») کے طریقے پر ہے اور ان مرکبوں کو « امتزاجی مرکب » کہنا زیادہ مناسب ہوگا. « اضافتِ مقلوب » تو حقیقت میں متاخرین کی « من گھڑت » ہے ان بزرگوں نے یہ سمجھ لیا کہ فارسی میں اضافت کی ایک ہی صورت (یعنی کسرے کے ساتھ) تھی. اسی کو مقلوب اور کسرۂ اضافت کو حذف کرکے یہ دوسری صورت ہاتھ آئی ہے. مگر یہ صحیح نہیں. اصل یہ ہے کہ دونوں صورتیں قدیم ہیں چنانچہ قدیم فارسی اور پہلوی میں دونوں ترکیبیں دوش بدوش ملتی ہیں خلاصہ یہ کہ نشان (٦) کے ذیل میں جو مثالیں ٹھیٹ فارسی مرکبوں کی بیان ہوئیں ان میں کسرۂ اضافت کا وجود کبھی تھا ہی نہیں.

ص ۲۲۸، س ۱۱. « تِل چاولی » (یا « تِل چوری » جس میں لام، رے سے بدلا، الف ترکیب کی بنا پر گرگیا).

ص ۲۲۸ (۲۳۸) نشان (۱۹ اور ۲۰) کے بارے میں عرض ہے کہ اگر اردو میں دو ایسے اسم استعمال ہوں جو مل کر ایک معنے دیں یا جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت گہرا ہو تو ان دونوں کے بیچ میں حرف عطف کا لانا نہ صرف غیر فصیح ہے بلکہ اکثر غلط ہوتا ہے. ملاحظہ ہو: ماں باپ، بھائی بہن، ہندو مسلمان، باپ بیٹا، جورو خصم، جوتا ٹوپی، انگیا کُرتی، ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، ناک نقشا، نانا بابا، کھانا پینا، لینا دینا، کھیل کود، رنگ روپ، آنا جانا، پیسنا پکانا، سینا پرونا، پکانا رِاندھنا (یا ریندھنا)، بھلا چنگا، خاک دھول، سمجھ بوجھ، جانچ پرتال، دیکھ بھال. اس قبیل کے سینکڑوں مرکب ہم دن رات بولتے ہیں.

البتہ ناشناس لکھنے والے اکثر غلطی کرتے ہیں اور بے محل حرف عطف لا کر اپنی عبارت کو خراب کرتے ہیں۔ چنانچہ اخباروں اور رسالوں میں اکثر اس قسم کی ترکیبیں دیکھنے میں آتی ہیں: «رنگ و روپ»، «کھیل و کود». حرف عطف کو بہ لاکر عطف کے معنے لینا ہندوستان کی زبانوں کے لیے مخصوص ہے. فارسی، انگریزی وغیرہ میں یہ ممکن نہیں. مگر فارسی کے جو عطفی مرکب اردو میں زیادہ رائج ہوگئے ہیں ان کو بھی اردو نے اپنے جتو پر کھینچ لیا ہے. جیسے «آب دانہ»، «آب ہوا»، «آمد رفت»، «خط کتابت»، «خدا رسول»، «عالم فاصل»، «عالم جاہل»، «امیر غریب»، «پیر پیمبر»، «پیر فقیر». بخلاف اس کے فارسی کے جو مرکب ابھی تک اردو میں پوری طرح متمکن نہیں ہوئے ہیں عطف کا واو ان کا ایک اٹل جز ہے. لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوں جوں یہ مرکب اردو میں زیادہ استعمال ہوتے جائیں گے اور ان کی غرابت کم ہوتی جائے گی، اردو صرف نحو ان پر اپنا سکہ بٹھاتی جائے گی. ہر زبان میں دخیل لفظوں کا یہی حال ہوتا ہے. اس سلسلے میں ملاحظہ ہو ص ۲۴۱ (۲۵۱) نشان (۵).

ص ۲۳۳ (۲۴۲) سے ۲۳۶ (۲۴۶) تک جو فہرست مرکب لفظوں کی دی گئی ہے اس میں سے فارسی لفظوں کو چھانٹ دینا چاہیے. اس لیے کہ فارسی لفظوں کی مخفف صورتیں بجائے خود استعمال ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں. یہ ترکیب کی جہت سے وجود میں نہیں آتی ہیں بخلاف ان کے اردو کے مرکبوں کے ٹکڑوں میں جہاں کہیں کوئی حرف گرا ہے ترکیب کی جہت سے گرا ہے.

ص ۲۳۹، س ۱ (۲۴۸، ۱۸) «بُھس» (بالضم) یہاں کام نہیں دیتا۔ «بھساکو» دو سے ہے۔ «بھس» (سنسکرت «بھسمن» سے اور اسی سے «بھسمنت») = راکھ۔ تماکو بیچنے والے گھٹیا مال میں راکھ ملا کر وزن بڑھا لیتے ہیں. اس لیے «بھساکو» بُری قسم کے تماکو کو کہتے ہیں.

س ۲ «(رس + چاول) سے رساول». یہ بھی درست نہیں. «ـَـ اول» ایک ہندی لاحقہ ہے جسے آپ ص ۶۳، س اخیر (۶۸، ۳ ن س) لاحقوں میں شمار کرچکے ہیں اور «جڑاول اور ہریاول»، نیز «دساور» اس اشتقاق کی مثالوں میں دے چکے ہیں. پھر وہی لاحقہ «رساول» میں کیوں نہ مانا جائے؟ آگے «(کھڑا+ پاؤں) سے کھڑاوں»، کا حال بھی ایسا ہی کچھ ہے جس میں دُہرا تصرف نمایاں

ہے (الف اور پ کا حذف). اس لفظ میں «پلوں» کو دخل نہیں. «کھڑاکا ، کھڑبڑ کھڑبڑاہٹ ، کھڑک ، کھڑمنڈل» وغیرہ پر نظر کیجیے تو یہاں حکایتِ صوت کی کارفرمائی صاف دکھائی دیتی ہے.

ص ۲۴۵ (۵۶، ۲۵۵) «اک» کو آپ نے نیم سابقہ قرار دے کریہاں داخل کیا ہے. یہ ٹھیک ہے. مگر «یک» کو سابقوں (ص ۴۸ = ۵۱ - ۵۲) میں کیوں شمار کیجیے ؟ «یک منہ» (یا بہتر «اک منہ») ہونا چاہیے.

«اِکلوتا» اور «اِکنگ» میں «اک» نہ سابقہ ہے نہ نیم سابقہ بلکہ مستقل لفظ ہے جس پر لاحقے لگائے گئے ہیں. میرے خیال میں «اِکلا» (= اکیلا) سے «اِکلوتھا» سا (جو بعد کو «اکلوتا» ہو گیا) چنانچہ «چوتھا» «کوتھا ؟» «پہلوٹھی» یا «پہلونٹی» (جو اصل میں «پہلوتھی» تھا). «چوتھی» (۱ - «چوتھا» کی تانیث ، ۲ - شادی میں ایک رسم). «اِکنگ» کو فارسی «یکنگ» سے اُردا لیا ہے. اس میں بھی «اک» اصل لفظ ہے اور «نگ» لاحقہ ہے جیسے «تفنگ» میں.

ص ۲۵۴ ، س ۱ (۲۶۴ ، ۷) اودھ کے علاقے میں دوسرا بیاہ کرنے والے مرد «کو «دُجہا» کہتے ہیں. (دو + جوے = جورو) یعنی «دو جویہا» کے کئی حرفِ علت ، ترکیب کی جہت سے گر کر «دُجہا» ہوگیا ، اور پھر اس سے تانیث «دجہی» (یعنی وہ عورت جس نے طلاق لے کے یا بیوہ ہو جانے کے بعد دوسرا نکاح کرلیا ہو).

ص ۲۶۴، س ۳ - ۴ (۲۷۴،۱۳). «نو گرہ» ، «نو منزلہ» وغیرہ مجموعی حیثیت سے اردو لفظ ہیں. اس لیے ان کو «نو گزا ، نو منزلا» لکھنا زیادہ مناسب ہوگا. اسی طرح «تماہا» ، «نو ماسا» «نونگا» (بازو بند جس میں ۹ نگ جڑے ہوتے ہیں).

ص ۲۶۸ (۲۷۹). «پیشہ» سے پہلے «پیشانی» بھی چاہیے : «خندہ پیشانی ، کشادہ پیشانی».

ص ۲۶۹ (۲۸۱). «منہ چور» جھیپو کو کہتے ہیں ، اور «جھیپ» اور «حیاداری» میں فرق ہے.

ص ۲۷۰ (۲۸۱). «خاطر» کے بعد «خند» کے مرکب درج کیے جائیں : «زہر خند ، شکرخند ، ریش‌خند».

ص ۲۷۵ (۲۸۷) . « صورت » کے ذیل میں « قبول صورت » (جس کی صورت بھلی ہو) بڑھایا جائے .

ص ۲۷۷ (۲۸۹) . « گوش » . « حلقہ بگوش » میں « گوش » لا حقہ یا نیم لا حقہ نہیں، مستقل لفظ ہے .

ص ۲۸۰ (۹۲ ـ ۲۹۱) . « نامہ » کے ساتھ « پنج نامہ » نہیں دکھائی دیا . عام اصطلاح ہے .

ص ۲۹۱، س ۱۵ (۳۰۳، اخیر) . « ہیولیٰ = (ہیئت + اولیٰ) » . شہاب الدین احمد خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ ھ) نے یہ لکھا تو ہے مگر پوری عبارت ہے : « وقیل ھو معرب ھیئۃ أولی والصواب أنہ لفظ یونانی . . . الخ » (شفاء الغلیل ، طبع مصر ۱۲۸۲ ھ ، ص ۲۳۶ ، نیز المزہر للسیوطی ، ج ۱ ، ص ۱۳۴) . « ھیئۃ » عربی ہے ، لیکن « ھیولی » کو اس سے کچھ واسطہ نہیں . « ھیولی » متکلمین کے دور میں یونانی اصطلاحوں کے ساتھ عربی میں آیا . اس لفظ کی بحث کو سراسر خارج فرمائیے .

ہاں صاحب ، « تحت » کی بحث میں « کشاجم » کیسے چھوٹ گیا ؟ یہ مثال بہت اہم ہے .

آخر میں یہ عرض ہے :

(۱) کتابت کی غلطیاں ان سے بہت زیادہ ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے . اگلی اشاعت کے وقت تصحیح کا اہتمام سخت ہونا چاہیے ، خاص کر اس لیے کہ لغوی تصنیفوں میں ایک نقطے یا ایک حرکت کی بھی غلطی ہوجائے تو کتاب کی سودمندی میں بڑا خلل پڑجاتا ہے .

(۲) لفظوں کی ہر چھوٹی بڑی فہرست میں حروف تہجی کی ترتیب سے لفظ دیے جائیں تاکہ جب کوئی لفظ ڈھونڈا جائے ، فوراً مل جائے ،

(۳) سابقے ، نیم سابقوں کے ساتھ اور لاحقے ، نیم لاحقوں کے ساتھ کہیں کہیں خلط ملط ہوگئے ہیں . اس کی اصلاح کی جائے .

(۴) مجوزہ اصطلاحوں میں ہندی کا حصہ کم ہے . اس عنصر کو بڑھانے کی کوشش کی جائے .

(۵) آپ کو خوب معلوم ہے کہ میں آپ کی تجویزوں کے معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں ، اور یہ کچھ آج کی بات نہیں . مگر زبان کی توسیع اس طرح

کرنے میں جو خطرے اور خدشے ہیں وہ بھی میری نظر کے سامنے ہیں. چنانچہ بعض لوگوں نے جو آپ کے طریقے پر کاربند ہوئے ایسے لفظ بنانا شروع کیے جو صرف نحو اور حسن مذاق دونوں کے خلاف تھے اور آپ نے خود ان کو بارہا (وضع اصطلاحات کی مجلس میں) ناپسند کیا. پس اگر ہوسکے تو ایک ضمیمہ اضافہ کیا جائے جس میں بتایا جائے کہ اصطلاح بنانے میں صرف نحو کے کن اصول کو مد نظر رکھنا ضروری ہے؛ عربی اور فارسی زبانوں سے جن لفظوں کو لے کر ان سے اصطلاحیں بنائی جائیں، ان کے متعلق عربی یا فارسی نحو کے اصول کو کس حد تک مد نظر رکھنا چاہیے. اس کے بعد چند ایسی مثالیں دی جائیں جو ذوق سلیم کے لحاظ سے مسترد کرنے کے قابل ہوں. میں جانتا ہوں یہ مبحث بجاے خود ایک وسیع مضمون ہے لیکن اختصار سے کام لیا جائے تو پچاس ساٹھ صفحے میں اس بحث کے ضروری مطالب کا ایک خاکا بن جائے جس کی بنیاد پر، آگے چل کے بہت مفید کام ہوسکے گا.

غلط نامہ اور استدراک

«وضع اصطلاحات» پہلی بار انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ میں چھپوائی (۱۹۲۱ ع = ۱۳۳۹ ھ)، جس میں ایک ورق کا غلط نامہ تھا. وہ ناکافی ثابت ہوا تو مصنف نے کئی نسخوں میں اپنے قلم سے تصحیح کی، جن میں سے ایک نسخہ میرے پاس محفوظ ہے. اب دوسری بار ۱۹۵۴ ع میں ا. ت. اُ. پاکستان (کراچی) نے شائع کی. اس اشاعت کے کارپردازوں نے کچھ غلطیوں کی اصلاح کردی، لیکن کچھ نئی غلطیاں بھی در آئیں. مبحث کتاب کا ایسا کہ خفیف سے خفیف سہو بھی بڑا نقصان پیدا کرسکتا ہے. اس لیے یہ نیا غلط نامہ بنانا پڑا تاکہ اگلی اشاعت کے وقت بھی کام آئے. اس غلطنامے میں حوالہ دوسری اشاعت کے صفحوں کا دیا گیا ہے اور اختصار کی جہت سے یہ رموز مقرر کیے گئے ہیں:

ص: صفحہ، س: سطر، نس: سطریں نیچے سے گنو، غ: غلط، صح: صحیح، x: قلمرد کرو، مص: مصنف، *: پہلی اشاعت کے مطابق، †: آخری تصحیح مص کے قلم سے.

استدراک کے تحت وہ اصطلاحیں درج ہیں جو تفصیل چاہتی تھیں. انگریزی لفظوں میں جو غلطیاں ہیں آسانی سے نظر میں آجاتی ہیں. ان سے تعرض نہیں کیا گیا.

غلطنامہ

دیباچہ

ص	س	غ	صح
† ۲	٦	نہیں آئے	نہ آتے
† ۵	اخیر	اور اس	اور جو اِس
† ٦	۳	اُصول	×

متنِ کتاب

ص	س	غ	صح
۱۱	٦نس	تمام	بہت سی
۱۸	۴	اُندلسی	آندلسی (ل کو صمہ)
۳۱	۲	پا اورا ۰۰ اشارا	پا اورار ۰۰ افشار
† ۴۲	۸	پھل	پہل
»	۹	سر تا	سہ‌تا
† ۴۳	۱۱	شش تار	شش تا
* ۵۰	۱۱	جلیس	جلوس
† ۵۳	۳ نس	دوڑ	دور
* ۵۴	۳	حرارت ۰۰ ہیں	×
۵۸	۴	بِلا	بِلا (بِل کی تصغیر)
† ٦۲	٦نس	پاتار	پاافشار
* ٦۵	۷ »	میان	مَیان
۸۰	۸ »	(خوشنویس	ـ رقم پرور (خوشنویس
۸۴	٦	کی	کے
* ۸۵	۳نس	خیراد	خراد
۹۴	۲	جامہ	سلحخانہ
* ۹٦	۵	روٹی	روئی

	ص	س	غ	صح
*	۹۶	۷	لیقه	لیفه
†	۹۸	اخیر	رَو	رُو
	۹۹	۳	ندرو	ندرَرو
†	۱۰۴	۵نس	گردستان	کردستان
	«	۴ «	سستان	شبستان
†	۱۲۹	اخیر	گڑاات	گڑانت
†	۱۳۰	۱۱	حم نشین	جم نشین [1]
*	۱۳۳	۴	اُنٹی	اونٹنی
*	۱۳۶	۶	نکواں	نلوان
*	۱۴۱	۳-۴س	تمہیں	تمھیں (۲ بار)
*	۱۴۳	۳نس	ایسٹیا	السیٹیا
	۱۴۵	اخیر	تیا	پتا
	۱۴۶	۱	بمیٹا	نمنیٹیا
	۱۴۸	۸س	بیه	ینه
	۱۵۰	۱۱	چڑھایا	چڑھانا
	۱۵۳	۱۱	کھکھلانا	کھلکھلانا
†	۱۵۷	۸	ـگررنا	گرمانا (گرم سے)ـگزرنا
	۱۶۰	۱	عطیدں	عطسیدن
	۱۶۶	۳ س	شیر	شیر کے
†	۱۷۰	۶ «	ڈرنا	×
*	۱۸۴	۷ «	رسوم	رسوم سے اچھے
*	۱۸۸	۷ «	پر حتم ـ اکلیل	اِکلیل ـ اِکلیل
	۲۰۲	۳س	(س)	×
	۲۰۴	۷	کلّ ہندی قوم	کُل ہند قومی
*	۲۰۷	۳	حرف	میں صِرف

(۱) دیکھو نوراللغات، ج ۲، ص ۳۲٤ـ۲٥، نیز ٤۲٦ (جواتی کا جم)

ص	س	غ	صح
۲۰۸		ایڈاسکوپی	انڈاسکوپی
۲۱۱	۶نس	خنیر گین	خنیز گین
«	۵«	شکر رگین	شکر زگین
«	اخیر	سے شکرزسی	×
† ۲۱۲	۱	رمیت	نومیت
«	۳نس	(ط)	×
۲۱۳	۱۱	حارچنبہ	حارچینہ
«	۵نس	چھند کیا	چھسد کیا (ب مصموم)
* «	اخیر	پرمقازہ	پرقارہ
	«	پٹیا۔ٹپٹونجیا	پیتا۔تٹپونحیا
	«	حدزا	حدا
† ۲۱۵	۳نس	= شُرمایا(شورین سے) شریانا	= شُرمایا۔شوریں سے شوریانا
† ۲۱۶	۱۱	تحت	بحت
† ۲۱۸	۶	بات	اِس بات
«	۱۰نس	مالیں	مایں
† «	۲«	پاس	پاس پاس
۲۱۹	۱۱	تسمیہ	تسمہ
۲۲۰	۸	ہندسا (ہندسہ غ .. غ .. عفیدو	ہَندسانا (ہَندسہ ع..ع..عفیدو
۲۲۴	۶نس	برقیارہ	برق پارہ
۲۲۴	۴نس	جنگ٠٠ حاجز	چنگ ٠٠ خاطر
* ۲۲۵	۳	برق سیری	برق سیرتی
* ۲۳۱	۹	دودھ شریک	درد شریک
۲۳۶	۵نس	کم چھڑ	لم چھڑ
† ۲۳۷	۲	بڑھ پیٹو	بڑپیٹو
«	۷نس	مشبہ بھی	مشبہ

	ص	س	غ	صح
	۲۴۱	۶نس	بوت	بیونت
	۲۴۳	۵نس	ڈھمنہا	ڈِھمنہا
	۲۵۱	۷	موبھامسہ	مونہا مُہ
†	۲۵۳	آخیر	زیرگاہ	زیرکاہ
	۲۵۶	۷	بادپردا	بادپروا
†	۲۵۸	۸	بڑمکھا	بڑآنکھا
	۲۶۸	۶	کلحھما	کِلجّہا
	۲۷۰	۳	علط وہمی	علط بیانی۔ علط وہمی
†	۲۷۳	۸س	گڈھی	گدھی
†	«	۷«	لم چھٹوا	لمُ چھوا
†	۲۷۴	۱	مہارابی	مہاربی
	۲۸۵	۱۰نس	ورشت	زشت
†	۲۸۶	۱	ارزاں	ارزن
	۲۹۳	۱	تل ںطر	تل نطرا
†	۳۰۰	۱۰	ںمایا	ایمیا ںنایا
	۳۰۱	۶	بیوابیت	بیوائیت
	۳۰۲	آخیر	عداتش (عداتیشی۔	غُدّاِتش (عُدّاتیشی
	۳۰۶	۲	زالوتی	زالوئی
	۳۰۷	۲	فخمین	فحمین

غلطیاں اور بھی تھیں مگر سب کو یہاں لکھنا ممکن نہیں.

استدراک

ص ۴، ۷ نس: «زرا شبه» (پہلی اشاعت: «ذرا شبھ») - پہلے لفظ کی کتابت مختلف فیہ ہے. مص نے «ذرا» لکھا ھے، یہی چاہیے تھا. «شبھ» میں دو «ہ» ہیں: پہلی ظاہر، دوسری مختفی. ان میں سے کوئی گر نہیں سکتی. اور «شبہ» تو غلط در غلط ہے. عربی یا فارسی میں مخلوط «ہ» کا وجود نہیں. ص ۴۷- ۲۷۳ میں «مبھ» ۲۵ بار آیا ہے، اور دونوں اشاعتوں میں «مبھ» لکھا گیا ہے. صحیح «مُبھ» ہے.

ص ۷، ۸: «بزرگ واروں» - مص نے «بزرگواروں» لکھا تھا اور یہی چاہیے تھا، اسی طرح «دستیاب، کامیاب، کمیاب» وغیرہ (ص ۱۴۴).

ص ۸، ۲. «خد و خال» - مص نے «خط و خال» لکھا ھے اور یہی صحیح ہے، جو انگریزی لفظ features کے مفہوم کو پوری طرح ادا کرتا ہے.

ص ۴۵، ۲: «لاحرم» (ج پر ضمہ) - صحیح. «ج» اور «ر» دونوں بالفتح.

ص ۵۰، ۷: «عاشورہ» میں «ہ» غلط ہے. صحیح صورتیں: (۱) «عاشور» (جیسا کہ مص نے لکھا تھا)، (۲) «عاشورا» (یا عاشوراء)، (۳) «عاشوریٰ»، (۴) «عشوریٰ» - فارسی اور اردو میں (۱) اور (۲) عموماً مستعمل ہیں.

ص ۶۴، ۶: «پیالہ» اور ص ۱۰۴، ۸: «دھرم سالہ، گئو سالہ» مگر ان لفظوں میں اخیر حرف الف ہے. اسی طرح مص نے عربی اور فارسی لفظوں سے اردو کے طریق پر جو جدید اردو مصدر تجویز کیے ہیں انھیں لازماً «نا» پر ختم ہونا چاہیے تھا، مگر دوسری اشاعت کے کاتب نے بعضی جگہ «نہ» لکھا ہے جو غلط بلکہ مضحک ہے، مثلاً «ذوقانہ، زلزلانہ، زمزمانہ، رردانہ» (ص ۲۱۹) اور «عوغانہ، کھلانہ، کلمانہ» (ص ۲۲۰). سب ہیں.

ص ۹۴، ۵: «خیارہ دار (... ہوں)»: مص نے قلمزد کردیا ہے، اس بنا پر کہ «خیارہوار» میں «و» ہے، اور یہاں بحث «دار» کے مرکبات سے ہے.

ص ۲۲۲، اخیر: «برق پزیر... پزیرہ... پزیری»، نیز ص ۲۲۷، ۶ (دوبار) - مص نے ان پانچوں جگہ «پذیر» وغیرہ «ذ» سے لکھا ھے. نئی اشاعت کے کاتب نے «ذ» کو «ز» کردیا - یہ بیجا ہے.

ص ۳،۲۷۲ : «کہن کو (وہ رگ جسے عرق النسا کہتے ہیں)»۔ اس جملے کو مص نے قلمزد کردیا تھا، ظاہرا اس لیے کہ «کہنکو» کو «کہن» (پرانا) سے اصلا تعلق نہیں. اس لفظ کی ایک اور شکل «کہنگی» بھی ہے اور اب بھی ایران میں «کہنگو» اور «کہنگی» دونوں طرح بولتے ہیں. (دیکھو «فرہنگ بہارستان» تالیف محمد علی تبریزی «خیابانی» جسے خود مولف نے شعبان ۱۳۴۹ میں پہلی بار شائع کیا، ص ۱۳۴)۔ «برہان» نے لفظ «قویں» کی تشریح اس کے مرادف «کہنگو» سے کی ہے اور اسے فارسی بتایا ہے، مگر «قویں» کی اصل کا ذکر نہیں کیا، نہ «کہنگو» کو کاف کے باب میں درج کیا۔ البتہ ایک اور مرادف «کحوک» (بفتح اول و واو معروف) کے ذیل میں «کہنگو» لکھا ہے. «بہارستان» میں ایک اور شکل «کچوک» بھی بتائی ہے. فرہنگ رشیدی. «کچوک، بضمتین، مرضی است کہ آنرا کہنگو نیز گویند». اور یہ محقق ہے.

مکاتیب سلیم

(۱)

[خط مورخۂ ۲۲ مئی ۱۹۲۶ ع]

محسن و مکرم حضرت ڈاکٹر صاحب دام اقبالہ

السلام علیکم. عنایت نامہ حیدر آباد سے منتقل ہو کر میرے پاس بریلی پہنچا. میں آجکل بریلی میں مقیم ہوں اور امتحانات کے پرچے دیکھ رہا ہوں لکھنؤ اور ملیح آباد ہو آیا ہوں. سندیلے کے چند آدمیوں سے آپ کی نسبت پوچھا. معلوم ہوا کہ آپ مکان پر نہیں ہیں. ورنہ میں سندیلے میں آپ سے ملکر یہاں آتا. میرے مکان یعنی پانی پت میں آجکل طاعون ہے. اسلیے ابھی وہاں نہیں گیا. وہاں کے لیے اچھا کچھا اخیر وقت رکھا ہے. بشرطیکہ طاعون نہ رہے. «وضع اصطلاحات» پر آپ کے مکمل تبصرے کا سخت انتظار ہے اور مدت سے اسی انتظار میں ہوں. جلد بھیجکر ممنون فرمائیے.

اہل و عیال غالباً خیر و عافیت سے ہونگے. اللہ تعالےٰ اُن کو اور آپ کو صحیح و سلامت اور با عافیت رکھے. تبصرہ بھیجنے کے لیے پتہ یہ ہے.

وحید الدین سلیم

معرفت مولوی سید عبدالودود صاحب

نمبر (۶۸) ـ سول لائن ـ

بریلی
22 / 5/ 26

(۲)

[پوسٹ کارڈ مورخۂ ۱۴ جون ۱۹۲۶ ع]

مخدومی و محسنی جناب ڈاکٹر صاحب. السلام علیکم و رحمۃاللہ و برکاتہ
تبصرۂ گرامی بریلی سے منتقل ہوکر میرے پاس پانی پت پہنچا. میں نے اس کو سرسری نظر سے دیکھا. اصل کتاب یہاں نہیں ہے حیدر آباد پہنچ کر اس سے مقابلہ کر کے دیکھوں گا.

آپ کی اس کاوش و توجہ کا نہایت شکر گزار ہوں. بچوں کو بہت بہت پیار اور دعا. و السلام مع الاکرام

وحید الدین سلیم
پانی پت ۱۴ جون سنہ ۲۶ ع

[پتے والا رخ]

[پانی پت کی مہر: ۱۴ جون ۲۶]
جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی بالقابہ زاد لطفہ
پروفیسر عربی ڈھاکہ یونیورسٹی
رمنا
ڈھاکہ

RAMNA
DECCA

وحید الدین سلیم
کرشنا منزل - چراغ علی کی گلی

24/11/26

مخدومی جناب ڈاکٹر صاحب - تسلیم بعد تعظیم - مدت کے بعد گرامی نامہ وصول ہو کر باعث اعزاز ہوا - آپ کی عنایتوں اور محبتوں کا نقش ایسا نہیں ہے جسے معمولی فراموشی مٹا سکے - حالانکہ فراموشی کی کوئی صورت آج تک پیش ہی نہیں آئی - میں آپ کا وہی خادم ہوں جو علی گڑھ میں تھا اور جو حیدرآباد میں رہا -

"وضع اصطلاحات" پر آپ نے تکلیف اٹھا کر جو رائے دی اُس کا شکریہ میں کسی طرح ادا نہیں کر سکتا - آپ کے اس تبصرہ کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد میں کوئی خیال میرے دل میں بجز شکرگزاری اور احسانمندی کے پیدا نہیں ہوا - آپ نے جو کچھ لکھا اُس سے میری بہت سی رایوں کو تقویت حاصل ہوئی اور جہاں آپ کی نظر میں کوئی خامی تھی اُس کو بھی آپ نے ظاہر کر دیا - آپ کی تنقید سے فائدہ اٹھا کر میں نے "وضع اصطلاحات" کی ترمیم شروع کر دی تھی اور بہت سا کام ہو گیا تھا مگر ابھی مولوی عبدالحق صاحب اُس کے چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اور کام اُن کو درپیش ہیں اور اسلیے میرا کام ابھی ملتوی کر دیا گیا ہے - آپ ہرگز یہ خیال میری طرف سے اپنے دل میں نہ لائیں کہ میں آپ کی تنقید سے خدانخواستہ ناراض ہو گیا ہوں - معاذ اللہ - میں تو آپ کی اس تکلیف فرمائی کا اسقدر شکرگزار ہوں کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا - تمام ہندوستان میں صرف آپ ہی ہیں جو ایسے علمی کاموں میں میری مدد کر سکتے ہیں -

اور میری خاطر دیدہ ریزی کے ساتھ رائے دینے پر آمادہ ہیں۔ خدا آپ کو
صحت و عافیت کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے اور آپ کے اہل و عیال کو
بھی۔ اس کو میری غفلت اور سہل انگاری کے سوا اور کسی بات پر
محمول نہ فرمائیے کہ میں نے وطن سے واپس آنے کے بعد کوئی عریضہ
آپ کی خدمت میں نہیں لکھا۔ امید ہے کہ میری اس خطا کو معاف
فرمائیں گے۔

"اصلاحِ سخن" کا ایک نسخہ کالج لائبریری کے لیے منگاؤں گا اور
بعض احباب کو بھی اس کتاب کے منگانے کی صلاح دوں گا۔

بچوں کو دعا۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام نیاز۔

وحید الدین سلیم

کرشنا منزل۔ چراغ علی گلی
حیدرآباد دکن

(۳)

[خط مورخۂ ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ ع]

وحید الدین سلیم
کرشنا منزل ۔ چراغ علی کی گلی 24/11/26

مخدومی جناب ڈاکٹر صاحب ۔ تسلیم بصد تعظیم ۔ مدت کے بعد گرامی نامہ وصول ہوکر باعث اعزاز ہوا ۔ آپ کی عنایتوں اور محبتوں کا نشہ ایسا نہیں ہے جسے کوئی ترشی اُتار سکے ۔ حالانکہ ترشی کی کوئی صورت آج تک پیش ہی نہیں آئی ۔ میں آپ کا وہی خادم ہوں جو علی گڑھ میں تھا اور جو حیدر آباد میں رہا ۔ «وضع اصطلاحات» پر آپ نے تکلیف اٹھاکر جو رائے دی اس کا شکریہ میں کسی طرح ادا نہیں کرسکتا ۔ آپ کے اس تبصرہ کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد بھی کوئی خیال میرے دل میں بجز شکرگزاری اور احسانمندی کے پیدا نہیں ہوا ۔ آپ نے جو کچھ لکھا اس سے میری بہت سی رایوں کو تقویت حاصل ہوئی اور جہاں آپ کی نظر میں کوئی خامی تھی اس کو بھی آپ نے ظاہر کر دیا ۔ آپ کی تنقید سے فائدہ اٹھاکر میں نے «وضع اصطلاحات» کی ترمیم شروع کر دی تھی اور بہت سا کام ہوگیا تھا مگر ابھی مولوی عبدالحق صاحب اس کے چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔ کچھ اور کام ان کو در پیش ہیں اور اس لیے میرا کام ابھی ملتوی کر دیا گیا ہے ۔ آپ بھولے سے یہ خیال میری طرف سے اپنے دل میں نہ لائیں کہ میں آپ کی تنقید سے خدا نخواستہ ناراض ہوگیا ہوں ۔ معاذ اللہ ۔ میں تو آپ کی اس تکلیف فرمائی کا اسقدر شکرگزار ہوں کہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا ۔ تمام ہندوستان میں صرف آپ ہی ہیں جو ایسے علمی کاموں میں میری مدد کر سکتے ہیں ۔ اور میری خاطر دیدہ ریزی کے ساتھ رائے دینے پر آمادہ ہیں ۔ خدا آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے اور آپ کے اہل و عیال کو بھی ۔ اِس کو میری غفلت اور سہل انگاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہ فرمائیے

کہ میں نے وطن سے واپس آنے کے بعد کوئی عریضہ آپ کی خدمت میں نہیں لکھا ۔ امید ہے کہ میری اس خطا کو معاف فرمائینگے ۔

« اصلاح سخن »[۱] کا ایک نسخہ کالج لائبریری کے لیے منگاؤں گا اور بعض احباب کو بھی اس کتاب کے منگانے کی صلاح دوں گا ۔ بچوں کو دعا ۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام پیار ۔

وحید الدین سلیم
کرشنا مرل چراغ علی کی گلی
حیدر آباد دکن

(۱) تالیف عبدالعلی ,, شوق،، سندیلوی (مرحوم) ، جو انہیں دنوں شائع ہوئی تھی۔

تبصرے

حالی کا سیاسی شعور ، از معین احسن جذبی ، صفحات ۲۰۸ ،
قیمت چار روپے پچاس نئے پیسے ، سول ایجنٹ : انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مولانا حالی کا شمار سر سید کے اہم ترین رفقا اور مخلص ترین احباب میں ہوتا ہے . اسی بنا پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا حالی کے خیالات سر سید کے خیالات کی صدائے باز گشت ہیں . اس عام خیال کو تقویت دینے والی حالی کی مشہور قومی نظم مد و جزر اسلام (مسدس حالی) اور سر سید کی سوانح عمری (حیات جاوید) ہے . ہماری زبان کے مشہور و مقبول شاعر معین احسن صاحب جذبی نے زیر نظر مقالہ (یا کتاب) میں اسی عام خیال یا نظریہ کی تردید کی کوشش کی ہے . ابتدائے کتاب میں تقریب اور تعارف کے عنوانات کے تحت علی الترتیب ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی مختصر تحریریں ہیں جن میں جذبی کی اس کوشش کو سراہا گیا ہے .

جذبی نے مولانا حالی کے سیاسی شعور کی ابتدا بجا طور پر ان کے اور نواب شیفتہ کے تعلقات سے کی ہے . جس طرح حالی کو اپنے ادبی ذوق کے سنوارنے میں غالب سے نہیں بلکہ شیفتہ سے فائدہ پہنچا » اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ « شیفتہ جیسی ہستی کی صحبت میں حالی کے سیاسی افکار و میلانات نے ایک خاص رخ ضرور اختیار کیا ہوگا . » جذبی کی یہ دلیل بھی اپنی جگہ پر معقول ہے کہ « یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے کہ . . . . حالی نے وہابی تحریک کا اثر قبول کیا ہو اور اس تحریک کی بنیاد انگریزی حکومت کی تخریب اور اسلامی حکومت کے قیام پر تھی . » جذبی کا یہ قول بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ حالی « جہاں حضرت شاہ ولی اللہ کے مذہبی افکار کے قائل تھے وہاں ان کے انقلاب آفریں تصورات سے بھی ضرور متاثر ہوئے ہوں گے . » لیکن حالی کے سیاسی شعور کی جڑوں کا پتا اور صحیح پتہ لگانے کے ساتھ ہی جذبی فوراً انہیں سر سید کے زیر اثر کام کرتا ہوا بتا دیتے ہیں . اس سے قاری کو الجھن ہوسکتی ہے . حالی کے صنعتی شعور اور دور بینی کا بہت کچھ کھوج لگانے اور انہیں اجاگر کرنے کے بعد وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ « اسے ان کی مذہبی تربیت یا شیفتہ کی عالمانہ صحبتوں

کا نتیجہ سمجھیے یا سر سید کی تحریک کا اثر، بہر صورت مسلمانوں کی خدمت ان کی زندگی کا مقصد بن گئی۔»

اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف نے جس عام خیال کی تردید کی کوشش کی ہے وہ ایک حد تک صحیح ہے۔ حالی سر سید سے متاثر ہونے اور ان کے زیر اثر کام کرنے کے باوجود اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔ ان کا سیاسی شعور بجا طور پر بیدار تھا اور ان کی آواز کو صرف سید کے خیالات کی صدائے باز گشت نہیں کہہ سکتے۔ حالی کو سید کے بعد ١٦ سال کا زمانہ ملا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت و بغاوت کا جذبہ پیدا ہوچکا تھا۔ مصنف نے حالی کے صنعتی شعور کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ لیکن ان کے بہت سے بیانات نظر ثانی چاہتے ہیں، مثلاً ان کا یہ کہنا کہ «وفاداری کی رسن حالی کے نزدیک مجبوری اور مصلحت تھی۔» صحیح نہیں بلکہ یہ حقیقت میں سر سید کا اثر تھا۔ اسی طرح ان کا یہ لکھنا کہ «حالی کو قوم کی خوش حالی کی فکر سر سید سے کہیں زیادہ» تھی قابل بحث ہے۔

یہ کتاب حالی کے متعلق ایک نیا نقطۂ نگاہ پیش کرتی ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اس طرح یہ «حالیات» میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

غزل اور درس غزل از اختر انصاری صفحات ١۴٥ دو روپے ملنے کا پتہ:

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

غزل اردو شاعری کی مقبول تریں صنف ہے۔ رشید احمد صدیقی اسے اردو شاعری کی آبرو کہتے ہیں۔ آج بھی جب کہ اردو کے گلستان سخن میں اور رنگوں کے بھی نہایت حسین پھول کھل چکے ہیں غزل کی مقبولیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ لڑکے، جوان، بوڑھے سبھی اسے پڑھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اوپر کے درجوں کی کوئی درسی کتاب غزلوں کے انتخاب سے خالی نہیں ہوتی اس لئے ضرورت ہے کہ ایسی اہم اور شگفتہ صنف شاعری کی تدریس ایسے نہج پر ہوکہ اس کے ذریعہ طلبہ میں ادبی ذوق اور گہری سوجھ بوجھ پیدا ہو۔ اختر انصاری

پروفیسر ٹریننگ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے یہ کتاب اسی نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے۔

اختر انصاری ایک طرف اردو کے بلند پایہ ادیب ہیں اور دوسری طرف تعلیم کے پروفیسر۔ ان دونوں خوبیوں کی یکجائی نے کتاب کو دل چسپ بھی بنا دیا ہے اور مفید بھی۔ اختر انصاری اس بات کے قائل ہیں کہ غزل کو درسی کتابوں میں جگہ ملنی چاہئیے لیکن ان کی شمولیت کے لیے « ایک انتخابی اصول کی ضرورت ہے۔» انہوں نے جو انتخابی اصول پیش کئے ہیں وہ اپنی جگہ پر بہت صحیح ہیں ان پر عمل کرنے کے بعد غزلوں کا جو انتخاب ہوگا وہ بلا جھجک لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو پڑھایا جاسکتا ہے اور ان کے ذریعہ طلبہ میں ترقی یافتہ ادبی مذاق اور گہری سوجھ بوجھ پیدا ہوگی۔ مگر تدریس اور تدریسی طریق کار کے مسائل سے متعلق بحث کرتے ہوئے اختر انصاری نے غزل میں جذباتی یک رنگی یا کیفیاتی وحدت ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تمہید سبق اور اعادۂ سبق سے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

یہ کتاب حقیقۃً غزل سے نہیں بلکہ درس غزل سے متعلق ہے اور ٹریننگ کالج کے طلبہ یا مدرسہ کے اساتذہ جن کا مضمون اردو کی تدریس ہے اس سے استفادہ کرسکیں گے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مصنف نے پانچ غزلوں کے منصوبے یا خاکے تیار کئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں طلبہ قدم بڑھا سکیں۔ یہ ایک ماہر استاد، بلند مذاق ادیب اور خوش گو شاعر کے تیار کئے ہوئے خاکے ہیں اس لئے یقیناً ٹریننگ کالج کے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

آخری باب چند غزل گو شعرا کے « نمائندہ انتخاب » کا حامل ہے۔ یہ انتخاب بقول مصنف اس اصول کی روشنی میں کیا گیا ہے جو دوسرے باب میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ دھما باقی رہا نہ کپڑا۔ یہ انتخاب غزل کی روح یعنی تغزل سے یکسر خالی ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے کے علاوہ دل چسپ اور شگفتہ انداز بیان کی حامل ہے۔ امید ہے کہ ٹریننگ کالج کے طلبہ اور ہائی اسکولوں کے اردو کے اساتذہ ضرور اس سے مستفید ہوں گے۔

پاکستان میں ذہنی رجحانات مصنفہ عبیداللہ قدسی صفحات ٢٠٤ قیمت مجلد پانچ روپے .
ملنے کا پتہ : مشتاق بک ڈپو ، اردو بازار ، کراچی نمبر ١

اس کتاب میں عبیداللہ قدسی نے اہل پاکستان کا ذہنی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے . یہ جائزہ انھوں نے « زیادہ تر اردو زبان کی مطبوعات » کے ذریعہ لیا ہے کیوں کہ پاکستان کے « مسلمانوں کا سرمایۂ علم و ادب اسی زبان میں سب سے زیادہ رہا ہے اور اس وقت بھی اسے آئینہ داری کی حیثیت حاصل ہے . » کتاب پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (سابق وزیر تعلیم پاکستان) کا دو صفحہ کا پیش لفظ ہے - جس میں انھوں نے بعض اچھی باتیں کہی ہیں .

یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کی کوششیں مدت سے ہورہی ہیں کیونکہ یہ ادب یا دوسرے لفظوں میں قوم کی ذہنی ترقی کے لیے ضروری ہیں ، لیکن اردو میں یہ اپنی نوع کی پہلی کوشش ہے . اس سے اردو ادب کو فائدہ پہنچیگا اور قوم کی ذہنی ترقی کی رفتار کو سمجھنے اور پھر اسے تیزتر کرنے میں مدد ملے گی مصنف نے زندگی (یا ادب) کے تقریباً تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے . لیکن بعض جائزے ضرورت سے زیادہ مختصر ہیں ، یہاں تک کہ بعض اہم باتیں کہنے سے رہ گئی ہیں مثلاً تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے مولوی عبدالحق ، سید عبداللہ وغیرہ جیسے مستند نقادوں کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدسی صاحب نے جائزہ لیتے وقت عموماً تاریک گوشوں ہی پر نظر رکھی ہے . اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ جائزہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے .

ادب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مصنف نے پاکستان کے علمی و ادبی اداروں ، ذخیروں اور قابل قدر کتابوں کا بھی مختصر طور پر ذکر کیا ہے ، یہ معلومات نہ صرف دل چسپ ثابت ہوں گی ، بلکہ نوجوان مصنفوں اور مضمون نگاروں کے لیے مفید اور ہمت آفریں ثابت ہوں گی .

کتاب مجموعی حیثیت سے پڑھنے والے کو دعوت غور و فکر دیتی ہے اور یہ ایک کتاب یا مصنف کی کامیابی کا ایک بڑا ثبوت ہے .

(ع - ر - ق)

مقالـــہ نمـا

مرتبین:

ڈاکٹر عالی جعفری

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱ ادو محمد امام الدین رام نگری
نظریہ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رام پور ۶۰ء اکتوبر ، نومبر ، دسمبر)
عقیدۂ رسالت کے پیش نظر اوتار کے نظریہ کی وضاحت کی ہے ۔ قسط ۱ ، ۲ ، ۳

۲ اصلاحی امین احسن
سفر حج ــــ سفر کی پہلی منزل
(میثاق لاہور ۶۰ء نومبر ۴۰ ـ ۴۱ ـ ۴۸)
سفر حج کے سلسلے میں تیاری کا ذکر

۳ اصلاحی امین احسن
سفر حج ــــ کراچی سے جدہ
(میثاق لاہور ۶۰ء دسمبر ۴۴ ـ ۵۱)
کراچی سے جدہ تک کے سفر کے حالات درج ہیں

۴ اصلاحی صدرالدین
عبادت کا اسلامی تصور
(زندگی رام پور ۶۰ء نومبر ۴۲ ـ ۵۶)
عبادت کے اسلامی تصور کی وضاحت کی ہے

۵ اصلاحی ضیاءالدین
خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب
(میثاق لاہور ۶۰ء اکتوبر ، نومبر ، دسمبر)
خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب بیان کئے ہیں ۔ قسط ۳ ، ۴ ، ۵

۶ تنزیل الرحمن
اسلام کا نظام معدلت
(ثقافت ۶۰ء دسمبر ۳۱ ـ ۳۶)
اسلام کے نظام معدلت کا ایک خاکہ پیش کیا ہے

۷ خورشید احمد
اسلامی آئیڈیو لوجی
(چراغ راہ ۶۰ء دسمبر ۳۱ ـ ۷۵)
اسلامی نظریۂ زندگی و سیاست کی وضاحت کی ہے

۸ زرقاء مصطفے احمد
مترجم : اصلاحی ضیاءالدین
اجتہــــاد
(معارف ۶۰ دسمبر ۴۳۴ ـ ۴۵۰)
دسمبر ۱۹۵۷ء کے آخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے شروع میں ہونے والی اسلامی بین الاقوامی کانفرنس (لاہور ، پاکستان) میں پڑھے جانیوالے ایک مقالہ کا ترجمہ درج ہے ۔ مقالہ عربی میں ڈاکٹر مصطفے احمد زرقاء کا لکھا ہوا ہے

۹ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
مترجم قادری سید احمد
دین نصیحت ہے
(زندگی رام پور ۶۰ء اکتوبر ۱۹ ـ ۲۵)
رسول اکرم کی متعلقہ حدیث کی

عبدالحق محدث دہلوی نے تشریح کی جس کا ترجمہ یہاں درج ہے

۱۰ صدیقی مظہرالدین

اسلامی تحریک پر تصوف کا اثر

(ثقافت ۶۰ء اکتوبر ۶۸ ـ ۷۲)

ابتداءً تصوف نے مسلمانوں پر اچھا اثر ڈالا لیکن عرب سے باہر نکل کر خود اس کی نوعیت بدل گئی ـ چنانچہ بعد میں اس کا اثر اچھا نہیں پڑا

۱۱ صدیقی مظہرالدین

انسانیت اسلام سے پہلے

(ثقافت ۶۰ء نومبر ۳۱ ـ ۴۶)

اسلام سے قبل کی مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی ماحول کا جائزہ پیش کیا ہے

۱۲ عبدالحئی

اسلامی فکر میں وحدۃالوجود کا نظریہ

(معارف ۶۰ء اکتوبر ۳۰۱ ۳۰۵)

۲ ـ (معارف ۶۰ء اگست سے مسلسل)

دوسری قسط درج ہے

۱۳ عبدالغفار حسن

غربت اسلام کے اسباب

(میثاق لاہور ۶۰ء اکتوبر ۲۳ ـ ۳۰)

غربت اسلام کے اسباب کی تفصیل درج ہے

۱۴ عتیق الرحمن سنبھلی

تعداد ازدواج

(الفرقان ۶۰ء اکتوبر ۴۹ ـ ۶۲)

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی کی مرتبہ کتاب «مسئلہ تعداد ازدواج» پر تبصرہ کیا ہے

۱۵ عثمانی ظفر احمد

مقتدی اور سورۂ فاتحہ کی قرأت

(فاران ۶۰ء نومبر ـ دسمبر)

۱ ـ مقتدی اور سورۂ فاتحہ کی قرأت کے سلسلے میں کتاب و سنت کی روشنی میں حنفی مذہب کا موقف بیان کرنے کی کوشش کی ہے ـ قسط ۱ ـ ۲

۱۶ عمری جلال الدین انصر

اسلام کا شورائی نظام

(میثاق لاہور ۶۰ء اکتوبر، نومبر، دسمبر)

اسلام کے نظام شوریٰ پر تفصیلی بحث قسط ۲، ۳، ۴

۱۷ عمری جلال الدین انصر

زندگی کی وسعتوں پر خدا کی حکمرانی

(زندگی رام پور ۶۰ء اکتوبر ۳۹ ـ ۴۷)

خدا کا تصور زندگی بسر کرنے کا ایک سسٹم عطا کرتا ہے اور زندگی کے سارے پہلوؤں کو محیط ہے

۱۸ قریشی اعجاز حسین

اسلام کا تاریخی رول

(چراغ راہ ۶۰ء دسمبر ۹۷ ـ ۱۰۴)

اسلام نے تاریخ انسانیت کی تشکیل میں ایک منفرد کردار ادا کیا ہے

۱۹ محمد ناصر و سعید رمضان

مترجم: حامدی خلیل

اسلام اور تھیا کریسی

(چراغ راہ ۶۰ء دسمبر ۹۰، ۹۲، ۹۳ و ۹۶)

«اسلامی حکومت» سے خوفزدہ ہونا غلط ہے۔ دوسری مذہبی حکومتوں سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی حکومت انسانی فطرت کے مطابق ہے۔

۲۰ محمود احمد شیخ

اسلام کا نظریۂ سود اور بنک کاری

(ثقافت ۶۰ اکتوبر ۲۲ - ۳۱)

قرآن و احادیث کی روشنی میں سود اور بنک کاری سے متعلق اسلامی نظریہ بیان کیا ہے

۲۱ مرزا احمد علی

شریعت اسلام اور منافع بینک

(ثقافت ۶۰ نومبر ۵۸-۷۲)

منافع بینک پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے

۲۲ مودودی ابوالا علیٰ

منصب نبوت — صحیح اور غلط تصور کا فرق

(ترجمان القرآن ۶۰ نومبر ۹۷-۱۲۰)

۲۔ دوسری قسط درج ہے۔

۲۳ مودودی ابوالا علیٰ

سنت کے متعلق چند مزید سوالات

(ترجمان القرآن ۶۰ دسمبر ۴۵-۶۲)

سنت کے متعلق ڈاکٹر عبدالودود کے چند مزید سوالات کے جوابات درج ہیں۔

۲۴ ندوی حافظ مجیب اللہ

اسلامی قانون اور عرف و عادت

(معارف ۶۰ اکتوبر ۲۴۵-۲۶۳)

۲۔ دوسری قسط درج ہے۔

۲۵ وحیدالدین خاں

سورۂ مزمل

(زندگی رام پور ۶۰ اکتوبر ۹-۱۸)

مطالعۂ قرآن کے تحت سورۂ مزمل کا مطالعہ پیش کیا ہے

۲۶ وحیدالدین خاں

سورۂ عصر

(زندگی رام پور ۶۰ نومبر ۹-۱۰)

مطالعۂ قرآن کے سلسلے میں سورۂ عصر کا مطالعہ پیش کیا ہے۔

۲۷ وحیدالدین خاں

گوشت خوری کا مسئلہ

(زندگی رام پور ۶۰ نومبر ۲۲-۴۱)

گوشت خوری یا جانوروں کے سلسلے میں اسلامی قوانین صحیح اور فطری ہیں۔ ان پر اعتراض کرنا بالکل غلط ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۸ آغا محمد اشرف

آزاد کا سفرِ ترکستان

(ماہ نو ۶۰ اکتوبر ۲۸-۲۹)

ڈاکٹر صادق کے مضمون « سفرِ ایران مطبوعہ ماہِ نو جنوری ۱۹۵۸ کی تردید میں لکھا ہے۔

۲۹ ادارہ

حضرت ثوبان

(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۰ نومبر ۲۳-۲۴)
مشہور صحابی حضرت ثوبان کا مختصر تذکرہ درج ہے۔

۳۰ ادارہ
مولانا رشید احمد گنگوہی
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۰ نومبر ۲۸،۲۵)
مکاتیب کی روشنی میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے خیالات اور قلبی کیفیات بیان کی ہیں۔

۳۱ ادارہ
مولانا رشید احمد گنگوہی
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۰ دسمبر ۲۸،۲۵)
حضورِ قلب، انکسار، چشتیۂ زمان، عایت انکسار، نفس خبیث، خطرات نفس حدیث نفس اور ذات باری تعالیٰ کے عنوانات کے تحت مولانا رشید احمد گنگوہی کی شخصیت کی کیفیت اور ان کے خیالات پیش کئے ہیں۔

۳۲ بدرالدین احمد بدر
مولانا ابوالکلام آزاد اور البیچ
(اشارہ پٹنہ ۶۰ نومبر ۱۲،۹)
ہفتہ وار البیچ پٹنہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلق کا تذکرہ کیا ہے۔

۳۳ برہم ناتھ دت
چنگیز خاں
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۰ دسمبر ۴۹-۵۶)
۱۔ چنگیز کے حالات کی پہلی قسط درج ہے۔

۳۴ جاوید عصمت اللہ
قرۃالعین سر زمین ایران کی قلو بطرہ
(نگار ۶۰ نومبر ۲۶-۳۴)
مسلک بابی کی حسین و جمیل ہیروئن قرۃالعین کی داستانِ حیات پیش کی ہے۔

۳۵ خلیق انجم
مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط
(برہان ۶۰ اکتوبر ۳۲-۳۸)
ضروری تمہید کے بعد مرزا کے دو خط درج کئے ہیں جن مرزا کے خاندان اور اس زمانہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

۳۶ خلیق انجم
مرزا مظہر جانجاناں
(برہان ۶۰ نومبر ۴۹-۵۴)
۲۔ اس قسط میں مختلف لوگوں کے نام چار خط ہیں جو جانجاناں کی شخصیت اور زمانہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۳۷ خلیق انجم
مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط
(برہان ۶۰ دسمبر ۵۷،۴۸)
۳۔ اس قسط میں تین خط درج ہیں جو مرزا کے عہد و شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں

۳۸ دسنوی عبدالقوی
مولانا ابوالکلام آزاد اور حیات جاوید
(قومی زبان ۶۰ اکتوبر)
مولانا ابوالکلام آزاد اور حیات جاوید پر ان کی آراء کا بیان ہے۔

۳۹ صابر مٹھیالوی
تذکرۂ بزرگانِ اسلام
(عارف لاہور ۶۰ اکتوبر ۱۳ـ۱۸)
حضرت خواجہ فقیر محمد نقشبندی رح
کے سوانح حیات بیان کئے ہیں۔
۴۰ صابر مٹھیالوی
تذکرۂ بزرگان اسلام
(عارف لاہور ۶۰ نومبر ۱۱ـ۱۳)
حضرت محمد رمضان صاحب شہید رح
کے مختصر سوانح حیات بیان کئے ہیں۔
۴۱ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور ۶ دسمبر ۱۳ـ۱۶)
حضرت ابوالحسن نور رح کے سوانح حیات
بیان کئے ہیں۔
۴۲ وائق کلب علی خاں:
انجام: نواب عمدۃالملک امیر خاں
(اورینٹل کالج میگزین ۶۰ نومبر ۱ـ۳۳)
نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کے
حالات پیش کئے ہیں۔
۴۳ فریدی نسیم احمد:
تجلیات مجدد الف ثانی مکتوبات کے
آئینے میں
(الفرقان لکھنؤ ۶۰ اکتوبر ۲۹ـ۳۴)
شیخ مودود سرہندی، خانخاناں، شیخ
فرید بخاری، ملا احمد برکی، میرزا
داراب ابن خانخاناں کے نام چھ خطوں
کا ترجمہ و تلخیص درج ہے جن میں
مذہبی امور سے متعلق مجدد الف ثانی کے
خیالات و تاثرات ملتے ہیں۔
۴۴ فریدی نسیم احمد
تجلیات مجدد الف ثانی ـ مکتوبات کے
آئینے میں
(الفرقان لکھنؤ ۶۰ نومبر و دسمبر ۱۷ـ۲۴)
مولانا محمد اشرف، مولانا محمد طاہر
لاہوری، شیخ بدیع الدین سہارنپوری اور
خواجہ محمد سعید سرہندی کے نام کے خطوں
کا ترجمہ و تلخیص درج ہے جن میں
مذہبی امور سے متعلق مجدد الف ثانی
کے خیالات ملتے ہیں۔
۴۵ محمد ایوب کیپٹن
مطالعۂ آزاد
(العلم، کراچی ۶۰ جولائی تا دسمبر ۹۸ـ۱۱۴)
مولانا آزاد کی تصانیف اور مضامین
کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد مولانا کی
سوانح حیات اور ذہنی کاوشوں سے متعلق
بعض ایسے بیانات پیش کئے ہیں جو
متضاد ہیں یا محلِ نظر۔
۴۶ محمد صادق
راہے کہ من رفتم (ایک خط)
(ماہ نو ۶۰ دسمبر ۱۰ـ۱۴)
ڈاکٹر آغا اشرف کے اعتراض پر کہ
آزاد کا سفر ترکستان تھا اور ڈاکٹر موصوف
نے اسے سفر ایران لکھا ہے، جو اباً
«ڈاکٹر صادق نے اپنے مضمون مطبوعہ
ماہِ نو جولائی ۱۹۵۸ء کی وضاحت کی ہے۔

۴۷ محمد عتیق صدیقی

سر سید کا ایک مخالف اخبار

(جامعہ دہلی ٦۰ دسمبر ۷۸-۹۱)

دہلی کے قدیم مٹیو میموریل گزٹ کا تذکرہ ہے ۔

۴۸ محمد عزیز ،

مولوی نذیر احمد کے لکچر

(فکرو نظر ، علی گڑھ ٦۰ اکتوبر ۳۰-۵۷)

مولوی نذیر احمد کا بحیثیت مقرر تعارف کراتے ہوئے ان کی تقریروں کی خصوصیات کا خاکہ پیش کیا ہے ۔

۴۹ محمد علی

شائع کنندہ جعفری رئیس احمد

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ تاریخی خط

(ثقافت ٦۰ اکتوبر ۳۲-۳۸)

غلام بھیک نیرنگ کے نام اس خط میں ۱۹۲۵ء کی قریب کی عام سیاسی فضا اور مسلمانوں کی کیفیت سے متعلق مولانا محمد علی کے تاثرات درج ہیں ۔

۵۰ محمد مسعود احمد

جمال الدین احمد ہانسوی الخطیب

(برہان ٦۰ نومبر دسمبر ، ۵-۲۲)

مشہور صوفی و شاعر جمال الدین احمد ہانسوی الخطیب کی حیات و شخصیت اور شاعری کا تعارف پیش کیا ہے ۔ قسط ۱ ــ ۲ ۔

۵۱ محی الدین قادری زور

جیون خان

(سب رس ، حیدر آباد ٦۰ نومبر ۴-۵)

محمد جیون خان قلعہ دار گولکنڈہ کی سوانح حیات کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے مضمون نگار نے اسی کا تعارف کرایا ہے ۔

۵۲ مختار الدین احمد

مکاتیب سر سید

(فکرو نظر ، علی گڑھ ، ٦۰ اکتوبر ۱۳۵-۱۳۸)

مکاتیبِ سر سید کی تیسری قسط ہے جس میں دو خطوں کی نقل اور ایک خط کا عکس ہے ۔

۵۳ ندوی سید سلیمان

مکاتیب ۰۰۰ بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی

(معارف ٦۰ اکتوبر ۳۰٦-۳۱۰)

۲ دوسری قسط ہے ۔ اس میں چار خط ہیں جن میں کانگریس و خلافت ، جدہ کا سفر (ابن سعود اور شریفیوں کی جنگ کے وقت) سنگاپور میں قادیانیوں کی شکست (۱۹۲۵ء) وغیرہ سے متعلق گفتگو کی ہے ۔

۵۴ ندوی سید سلیمان

مکاتیب ۰۰۰ بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب مرحوم دسنوی

(معارف ٦۰ دسمبر ۴۵۹)

۳ اس قسط میں دس خط درج ہیں

جن میں نجی حالات کے ساتھ دارالمصنفین اور مولانا کی تصنیف و تالیف وغیرہ سے متعلق چند باتیں ملتی ہیں۔

۵۵ ہاشمی نصیر الدین

سیرت النبی کی ایک اہم اور اردو کتاب یعنی فوائد بدریہ

(برہان ۶۰ اکتوبر ۳۹-۴۵)

قاضی بدرالدولہ (ارکاٹ) المتوفی ۱۲۸۰ ھ کی فوائد بدریہ کا تعارف کرایا ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۵۶ اسرار عالم:

پاکستان — تاریخ کے پس منظر میں

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۱۲۱-۱۹۳)

مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے قومی، تمدنی اور تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کی ہے اور پاکستان اسی سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے وجود میں آیا۔

۵۷ ادارہ

حضرت عمرو بن عبسہ

(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۰ دسمبر ۲۳-۲۴)

عمرو بن عبسہ کے حالات، قبول اسلام اور شجاعت وغیرہ کا مختصر تذکرہ درج ہے۔

۵۸ اسمتھ، ڈبلیو، سی

ترجمہ: عبدالرحمٰن

پاکستان کی اسلامی ریاست

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۷۷-۲۹۴)

ولفریڈ کانٹول اسمتھ کی کتاب «اسلام تاریخ جدید میں» کے پاکستان سے متعلق باب کی تلخیص و ترجمہ درج ہے۔ ساتھ ہی مسٹر اسمتھ کے تسامحات بھی ادارہ چراغ راہ نے استدراک کے عنوان کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

۵۹ انصاری ظفر احمد

پاکستان ماضی، حال اور مستقبل

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۲۰۷-۲۱۷)

پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل کے سلسلے میں اپنے خیالات اور تاثرات بیان کئے ہیں۔

۶۰ انصاری ظفر احمد

نظریۂ پاکستان اور علما

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۲۲۸-۲۴۸)

نظریۂ پاکستان کی تشکیل اور پاکستان کی تعمیر و ترقی میں علماء نے جو حصہ لیا ہے اس کی صراحت کی ہے۔

۶۱ بیدار عابد رضا

تحریک ندوۃالعلماء

(ثقافت ۶۰ دسمبر ۵۸-۶۲)

تحریک ندوۃالعلما سے متعلق ایک دستاویز درج ہے۔

۶۲ ثمینہ شوکت

جنگ آزادی کا اولین مجاہد

(نوای ادب، بمبئی ۶۰ اکتوبر ۱۷-۲۹)

آصف جاہی شہزادہ میر گوہر علی خان مبارز الدولہ اردو کا شاعر اور جنگ آزادی کا اولین مجاہد تھا۔ اس نے مہاراجہ چندو لعل اور انگریزوں کی دست برد کے خلاف بغاوت کی تھی۔

۶۳ حامدی خلیل

عالم اسلام اور نظریۂ پاکستان ــــ دستوری اثرات کا ایک جائزہ

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۳۰۵-۳۲۲)

عالم اسلام کے دستوروں پر نظریۂ پاکستان کے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے

۶۴ حسن ریاض

قرارداد پاکستان کا منظر و پس منظر

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۱۹۴-۲۰۶)

مقالہ نگار نے ان سیاسی رجحانات اور واقعات کا جائزہ لیا ہے جن کے نتیجہ کے طور پر قرارداد پاکستان پیش کی گئی تھی۔ نیز مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس کی مختصر روداد بھی پیش فرمائی ہے۔

۶۵ خالد بن سعید

مترجم: نظمی، وحید اللہ

پاکستان کے ۱۲ سال ــــ ایک جائزہ

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۲۴۹-۲۶۵)

قیام پاکستان سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۶۶ خان جی۔ ایم

ہمارے خیالات

(ہندوستانی ادب حیدرآباد ۶۰ اکتوبر - نومبر ۳-۱۶)

رسالۂ ہندوستانی ادب، کی اشاعت کی ۲۰ سالہ تاریخ پیش کی ہے۔

۶۷ خلیق احمد نظامی

نفائس المآثر

(فکر و نظر، علی گڑھ ۶۰ اکتوبر ۱۳۱-۱۴۲)

عہدِ اکبری کے ایک مشہور ادیب و مورخ علاء الدین کامی قزوینی کی تالیف نفائس المآثر کا قدیم ترین نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، مضمون نگار نے مؤلف اور اس کی تالیف کا تعارف کرایا ہے۔

۶۸ خورشید احمد

پاکستان۔ تاریخی دستاویزات

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۴۴۵-۵۴۳)

پاکستان کے نظریہ اور قیام کے سلسلے میں تاریخی اہمیت کے مالک بیانات اور تحریریں درج ہیں۔

۶۹ خورشید مصطفےٰ رضوی

تحریک ۱۸۵۷ء کا ایک ماخذ

(نگار ۶۰ اکتوبر ۱۲-۲۶)

تحریک آزادی سے متعلق آر۔ سی مجمدار کی کتاب پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔

۷۰ رشید الدین

قلعۂ دولت آباد

(آجکل ۶۰ دسمبر ۱۹)

مرہٹواڑہ کے قدیم اور مستحکم تاریخی قلعہ « قلعۂ دولت آباد » کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۱ ز۔ ربیری

قتل شیر افگن اور معاشقۂ جہانگیر و نور جہاں

(نگار ۶۰ دسمبر ۳۵-۳۸)

قتلِ شیر افگن اور معاشقۂ جہانگیر و نور جہاں کو تاریخ کی صحیح روشنی میں پیش کیا ہے۔

۷۲ صباح الدین عبد الرحمان

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تہوار

(معارف ۶۰ نومبر، دسمبر)

عیــد الفطر، عید اضحیٰ اور جشن نوروز کا ذکر ہے قسط ۱ - ۲

۷۳ ضیاء الحسن فاروقی

ترکی اٹھارہویں ایسویں صدی میں

(جامعہ دہلی ۶۰ دسمبر ۶۴-۷۷)

پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفےٰ کمال کی قیادت میں انقلاب ترکی کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔

۷۴ فارق خورشید احمد

تاریخ الـرّدۃ

(برہان ۶۰ اکتوبر، نومبر)

تیرہویں اور چودہویں قسط درج ہے۔

۷۵ قاضی اطہر مبارکپوری

قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری متوفی محرم ۵۶۳ ھ

(معارف ۶۰ دسمبر ۴۵۱-۴۵۸)

الذخائر والتحف (عربی) کے مقدمہ میں قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری سے متعلق مقدمہ نگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے سہو پر تنقید و تحقیق کی ہے

۷۶ کیانی ایم۔ آر۔ وغیرہ

مذاکرہ — پاکستان اور اسلامی نظریہ

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۴۳۹-۴۴۰)

پاکستان اور اسلامی نظریہ کے سلسلے میں مختلف لوگوں کے خیالات اور تاثرات درج ہیں۔

۷۷ محمد عاصم

ارض القرآن کا سفر

(ترجمان القرآن ۶۰ دسمبر ۳۱-۴۴)

۶ - چھٹی قسط درج ہے۔

۷۸ مصطفی السباعی

مترجم: حسینی سید محمد

اسلامی تاریخ میں اوقاف اور رفاہ عام کے ادارے

(الفرقان لکھنؤ ۶۰ نومبر و دسمبر ۷۹-۸۶)

مسلمانوں کے اوقاف اور رفاہ عام کے اداروں کی نوعیت و کیفیت بیان کی ہے۔

۷۹ مغیث الحسن سید

سر جادوناتھ سرکار کا محفوظۂ مخطوطات

(معارف ۶۰ نومبر ۳۷۴-۳۸۸)

۱ ـ سر جادو ناتھ سرکار کے انتقال (۱۹۵۸ ء) کے بعد (۱۹۵۹ ء) ان کے مخطوطوں وغیرہ کو نیشنل لائبریری میں منتقل کردیا گیا. موجودہ مقالہ اس مخطوطہ کی کتابوں کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے (باقی).

۸۰ مودودی ابو الاعلیٰ

اسلامی ریاست کے بیادی اصول

(چراغ راہ ۶۰ دسمبر ۷۶ـ۸۹)

اسلامی نظریۂ سیاست کی توصیح کرتے ہوئے اس کے بیادی اصول مع تشریح بیان کئے ہیں.

۸۱ ندوی ابو الحسن علی

طوفان سے ساحل تک

(الفرقان لکھنؤ ۶۰ اکتوبر ۸ـ۲۸)

جرمن نو مسلم لیوپولڈ محمد اسد کی «روڈ ٹو مکہ» کے اردو ترجمہ «طوفاں سے ساحل تک» کا مقدمہ درج ہے حو خود کتاب کا نچوڑ ہے.

۸۲ نذیر احمد

سلاطین گجرات کی ایک نادر تاریخ

(فکر و نظر، علی گڑھ ۶۰ اکتوبر ۷۲ـ۸۵)

تاریخ گجرات کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے حس کا ذکر مقالہ نگار کے خیال میں فرشتہ نے طبقات محمود شاہی کے نام سے کیا ہے.

تنقید ادب، لسانیات

۸۳ احمل حان

بھارت کی زبانوں میں عربی فارسی کے الفاظ

(آجکل ۶۰ دسمبر ٤ـ۱۲)

بھارت کی زبانوں خصوصاً گجراتی اور کشمیری میں عربی فارسی کے الفاظ کے استعمال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک طویل فہرست دی ہے.

۸۴ احسن فاروقی

تخلیق و تنقید

(قومی زبان نومبر دسمبر ۶۰)

تخلیق میں تنقیدی شعور کی اہمیت کو پیش کیا ہے.

۸۵ اختر انصاری

ہندوستانی ڈراما اور انارکلی،

(ہندوستانی ادب، حیدرآباد ۶۰ اکتوبر، نومبر، دسمبر)

اردو ڈراما نگاری کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے، انارکلی، کا درجہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے. قسط ۱ـ ۲ـ

۸۶ انجم فاطمی

غالب ـــ اس کا عہد اور شاعری

(شاعر، بمبئی، ۶۰ نومبر ۱۵ـ۱۸)

غالب کی زندگی میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ایک دور ختم ہوکر دوسرے دور کا آغاز ہورہا تھا اسی لئے غالب کے کلام میں روایت اور جدت پسندی

باہم گلے مل رہی ہیں ۔

۸۷ انصار اللہ نظر

فوق بن ذوق

(نگار ٦٠ دسمبر ٢٠-٢٣)

ذوق کے لڑکے فوق سے متعلق مختلف تذکروں کی روشنی میں معلومات فراہم کی ہیں ۔

۸۸ ایک پروفیسر

مصحفی کی انفرادیت اور شخصیت

(نگار ٦٠ نومبر ٦-١٥)

مصحفی کی شخصیت اور شاعری میں اس کے انفرادی رنگ پر سیر حاصل ناقدانہ تبصرہ کیا ہے ۔

۸۹ بیدار عابد رضا

جوئے کہستاں کی موج رواں اقبال کے کچھ غیر مرتب نوادر

(برہان ٦٠ دسمبر ٥٢-٥٧)

اقبال کی ایک فارسی غزل ، ایک فارسی نظم ، اور حسن نظامی ، سر اکبر حیدری ، مسعود عالم ندوی ، اور ڈاکٹر رام باہو سکسینہ کے نام چار خط درج ہیں ۔ ان سے متعلق ضروری تصریحات بھی دی ہیں ۔

۹۰ بیدار عابد رضا

رفتار ادب

(قومی زبان ٦٠ اکتوبر ١٦ نومبر دسمبر)

ہمارے ادب کی رفتار سے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں ۔

۹۱ بیدار عابد رضا

ایک جوئے کہستاں کی موج رواں

(ماہ نو ٦٠ نومبر ١٧-٢٠)

اقبال کے چند نایاب پاروں کو پیش کیا ہے ۔

۹۲ حفظ الکبیر قریشی

واحدہ تبسم

(شاعر بمبئی ، ٦٠ دسمبر ١٨-٢٤)

ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ، واحدہ تبسم کی شخصیت کا مطالعہ پیش کیا ہے ۔

۹۳ حمیدالدین شاہد

لچھمی نارائن شفیق اور ان کی مثنوی « تصویر جاناں »

(ہندوستانی ادب ، حیدرآباد ، ٦٠ اکتوبر نومبر ٢٥-٣٢)

لچھمی نارائن شفیق کا تعارف کراتے ہوئے ان کی مثنوی تصویر جاناں ، سے اقتباسات پیش کئے ہیں ۔

۹۴ حلیمہ عبدالحکیم

افادات رومی

(ثقافت ٦٠ دسمبر ٣٧-٤٣)

مولانا روم کی « فیہ مافیہ » (نثری کتاب) کے بعض حصوں کا خلاصہ درج کیا ہے ۔

۹۵ راشد آذر

ساحر کا شعور

(صبا ٦٠ نومبر دسمبر ٣٣)

ساحر لدھیانوی کی شاعری کے بنیادی عناصر اور اس کے شعور پر روشنی ڈالی ہے ۔

۹۶ رشید احمد صدیقی
تیری یاد کا عالم
(فکر و نظر، علی گڑھ ۶۰ اکتوبر ۱۱۶-۱۳۴)
جگر مرحوم سے متعلق ایک تاثر پیش کیا ہے۔

۹۷ رفیق خاور
نغمہ ہے اور صدا نہیں
(ماہ نو ۶۰ نومبر ۱۱-۱۶)
جگر کی شاعری اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۸ زار راج نرائن
منور اور مذہب
(نگار ۶۰ دسمبر ۱۲-۱۶)
علامہ بشیشور پرشاد منور اور ان کے مذہب پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

۹۹ سخاوت مرزا
ابوالمعرفت شاہ زین الدین گنج نشین بیدری رح
(نوای ادب، بمبئی، ۶۰ اکتوبر ۴۱-۶۱)
شاہ زین الدین سجادہ بیدری رح کا تفصیلی تعارف، حالاتِ زندگی اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۱۰۰ سخاوت مرزا
صراط المستقیم کیا وجہی کی تصنیف ہے؟
(اورینٹل کالج میگزین ۶۰ نومبر ۴۵-۶۴)
صراط المستقیم اور اس کے مصنف سے متعلق معلومات پیش کی ہیں۔

۱۰۱ سروش عسکری طبا طبائی
حبیب احمد صدیقی کی غزل گوئی
(آجکل ۶۰ نومبر ۳-۱۱)
حبیب احمد صدیقی جدید اردو غزل گویوں میں ممتاز شخصیت کے مالک ہیں، مضمون نگار نے ان کی غزل گوئی پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔

۱۰۲ سعید احمد اکبرآبادی
حضرت جگر مرادآبادی
(برہان ۶۰ اکتوبر ۲-۴)
جگر مرادآبادی کی وفات پر اظہار افسوس کے بعد ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۳ سعید احمد رفیق
ام الفضائل ـــ خودی
(ثقافت ۶۰ اکتوبر ۴۳-۶۷)
(اقبال کے نقطۂ نظر سے) خودی کے مفہوم و مطالب اور نوعیت و کیفیت بیان کی ہے۔

۱۰۴ سماک رامح
حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم «بھری برسات»
(نگار ۶۰ اکتوبر ۳۵-۳۸)
جوش کی نظم بھری برسات پر ناقدانہ اظہار خیال کیا ہے۔

۱۰۵ شجاعت علی سندیلوی
حالی کی سیاسی شاعری
(فروغ اردو، لکھنؤ ۶۰ نومبر ۶-۱۹)

واضح کیا گیا ہے حالی میں کافی سیاسی شعور موجود تھا اور انہوں نے سب سے پہلے اردو نظم میں انگریزوں کی سیاست کا پردہ چاک کیا۔

۱۰۶ شرما امین چند

رباعیات امجد

(الفرقان لکھنؤ ۶۰ نومبر و دسمبر ۸۷-۹۶)

امجد حیدر آبادی کی رباعیات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۷ شکیل الرحمان

نیاز فتحپوری کے افسانے

(صبا ۶۰ نومبر ، دسمبر ۲۳-۲۸)

نیاز فتحپوری کے افسانوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۰۸ شعیب راہی

شکیلہ اختر بہ حیثیت افسانہ نگار

(اشارہ پٹنہ ۶۰ دسمبر ۱۵-۲۳)

مشہور خاتون افسانہ نگار شکیلہ اختر صاحبہ کی افسانہ نگاری کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

۱۰۹ شمس تبریز خاں

جگر کا اسلوب غزل

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۰ اکتوبر ۵-۱۷)

جگر مراد آبادی کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کی غزلیں زندگی کی صحیح آئینہ دار ہیں۔

۱۱۰ شمس تبریز خاں

حسرت کا اردوئے معلیٰ

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۰ دسمبر ۴۱-۵۶)

حسرت موہانی کے ادبی جریدے «اردوئے معلیٰ» کے آغاز ، ترتیب اور مقبولیت کا ذکر ہے۔

۱۱۱ صالحہ عابد حسین

میر انیس

(جامعہ دہلی ۶۰ دسمبر ۹۲-۹۹)

میر ببر علی انیس کی مرثیہ گوئی پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۲ صوفی نذیر احمد

اقبال و رومی کا دین و عمرانی مقام

(برہان ۶۰ دسمبر ۱۹-۴۷)

اقبال و رومی کے مابین مشابہت و اختلاف کو بیان کرتے ہوئے ان کے دین و عمرانی مقام پر بحث کی ہے۔

۱۱۳ ط. انصاری

پریم چند

(شاعر ۶۰ دسمبر ۱۵-۱۷)

پریم چند کے ادبی شعور کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

۱۱۴ ظفر احمد

آتش اور ان کی شاعری

(شاعر ، بمبئی ۶۰ دسمبر ۲۵-۲۷)

آتش نے لکھنؤ کی فرسودہ و مبالغہ آمیز شاعری سے ہٹ کر نئے انداز سے سوچا اور نئی قدروں کو ابھارا۔

۱۱۵ عبد الصمد سربازی

ناطق مکرانی

(ماہ نو ۶۰ اکتوبر ۳۹۔۴۳)

غالب کے ہم عصر ناطق مکرانی کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۱۶ عبد القوی دریابادی

اردو کے چار مشاہیر کی بعض مشترک چیزیں

(فروغ اردو، لکھنؤ ۶۰ دسمبر ۹۔۱۶)

محمد حسین آزاد، نذیر احمد، مولانا شبلی اور حالی کی مشترکہ صفات ذاتی پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۷ فاضل زیدی

مثنوی فریاد داغ کی شان نزول

(سب رس حیدرآباد ۶۰ دسمبر ۴۔۶)

مثنوی فریاد داغ کی شان نزول، حجاب کے حیدر آباد آنے اور اختر خاں کے ملازمت سے ہٹائے جانے کے متعلق حضرت داغ کی آغوشی دختر محترمہ لاڈلی بیگم کی توجیہات بیان کی ہیں

۱۱۸ فرمان فتحپوری

اردو کی ایک گمنام مثنوی

(قومی زبان ۶۰ نومبر)

غلام علی مہری بمبئی کے مشہور اردو گو شعرا میں سے تھے، مضمون نگار نے ان کی مثنوی « سعد و سلمی » کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۱۹ قاضی عبد الستار

خواجہ میر درد کی شاعری

(ادب لطیف، لاہور ۶۰ اکتوبر ۷۔۱۴)

خواجہ میر درد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وہ محض تصوف کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں توازن اور ہمواری پائی جاتی ہے اور زندگی سے شدید محبت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

۱۲۰ قاضی عبد الودود

بہار

(اشارہ، پٹنہ ۶۰ نومبر ۵۔۸)

گلدستہ بہار کے تاریخی ماخذ پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۲۱ قاضی عبد الودود

غمگیں دہلوی

(برہان ۶۰ اکتوبر ۴۶۔۵۱)

خود غمگیں اور غالب کے نام ان کے خطوط سے متعلق برہان میں شائع شدہ مقالوں کے سلسلے میں چند گفتنی باتیں ملتی ہیں جن کی صراحت مطلوب ہے۔

۱۲۲ قاضی عبد الودود

کچھ سودا کے بارے میں

(سب رس حیدرآباد ۶۰ نومبر ۶۔۱۰)

سودا کے سوانح حیات کے بارے میں کچھ تحقیقی نکات پیش کئے ہیں۔

۱۲۳ قاضی عبد الودود

دیوانِ نوعی

(فکر و نظر، علی گڑھ ۶۰ اکتوبر ۵۸۔۷۱)

اکبری دور کے ایک فارسی شاعر نوعی کے دیوان کا ایک ناقص نسخہ کتابخانۂ

جدا بحث میں موجود ہے ، مقالہ نگار نے
اُسی کا تعارف کرایا ہے۔

۱۲۴ قریشی اللہ بخش
اقبال کا تصور حسن و عشق
(پیص الاسلام ، راولپنڈی ۶۰ نومبر ۴۱۔۴۸)
اقبال کے تصور حسن و عشق کی
وضاحت کی ہے۔

۱۲۵ قیسی الفاروقی
جگر و کلام جگر
(نگار ۶۰ نومبر ۱۶ ۔ ۲۱)
جگر کی شخصیت اور شاعری پر روشنی
ڈالی ہے۔

۱۲۶ گوپی چند نارنگ
رفتارِ ادب
(سب رس ، حیدرآباد ۶۰ دسمبر ۷ ۔ ۹)
اردو ادب کی موجودہ رفتارِ ترقی کا
جائزہ لیا ہے۔

۱۲۷ لطیف الرحمٰن
نساخ اور اس کے کارنامے
(نوائے ادب ، بمبئی ۶۰ اکتوبر ۳۰ ۔ ۴۰)
مولوی عبدالغفور نساخ اور ان کی جملہ
اٹھارہ کتابوں کا تعارف کرایا ہے

۱۲۸ ماہرالقادری
رجالِ اقبال ۔ کلامِ اقبال میں کردار نگاری
(فاران ۶۰ نومبر ۳۰ ۔ ۳۹)
کلامِ اقبال میں مختلف اشخاص کا ذکر
ملتا ہے جو موقع محل سے ان کے کردار کے
بعض پہلوؤں کو اجاگر کر دیتا ہے۔

۱۲۹ ماہرالقادری
جگر مراد آبادی مرحوم
(فاران ۶۰ نومبر ۲۷ ۔ ۴۶)
اپنے مشاہدات و تاثرات کی روشنی میں
جگر کی شخصیت بیان کی ہے۔

۱۳۰ محمد علی صدیقی
انگریزی ناول ۔ دو جنگوں کے درمیان
(۱۹۶۰ اکتوبر ۱۱ ۔ ۱۴)
انگریزی ناول کی تکنک پر جنگ عظیم
کے رد عمل کا جائزہ لیا ہے۔

۱۳۱ محمد یٰسین
کلام اقبال کا سیاسی پس منظر
(نگار ۶۰ اکتوبر ۶ ۔ ۱۱)
اقبال کی شاعری کے سیاسی پس منظر
پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۳۲ محی الدین قادری زور
ناوک گلشن آبادی
(سب رس ، حیدرآباد ۶۰ اکتوبر ۳ ۔ ۵)
دکن کے ایک گمنام شاعر ، احمدحسین
ناوک کے بارے میں تحقیقی مقالہ ہے۔

۱۳۳ مسعود احمد
خواجۂ خورد اور ان کی فارسی رباعیات
(معارف ۶۰ اکتوبر ، نومبر)
محمد عبداللہ نام ، خواجۂ خورد لقب
اور تخلص احمد ہے۔ ولادت ۱۰۱۰ھ
بمقام دہلی ہوئی۔ علوم ظاہری و باطنی
میں مہارت و کمال حاصل کیا۔ نغزگو
شاعر تھے۔ قسط ۱ ، ۲۔

۱۳۴ مشرف، ڈاکٹر
ادب عربی کا فقیدالمثال شاعر
(عارف، لاہور ۶۰ نومبر ۱۵ ـ ۱۷)
عربی شاعر متنبی کی قادرالکلامی کا تعارف کرایا ہے۔

۱۳۵ مشہود مفتی
رات کے پرستارو! ـــ ایک شاہکار نظم
(شاعر، بمبئی ۶۰ نومبر ۲۳ ـ ۳۰)
رات کے پرستارو! نارش پرتاپگڈھی کی ایک شاہکار نظم اردو کی حمایت میں ہے۔ مضمون نگار نے اُس پر تبصرہ کیا ہے

۱۳۶ مظر نقوی
جگر کی عشقیہ شاعری
(سب رس، حیدرآباد ۶۰ نومبر ۱۱ ـ ۲۰)
جگر کی عشقیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اُس میں ایک شائستگی تہذیب اور پاکیزگی ہے

۱۳۷ نجیب اشرف ندوی
بمبئی سے متعلق دو قدیم مثنویاں
(نوائے ادب، بمبئی ۶۰ اکتوبر ۵ ـ ۱۶)
بابو میاں فقیہ کوکنی کی دو مثنویاں تعارف کے ساتھ پیش کی ہیں۔

۱۳۸ ندوی وحید قیصر
مشرقی پاکستان کی اردو صحافت
(ثقافت ۶۰ دسمبر ۶۳ ـ ۶۹)
مشرقی پاکستان کی صحافتی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۹ نذیر احمد
ہندی کے چند مسلمان شعراء
(معارف ۶۰ دسمبر ۴۰۵ ـ ۴۲۱)
رسالۂ نیا دور لکھنؤ ۶۰ اگست میں شائع شدہ مضمون «ہندی کے مسلمان شاعر» از سرسوتی سرن کیف کی کوتاہیوں کے پیش نظر اس مقالہ میں جامعیت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ (مسلسل)

۱۴۰ نصیر احمد صدیقی
عبدالماجد دریابادی کی طنزیہ شاعری
(فروغ اردو لکھنؤ، ۶۰ اکتوبر ۲۷ ـ ۳۵)
طنز نگاری پر فنی اور تاریخی بحث کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد کی طنز نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۱ نظیر حسین زیدی
«سوانح غالب تاریخی اعتبار سے
(العلم، کراچی، ۶۰ جولائی تا ستمبر ۶۶ ـ ۹۱)
غالب کے سوانح حیات نقید تاریخ و سال تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں

۱۴۲ نیرنگ نیاری
فانی اور غم دوراں
(مہر نیمروز ۶۰ دسمبر ۱۵)
فانی کی شاعری اور اسمیں غم دوراں کی حقیقت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۴۳ وقار احمد رضوی
رباعی، فارسی سے اردو تک
(صبا ۶۰ نومبر، دسمبر ۲۹ ـ ۳۲)
فارسی سے اردو تک رباعی کے ارتقاء

پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۴ ویریندر پرشاد سکسینہ

منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۰ نومبر ۲۷-۳۰)

نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے دور کے ایک انشاء پرداز اور شاعر خوشتر لکھنوی کا تعارف کرایاگیا ہے۔

۱۴۵ یوسف بخاری

بھول بھلیاں

(ماہ نو ۶۰ دسمبر ۱۷)

اصناف شاعری میں پہیلی کی اہمیت اور ہئیت پر اظہار خیال کیا ہےاور اردو میں پہیلیوں کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے

معاشرتی حالات

۱۴۶ جی فلپ۔ کے

مترجم ارشد رشید احمد

امریکہ میں مشرقی علوم کی اشاعت

(ثقافت ۶۰ نومبر ۴۷-۵۷)

امریکہ میں مشرقی علوم کی اشاعت سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں

۱۴۷ حمیداللہ ڈاکٹر

مستشرقین عالم کا پچیسواں اجلاس ماسکو

(معارف ۶۰ نومبر ۳۸۹-۳۹۷)

تمہید و تاریخ کے ساتھ، ماسکو کے اجلاس سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔

۱۴۸ سید عبداللہ

پاکستان میں عربی و فارسی کی تعلیم کا مستقبل

(اورینٹل کالج میگزین ۶۰ نومبر ۳۳-۴۴)

پاکستان میں عربی و فارسی کی تعلیم کے مستقبل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

متفرقات

۱۴۹ خلیفہ عبدالحکیم

آزادی کی نفسیات

(ثقافت ۶۰ نومبر ۵-۱۱)

حقیقی آزادی ورزش عشق اور مشق عدل کا ثمرہ ہے۔

۱۵۰ خواجہ عبدالرشید

علم النفسیات کا ایک افادی پہلو

(برہان ۶۰ اکتوبر ۵-۲۳)

علم نفسیات کی روشنی میں ذکر کی فضیلت اور ماہیت بیان کی ہے (برہان ۶۰ مئی سے مسلسل)۔

۱۵۱ طالب نواب محمد عباس

صوفی فلاسفہ

(نگار ۶۰ اکتوبر ۹-۴۱)

ابن العربی کی شخصیت اور فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۲ طالب نواب محمد عباس
عصر جدید کے فلاسفہ
(نگار ۶۰نومبر ۲۲_۲۵)
عصر جدید کے فلاسفہ پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں،

۱۵۳ غوری شبیر احمد خاں
فارابی کے سیاسی افکار
(ثقافت ۶۰ اکتوبر ومبر دسمبر)
فارابی کے حالات زندگی اور اس کی تصانیف کا تذکرہ. قسط ۳،۲،۱.(باقی)

آرٹ

۱۵۵ صابر شاہ آبادی
رومانیات اور جمالیات
(شاعر، بمبئی، ۶۰ نومبر ۲۱_۲۲)
رومانیات اور جمالیات کا فرق بتاتے ہوئے رائے ظاہر کی ہے کہ رومانیت حوشِ سیاست ہے اور جمالیاتی قدروں کی حفاظت ضروری ہے۔

۱۵۶ اختر انصاری
ہندستانی ڈراما اور انارکلی
(ہندوستانی ادب، حیدرآباد، ۶۰ دسمبر ۹_۱۴)
مضمون کی دوسری اور آخری قسط ہے۔

۱۵۷ غوری شبیر احمد خاں
البیرونی کی یادگار جلد پر ایک نظر
(معارف ۶۰ اکتوبر ۲۶۴_۲۸۴)
۳_ تیسری قسط درج ہے۔

۱۵۸ غوری شبیر احمد خاں
البیرونی کی یاد گار جلد پر ایک نظر
(معارف ۶۰ نومبر ۳۴۱_۳۵۸)
۴_ چوتھی قسط ہے۔

۱۵۹ محمد مسعود احمد
خواجہ خورد اور ان کی فارسی رباعیات
(معارف ۶۰ نومبر ۳۵۹_۳۷۳)
۲_ دوسری قسط درج ہے۔

۱۶۰ عابد رضا بیدار
ادب کی رفتار
(قومی زبان ۶۰ ومبر دسمبر)
ہمارے ادب کی رفتار پر اپنی معلومات پیش کی ہیں۔

۱۶۱ عابد رضا بیدار
ادب کی رفتار
(قومی زبان ۶۰ نومبر)
ادب کی رفتار ترقی کو پیش کیا ہے۔

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۲ | جولائی ۱۹۶۱ ع | شمارہ ۳

شذرات

ہندوستان میں زبان کے مسئلہ نے جو اہمیت اختیار کرلی ہے اور اس سلسلہ میں جس افسوسناک تعصب کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ ہم کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ ایسے صوبوں میں جہاں صرف ایک زبان ہے اور کسی موثر اقلیت کی دوسری زبان نہیں ہے ، دو زبانوں کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جہاں ایک موثر اقلیت کی دوسری زبان ہے وہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اگر حکومت اس کو ہمدردانہ اور مدبرانہ طریقہ سے حل کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کا نتیجہ خوشگوار نہیں ہوتا اس لئے ایسی حکومتوں کو چاہئے جہاں تک کسی ریاست میں اقلیتوں کا سوال ہے وہ ایسی حکمت عملی اختیار کریں جس سے لسانی اقلیت مطمئن ہو جائے ورنہ ریاستی حکومت کا بہت وقت اسی مسئلہ کے سلجھانے میں بے کار گزرے گا ۔
اس سلسلہ میں مغربی بنگال کے وزیراعلی نے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں لیکن ہمارے خیال میں وہ اس مرض کی دوا نہیں ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان کے مسئلہ پر مرکزی حکومت موجودہ حالات کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر غور کرے اور لسانی اقلیتوں کے لئے ایسی سہولتیں مہیا کرے کہ تعلیمی اور دفتری حیثیت سے اقلیت کو کوئی شکایت نہ رہے ۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ اگر اردو کو صرف باقی ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر رکھنا ہے تو ہم کو خود اس سلسلہ میں سب کچھ کرنا چاہئے ۔ اردو کو اس ملک کی ایک اہم زبان اور ایک قیمتی و وسیع ادب کی مالک ہونے کی عزت حاصل ہے اس لئے ایک طرف تو ہم کو اردو زبان کے مقبول عام اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کرنا چاہئے اور دوسری طرف اس کی ادبی تخلیقات میں تنوع اور وسعت پیدا کرنا چاہئے ۔ پہلی صورت کے لئے ضروری ہے کہ ہم نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ بڑوں کے لئے بھی اردو کے ابتدائی مدارس کھولیں ، ایسی مجلسیں منعقد کریں جن میں اردو سیکھنے کے شائقین شریک ہو سکیں اور ایسی آسان کتابیں شائع کریں جن کو وہ دلچسپی سے پڑھ سکیں ، تقسیم سے پہلے تعلیم بالغان کے سلسلہ میں اس قسم کی مختلف کوششیں کی گئی تھیں لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ ختم سا ہو گیا ہے ۔ اردو زبان سے غیر اردو دانوں میں جو دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اس کی روشنی میں اس اقدام کی سخت ضرورت ہے ۔

ادبی حیثیت سے بھی اس سلسلہ میں ہم کو بہت کچھ کام کرنا ہے ، دارالمصنفین ، ندوۃالمصنفین ، ادارۂ ادبیات اردو وغیرہ ایسے ادارے ہیں جن سے مفید کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ، لیکن ضرورت ہے کہ اس کی رفتار کو تیز تر کیا جائے اور ایسے مضامین پر کتابیں لکھی جائیں جن پر ہمارے یہاں کتابیں نہیں ہیں ، ہمارے یہاں علوم کو توجا نے دیجئے کہ ان کے متعلق کتابیں ہیں ہی نہیں بلکہ فنون میں بھی ہم بڑی حد تک تہی دامن ہیں . جغرافیہ میں ہم اسکول کی درسی کتابوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں . تاریخ میں ہمارے پاس یورپ ، امریکہ ، ایشیاء کے دوسرے ممالک سے متعلق کیا ہے ؟ مولانا ذکاءاللہ کی تاریخ کے علاوہ ہمارے پاس ہندوستان کی کوئی مستند و مفصل تاریخ ہے ؟ اقتصادیات کا کیا حال ہے ؟ اور جہاں تک بچوں کے ادب کا تعلق ہے اس پر بھی ہم نے اچھی طرح غور نہیں کیا ہے کہ بچوں کو ان کے سن اور سمجھ کے مطابق ، کس قسم کی اور کس طرح کی کتابیں ان کے ہاتھ میں دینا چاہئے .

لسانیات ، قواعد وغیرہ پر بھی ہمارے یہاں زیادہ کام نہیں ہوا ہے ، اس لئے ضرورت ہے کہ جو اردو دوست جہاں بھی ہو اور جو ادارہ اردو سے متعلق کام کر رہا ہو ان چیزوں کو بھی پیش نظر رکھے ، ادارۂ فروغ اردو اس سلسلہ میں قابل ذکر کام کررہا ہے اور اس کے ارباب کار کو اس طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے

اس سلسلہ کی دوسری کڑی اردو کا دفتری استعمال اور اسکی تصانیف کی اشاعت بھی ہے ، اگرچہ طباعت کے سلسلہ میں ٹائپ کو رفتہ رفتہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے پھر بھی اس کے مکمل اور حسین بنانے اور طباعت کی مزید سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کو جاری رکھنا چاہئے . اسی طرح اردو کے ٹائپ رائٹر کو بھی آسان سے آسان تر بنایا جائے . امید کہ ہماری معروضات پر غور کیا جائے گا .

•

اس سہ ماہی میں ہمارے ادبی رفقاء میں سے دو ، ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے . تمکین کاظمی مرحوم حیدر آباد کے ایک علم دوست خاندان سے

متعلق تھے . شعر و شاعری سے بھی شغف تھا ، تمام عمر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے . انھوں نے ریختی کی تاریخ لکھی ہے . آسکروائلڈ کے ڈرامہ کا تکمیل کے نام سے ترجمہ کیا ہے ، علمی زندگی ان کی ایک تصنیف ہے لیکن سب سے اہم اور سب سے آخری کتاب داغ سے متعلق تھی ، اگرچہ ان کی صحت خراب تھی لیکن انھوں ہمت نہ ہاری اور وظیفہ یاب ہونے کے بعد سے وہ مستقل طور سے ادبیات اردو کے ادارہ میں تحقیقی کاموں میں مصروف تھے . دوسرے خواجہ دل محمد تھے جن کے یہاں علم و فن کا حسین امتزاج تھا ، وہ ریاضی کے استاد تھے لیکن ان کا کلام ان کے شاعرانہ ریاض کی غمازی کرتا ہے . اللہ تعالیٰ ان کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے آمین

خوشی کی بات ہے کہ اتر پردیش کی نئی وزارت نے اردو کی طرف توجہ کی ہے اور اس سلسلہ میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو اردو سے متعلق تمام شکایتوں کی تحقیقات کر کے ان کے دور کرنے کا حل بتائے گی . امید ہے کہ اس کمیٹی کی سفارشات نہ صرف اتر پردیش میں ہمارے درد کا مداوا ثابت ہوں گی بلکہ دوسرے صوبوں کے لئے بھی شمع ہدایت کا کام دیں گی

ادھر ملک کے بعض جامعوں ، کالجوں اور اہل تحقیق حضرات نے اپنے اپنے یہاں اردو کے تحقیقاتی کام کے لئے ادارے قائم کئے ہیں . اس سلسلہ میں ہم پٹنہ کے ادارۂ تحقیقات اردو کا تذکرہ کر چکے ہیں جامعہ دہلی کا شعبہ اردو بھی اپنے پر جوش و عملی صدر کے ماتحت نہ صرف تعلیمی حیثیت سے بھی بلکہ تحقیقاتی حیثیت بھی بہت وسیع ہو گیا ہے . اس کا اپنا شش ماہی رسالہ ہے ، پھر وہ اردو کی قدیم کتابوں کو بھی اڈٹ کر کے شائع کر رہا ہے اس شعبہ میں متعدد اشخاص تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہیں . اسی سلسلہ کی ایک مسرت بخش خبر یہ ہے کہ کشمیر میں بھی ایک اردو اکیڈمی کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے ، اورحیدر آباد میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی ایک ادارہ قائم کیا ہے

از پروفیسر امین چند شرما

رباعیات امجد

دنیائے ادب میں کوئی فیصلہ قطعی نہیں کہا جاسکتا۔ مگر یہ قطعی فیصلہ ہے کہ اردو کے رباعی گو شعراء میں حضرت امجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں شخصی حکومت نہیں جمہوریت ہے۔ عوام نے حضرت امجد کی رباعیات کو قبولیت کی آنکھوں میں جگہ دی۔ جتنی قبولیت اور شہرت ان کی رباعیات نے حاصل کیں، اتنا ہی عجز و انکسار شاعر کی طبیعت میں پایا جاتا ہے۔ اس عجز و انکسار کا اظہار شاعر کی زبانی سنیئے۔

« دیکھنے والے ہم کو رباعیات امجد کا مصنف معلوم کرکے نہایت حیرت سے دیکھتے اور ہماری صورت اور کلام میں کوئی مطابقت نہیں پاتے ہیں شاید رباعی کی طرح ہماری وضع اور لباس میں بھی کوئی خاص موزونیت تلاش کرتے ہیں یا ہماری کتابوں کی طباعت اور کتابت کی طرح ہماری صورت میں بھی کسی دلفریب نظارے کے طالب رہتے ہیں۔ شوق دید میں آنے والے اصحاب ہماری کتاب ہستی کو کسی سنہری روپہلی جلد سے مجلّد نہ پاکر « نام بڑا درشن تھوڑے » کہتے ہوئے منھ پھیر خفا ہوکر چلے جاتے ہیں اور ہم کہتے جاتے ہیں :

ارے او جانے والے دم نکلنے تک ذرا دم لے » [1]۔

مذکورہ بالا اقتباس سے ایک صوفی منش، سادہ مزاج، پیرانہ سال، بزرگ صورت پاکیزہ سیرت، متین و سنجیدہ، خاموش و حلیم انسان کی شکل تصور کی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے جس کی زندگی میں ایک خاص وضع اور موزونیت ہے۔ جس کی کتاب زندگی کا ظاہر و باطن دونوں صاف ہیں، اور یہ پاکیزگی کہتی ہے۔

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی　　لب پہ نغمہ نہیں تو فریاد سہی

(۱) حج امجد صفحہ ۱۰۸ جمال امجد صفحہ ۱۹٦

* پروفیسر امین چند شرما، صدر شعبۂ اردو و فارسی، مہاکوشل مہاودیالیہ جبل پور

مجھ سے دامن چھڑا کے جانیوالے جا، ؑجا، گر تو نہیں تیری یاد سہی [١]

حضرت امجد کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہیں۔ قدرت نے فیاضی کے ساتھ شاعرانہ احساسات ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔ ان کا کلام حقائق سے لبریز اور فطرت کے قریب ہے۔ وہ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اس وقت تک شعر نہیں کہتے۔ جب تک کوئی کیفیت ان کے دل و دماغ پر طاری نہ ہو۔

کیف و سرور کی سرشاری میں ان کے دلی جذبات الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ فگن ہوجاتے ہیں۔ ان کے اشعار پر «از دل خیزد بردل ریزد» والی مثال صادق آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اشعار پڑھنے والے کے دل کو متاثر کرتے ہیں سچ ہے، دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

امجد کا کلام اردو ادب کے اربابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ان آراء میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے امجد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ: «امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں۔ مبصرین کی رائے میں اس وقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہے» [٢]

حس خصوصیت نے امجد کو یہ انفرادیت بخشی ہے۔ وہ ان کی دقت نظر اور خیال کی رفعت ہے۔ ایک بلند خیال ان کے تصوّر کے افق کے سامنے رہتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں۔ جو لفظی بازیگری اور محاورہ بندی کی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ ان کے خیالات الفاظ کے تابع ہوجاتے ہیں۔ مگر امجد کے یہاں دوسری شان پائی جاتی ہے۔ الفاظ ان کے خیالات کے تابع ہیں۔ ان کے کلام میں ایک بجلی کی چمک سے کوند ہے۔ جو اہلِ بصیرت کے قلب و نظر کو حیران بنا دیتی ہے۔

امجد کی رباعیات ان کی قادر الکلامی اور فن کے کمال اور پختگی کی شاہد ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

---

(١) گلستان امجد صفحہ ١٦٢ (٢) جمال امجد صفحہ ١٨٣

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو　　رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہار کمال میں ہر اک کامل ہے　　سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو [1]

دوسری جگہ کہتے ہیں۔ کہ :

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے　　مضمون بلند لا مکاں سے لائے [2]

«لا مکانی مضامین» نے ان کو کشورِ رباعی کا خسرو سا دیا ہے۔ منشی تلوک چند محروم فرماتے ہیں۔

اے نازشِ جوہر رباعی امجد　　لعل سرِ افسرِ رباعی امجد
ہے چار سوئے ہند میں شہرت تیری　　اے خسرو کشور رباعی امجد [3]

امجد کی رباعیات اور شاعری کے متعلق سید احتشام حسین کی رائے بھی ملاحظہ کیجئے۔ «حضرت امجد ایک بلند پایہ اور حقیقی شاعر ہیں۔ انہوں نے فلسفیانہ بصیرت سے اسرار حیات کے فاش کرنے اور جذباتی انداز سے زندگی کے گہرے نقوش کو ابھارنے کی جو سعی کی ہے اس سے اردو ادب کا دامن وسیع ہوا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت اور پاکیزگی خیال نے ان کی رباعیات میں کلاسکی عظمت پیدا کی ہے اور جذبات کی گرمی نے ایک خاص قسم کی رومانیت کو جنم دیا ہے۔ موصوف کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے ان فنکاروں کی طرف متوجہ ہورہے ہیں جن کی خاموش کاوشوں سے ادب کے خزانے میں لازوال اضافے ہوتے ہیں میری دعا ہے کہ موصوف بہت دنوں تک اردو زبان و ادب کی آبیاری کے لئے زندہ اور تندرست رہیں» [4]

رباعیاتِ امجد — رباعیاتِ امجد کے تین حصے ہیں :

حصہ اول	—	اردو رباعیات	۶۸
حصہ دوم	—	»	۹۶
حصہ سوم	—	»	۸۲

حصہ اول میں ۳۲ فارسی رباعیات ، حصہ دوم میں ۴ فارسی رباعیات اور حصہ سوم میں چند قطعات ہیں۔ سنہ ۱۳۲۶ ھ میں رود موسیٰ کی طغیانی میں امجد کا تمام سرمایہ رباعیات۔ کلام اور خاندان کے افراد نذرِ طوفاں ہوگئے۔

---

(۱) رباعیات امجد حصہ دوم صفحہ ۶۵　　(۲) رباعیات امجد حصہ سوم صفحہ ۸۱
(۳) پیامات ارمغان امجد صفحہ ۸۷　　(٤) پیامات ارمغان امجد صفحہ ۸۷-۸۸

سنہ ۱۳۵۲ ھ میں رباعیات کا ایک نسخہ شائع ہوا تھا. سنہ ۱۳۷۲ ھ میں اس بربادی کے بعد نئی رباعیات لکھیں.

ان رباعیات کا موضوع قرآنی آیات اور احادیث ہے. ہر رباعی کسی آیت یا حدیث کی شرح ہے. ان رباعیات میں انسانی زندگی کے حقائق و اسرار ملتے ہیں. اگر شاعری صحیح معنوں میں انسانی حیات کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی ہے، تو بلاشبہ ان کی ہر رباعی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی جیتی جاگتی تصویر ہے.

سلوک و معرفت کے اسرار و غوامض پر ان کی نظر گہری ہے. ایک سالک و عارف کی حیثیت سے تصوف کے پیچیدہ مسائل کے حل نہایت چابکدستی سے رباعیات میں پیش کئے ہیں. اور ان کو سریع الفہم بنا دیا ہے.

آپ نے شاعری کو اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ و آلہ بناکر اس سے مفید دینی خدمت انجام دی ہے. ان کی کثیر التعداد رباعیات اسلامی تعلیم کی حامل ہیں. مختصر یہ کہ اگر ان رباعیات کو کلام پاک کی تفسیر کے نام سے موسوم کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا.

حضرت امجد کا کلام پر تاثیر ہے. وہ سلیس اور عام فہم ہونے کے علاوہ وجد آفرین ہے لوگ ان اشعار کو سن کر وجد کرتے ہیں. سر دھنتے ہیں. جب وہ رباعیاں سناتے ہیں تو ان کا انداز بیان زبان حال سے کہتا ہے.

باتیں ہماری غور سے سنئے پھر ایسی باتیں نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا (میر)

ان کے لہجہ کی متانت سازندوں کے انداز اور بجتی ہوئی آواز کی ترنم ریزیوں سے بے نیاز کردیتی ہے. لفظی و معنوی خوبیاں آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں. کلام میں سادگی اور روانی بدرجۂ اتم موجود ہیں. آپ کا کلام تصوف کی چاشنی سے بھرا ہوا ہے. فلسفہ اس کا خاص جوہر ہے درد و غم کے سوز نے کلام کو دوآتشہ بنادیا ہے.

پند و نصائح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے. کہ امجد عصر حاضر کے سعدی ہیں. مذکورہ بالا خصوصیات نے ان کے کلام کو دوام بخش دیا ہے. مولوی سلیم نے لکھا ہے کہ:

«ان کی رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی»[1]۔

---

(۱) ارمغان امجد صفحہ ۷۰

امجد کے اشعار میں ایک پیغام ہے۔ ایک ہدایت کا درس ہے۔ ہر خاص و عام ان کے کلام سے لطف اٹھاتا ہے۔ ذیل کی رباعیات سے امجد کے عام انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔

قانون قدرت ہے کہ عیش کے عالم میں انسان سرمستی و غمات کے عالم میں رہتا ہے۔ محفل عیش برہم ہونے کے بعد کیف و سرور کی جگہ افسردگی اور حزن لے لیتے ہیں۔ آرزو کی جگہ حسرت اور آس کی جگہ یاس چھا جاتی ہے۔

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کے لئے سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا[1]۔

دل خانۂ خدا ہے۔ دل کا توڑنا خانۂ خدا کو مسمار کرنا ہے۔ جو گناہ کبیرہ میں محسوب کیا جاتا ہے۔

معصوم کے قلب مضمحل کو توڑا یا منزل فیض متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے رونا تو یہ ہے کہ تونے دل کو توڑا[2]۔

تخلیق عالم کا بیان مختلف شعراء نے مختلف پیرایہ میں کیا ہے اور اس کثرت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں جدت کی گنجائش نہیں۔ لیکن امجد کی قادر الکلامی نے اس پامال مضمون میں بھی ایک اچھوتا انداز پیدا کرلیا ہے۔ کمال شوخی سے کہتے ہیں۔ کہ:

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے[3]۔

دیکھیے۔ انسان کی بے بسی اور آزادی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

دم بند کیا قید نفس میں رکھ کر بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں رکھ کر
صیاد کی صید پروری تو دیکھو گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر[4]۔

«صیاد کی صید پروری» کتنا لطیف طنز ہے اور صید پروری کا کیا انوکھا انداز ہے،

ع گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر

حضرت امجد کے یہاں تمثیلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا حکیمانہ استدلال

---

(۱) رباعیات امجد حصۂ دوم صفحۂ ۴۸
(۲) رباعیات امجد حصۂ سوم صفحۂ ٤٤
(۳) رباعیات امجد حصۂ اول صفحۂ ٦١
(٤) رباعیات امجد حصۂ سوم صفحۂ ۵۹

قابل داد ہے۔ وہ جس بات کو بیاں کرتے ہیں اس کے ثبوت کا خوب حق ادا کرتے ہیں۔

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے　　　بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کردی　　　دولت کا نہونا بھی بڑی دولت ہے[1]۔

دنیا امید پر قائم ہے۔ مایوسی کے سیاہ بادل میں امید کی کرن جھلکتی ہے۔

میں چھوڑ کے تیرا در کہاں جاؤں گا　　　اپنا مقصود پھر کہاں پاؤں گا
اے میری نہ سننے والے اتنا سن رکھ　　　محروم گیا آج، تو کل آؤں گا[2]۔

مذکورہ بالا رباعی میں بندہ اپنے رب سے مایوس نہیں۔ اس کے در کے سوا اس کا کوئی آسرا نہیں۔ کیا خوب تکرار ہے۔

اے میری نہ سننے والے اتنا سن رکھ　　　محروم گیا آج، تو کل آؤں گا

غالب نے سعی لاحاصل کی لذت کا ذکر کیا ہے۔ امجد اس کو نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

اس دشت میں سینکڑوں کے جی چھوٹ گئے　　　پتھر بھی حباب کی طرح پھوٹ گئے
اس دام کا ایک عقدہ بھی کھل نہ سکا　　　بیجا کوشش میں بال و پر ٹوٹ گئے[3]۔

ذات خداوندی حیّ و قیوم ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ کائنات کا سارا سلسلہ فنا انجام ہے۔ صرف خدائے قدوس کی ذات کو بقائے دوام حاصل ہے۔

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی　　　قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسماں سب کچھ ہے　　　باقی ہے اسی کا نام باقی فانی[4]۔

روز عمل انسان کا دفتر عمل خدا کے سامنے پیش ہوگا۔ غافل انسان کو منصف حقیقی کے سامنے نیک اعمال پیش کرنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ نیک اعمال ہمارے پاس نہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ہمیں شرمساری ہوگی۔ اقبال نے تو کہا ہے کہ ذاتِ باری کو بھی شرمساری ہوگی امجد کہتے ہیں۔

ضائع فرما نہ سر فروشی کو مری　　　مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور　　　دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری[5]۔

---

(۱) رباعیات امجد حصہ دوم صفحہ ۷۰　　(۲) رباعیات امجد حصہ سوم صفحہ ۳
(۳) رباعیات امجد حصہ سوم صفحہ ۱۲　　(۴) رباعیات امجد حصہ اول صفحہ ۵
(۵) رباعیات امجد حصہ اول صفحہ ۷

آدمی اور اس کے دل کے درمیان اللہ ہے۔ اس امر کا سراغ دل کی آہٹ سے ملتا ہے۔

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے دیکھو دیکھو، کہیں وہ آیا تو نہیں[1]۔

دیکھو دیکھو کا انداز دیکھیئے!

اللہ کارساز ہے۔ مولانا روم نے کہا ہے ع فکر ما در کارِ ما آزارِ ما۔ امجد اس آزار سے کس طرح نجات حاصل کرتے ہیں۔

ناحق پھر پھر کے سر پھرایا میں نے اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے
طوفان میں ہے کشتیٔ امید مری لے توہی سنبھال، ہاتھ اٹھایا میں نے[2]۔

«لے توہی سنبھال» کے تیور دیکھئیے۔ سپردگی کا کیا انداز ہے۔ اور نیازمندی میں کیا ناز ہے! سبحان اللہ

حضرت امجد درگاہ حبیب میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف انتہائی سادگی اور معصومیت سے کرتے ہیں۔

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تری رحمت کے بھروسے امجد بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے[3]۔

مظاہر قدرت سے خدا کی شان کا بیان ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ کسی کو برگ درختاں سبز میں معرفتِ حق کے دفتر نظر آئے۔ کسی کو ذرہ ذرہ میں جمال کبریائی کی جھلک دکھائی دی۔ امجد کہتے ہیں کہ باغ وراغ، زمین و آسمان کے مشاہدہ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مخلوق کا مطالعہ خالقِ کی صفت کی معراج کو ثابت کرے گا۔ قرآن کی گہرائیوں میں اتر کر قاری کو خالق کے وجود کا علم ہوسکے گا۔

ہر وقت فضائے دلکشا دیکھتے ہو صحرا و چمن، ارض و سما دیکھتے ہو
مخلوق میں نیرنگی خالق دیکھو قرآں پڑھو، جلد کو کیا دیکھتے ہو[4]۔

غالب کے یہاں اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں۔ شاعر حیران ہے کہ پھر مشاہدۂ کس شمار میں ہے۔ زبان خاموش ہے۔ حضرت امجد کس بے باکی سے اظہار کرتے ہیں۔

---

(۱) رباعیات امجد حصہ اول صفحۂ ۹
(۲) رباعیات امجد حصہ اول صفحہ ۱۰
(۳) رباعیات امجد حصہ اول صفحۂ ۳۲
(۴) رباعیات امجد حصہ دوم صفحہ ۱۶

ہیں مست مئے شہود ـ تو بھی میں بھی　　ہیں مدعی نمود ـ تو بھی میں بھی
یا تو ہی ہیں جہان میں یا میں ہی ہیں　　ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی [1]ـ

وحدت‌الشہود کا مسئلہ تصوف کا خاص مسئلہ ہے۔ امجد نے اس کی تشریح بڑی خوبی سے بیان کی ہے۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں ـ فرماتے ہیں :ـ

میں قلزم ذخار ہوں منبع تو ہے　　میں مہرجہانتاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں　　مانند ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے [2]ـ

کائنات کی ہر شے کا مرجع ذاتِ الہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا کی جناب میں صرف خلوص قلب و نظر کی قدر ہے۔ زردار خدا کے نام پر زر و سیم دیتے ہیں۔ بے نوا غریب خلوص نیت سے رکوع و سجود کے ہدیے پیش کرتے ہیں۔

خالق نے جنہیں دیا ہے زر دیتے ہیں　　زر کیا ہے خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ　　سامان میں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں [3]ـ

عشق اردو فارسی ادب کا سرمایۂ ہے صوفی شعراء اسے تخلیقِ کائنات کا باعث قرار دیتے ہیں۔ حضرت امجد نے اس کی داستان بے پایاں کو چار مصرعوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

دریائے محبت ہے سفینہ میرا　　ہے حسن کی خاتم پہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغِ عشق سے کعبۂ دل　　معمور ہے نور سے مدینہ میرا [4]

جبر و قدر کا مسئلہ ہمارے شعراء کا خاص موضوع سخن رہا ہے۔ انسان پورے طور پر قدرت کے آئین و قوانین کے تحت ہے۔ میر خدائے سخن فرماتے ہیں :ـ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

امجد کا مسلک ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ تقدیر کا شکوہ عبث ہے۔ جو کچھ ہوا، ہوتا ہے اور ہوگا اس میں خدا کی رضا شامل ہے۔

تقدیر سے کیا گلا خدا کی مرضی　　جو کچھ بھی ہوا ہو، خدا کی مرضی
امجد! ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں　　ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی [5]ـ

---

(۱) رباعیات امجد حصۂ اول صفحہ ۶۹
(۲) رباعیات امجد حصۂ دوم صفحہ ۴۰
(۳) رباعیات امجد حصۂ اول صفحہ ۲۵
(۴) رباعیات امجد حصۂ اول صفحہ ۳۵
(۵) رباعیات امجد حصۂ دوم صفحہ ۷۳

امجد کے یہاں شوخی، سادگی اور پرکاری ہے. ان خصوصیات نے کلام کو بے حد دلچسپ بنادیا ہے. حضرت امجد اپنے خالق حقیقی کے حضور اعتراف گنہ کس عجز اور شوخی سے کرتے ہیں.

میں گنہ گار اور تو رب کریم　　کوہ سے کس طرح ہو کاہ بڑا
گو بڑا ہی گناہ گار ہوں میں　　تو بڑا یا میرا گنـــاہ بڑا [1]

اللہ کی ذات بزرگ و برتر ہے، گنہ کی کیا بساط. انسان کے گناہ کتنے ہی بڑے ہوں، ذاتِ آمرزگار ان سے بہت بڑی ہے.

امجد کا کلام تاثیر سے لبریز ہے. اس میں سادگی اور روانی ہے. نہایت سلیس عام فہم اور وجد آفریں ہے. اس میں لفظی اور معنوی خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں نہایت چابک دستی سے تشبیہات اور استعارات کو اپنے کلام میں لاتے ہیں، لیکن وہ عین فطری معلوم ہوتے ہیں، قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہونے پاتے. ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے، کہیں تصوف کی چاشنی، کہیں درد و غم کا سوز اور کہیں پند و نصائح کا بیان. عام شعراء کے مانند وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے. بلکہ ان کا ہر شعر اہل دنیا کے لئے ایک درسِ ہدایت اور پیغام عمل ہے. مگر　ع　گوشِ سخن شنو کجا! دیدۂ اعتبار کو [2]. نخوت اور غرور کی تمثیل کی تباہ کاری کو کتنے عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے.

سمجھو، کہ زمانہ تمہیں سمجھاتا ہے　　آغاز میں انجام نظر آتا ہے
ہے نخوت وسر کشی تباہی کا پیام　　دیکھو شعلہ بھڑک کے بجھ جاتا ہے [3]

جس ظرف میں وسعت نہیں ہوتی. وہ سیم و زر کی فراوانی سے اتراتا ہے. فخر کرتا ہے. کم مایہ کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں. اس کی توضیح تمثیل کے انداز میں ملاحظہ کیجئے.

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے　　مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس　　تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے [4]

ایماندار اور پر خلوص اہل قلم نے مذہب کے اجارہ داروں کا مذاق اڑایا ہے. امجد کی رباعیات میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں.

---

(۱) گلستان امجد صفحۂ ۵۱　　(۲) دیوان حافظ صفحۂ ۴۲۷
(۳) گلستان امجد صفحۂ ۲۳۷　　(۴) رباعیات امجد حصہ اول صفحہ ۴۴

ایک جگہ داغ سجود کا خاکہ یوں اڑایا ہے :

پر داخت نہ کی تونے کماھی دل کی دیکھی نہ کبھی ذرا تباہی دل کی
اے زاہد خود بیں یہ نہیں داغ سجود پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی[1]

انسان اپنے بداعمال اور گناہوں پر شرمندہ ہوتا اور ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ جب ہمارے افعالِ بد کی قبیح شکلیں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں تو ہم غیرت کے مارے زمین میں گڑجاتے ہیں۔ کردہ گناہوں کی یاد یا تصور ہمیں عرق انفعال میں عرق کردیتا ہے۔ عرقِ انفعال کے قطرے انسان کو خود اپنی نظر میں سبک بنا دیتے ہیں حضرت امجد نے اس شرمساری کا جو نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

خود اپنی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں قطـــرہ سا زمین میں سما جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں میں شرم گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں[2]

متوسط طبقہ کا ہر آدمی تفریق سے متاثر ہے۔ وہ غلام اور آقا کے دل شکن فرق کو مٹا کر محمود و ایاز کو معاشرت کی ایک صف میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔

حضرت امجد ایک متوسط طبقہ کی پیداوار ہیں۔ اس کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ اس ماحول نے جو نقوش ان کے ذہن پر چھوڑے ہیں۔ ان سے متاثر ہوکر لوٹنے والے طبقہ کے مظالم کے خلاف ان کے قلم سے ذیل کے مصرعے نکل جاتے ہیں :

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں افلاس کے یہ نقیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں[3]

عرض یہ ہے کہ حضرت امجد ریاض شعر کے گل سرسبد ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی فطرت کی بو قلمونیوں، جبر و قدر کی چیرہ دستیاں، حقائق و معارف کی موشگافیاں اس لطیف انداز میں جھلکتی ہیں کہ باید و شاید۔

آپ کے کلام کی صحت مند قدروں سے متاثر ہوکر قاری زندگی سے فرار اختیار کرنے کے بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہنچ کر اس سے نمٹنے کے لئے آمادہ و سرگرم نظر آتا ہے۔ جہاں اس کے لئے زندگی کے نشیب و فراز زندگی

(۱) گلستان امجد صفحہ ۸۱ (۲) رباعیات امجد حصۂ اول صفحہ ۶۵
(۳) گلستان امجد صفحہ ۸۹

کے نشیب و فراز نہیں رہتے۔

ان کے کلام کے غائر مطالعہ اور تاثر انگیزی سے قاری کے دل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے یہ جذبہ جارحانہ تیور نہیں سکھاتا وہ مصالحت اور آشتی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ دوستوں کے ساتھ تلطف اور دشمنوں کے ساتھ «مدارا» کی تعلیم دیتا ہے۔ حافظ نے کہا ہے کہ:

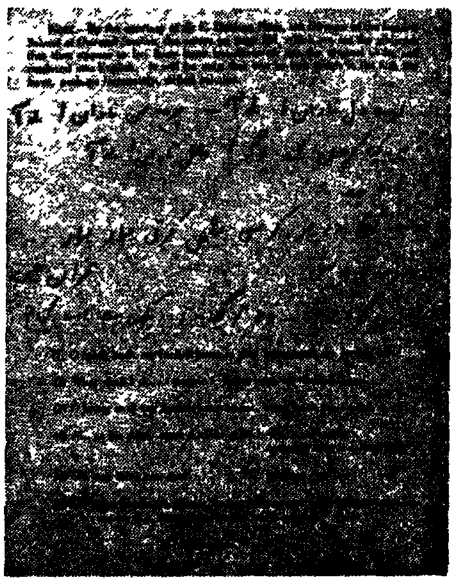
آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا[1]

(۱) دیوان حافظ صفحہ ٤

* از ڈاکٹر اے۔ اے۔ نامی

اٹھارہویں صدی عیسوی کے انگریزی ڈراموں میں اردو گانوں اور الفاظ کا استعمال

اردو ڈراما پر انگریزی تمدن و تہذیب اور سیاست و معاشرت کے اثرات قدم قدم پر ملتے ہیں اور ہم نے اپنی کتاب اردو تھیٹر میں اس پر مفصل بحث کی ہے اس مضمون میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزوں پر اردو زبان کا کس حد تک اثر پڑا اور وہ کس قدر اپنی روز مرہ کی زندگی میں اس سے متاثر ہوئے اور کتنے الفاظ ان کی زبانوں پر چڑھ گئے یہاں تک کہ ڈراما جیسی ادبی صنف بھی اس سے خالی نہیں رہی۔



اردو کے نوجوان محققین سے ہمیں امید ہے کہ وہ جلد یا بہ دیر ایسے انگریزی ڈرامے تلاش کریں گے جن میں وافر اردو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ یہاں ایک ڈراما «بنگال کا سفر»[1] بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ سر ای۔ ڈینی سن راس نے رومن میں لکھے ہوئے گانے کو اردو حروف میں لکھا ہے اور اس کے نیچے انگریزی میں اس کا ترجمہ دیا ہے۔

یہ دو ایکٹ کا ایک مختصر مذاحیہ ڈراما جو باون صفحات پر مشتمل

* ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بمبئی ۳

1. A Trip to Bengal By Charles Smith London 1802

ہے ، چارلس اسمتھ کی تصنیف ہے ۔ چارلس دربار مغلیہ کا مصور بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں ایک طویل دیباچہ ہے ۔ یہ ڈراما سر جان میکہرسن کے نام معنون ہے ۔

اس مختصر ڈرامے میں مندرجہ ذیل اردو الفاظ آتے ہیں :

« خدمتگار ، مشعلچی ، حرام زادہ ، سلام ، سورمرابی ، علی ، بحرا ، چھتری ، نائی ، حقہ ، پنکھا ، دربان ، سرکار ، برآمدہ ، لال‌شربت ، چھکڑی ، جھوٹ ، پیسے کا پانی ، بہادر ، چوبدار ، صاحب لوگ آتا ہے خبردار ہو جاؤ ، »

چارلس اسمتھ[1] اسکاٹ لینڈ کے ایک جزیرہ آرکیے[2] کا رہنے والا تھا اور غالباً سنہ ۱۷۴۹ ع (سنہ ۶۳-۱۱۶۲ ھ) میں پیدا ہوا تھا ۔ اس نے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا ۔ پہلے لندن میں ، پھر ایڈنبرگ (سنہ ۱۷۹۳ ع مطابق سنہ ۸-۱۲۰۷ ھ) میں اس کے بعد ہندوستان آیا ۔ ہندوستان کی دولت و عظمت کے قصے اس نے اس قدر سنے تھے کہ وہ اپنی آنکھ سے سب کچھ دیکھنا اور شہنشاہ مغلیہ کی تصویریں اتارنا چاہتا تھا ۔

چارلس ۱۱ مارچ سنہ ۱۷۸۳ ع کو بندرگاہ ڈاؤنس[3] سے ہندوستان[4] کے لئے بذریعہ جہاز بلمانٹ[5] روانہ ہوا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دولت خداداد حکومت مغلیہ کا آفتاب عالمتاب غروب ہورہا تھا ۔ سلطنت مختلف حصوں میں بٹ چکی تھی اور بقول لارڈ ویلنشیا[6] آگرہ کا سفر خطرہ سے خالی نہیں تھا

ضعیف اور نابینا شاہ عالم اس وقت سندھیا کے قبضہ اقتدار میں تھا ۔ سندھیا کی وفات کے بعد نانا فرنویس نے بھی شہنشاہ ہند کی عزت و عظمت میں فرق نہ آنے دیا لیکن سیاسی افراط و تفریط اور ملکی بدحالی میں یہ ممکن ہے کہ چارلس جان پر کھیل کر دہلی گیا ہو اور شہنشاہ کی تصویریں بنائی ہوں ۔ چارلس نے اپنے دوران قیام ہند میں کس قدر تصویریں بنائیں اور ان میں سے اب کس قدر دستیاب ہوسکتی ہیں اس کا جواب اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ۔ وہ سنہ ۱۷۹۶ ع

1. Charles Smith. (Ref. Good Old Days of the Hon'ble John Company. Carey Vol. II Page 257
2. Orkney Isles. Scotland.
3. Downs.
4. For the Coast and Bay.
5 Bellmont 758 Tons. Captain, William Dick Gamage.
6 Lord Valentia.

میں وطن واپس گیا۔ روانگی سے قبل ہی اس نے ڈراما لکھا ہوگا جو سنہ ۱۸۰۲ ع (مطابق سنہ ۱۷-۱۲۱۶ ھ) لندن میں شائع ہوا۔ وہ سنہ ۱۸۲۴ ع (سنہ ۴۰-۱۲۳۹ ھ) میں زندگی کے پچھتر سال گذار کر اس جہان فانی سے رخصت ہوا اور بمقام لیتھ[1] سپرد خاک ہوا۔

چارلس اسمتھ کے متعلق ایک مختصر مضمون بعنوان «دربار لکھنؤ کے یورپین آرٹسٹ» روز نامہ پانیر مورخہ ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۱۹ ع میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے اس کی زندگی کے بعض تشنہ پہلو بھی روشنی میں آجاتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ وہ سر جوشوا رینالڈز کا گہرا دوست تھا اور سنہ ۱۷۷۶ ع (سنہ ۹۰-۱۱۸۹) سے سنہ ۱۷۹۷ ع (سنہ ۱۲-۱۲۱۱ ھ) تک انگلستان کی مختلف گیلریوں میں اس نے اپنی سولہ تصویریں نمائش کے لئے پیش کی تھیں۔

یہاں اس کے مختصر ڈرامے «بنگال کا سفر» سے متعلق جو ضروری معلومات دستیاب ہو سکیں وہ درج کی جاتی ہیں۔ یہ کتابچہ اب بھی برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ باون صفحات پر مشتمل اور مجلد ہے اس کے صفحہ اول پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

سفر بنگال

ایک نغماتی ڈراما

دو ایکٹ کا

مصنفہ چارلس اسمتھ

لندن

مطبوعہ اورینٹل پریس[2]

بمطابق ولسن اینڈ کمپنی، وائیلڈ کورٹ، لنکنس اینس فیلڈس

برائے ایس ریڈوے اینڈ بلیک اینڈ پیری

سنہ ۱۸۰۲

اس کے ساتھ چارلس اسمتھ کی تصویر بھی ہے جو ایس، ڈبلیو، رینالڈس[3]

1. Leith
2. London: Printed at the Oriental Press by Wilson & Co Wild-Court, Lincolns Inns Fields for S. Ridway and plack and Parry.
3. S. W. Reynolds.

ہے انگریو کی تھی۔ تصویر کے نیچے تحریر ہے۔ «پینٹر تو گریٹ مغل۔»[1]

چارلس نے یہ ڈراما سر جان میکفرسن، بیرونٹ، گورنر جنرل اور برطانوی باشندگان مقیم مدراس کے نام معنون کیا ہے جن کی مہمان نوازی اور تواضع کا وہ بیحد مداح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سر جان میکفر سن نے اپنی کمائی سے اس کی کافی مدد کی ہوگی۔ کیونکہ وہ سنہ ۱۷۸۵ ع (سنہ ۱۲۰۰-۱۱۹۹ ھ) سے سنہ ۱۷۸۶ ع (سنہ ۱-۱۲۰۰ ھ) تک بنگال کا گورنر اور فورٹ ولیم کی کونسل کا سینیر ممبر رہا تھا اس لئے کہ وارن ہسٹنگز کی روانگی اور لارڈ کارنوالس کی آمد تک یعنی کم و بیش ۲۰ ماہ اس نے گورنر جنرلی کی تھی اور کافی روپیہ کمایا تھا اور بڑے ٹھاٹھ باٹ سے زندگی بسر کرتا تھا اور حقیقی معنوں میں «نواب» کہلانے کا مستحق تھا۔ وہ لارڈ میس فیلڈ کے پر سر کی حیثیت سے سنہ ۱۷۶۷ ع (سنہ ۱-۱۱۸۰ ھ)[2] میں مدراس آیا تھا اور تین سال کے اندر ہی فورٹ سینٹ جارج میں ملازم ہوگیا تھا۔

یہ وہ پر آشوب زمانہ تھا جب ملازمین سرکاری کی بدتریں اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں بھی نظر انداز کردی جاتی تھیں کیونکہ این خانہ ہمہ آفتاب است والا مضمون تھا۔ جب تک کے ڈائرکٹران کمپنی اپنے ملازمین کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے وہ لاکھوں کی دولت سمیٹ کر لندن پہنچ جاتا اور پارلمینٹ کا ممبر بن جاتا تھا اور وہ غیرارادی طور پر اس سے خوفزدہ رہنے لگتے تھے۔

چنانچہ جب جان میکفرسن والا جاہ نواب کرناٹک کے یہاں پہنچا تو اس نے پانچ چھ سال میں اس قدر دولت پیدا کرلی کہ سنہ ۱۷۷۶ ع (۹۰-۱۱۸۹ ھ) میں انگلستان جا کر اور پارلمینٹ کی ایک نشست خرید کر نہ صرف پارلمینٹ کا ممبر بن گیا بلکہ بیرونٹ بھی بن گیا اور پرنس ریجنٹ کا دوست اور محرم راز بھی سمجھا جانے لگا۔[3]

چارلس اسمتھ نے «ڈیڈی کیشن» کے بعد ایک خوبصورت «دیباچہ» بھی لکھا ہے جس پر یکم جنوری سنہ ۱۸۰۳ ع (مطابق ٦ رمضان سنہ ۱۲۱۷ ھ) درج ہے۔

---

1 Charles Smith, Painter to Great Mogul, ipse pinxt. S. W. Reynold Sculpt.

2 Purser of the Lord Mansfield India man, 499 tons.

(۳) لارڈ کارنوالس نے اس کے متعلق بہت ہی خراب رائے ظاہر کی ہے۔ ملاحظہ ہو
Calcutta, Old and New, Page 120 and 121.

اس دیباچہ میں اس نے اپنے ناظرین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔

چارلس اسمتھ کے ڈرامے کے کردار حسب ذیل ہیں۔

ذکور ۱ گورنر جنرل آف بنگال

۲ رسل

۳ ہارٹلے

۴ کیپٹن فٹز پیٹرک

۵ خدمت گار

اناث ۱ لیڈی گورنر جنرل

۲ میریا (رسل)

۳ وینی (وریک) بحری افسر کی پوشاک میں۔

۴ خادمائیں

پالکی بردار۔ مشعلچی۔ گانے اور ناچنے والی لڑکیاں۔ سارندے اور ملاح

منظر کلکتہ اور مضافات

وقت۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر

یہ ڈراما دو ایکٹ اور چھ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ایکٹ اول۔ منظر اول

دریائے ہگلی کا ساحل ... دور ... بہت دور کلکتہ نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف چھتری (مندر کی محرابیں) نظر آ رہی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ قدرتی شمعیں دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ برق و باراں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک بجرا آتا ہوا دکھلائی دیتا ہے، بارہ ملاح کھے رہے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے۔ علی! علی!! علی! علی!!

مرد چلے چلو۔ چلے چلو۔

اس جگہ ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

یہاں سانپ اور چیتوں کی کثرت ہے۔

عورتیں بادل گرج رہے ہیں۔

طوفان کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔
لہریں آسمان سے باتیں کرتی اور ساحل
سے ٹکرا رہی ہیں۔
چلے چلو! چلے چلو!!
ساحل قریب ہے۔

ساحل آ جاتا ہے۔ ملاح کود پڑتے ہیں اور بجرے کو رسی کے ذریعے ایک کھمبے سے باندھ دیتے ہیں۔ ملاح ...... ہارٹلے، وڈ پیٹرک، ویلی (جو ابھی تک بحری افسر کے لباس میں ہے) اور میریا کو چھتریوں کے سایہ میں کشتی سے اتارتے ہیں سب مندر میں پناہ لیتے ہیں، ہارٹلے پانچ ماہ کی مسافرت کے بعد بنگال آنے پر میریا کو خوش آمدید کہتا ہے۔

ویلی: (بحری افسر کے لباس میں) کم بخت طوفان کو بھی اسی وقت آنا تھا جب کہ کلکتہ صرف ایک میل رہ گیا ہے[1]۔

ہارٹلے: تند و تیز لہریں ابھی تک ہمارا پیچھا کر رہی ہیں۔

* · ·

ورینک: میرا خیال ہے کہ ہم اُس وقت تک یہاں ٹھہریں جب تک کہ طوفان ختم نہ ہوجائے اس کے بعد چار ناٹ کی رفتار سے روانہ ہوکر نصف گھنٹے میں کلکتہ پہنچ جائیں۔

ہارٹلے کو کچھ فاصلہ پر ایک وسیع بنگلہ نظر آتا ہے۔ وہ وہاں جاتا اور واپسی پر بتلاتا ہے کہ وہ گورنر جنرل کا بنگلہ ہے۔ وہ اور وڈ پیٹرک بنگلہ کی طرف جاتے ہیں۔ عورتیں باتیں کرتی ہیں۔ میریا کے باپ رسل کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

رسل نے بنگال میں کافی دولت پیدا کی تھی اور بارہ ماہ قبل یورپ کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اس کے جہاز کا پتہ ماریشس سے آگے نہیں چلا۔ ویلی نے یہ بھی بتلایا کہ گورنر کی لیڈی اسکول کے زمانے میں اس کی بہترین دوست تھی۔

---

(۱) اس وقت دریائے ہگلی کی خصوصیت یہ تھی کہ پانی سترہ میل کی رفتار سے شہر کی طرف بڑھتا تھا اور سولہ سے اٹھارہ فیٹ کی بلندی تک اس کی لہریں اٹھتی تھیں جس سے بڑی جہاز تو بچ جاتے تھے لیکن کشتیاں غرق آب ہوجاتی تھیں

Caunter's Oriental Annual for 1834, Page, 258.

دونوں مرد واپس آتے ہیں . پالکیاں ان کے ساتھ ہیں . ایک پالکی میں میریا بیٹھ جاتی ہے اور دوسری میں ہارٹلے اور فرینک . فٹز پیٹرک ایک چھوٹی سی پالکی میں سب سے آگے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ملاحوں اور مشعلچیوں کے درمیان گر پڑتا ہے .

ایکٹ اول ۔ منظر دوم

ایک وسیع کمرہ جس میں ٹپائی پر رکھی ہوئی مشعلیں روشن ہیں . گورنر جنرل ایک صوفہ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا ہے . لیڈی گورنر برابر بیٹھی ہوئی ہے . اس کے ہاتھ میں ایک خط ہے . ملازمین پنکھا جھل رہے ہیں . ایک چوبدار ہاتھ میں شمع لئے ہوئے حاضر ہوتا ہے .

دربان مہمانوں کے آنے کی اطلاع دیتا ہے . ہرکارہ اعلان دہراتا ہے . « صاحب لوگ آتا ہے . خبردار ہوجاؤ » . ہارٹلے ، فٹز پیٹرک ، میریا اور فینی (جو ابھی تک فرینک کے لباس میں ہے) داخل ہوتے ہیں . گورنر جنرل ان کو خوش آمدید کہتا ہے . مہمانوں کو ان کی جائے قیام پر پہنچا دیا جاتا ہے . فٹز پیٹرک باہر رہ جاتا اور خدمت گاروں سے مذاق کرتا ہے جو اینگلو انڈین رسم و رواج سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں .

فٹز پیٹرک کہتا ہے : یہ کس قسم کی غریب ، سیاہ حبشی مخلوق ہے اور کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں گویا ہماری طرح وہ انسان ہی نہیں ہیں . اگر میں گورنر ہوتا تو ان کو موزے ، جوتے اور ٹوپی پہناتا .

ایک بڑی بوتل میں لال شربت لایا جاتا ہے . سب پیتے ہیں . فٹز پیٹرک اور فرینک میں مصنوعی جنگ ہوتی ہے . ہارٹلے فٹز پیٹرک کی پستول سے گولیاں نکال لیتا ہے .

ایکٹ دوم ۔ منظر اول

گورنر جنرل کی کوٹھی کا برآمدہ ، کھمبوں کے درمیان سے کلکتہ کا ٹینک اسکوائر نظر آتا ہے فٹز پیٹرک اور ہارٹلے بھی گورنر جنرل کے ہم جلیس ہیں .

ایکٹ دوم ۔ منظر دوم

ایک شاندار بڑا کمرہ ، گورنر اپنے حبشی ملازمین کے ہمراہ آتا ہے ، لوگ

باریابی حاصل کرنے اور شرف ملاقات کے لئے اسٹیج کے ایک کونہ میں چلے جاتے ہیں۔ ہارٹلے اور فڑ پیٹرک بھی گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں فز درخواست کرتا ہے کہ اسے دربار لکھنؤ میں کوئی عہدہ دلوایا جائے گورنر جنرل وعدہ کرتا ہے کہ وہ مغل اعظم سے اس کی سفارش کرادے گا اور اس کو نیک وف «امیر» اور «جنرل» بنادیا جائے گا۔ گورنر اس کو بتلاتا ہے کہ نواب اودھ کا وکیل کلکتــــہ میں رہتا ہے جس کو اس کے مالک نے جملہ حقوق تفویض کردئے ہیں

گورنر جنرل کی بیوی آتی ہے میریا اس کے ساتھ ہے ہارٹلے اور میریا میں جدائی گفتگو ہوتی ہے۔ ہرکارہ داخل ہوتا اور ایک مہمان کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ رسل آتا اور اپنے سفر کے حالات بیان کرتا ہے۔

وہ بتلاتا ہے کہ ماریشس سے روانگی کے بعد وہ کس طرح طوفان میں گھر گیا اور بہت سے مصائب کے بعد افریقی ساحل پر پہنچا۔ چونکہ اس کا جہاز تباہ ہوگیا تھا اس لئے وہ کیپ جانے پر مجبور ہوگیا اور وہ اس وقت وہاں پہنچا جب «ہندستان» کو روانہ ہوئے چوبیس گھنٹے گذر چکے تھے۔ وہ بعجلت تمام بنگال پہنچنا چاہتا تھا اس لئے اولین جہاز سے روانہ ہوگیا اور «ایس ایس۔ ہندستان» کے پہنچنے کے چند گھنٹے کے بعد ہی یہاں پہنچ گیا۔

جب رسل کو معلوم ہوا کہ میریا اپنے چچا زاد بھائی ہارٹلے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس نے اجازت دینے سے انکار کردیا کیونکہ ہارٹلے کے باپ ہی نے اسے ہندستان جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن گورنر جنرل کی مداخلت سے ہرطرف خاموشی چھاگئی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ایکٹ دوم ۔ منظر سوم

ایک سڑک ۔ فڑپیٹرک اور خدمتگار ہاتھی سے اترتے ہیں۔ ہاتھی اور حبشی غلام واپس بھیج دئے جاتے ہیں۔ مصنوعی وکیل سے ضروری سلام و پیام کی باتیں ہوچکی ہیں۔ فڑپیٹرک خدمتگار سے دریافت کرتا ہے کہ اس کو کن خطابات سے نوازا گیا ہے۔ خدمتگار ایک کاغذ نکال کر پڑھتا اور اس کا ترجمہ سناتا ہے۔

«حرام زادہ ۔ سور مرابی ۔ جھوٹ الدولہ بہادر»۔

چوبدار داخل ہوتا ہے۔ ایک چھکڑی اس کے ہمراہ ہے۔ وہ فڑپیٹرک کو ایک خط اور خدمتگار کو ایک پلندہ دیتا ہے۔ فڑپیٹرک خدمتگار کو خط دیتا ہے جو اسے بلند آواز سے پڑھتا ہے۔ «بنام ہز ھائی نس حرام زادہ۔ سور مرانی جھوٹ الدولہ بہادر» اور اطلاع دیتا ہے کہ بیگم صاحبہ نے یہ خط بھیجا ہے اور اس کو در دولت پر طلب کیا ہے لیکن ساتھ ہی درخواست کی ہے کہ وہ عورتوں کے لباس میں آئے۔ وہ بتلاتا ہے کہ اس پر کسی جمنا بیگم کے دستخط ہیں۔ وہ خدمتگار کے ساتھ چھکڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ چھکری روانہ ہوجاتی ہے۔

ایکٹ دوم۔ منظر چہارم

زنان خانہ ایک کمرہ۔ محراب پر باریک پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہندستانی ساز بج رہے ہیں۔ گانے اور ناچنے والی لڑکیاں اسٹیج کے ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ فڑپیٹرک دوسرے راستے سے داخل ہوتا ہے۔ لیڈی گورنر جنرل جو برقعہ میں ہے اسے اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔ وہ ایک مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔ حقہ اور عطر پان پیش کئے جاتے ہیں۔ رقص شروع ہوتا ہے۔ اسی وقت فینی ہندستانی ڈریس میں پردے کے پیچھے آتی ہے۔ فڑپیٹرک بیگم صاحبہ کو آداب بجا لاتا ہے۔ فینی اشارہ کرتی ہے۔ لیڈی گورنر جنرل گاتی ہے۔

او دل ناداں! لے آ — میرے من ناداں۔ لے آ
میں کیا کروں اے لوگو — دل ناداں! لے آ
او دل ناداں! لے آ — میرے من ناداں۔ لے آ
ارے ان کے در پر کوئل بیٹھی کرتی پی۔ پی
ارے ایک تم بولیں اس سے سکھی لو اسکے قربان میں
ارے اس گلی میں وہ تو گیا تھا دیکھنا۔ ارے۔ لے آ۔

گورنر جنرل کی لیڈی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں فڑپیٹرک سے باتیں کرتی اور اس سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ بیگم صاحبہ سے ہر قیمت پر شادی کرے گا اور شادی کے دن نئی نویلی دلہن کو ایک لاکھ روپیہ دے گا۔

گورنر جنرل۔ رسل۔ ہارٹلے اور میریا داخل ہوتے ہیں۔ منظر میں سنجیدگی

پیدا ہوجاتی ہے . لیکن . . . . پھر . . . . قہقہے بلند ہونے لگتے ہیں . میریا اعلان کرتی ہے کہ اس کے والد نے ہارٹلے کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیدی ہے .

اس مسرور کن اعلان سے ہر طرف مسرت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں .

پردہ گرتا ہے

*		*		*

انگریزی زباں میں اس قسم کے کتنے ڈرامے ہوں گے جن میں اس کثرت سے اردو کے الفاظ استعمال ہوئے ہوں ؟ یہ جاننا ہمارے نوجوان محققین کا کام ہے .

« بنگال کا سفر » سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریز آکر باقاعدہ اردو سیکھنے نہیں لگے تھے تو اردو سمجھتے اور بولتے ضرور تھے . انسان روز مرہ زندگی میں جو کچھ بولتا ہے وہ ہی اسٹیج پر پیش کرتا ہے .

* از محمد سخاوت مرزا

مثنوی مراۃ الحشر

مصنفه سید محمد فراقی بیجاپوری رح

(نوٹ : مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب کا ایک سرسری مضمون رسالہ برہان دہلی سنہ ۵۶ میں شائع ہوا ہے۔ ہم نے چھ سات سال قبل یہ مضمون سنہ ۱۹۵۰ ع میں لکھا تھا اور بعض تذکروں سے کچھ مصنف کے حالات کا پتہ چلایا تھا ، مزید تحقیق میں یو ہی پڑا رہا جو اب ہدیہ ناظرین ہے۔ چونکہ مولوی ہاشمی صاحب کو مصنف کے حالات کا پتہ نہیں چلا ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت بحیثیت ایک قدیم مصنف اور تصنیف کے ضروری خیال کی جائے گی)

سید محمد فراقی بیجاپوری رح | سلاطین عادل شاہیہ کے عہد میں فراقی تخلص کے دو شاعر گزرے ہیں ایک تو ملاحسین فراقی یا فراغی جو شاہ صبغۃ اللہ [1] نائب رسول کے خلفا میں سے تھے دوسرے فراقی [2] سید محمد ہیں جو شاہ صاحب مذکور کے برادر زادہ ، میران سید محمد مدرس بیجاپوری المتوفی سنہ ۱۰۸۰ ہجری معاصر علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ ـ ۱۰۸۳ ھ کے نبیرہ ہوتے ہیں مثنوی مراۃ الحشر [3] دکھنی کی داخلی شہادتوں نیز بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف آخرالذکر فراقی ہی ہیں۔ مصنف مراۃ الحشر کے حالات کمیاب ہیں مولف بساتین السلاطین [4] نے دوسرے شعراء اہل کمال بیجا پور مثلاً نصرتی اور مرزا مرثیہ گو کے ضمن میں ایاغی اور فراقی کے متعلق صرف اتنا اشارہ کیا ہے «وغیر اینہا شعرائے ہندی گو دیگر بسیار بودہ اند کہ ذکر ایشان تطویل پذیرد چنانچہ ایاغی و فراقی و فدوی کہ کلام ایشان مشہور انام است» گویا فراقی کا بھی شمار بیجا پور کے مشہور شعراء میں تھا۔ تاریخ اولیاء رایچور مطبوعہ

---

(۱) تذکرہ اولیاء دکن مولفہ ملکا پوری جلد ۱ (۲) تذکرہ اولیاء رایچور مطبوعہ
(۳) تذکرہ اولیاء دکن ملکا پوری (۴) بساتین السلاطین قلمی موجودہ احقر
* محمد سخاوت مرزا بی۔ای ، ایل ایل بی ، حیدرآباد دکن۔

مولفہ روشن علی میں بھی صرف فراقی کا نام اور آپ کی تصنیف مراۃ الحشر کا ذکر موجود ہے اور کوئی حالات نہیں البتہ ترجمہ روضۂ اولیاء بیجا پور میں ضمیمہ کے طور پر مولوی سیف اللہ مدراسی نے مختصر و جامع حالات اس خاندان کے تحریر کئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فراقی کے ایک پوتے سید شاہ حسین پیر رح بیجا پور سے رایچور بزمانہ صوبہ داری نواب [1] بسالت جنگ (۱۱۷۶ ھ) گئے تھے چونکہ نواب صاحب ممدوح بیجا پور کے بھی صوبہ دار تھے اسی لئے نواب صاحب کے حسن عقیدت کی وجہ سے اس خاندان نے رایچور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور چند مواضعات بھی بطور نذر دئیے گئے چنانچہ مواضعات دمی ویہور، خانہ پور، جمل دنی، ننگن خان دوڈی و کنکور اور کوٹ گڈھ ان کی جاگیر میں شامل تھے. بیان کیا جاتا ہے کہ اب بھی اس خاندان کے لوگ بیجا پور، رایچور، نیلور، اور مدراس میں موجود ہیں. چنانچہ موضع دومتی (ضلع رایچور) جو خود نواب آصفجاہ اول (وفات ۱۱۶۱ ھ) نے حسب تحریر و سفارش جگت استاد مولانا سید شاہ عبدالرحیم بیجا پوری رح المتوفی (۱۱۶۸ ھ) سید محمد فراقی کو ضلع رایچور صوبہ بیجا پور میں بطور تنخواہ عطا فرمایا تھا. ملاحظہ ہو مکتوب آصفجاہ بنام سید عبدالرحیم بیجا پوری: جو بوجہ نایابی بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے

فضیلت و کمالات دستگاہا، حقایق و معارف آگاہ (سید عبدالرحیم بیجا پوری رح) مکتوب مرغوب بہجت خاطر وصول بخشید، موضع دومتی پرگنہ کوتال، سرکار رایچور، صوبہ دارالظفر بیجا پور سیادت و نقابت پناہ سید محمد بیجا پوری تنخواہ نمودہ شد برائے دوام فتح و نصرت و مقہوری اعدائے دین و دولت و حصول مقاصد دارین و توفیق حسنات این جانب و فرزندان عزیز در مکان استجابت بدعا متوجہ باید بود والسلام» (مآثر نظامی مولفہ منسارام پدر شفیق اورنگ آبادی صـــ ۱۴۲ مخطوطہ آصفیہ)

---

(۱) میر محمد شریف خان شجاع الملک بسالت جنگ امیر الامرا فرزند پنجم آصفجاہ اول (۱۱۴۹ ـ ۱۱۹۵ ھ) ـ نواب صلابت جنگ نے آپ کو امیرالامرا خطاب دیا سنہ ۱۱۶۷ ھ میں بیجا پور کے صوبہ دار تھے سنہ ۱۱۷۶ ھ میں آصفجاہ ثانی نے ان کو ادھونی اور رایچور کا صوبہ دار مقرر کیا. نواب عالیجاہ آپ کے داماد تھے. بسالت جنگ ادھونی (کرنالک) میں آسودہ ہیں. آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے محمد میر خان دارا جاہ مہابت جنگ ذوالفقارالدولہ جانشین ہوئے. وفات سنہ ۱۲۱۷ غفران مآب کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگر بیدری بیگم و نقشبندی بیگم آپ سے منسوب تھیں جن کے مزار بیدر میں حضرت ابوالفیض رح کی درگاہ میں موجود ہیں. (مآثر الامرا)

فراقی کے پدر بزرگوار فراقی کے پدر بزرگوار سید کریم محمد قدس سرہ بھی بڑے اہل کمال تھے جن کا مختصر حال محمد ابراہیم زبیری نے اپنے تذکرہ اولیاء بیجاپور میں اس طرح کیا ہے[1] :

« حضرت سید کریم محمد قدس سرہ ذات ہما یوش خلف صغیر سید محمد مدرس قدس سرہ است . فضائل کمال والد بزرگوار خود را جامع بود ، و مرید و خلیفہ والد خویش است و متصل گنبد عبد الرحمن در گنبد علحدہ آسودہ است و عرس ایشان در بست و چہارم جمادی الثانی است و سال و صالش ہزار و یک صد و پنج است » .

گویا فراقی کے والد اپنے والد ماجد ہی کے خلیفہ تھے اور سنہ ۱۱۰۵ ھ میں وفات پائی اور وہیں اپنے خوبصورت گنبد میں دفن ہیں[2] ۔

اولاد سید کریم محمد قدس سرہ | مولانا سید کریم محمد کے چار صاحبزادے تھے . ایک تو سید عبد القادر قادری خلیفہ و جانشیں والد بزرگوار (مدفن بیجاپور) . دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ سید محمد فراقی جو اپنے برادر بزرگ کی وفات کے بعد جانشین ہوئے (یعنی صاحب زیر ترجمہ) تیسرے صاحبزادے حافظ سید عزیز اللہ قادری المتوفی ۱۱٤٦ھ (مدفن بیجا پور) . « حافظ کلام اللہ » مادہ وفات ہے . داماد مولانا سید شاہ عبد الرحمان قادریؒ ابن سید محمد مدرس بیجاپوریؒ چوتھے صاحبزادے سید شاہ قاسم حسینیؒ داماد سید علی محمد حسینی . وفات سنہ ۱۱۹٦ ھ بیان کی جاتی ہے مگر مادۂ وصال « سید قاسم قلندر قادری » سے ۱۲۰٦ ھ برآمد ہوتے ہیں . مدفن ساتگڈہ مدراس ، (ترجمہ روضۃ اولیاء بیجا پور مطبوعہ) .

فراقی بیجا پور ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں واصل بحق ہوئے . فراقی نے اپنے دادا علامہ سید میران محمد مدرس قادری شہر استاد بیجا پور المتوفی سنہ ۱۰۸۰ ھ[3] ۔

---

(۱) روضۃ الاولیا بیجا پور مولفہ محمد ابراہیم مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

(۲) گنبد سید محمد قادری نہایت خوبصورت ہے اندرونی حصہ میں سیپ کا کام ہے (سروے آف انڈیا حصہ بیجاپور مولفہ کزنس مطبوعہ)

(۳) میران سید محمد مدرس ابن عبد الرحمان چشتی وصال ۱۰۸۰ ھ برادر زادہ شاہ صبغۃ اللہ نائب رسول اللہ نو دس سال بیجا پور میں درس و تدریس علوم ظاہری و باطنی میں مشغول رہے اس کے بعد مدینہ میں ہجرت کی روضۃ النبی کے سامنے اپنی آپ نماز جنازہ پڑھی اور جان بحق تسلیم ہوئے جنت البقیع میں جد امجد شاہ صبغۃ اللہ کے پہلو میں دفن ہیں . تین فرزند چھوڑے ۱ ۔ سید زین الدین ۲ ۔ عبد الرحمان اور ۳ ۔ کریم محمد پدر فراقی (تذکرۂ اولیاء دکن جلد دوم صفحہ ۸٥٤ مولفہ عبد الجبار خان ملکاپوری)

اور اپنے والد بزرگوار سید کریم محمد قادری رح کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی اور اپنے جد امجد کے دست حق پرست پر قادریہ طریقہ میں بیعت کی جس کا ذکر فراقی نے اپنی کتاب مراۃ الحشر میں اس طرح کیا ہے : وصف سید محمد مدرس

محی الدین کے پاس لیا یا مجے علامان میں تس کے ملایا مجے
دیا ہات اپنا ترے ہات میں نجات اپنی دیکھا اس بات میں
کرے جوں بیعت وو جوش ہات سوں پرک تربیت کچ کئی دھات سوں
کمینہ ہوں ترے مریداں میں میں سمجھتا ہوں مجھ سا گنہگار ہیں

ملک الشعرا نصرتی بیجاپوری بھی فراقی کے جد امجد میراں سید محمد مدرس کا مرید تھا . اس لحاظ سے فراقی کا پیر بھائی ہوا . (ترجمہ روضۂ اولیاء بیجاپور مطبوعہ) معلوم ہوتا ہے کہ فراقی اپنے جد امجد کے وصال کے وقت نوجواں تھے اور یہ زمانہ علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ ھ تا ۱۰۸۳ ھ کا ہے .

فراقی حسن شوقی ہم عصر محمد عادل شاہ اور نصرتی ہم عصر علی عادل شاہ کے چھوٹے معاصر تھے چنانچہ اپنی مثنوی میں انہوں نے ان دونوں شعرا کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ، جو ترتیب مثنوی مراۃ الحشر کے وقت وفات پاچکے تھے . فراقی کے حسب ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بیجاپور کے دوسرے باکمال شعرا سے بھی ملاقات تھی اور بہت سے ان کی زندگی میں انتقال کرچکے تھے جس کا ان کو بہت ملال ہے چنانچہ کہتے ہیں

اس دھات جو سحور اتھے[1] حقیقت میں غواص گوہر اتھے
وہ جیتے ہیں عالم موی کئی[2] تو کیا رکھے نا ہون اپنا اپیں[3] گئے تو کیا
جو دیکھا ہوں ایسے تماشے اپار[4] میرا بھی ہوا شوق بے اختیار

حسن شوقی بیجاپوری سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں فوت ہوچکا تھا چنانچہ ابن نشاطی نے پھول بن میں (۱۰۶۶ ھ) اس کی وفات کا اشارہ کیا ہے یہ ان کا بچپن ہوگا اور نصرتی کی وفات سکندر عادل شاہ کے زمانہ میں فتح بیجاپور کے بعد سنہ ۱۰۸۵ـــ۱۰۹۷ ھ میں واقع ہوئی چنانچہ فراقی نے اپنی اس مثنوی میں نصرتی کی وفات کا اس طرح ذکر کیا ہے :

(۱) اتھے = تھے (۲) مرگئے کہے تو کیا ہوتا ہے
(۳) اپیں = آپ خود (۴) اپار = بہت سے

گیا نصرتی بول میٹھا بچن رہیا نا نون ہوکر جواہر کا کھن

فراقی زیر تذکرہ، ولی دکنی المتوفی ۱۱۱۹ ھ کے معاصر بھی ہیں. مگر جس فراقی کا ذکر خود ولی نے اپنے بعض اشعار میں کیا ہے اور میر حسن اور قائم نے اپنے تذکروں میں کیا ہے بلحاظ زبان و طرز ادا یہ وہ نہیں معلوم ہوتے. فراقی کا مشہور شعر ہے

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کے وہ ظالم
کمر سے کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستین آوے

اس پر ولی نے گرہ لگائی

ولی مصرعہ فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وو ظالم
کمر سے کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی مرتب دیوان ولی نے لکھا ہے کہ فراقی غالباً گجراتی شاعر تھا معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی ان سے چشمک رہتی تھی مثلاً

ترے اشعار ایسے ہیں فراقی کہ حس پر رشک آوے گا ولی کون

ص ۲۸ کلیات ولی

فراقی کا ایک شعر خود اپنی علمی استعداد کے متعلق یہ ہے

نظر ہے علم منطق اور معانی میں فراقی کون
اگر علم حدیث مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا

مگر فراقی زیر تذکرہ کو احادیث اور تفاسیر پر کامل عبور تھا فرماتے ہیں

احادیث کی سب کتاباں منے و اکثر تفاسیر قرآن منے
یو احوال جان جان پریا مج نظر لکھا ہوں او سب منتخب جمع کر
احادیث قرآن کا مغز سب دیکھا ہوں دکھنی کر صاف اب الخ

اس سے یہ متحقق ہوتا ہے کہ بلحاظ اسلوب بیان اور علمیت مذہبی، فراقی معاصر ولی کا اس فراقی سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا. فراقی زیر بحث نے ولی کا اپنی اس طویل مثنوی میں سوائے حسن شوقی اور نصرتی کے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ شمالی ہند کی سیر کا اور نہ اورنگ‌آباد کا. اس لئے مولوی نصیرالدین ہاشمی کی رائے سے ہم متفق نہیں ہیں (برہان ستمبر ۱۹۵۶ ع ص ۱۷۸). ترجمہ تذکرہ روضۃ اولیاء بیجا پور (اردو) میں فراقی کے حالات موجود ہیں. جس سے واضح ہے

کہ ان کی عمر بیجاپور ہی میں گزری اور وہیں اپنے آبائی مقبرہ میں دفن ہیں۔

نسخہ مکتوبہ سید شاہ نورالدین رح جو فراقی کے بہت بعد گزرے ہیں۔ خاتمہ میں بعض زائد اشعار ہیں جس کے ضمن میں اشارہ کیا ہے کہ سنہ ۱۱۱۱ھ میں لکھی گئی ہے مگر یہ در اصل سہو کتابت معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ خود مصنف نے دوسری جگہ اس کا صحیح سنہ تصنیف ۱۱۲۳ھ بیان کیا ہے، جس سے واضح ہے کہ یہ مثنوی شاہ محمود بحری رح مصنف « من لگن » کی وفات ۱۱۳۰ھ سے تین سال بعد تصنیف کی گئی۔ بہر حال متذکرہ صدر الحاقی اشعار یہ ہیں جو اس نسخہ کے کاتب مولانا شاہ نورالدین کے مکتوبہ نسخہ میں ہیں جو خود مصنف کا بیان ہے، اور اشارہ یہ کہ اس کا ماخذ فارسی تصنیف ہے جو صحیح ہے۔

لکھا ہوں مرات الحشر کو میں تمام دعا سوں کرے یاد ہر کوئی مدام
بیاں کیا کروں میں میرے حال کا اتھا میں گرفتار جنجال کا
کہ عبدالنبی یوں بولا مجھ کہے کتاب یو لکھو تا نشانی رہے
قبولا یو لکھنے کو ساری کتاب دیو حق جزا مجھکو اوسکا ثواب
اگر اوسکو کوئی بی پڑیگا تمام دعا کرتے رہو حق میں میرے مدام
کہ تاریخ ہفتم ربیع الاول مرتب ہوا نسخۂ بے بدل
اتھا سن اگیارا جو سم پر اسے لکھا ہوں بیاں اوسکا ار فارسی

غرض فراقی کو بچپن ہی سے دکھنی شعرا کا کلام بہت مرغوب تھا اور اسی ذوق نے ان کو یہ مثنوی لکھنے پر آمادہ کیا نیز اس خیال سے بھی کہ اوسکی دنیا میں اور شعرا کی طرح کوئی یادگار باقی رہے چنانچہ فراقی نے اسکا اشارہ کیا ہے۔

جو دیکھا ہوں ایسے تماشے اپار[1] میرا بھی ہوا شوق بے اختیار
اتھا پن یو بھنوادگی[2] تے ہوس بچن خوب سنے کا مجھ کان رس
کہ جاں کوئی بچن خوب پڑتی اتھے میرے دل کوں لذت سوں گھر تے اتھے
سی جاں جاں کان میں خوب بول میرے جیو میں ہوتا تھا پیدا کلول
بہوت روز سن سن کو شیریں کلام کیا دل بھی میرا ہوس یو تمام
کہ اب میں طبع آزمائی کروں ہنر کیچ درجک میں گوہر بھروں
جو رہیے کان میں جگ کے ہو گوشوار کہیں مرحبا مرحبا سب پکار

(۱) بیحد (۲) لڑکپن

میر دل منے بات جب ہونی یو گھٹ   مچپی [1] ۔ ناد پس مکھ تے کاڑیا گھنگٹ
اور جیون آئے تیوں شعر بول لگیا   مضامین اپس دل کے کھولن لگیا

فراقی حافظ قرآن اور عربی فارسی کے بڑے عالم اور مفسر و محدث، بقول شخصے، این خانہ ہمہ آفتاب است کے مصداق تھے۔ اور سید محمد مدرس جیسے بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میری تمام عمر فارسی زبان کی خدمت میں گزری۔ کبھی کبھی دکھنی زبان میں بھی کہہ لیا کرتا تھا۔ فرماتے ہیں

عمر میری سب فارسی میں سری   کہوں شعر دکھنی تو میں سرسری
یکادی وقت جیب میں کھولتا   یہ دکھنی بچن گاہ گاہ بولتا

وفات فراقی کی تاریخ وفات ۹ شوال ۱۱۴۴ھ اور تاریخی مادہ وفات « فی حفظ اللہ » ہے گویا فراقی نے محمد شاہ دہلی (۱۱۲۱ھ تا ۱۱۶۰ھ) کے اوائل عہد میں وفات پائی اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں بمقام جامع مسجد بیجاپور مدفون ہیں۔ فراقی کے والد بزرگوار سید کریم محمد قدس سرہ کا بیجا پور میں نہایت خوبصورت گنبد ہے، جس میں چار قبریں ہیں ان میں ایک فراقی کی بھی ہے اور یہ مقبرہ جاگیردار فتحپور (ضلع بیجا پور) کی نگرانی میں ہے جو ان کی اولاد سے ہیں (ترجمہ اولیاء بیجا پور مطبوعہ) سلاطین آصفیہ اس خاندان کے بہت معتقد رہے ہیں، چنانچہ آصف جاہ اول المتوفی ۱۱۶۱ھ نے موضع دومتی رایچور بر بنا مکتوب سید شاہ عبدالرحیم بیجا پوری عطا فرمائی تھی، اوسکے بعد بزمانہ نواب بسالت جنگ بہادر امیرالامرا صوبے دار بیجاپور فرزند پنجم آصف جاہ اول نے اور بھی مواضعات جن کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں دئے گئے تھے۔

اولاد سید محمد فراقی کے ایک صاحبزادے سید کریم محمد ثانی، اور دو صاحبزادیاں ایک تو بی بی فاطمہ جو شاہ حیدر قادری ساکن انا ہور (رایچور) اور دوسری بی بی صاحبہ جو سید صاحب قادری ساکن دومتی سے منسوب تھیں۔ اور سید کریم ثانی کے صاحبزادے سید حسن پیر تھے جو رایچور آئے اور سنہ ۱۲۲۷ھ میں آثار مبارک کے لئے ایک خاص مکان قلعہ ارک رایچور میں بنوایا تھا۔

---

(۱) یعنی چپ کر سو، خاموش سو

بیگم صاحبہ نواب بینگن پلی نے آپ کا مقبرہ بنوایا ۔ (ترجمہ روضۃالاولیاء بیجا پور مع حواشی مترجمہ شاہ سیف اللہ قادری مدراسی مطبوعہ) آپ کے برادر سویم مولانا شاہ حافظ عزیزاللہ رح کی اولاد میں ایک مسن بزرگ میراں شاہ محمد قادری رح تقریباً پچیس سال قبل حیدرآباد میں رہتے تھے ، جن کا وصال یہیں ہوا ان کے نواسے سید شاہ محمد اسحق کرنل فوج وظیفہ یاب اور ان کے برادر بزرگ مولوی سید محمود حسین بی ۔ اے انسپکٹر لیبر سنگارینی کالیرز اس خواجہ محی الدین مرحوم اس وقت حیدرآباد میں موجود ہیں ، جن کا نسبی سلسلہ حضرت سید حاجی اسحق خلیفہ خواجہ برہان الدین جانم بیجا پوری قدس سرہ سے اور والد کا حسبی سلسلہ قاضی سید محمود کبیر جد اعلی علامہ محمد غوث شرف الملک مدراسی المتوفی (۰۰۰۰) تلمید مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی وفات ۱۲۲۹ھ سے ملتا ہے ۔

تصنیفات | فراقی کی تصنیفات میں ہم کو ان کی مثنوی مراۃ الحشر دستیاب ہوئی ہے کتب‌خانہ آصفیہ میں اس کے دو نسخے ہیں پہلا نسخہ ۳۵۰ پر فن مثنویات اردو قلمی میں محفوظ ہے ، جس کے جملہ صفحات ۳٦۰ تقطیع متوسط مسطر ۱۱ ، کاتب رکن الدین ساکن پیٹ بابا نگر (ادونی) سنہ کتابت درج نہیں ۔ دوسرا نسخہ نمبر ۷٦۸ فن حدید پر مخزون ہے جس کے کاتب غلام قادر جوہر ہیں ۔ اور سنہ کتابت سنہ ۱۲۴۴ ھ بمقام حیدرآباد دکن ، جس نے مراۃ الحشر مکتوبہ سید شاہ نور الدین حسینی نبیرہ سید حمزہ حسین رایچوری از اولاد میر اشرف جہانگیر سمنانی کے نسخہ سے اس کو نقل کیا ہے ۔ شاہ نورالدین عرف چاند پیر رح نے بضمن کتابت آخر میں اپنے چند اشعار لکھے ہیں جو یہ ہیں :

مصنف فراقی ہیں ان کی کتاب　　　لکھا نور الدین تاکہ ہوئیے صواب
اگر کچھ غلط اس میں آوے صواب　　　لکھو اور کرو تم صحی اس کو آپ
میرے پر سخن ناکرو کچھ بھی تم　　　اچھے اوس وقت میں میری عقل گم
اصل نور الدین ناوں چلاتے اتھے　　　عرف چاند پیر کر بولاتے اتھے
کہ لکھ کر کیا اس قطعے کو تمام　　　بحق محمـــد علیـــہ السلام

اس مثنوی کے اشعار کی صحیح تعداد جملہ ۳۹۱۳ گویا تقریباً چار ہزار بیت

---

(۱) ترجمہ اردو روضہ اولیا بیجا پور ترجمہ سیف اللہ قادری مطبوعہ

ہے . نسخہ نمبر ۳ مراۃالحشر مکتوبہ سنہ ۱۱۹۴ھ کتبخانہ انجمن ترقی اردو علیگرہ ، مگر مرتب فہرست انجمن مذکور نے سنہ تصنیف ۱۱۹۲ ھ بیان کیا ہے جو محض قیاسی ہے . نسخہ مراۃالحشر نمبر ۴ کتبخانہ نواب سالار جنگ حیدرآباد ناقص الاخر ہے مگر فہرست مخطوطات توضیحی مرتبہ مولوی ہاشمی صاحب میں اس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۱ھ درج ہے جو بالکل غلط ہے بمطابقت نسخہ جات دیگر کتبخانہ آصفیہ بلحاظ مادۂ تاریخی « یو دیکھو جو ہے با برکت کتاب » ۱۱۳۳ ھ صحیح سنہ تصنیف ہے (ص ٦٦ فہرست توضیحی کتبخانہ سالار جنگ بہادر)

ماخذ: اس مثنوی کا ماخذ مثنوی مطلع الانوار ہے . اس نام کی کئی مثنویاں ہیں ایک تو حضرت امیر خسرو رح کی مگر وہ ایک عارفانہ مثنوی ہے دوسری مطلع الانوار مصنفہ عفیف ابن نورکا شانی ہے جس کا اردو ترجمہ دکنی زبان میں مدراس کے ایک شخص محمد خاں عرف ممدوح میاں نے سنہ ۱۲۵۰ میں کیا تھا

غرض فراقی نے مثنوی مطلع الانوار فارسی کے باب آخرت نامہ کو اردو کا جامہ پہنایا ہے چنانچہ کہا ہے :

یکایک دیکھا مطلع الانوار میں ہور اس بیچھ کے سارے اسرار میں
وہ تھی مہرباں ایک مخلص کے پاس دیکھیا جیو کا شوق دھر بیقیاس
پر یا آخرت نامہ میری نظر دیکھا خوب دل رکھ میں تس کے بہتر
قیامت کا احوال سارا اتھا وہ دحال کا سب پکارا اتھا
مفصل اسی دھات تھا ذکر سب مطالعہ کیا خوب میں دھر طلب

گویا مطلع الانوار کا باب آخر ان کو بہت پسند آیا اور دوسری بہت سی معتبر کتابوں سے مدد لے کر اس مثنوی کی تکمیل کی . چنانچہ فرماتے ہیں :

جیتاں پھر کتاباں جو تھیاں معتبر اسی بات کی جان کی صحت خبر
حدیثاں دلیلاں تے اثبات ہو دسی دل میں جب صاف ہر بات او
تب آیا میرے دل میں اس گنج کون کتے لوگ پاتے ہیں بے رنج سون

نام و تخلص :

فراقی تخلص ہے میرا مدام ولے اصل سید محمد ہے نام

نام کتاب و موضوع :

قیامت کا دیکھ حال تس کے بہتر رکھیا ناوں میں مرات الحشر کر

سنو اے عزیزان سخندان سنو میرے دل کے مطلب کے گوہر چنو

کتاب مرات الحشر کل بارہ عنوانات پر منقسم ہے اور ہر عنوان ایک خاص بیت حس کو علم صنائع و بدایع میں براعت استہلال کہتے ہیں حس کے سرخیوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)	حمد	۵	صفحات
(۲)	اب مناجات کو پسار یا ہات تا کرے حق گنہ میرے معفور	٦	"
(۳)	یو محمد کی نعت کا ہے بیان ہوئی خدائی سب حس کی طہور	۷	"
(۴)	غوث الا عظم کے یو مناقب ہیں جس کو معشوق اپیں کیا ہے عمور	۵	"
(۵)	وصف سید محمـــد کا مگر رہے مدینہ میں چھوڑ بیجا پور	٦	"
(٦)	طبع کی یو بیاں وحودت کا حس سبب یو کتاب ہوئی مسطور	۱۰	"

اصل متن کتاب:

(۷)	مومنان کایو ہے نزاع وداع حو اسی حال ابو کے چکّکے حصور	۳۷	"
(۸)	یو سنو حال گوش عبرت سون ہے نصیحت بیاں اہل قبور	۵	"
(۹)	یو حکایت ہے یک ممسک کی نکبـاتی میں حو اتھا مشہور	۷	"
(۱۰)	یو قیامت کی دس علامت ہیں ہر علامت کرینگی جگ میں ظہور	۷	"
(۱۱)	دابۃ الا رض کا لکھا ہوں حال سب حدیث و دلیل کرکے عبور	۱۸	"
(۱۲)	ذکر یا جوج ہور ماجوج جو خرابیاں کریں گے او مغرور	۱۱	"

(۱۳)	یو ہے مذکور حشر کا سارا حلق اٹھیگی تمام یوم نشور	۲۱ صفحات
(۱۴)	ہو کہ قاصی حدا عدالت سوں سب سناوے مقدمے یو حصور	۲۵ "
(۱۵)	یو ہی دیکھلا آجائے گی میزاں تھا عمل کا سو ...... مدکور	۱۱ "
(۱٦)	بات سون پل صراط کے ہوئے کافران عاصیان تے دورخ پور	۳۳ "
(۱۷)	کر شفاعت گناہ گاراں کوں انبیا اولیا کریں مسرور	۵۰ "
(۱۸)	یو مسلماں حا کہ حنت میں ہوئیں محطوط دیکھ حور و قصور	۳۹ "
(۱۹)	سب موافق ایسی مراتب کے حق کا دیدار پائینگے پر نور	۲۱ "
(۲۰)	پسد فررسد ہے نیکی تو سب محاں کوں ہی ہے یوبچہ صرور	۱۸ "
(۲۱)	ختم ساری کتاب کا یو ہوا یارب اس کوں مدام کر منظور	۲۲ "

ابتداء :

کہوں حمد ہور شکر اس رب کے تئیں
جلاتا ہے اور مارتا سب کے تئیں

خاتمہ :

مرا ہوئے جب اس دھات حوشحال من
میں اتنا جہ آخر کون بولوں بچن
سپر دم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

جملہ صفحات ۳۵۷

مثنوی مرات الحشر ایک مذہبی مثنوی ہے مگر ادبی حیثیت سے یعنی لطیف تشبیہات و استعارات کے مدنظر لسانی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ یہ ڈھائی سو برس پہلے کی زبان ہے، فراقی، نصرتی، ولی، اور بحری کے ہم عصر تھے، واقعہ نگاری اور تسلسل بیان، اور بعض قیامت کے مرقعے خوب کھینچے ہیں، خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری، ترک و احتشام، دبدبہ اور شان کا منظر خوب کھینچا ہے۔ ہم یہاں مثنوی مراۃ الحشر فراقی سے چند اقتباسات درج ذیل کرتے ہیں جس سے شاعر کی زبان اور اسلوب بیان کا اندازہ ہوگا۔ ایک بخیل اور اس کی بیوی کا قصہ کس مزہ سے بیان کرتے ہیں جو مذہبی اور تعلیمی پہلو لئے ہوئے ہے، عنوان اصل قصہ

یو حکایت ہے یک ممسک کی نکاتی[1] میں جو اتھا مشہور
الہی اپس کا[2] دے ہمنان[3] کو ڈر نکو کر گرفتار دنیا اوپر
ہمارے دلاں کو نکو ڈھلا[4] اپس کی محبت میں ہمنا چلا
سمجھتے ہیں دنیا کو فانی ہمیں کریں گے کتی زندگانی ہمیں
دعا دے کو آخر نکل جائے گی نہ کام آئی کسکوں نکام آئیگی
لطائف قصص میانے[5] مذکور ہے حکایت عجایب یو مسطور ہے
اتھا ئیک[6] تجار یے مالدار ہتی، ہور، گھوڑے، شتر کئی ہزار
جہازاں بی گھر کیچ چلتے تھے کئی اتھی بے بہا اس کے بہوت شئی
تماشا ہر یک بھانت کیاں[7] بیشمار سری[8] صاف شالان لی گنتی تھی ہار
ہر یک جنس کپڑیاں کی بستی اتھی ہزاران عالم اوکستی اتھی
ہر یک نک جواہر کا بے مول تھا نہ موتی کا یک اوسکے کیں تول تھا
خزانہ بی تھا نقد ایسا اوسے میسر نتھا بادشاہ کون کسے
کیا تھا جدا اسکون قارون تے چڑ[9] رہیا تھا بخیلی میں پن وو سپڑ[10]
اتھا نکمت ایسا جو اس دھات تے[11] نہ مارے کوا بی جھوٹی ہات تے[12]
اگر حواب میں کس کون روتی کھلائے تو ہشیار ہو مون[13] مٹی خاک[14] بھائے

---

(۱) نکبت (۲) اپنا (۳) ہم کو (٤) ڈاوان ڈول (٥) درمیاں، میں (٦) ایک (٧) کے
(٨) صرف ہوئے (٩) بڑھا، چڑھا (١٠) پکڑا (١١) اس طرح، اس قدر (١٢) کو اپنی جھوٹے ہاتھ سے مارنے مین تکلیف کرتا تھا (١٣) منہ (١٤) منہ میں مٹی پڑنا

اگر کوں[1] بخیلی کا اوس کے بیان   تو ہو جائے ممسک یو[2] میری زبان
پچھیں بند بر[3] یکی کروں کیوں بچن   بجے کام ہے بولنا یے سخن
مجے تس بخیلی تے کیا کام ہے   یو قصے کا کرنا سر انجام ہے
اتھی ایک عورت اوسے بے مثال   اچھی سورتی[4] خوب اس کا جمال
روا ہیں اگر اوسکوں بولیں یہ حور   ولے حور میں بی اچھیگا قصور
وو برمل اچھی مار چندر بدن   دسیں نور کی ایک پتلی نمن[5]
سو ویسی لچھن[6] کیتی وو کنوار[7]   کہا نین کری بھی بخیلی تے یار
رکھیا تھا نپٹ بھوک ہور پیاس سوں   بچاری وو اچتی[8] تھی اس آس سوں
ندیتا تھا جیو کھول کر وو بخیل   معین تے دیوی اس کچھ بی قلیل
اوسی میچہ گذران وو دھن کرے   اپسکی تو جینی کے روزان بھرے[9]
نہ بولیں کسی سات اپس دل کا غم   نکھولیں کسی سوں اپس کا بھرم
یکا یک امر خدا یوں ہوا   وو تجار اپنی قضا تے مرا
ملے سب مسلمان سن یو خبر   اوسیکی اوسی گھر میں کئی دفن کر
پچھیں دھن کی امید جیئو میں بھری   اپس ذوق سوں مرد دوسرا کری
کریں عیش و عشرت دونو مل مدام   اچھیں موکلی[10] ذوق تے صبح و شام
ندل میں دھریں عشق بن کچھ خیال   گمت[11] میں اوڑاتے تھے سارا وو مال
ہریک بھانت کی کاڑ[12] اوپرال[13] تھان   رکھیں کھول سوداگری کی دوکان
خریدی کون یے لوگ آتے تھے   جکچہ من منگیا سو لجاتے اتھے
چل آیا تھا یکروز واں یک جوان   وو کچ کام تھا سو گیا اس دکان
دیکھیا خوب شان اس کا محل   وو دھن ہور ہے یک جوان بے دل
دھرے تھے او شیشاں میں بھر بھر شراب   انگ[14] نقل تھے ہور سوندے کباب
او کھاتے و پیتے گمت میں اتھے   دونو عشقبازی کی گت میں اتھے
یکس یک کون[15] دیتے پیالے انپڑ   یکس عشق میں یک رہتے تھے سنپڑ
انگن اس محل کا اتھا بے مثال   رکھے ہیں کہ جوں صاف روپے[16] کا تھال

---

(۱) کھون (۲) یہ (۳) کسی کے پیت پچھے (۴) صورت کی (۵) طرح۔
(۶) عادت مراد نیک سیرت (۷) گنوار، جاہل (۸) رہتی (۹) یعنی دن پورا کرنا
(۱۰) سہ کھلے، کھلم کھلا (۱۱) تماشا، کھیل (۱۲) نکالنا (۱۳) اوپر، باہر
(۱۴) آگے سامنے (۱۵) ایک دوسرے کو (۱۶) صاف چمکدار، چاندی

دسیا چوترا [۱]- خوب د میان صاف
اتھی گو ایک تسپه دالی غلاف

او رمل که بیٹھی تھی گو اپاس
اپس دل میں بھر حرمی بے قیاس

دیکھی او جو آیا ہے یو مشتری
کئی بھوت تعظیم سوداگری

بیٹھا کر دھرے پان آگے شتاب
قماشاں دیکھانے لگے بے حساب

و بھر بھر کے بلور کے جام میں
پھراتے اتھے [۲]- دور آرام میں

جب اس دھن طرف آئی نوبت شتاب
او تھی ہت‌میں چانک‌لے پیکر شراب

جسک دوڑکر آ بھوت زور سون
غصه کرکے مارے وو اس گور کون

پھر اپیچ [۳]- جاگے [۴]- پر آ بیٹھ کر
پھر اتی اتھی دور خوش جام بھر

جب آتی رہتی اس کی نوبت ادھر
اوٹھی وونچه [۵]- ہور مار آویں نڈر

بران [۶]- او مساور پریشان ہو
اپسکے اپی دل میں حیران ہو

عجائب تماشا دس [۷]- آیا اوسے
اوے وقت لک پن پوچھیا کسے

کیا [۸]- کچھ تو خالی خلل تے یوہین
ولے کیا ہے حکمت سو حیرت ہوں میں

دره سک [۹]- کے دھن کون‌وو پوچھیا که بول
پریشان ھوں میں (تو) معما یو کھول

بچاری تو مردے کا تقصیر کیا
عصے سوں توں کی مارتی ہت اچا [۱۰]-

حقیقت میں مردیکا ہے بی ادب
تیا مان او کرنا تجھے کیا سبب

کھی دھن ارے بھائی میں کیا کہوں
ولے پوچھتا ہے تو کیوں چپ رہوں

مرا تو بھی یو مرد پارا اتھا
دو سب گھر یو سب مال اوسکا اتھا

ولے تھا بخیلی میں مشھور او
سخاوت کی ره تے اچھیں [۱۱]- دور او

نه کھاویں اپی ہور نه مجھکو کھلائیں
مدے آپ کسکون نکس [۱۲]- بھی دلائیں

تیا [۱۳]- مال اچکر [۱۴]- بھوکا رہیں مدام
اتھا خوب کھانا ہمن پر حرام

اوسے مالکی بھی کمیں نا اچھے [۱۵]-
کسی شئی کی بھی پر کمیں [۱۶]- نا اچھے

خزانیچ بھر بھر کے رکھتا اتھا
خرچ نے کو یکدام سکتا اتھا

یو سب چھور کر گور میں جا رہیا
مرے ہات میں حکم تب آ رہیا

نکاح اس جواں کو کری میں حلال
یو دی ہوں سب اوسکے تصرف میں مال

---

(۱) چبوتره　(۲) یعنی دور ساغر چل رہا تھا　(۳) ایسے ہی　(۴) جگه　(۵) اوسی طرح
(۶) بعد ازاں　(۷) نظر　(۸) کہا　(۹) نه ره سکا　(۱۰) ہات اٹھا کر　(۱۱) رہے
(۱۲) نه کسیکو　(۱۳) اتنا　(۱۴) رہکر　(۱۵) سجتی نه تھی　(۱۶) کمی

جکچ من منگیا خرچ کرتے ہمیں جمع کرکے گھر میں نہ رچتے ہمیں
دونو مل کر کرتے ہیں عشرت ہمیں یو دنیا کا لیتے ہیں لذت ہمیں
ہمارا بھی جیئو جب نکل جائے گا تو کیا گھر بھی کیا مال کام آئیگا

پل صراط جو تلوار سے تیز اور بال سے باریک بیان کیا جاتا ہے اوس پر سے گذرنے کی کیفیت کو بموجب اقوال احادیث اس طرح بیان کرتے ہیں :-

اوسب اپسے اپسے عمل کے حساب چلے جائینگے کوئی ہلو کوئی شتاب
کیتے [۱] جائینگے بیگ [۲] بجلیاں کے ناد [۳] کتے جائینگے اوڑ کہ جوں جلد باد
کتے جائیں رہوار گھوڑے سمن کتے ہو پیاد بیچ [۴] ست کر چرن
کتے ہو کہ لنگڑے سنبھال اپنا تول کتے ہو کہ اندے [۵] چلینگے ٹٹول
کتے اپسے چتران [۶] پہ پڑ آئینگے کتے پیٹ گھستے چلے جائینگے
کتے آئینگے اپسے سیسے کے زور کتے جائینگے سست ہو جو نکہ مور
او ابلیس سارے شیاطین سات او سب مشرکاں کافراں بی سنگات
قدم لا کہ رکھتیچ [۷] میں تل اوپر پڑیگا او اندھا ہو دوزخ بہتر

فراقی گویا طوطی شکر مقال ہے | اگر چہ کہ شاعرانہ تعلی سے خالی نہیں مگر استعارے و تشبیہات سے عجیب لطف پیدا کردیا ہے جو متقدمین بیجاپوری شعرا میں کم ہیں ، مگر زمانہ ما بعد میں اس کا اثر زیادہ ہے حتی کہ بعض نثر نگاروں نے اس کا اثر لیا ہے ۔

میرے طبع کے تیز پر باز کون ہوا پر کرنہار پرواز کون
چپی [۸] کاچ [۹] ٹوپن [۱۰] دے مون کے اوپر بندیا حبر [۱۱] کون دوڑ پاووں کی کر
پھر یاں دیکھ جودت کی حکمت دیکھا نزاکت کی دلپی یو پھر پھر بولا
کیا دست پر فکر کے آشنا کھلایا فصاحت کے طعمے بنا
چکایا مضامین پھر شغل دھر پھرایا معانی کی کچری [۱۲] بہتر
مجے جان اس طایری [۱۳] جوش خیال چپی کاچہ [۱۴] تس مکہ تے ٹوپن نکال
سٹون کھول جب حبر کی پگ [۱۵] تے دوڑ اوریں فکر کے ہات تے کر کہ دوڑ

---

(۱) کتنے (۲) بیگی ، جلدی (۳) مثل (۴) پیدل (۵) اندھے (٦) یعنی چوتر کے بل
(۷) قدم رکھتے ہی (۸) خاموشی (۹) کاہی (۱۰) ڈھکن (۱۱) سیاہی (۱۲) کچہری
(۱۳) طائر (۱٤) خاموشی کا (۱۵) پاؤں

چنگل کھول اصلاح کا مار پر
وو پکڑیں ہنر کے عجب جانور

جھورا اوسکے چنگل تے پر یاردار
دھروں گھال معنیاں کے پنجرے مںجھار

غلاف اوس پہ حرفاں کا میں ڈالکر
رکھوں ہر ورق کیچ گھر کے بہتر

رہے ناؤں میرا کہ ہے خوش ہوس
اگر میں نہ رہوں رہے میرا ناؤں بس

میری طبع کی بحر اوبلنے لگی
ہر یک موج خواہش کی چلنے لگی

پھرایا جہاز آپنے فکر کا
لگا یا ہوں اوراد اس ذکر کا

میری طبع کا ناخدا چڑ لیا [1]
دیوسی میں جودت کے جاگا دیا

معلم ارادے کا آکر شتاب
ستاریاں کا مضمون کے دیکھ حساب

ہنکاریا سو خوش ورن ہو کر بھیا
خموشی کی کھاڑی، سٹ آگے گیا

خدا کی مدد کا ہو بارا چلیا
خطایاں کے گرداب اوپر تے تلیا

ہنر کاچ کپڑ [2] کا دس آیا شتاب
رکاکت کی ستی لگی بیحساب

خدا کا نپٹ دل میں شکر کر
دیا میں اپس آرزو کا لنگر

لطافت کی ہوپری اوپر ہو کہ سار
کثافت کی کھاڑی سٹی جا کہ پار

عنایت کے بندر میں آکر اتر
رہیا لیکہ نادر طراوت کا گھر

بچن کا متاع لیکے بھرنے لگیا
خیالاں کی نت فکر کرنے لگیا

نظر دھر اپس ذوق کا خوش وطن
جب آیا .... تب کیا چوکدھن

ملو یاں معانی کے تجار سب
دیکھو یو متاع آکہ یکبار سب

اول مجکو تحسین کا دیکہ زر
پچھے یو خریدی کرو سرسر

الٰہی مشقت میری کر توں چیز
میرا شعر رہے جگ میں ہو کر عزیز

میدان حشر اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری مبارک:

محمد کی نوبت کا جھنکار سب
سنیگی مہابت تے سنسار تب

اچھیگا نور کا برا غلغلا
جو دیکھے سو ہو جائینگے مبتلا

سو جبریل اپنے کوں پونجائینگے
سرافیل عزرائیل بھی آئینگے

ملا یک بھی سات اون کے ستر ہزار
طبق نور کے لیکہ کرتے نثار

کرینگے او سارے بڑا طمطراق
کہ لاکھاں تے لاوینگے ابلق براق

اچھیں سب براقاں کو زری لگام
مکلل مرصع کی زیان تمام

(۱) چڑھ گیا (۲) لباس

بهشتیچ کے بھات کیا ...... تان — او چھب رنگ برنگی چیتاں ہے وتیاں
حریری و دیبائی و سند سی — اچھینگے او بیقیمتی مرد ستہی
لیکر آئینگے یونچہ لاکھاں نے تاج — ندیکھا ہوکوئی ہو سنیاں نہیں ہے آج
اسی دھات کے تحفے لے آئینگے — موافق مراتب کے پو نچائنگے
کرینگے اول دست بوسی نبی — پچھیں یونجہ امت کون اسکی سبی الخ

* * *

کتے ہیں کہ جنت کیاں نہران یوچار — اوسیچ کیاں اب دنیاں میں چار
کہ جیحون جنت کی ہے نیرکی — یو ظاہر فرات اوسکی ہے شیر کی
لیا نیل کی شکل واں کا شراب — ہور شہد ہے یوج گنگا کا آب
عربی میں حیحون ہے اصل نام — کتے ہند میں اوسکو گنگا تمام

ہمکو ایک قدیم مخطوطہ مثنوی مولانا روم قدس سرہ مکتوبہ عبد اللطیف کے ایک حاشیہ سے فراقی کی ایک نظم بعنوان « پند تصنیف فراقی » دستیاب ہوئی ہے۔ زبان دکھنی ہے کچھ عجب نہیں کہ وہ یہی فراقی ہوں، جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

کہا میرے مرشد نے یوں میرے تئیں — کہ ایک بات کہتا ہوں سن تیرے تئیں
کہا مجکو ایک پاک درویش نے — رہ کی کتاری کے دل ریش نے
ارے یار دنیا کا طالب نہو — قلندر ہو شہ کا مصاحب نہو
توں رردار سے جگ میں یاری نکر — توانا ہے جب تیئں سواری نکر
ہرکھ آرزو زیر بریان کی — ہوس دور کر روغنی نان کی
عبث ہے عمارت بنانا تجھے — کہ آخر یہ سب چھوڑ جانا تجھے
ارے یار تنہا توں رہ جگ بھیتر — کہا کر میرا کد خدائی نکر
گزر جا تو دنیا کے جنجال سے — توں مشغول ہو اپنے احوال سے
کہ پیری کا ہنگام جب آئے گا — جوانی کا لحظہ گزر جائے گا
نہ رہویگی رونق تیرے گال میں — سیاہی نہ رہویگی تجہ بال میں
نہ رہویگی قوت بدن میں تیرے — نہ رہویگی طاقت چرن میں تیرے
عصا لے پھرے گا توں بازار میں — نزاکت نہ رہویگی رفتار میں
نہ رہویگی گھر بیچ عزت تجھے — نہ لیاویگی خاطر میں عورت تجھے
نہ رہویگی یاروں سے یاری تجھے — محبان ستی دوستداری تجھے
مصیبت ترے سر اوپر آئیگی — پریشان دنیا گزر جائیگی

اجل آکے پونچھیگی اے صاحبا ملینگے ترے یار اور آشنا
یکا یک پلنگ سے اوتارینگے تجھ جنازہ میں لیکر سولاویگے تجھ
کفن گل میں پہناوینگے یار مل نکالینگے گھر سیتی غمخوار مل
کرینگے تجھے شہر سیتی بدر بناویںگے جنگھل میں تیری قبر
لجا ویں گے وارث تیرے مال کو قبا اور دولائی دگر شال کو
نہ دیکھے گا کوئی تیرے فرزند کو توں ہشیار ہو سن میرے پند کو
تجھے پھر کسی سیتی ملنا نہیں اندھاری قبر سے نکلنا نہیں
نہ آوے گا کوئی تجھے یاد کر مگر باؤ گزرے گی تجھ گور پر
کہا ہے عجب داستان فراق فراقی نے اے کشتگان فراق

شاید اسی فراقی کی ایک اور نظم کتبخانہ نواب سالار جنگ بہادر کی بیاض میں درج ہے مگر کاتب نے فراقی کا املا فراحی لکھا ہے، اس لئے مزید تحقیق نہ ہوسکی، جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے، (۴۸) بیت

ہمیشہ مجھ سے عاصی کوں نبی جی آسرا تیرا جہنم کی خلاصی کوں نبی جی آسرا تیرا
تو ساقی حوض کوثر کا ملاقی ہو ہر ہر کا فراحی بھی ہے تجھ گھر کا نبی جی آسرا تیرا
گوایاں عمر کھٹ پٹ میں جہاں فانی کی لٹ پٹ میں
پریا مایا کی چٹ پٹ میں نبی جی آسرا تیرا الخ

دکھنی عوام کا تلفظ ق کے بجائے خ اب بھی رائج ہے جس طرح پنجابی قاف کو کاف بولتے ہیں ممکن ہے کسی کم علم کاتب نے اس کا املا فراحی لکھ دیا ہو۔

بعض ماخذ:

(۱) تاریخ بساتین السلاطین مولفہ محمد ابراہیم زبیری (قلمی)
(۲) تذکرۂ اولیاء رائچور " روشن علی رائچوری مطبوعہ
(۳) ترجمہ روضۃ الاولیا بیجاپور ترجمہ معہ ضمیمہ مولوی سیف اللہ قادری المدرسی
(۴) تذکرۂ اولیاء دکن مولفہ عبد الجبار خان ملکاپوری مطبوعہ حیدرآباد دکن
(۵) " روضۂ اولیاء بیجاپور " زبیری (قلمی)
(۶) مآثر نظامی " نسارام پدر شفیق اورنگ آبادی
(۷) بیجاپور گزیٹیر (انگریزی) Archaelogical Survey of India (Bijapur) By Cousins 1916
(۸) شجرۂ خاندان فراقی مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن

(بمہر میراں شاہ محمد ۱۲۸۵ ھ) از اولاد شاہ عزیز اللہ برادر فراقی

(۹) مثنوی مراۃ الحشر مصنفہ فراقی (کتبخانہ آصفیہ) مکتوبہ نور الدین دح

(۱۰) قدیم نسخہ شرح مثنوی مولانا روم کے حاشیہ پر ایک غزل فراقی (مکتوبہ شاہ عبد اللطیف شارح مثنوی)

(۱۱) بیاض شعراء دکھنی فارسی		کتبخانہ سالار جنگ حیدر آباد

(۱۲) رسالہ اردو ادب		انجمن ترقی اردو علی گڈھ

(۱۳) حدیقۃ المرام		مولوفہ محمد مہدی واصف (عربی) مطبوعہ ۱۲۷۹ ھ (مدراس)

(۱۴) رسالہ برہان		دھلی ستمبر ۱۹۵۶

(۱۵) کلیات ولی		مرتبہ ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان

* از لال چند بسمل، عشرتی، پشاوری

مسلم صوفی کا ہندی کلام ـ اللہ نامہ

« جناب پرشو رام چترویدی نے اپنی ہندی تصنیف « صوفی کاویہ سنگرہ » میں لکھا ہے کہ « اللہ نامہ » نام کی رچنا کسی صوفی شاعر کی ملی ہے جس کے نام کا پتا نہیں چلتا ۔ » چترویدی صاحب نے ٹھیک کہا ہے ۔ شاعر نے صرف نام ہی نہیں اپنے تخلص سے بھی واضح طور پر آگاہ نہیں کیا ۔ لیکن کلام مندرجہ کے آخری شعر میں آیا ہوا لفظ « باقی » اگر نگاہ تجسس کے نزدیک شاعر کا تخلص قرار پاسکے تو اس کی وساطت و رعایت لفظی، شاعر کے نام کا معمہ بھی حل کردیتی ہے ۔ یعنی « عبد الباقی » واللہ اعلم بالصواب، اگر کسی صاحب کو ان اشعار کے مصنف کا نام و حال معلوم ہو تو ضرور مطلع فرمائیں ۔

(۱) جگ[۱] فانوس کی شکل بنایا آپ کو[۲] چاتر[۳] ہوئے جتایا[۴]
(۲) ہاتھی گھوڑے واں[۵] نائے دیپک[۶] بل[۷] سب سیر[۸] دکھائے
(۳) دیپک ہو جب آئے اندر سوجھے[۹] سورج تارے اندر

ترجمہ نمبر ۱ تا ۳

از روئے عقائد صوفیانہ، جمیل اکبر نے جب اپنا جمال خود آپ دیکھنا چاہا تو ایک لطیف سی جنبش نطق طرفۃ العین میں آئینہ کائنات کو عالمِ وجود میں لے آئی ۔

اسی کائنات کو شاعر نے فانوس سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ خلاق اعظم نے جہان شش روز کو فانوس تصویر کی صورت میں ظاہر کیا ...... ہر تصویر کی چولی موالید ثلاثہ کے دامن سے باندھی ...... اور چراغ فانوس کے پردے میں پرتو جمال کی ضیائے حیات سے فانوس کی ہر تصویر کو زندگی سے

---

(۱) دنیا (۲) خود کو (۳) دانا ـ سیانا (۴) دکھایا (۵) اس میں (۶) چراغ
(۷) دریعہ (۸) حرکت، چلنا، پھرنا (۹) دکھائی دئے

* لال چند بسمل عشرتی، پشاوری تمثیل نگار، بمبئی

آشنا کرتے ہوئے، حسب حال و حقیقت، قوتِ حرکت و گردش و گویائی بخشی۰۰ ۰۰۰۰۰ مہر و ماہ بھی چمک اٹھے ۰۰۰۰۰ ستارے جگمگانے لگے ۰۰۰۰۰ اور دنیائے فانوس کا ہر فرد گویا زبان حال و حیرت سے پکار اٹھا ۰۰۰۰۰۰

لا احصی

(۴) جب مگ[۱] دیپک واں رہے ہنسی خوشی حگ واکو[۲] کہے
(۵) جب دیپک فانوس سے جائے کاہو[۳] کو فانوس نہ بھائے

ترجمہ نمبر ۴ تا ۵

ان شعروں میں آئے ہوئے فانوس سے شاعر کی مراد انسان کے قالب خاکی سے ہے. جوکہ ذو معنی تشبیہہ کے دائرہ سے باہر نہیں، اس چھوٹے سے فانوس در فانوس کا رشتۂ حیات بھی اسی چراغ فانوس کی لَو سے بندھا ہوا ہے.

لہٰذا جب تک یہ رشتہ بندھا ہے تب تک سب کچھ قائم ہے. شان شوکت بھی ۰۰۰۰ عزت و آبرو بھی، خویش و اقربا بھی محبت و مروت سے کام لیں گے، دوست و احباب بھی خندہ پیشانی سے پیش آیں گے لیکن رشتے کے ٹوٹتے ہی ۰۰۰ سب کچھ ختم! ع اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی افتاب کے، پھر تو

مرنے کے بعد کوئی الفت نہ پھر جتائے
بیٹا نہ پاس آئے نہ بھائی منہ لگائے
جو دیکھے اس کی صورت دہشت سے بھاگ جائے
اس مرگ کی بلا بھی کیا کیا نہیں بنائے

(۶) کہیں بلبل کہیں پھول ہو آیا کئی بھانت[۴] اپنا روپ[۵] دکھایا
(۷) کہیں لیلیٰ کہیں مجنوں ہوا کہیں کلی کہیں مدھوبن[۶] ہوا
(۸) کہیں روئے کہیں کھلکھل ہنسے وہ پیار کئی رنگ میں سے

ترجمہ نمبر ۶ تا ۸

تقریر مختلف ہیں مگر مدعا ہے ایک
باجے ہزاروں بجتے ہیں لیکن صدا ہے ایک
شمع و چراغ و آئینہ و برق و مہر و ماہ
جلوے ہیں لاکھ رنگ کے جلوہ نما ہے ایک

---

(۱) جب تک (۲) اس کو (۳) کسی کو (۴) کئی طرح (۵) جلوہ حسن (۶) سرسبز باغ

بلبل گریاں بھی تو　　اور گل خنداں بھی تو
اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
وہی وہی نظر آیا جدھر جدھر دیکھا

(۹) آپ انا الحق نام پکارا　　کیا بدنام منصور بے چارہ
(۱۰) پھر قاضی ہو قائل کیا[۱]　　ار[۲] واکو سولی[۳] پر دیا
ترجمہ نمبر ۹ تا ۱۰
چو خود کردند رازِ خویشتن فاش　　عراقی را چرا بدنام کردند؟
بار میگوی کہ دامن ترمکن ہشیار باش!
(۱۱) کون چڑھا اور کون چڑھایا؟　　آپ ہی وہ کئی روپ[۴] میں آیا
(۱۲) غور کرو اور آنکھ پسارو[۵]　　وہ ہے محیط ہر رنگ میں یارو!
ترجمہ نمبر ۱۱ تا ۱۲
خود کوزہ و کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
رہا کن عقل را ناحق ہمیں باش　　کہ تاب خور نہ دارد چشم خفاش
چشم مجنوں چاہیے دیدار لیلی کے لئے
تنہا نہ اسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچاں
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچاں
ہر آن ہر بات میں ہر رنگ میں پہچاں
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچاں

(۱۳) اس کا وچار کروں کیا بھائی　　آپ کو[۶] اپنی چھوی[۷] دکھلائی
ترجمــــہ:
اپنی صورت کا مصور آپ ہے　　دہر میں نقاشِ لا ثانی ہے وہ

(۱) کیا　(۲) اور　(۳) دیا، چڑھایا　(۴) شکلیں، صورتیں　(۵) کھولو　(۶) خود کو
(۷) جلوہ، صورت

(۱۴) یہ باتیں میں کیسے وچاروں سر پھوڑوں کہ کپڑے پھاڑوں
ترجمہ: زیبا ہے شور مرغِ گرفتار کے لئے ؟

(۱۵) ہنسوں بہت یا آہیں ماروں کاہے[۱] سناؤں کسے پکاروں
ترجمہ: ہم کہیں کس سے کہ در پیش ہے حالت کیسی

(۱۶) مستانہ ہو منہ کو کھولوں ہو[۲] منصور انا الحق بولوں
ترجمہ: میری قدرت سے اب احفائے رازِ عشق باہر ہے
تو کہہ دوں کہ: ہرکہ ازوے نہ زد انا الحق سر ....
یا یوں کہوں : لب دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دیںداری
و لیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد!
لیکن نہیں شاعر کہتا ہے ...

(۱۷) بھلا ہے مجھ کو اب چپ رہنا کفر ہے بھید خدا کا کہنا
ترجمہ : مصلحتِ نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست
حقایق ہائے نیک و بد بہ شیر خفتہ می ماند
کہ عالم را زند برہم چو دستی برہی بر او
لہذا ...... خموش ...! خموش ....!

(۱۸) آپ کرم او مو پہ کینا تب میں نے واکو لے لینا
(۱۹) کچھ سگار[۳] کئے ہیں ہوئے جا پی[۴] چاہے سہاگن[۵] سوے
(۲۰) نہ کچھ طاعت میں نے کیتی[۶] آپ کرپا[۷] ان مو پہ کیتی
(۲۱) باقی بات ہے اپرم پارا[۸] کیا لکھوں میں بارم بارا[۹]
ترجمہ نمبر ۱۸ تا ۲۱

سرمد غم عشق بو الہوس را نہ دہند سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

---

(۱) کس کو (۲) بن کر، ہو کر (۳) بناؤ، سورما (۴) مطلوب، و بر معشوق (۵) نیک بخت
(۶) کی (۷) کرم و فضل (۸) بے حد (۹) بار بار، گھڑی گھڑی

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

گر عمر بھر میں اس کو لکھوں بھی تو کیا لکھوں
بے انتہا ہے وہ تو عرض تا کجا لکھوں

پھر! رات کوتاہ وقصہ بسیار!

* از سیدہ جعفر

اردو نظم اور ہیئت

جدید انگریزی شاعری کی روحِ رواں ازراپاؤنڈ (Ezra Pound) نے اپنی کتاب "Active Anthology" کے مقدمے میں جب یہ بات کہی تھی کہ « ادب بغیر تجربے کے مر جاتا ہے اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے تجربہ ہی ایک اہم اور ضروری عنصر ہے » تو گویا ازرا پاؤنڈ نے ادب کی ان متحرک اور تغیر پذیر قدروں کی طرف اشارہ کیا تھا جو مادی زندگی کی کشمکش اور انسانی شعور کے ارتقاء کے ساتھ صوری اور معنوی حیثیتوں سے تبدیلی اور تجربے کے سانچوں میں ڈھل جانا چاہتی ہیں. ہمارے ادب میں ان تجربات کا سلسلہ انیسویں صدی کے وسطی حصے سے شروع ہوتا ہے جب تمدن اور ادب کی قدیم راہیں دھندلی ہونے لگی تھیں اور سماجی ڈھانچے کی تبدیلی ادب میں نئے موضوعات کو سمو رہی تھی سر سید کی تحریک سے جو شعراء متاثر ہوئے تھے انھوں نے ادب میں ایسے رجحانات اور حقائق کی تلاش شروع کردی تھی جو اسالیب کو نئی توانیاں نئے تیور اور نیا رنگ دے سکتے تھے. اس راستے پر سب سے پہلا قدم اسماعیل میرٹھی نے اٹھایا اور پہلی بار ہیئت کے اصولوں کو ایک خفیف اور خوشگوار تبدیلی سے روشناس کرانے کی کوشش کی. « ستارے اور کسان » کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی تھی اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں.

وہ غریب کھیت والے　　　وہ امیر وار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی　　　کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہ رہا ہے خرمن　　　کہیں آنکھ ان کی جھپکی
یونہی شام سے سحر تک　　　ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ　　　نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو　　　ہو تمہیں انہیں بتاتے

---

* ڈاکٹر سیدہ جعفر حیدرآباد ۲۰

کہ گئی ہے رات کتنی

اسماعیل میرٹھی، آزاد اور نظم طباطبائی کی کوششیں ہیئت کے سانچوں میں کوئی بڑا انقلاب برپا نہ کرسکیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ردیف اور قافیہ کی سخت پابندیوں اور مروجہ بحروں کے روایتی اور میکانکی استعمال کے انداز سے شاعروں کا ایک گروہ غیر مطمئن سا نظر آنے لگا۔ نظموں میں بند کی نئی ترکیبیں ہلکی پھلکی رومانی نظمیں اور سانٹ کے تجربے، گیتوں کی متعین شکلوں میں تبدیلی اور بحروں میں تنوع پیدا کرنے کا احساس ایک طرف ہیئت کی ارتقائی منزلوں کا پتہ دیتا ہے تو دوسری طرف مغربی ادب کے ان میلانات کو ظاہر کرتا ہے جنھیں شعوری اور نیم شعوری طور پر ہمارے ادب میں جذب کیا جارہا تھا۔ حفیظ جالندھری، اندرجیت شرما، ساغر نظامی، وقار انبالوی، احسان دانش، افسر میرٹھی اور اختر شیرانی نے اردو ادب میں اسالیب کے نئے انداز اور نئے تجربات کو پیش کرکے سنگیت اور آہنگ کی اُن بنیادوں کو مضبوط کردیا جن پر بعد کو آزاد نظم نگاری نے ایک نئے ذوق نغمہ کی تعمیر کی۔ اختر شیرانی کی رومانی نظمیں بڑی نرم اور رسیلی ہیں ان میں زندگی کا نشہ بھی ہے اور محبت کی دھڑکنیں بھی ارکان اور الفاظ کی نئی ترتیب سے یا بحروں کے تنوع کے ذریعہ اختر شیرانی اپنی نظموں میں اثر اور ترنم پیدا کرتے ہیں۔ حفیظ جالندھری نے چھوٹی چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے ان کی نظموں میں ارکان کی تقسیم اور ترتیب کا انداز اور قافیہ کے تیور، اسانٹ کی مجموعی آہنگ کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں قافیہ کو اس طرح بکھیر دیتے ہیں کہ ہر مصرعے کے بجائے اسکا استعمال صرف اُنہی موقعوں پر کرتے ہیں جہاں قافیہ کی جھنکار ترنم کے اثر کو بڑھا سکتی ہے۔ فرصت کی تلاش کے چند اشعار یہ ہیں۔

یوں وقت گذرتا ہے (ا) فرصت کی تمنا میں (ب)

جس طرح کوئی پتا (ج)

بہتا ہوا دریا میں (ب)

ساحل کے قریب آکر (د)

چاہے کہ ٹھہر جاؤں (ہ)

نظارہ ذرا کرلوں (و)

اس عکس شجر کا (ز) جو دامن دریا پر (ح) زیبائش دریا ہے (ا)

حفیظ، احسان، دانش، عظمت اللہ اور افسر کی نظموں کے پیچھے بہت سے عوامل کام کر رہے تھے ایک طرف تو مغربی ادب کے نئے رجحانات تھے جو ہلکی پھلکی دلاویز اور رومانی نظموں کی سمت رہبری کررہے تھے تو دوسری طرف ٹیگور کی شعری تخلیقات تھیں جو اپنے دامن میں ماورائیت کی پرچھائیاں، زندگی کی تڑپ اور مناظر قدرت کی دلکشی کو سمیٹے ہوئے تھیں۔ حفیظ کی نظم «چاند کی سیر» کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عطر بیز لالہ زار　نغمہ ریز جوئے بار
حشر خیز آبشار
کیف موج بیقرار　چاندنی میں کوہسار
تھا بہار در بہار
میں یہ شان کردگار
دیکھتا چلا گیا

یا افسر کی نظم «شب تاریک» کا ایک سماں دیکھئے:

کیا چیز ہے تو اے شب تاریک سکوں ریز
دنیائے خموشاں
محویت پنہاں
ہو حد سے سوا ضبط تو ہوتا ہے جنوں ریز

پریم پجاری، اختر انصاری اور روش صدیقی نے نظم کے اسالیب کو نئی وسعتوں، نئے پیکر اور نئے مزاج سے آشنا کیا اور وہ نغمے بکھیرنے شروع کئے جن کی تان نظم معرٰی پر ٹوٹتی تھی۔ ساغر کی نظم «تاج شب ماہ میں» کے یہ شعر ملاحظے کے قابل ہیں:

یہ نقش منور
منوّر مظہر
مرصع شجر
محبت کے پیکر
جمیل اور رعنا خموش اور گویا سبیل و ثریا
شاعوں کی جھرمٹ میں جلوہ نما ہے

زندگی کے بدلتے ہوئے انداز کے ساتھ جہاں ادب کے موضوعات متاثر ہوتے ہیں ہیئت کے اصولوں میں بھی تغیر کے آثار ابھرنے لگتے ہیں. ہیئت اور مواد کے تعلق کو اس طرح سمجھایا جاسکتا ہے کہ ساری زندگی کے مطالبات اور تاریخی ارتقاء کے تقاضے ادب میں نئے عنوان، نئی علامتیں اور نئے اشعار پیدا کرتے ہیں اور شاعر کا فنی شعور سماج کے وجدان اور ذوق کی مناسبت سے مواد کے لئے ہیئت کے نئے سانچے فراہم کرتا ہے. ہمارے ادب میں ہیئت کی سب سے اہم تبدیلی سنہ ۱۹۳۰ع کے قریب رونما ہوئی جب ن. م. راشد، میراجی، فیض احمد فیض، یوسف ظفر، قیوم نظر، علی جواد زیدی اور عبدالمجید بھٹی نے اُردو میں پہلی بار آزاد نظم نگاری کی کوششیں شروع کیں.

جہاں تک آزاد نظموں کی ٹکنیک کا تعلق ہے عروض کے فطری ارتقاء کو ظاہر کرتی ہیں. آزاد نظم میں کسی ایک بحر کا انتخاب کیا جاتا ہے اور شاعر اپنے شعری ذوق اور ضروریات کے پیش نظر اس بحر کے مروجہ ارکان اسطرح گھٹا بڑھا لیتا ہے کہ بحر کے مجموعی آہنگ اور ترنم کو ٹھیس نہ لگنے پائے آزاد نظم ردیف اور قافیہ کی پابند نہیں ہوتی اس لئیے اس میں ردیف و قافیہ سے جو ترنم اور موسیقی پیدا ہوتی ہے اُسکی کمی کو پورا کرنے کیلئے شاعر کو داخلی ترنم یعنی الفاظ اور تراکیب کے جھنکار اور آہنگ (Cadence) کو پرکھ لینا ضروری ہوتا ہے سردار جعفری کی نظم «اودھ کی خاک حسین» کا آخری حصہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے :-

اودھ کی خاک حسین کے ذرو
جو سینکڑوں میل دور سے اڑ کے میرے خوابوں میں آگئے ہو
میرے وطن کی زمین سے میرا سلام کہنا
اُسے بتانا
کہ میرے ہونٹوں پر سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آگیا ہے
جسے اہنسا کا نام لیکر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے
مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کون دبا سکتا ہے؟

میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

نظم میں قافیہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ وزن کی تکمیل کا احساس دلائے اور دوسرے اشعار کے ساتھ صوری ربط قایم رکھے ۔ آزاد نظم میں یہ فرض اسکے ہر مصرع پر عاید ہوتا ہے یعنی نظم کی ابتداء میں جو نغمہ چھیڑا گیا ہے اسکی لے کہیں ٹوٹنے نہ پائے ، ن . م. راشد « ماوراء » کے دیباچے میں قافیے کے متعلق لکھتے ہیں :-

« قافیہ شعر کا ضروری جزو نہیں بلکہ اتفاقی اور ضمنی عنصر ہے
جس شاعر کو قدرت نے آہنگ اور توازن کی حس عطا کی ہے اسے
قافیے کے سامنے دریوزہ گری کرنے کی ضرورت نہیں »

نظم میں قافیہ کی اہمیت اور اس کے استعمال کو حالی نے سب سے پہلے ایک نئے زاوئیے سے دیکھنے اور سوچنے کی کوشش کی تھی « مقدمہ شعر و شاعری » میں اچھے شعر کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے بتایا تھا کہ شعر کے لئے قافیہ اور ردیف سے زیادہ وزن عنایت اور ترنم کی ضرورت ہے . کم و بیش یہی بات ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی کہی تھی « بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کیلئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرنا ہے جو قالبِ شعر کو اپنے دخل سے زندہ رکھتی ہے . اگر شعر از روئے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن درست ہو لیکن آہنگ تشنہ رہ جائے تو خام ہے ایسا شعر مثل ایک آئینہ کے ہے جو گلخن سے سالم اور درست باہر آئے لیکن صیقل سے محروم رہے »

آزاد نظموں میں کہیں کہیں قافیہ بھی نظر آتا ہے اگر ان سے تخیل کے اظہار میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی اور وہ جذبات کے بہاؤ کی بھرپور ترجمانی کرسکتے ہیں تو آزاد نظم نگار ان کو استعمال کرنے سے نہیں چوکتے . « پتھر کی دیوار » میں « فریب » کے چند شعر یہ ہیں :

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موج پایاب کا ساحل ہے یہی

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لیکر
کہدیا ہم سے گلستان میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموس شہیداں وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

آزاد نظم نگاری بہت سی منزلوں سے گذرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے ۱۹۱۳ ع کے قریب انگلستان اور امریکہ کے بعض شعراء نے آزادی فکر، حقیقت پسندی اور سادہ نگاری کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے آزاد نظمیں لکھی شروع کیں ان میں ٹی ایس. ایلیٹ، ازراپاونڈ، جے. جی. فیلچر، رچرڈ بلڈنگٹن، ٹی. ایس فلنٹ وغیرہ شامل تھے۔ یورپ کی آزاد نظم نگاری بڑی حد تک فرانس کے رمز نگار شاعروں سے متاثر نظر آتی ہے جن میں باڈیلر (Baudelaire) لیمارج، ورلین اور رمباؤ کے نام سر فہرست دکھائی دیتے ہیں. وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ نظم معریٰ کی ساخت نیا روپ اختیار کرتی گئی انگریزی ادب میں مس ایڈتھ سٹویل (Miss Edith Sitwell) گمنگس (Gamings) میریانے مور (Marianemoore) نے اس قسم کی نظموں میں بہت سے تصرفات کیئے ہیں. اُردو میں ن. م. راشد، میراجی، فیض احمد فیض، سردار جعفری، اختر الایمان، نیاز حیدر، خان نثار اختر، مخدوم محی الدین اور طہیر کاشمیری کی نظمیں آزاد شاعری کے عمدہ تجربے ہیں.

ن. م. راشد آزاد نظم نگاری کے نمائندہ شاعر ہونیکے باوجود ان کی نظموں میں زندہ اور صحت مند عناصر کی کمی ہے . « خود کشی » « انتقام » «افیونی» «شرابی» «انسان» اور «رقص» میں ایک شکست خوردہ ذہن اور زندگی کی کشمکش سے روٹھا ہوا دل نظر آتا ہے .

ایک بار اور محبت کرلوں
سعی ناکام سہی
اور اک زہر بھرا جام سہی
میری اور میری تمناؤں کا انجام سہی
ایک سودا ہی سہی آرزوے خام سہی
ایک بار اور محبت کرلوں

میراجی کی عریاں نگاری بھی آزاد نظم کو زندگی اور سماجی حقیقت کے رنگوں سے سنوار نہ سکی « ابوالہول » ، « کلرک کا نغمۂ محبت » ، « اونچا مکان » « ترغیب » ، « محرومی » اور « سرسراہٹ » میں میراجی لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھو سے گئے ہیں. ن ـ م ـ راشد اور میرا جی کی نظموں پر ازراپاونڈ اور جیمس جوائیس کی شعری تخلیقات کی طرح اشاریت کا دھندلکا چھایا رہتا ہے آزاد نظم نگاری کو جن شعراء نے صوری اور معنوی حیثیتوں سے سوارا ہےان میں مخدوم محی الدین سردار جعفری ، فیض احمد فیض اور اختر الایمان وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں.

مخدوم محی الدین کی نظمیں ان کے رچے ہوئے فنی شعور کی ترجمانی کرتی ہیں. ان میں سیاسی اور تمدنی زندگی کے نئے امکانات اور روحِ عصر کی جوان سال امنگوں کی جھلک نظر آتی ہے. مخدوم کے ذہن میں مستقبل کی ایک درخشاں تصویر ہے تاریکی کے بعد طلوع ہونے والی ایک حسین سحر کا انتظار ہے.

رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک بہتر ہیئت اجتماعی تک پہنچنے کی کوشش میں انسانی جذبات و احساسات نے جو تازیانے کھائے ہیں ان کی یاد مخدوم کے ذہن میں بیدار دکھائی دیتی ہے مخدوم کی آزاد نظموں میں خیال کا تعارف اسکے ارتقاء اور تکمیل کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ہر بند ایک بھر پور تصور کی تفسیر ہوتا ہے. اور ساتھ ہی ساتھ نظم کے غنائی تاثرات اور مجموعی آہنگ کہیں مجروح نہیں ہونے پاتے :-

شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پر تردّد کے نقوش
ان کی نظروں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کی جھلک
سینکڑوں لاکھوں عوام
سینکڑوں لاکھوں قدم
سینکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جبرشاہی سے غمیں جورِ سیاست سے نڈھال

جانے کس موڑ پر یہ دھن سے دھمکا بن جائیں

علی سردار جعفری کی آزاد شاعری میں انقلابی عناصر کی گرمی اور ولولہ ہے. ان کی نظموں میں زندگی کے تاریک عناصر سے برسرپیکار رہنے انہیں ٹھکرا دینے اور ان پر فتح حاصل کرنیکی تمنا مچلتی رہتی ہے۔ « نئی دنیا کو سلام » « موت » « خواب » « فریب » « آنسوؤں کے چراغ » « تلنگانہ » « سیلاب چین » « پتھر کی دیوار » « ارمان سے انقلاب تک » اور « ایشیاء جاگ اٹھا » میں زندگی کی تلخیوں کو روند دینے کا حوصلہ حیات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا عزم اور ایک نئے اُفق کی تلاش صاف نظر آتی ہے۔ ذیل کا اقتباس ان خصوصیات کی اچھی نمایندگی کرتا ہے

شریف ماؤں غیور بہنوں
تمہارے بھائی تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے کھیتوں سے اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو اُن کے جوان سینوں میں عدل و انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیری شب میں شفق کی سنہری میا جھلک رہی ہے
وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنے آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنے روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس داموں میں گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

فیض احمد فیض کی آزاد نظمیں ان کے آدرش کی آئینہ دار ہیں اور اس آدرش تک پہنچنے کے لئے جن اُلجھے ہوئے راستوں سے زندگی کا کارواں گذر رہا ہے فیض اُس کی تلخیوں کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ان کی نظموں میں حالات کی گرانباری کا پرتو ہے، « موجِ خون » کے « سر سے گذر » جانے کا احساس ہے لیکن ارادوں کی پسپائی نہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

لبوں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر پر زباں میں نے

اندھیرے اور اُجالے کی کشمکش، انسانی دکھ درد اور محرومیوں کا شکوہ تاریک عناصر سے نفرت اور ایک روشن مستقبل کی آرزو، انقلابی نظموں کے لئے کوئی نیا موضوع نہیں لیکن فیض کی نظموں میں یہی موضوعات «نئے عزم» نئی تڑپ اور نئی توانائیوں کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔

الم نصیبوں جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہی ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

آزاد نظم نگاری میں تجربات کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور یہ صنف ہمارے نوجوان شعراء میں کافی مقبول ہوتی جارہی ہے۔ معلوم نہیں اس چاندنی میں کتنے نئے ماہتاب سمٹ آئیں گے۔

* قاضی عبد الودود

کلیات سودا کا خطی نسخہ

کلیات سودا کے بکثرت نسخے میری نظر سے گذرے ہیں، سطور ذیل میں ان میں سے ایک کا تعارف کرایا جاتا ہے، یہ ابھی حال میں کتب خانہ خدا بخش میں آیا ہے اس کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے:۔

تمام شد کلیات دیوان (کذا) . . . . . سودا بخط خام نعمت خاں در قصۂ ٹکاری[1] حسب الفرمایش (کذا) بابو صاحب عالی قدر . . . . . بابو دلیپ سنگھ . . خلف . . لاله صاحب رام . . برادر خرد رائے صاحب خداوند رائے پرتھی سنگھ صاحب دیوان مختار ٹکاری،

کلیات کا آغاز ایک غزل سے ہوتا ہے جس کا مصرع اوّل یہ ہے، مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیان کا۔ اس نسخے (= ن) میں کلیات مطبوعہ مرتبہ آسی (= مط) کی ایک غزل میں شعر ذیل زائد ہے:۔

سونپا ہے کیا جنوں نے گریباں کو میرے لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا

ایک دوسری غزل میں ذیل کا شعر «ن» میں ہے جو «مط» سے غیر حاضر ہے مگر یہ غالباً سودا کا نہیں:۔

جو کہ ظالم ہے وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں
سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا

«مط» میں ایک زمین کے صرف دو شعر ہیں، تیسرا «ن» میں ہے:۔

اس مکھڑے کے حضور کسے تاب لاوے آفتاب
یہ دل لگو[2] نہیں گرمی کہاں پاوے آفتاب

اشعار ذیل جن زمینوں میں ہیں، «مط» میں ان زمینوں کا ایک شعر بھی نہیں:۔

---

* قاضی عبد الودود، بیرسٹر پٹنہ

(۱) ٹکاری ضلع گیا، صوبۂ بہار میں ہے۔ یہ نسخہ اواسط مئۂ سیزدہم کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۲) یہ لفظ «ن» میں «دل لگو نہیں» تصحیح ایک دوسری قلمی نسخے سے ہوئی ہے

کرتا ہوں تیرے ظلم سے ہر بار الغیاث
یکبار تیرے دل میں نہیں کار الغیاث
تیری نگاہ کو دیکھ کے گردش میں آسماں
کرتا پھرے ہے شعبدہ دور[۱] الغیاث
مغرور حسن کا ہے تجھے یہ کہاں خبر
یعنی کہ کون ہے پس دیوار الغیاث
سودا میں کہتا ہوں کہ یہ پرہیز عشق سے
رسوا ہے کیوں تو کوچہ و بازار الغیاث[۲]
[۳] خط کے آنے پر بھی وہ ملتا نہیں ہے سینہ صاف
گرد سے ھوتا ہے کب یا رب ہر اک آئینہ صاف
خوش کوئی ناداں ہوا دوراں سے تو کیا گو کہ ہو
غم سے دل طفل دستاں کا شب آدینہ صاف
چشم کم سے تیرہ بختوں کی نہ دیکھ افتادگی
سایہ چڑھ جاتا ہے تا بام فلک بے زینہ صاف
جمع زر کرنے سے اپنی سر بلندی تو نہ چاہ
لیگیا قارون کو تا تحت الثریٰ گنجینہ صاف
عکس خوب و زشت جوں یکساں ہے آینے کے بیچ
دوست و دشمن سے ہے یوں اپنا دل بے کینہ صاف
گو کیا ہم آپ کو دنیا کے الجھیڑے سے پاک
گلجھڑی جو یار کے دل میں ہے وہ نہ کی نہ صاف
شیخ کی داڑھی کو سودا رند تو کہتے ہیں پشم
مجھ کو ان کے منھ پر آتا ہے نظر پشمینہ صاف
اس کاروان[۴] میں یار ہے گویا کہ درد دل
فریاد ہر جرس ہے کہ جوں آہ سرد دل
کرتی ہے قطع مزرع اُمید تیغ یاس
اے بوف ہے فلک تجھے کچھ بھی ہے درد دل

---

(۱) کذا۔ (۲) یہ غزل سودا کی نہیں معلوم ہوتی۔ (۳) سودا کی غزل ہوسکتی ہے مگر یاد نہیں کسی اور قلمی نسخے میں ہے یا نہیں۔ (۴) یہ اشعار ایک دوسری خطی نسخے میں بھی ہیں

ہوئیں پشت لب پہ جب سے سوار مونچھیں[1]
کلے سے نیزہ بازی کرتی ہیں یار مونچھیں
جوں کرک سبز واری کی ناک پچ[2] پر ہو
عفت[3] پہ کر رہی ہیں ایسی بہار مونچھیں
زیاد اس سے تم بڑھا کر اب قہر کیا کروگے
جھینگر کی شکل ہیں تو کاندھوں کی دار مونچھیں
جتنا[4] کوئی اکھاڑے اکھڑے نہ پشم اُنکی
حق ہے تمہیں دیے[5] ہیں کیا استوار مونچھیں
کلا[6] تھا توسا قدھے تمام ڈنڈی
کھوڑچ[7] ہے ناک مبھ پر اور ھیںگی تار مونچھیں
بائیں سپید رکھو اور داہنے سیہ تم
ھینگی عجب طرح کی لیل و نہار مونچھیں
[8]ظاھر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں
آوے مگر وہ حواب ہی نہیں
سجدہ کروں نہ کیونکے تری تیغ کے تلے
ایسی نماز عشق کو محراب ھی نہیں
[9]مجھ کو نہیں ہے دل میں ترے راہ کیا کروں
پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں
سنکر ہزار طرح مرا حال یوں کہا
تو تو کسی طرح نہیں دلخواہ کیا کروں

«ن» کی فرد ذیل «مط» میں نہیں :-

جب تک ہے جہاں میں گل و گلزار سلامت
یارب وہ رھے گوشۂ دستار سلامت

«ن» کی یہ دو رباعیاں «مط» سے غیر حاضر ہیں، دوسری سودا کی نہیں بیان کی ہے :-

اے دوست پہے دفع عدو میجوشی وز غصہ شب و روز تو حوں میوشی

---

(١) «ن» میں ہر جگہ موچھیں۔ یہ غزل اور کہیں میری نظر سے نہیں گذری (٢ تا ٧) کذا

(٨) یہ اشعار اور نسخوں میں ہیں۔ (٩) غالباً یہ بھی اور نسخوں میں ہیں

تاکشتن نفس خویش ممکن ناشد　　حیفؑ است که ىر کشتن دشمن کوشی

اب تجھ سے کہوں حو کچھ ہے دل میں میرے
سب تجھ سے کہوں حو کچھ ہے دل میں میرے
پہلے کہہ لو کہ میں نہ مانونگا برا
تب تجھ سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے

ذیل کی پہیلی « مط » سے حارج ہے :-

ایک پرکھ کے اچھر تیں ٭ تین میں چار اوکس پر بین
اوہ اچھر ن میں موہ ڈالے ٭ مدھ اچھر س ن حی کو پالے
است اچھر س دیوے دکھ ٭ سب اچھر سدوں کو سکھ

پہیلی ایک نار کے اچھر چار الخ کے اشعار ذیل حو آخر میں ہیں «مط» میں نہیں ہیں :-

جس کو ہو کچھ ست اور سوحھ ٭ اس پہیلی کو لے وہ بوجھ
اور اس یار حسن بے دکر ٭ کیا تو بولا بعد از فکر
کرتا نہیں ہے کام قیاس ٭ ھو ویگی کچھ پیار باس

« ن » میں قطعہ « الہی ذات سے تیری جہاں میں رہے تاحشر ملک ھند آباد الخ » کے بعد ایک قطعہ بعنواں « در مبارک باد صحت ۱۱۸۸ ھ » ہے « حہاں میں آب ہوا کی موافقت تجھ کو » اس سنہ کا تعلق قطعۂ اول سے ہے اس کے مصرع آخر میں " ھے یہ فتح بو حداداد "، سے تاریخ نکالی ہے ۔

« مط » اور « ن » دونوں میں ایک مخمس ہے ، جس کا مصرع اوّل یہ ہے :-

« حسروا تجھ سا کوئی دوراں بہم پہنچائے تو »

« مط » کے مطابق یہ عالمگیر ثانی کی مدح میں ہے ، « ن » میں اس کا عنوان یہ ہے ، « مخمس در مدح ، بلند احتر برادر محمد شاہ بادشاہ مشہور بہ اچھے صاحب » اس مخمس میں ایک مصرع یہ بھی ہے ۔

« دیکھ تجھ شاہ بلند احتر کو بولے نیک و بد »

غالباً یہ نظم عالمگیر ثانی ھی سے تعلق رکھتی ہے ، "دیکھ تجھ الخ" میں لفظ "بلند اختر" غلط فہمی کا باعث ہوا ہے ۔

«ن» میں کچھ ایسا کلام بھی ہے جو « مط » میں نہیں ، لیکن اس مطبوعہ

سجے میں ہے جس پر یہ مبنی ہے: مخمس، «یا رب تو میری سن لے یہ کہتا ہے سکندر الخ» ایضاً «ندرت ہے ایک بھڑوا کا شو ہے ایک پدنا الخ» قصیدہ «ساجدا کیوں نہ تو پرواز کرے زیر فلک الخ» مثنوی «واسطے طفل کے جو بہتر ہے الخ» ہجویہ نظمیں جو «مط» میں نا مکمل ہیں «ن» میں مکمل ہیں۔ سودا نے شیدا کی طرف سے جو مثنوی کہی ہے اور یہ ہجویہ مخمس جو بعض اصحاب غلطی سے صاحک کی طرف منسوب کرتے ہیں «آبی کہ طرز فتنہ تو ایجاد کردۂ الخ» قصیدہ «ہے سخن سنج ایک جوان متین الخ» میں «لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں» ہے لے . . . . کلیم و حزیں» ہیں۔

«مط» کی مثنوی «مرا دل نام پر اس کے ہے شیدا الخ» «ن» میں ہے، لیکن، «ن» میں اشعار ایسے ہیں جو «مط» سے غیر حاضر ہیں:- «مط» کے شعر ۸ «اسی کا جلوہ الخ» کے بعد:

کسوجا خلوت مریم کی ہو شمع — کسوجا برسر تہمت ہو وہ جمع

«مط» کے شعر ۱۰۲ «وہ نارہ ہیں الخ» کے بعد:

کروں ایسے ہوں جب حامی محشر — بیاد ساقی کوثر سحن سر

«مط» کے شعر ۴۳۵ «ہوا تفتیش الخ» کے بعد:

دیا (کذا) تحقیق آخر شیشہ گر نے — کہ دل اسکا لیا زر گر پسر نے

«مط» کے شعر ۴۳۹ «تجھے بھی کہیں الفت الخ» کے بعد یہ ۱۷ شعر:

محبت کا کھلا ہے آخرش باغ — ہوا گل سے جگر لالے کا یوں داغ
کہ جیسے آگ لگ کر اک شرر سے — جلے ہے دوسرا گھر ایک گھر سے
یہ حاصل عشق کی دولت ہو بے رنج — کہ ہے مارسیہ کے سامنے گنج
جب اس نے یہ بلا سر اپنے پر لی — دلِ زر گر پسر میں تب جگہ لی
کرشمہ تھا یہ الفت کے اثر کا — کہ دل پگھلا دیا زر گر پسر کا
گداز ایسا ہوا دل کیا تب و تاب — کٹھالی میں طلا جیسے کہ ہو آب
نہ دن کو چین اُسے نہ شب کو آرام — نہ تھا جز نالہ و فریاد کچھ کام
اسی حالت میں اک دن یہ گیا سو — بہ خواب آیا نظر وہ آئینہ رو
کہ یوں کہتا ہے وہ اس سے بصد درد — دل گرم اپنے سے بھر کر دم سرد
محبت کا مری تجھ میں اثر ہے — تجھے کچھ حال سے میرے خبر ہے

سخن میرا (یہ)شکوے سے نہیں ہے　　کہ دوُر اس امر سے شکوہ کہیں ہے
کرے گو شمع داغ اس کا سراپا　　پتنگے کو شکایت سے نہیں جا
جو لہ سے ہے جگر ٹکڑے کتاں کا　　اسے شکوہ نہیں اپنے زیاں کا
ہوا ہے یہ گلستان جب سے ایجاد　　ترانہ گل کو ہے بلبل کی فریاد
وھی اے دوست میرا مدعا ہو　　میرے حق میں حو کچھ تیری رضا ہو
میری زنجیر پا میں جو کڑی ہے　　محبت تیری ھی میں یہ گھڑی ہے
مجھے خاک آپ کو باد سحر جان　　جدھر تو چاھے مجھکو پیشتر جان

اس مثنوی کے اشعار ذیل جو « مط » میں ہیں « ن » میں نہیں :

کیا اژدر کو ان نے چیر کر دو　　کہیں ہیں حیدر کرار حس کو　　۸۶
اتھا کر جلد رکھ کاندھے پہ طبور　　صدا اپنی سے دے تین ان کو سیندور　　۱۱۴
تجھے جھوٹی قسم اپنے کی سو گند　　مکر نے دمبدم اپنے کی سو گند　　۱۶۴
تجھے ھی اپنی بدمستی کی سو گند　　تحھے اپنی زبردستی کی سو گند　　۱۶۵
تجھے ان ساری قسموں کی قسم ہے　　پہنچ جلدی کر فرصت کوئی دم ہے　　۱۷۳
بلا شک اس کا جنت میں ہو ماوا　　اٹھاوے جو ابھوں کا آفتابہ　　۲۰۴
غرض کیا کہیے ان کی ذات عالی　　نہ رہتی تھی کراماتوں سے خالی　　۲۰۵
جہاں وہ گاڑ دیتے اپنی مسواک　　لگے تھے ناسپاتی سیب اور تاک　　۲۰۶

« مط » و « ن » میں ترتیب اشعار میں کسی قدر اختلاف ہے : ۱ تا ۸ شعر زائد ۹ ، ۱۳ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۴ تا ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۳ ، ۳۵ تا ۵۷ ، ۵۹، ۵۸ ، ۶۰ ، تا ۷۶ ، ۷۸ ، ۷۷ ، ۸۰ تا ۸۱ ، ۸۵ تا ۸۶ ندارد ، ۸۷ تا ۱۰۲ ، شعر زائد ، ۱۰۳ ۱۱۳ ، ۱۱۴ ندارد ۱۱۵ تا ۱۶۲ ، ۱۶۶ ، ۱۶۳ ، ۱۶۴ و ۱۶۵ ندارد ۱۶۷ تا ۱۷۲ ، ۱۷۳ ندارد ۱۷۳ تا ۱۸۳ ، ۱۸۴ تا ۱۸۶ ندارد ۱۸۷ تا ۴۳۵ شعر زائد ، ۴۳۶ تا ۴۳۹ ، هفتده اشعار زائد ۴۴۰ تا آخر . اهم اختلاف متن یہ ہے کہ « مط » کے مصرع ” خصوصاً خان عالم خاں بہادر “ میں ” خاں عالم “ کی جگہ ” جان عالم ہے “ .

اضافہ : شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی جنگ کا ذکر جس قصہ میں ہے ، اس میں ” حافظ یہ چاہے الخ “ ک بعد شعر ذیل « ن » میں ہے ، جو « مط » میں نہیں ہے .

کہتے تھے اس کو حافظ زر دوست خلق میں
رکھتا تھا ما دھندی میں ایسا وہ اشتہار

« ن » میں قصیدہ « کروں چمن میں اگر جاکے میں غزلخوانی الخ » کا عنوان « ہجو حاجی » ہے مثنوی « یارو خدا ایک ہے دوسرے ر حق نبی الخ » کا عنوان « ن » میں « ہجو فدوی دکنی » ہے سیف الدولہ کی مدح کے قصیدے « ہے سخن سنج اک جواں متین الخ » میں « لے ھدایت سے تا کلیم و یقین » ہے، « مط » میں « یقین » کی جگہ حریں ہے۔

تبصرے

حالی بحیثیت شاعر

از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایم ، اے ، پی ایچ ، ڈی
صفحات : ۳۹۲ قیمت : چھ روپئے
پتـــہ : ادارہ فروغ اُردو ، لکھنؤ

غالب کے شاگردوں اور سر سید کے رفقاء میں شاید حالی ہی کی وہ خوش نصیب شخصیت ہے جس کی طرف مختلف حیثیتوں سے توجہ کی گئی ہے اور متعدد لوگوں نے ان کی زندگی اور کارناموں پر مختلف زاویوں سے مختصر اور مفصل طور پر روشنی ڈالی ہے. حالی صرف ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک سوانح نگار ، ایک ماہر اخلاق ، ایک تعلیم دوست ، ایک مقالہ نویس ، ایک نقاد اور ایک مصلح بھی تھے ، لیکن سب سے بڑھ کر جو چیز ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا خلوص، ان کی انسان دوستی، بلند اخلاق اور ہمدردانہ نقطۂ نگاہ ہے. ان کی شاعری بڑی حد تک انہیں بلند جذبات کی عکاسی کرتی ہے .

حالی کا عہد ہر قسم کے انقلابات کا زمانہ تھا. ملک میں ہر حیثیت سے تخریب کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور ادب بھی اس سے بچ نہ سکا تھا. حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے ان سے جو کچھ ہوا کیا. زیر تنقید کتاب در اصل حالی کی ان خدمات کا بڑا اچھا، بڑا متوازن اور بڑا فکرزا جائزہ ہے. کتاب حرف آغاز اور حرف آخر کے علاوہ چھ ابواب پر اس طرح منقسم ہے : باب اول ، حالات حالی . باب دوم ، عہد حالی اور اس کاپس منظر . باب سوم ، حالی کا نظریۂ شعر و شاعری . باب چہارم ، حالی کی شاعری . بابِ پنجم ، حالی کی مخالفت ، باب ششم ، حالی بحیثیت شاعر . ہر باب اپنے مواد کی حیثیت سے بڑی حد تک مکمل ہی نہیں ہے بلکہ جس طریقے سے ہر موضوع پر نظر ڈالی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ دوسرے لوگ اس کو پیش نظر

رکھیں۔ حالی پر عموماً اور ان کی حیات و شاعری پر اس وقت تک اس سے زیادہ جامع کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ لائق مصنف سے ہماری درخواست ھے کہ جس طرح انھوں نے حالی بحیثیت شاعر کے موضوع پر داد تحقیق و تنقید دی ہے اسی طرح وہ حالی بحیثیت نثر نگار کے موضوع پر بھی متوجہ ہوں تاکہ حالی کے ادبی، علمی، تعلیمی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اصلاحی کارنامے لوگوں کے سامنے آجائیں اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حالی نثر میں بھی کسی سے بڑھ کر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں۔ ہم مصنف کو اس "خاصہ کی چیز" کے لئے مبارکباد دیتے ہیں اور ہر ادبی صاحب فکر سے سفارش کریں گے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ کرے۔

ریاست میسور میں اُردو

جلد اول (حصہ اول و دوم)

مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون اور جناب محمد خان صاحب

قیمت۔ دس روپئے

پتہ : ڈاکٹر آمنہ خاتون ۴۵۲۳ «امین» سیواجی روڈ مہاراج محلہ میسور

میسور کی ریاست میں تقریباً دو سو برسوں سے اردو زبان کے علاوہ اس کے ادب کا بھی چرچا رہا ہے اور وہاں کے شاعروں، نثر نگاروں اور افسانہ نویسوں نے اردو ادب و زبان کی ترقی و توسیع میں قابل ذکر حصہ لیا ہے اب سے کچھ برس پہلے ایک چھوٹی سی کتاب میسور میں اردو شائع ہوئی تھی اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر حبیب النساء بیگم نے پی۔ ایچ ڈی۔ کے لئے اپنا مقالہ لکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ میسور کے کالجوں، اساتذہ اور طلبہ میں اردو سے متعلق دلچسپی ہے چنانچہ مہاراجہ کالج سے مخزن نامی سالنامہ شائع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جو میسور میں مہارانی کالج کی پروفیسر ہیں اور جن سے اردو کے تحقیقی کام کرنے والے اچھی طرح واقف ہیں، اپنے کالج کی طرف سے ایک مجلہ شائع کرنے کا ارادہ کیا، اور تقریباً پانچ سال کی مدت میں مشکلات کا ہفت خواں طے کرکے اس لائق ہوئیں کہ مہارانی کالج کا علمی و ادبی رسالہ شائع کرسکیں،

س سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ مجلہ کا نام کیا ہے ، س کے نیچے صرف یہ لکھا ہے کہ ریاست میسور میں اردو ، یہ کسی مجلہ ؑ نام نہیں ہو سکتا اس رسالہ کا کوئی نام ہونا چاہئے تھا اور اگر شمارہ کو صرف میسور ہی تک محدود رکھنا تھا تو مجلہ کے نام کے نیچے میسور میں اردو نمبر لکھا جاسکتا تھا ۔ مضامین کی حیثیت سے ڈاکٹر آمنہ اور خان صاحب شریک غالب ہیں ۔ رسالہ دو حصوں میں تقسیم ہے ۔ ایک حصہ متذکرہ بالا دو ادیبوں کے رشحات قلم کا ممنون ہے اور دوسرے حصے میں بعض طالبات کے نام سے بعض تحریریں ہیں ۔ معلوم نہیں یہ حصہ کس اصول پر مرتب کیا گیا ہے اور اس میں طالبات کا کیا حصہ ہے ؟ اس حصہ کی مرتبہ محمودہ خانم مکّی ہیں ۔ اس حصہ کے پہلے مضمون کا عنوان ہے خانم کے بارے میں ۔ ۔ ۔ ۔ قول ، ہمارا خیال ہے کہ یہاں خانم کی جگہ عورت ہونا چاہئے ، چنانچہ خود مضمون نگار نے کئی جگہ عورت ہی لکھا ہے ، دوسرے اس حصہ کے مضامین کی اصلاح بھی نہیں کی گئی ہے ، حصہ اول میں بعض مضامین بہت اچھے ہیں ، لیکن بعض سے متعلق صرف اسقدر گذارش ہے کہ

تلخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات ، اُس نے شکایت ضرور کی

طباعت اور کاغذ بھی بہتر ہوتا تو اچھا تھا ، لیکن شاید مالی مشکلات کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا اور بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے قیمت بھی زیادہ رکھی گئی ہے ۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک اچھا مجموعہ ہے ۔ ہم کو امید ہے کہ اس کا آئندہ شمارہ اس سے بہتر ہوگا ۔

Literary and Cultural Activities in Gujrat under the Khaljis and the Sultunat.

از پروفیسر محمد ابراهیم دار   صفحات ۶۲   قیمت : دو روپے
پتہ : ۔ بزم اشاعت اسمعیل یوسف کالج ۔ جوگیشوری ، بمبئی نمبر ۶۰

اسمعیل یوسف کالج کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس میں اسلامی تاریخ اور ان تمام زبانوں کے جن کا بڑی حد تک اسلامیات سے تعلق ہے ، مطالعہ کا سامان مہیا کیا جائے ، اور کالج کے ذمہ دار حضرات نے ابتداء ہی

سے اس مقصد کے حصول کی طرف جد و جہد شروع کردی تھی ، اب اس کالج کے تاریخ ، فارسی اور اُردو وغیرہ کے شعبوں کے اساتذہ نے ایک مجلس بزم اشاعت کے نام سے قائم کی ہے اور مندرجہ بالا کتاب اس کے سلسلے اشاعت کی پہلی کڑی ہے ۔

پروفیسر محمد ابراھیم دار مرحوم ہماری تعلیمی جماعت کے ایک ممتاز رکن ہی نہ تھے بلکہ ایک وسیع المطالعہ ، لائق ، سنجیدہ محقق و نقاد بھی تھے ، ان کے بعض ادبی و تنقیدی مضامین جو اردو اور فارسی ادب سے متعلق ہیں شائع ہو چکے ہیں ، اب بزم اشاعت نے ان کی ان تاریخی انگریزی مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے ، یہ مضامین گجرات سے عرب و اسلامی تعلقات سے لیکر سلطنت گجرات کے خاتمہ تک کے تہذیبی و ادبی حالات کا بڑا اچھا جائزہ ہیں ان میں انہوں نے عربوں اور مسلمانوں کے ابتدائی تعلقات پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ، پھر سلاطین گجرات کی ثقافتی و ادبی تاریخ والا مقالہ اس موضوع پر ان کی وسعت نظر کا غماز ہے ۔

اس عہد کے گجرات کی علمی ، تہذیبی اور عام سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ معلومات بخش ذخیرہ ہے ۔

<u>اُردو غزل ولی تک</u>

مرتبہ :۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

صفحات ۱۲۸ قیمت : تین روپے

پتہ :۔ بزم اشاعت ، اسماعیل یوسف کالج ، جوگیشوری بمبئی ۔ نمبر ۱۶

زیر تبصرہ کتاب اس بزم کے سلسلۂ اشاعت کی تیسری کڑی ہے اس کے مرتب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہیں ۔ زیر تبصرہ کتاب ایک مفصل دیباچہ اور انتخاب کے تین دوروں پر جو حالی پر ختم ہوتے ہیں مشتمل ہے لائق مرتب نے دیباچہ میں ریختہ کی اصطلاح سے متعلق سیر حاصل فکرزا بحث کی ہے اور اس لفظ کا موسیقی سے تعلق بڑے ماہرانہ طریقے سے بیان کیا ہے ۔ پھر ہر دور کے غزلیات کی خصوصیات اور ہر

دور کے مختلف شعرا کے رجحان طبیعت اور انداز بیان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی ہے۔ جو لوگ پرانی اُردو، عہد ولی اور اس سے پہلے کی شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب یقیناً لائق مطالعہ ہے۔

آج کل (ٹیگور نمبر)

قیمت: ایک روپیہ

پتہ: پبلیکیشنز ڈیویژن، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱ دہلی۔

ماہنامہ «آج کل» اپنی شکل جمیل، اپنی نفیس طباعت، اپنی دلچسپ تصاویر سے زیادہ اپنے مضامین کے لئے مشہور و مقبول ہے اس کے ساتھ ھی اسکی ایک خصوصیت یہ کہ اہم موقعوں پر وہ خاص نمبر بھی شائع کرتارہتا ہے، چنانچہ ٹیگور کی ولادت کے صد سالہ جشن کے موقع پر بھی اس نے ٹیگور نمبر شائع کیا ہے، یہ نمبر بھی آجکل کی تمام خصوصیات کا حامل ہے، اس میں ٹیگور کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور ٹیگور کی زندگی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مفید ہوگا۔

کاروان ـ سینٹ زیویر کالج بمبئی

سینٹ زیویر کالج بمبئی کے شعبۂ اردو کا سالانہ رسالہ ہے، زیرنظر رسالہ میں زیادہ تر وہاں کے طلبہ کے مضامین ہیں، یہ مضامین ہم کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ ان کے لکھنے والے آگے چل کر انشاء اللہ اردو ادب کو متعمیر و توسیع کے سلسلے میں اچھی خدمت انجام دیں گے۔ (ن)

رسالۂ جامعہ،

زر سالانہ چھ روپے

پتہ: جامعہ ملیہ ملاحیہ، جامعہ نگر، دہلی

جامعہ ملیۂ اسلامیہ، دہلی نے ہر بلند معیار و اعلیٰ نصب العین کی حامل یونیورسٹی یا درس گاہ کی طرح علم و ادب کی خدمت بھی انجام دی ہے، اور دے رہی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی رسالۂ جامعہ ہے۔ جامعہ ۲۲ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے کر دوسری جنگ عظیم کی گراں باریوں کا شکار ہوگیا۔ اس نے اردو کے علمی و ادبی رسالوں میں ایک ممتاز جگہ بنالی تھی اس لئے اس کا بند ہوجانا ادبی دنیا کے لئے ایک حادثہ تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ رسالہ نومبر ۱۹۶۰ع سے پھر نکلنا شروع ہوگیا ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس نے پچھلے تمام محاسن کو برقرار رکھا ہے۔ کتابت و طباعت، کاغذ اسی اعلیٰ معیار کے حامل ہیں جو پہلے دور میں تھا، معنوی حیثیت سے بھی اسکا معیار باقی رکھا گیا ہے۔ رسالہ میں علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ تعلیمی مضامین محض خشک قسم کے نظریاتی مضامین نہیں ہوتے بلکہ ان میں زندگی ہوتی ہے، یہ پڑھنے والے کو غور و فکر پر آمادہ کرتے ہیں مجیب صاحب کے تین خطبے جو انھوں نے جامعہ کی چہل سالہ جوبلی کے موقع پر پڑھے تھے بڑے فکر انگیز خطبے ہیں اور توجہ سے پڑھنے کے متقاضی ہیں متنوع مضامین کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کے عنوان سے تبصرہ بھی ہوتا ہے جو معلومات افزا بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی، اگر ادبیات کی طرف ذرا اور توجہ کی جائے تو بہتر ہے۔ اُمید ہے کہ یہ رسالہ اردو نواز حلقہ میں پھر اسی قدر و منزلت کی نگاہ سے جس کا وہ مستحق ہے دیکھا جائے گا۔

(ع ر. ق.)

<u>مجلس، مولوی عبد الحق نمبر</u>

صفحات ۲۳۴ قیمت: تین روپے

پتہ: اردو مجلس، اردو ہال حمایت نگر، حیدرآباد، (آندھرا پردیش)

اردو مجلس کے پرجوش، مخلص اور با عمل بزرگوں نے اردو کی حفاظت، وسعت اور ترقی کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں خدمات کی ایک اہم کڑی ان کا سہ ماہی رسالہ «مجلس» ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کو اردو کے ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد سے جو وابستگی اور تعلق رہا ہے اس کی روشنی میں اردو مجلس کا یہ اقدام قابل تحسین اور مبارکباد ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہندوستان کی طرف سے نذر عقیدت کے طور پر ایک ایسا مجموعہ پیش کیا جاتا

جس میں ہندوستان کے لکھنے والوں کے تأثرات ہوتے۔

«مجلس» کا یہ خاص نمبر بڑی حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے، اردو مجلس نے نہ صرف یہ کہ اس سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا بلکہ مختلف لوگوں سے جو بابائے اردو سے متاثر تھے مضامین حاصل کرکے یہ نمبر مرتب کیا ہے۔ لکھنے والوں میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، وہ بھی ہیں جو مولانا کے ساتھ عرصہ تک رہے ہیں اور وہ بھی ہیں جن سے سرسری ملاقات رہی ہے، وہ بھی ہیں جو ادبی حیثیت سے ان سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ بھی جو تعلیمی حیثیت سے ان کے شریک تھے عرضیکہ یہ مولانا کی دلچسپ، و دلکش شخصیت اور ان کے متنوع و مختلف کاموں کے مطالعہ کیلئے بنیادی سرمایا کا کام دے سکتا ہے۔ نظم کا حصہ بھی کافی دلچسپ ہے اور مولانا کے خطوط کے نام انشاء کے اس صنف مخصوص سے متعلق اچھے نمونے ہیں، ہم اردو مجلس کو اس خاص اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ اس کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

مقالـــہ نمـا

مرتب:

ڈاکٹر عالی جعفری

معـاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جیاپڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱ اصلاحی امین احسن
تفسیر سورۂ بقر
(میثاق ۶۱ جنوری ۹-۱۶ و ۲۴)
اٹھارویں قسط درج ہے

۲ اصلاحی امین احسن
تفسیر سورۂ بقر
(میثاق ۶۱ فروری ۹-۱۸)
انیسویں قسط درج ہے

۳ اصلاحی امین احسن
تفسیر سورۂ بقر
(میثاق ۶۱ مارچ ۹-۲۰)
بیسویں قسط درج ہے

۴ اصلاحی امین احسن
سفر حج، جدّہ میں
(میثاق ۶۱ جنوری ۴۱-۴۶)
سفر حج کی روداد کا وہ حصہ ہے جس میں جدہ کے سلسلے میں پیش آئے ہوئے تجربات، احساسات و تأثرات کا بیان ہے

5 اصلاحی امین احسن
سفر حج جدّہ سے مکّہ معظمہ
(میثاق ۶۱ فروری ۴۹-۵۶ و ۴۴)
جدہ سے مکہ معظمہ تک کے سفر کے تجربات، مشاہدات اور تأثرات کا بیان ہے

۶ اصلاحی ضیاء الدین
امام ابو داؤد اور ان کی سنن
(معارف ۶۱ جنوری ۳۸-۵۷)
(۱) مشہور عالم و محدث حضرت ابو داؤد سلیمان (۲۰۲-۲۷۵ھ) کے وطن، تعلیم اور کمالات علمی کا مختصر ذکر (باقی)

۷ اصلاحی ضیاء الدین
امام ابو داؤد اور ان کی سنن
(معارف ۶۱ فروری ۱۲۱-۱۳۸)
(۲) اس قسط میں تصانیف وغیرہ کا تعارف درج ہے

۸ اصلاحی ضیاء الدین
اجتہاد
(معارف ۶۱ مارچ ۱۸۴-۱۹۴)
اجتہاد کی نوعیت و کیفیت بیان کرتے ہوئے موجودہ زمانے میں اس کی ضرورت دکھائی ہے

۹ امام الدین ابو محمد
نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رام پور ۶۱ جنوری ۳۰-۳۸)
چوتھی قسط درج ہے

۱۰ امام الدین ابو محمد
نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(زندگی رام پور ۶۱ فروری ۲۱۔۲۶ و ۶۴)
پانچویں قسط درج ہے

۱۱ امینی محمد تقی
لا مذھبی دور کا پس منظر
(برہان ۶۱ جنوری ۵۔۲۱)
(۱) ہمارے معاشرے کی لا مذھبیت کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے (باقی)

۱۲ چودھری محمد اسماعیل
مسئلہ سود ۔ ایک تجربہ
(ثقافت ۶۱ جنوری ۳۷۔۴۷)
رسالہ تعمیر، راولپنڈی سے نقل شدہ اس مقالہ میں موجودہ نظام معاشیات میں سود اور نفع کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامی نظام معاشیات ہی بہتر ہے اور یہ کہ سود حرام ہے

۱۳ رضوی سید محبوب
زمزم
(برہان ۶۱ مارچ ۱۵۷۔۱۶۷)
زمزم کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں

۱۴ عبد الغفار حسن
تدوین سنت
(میثاق ۶۱ جنوری ۱۷۔۲۳)
(۱) حدیث کے قلم بند کرنے کے سلسلے میں آں حضرت کی حدیث کا مفہوم اور تدوین سنت کی مختصر تاریخ پیش کی ہے

۱۵ عبد الغفار حسن
سنت کا تحریری سرمایا
(میثاق ۶۱ فروری ۱۹۔۳۲)
حدیث کے جمع و ترتیب کا ایک خاکہ پیش کیا ہے

۱۶ عبد الغفار حسن
سنت نبوی اور خلفاء راشدین
(میثاق ۶۱ مارچ ۲۱۔۳۳)
ان روایات کی تشریح کی گئی ہے جن کی بنا پر عام طور پر منکرین سنت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو اپنا ہم نوا اور ہم مسلک قرار دیتے ہیں ضمنی طور پر بعض دوسرے مباحث بھی آ گئے ہیں

۱۷ عبد الحی ڈاکٹر
اسلامی تحریک پر تصوف کا اثر
(ثقافت ۶۱ جنوری ۴۸۔۵۶)
اسلامی تحریک پر بیرونی تصوف کی چھاپ جہاں تہاں ضرور پڑی ہے، مگر اسلام کا اپنا تصوف ہے جو دوسری تصوف کی تحریکوں کی طرح انسان کو بیکار نہیں کر دیتا

۱۸ عثمان شمس نوید
ایک کتاب کا تعارف
(زندگی رام پور ۶۱ مارچ ۳۶۔۴۵)
ڈاکٹر میر ولی الدین کی انگریزی کتاب قرآنی تصوف کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندھی کی ہے

۱۹ عمری انصر جلال الدین
رسول کی ضرورت
(زندگی رام پور ۶۱ جنوری ۳۹۔۵۳)

ہمارے علم اور معلومات کا ذریعہ عقل اور وحی ہے، عقل بہت سی باتیں بتانے سے قاصر ہے یہ باتیں صاحب وحی بتاتا ہے، یوں ہمیں رسول کی ضرورت لازماً ہوتی ہے

۲۰ عمری انصر جلال الدین
اسلام کا شورائی نظام
(میثاق ۶۱ جنوری ۲۵-۴۰)
پانچویں قسط درج ہے

۲۱ عمری انصر جلال الدین
اسلام کا شورائی نظام
(میثاق ۶۱ فروری ۳۳-۴۴)
چھٹی قسط درج ہے۔

۲۲ عمری انصر جلال الدین
اسلام کا شورائی نظام
(میثاق ۶۱ مارچ ۳۴-۴۷)
ساتویں قسط درج ہے

۲۳ غلام مرتضی حافظ
اسلامی فکر میں وحدۃ الوجود کا نظریہ
(معارف ۶۰ جنوری ۲۲-۳۷)
اس عنوان کے ساتھ مقالہ نگار کے ایک مضمون (مارچ ۶۰ع) پر جولائی، اگست اور اکتوبر میں اعتراضات چھپے تھے جن کا بطلان اس مقالہ میں کیا گیا ہے۔

۲۴ فریدی نسیم احمد
تجلیات مجدد الف ثانی مکتوبات کے آئینے میں
(الفرقان ۶۱ جنوری ۱۴-۲۲)
مختلف لوگوں کے نام چار خطوں کی تلخیص و ترجمہ ہے۔ ان میں دعوت، اعمال، فضائل نماز، معارف اور حقوق کا بیان ہے

۲۵ فریدی نسیم احمد
تجلیات مجدد الف ثانی مکتوبات کے آئینے میں
(الفرقان ۶۱ فروری ۲۱-۲۸)
حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادوں کے نام ایک خط میں عقائد کی تفصیل ملتی ہے

۲۶ فریدی نسیم احمد
تجلیات مجدد الف ثانی مکتوبات کے آئینے میں
(الفرقان ۶۱ مارچ ۹-۲۱)
(مسلسل) خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ صاحبزادگان حضرت باقی باللہ کے نام اس خط میں عقائد کا ذکر اور تفصیل ہے

۲۷ قادری سید احمد عروج
دنیا، سفر آخرت کی ایک منزل ہے
(زندگی رامپور ۶۱ فروری ۱۶-۲۰)
انسان کے قیام دنیوی کی وضاحت کی ہے۔

۲۸ قاضی اطہر مبارکپوری
مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا

(معارف ۶۱ جنوری ۶۷-۷۱)
مصحف عثمانی کا نسخہ ڈرہام یونیورسٹی میں ہے۔ اس سے قبل وہ پیٹرس برگ لائبریری میں ۱۹۰۵ع تک تھا۔ ایک روسی عالم عبداللہ الیاس بن احمد شاہ بورعانی قریمی نے اس نسخہ سے سورۂ یٰسین کا فوٹو بلاک چھاپا تھا جس کا ایک نسخہ حاجی احمد غریب (بمبئی) کے کتب خانہ میں ہے۔ آخر میں اس مصحف سے متعلق معلومات درج ہیں۔

۲۹ محمد جعفر شاہ
اطاعت رسول کی حدود
(ثقافت ۶۱ جنوری ۷-۱۹)
رسول کے رسول اور اولی الامر ہونے کی صورت میں اس کے احکام کا ماننا واجب ہے، بشر کی حیثیت سے اس کے مشوروں پر عمل کرنا واجب نہیں

۳۰ محمد جعفر شاہ
اطاعت رسول کے حدود
(ثقافت ۶۱ فروری ۲۲-۲۹)
(۲) دوسری قسط درج ہے

۳۱ محمد عاصم
ارض القرآن کا سفر
(ترجمان القرآن ۶۱ جنوری ۳۰-۴۸)
ساتویں قسط درج ہے

۳۲ محمد عاصم
ارض القرآن کا سفر
(ترجمان القرآن ۶۱ فروری ۲۵-۴۴)
آٹھویں قسط درج ہے

۳۳ محمد عاصم
ارض القرآن کا سفر
(ترجمان القرآن ۶۱ مارچ ۳۷-۴۸)
نویں قسط درج ہے

۳۴ محمد فاروق
مادیت اور روحانیت
(زندگی رام پور ۶۱ مارچ ۲۱-۳۵)
انسانی زندگی میں مادیت اور روحانیت کی نوعیت و کیفیت پر گفتگو کی ہے

۳۵ محمد یوسف
رپورٹ قیم جماعت
(زندگی رام پور ۶۱ فروری ۳۲-۵۹)
جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ دہلی میں ۱۱ نومبر ۱۹۶۰ع کو جماعت اسلامی کی کارگذاریوں کی یہ رپورٹ پیش کی گئی تھی

۳۶ مطلوب حسین
خلافت راشدہ میں فتوحات کے اسباب
(ثقافت ۶۱ فروری ۳۰-۳۶)
مستشرقین نے اسلامی فتوحات کا سبب معاشی عنصر میں دیکھا ہے حالانکہ ان کا اصلی سبب اسلام اور اس کی تعلیم ہے

۳۷ مفتاحی محمد ظفیر الدین
اسلام کا نظام امن و امان
(برہان ۶۱ جنوری ۲۲-۳۳)
(اکتوبر ۱۹۵۹ع سے مسلسل) اسلام

کے نظام امن و امان پر روشنی ڈالتے ہوئے
غیر مسلموں کے سلسلے میں اسلامی طرز
اس کی وضاحت کی ہے (باقی).

۳۸ مفتاحی محمد ظفیر الدین
اسلام کا نظام امن و امان
(برہان ۶۱ فروری ۹۳-۱۰۶)
دوسری قسط درج ہے.

۳۹ مفتاحی محمد ظفیر الدین
اسلام کا نظام امن و امان
(برہان ۶۱ مارچ ۱۳۳-۱۴۹)
(۳) تیسری قسط درج ہے.

۴۰ مودودی ابو الاعلیٰ
تفہیم القرآن، الروم
(ترجمان القرآن ۶۱ جنوری ۱۳-۲۹)
تیسری قسط درج ہے.

۴۱ مودودی ابوالاعلیٰ
تفہیم القرآن، لقمان
(ترجمان القرآن ۶۱، مارچ ۹-۲۸)
(۱) سورۂ لقمان کی تفہیم کی پہلی
قسط درج ہے

۴۲ ندوی حافظ مجیب اللہ
اسلامی قانون اور عرف و عادت
(معارف ۶۱ جنوری ۵-۲۱)
(۳) معارف اکتوبر ۶۰ء سے مسلسل.
اسلامی قانون اور عرف و عادت کے
گہرے تعلق کے سلسلے میں مزید معلومات
فراہم کی ہیں (باقی)

۴۳ ندوی حافظ مجیب اللہ
اسلامی قانون اور عرف و عادت
(معارف ۶۱ فروری ۱۲۰-۱۳۰)
(۴) چوتھی قسط درج ہے

۴۴ ندوی محمد حنیف
فہم قرآن
(ثقافت ۶۱ جنوری ۲۱-۳۵)
دوسری قسط ہے

۴۵ وحید الدین خاں
مومن کی تصویر
(زندگی رام پور ۶۱ جنوری ۱۶-۲۹)
جماعت اسلامی کے اجلاس دہلی
منعقدہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۰ع کو یہ مقالہ
پڑھا گیا تھا اس میں بتایا ہے کہ مومن
کی تصویر، احکام اسلام پر عمل پیرا،
نماز کا پابند اور جہاد کے لئے ساعی
ہونے سے مرتب ہوتی ہے.

۴۶ وحید الدین خاں
سورۂ فجر
(زندگی رام پور ۶۱ فروری ۱۱-۱۵)
سورۂ فجر کا مطالعہ درج ہے

۴۷ وحید الدین خاں
سورۃ القدر
(زندگی رام پور ۱۶ مارچ ۹-۱۱)
سورۃ القدر کا مطالعہ پیش کیا ہے

تذکرہ و سیرت نگاری

۴۸ ادارہ
حضرت ولید بن ولید

شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا ہے۔

۶۶ مومن محی الدین

حکیم ابو الفتح گیلانی اور عہد اکبری

(نگار ۶۱ مارچ ۲۰-۲۵)

عہد اکبری اور حکیم ابو الفتح گیلانی کی شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۶۷ ندوی محمد حنیف

ابن تیمیہ کا تصور صفات

(ثقافت ۶۱ فروری ۶-۲۱)

ابن تیمیہ کے علم و فضل کے پس منظر میں ان کے تصور صفات کی وضاحت کی یہ پہلی قسط ہے

۶۸ نصرؔہ بشیر

ایک کتاب۔ ایک جائزہ

(ماہ نو ۶۱ خاص نمبر ۲۱)

ڈاکٹر آغا اشرف کی کتاب «انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت» پر تبصرہ کیا ہے۔

۶۹ ہاشمی نصیر الدین

مولوی وحید الدین سلیم میری نظر میں

(جام نو کراچی ۶۱ فروری ۱۱-۱۴)

مولوی وحید الدین سلیم کے ورود حیدرآباد اور ملازمت سے ان سے ذاتی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے

تاریخ و سیاسیات

۷۰ زراقی شاہد حسین

انڈونیشیا میں ولندیزی عہد حکومت

(ثقافت ۲۱ فروری ۳۷-۵۸)

انڈونیشیا میں اہل ہالینڈ کے طرز حکومت اور استحصال پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۱ رضوی سید محبوب

بحیرۂ مردار

(برہان ۶۱ فروری ۱۰۷-۱۱۸)

قوم لوط کی تباہی کے بعد ان کا زمینی علاقہ جھیل میں تبدیل ہوگیا اسی کی تفصیل یہاں درج ہے۔

۷۲ سید محمد الحسنی

مغربی تہذیب

(الفرقان ۱۶ مارچ ۳۱-۳۸)

مغربی تہذیب کا نفسیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔

۷۳ صابر عبدہ ابراہیم

مترجم: ابوسعید ندوی

پہلی اسلامی حکومت

(تعمیر انسانیت ۶۱ جنوری ۷-۹)

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے وزراء اور گورنروں کا تذکرہ کیا ہے۔

۷۴ صدیقی عبدالمجید

آندھرا پردیش کا کلچر

(سب رس، ۶۱ جنوری ۷-۱۰)

جغرافیہ اور تاریخ کے پس منظر کے ساتھ آندھرا پردیش کے کلچر سرسری جائزہ لیا ہے۔

۷۵ فارق خورشید احمد
تاریخ الـردۃ
(برہان ۶۱ جنوری ۳۵-۴۴)
پندرہویں قسط درج ہے۔

۷۶ فارق خورشید احمد
تاریخ الـردۃ
(برہان ۶۱ مارچ ۱۵۰-۱۵۶)
سولھویں قسط درج ہے۔

۷۷ فاروقی نثار احمد
مجموعہ مکاتیب حضرت سید احمد بریلوی
(برہان ۶۱ مارچ ۱۷۳-۱۷۸)
کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد، دکن میں حضرت سید احمد شہید بریلوی کے فرامین، رقعات اور مکتوبات کا ایک قلمی نسخہ ہے، ناقص الاخر ہونے کے باعث سال کتابت یا کاتب کا نام معلوم نہیں ہوپاتا، اس میں شاہ اسماعیل اور دوسرے لوگوں کے بھی خط ہیں، یہ ابھی تک نہیں چھپا، خطوں کی فہرست جہاد سید احمد سے متعلق اقتباسات درج ہیں۔

۷۸ قاضی اطہر مبارکپوری
راجہ رہمی اور ہندوستان کے چند دوسرے راجے
(معارف ۶۱ فروری ۸۵-۱۰۲)
(۱) ہندوستان کے چند راجوں کا ذکر ہے جو ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کے قدیم تعلقات کے سلسلے میں مفید ہے۔ (باقی)

۷۹ قاضی اطہر مبارکپوری
راجہ رہمی اور ہندوستان کے چند دوسرے راجے
(معارف ۶۱ مارچ ۱۶۵-۱۸۳)
دوسری قسط ہے۔

۸۰ لیاقت بیگم
شہر حیدرآباد کی بنا اور ترقی قطب شاہی دور میں
(سب رس ۶۱ فروری ۳-۷)
شہر حیدرآباد کی بنیادی تعمیرات سے متعلق تاریخی تفصیلات پیش کی ہیں۔

ادب، تنقید، لسانیات

۸۱ محمد حسن الدین
عہد قطب شاہی میں آبرسانی و آبپاشی کا انتظام
(سب رس ۶۱ فروری ۸-۱۸)
قطب شاہی دور میں گولکنڈہ میں آبرسانی و آبپاشی کے لئے جو انتظامات کئے گئے تھے ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

۸۲ آزاد جگن ناتھ
مولوی عبدالحق، چند تاثرات
(مجلس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۶۵-۱۷۰)
مولوی صاحب سے متعلق چند تاثرات کا ذکر کیا ہے۔

۸۳ آغا حیدر حسین
قطب شاہی تہذیب و تمدن
(سب رس ۶۱ جوری ۳-۶)
قطب شاہی دور کی تہذیب اور تمدن کا خاکہ پیش کیا ہے۔

۸۴ آل احمد سرور
جگر کی شاعری
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ ۵۴۰-۵۵۹)
جگر کی شاعری کی خصوصیات پر مبسوط مقالہ ہے۔

۸۵ احتشام حسین
جگر کی شاعری، موثرات اور محرکات
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ ۴۵۲-۴۵۹)
بتایا گیا ہے کہ جگر کی تخئیل ان کے جذبات، محرکات اور عوامل پر نظر ڈالنے والا ان کی شاعری سے بھی زیادہ لطف اندوز ہوسکے گا کیونکہ شاعر کے نہاںخانۂ دل تک پہنچنا خود اپنی جگہ پر آسودگی بخش ہوتا ہے۔

۸۶ احسان احمد
یاد جگر
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ ۱۱-۲۶)
جگر سے اپنے دوستانہ تعلقات کا اظہار کیا ہے اور ان کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

۸۷ اختر انصاری
حالی اور نیا تنقیدی شعور
(اردو ادب ۶۰ دسمبر ۷۵-۱۰۳)
کلیم الدین احمد سے اختلاف کرتے ہوئے حالیؒ کے تنقیدی شعور کی عظمت اعتراف کیا ہے۔

۸۸ اختر راہی
جشن سی سالۂ «شاعر» کی ایک جھلک
(شاعر ۶۱ فروری ۶۲-۶۵)
ماہنامہ «شاعر» کے جشن سی سالہ کی روداد (باقی)۔

۸۹ اختر راہی
جشن سی سالۂ (شاعر) کی ایک جھلک
(شاعر ۶۱ مارچ، اپریل ۵۰-۵۳)
مضمون کی دوسری قسط ہے (باقی)

۹۰ ادیب سہارنپوری
جگر۔ ایک انسان
(جام نو کراچی ۶۱ جوری ۵۱-۵۵)
جگر سے اپنے ذاتی تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی اخلاقی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

۹۱ اسرار احمد حکیم
اردو کا معمار اعظم
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۵۸-۶۴)
ڈاکٹر عبدالحق کو اردو کے ایک عظیم معمار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۹۲ اسعد گیلانی
اسلامی ادبی تحریک اور کردار کی اہمیت
(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۵۳-۵۶)
اسلامی ادب کے اندر ادیب کے ذاتی

کردار کی اہمیت بیان کی ہے۔

۹۳ اطہر پرویز

ادب کیا ہے؟

(جامعہ ۶۱ فروری ۱۹۰-۱۹۸)

ادب کی تعریف کرتے ہوئے، ادبی تخلیق کے اسباب، اس کے موضوعات اور تحلیقی عمل وغیرہ سے بحث کی ہے۔

۹۴ اقبال سلمان

اخلاقیات غالب

(ماہ نو ۶۱ فروری ۲۰-۲۲)

غالب کے اخلاقی تصورات پر ان کے اشعار کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے۔

۹۵ اکبر علی

ڈاکٹر عبدالحق اور ان کی خدمات

(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۷۵-۱۸۵)

ڈاکٹر عبدالحق کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔

۹۶ اکبر علی خاں

دیوان ناظم میں غالب کا حصہ

(اردو ادب ۶۰ دسمبر ۱۲۶-۱۵۲)

شیخ محمد اکرام کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے دیوان میں غالب کا کلام پایا جاتا ہے۔

۹۷ اکبر علی خان

نقش ہائے رنگ رنگ۔ ایک پہلو

(ماہ نو ۶۱ فروری ۱۴-۱۹)

غالب کے چند نادر فارسی خطوط کا تعارف پیش کیا ہے۔

۹۸ امجد الطاف

ہمارے رومانی انشا پرداز

(ہندوستانی ادب، ۶۱ جنوری، فروری ۵۷-۶۳)

شرر، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری، بشیر احمد اور دیگر رومانی انشا پردازوں کے انداز نگارش کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارے رومانی مضمون نگاروں نے ہمارے ادب کو جذباتی تحریرات، اظہار اور فکر و فن میں تقلید سے آزادی اور تازگی بخشی ہے

۹۹ انصاری اسلوب احمد

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری

(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۴-۱۵)

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔

۱۰۰ انصاری محمد رضا

پاک دل، پاک صفات

(آج کل ۶۱ جنوری ۴۳-۴۷)

جگر کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۱ انصاری محمد رضا

ایک معلم اخلاق

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ ۲۶۴-۲۶۸)

جگر کی شخصیت کے اخلاقی پہلو پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

۱۰۲ ایوبی محمد اسحاق

تلوک چند محروم کی سیاسی نظمیں

(صبا ۶۱ مارچ ۱۸-۲۲)

تلوک چند محروم کی سیاسی نظموں
پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔
۱۰۳ بدر عالم
ایک اہم ناول نگار
(قومی زبان ۱٦ جنوری ۳۲-۳۵)
شام اودھ ، رہ و رسم آشنائی اور
ماشے اللہ سے ایم ، اے کے مصنف
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے فن ناول
نگاری پر روشنی ڈالی ہے
۱۰۴ ثمینہ شوکت
مولوی عبدالحق کا اسلوب بیان
(علس حیدر آباد ٦۱ عبدالحق نمبر ۱٦۰-۱٦٤)
مولوی صاحب کے اسلوب بیان پر
روشی ڈالی ہے ۔
۱۰۵ جاوید نہال
ابوطالب کلیم ہمدانی
(جام نو کراچی ٦۱ یوم پاکستان ایڈیشن ۱۱-۱۸)
عہد جہانگیر کے نامور فارسی شاعر
ابوطالب کلیم ہمدانی کی زندگی اور اس
کی شاعری کا تذکرہ ہے ۔
۱۰٦ جعفری رئیس احمد
الندوہ
(ثقافت ٦۱ فروری ۵۹-٦۲)
دارالعلوم الندوہ ، لکھنؤ کے مجلہ الندوہ
نے اردو زبان و ادب کی ناقابل فراموشی
علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے اور
اور اس کی جگہ اب بھی خالی ہے ۔
۱۰۷ جگر
جگر پارے
(چراغ راہ ٦۱ سالنامہ ۱۳۳-۱۳٤)
محمود علی خاں جامعی کے نام دو
اور رشید احمد صدیقی کے نام ایک خط
درج ہے پہلے خط میں جگر کی صاف
دلی اور « گھٹ گئے انسان بڑھ گئے
سائے» والی غزل ہے ۔ دوسرے میں ایک
امانت کی واپسی کا ذکر ہے ۔ تیسرے میں
صدیقی صاحب نیاز محمد خاں صاحب اور
فضلی سے ان کے لگاؤ کا تذکرہ ہے ۔
۱۰۸ جوش ملیح آبادی
دانش گاہِ فکر و قلم
(اردو نامہ ، کراچی ٦۱ فروری ۵-۱۰)
جوش کی وہ تجویز درج ہے جو
انہوں نے اردو کی ترقی اور اہل پاکستان
کی شخصیت و کردار کی تعمیر کے لئے
حکومت پاکستان کو پیش کی تھی۔
۱۰۹ جیلانی کامراں
اردو شاعر دوراہے پر
(ماہ نو ٦۱ خاص نمبر ۲۷-۳۰)
پچھلے دس بارہ سال کی اردو شاعری
اور اس کے رجحانات پر روشنی ڈالی ہے ۔
۱۱۰ حبیب ضیاء
دکنی میں اسم کی فاعلی حالت
(سب رس ، ٦۱ مارچ ۷-۱۰)
دکنی میں علامت فاعل « نے » کا
استعمال فعل متعدی اور فعل لازم دونوں
کے ساتھ ہوتا ہے لیکن فعل بہر صورت

فاعل کے تابع رہتا ہے اس لئے کبھی یہ علامت حذف بھی کر دی جاتی ہے تو کوئی نحوی سقم پیدا نہیں ہوتا .

۱۱۱ حمیدالدین شاہد

اردو میں سائنس کے اولین کارنامے

(اردو نامہ ، کراچی ، ٦١ فروری ۲۷ ـ ۳٤)

سائنس کی اولین مطبوعہ اردو کتابوں کا تعارف کرایا ہے

۱۱۲ حمیدالدین شاہد

اردو نے قدیم اور بابائے اردو

(مجلس حیدرآباد ٦١ عبدالحق نمبر ۷۷ ـ ۸۷)

مولوی عبدالحق نے قدیم اردو سے متعلق جو خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف کیا ہے

۱۱۳ حمید صدیقی

حضرت جگر کے ساتھ

(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ فروری مارچ ۸۹ ـ ۱۱۲)

جگر مرادآبادی سے اپنے ذاتی تعلقات کا اظہار کیا ہے

۱۱٤ حیات‌الله انصاری

کشمیری کے لئے ایک رسم خط

(اردو ادب ، علی گڑھ ، ٦۰ دسمبر ٤۹ ـ ۷٤)

کشمیری زبان کے لئے ایک رسم خط پیش کیا ہے جو اردو سے بنایا ہے اور اسے بہ تفصیل سمجھایا ہے

۱۱۵ خالدی محمد یونس

عشق جگر

(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ فروری مارچ ٤۱۱ ـ ٤۲۰)

کلام جگر سے مثالیں دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یوں تو انھوں نے اساتذہ سخن کا گہرا مطالعہ کیا تھا مگر خواجہ میر درد سے بالخصوص متاثر تھے

۱۱٦ خلیق انجم

مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار

(مجلس حیدرآباد ، ٦١ عبدالحق نمبر ۹۷ ـ ۱۰۳)

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے

۱۱۷ خمار بارہ بنکوی

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ فروری مارچ ۱۲٤ ـ ۱۳۳)

اپنے استاد حضرت جگر سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کیا ہے

۱۱۸ خواجہ مقبول احمد

جگر کی ژرف نگاہی

(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ فروری مارچ ـ۲۳ ـ ۲٤۰)

جگر کے مجموعہ کلام آتش گل کے آئینہ میں ان کے کردار کے جوہر دکھائے گئے ہیں

۱۱۹ داس گپتا ، ایس ـ بی

مترجمہ اعزاز افضل

جدید بنگلہ ادب

(شاعر ، ٦١ مارچ ـ اپریل ۱۱ ـ ۱۲)

پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے بنگلہ کے ادبی رجحانات کا سرسری جائزہ لیا ہے

۱۲۰

نمائش رسائل و اخبارات

(شاعر ، ٦١ مارچ - اپریل ٥٥ - ٧١)
حشنِ سی سالہ ماہنامہ شاعر کے سلسلے میں حدید و قدیم اردو رسائل و احبارات کی ایک نمائش مرتب کی گئی تھی . ان تمام احبارات و رسائل کی فہرست مع دیگر تفصیلات کے اور مشہور ادیبوں کی آراء کے ساتھ درج ہے

۱۲۱ دلدار حسین خان

پدماوت اردو

(آج کل ٦١ مارچ ٤ - ١)
مثنوی «پدماوت اردو» تبصرہ کیا ہے .

۱۲۲ راج بہادر گوڑ

« چراغ منزل » کا شاعر

(صبا ٦١ مارچ ٢٦ - ٣٠)
شاہد صدیقی کی شاعری پر ان کے مجموعہ کلام « چراغِ منزل » کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے .

۱۲۳ رار مرادآبادی

مکتوب راز

(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ فروری مارچ ٢٧ - ٣٨)
ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کے نام ایک خط میں جگر کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے .

۱۲۴ راہی شعیب

شکیلہ اختر بحیثیت افسانہ نگار

(اشارہ پٹنہ ٦١ مارچ ٥ - ١٢)
مشہور اردو افسانہ نگار خاتون شکیلہ اختر کے فن افسانہ نگاری کے پس منظر کو ابھارا گیا ہے .

۱۲۵ رحیم الدین کمال

اردو تہذیب کی تعمیر و ترقی میں
مولوی عبد الحق صاحب کا حصہ

(مجلس حیدرآباد ٦١ عبدالحق نمبر ٤٢ - ٥٢)
مولوی عبدالحق نے اردو تہذیب کی تعمیر و ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کی نشاندہی کی ہے .

۱۲۶ ررمی شریف

ہیگو کے میاں جی

(جام نو کراچی ٦١ جوری ٦٥ - ٦٨)
جگر کے ایک ان پڑھ مگر مخلص دوست عبدالستار عرف ہیگو پہلوان کانپوری کے مراسم کا تذکرہ ہے .

۱۲۷ رضوی سراج

حدا کی بستی

(چراغ راہ ٦١ سالنامہ ٩١ - ٩٩)
شوکت صدیقی کے اس ناول پر پاکستان آدم جی انعام ملا ہے چنانچہ اس ناول پر بہ اعتبار موضوع ، بہ اعتبار فن اور بہ اعتبار زبان تبصرہ کیا اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے .

۱۲۸ رفعت نواز

جیلانی بانو کے افسانے

(شاعر بمبئی ، ٦١ فروری ٢٤ - ٢٧)
جیلانی بانو کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ جیلانی بانو کا اجتماعی بہبود اور انسان دوستی کا شعور پختہ ہے .

۱۲۹ رفیعہ سلطانہ
ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے
(علس حیدرآباد ٦١ عبدالحق نمبر ١٢٠۔١٢٤)
ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۳۰ رونق نعیم
سید حرمت الاکرام اور ان کی غزلیں
(شاعر بمبئی ٦١ جنوری ٢٨۔٣٨)
سید حرمت الاکرام کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ھے۔

۱۳۱ زور محی الدین قادری
مولوی عبد الحق صاحب
(علس حیدرآباد ٦١ عبدالحق نمبر ١٣٩۔١٤٢)
مولوی صاحب کی زندگی کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

۱۳۲ زیدی علی جواد
جگر — ایک تأثر
(فروغ اردو (جگر نمبر) ٦١ فروری ، مارچ ١٥٢۔١٦٨)
جگر کو بحیثیت انسان پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۳۳ زینت ساجدہ
امیر خسرو
(صبا ٦١ جنوری، فروری ٧۔١١)
امیر خسرو کی حیات اور کارناموں پر سیر حاصل اظہار خیال کیا ہے۔

۱۳۴ زینت ساجدہ
محمد قلی اور اس کی شاعری
(سب رس ٦١ جنوری ١١۔١٣)
محمد قلی کی شاعری اس دور کی حقیقی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے حسن میں سرشار جوانی، بھر پور جذبات اور ان جذبات کی تسکین ملتی ہے۔

۱۳۵ ساجد علی
مولوی عبد الحق صاحب اور تعلیمات
(علس حیدرآباد ٦١ عبدالحق نمبر ١٤٣۔١٥٠)
مولوی عبد الحق کی تعلیمی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۳۶ سخاوت مرزا
دیوان سید شاہ حسینی پیر بیجاپوری
(اردو ادب ٦٠ دسمبر ٣٧۔٤٨)
سید شاہ حسینی کے شجرۂ نسب اور تاریخ ولادت کا بہ تحقیق تعین کرتے ہوئے ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے ، جو ہمعصر شعراء ولی و مظہر جان جاناں وغیرہ کی طرز پر ہے۔

۱۳۷ سروری عبد القادر
مولوی عبد الحق — میرے تاثرات
(علس حیدرآباد ٦١ عبد الحق نمبر ٥٣۔٥٥)
مولوی عبد الحق سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات پیش کئے ہیں۔

۱۳۸ سعید احمد
جگر کا غزل پر احسان
(فروغ اردو جگر نمبر ٦١ مارچ ١٧١۔١٨٠)
جگر کے تغزل کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

۱۳۹ سلام مچھلی شہری

میرا خیال ہے!

(قومی زبان کراچی ۶۱ فروری ۹-۱۱)

مسلسل عنوان « میرا خیال ہے » کے تحت سروجنی نائیڈو بلبل ہند کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔

۱۴۰ سلطان اشرف

حسرت شملوی ـ شخصیت اور شاعری

(نگار ۶۱ مارچ ۳۸-۴۴)

حسرت کی شخصیت اور شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔

۱۴۱ سلیم اختر

جاپانی شاعری

(ادب لطیف ۶۱ فروری ۲۱-۲۴)

جاپانی شاعری کی قدامت، اقسام اور خصوصیات کا سرسری تعارف کرایا ہے۔

۱۴۲ سہیل عظیم آبادی

بابائے اردو

(علم حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۲۵-۱۳۳)

بابائے اردو پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۱۴۳ سوامی ناتھم

جگر مرادآبادی

(فروغ اردو (جگر نمبر) ۶۱ فروری، مارچ ۱۳۴-۱۴۳)

انتہائی والہانہ انداز میں جگر کی شخصیت اور ان کے کلام سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔

۱۴۴ سید عبد اللہ

خیالاتِ اکبر پر ایک تحریر

(ادب لطیف ۶۱ مارچ ۷-۱۱)

اکبر سرسید کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ اکثر مذہب کے علاوہ مشرقیت اور ملکی آداب و اطوار کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں جو غلط ہے۔ تعلیم سے متعلق اکبر کے خیالات صحیح تھے۔

۱۴۵ سید محمد

« بیسویں صدی کا سرسید »

(علم حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۲۶-۳۲)

ڈاکٹر عبدالحق کو بیسویں صدی کے سرسید کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۱۴۶ سیدہ جعفر

عبدالحق کے تنقیدی تصورات

(علم حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۵۱-۱۵۷)

ڈاکٹر عبدالحق کے تنقیدی تصورات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۷ سیفی محمد عمر

جگر کا تغزل

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۱۰۰-۱۰۸)

جگر کی غزلیہ شاعری کی نوعیت و کیفیت دکھائی ہے۔

۱۴۸ شاد سلطانپوری

کاشانۂ اصغر کی ایک شام

(فروغ اردو (جگر نمبر) ۶۱ فروری، مارچ ۴۷-۵۲)

جگر کی ایک صحبت شعر و سخن کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔

۱۴۹ شان الحق حقی

اردو الفاظ کی رومن املا
(اردو نامہ ۶۱ فروری ۴۴-۵۰)
اردو الفاظ کی رومن املا سے متعلق اصول و قواعد متعین کئے ہیں .

۱۵۰ شروانی ہارون خاں
ڈاکٹر عبدالحق
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۳۷-۴۱)
مولوی عبدالحق کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے .

۱۵۱ شریف رزمی
جگر ایک عظیم شخصیت
(جام نو کراچی ۶۱ جنوری ۱۳-۱۸)
جگر مرادآبادی کے سوانحی حالات مجملاً پیش کئے گئے ہیں .

۱۵۲ شکیل الرحمن
انگارے - نئی روایت
(صبح نو پٹنہ ۶۱ مارچ ۱۰-۱۲)
ترقی پسند مصنفین کے افسانوں کے مجموعے « انگارے » کی ادبی و تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا ہے .

۱۵۳ صابرہ شاہ آبادی
زیر لب
(شاعر ۶۱ جنوری ۱۵-۱۸)
مرحومہ صفیہ اختر کے مجموعۂ خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے مرحومہ کی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے .

۱۵۴ صالحہ عابد حسین
ادیب پڑھنے والوں سے کیا چاہتا ہے
(جامعہ ۶۱ فروری ۲۱۲-۲۱۵)
بتایا گیا ہے کہ ادبی مطالعہ کا ذوق اور ادیب کے محسوسات سے ہم آہنگی ہی قاری کا بہترین تحفہ ہے جو وہ ادیب کو پیش کرسکتا ہے

۱۵۵ صدیق حسن کڑوی
جگر
(فروغ اردو (جگر نمبر) ۶۱ فروری ، مارچ ۱۱۳-۱۲۳)
جگر کی زندگی چند اہم واقعات کا تذکرہ کیا ہے .

۱۵۶ صدیقی اکبرالدین
کلام قطب شاہ پر ایک سرسری نظر
(سب رس ، ۶۱ مارچ ۳-۶)
محمد قلی قطب شاہ کے « کلیات معانی » کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ آج چار سو سال کے بعد بھی ان کا کلام اچھوتے خیالات اور انوکھے اندازِ بیان کی وجہ سے ممتاز ہے .

۱۵۷ صدیقی حبیب احمد
کلام غالب کا انتخاب جو خود غالب نے کیا
(اردو ادب ، ۶۰ دسمبر ۱۰۴-۱۲۵)
غالب نے اپنے کلام کا انتخاب سنہ ۱۸۶۶ع میں والی ریاست رام پور کی فرمائش پر کیا تھا ، مضمون نگار نے اس انتخاب پر بہ تفصیل تبصرہ کیا ہے .

۱۵۸ صدیقی حبیب احمد
جگر صاحب اور ان کی شاعری

(آج کل ۶۱ جنوری ۱۰۔۳۰)
جگر کی شخصیت اور شاعری پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

۱۵۹ صدیقی رشید احمد
جگر میری نظر میں
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۵۲۳۔۵۳۹)
جگر کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے

۱۶۰ صدیقی شفاعت علی
داغ جگر
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۴۸۸۔۵۱۹)
جگر کے سانحہ ارتحال پر مختلف ادبا شعرا اور اخبارات کے بیانات کو یکجا کیا ہے۔

۱۶۱ صدیقی شمش الدین
غالب کی تصویر کاری
(ماہ نو ۶۱ فروری ۲۴۔۲۵ و ۳۲)
غالب کی تشبیہوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۶۲ صدیقی ظہیر احمد
جگر کا لب و لہجہ
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ ۳۵۷۔۳۶۶)
جگر کی غزل میں جگر کے انفرادی طرز کو سراہا گیا ہے۔

۱۶۳ صدیقی محمد احمد
جگر کا ذہنی ارتقا
(جام نو کراچی ۶۱جنوری ۴۵۔۵۰)
جگرشخصیت اور فن کاری کا نفسیاتی تجربہ کیا گیا ہے۔

۱۶۴ صدیقی محمد حمیداللہ
نظریۂ پاکستان اور ہمارے تنقید نگار
(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۵۔۱۳)
نظریۂ پاکستان کی وضاحت اور قیام پاکستان کے سلسلے میں ہونے والے مختلف واقعات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان اعتراضات کو بیان اور ان کا جواب دیا ہے جو وقتاً فوقتاً ان پر وارد ہوتے تھے

۱۶۵ صدیقی محمد عتیق
بغاوت کے اخبارات
(اردو ادب، ۶۰ دسمبر ۲۳۸۔۲۵۹)
سنہ ۱۸۵۷ ع کے اردو اخبارات سے اقتباسات پیش کر کے بتایا ہے کہ اخبارات نے ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دئیے تھے۔

۱۶۶ صدیقی محمد عتیق
قلعۂ معلیٰ سے غالب کے تعلقات
(جامعہ ۶۱ فروری ۱۹۹۔۲۰۶)
اسعد الاخبار اور سراج الاخبار کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب کی شہرت و ناموری کی تعمیر میں ان دو اخبارات کا کیا حصہ تھا۔

۱۶۷ ضمیر علی بدایونی
ادب میں «اشاریت» کی تحریک
(ماہ نو ۶۱ جنوری ۱۶۔۲۱

ادب میں اشاریت اور اس کی اہمیت
پر روشنی ڈالی ہے ۔

۱۶۸ طاہر فاروقی
اردو قصیدہ
(اردو نامہ، ۶۱ فروری ۱۱-۲۶)
اردو قصائد کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۱۶۹ رضوی برق
آزاد شاعری
(شاعر ۶۱ فروری ۱۸-۲۳)
آزاد شاعری کی تشریح کرتے ہوئے
آزاد اردو شاعری کا تاریخی و تنقیدی
جائزہ لیا ہے ۔

۱۷۰ عابد حسین
ادب اور نفسیات
(جامعہ ۶۱ فروری ۱۷۱-۱۷۴)
انسان کو ادب اور نفسیات کا موضوع
قرار دیتے ہوئے ادب میں عملی نفسیات
کے استعمال پر زور دیا ہے ۔

۱۷۱ عابد رضا بیدار
کچھ اردو کے قدیم اخبارات و رسائل
(جامعہ ۶۱ مارچ ۲۳۸ - ۲۴۹)
اردو کے مشہور صحافی بال مکند گپتا
اور میر ناصر علی نیز مولوی ذکاءاللہ کے
چند ایسے مضامین کے اقتباسات ہیں جن
سے اردو صحافت کی تاریخ پر روشنی
پڑتی ہے

۱۷۲ عابد رضا بیدار
ایک جوئے کہستاں کی موج رواں
(صبا ۶۱ مارچ ۱۲ - ۱۷)
نوادرِ اقبال کا تعارف پیش کیا ہے

۱۷۳ عبادت بریلوی
جگر اور جذبۂ عشق
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری ، مارچ ۱۸۱ - ۱۹۰)
مضمون میں بتایا گیا ہے کہ عشق کو
جگر کے تغزل میں بنیادی حیثیت
حاصل ہے

۱۷۴ عباسی اشتیاق احمد
آئی جو ان کی یاد
(فروغ اردو جگر نمبر، ۶۱ فروری، مارچ ۳۹ - ۴۶)
جگر سے اپنے تعارف اور قربت کا
ذکر کیا ہے

۱۷۵ عبدالاحد خان خلیل
جگر کا طریقۂ حسن و تغزل
(فروغ اردو جگر نمبر ، ۶۱ فروری ، مارچ ۴۲۱- ۴۲۲)
جگر کے کلام کی خصوصیات پر
تبصرہ ہے

۱۷۶ عبدالمغنی
جدید اردو تنقید
(اردو ادب ، ۶۰ دسمبر ۱۵۳ - ۱۶۸)
جدید اردو تنقید کا جائزہ لیا ہے اور
مختلف ناقدوں کی تنقید نگاری پر تبصرہ
کیا ہے

۱۷۷ عبدالواحد ابو ظفر
مثالی شخصیت - مولوی عبدالحق
(مجلس حیدرآباد ، ۶۱ عبدالحق نمبر ۸۸- ۹۰)
ڈاکٹر عبدالحق کو مثالی شخصیت کی

حیثیت سے پیش کیا ہے

۱۷۸ عثمانی ابوذر

اکبر اور مسئلہ زبان

(اشارہ پٹنہ، ۶۱ مارچ ۱۳ ـ ۱۷)

لسان العصر اکبرالہ آبادی کے تصورات زبان سے متعلق پیش کئے گئے ہیں

۱۷۹ عرش ملسیانی

جگر ـ ذاتی تاثرات

(آجکل، ۶۱ جنوری ۳۱ ـ ۳۸)

جگر کی شخصیت اور شاعری سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے

۱۸۰ عرشی محمد حسین

مرزا غالب کی فارسی شاعری

(نگار ، ۶۱ مارچ ۱۴ ـ ۱۹)

غالب کی فارسی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے

۱۸۱ عطا محمد شعلہ

جگر کی شاعری میں تصور محبوب

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ مارچ ۲۴۶ـ۲۵۳)

جگر کے کلام کو آئینہ بنا کر ان کے محبوب کے حد و حال کو نمایاں کیا گیا ہے .

۱۸۲ علام حسین ذو الفقار

اکبر اور قومی تہذیب و معاشرت

(ادب لطیف ۶۱ فروری ۵ـ۲۰)

اکبر مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کے خلاف تھے اور مذہب سے متعلق بنیادی اصول و مسلمات پر ثابت قدم رہتے ہوئے تہذیب و معاشرت کے فروعی امور و معاملات میں تبدیلی کے لئے تیار تھے .

۱۸۳ علام ربانی

اردو افعال

(اردو ادب ۶۰ دسمبر ۲۰۴ـ۲۲۰)

اردو افعال کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ان کے مادوں سے متعلق بحث کی ہے .

۱۸۴ علام ربانی

عظیم انسان

(مجلس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۶ـ۲۵)

ڈاکٹر عبد الحق کو عظیم انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے .

۱۸۵ علام یزدانی

مولانا عبد الحق

(مجلس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۴ـ۱۵)

مولوی عبد الحق کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے .

۱۸۶ فاروقی نثار احمد

غالب نما

(برہان ۶۱ جنوری ۵)

(برہان دہلی : فروری و اپریل ۱۹۶۰ع اور تحریک دہلی ؛ مارچ ۱۹۶۰ ع سے مسلسل) . اس قسط میں ۶۸۳ سے لے کر ۸۷۰ تک کے اندراجات شامل ہیں .

۱۸۷ فاروقی نثار احمد

مولوی عبد الحق کا اسلوب

(علس حیدرآباد ٦١ عبدالحق سبر ١٠٤-١١١)
مولوی عبدالحق کے اسلوب نگارش
پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔
۱۸۸ فاروقی نثار احمد
مثنوی دریائے عشق
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ٦١ جنوری، فروری ٩-١٤)
میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق
پر تنقید کرتے ہوئے مصحفی کی مثنوی
« بحر المحبت » پر اسے ترجیح دی ہے۔
۱۸۹ فاطمی انجم
اردو میں آزاد شاعری کا وجود
(شاعر ٦١ جنوری ٢٣-٢٨)
میراجی، ن۔ م۔ راشد، سردار جعفری
اور فیض احمد فیض کی آزاد شاعری کا
سرسری جائزہ لیا ہے۔
۱۹۰ فاطمی انجم
جدید اردو شاعری
(صبح نو ٦١ فروری ١٧-٢٣)
جدید اردو شاعری کے محاسن و معائب
کا جائزہ لیا گیا ہے۔
۱۹۱ فرمان فتحپوری
جرأت کی غیر مطبوعہ مثنوی
(نگار ٦١ مارچ ٢٦-٣٢)
جرأت کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی
کا تعارف پیش کیا ہے۔
۱۹۲ فروغ احمد
اسلامی ادب کی تحریک کا ایک
تاریخی جائزہ

(چراغ راہ ٦١ سالنامہ ٤٦-٥٢)
اسلامی نقطۂ نظر سے اردو ادب پر
ایک نگاہ ڈالتے ہوئے ۱۹۴۷ ع کے
ارد گرد سے باقاعدہ لکھے جانے والے
اسلامی ادب کا ایک تاریخی جائزہ پیش
کیا ہے۔
۱۹۳ فضل علی
تلگو شاعر ویما
(صبا ٦١ مارچ ٢٣-٢٥)
تلگو شاعر ویما کا تعارف پیش کیا
ہے۔
۱۹۴ فضلی فضل کریم احمد
(چراغ راہ ٦١ سالنامہ ١١٩-١٢٥)
جگر کی زندگی اور کلام سے متعلق
ادارۂ چراغ راہ نے پانچ سوالات پوچھے
تھے جو جوابات کے ساتھ درج ہیں۔
۱۹۵ قاضی عبد الودود
دیوان قصائد مصحفی
(شاعر ٦١ فروری ١٣-١٧)
دیوان قصائد مصحفی کے نسخۂ رامپور
کی ایک نقل کا تفصیلی تعارف پیش کیا
ہے۔
۱۹۶ قدرت نقوی
غالب اور سرسید
(ماہ نو ٦١ فروری ٨-١٣)
غالب اور سرسید کے تعلقات پر
پر اظہار خیال کیا ہے۔
۱۹۷ قریشی اللہ بخش

اقبال کا نظریۂ زندگی
(فیض الاسلام ۶۱ مارچ ۳۳ـ۴۴ و ۶۴)
اقبال کا نظریۂ زندگی خالص اسلامی ہے۔

۱۹۸ قریشی حفظ الکبیر
ہمارا موجودہ ادب اور زبان
(صبح نو ۶۱ فروری ۲۴ـ۲۷)
موجودہ ادب اور زبان کی کمزوریوں اور خامیوں کا بیان ہے۔

۱۹۹ قریشی حفظ الکبیر
اقبال متین اور اس کا فن
(صبا ۶۱ مارچ ۳۳ـ۳۶)
اقبال متین کی شخصیت اور فن پر اپنی رائے پیش کی ہے۔

۲۰۰ قطب النسا ہاشمی
بابائے اردو ـــ ایک تاثر
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۶۵ـ۶۸)
بابائے اردو پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۲۰۱ قیسی الفاروقی
حیات جگر کا ایک باب
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۵۳ـ۸۴)
جگر نے خود اپنے کلام پر وقتاً فوقتاً اصلاحیں دی ہیں ان پر بہت ہی معلومات افروز تبصرہ ہے۔

۲۰۲ قیصر تمکین
روح عصر ـ جگر کے کلام میں
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۲۷۷ـ۲۸۸)
جگر کے کلام کے سیاسی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے زمانے کی تحریکات کا علم رکھتے تھے اور ان سے متاثر تھے۔

۲۰۳ کاظمی حسین
گلچیں معانی
(صبا ۶۱ جنوری، فروری ۳۷ـ۴۶)
تہران کے مشہور شاعر آقائی احمد گلچیں معانی کی شخصیت اور شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔

۲۰۴ کرامت علی کرامت
امجد نجمی اڑیسہ کا ایک عظیم شاعر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جنوری ۱۵ـ۲۳)
اڑیسہ کے مشہور اردو شاعر امجد نجمی کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۰۵ گوپی ناتھ امن
جگر مرادآبادی
(آج کل ۶۱ جنوری ۴۰ـ۴۱)
جگر سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات پیش کئے ہیں۔

۲۰۶ گوہر نوشاہی
اشرف فاروقی
(قومی زبان ۶۱ جنوری ۴۱ـ۴۳)
میرزا محمد رفیع سودا کے ایک معاصر اشرف فاروقی کا تذکرہ ہے۔

۲۰۷ ماہر القادری
جگر کی زندگی کا ایک روپ
(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۱۲۶ـ۲۹)
جگر کی زندگی کے بعض پر لطف

واقعات بیان کئے ہیں۔

۲۰۸ مبارز الدین رفعت
بابائے اردو
(علمی حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۳۳-۳۶)
بابائے اردو عبدالحق کے ادبی مرتبہ پر اظہار خیال ہے۔

۲۰۹ مجنوں گورکھپوری
بابا طاہر عریاں
(آج کل ۶۱ فروری ۳۲-۴۲)
بابا طاہر عریاں سے متعلق اپنی معلومات پیش کی ہیں۔

۲۱۰ مجنوں گورکھپوری
پردیسی کے خطوط
(سویرا ۶۰ خاص نمبر ۷-۲۸)
بیدل کے سلسلے میں اپنے خیالات مفصل بیان کئے ہیں۔

۲۱۱ مجنوں گورکھپوری
حکیمانہ و فاضلانہ اسلوب
(صبا ۶۱ مارچ ۷-۱۱)
حکیمانہ اور فاضلانہ اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے، اردو ادب میں اسکی کمی کا احساس دلایا ہے۔

۲۱۲ محمد احسن فاروقی
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں
(قومی زبان ۶۱ فروری ۱۸-۲۰)
اپنی ناول نگاری کو موضوع بحث بناتے ہوئے اردو افسانوں اور ناولوں کے قارئین سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اچھے ناول پڑھنے کا صحیح مذاق پیدا کریں۔

۲۱۳ محمد ادریس
ٹالسٹائی - ایک تعارف
(جامعہ ۶۱ مارچ ۲۵۰-۲۶۲)
کاونٹ لیو ٹالسٹائی کے مختصر سوانح کو پس منظر بنا کر اس کی مشہور کہانیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۲۱۴ محمد اسمٰعیل
پیام ساوتری
(اردو ادب ۶۰ دسمبر ۲۲۱-۲۳۷)
جگر بریلوی کی تصنیف پیام ساوتری سے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ مثنوی اردو ادب کے لئے ایک غیر فانی شاہکار ہے۔

۲۱۵ محمد حسین
جگر کی شاعری
(جام نو کراچی ۶۱ جنوری ۱۹-۲۷)
جگر کی شاعری خصوصاً ان کی غزل گوئی کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۱۶ محمد حسین شمس
جگر کی شاعری میں تصوف
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۴۶۰-۴۶۵)
مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے کہ درد اور اصغر سے متاثر ہوکر جگر کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی پیدا ہوگیا

۲۱۷ محمد عظیم
جگر کی حیات معاشقہ کا ایک ورق

(نگار ۶۱ مارچ ۳۳۔۳۷)

جگر کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۱۸ محمد عقیل

جگر اور جدید غزل

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۱۹۷۔۲۱۲)

جگر کے تغزل کے عوامل کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۱۹ محمود الحسن

شوقی۔ جدید عربی ادب کا ممتاز شاعر

(معارف ۶۱ مارچ ۱۹۵)

جدید عربی ادب کے ممتاز شاعر شوقی کی زندگی کے حالات اور اسکی شاعری کا تعارف درج ہے۔

۲۲۰ محمود علی خاں

دار الکھلا

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۱۳۰۔۱۳۲)

جگر مرادآبادی کے ایک دفعہ کے قیام بھوپال میں دوست احباب نے رات کے ۹ بجے سے تین بجے تک کی طویل نشستوں کے سبب ایک انجمن کھلا ساتی تھی، اسی کا ذکر یہاں ملتا ہے۔

۲۲۱ محمود علی خاں

جگر صاحب

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۱۰۹۔۱۱۸)

جگر کی عام اور شعری زندگی، شراب عشق اور اوامر و نواہی پر ان کے عمل کے سلسلے میں اپنے خیالات بیان کئے ہیں۔

۲۲۲ محمود فاروقی

قرۃ العین حیدر کے دو کردار

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۷۱۔۹۰)

آگ کے دریا کے دوسو صفحات کا تأثراتی جائزہ قلم بند کیا ہے۔

۲۲۳ محمود نقوی

نقد بر نقد

(فروغ اردو ۶۱ جنوری ۱۷۔۳۰)

جوش ملیح آبادی کی نظم «بھری برسات» پر حسرت نیاز فتح پوری کی تنقید پر دوبارہ تنقید ہے۔

۲۲۴ محمود واحد

شاہین۔ ایک تعارف، ایک مطالعہ

(شاعر، بمبئی ۶۱ مارچ، اپریل ۱۳۔۱۶)

شاہین عارپوری اور ان کے کلام کا تعارف کرایا ہے۔

۲۲۵ مراد علی طالع

شیر محمد خان ایماں

(سب رس ۶۱ مارچ ۱۱۔۱۳)

آصف جاہ ثانی کے درباری شاعر میر و سودا کے ہم عصر اور دکن کے مسلم الثبوت استاد سخن تھے، وہ پہلے حیدرآبادی شاعر ہیں جنھوں نے شمالی ہند کی زبان میں اپنا شاعرانہ کمال منوایا۔

۲۲۶ مرتضی حسین

خواجہ غلام غوث بے خبر

(آج کل ۶۱ فروری ۱۳۔۱۴)

خواجہ غلام غوث بے خبر کی اور

ادبی کارناموں کا تعارف پیش کیا ہے

۲۲۷ مسعود جاوید

افسانوی ادب اور نظریۂ پاکستان

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۱۴-۱۹)

اسلامی ادب کے نقطۂ نظر سے پاکستان کے افسانوی ادب « اردو » کا جائزہ لیتے ہوئے اسکی کوتاہیوں کی نشاندھی کی ہے۔

۲۲۸ مظہر علی سید

ڈرامے کا فن

(سویرا ۶۰ خاص نمبر ۲۹-۳۷)

ڈرامے کے فن پر تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے اردو ادب میں اسکی کمی کا احساس دلایا ہے۔

۲۲۹ مفتوں کوٹوی

جگر مرحوم کی وطن پرستی

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۲۸۹-۳۰۴)

جگر کے کردار کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے

۲۳۰ ممتاز حسین

غالب کی ایک تہذیبی قوت

(ماہ نو ۶۱ فروری ۶-۷)

انیسویں صدی کے ہندوستان میں غالب کو ایک تہذیبی قوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۲۳۱ منظر سلیم

جگر ــــ ایک انجمن، ایک تحریک

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۲۶۹-۲۷۶)

جگر کی وسیع النظری، فراخ دلی اور انسانیت دوستی کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۳۲ مہ جبیں انور

مولانا ابو الکلام آزاد

(صبح نو ۶۱ مارچ ۱۹-۲۱)

ابو الکلام آزاد کی شخصیت کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

۲۳۳ مہر محمد خان شہاب

کچھ داغ سے متعلق

(شاعر ۶۱ جنوری ۱۹-۲۲)

جناب تمکین کاظمی کی کتاب «داغ» پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض نکات پر مؤلف کے خیالات سے اختلاف کا اظہار کیا ہے

۲۳۴ نادم سیتا پوری

غالب کا ایک چہیتا شاگرد

(آجکل ۶۱ فروری ۳)

غالب کے ایک شاگرد حافظ محمد حسین بسمل پر اپنے معلومات پیش کی ہیں۔

۲۳۵ نارنگ گوپی چند

نارس ـ دیارِ دلبراں

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۶۱ جنوری، فروری ۲۸-۳۱)

نارس سے متعلق راسخ عظیم آبادی کی مثنوی « کششِ عشق » کا خلاصہ پیش کیا ہے نیز بتایا ہے کہ اردو کے ادیب و شعراء نے نارس کے حسن و جمال کو کس طرح بیان کیا ہے۔

۲۳۶ ناظر کاکوروی

جگر کی انفرادیت

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۲۲۱-۲۳۶)

مضمون میں اس نکتہ کو واضح کیا گیا ہے کہ جگر کی رومانیت اور رنگیں بیانی ہی ان کے کلام میں انفرادیت کی شان پیدا کردیتی ہے.

۲۳۷ ناہید صدیقی

اقبال کی مسجد قرطبہ

(شاعر ۶۱ مارچ، اپریل ۱۷-۲۰)

اقبال کی نظم « مسجد قرطبہ » پر تنقید

۲۳۸ نجم الاسلام

اردو شاعری میں آزاد اسلامی ریاست کا تصور

(چراغ راہ ۶۱ سالنامہ ۲۰-۴۵)

تاریخی تسلسل کے ساتھ دکھایا ہے کہ ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی آرزو، اس کے عملی جد و جہد اور اس کے تاثرات اردو شاعری میں کس انداز میں نمایاں ہیں.

۲۳۹ ندوی وحید قیصر

شرف الحسینی شرف اور ان کا کلام

(معارف ۶۱ مارچ ۲۱۰-۲۲۱)

سید ابوالفتح محمد شرف الدین الحسینی شرف ۱۲۹۲ ع میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے. اپنے والد اور سید محمد آزاد سے تعلیم حاصل کی. شاعری میں آزاد اور دوسرے اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا. ان کے ہاں لکھنؤ، اور دہلی کی زبان اور طرز فکر ملتی ہے. امیر مینائی اور داغ کے علاوہ غالب کے رنگ میں بھی شعر کہے. گلستان شرف اور دبستان شرف ان کے شعری مجموعے ہیں. پہلا ۱۹۳۷ ع میں چھپا ہے. ۱۹۶۰ ع میں انتقال ہوا. ہر صنف شعر پر قدرت تھی.

۲۴۰ نذیر احمد ڈاکٹر

ہندی کے چند مسلمان شعراء

(معارف ۶۱ جنوری ۵۸-۶۶)

۲ ـ میر عبد الجلیل بلگرامی، غلام نبی سید باقر بلگرامی، سید برکت اللہ عبد الواحد ذوقی، محمد عارف بلگرامی، شاہ کاظم اور ابراہیم عادل شاہ کے مختصر حالات کے ساتھ ان کے ہندی کلام کے نمونے درج ہیں.

۲۴۱ نظر حیدرآبادی

مولوی عبدالحق ـ ایک ادارہ ـ ایک تحریک

(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۵۷ ـ ۱۵۹)

ڈاکٹر عبدالحق کو ایک ادارہ اور تحریک کی صورت میں پیش کیا ہے.

۲۴۲ نقوی احراز

جگر بسوانی

(قومی زبان ۶۱ جنوری ۳۶ ـ ۴۰)

امیر مینائی کے شاگرد حکیم افتخار علی جگر بسوانی مرحوم کے حالات زندگی اور شاعری کا تذکرہ ہے.

۲۴۳ نقوی احراز

جگر کی شاعری کا پس منظر

(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری مارچ، ۳۱۹ ـ ۳۳۶)

جگر کے عہد کے اس ماحول اور فضا کو پیش کیا گیا ہے جس میں ان کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔

۲۴۴ نقوی احراز
انیسویں صدی کے ظریف اخبار
(آجکل ۶۱ مارچ ۴۱ - ۴۶)
انیسویں صدی میں اردو کے چند ظریف اخباروں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

۲۴۵ نقی احمد ارشاد
ہندی کی نشو ونما میں مسلمانوں کا ہاتھ
(شاعر، ۶۱ جنوری ۲۹ - ۳۴)
امیر خسرو، ملک محمد جائسی، مبارک علی مبارک، رس خان، اشرف علی فغاں، راجہ جھاؤ لال، سلطان عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کی ہندی شاعری کا تعارف کرایا ہے۔

۲۴۶ نورانی امیر حسن
غالب کے دو نادر خطوط
یا
«غالب بہ حیثیت اخباری نامہ نگار»
(اردو ادب، ۶۰ دسمبر ۲۹ - ۳۶)
اودھ اخبار سے غالب کے دو خطوط کی نقل پیش کی ہے اور ان کا تعارف کرایا ہے۔

۲۴۷ نیاز فتحپوری
غالب کا طرز شاعری
(نگار، ۶۱ سالنامہ ۴ - ۸)
غالب کے شاعرانہ طرز پر اظہار خیال۔

۲۴۸ نیاز فتحپوری
غالب کی شاعرانہ خصوصیات
(نگار، ۶۱ سالنامہ ۹ - ۲۴)
غالب کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

۲۴۹ نیاز فتحپوری
غالب ولی بادہ خوار
(نگار، ۶۱ سالنامہ ۵۷ - ۶۵)
غالب، بادہ خواری اور اس کی ولایت پر اظہار خیال کیا ہے

۲۵۰ نیاز فتحپوری
غالب کا بہانۂ ازل
(نگار، ۶۱ سالنامہ ۶۶ - ۷۰)
غالب اور دوسرے قدیم فارسی شعرا کے ہم معنی اشعار پیش کرتے ہوئے توارد اور سرقہ پر اظہار خیال کیا ہے۔

۲۵۱ نیاز فتحپوری
غالب کی مثنوی نگاری
(نگار، ۶۱ سالنامہ ۷۱ - ۸۸)
غالب کی دس مثنویوں پر اظہار خیال

۲۵۲ نیاز فتحپوری
غالب کا آہنگ و لب و لہجہ
(نگار ۶۱ سالنامہ ۱۰۳ - ۱۱۰)
غالب کے آہنگ و لب و لہجہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۵۳ وجاہت علی سندیلوی
تجھے اے جگر مبارک یہ شکست فاتحانہ
(فروغ اردو جگر نمبر ۶۱ فروری، مارچ ۲۵۴ - ۲۶۳)
جگر کی شخصیت کے کچھ نقوش ابھارے ہیں۔

۲۵۴ وحید اختر
خورشید الاسلام کی شاعری
(صبا ۶۱ جنوری، فروری ۲۰۔۲۱)
خورشید الاسلام کی شاعری پر اظہار خیال

۲۵۵ وزیر حسن دہلوی
اردو کے بڑے میاں
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۷۰۔۱۷۵)
مولوی عبدالحق کی اردو خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۵۶ وقار خلیل
یوم محمد قلی قطب شاہ کا آنکھوں دیکھا حال
(سب رس ۶۱ جنوری ۱۹۔۲۳)
یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ع کی مختصر روداد

۲۵۷ وشی دھرجی ودیا لنکار
سچا ہیرہ
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۶۹۔۷۶)
مولوی عبدالحق کی شخصیت پر روشی ڈالی ہے۔

۲۵۸ ویریندر پرشاد سکسینہ
جگت موہن لال رواں مرحوم
(ہندوستانی ادب ۶۰ مارچ ۹۔۱۲)
عزیز لکھنؤی کے شاگرد جگت موہن لال رواں کا تعارف اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے

۲۵۹ ہاشمی نصیرالدین
ڈاکٹر مولانا عبدالحق اور دکھنیات
(علس حیدرآباد ۶۱ عبدالحق نمبر ۱۳۴۔۱۳۸)
مولوی عبدالحق نے دکھنی ادب سے متعلق جو خدمات انجام دیئے ہیں ان کا جائزہ پیش کیا ہے۔

تعلیمات

۲۶۰ یوسف بخاری
میر باقر علی داستان گو
(اردو نامہ کراچی ۶۱ فروری ۵۱۔۶۵)
میر باقرعلی اور انکی داستان گوئی کا تعارف کرایا ہے اور انکی مجلسوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

۲۶۱ سلامت اللہ
تعلیم کا منصب
(جامعہ ۶۱ فروری ۱۷۵۔۱۸۲)
تعلیم کی تہذیبی، سماجی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسکی حدود اور امکانات کا تعین کیا گیا ہے۔

۲۶۲ غلام مرتضی حافظ
جدید ہندوستان میں عربی و فارسی کا مستقبل
(معارف ۶۱ مارچ ۲۲۲۔۲۳۱)
نئے ہندوستان میں عربی و فارسی کی تعلیم سے متعلق ایک اسکیم مرتب کی ہے۔

ایڈیٹر : نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ شیعرڈ روڈ ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۲ — اکتوبر ۱۹۶۱ء — شمارہ ۴

شذرات

گذشتہ چند مہینے اردو زبان و ادب کے لئے بہت ہی غمناک ثابت ہوئے ہیں. اردو ایسے تین بزرگوں کی فیض رسانیوں اور ہمت بخش رہنمائیوں سے محروم ہوگئی ہے جو مدرس بھی تھے مصنف بھی، معلّم بھی تھے اور محقق بھی، سراپا علم بھی تھے اور مجسم عمل بھی. وہ اس جماعت کے جس نے سب سے پہلے مشرقی و مغربی علوم و فنون کے سرچشموں سے فیض حاصل کیا شاید آخری رکن تھے. ان میں سے دو بزرگوں نے اپنے زبان و قلم سے اردو کی خدمت کی اور تیسرے نے تو اردو کی زندگی و ترقی کے لئے اپنے جان و مال کی بھی بازی لگا دی.

پروفیسر سید نواب علی کی زندگی تعلیمی دنیا سے شروع ہوئی. پہلے علی گڑھ میں رہے. پھر بڑودہ میں پروفیسر مقرر ہوئے اور وہاں سے سبکدوشی کے بعد ریاست جوناگڈھ کے وزیر تعلیم کی خدمات انجام دیں. پروفیسر مرحوم نے سیرۃ، صحف سماوی اور دوسرے علمی و مذہبی موضوعوں پر ایسی محققانہ کتابیں لکھیں کہ ان میں سے بعض تو یونیورسٹیوں میں شریک نصاب کرلی گئی تھیں. بڑودہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے گجرات کی مشہور و مستند تاریخ «مرآۃ احمدی» کو ایڈٹ کرکے گائکواڑ اورینٹل سیریز میں شائع کیا. شاعری سے بھی ان کو دلچسپی تھی. وہ بڑے خاموش، مخیر اور عملی انسان دوست تھے. راقم الحروف کو بھی ان کے ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل رہی ہے، مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کی سنجیدگی اور وقار میں کبھی فرق نہیں آیا. وہ بڑے ضابط تھے اور بڑے با وضع تھے.

خان بہادر ظفر حسین خاں مرحوم کا تعلق بھی محکمۂ تعلیم سے تھا. وہ ایک اچھے مفکر اور بلند پایہ انشاء پرداز تھے. اپنے سرکاری کاموں کی فرصت کے درمیان وہ علمی کاموں میں منہمک رہتے. ان کی تصانیف کے بلند معیار کا ایک ثبوت یہ بھی کہ ساہتیہ اکیڈمی کا اردو کا پہلا انعام ان کی تصنیف مآل و مشیت کو دیا گیا. دبستان شبلی سے ان کو خاص لگاؤ تھا.

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی موت ایک ناقابل تلافی سانحہ ہے، اور شاید عرصہ تک ایسا مرد اردو پیدا نہ کرسکے گی اور اس زبان کو ایک ایسا

سچا مجاہد جو اس کی راہ میں اپنی جوانی، اپنا بڑھاپا، اپنی صحت، اپنی کمائی اپنا تن من دھن قربان کردے نہ ملیگا۔ اردو سے ان کا یہ عشق ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ ہے اس اثر کا جو انہوں نے سر سید کی صحبت میں اردو کی حفاظت و ترقی کی کوششوں کو دیکھ کرلیا۔ سر سید کی زندگی کے آخری چالیس برس بڑی حد تک اردو کی حفاظت میں گزرے، اور مرنے سے پہلے جو آخری مضمون وہ لکھ رہے تھے وہ اردو کی مدافعت میں تھا، پھر محسن الملک کے زمانے میں اس مسئلہ نے جو تکلیف دہ صورت اختیار کرلی تھی اس کو نزدیک سے دیکھنے والوں میں یہ بھی تھے اور شاید انہیں چیزوں نے ان کو اردو کا سب سے بڑا محافظ مجاہد اور مربی بنا دیا۔ وہ شروع ہی سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے اور جب ۱۹۱۲ع میں وہ انجمن ترقی اردوکے سکریٹری مقرر ہوئے تو اس زمانے کے حالات کے مطابق اردو کے خزانے کو تراجم و تصنیفات کے ذریعہ مالا مال کرنے کا انتظام کیا اور اس طرح دراصل علمی حیثیت سے جامعہ اردو کی بنیاد رکھنا شروع کی، عملی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے تحریک سے لےکر آخر تک بڑی حد تک اس کے روح رواں رہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اردو کی اہمیت دکھانے اور کانفرس کی حلقہ بگوشی سے نجات دلانے کے لئے انجمن ترقی اردو کو ایک مستقل کل ہند ادارہ بنا لیا اور اس کا سب سے پہلا شاندار اجلاس ۱۹۱٦ع میں لکھنؤ کی اسی بارہ دری میں ہوا جس میں چار سال پہلے ۱۹۱۲ع میں سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس کے چند برسوں کے بعد ہی انہوں نے سہ ماہی رسالہ اردو نکالنا شروع کیا۔ جوں جوں اردو کی تحریک بڑھتی گئی ان کا دائرہ عمل بھی وسیع تر ہوتا گیا انجمن کی تصانیف کی تعداد سے اس کے ادبی کارناموں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس میں بھی مختلف حیثیتوں سے وہ شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جوں جوں اردو کی تحریک بڑھتی اور اہم ہوتی گئی ان کا حلقۂ عمل بھی بڑھتا گیا۔ اس انجمن ترقی اردو کی جو مقبرۂ رابعہ دورانی کے محدود احاطہ میں بند تھی، سارے ہندوستان میں شاخوں کا جال بچھ گیا۔ اور پھر اردو کے متعلق جو مسئلہ بھی پیدا ہوا اس کے حل و نظم میں ڈاکٹر عبدالحق سب سے آگے سینہ سپر تھے۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر تقسیم کے پہلے فضا بہت زیادہ مسموم نہ ہوگئی

ہوتی تو اردو کا مستقبل اس ملک میں کافی محفوظ ، مستحکم اور متعین ہوچکا ہوتا . اس کا اندازہ اس لغت کی جو اب نا پید ہو گیا ہے ، ترتیب و تکمیل سے ہوسکتا ہے جو مولانا نے راجندر عبدالحق معاہدہ کے بعد مرتب کیا تھا . تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے گئے ، ان کی زندگی کے چند آخری برسوں نے ان کو بڑی حد تک مایوس کر دیا تھا اور اگر موجودہ حکومت کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو معلوم نہیں ان کا کیا خال ہوتا. اس مایوسی نے ان کی بیمارئی دل کو نا سور جگر کی شکل دے دی اور ان کا کام تمام کردیا .

. مولانا کی زندگی ایک دردمند انسان ، ایک شفیق معلم ، ایک ژرف نگاہ محقق ، ایک دبستانِ انشاء کے بانی اور ایک نڈر مجاہد کی حیثیت سے ایک مثالی زندگی ہے . مجھے بھی اس مجاہد اردو کے زیر علم عرصہ تک کام کرنے کی عزت حاصل رہی ہے - اس مجاہد اعظم نے اپنی عمر اردو کی حفاظت کے جہاد میں گزار دی - وہ تھک چکا تھا اور اب اسے ابدی آرام کی ضرورت تھی - ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس ایثار و قربانی اور علم و عمل کی معزز ہستی کی پیروی کریں .

اللہ تعالیٰ ان تینوں بزرگوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے .

اسلامی تاریخ سے متعلق عموماً اور ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سے متعلق یورپی اور دوسرے مورخوں نے جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں . ان کی اصلاح و تصحیح کے لئے مولانا شبلی رح نے ندوۃالعلماء میں ایک شعبہ اس مقصد کے لئے قائم کیا تھا - مولانا سید سلیمان ندوی رح اس کے پہلے ناظم تھے لیکن مولانا شبلی کی ندوہ کی نظامت سے علیحدگی اور پھر قبل از وقت وفات نے اس کام کوانجام نہ ہونے دیا ، اب ان کے لائق جانشینوں نے جن میں الحاج مولوی ابوالحسن علی ندوی بھی ہیں « مجلس تحقیقات و نشریات اسلام » کے نام سے ایک علمی ادارہ دارالعلوم ندوۃالعلماء میں قائم کیا ہے . ہم کو امید ہے کہ یہ ادارہ تحقیقاتی کاموں کے لئے ایک مثالی ادارہ ہوگا اور ان تعلقات کی روشنی میں جو مولوی صاحب موصوف کو اسلامی ممالک کے علمی حلقوں سے ہیں ، وہ زیادہ بہتر و وسیع تر کام کرسکے گا .

صمدر آہ*

امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر

امیر خسرو کی ہندی شاعری

امیر خسرو کی فارسی شاعری کا جو احترام اور وقار ہے ان کی ہندی شاعری کی عزت اس سے کسی طرح کم نہیں. ان کا ہندی کلام ہمارے قومی شعر و ادب کا نقش اول ہے. اردو، ہندی، ہندوستانی یا کوڑی بولی کی پہلی جھلک ہمیں خسرو ہی کی ہندی شاعری میں نظر آتی ہے.

خسرو سے تقریباً سو سال قبل ایک شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸ ھ سے ۵۱۵ ھ تک) ہوئے ہیں. پہلے تو شاہی دربار سے متعلق رہے، اسکے بعد چالیس سال کی عمر میں کسی سیاسی جرم میں ماخوذ ہوئے اور ۱۹ سال تک قید خانے میں رہے. قید ہونے سے قبل اور قید کے دوران میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے.

خسرو نے اپنے دیوان غرۃالکمال کے دیباچے میں مسعود سعد سلمان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ اونکے تین دیوان ہیں ایک عربی میں، ایک فارسی میں اور ایک ہندوی میں. مسعود سعد کا فارسی دیوان اب بھی باقی ہے اور تقریباً آٹھ سو صفحات پر آقائے رشید یاسمی نے طہران سے شائع کیا ہے لیکن اونکا عربی دیوان غالباً مفقود ہو چکا ہے اور ہندی دیوان کا تو صرف ذکر باقی ہے.

مسعود سعد سلمان کے فارسی کلام سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اونہیں ہندوستانی طرز فکر سے ایک لگاؤ تھا اور ہندوی میں غالباً اونھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا. خسرو کی شہادت کے بعد اونکا صاحب دیوان ہندوی شاعر ہونا یقینی بات ہے.

---

* والکیشور روڈ، بمبئی ٦.

لیکن اونکے ہندوی کلام کا آج کوئی نمونہ ہمارے پاس باقی نہیں ہے جس سے ہم اونکے متعلق کوئی واضح رائے قائم کر سکیں ۔ ہمارے علم میں ہمارے ادب کی ابتدا خسرو ہی کے کلام سے ہوتی ہے ۔

خسرو کے ہندی کلام کی مقدار : خسرو کی حیرتناک مقدار کلام کو سمجھنے کے لئے اونکی زود گوئی ، بدیہہ گوئی اور پر گوئی کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے ۔

خسرو اپنے چوتھے دیوان بقیہ نقیہ کے دیباچے میں اپنی زود گوئی کے لیے کہتے ہیں کہ میں شعر اتنی دیر میں کہتا ہوں جتنی دیر میں لفظ بیت زبان سے ادا کیا جائے ۔ امراء کی محفلوں کے لئے وہ کہتے ہیں کہ وہاں میں بیشتر قلم کا استعمال ترک کردیتا ہوں اور بدیہہ گوئی پر اکتفا کرتا ہوں ۔

یہ بیان کسی یاوہ گو کا نہیں ، خسرو جیسے متوازن انسان کا ہے جو شاعری کے علاوہ اخلاق اور روحانیت کی دنیا میں بھی ایک مقام رکھتا ہے ۔ ہمیں خسرو ہی کے بیان کی روشنی میں اون کی مقدار کلام کا اندازہ کرنا ہوگا ۔

بیشتر تذکرہ نویسوں نے خود خسرو کے قول کے مطابق اون کے فارسی کلام کی تعداد لاکھ ابیات سے زیادہ اور چار لاکھ ابیات سے کم بتائی ہے ، تذکرۂ عرفات میں اوحدی کا بیان ہے کہ خسرو کا ہندی کلام بھی اتنا ہی تھا جتنا اون کا فارسی کلام تھا ۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ اون کے تین چار لاکھ شعر ہندی میں بھی ہوں گے ۔

مولٰینا شبلی کے بیت پرانے معنی مصرع بتاتے ہیں اور خسرو کے اشعار کی تعداد نصف کردینا چاہتے ہیں ۔

خسرو کا کلام اگر نصف بھی کردیا جائے تو بھی اتنا زیادہ رہتا ہے کہ شاید ہی دنیا کے کسی شاعر کی مقدار کلام خسرو کے برابر ہو سکے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولٰینا شبلی کا خیال درست نہیں ہے ، بہت پہلے کسی نے بیت کا لفظ مصرعے کے معنی میں استعمال کیا ہوگا ، لیکن خسرو کے عہد میں بیت کے معنی مطلع نما شعر کے تھے ، خود خسرو نے بھی بیت کا لفظ انہیں معنوں میں اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے ، جیسے اعجاز خسروی کے پہلے رسالے میں

« سست ماجرائے آب » کی سرخی کے ضمن میں انہوں نے حسب ذیل مطلع کو بیت کہا ہے :

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چون کنم دل به چنین وقت ز دلدار جدا

اسی اعجاز خسروی کے دوسرے رسالے میں اختتام تمہید پر وہ اس مطلع کو بیت کہتے ہیں :

این قسم مایهٔ همه در غرب و شرق بین
وین بیت درمیانِ دو خط بهر فرق بین

خسرو اپنی تحریروں میں مصرعے کو صرف مصرع تحریر کرتے ہیں، مصرع کو اونہوں نے بیت کسی جگہ نہیں کہا ہے. مولٰینا شبلی کی غلط فہمی کے باوجود اگر اونہی کے اندازے کو پیش نظر رکھا جائے تو خسرو کے ڈیڑھ دو لاکھ شعر فارسی کے، اور اتنے ہی شعر ہندی کے ہوتے ہیں.

خسرو کے دو سو برس بعد جب میرزا بائیسنغر نے خسرو کا مکمل فارسی کلام مدون کرنے کا ارادہ کیا تو اونہوں نے ایک لاکھ بیس ہزار شعر تک جمع کئے، لیکن اس کے بعد بھی میرزا کو معلوم ہوا کہ خسرو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو اون کی بیاض تک نہیں پہونچ سکے ہیں، آخر تھک کر اونہوں نے تدوین کا کام بند کردیا.

ڈاکٹر وحید میرزا کی تحقیق اور اندازے کے مطابق ایک شاعر سیفی میرزا بائیسنغر کے معاونین میں تھا جس نے خسرو کا دیوان مدون کرکے اوس پر دیباچہ بھی لکھا ہے، یہ دیوان « سینٹ پیٹرس برگ » کے کتب خانے میں اب بھی موجود ہے.

اس دیوان کی تعداد اشعار معلوم نہیں، لیکن اگر سیفی میرزا بائیسنغر کے معاونین میں تھا تو اس میں کم سے کم اوتنے اشعار تو ہونا ہی چاہئے جتنے میرزا بائیسنغر نے جمع کئے تھے.

خسرو کے فارسی اشعار آج بھی کافی تعداد میں موجود ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اون کی مادری زبان ہندوی کے لاکھ اشعار میں سے اون کے چار پانچ سو شعر

ہمارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔ خسرو جیسے عظیم شاعر کا اتنا بڑا ذخیرۂ کلام ضائع ہوجانا ایک جانکاہ ادبی سانحہ ہے جس کے لئے وقت کی بد عنوانیوں کو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

خسرو کا ہندی کلام کیوں ضائع ہوا؟ ڈاکٹر وحید میرزا نے اپنی کتاب «امیر خسرو» میں خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب بحوالہ دیباچۂ غرۃ الکمال یہ بیان کیا ہے کہ خسرو کی نظر میں اپنے ہندی کلام کی کوئی وقعت نہ تھی لہـــذا، اونھوں نے اسے جمع کرنے کے بجائے دوستوں کو بانٹ دیا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر تعجب ہوتا ہے، دیباچۂ غرۃ الکمال میں مجھے باوجود کوشش کسی جگہ کوئی عبارت ایسی نہ مل سکی جس میں خسرو نے اشارۃً بھی اپنے ہندی کلام کو بے وقعت کہا ہو، احباب کو ہندی کلام نذر کرنے کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

«جزوِ چندِ نظمِ ہندوی نذر دوستاں کردہ شد»

کتاب میں یہ فقرہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ اس سے قبل یا اس کے بعد ایک لفظ بھی اس ضمن میں نہیں لکھا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو تحفہ دوستوں کو نذر کیا جائے وہ پست اور ادنیٰ کیوں کر ہوسکتا ہے، خسرو کا اپنی چند نظمیں احباب کو نذر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اون کے احباب ان ہندی نظموں کو حاصل کرنے کی فرمائش کرتے ہوں گے۔

ڈاکٹر وحید مرزا کے اس بیان سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب اس کی طرف سے اون کی بے اعتنائی ہے۔ در حقیقت اس معاملے میں قصور اوس عہد کے پست ذہنیت، ماحول کا ہے جس میں کسبی زبانوں کی عزت تھی اور مادری زبانیں ہیچ اور بے وقعت سمجھی جاتی تھیں۔ ایک طرف ہندوؤں کا مذہبی طبقہ عوامی زبانوں سے رو گردانی کرکے مردہ سنسکرت کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھا رہا تھا، سنسکرت کو سب سے پہلے عوامی شاعر کبیر نے للکارا:

سنسکیرت کوپ، جل بھاشا بہتا نیر

دوسری طرف مسلمان اور درباری لوگ اپنی مادری زبان کو بھول کر فارسی اور عربی کے غلام بن گئے تھے. ادبی صحبتوں اور درباروں پر فارسی چھائی ہوئی تھی اور شعر سننے سنانے کا کام اسی زبان میں ہوتا تھا اس صورت میں خسرو کا فارسی کلام تو محفوظ ہوسکتا تھا، لیکن اون کا ہندی کلام کون جمع کرتا.

ہندوستانی ہونے پر خسرو کو فخر | خسرو قصبۂ پٹیالی میں گنگا کے کنارے پیدا ہوئے اور شہر دہلی میں جمنا کے کنارے مر گئے. وہ ہندوستانی تھے، اون کی والدہ ہندوستانی تھیں. کثرت سے پان کھانے والے، اون کے سانولے سلونے نانا عمادالملک کا گھرانہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا ایک معیاری نمونہ تھا. ان تمام باتوں پر خسرو نے جابجا فخر کیا ہے.

اوس زمانے میں خسرو کی مادری زبان ہندوی کا عہد طفولیت تھا، لیکن پھر بھی وہ اپنی فارسی کے لئے غالب کی طرح : ع

فارسی بین تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

کا نعرہ نہیں لگاتے، وہ تو فخر کے ساتھ کہتے ہیں:

چو من طوطئ ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

خسرو کی فارسی کو اہل ایران نے سعدی اور حافظ کی زبان کا درجہ دیا ہے لیکن پھر بھی اونھیں اپنی مادری زبان میں اظہار مطالب کی قدرت زیادہ نظر آتی ہے جس کا اشارہ اوپر کے شعر میں «تا نغز گویم» کے ٹکڑے میں ملتا ہے.

فارسی کی طرح خسرو عربی پر بھی قادر تھے، لیکن اونھیں اپنی مادری زبان ہندوی، عربی سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے:

ترکِ ہندستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

خسرو اپنی پدری زبان ترکی پر بھی ہندوی کو ترجیح دیتے تھے:

اثبات گفتِ ہند بہ حجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

ظاہر ہے اس زمانے میں بیچاری ہندوی کیا ہوگی، لیکن خسرو کی دور بین نظروں نے اس زبان کا مستقبل دیکھ لیا تھا، اون کا خیال تھا کہ اس نوزائیدہ زبان میں فارسی اور عربی سے زیادہ امکانات موجود ہیں، آج خسرو کی یہ پیشن گوئی آخر سچ ثابت ہوئی۔

ہندی کی طرح ہندوستانی فارسی پر بھی خسرو کو ناز تھا، غالب کا ایسا بے عدیل فارسی گو شاعر ایک بالکل فرضی اور خیالی ایرانی عالم عبدالصمد سے رشتۂ تلمذ جوڑ کر اپنی فارسی کو مستند منوانے کی کوشش کرتا ہے جس سے غالب کے احساس کمتری کا پتہ چلتا ہے لیکن خسرو ہندوستانی فارسی کو ایرانی فارسی سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ اعجاز خسروی کے پہلے رسالے میں «نسبت آب ہیں رواں و لطیف» کی سرخی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> «ہندوستان میں قدیم طرز کی فارسی موجود ہے، لیکن ساتھ ہی دریا دلانِ ہند نے ایک نئی روش کی فارسی جاری کی ہے، جس میں صنائع اس طرح آتے ہیں جیسے قند کی چاشنی میں پانی ملادیا جائے۔ ماوراء النہر اور خراساں کے یخ شکن اس چاشنی سے بے بہرہ ہیں»۔ (مقتبس)

اعجاز خسروی کے اسی رسالے میں «نسبت پختن الوان نعم» کی سرخی کے ذیل میں وہ پرانی فارسی کے لئے لکھتے ہیں:

> «یہ ترکان نخچیر گیر صحرا اور ہندوان ماہی گیر دریا کے کھانے کی طرح بد مزہ ہے»۔ (مقتبس)

غرۃ الکمال کے دیباچے میں وہ ایرانیوں کے تفاخر بلادت کے لئے کہتے ہیں:

> «بعض اہل ایران نے جو بلائے بلادت میں گرفتار ہیں میری فارسی پر نکتہ چینی کی، میں نے یہی چاہا کہ ان احمقوں کو صرف سکوت سے جواب دوں»۔ (مقتبس)

خسرو ہندوستان کو روم و عراق و خراساں سے بہتر سمجھتے تھے:

ترجیح ملک ہند بہ عقل از ہوائے خوش
بر روم و بر عراق و خراسانِ برف بار

خسرو کے نزدیک دانشوران ہند کے سامنے عجم کے اہل حکمت ہیچ ہیں:

ترجیح اہل ہند بر اہل عجم ہمہ
در زیر کی و دانش و دلہائے ہوشیار

بحوالہ حیات خسروی (سعید مارہروی) اور چشمۂ کوثر (اکرام) خسرو نے ہندوستان کی فضیلت پر دس دلیلیں قائم کی ہیں جسمیں سے چند یہ ہیں!

۱ ـ یہاں علم نے تمام دنیا سے زیادہ وسعت حاصل کی.

۲ ـ ہندوستانی دنیا کی تمام زبانیں بول سکتے ہیں لیکن کسی ملک کا آدمی ہندوستانی زبان نہیں بول سکتا .

۳ ـ ہندوستان میں دنیا کے ہر حصے سے لوگ تحصیل علم کے لئے آئے ، لیکن کوئی ہندوستانی تحصیل علم کے لئے باہر نہیں گیا . ابوالمعشر دس سال تک بنارس میں پڑھتا رہا .

۴ ـ علم حساب میں صفر ہندوستانی برہمن آسا کی ایجاد ہے .

۵ ـ شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے . وغیرہ وغیرہ .

آخری دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کے خسرو کا ایسا شاعر تمام دنیا میں نہیں.

خسرو نے ایک کتاب مناقب ہند میں لکھی تھی جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے لیکن اب یہ کتاب بالکل نایاب ہوگئی ہے . ان کی مختلف تصنیفات میں ہندوستان کی مدح سرائی بڑے دلکش انداز میں موجود ہے . علی الخصوص مثنوی نہ سپہر میں چار پانچ سو شعر ہندوستان کی تعریف میں کہے ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد ہیں .

خسرو سچے وطن پرست اور ہندوستان کے عاشق تھے . اپنے اشعار میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں تو جیسے ان کی روح بول اٹھتی ہے . ہندوستان کی زمین، ہندوستان کے موسم ، ہندوستان کے پرندے ، ہندوستان کے پھول ، ہندوستان کے ریت رواج، ہندوستان کے دانشور وغیرہ پر جس تاثر سے خسرو نے شعر کہے ہیں اون کی مثال غالباً سنسکرت سے لیکر ہندی اور اردو تک کسی ہندوستانی زبان میں نہ مل سکے گی. حالانکہ خسرو کے عہد میں وطن اور وطنیت کا شعور بالکل نابالغ اور ناپختہ تھا .

خسرو کے ہندی کلام کی حیثیت| خسرو کی بے عدیل ذاتی صلاحیت اور ہندوی

زبان سے اون کے بے پناہ خلوص کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اپنے لاکھوں ہندی اشعار میں انھوں نے کیا کچھ کہا ہوگا۔ خسرو کا جو کچھ بھی کلام اسوقت باقی ہے اس کا بیشتر حصہ عوام کے سینوں سے اور کم تر حصہ اہل ذوق کی بیاضوں سے ہم تک پہونچا ہے یہی وجہ ہے کہ اون کے کلام کا زیادہ حصہ عام پسند اور کم تر حصہ خالص ادبی رنگ کا ہے۔

خسرو کے ہندی کلام کے ضمن میں شاہان اودھ کے کتب خانے کا ذکر بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ شمس‌الله قادری اپنی کتاب اردوے قدیم میں خبر دیتے ہیں کہ خسرو کے مختلف ہندی اشعار کا ایک مجموعہ اور دو سو چیستانوں کا دوسرا مجموعہ اودھ کے شاہی کتب خانے میں موجود تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے انہی دونوں مجموعوں کو سامنے رکھ کر ایک مقالہ خسرو کی ہندی شاعری پر سنہ ۱۸۵۴ ع میں لکھا تھا۔

سخت کوشش کے باوجود مجھے یہ مقالہ نہ مل سکا۔ نہ معلوم اودھ کے شاہی کتب خانے کے نسخے مفقود ہو گئے یا ان کا کچھ حصہ خسرو کے حالیہ ذخیرۂ کلام میں آگیا ہے۔ یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ نسخے کس زمانے کے لکھے ہوئے تھے۔ خیال تو یہی ہے کہ کافی پرانے ہونگے ورنہ شاہی کتب خانے کی زینت کیونکر بنتے۔

ایک گمان اور ہوتا ہے کہ کہیں ڈاکٹر اسپرنگر نے ان مخطوطوں کو ولایت کی ہوا تو نہیں کھلادی۔ اون کے مقالے کا زمانہ وہی وقت تھا جب لکھنؤ پر سفید فاموں کا پوری طرح تصرف ہوا ہے۔

ادبی رنگ: خسرو کے موجودہ ہندی کلام میں صرف دو دوہے ایک غزل اور ایک قطعہ خالص ادبی رنگ کے ہیں۔ غیر مستند روایات کے مطابق اس تعداد میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ روایات ناقابل اعتنا ہیں۔ دو دوہے حسب ذیل ہیں۔

(۱)

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھو دیس

(۲)

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا من پیو کا دوؤ بھئے اک رنگ

ان دونوں دوہوں میں خسرو کا وہ سوز تغزل کی صورت میں نظر آتا ہے جس کا واسطہ دیکر خواجہ نظام‌الدین اولیا دعا مانگتے تھے. سنسکرت کا شرنگار اس رنگ سے الگ ہوتا ہے. معلوم یہ ہوتا ہے جیسے خسرو اپنا رنگ تغزل نوزائدہ ہندی شاعری میں بھر رہے تھے.

دوہے ہندی میں غزل کا نعم البدل ہیں. اس صنف میں بھی غزل ہی کی طرح ایک خیال صرف دو مصرعوں میں ادا کیا جاتا ہے. کئی صدیوں تک دوہا ہندی شاعری کی سب سے مقبول صنف رہا ہے. اس صنف کی ایجاد کا فخر بھی خسرو کو حاصل ہے. سسکرت پنگل میں دوہے کا وجود نہیں ہے.

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کی کتاب «پنجاب میں اردو» بحوالۂ دیباچۂ فرہنگ آصفیہ خسرو کے ہم عہد شاعر بو علی شاہ قلندر سے حسب ذیل دوہے کو منسوب کرتی ہے.

سجن سکارے جائینگے نین مرینگے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدی نا ہوئے

اول تو یہ دوہا اور اس کا فارسی ترجمہ امیر خسرو ہی سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ مبارز خاں کے جس واقعے کے ساتھ اس دوہے کا ذکر آیا ہے وہ خسرو کی آخر عمر کا ہے جب ان کی دوہا نگاری مقبول انام ہوچکی تھی. مجھے اس دوہے کو بو علی شاہ قلندر سے نسبت دینے میں تامل ہے. میں اس واقعے پر بھی اعتبار نہیں کرتا کہ مبارز خاں کے ارادۂ سفر کو ملتوی کرانے کے لئے بو علی شاہ قلندر نے یہ دوہا اور اس کا فارسی ترجمہ نظم فرمایا.

دوہوں کے علاوہ خسرو کی ایک مشہور ہندوی غزل بھی خالص ادبی رنگ کے تحت آتی ہے. اس غزل میں بھی خسرو کا سوز سب سے زیادہ نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کی طرح ہندی پر بھی قادر تھے. یوں تو یہ غزل زبان زد عام ہے. پھر بھی اس کے دو تین شعر پڑھئے.

زحال مسکیں مکن تغافل درائیے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے دل نہ پی لیو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
بحقِ روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کی درائیے راکھوں جو جان پاؤں پیا کی بتیاں

یہ غزل سنہ ۱۱۳۴ ھ میں بھی اہل ذوق کی بیاضوں میں موجود تھی۔ میرے پاس بو علی شاہ قلندر کا ایک قلمی دیوان مکتوبہ سنہ ۱۱۳۴ ھ ہے۔ اس دیوان کے پہلے صفحے پر اس غزل کے تین شعر حضرت مولوی امیر خسرو کے نام سے درج ہیں۔

اس غزل کے علاوہ اسی فارسی ہندی آمیزش کے رنگ میں خسرو کا دو شعر کا ایک قطعہ اور ہے جو بعض مخصوص بیاضوں میں ملتا ہے۔ شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب اردوے قدیم میں یہ قطعہ نقل کیا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گڑھئے سنوارئیے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سوارا

یہ قطعہ خسرو کے رنگ کا ہے اور قطعاً اوہی کا ہے۔ اون کی ایک فارسی غزل کا شعر بھی اس انداز کا ہے۔

گفتم چہ طور می کُشی و زندہ می کُنی
او یک نگاہ کرد و نگاہ دگر نہ کرد

ان دو دوہوں، ایک غزل [1] اور ایک قطعے کے علاوہ ادبی رنگ میں

---

(۱) شمس اللہ قادری نے اردوے قدیم میں ایک اور غزل خسرو کے نام سے درج کی ہے۔ میرے تھوڑے ردوبدل کے ساتھ یہ غزل ایک ایسے ایرانی حکیم صاحب کے نام سے سنی تھی جن کو اردو شاعری کا تو دعوے تھا لیکن اردو بالکل نہ آتی تھی۔ یہ غزل صرف مسخرہ پن ہے۔ اسے خسرو سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ صرف دو شعر نقل ہیں۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا   در غم ہجر تو کمر ٹوٹ گیا
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من   بے گنہ ہم سینہ عجب روتہ گیا

حسرو نے نہ جانے کیا کچھ کہا ہوگا. لیکن اب وہ سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو چکا ہے .

عام پسند رنگ | خالص ادبی کلام کے علاوہ خسرو کا تمام ہندی کلام عوام کے ذریعے سے ہم تک پہونچا ہے اور عام پسند رنگ کا ہے . اس کلام کو پست اور رکیک کہہ کر نظر انداز کرنے والے نقاد قابل رحم ہیں. وہ بیچارے روایت کے اس بری طرح غلام ہیں کہ حسن و لطافت کو اپنے فرسودہ رواجی میعاروں سے ہٹکر دیکھ ہی نہیں سکتے . حسرو کے عام پسند کلام میں بھی وہ خصوصیات ہیں جن کو صرف ایک بڑا شاعر ہی پیدا کرسکتا ہے .

۱۔ خسرو نے اپنے اس کلام کو عام پسندی کی سطح پر رکھتے ہوئے بھی اس میں عوک[1] کے بھدے اسلوب کی جگہ ایک شائستگی اور تہذیب بیان کو برقرار رکھا ہے . یہ کام کسی زبان کی غیر ترقی یافتہ حالت میں بیحد دشوار ہوتا ہے .

۲۔ یہ کلام سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے کہا گیا ہے :

فَاِذا قِیلَ اطمع النـاس طَراً
واد اُریدُ اعجـــز المعجـــزین

جب اسے پڑھا جائے تو عام پسند (عامیانہ) معلوم ہو لیکن جب ایسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیاں عاجز ہوجائیں .

۳۔ اس کلام میں ترییت لغات فارسی و ہندی کا مفید سلسلہ انتہائی دلچسپ انداز میں جاری ہے . جیسے حسب ذیل آئنے کی پہیلی جس میں تین زبانوں میں آئنے کا نام موجود ہے . لیکن پڑھنے والے کو پتہ نہیں چلتا .

فارسی بولی آئی نہ (آئنـہ)
ترکی بولی پائی نہ (پائنـہ)
ہندی بولوں آرسی آوے (آرسی)
کیسے خسرو کوئی بتلاوے

۴۔ اس کلام میں وہ نئے نئے اسلوب اور انداز ہیں جو حسرو سے پہلے کسی

---

(۱) عوام

زبان میں نہیں کہے گئے، جیسے یہ مکرنی:

سگڑی رین مورے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
واکے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن؟۔ ناسکھی «دیا»

زرا دیکھئے کس خوبصورتی سے شرنگار رس سے ہالیہ رس میں پہونچے ہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نئی نویلی دلہن کے دل سے رس کی بوندیں ٹپکیں اور ہنسی کا زعفران زار کھل گیا۔ پھر مضمون کتنا اچھوتا ہے، آخری مصرعے میں مکالمے کا رنگ بالکل نئی بات ہے۔

۵۔ اس کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندی کے باوجود مسلم معاشرت کا رنگ نظر آتا ہے عام ہندی شاعری پر ہندو طریقۂ فکر اور ہندو انداز معاشرت چھایا ہوا ہے، اودھی یا برج بھاشا کے مسلمان شاعروں کے یہاں بھی ہندوستانی مسلمان کی معاشرت کے کوئی نقوش[1] نہیں ملتے۔

شاعر اعظم کبیر نسلاً مسلمان ہیں لیکن اون کا سارا سرمایہ فکر ہندوانہ ہے، یہ اور بات ہے کہ اون کی ادھیاتمک شاعری میں بعض ژرف نگاہوں کو کچھ ناتراشیدہ مسائل تصوف نظر آجائیں۔ ملک محمد جائسی، رس کھان اور خان خانان وغیرہ کی بھی یہی حالت ہے، ان شاعروں کا کلام بے عدیل اور بے مثل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کلام کو ہندوستانی مسلم معاشرت سے کوئی لگاؤ نہیں۔

اس کے برعکس خسرو کا ہندی کلام (علاوہ غزل کے) ہندی چھندوں میں ہے، ہندوستانی روایات شاعری کے مطابق اس میں عشق عورت کی طرف سے اس کی ریت رواج ہندوستانی ہیں، لیکن اس کی زبان وہ ہندی ہے جو یہاں کے مسلمان بولتے تھے، نیز اس کے بھاؤ میں مسلم معاشرے کی ایک جھلک موجود ہے۔

ساون میں نئی بیاہی دلہن اپنے میکے جاتی ہے، یہ رسم یہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں میں مشترک ہے، خسرو ساون کی ملہار گیت کے چھنڈ میں

---

(۱) صوفیوں کے وہ شاعری جو تبلیغ مذہب کے لئے غیر متوازن ہندی میں کی گئی ہے، بالکل بے کیف ہے، لہذا وہ ہندی ادب کا جزو کبھی نہ بن سکی۔ فارسی کے بعد تصوف اوسی وقت نکھرا جب وہ ترقی یافتہ اردو کا جامہ زیب تن کرسکا۔

ایک مسلمان دلہن کی زبانی پیش کرتے ہیں:

اماں میرے بابا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بوڑھا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری — کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

کتنا خالص ہندوستانی بھاؤ ہے، لیکن اس بھاؤ کے اظہار کا ذریعہ ایک مسلمان دلہن ہے؛ اماں، بابا، بیٹی، ماموں یہ سارے الفاظ وہ ہیں جو ہندی بولنے والے ہندوستانی مسلمان گھرانوں میں بولے جاتے ہیں، ساتھ ہی گیت کا رنگ بھی مسلمانی ہے۔

ویدانت اگر ہندوستانی ذہن و دماغ کی معجز نما پرواز ہے تو ویشنو بھاؤ یہاں کے آرٹ اور کلچر کا انتہائی دلکش حسن ہے جس وقت صوفیائے کرام ہندوستان آئے تو اونھوں نے ہندوستانی تفکر اور ہندوستانی کلچر کے حسن دونوں کو اپنایا ویدانت اور تصوف تو اتنا قریب آئے کہ بیشتر تاریخ فلسفہ لکھنے والوں کا یہی خیال ہے کہ تصوف پر ویدانت کا کافی اثر ہے، اسی طرح ویشنو بھاؤ بھی سیکڑوں سال سے تصوف میں پہونچ گیا ہے۔

ویشنو فلسفۂ عشق میں عورت عاشق اور مرد معشوق ہے۔ اپنے مرشد یا پیشوا سے عورت کے انداز میں اظہار عشق دراصل ویشنو بھاؤ ہی کی ایک صورت ہے اس رنگ میں ذرا خسرو کی ایک ہولی سنئے جس میں وہ اپنے مرشد نظام الدین اولیا سے اظہار عشق کررہے ہیں:

دیا ری موہے بھیجو ناری
شاہ نظام کے رنگ میں
کپڑے رنگے سے کچھ نہ ہوت ہے
یا رنگ منے تن کو ڈبویاری ۔ دتا ری

اس ہولی میں وزن گیت کے ہیں، بھاؤ ویشنو ہیں، زبان ہندی ہے، لیکن پھر بھی اون پر ہندوستانی مسلمان کے طرز فکر کا رنگ چڑھا ہے۔

دو سو سال کے اندر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے ہندوستانی مسلمان کی سیاست کچھ بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اوس کے معاشرے کے بنیادی رسم و رواج ہندستانی ہیں اور کم و بیش ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ بچہ ہونے سے شادی ہونے تک اور شادی سے موت تک مسلمان کے یہاں بھی گیت، ریت اور بھاؤ ہیں جن کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں۔ ہندی ادب نے ان کو بالکل جذب نہیں کیا ہے حالاں کہ یہ معاشرہ بھی ہندوستانی تہذیب کا ایک پہلو ہے۔

خسرو کے ہندی کلام پر شکوک : پچھلے سو برس کے اندر اس ملک میں فرقہ پرستی کے جو طوفان آئے اون سے یہاں سے والوں کے ذہن و دماغ کافی مسموم ہوئے ایک طرف «ہندی، ہندو اور ہندوستان» کا نعرہ لگا تو دوسری طرف ہندی دشمنی اس انتہا پر پہونچی کہ اودھی اور برج بھاشا جیسی زبانوں کو دیہقانوں کی بولی بتاکر اون پر نظر کرنا بھی توہینِ ذوق سمجھا جانے لگا، خسرو کے باقی ماندہ ہندی کلام کی اہمیت گھٹانے میں بڑی حد تک اسی ذہنیت کا ہاتھ ہے۔

ستم تو یہ ہوا کہ بعض حضرات نے خسرو کے موجودہ کلام کو اون کی تصنیف ہی ماننے سے انکار کردیا ہے۔ اس بحث کے دو حصے ہیں، جس میں سے ایک حصہ خسرو کی مشہور نظم «خالق باری» سے متعلق ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی (مرحوم) نے اس بحث میں بڑی کاوش سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ «خالق باری» کے مصنف امیر خسرو نہیں ہیں۔ شیرانی (مرحوم) کے اس نظریے پر آئندہ صحبت میں روشنی ڈالی جائیگی۔

خسرو کے بقیہ ہندی کلام کے متعلق مختلف لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اوسے شبہے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی، لیکن سوال تو یہ ہے کہ شبہہ بھی کیوں؟ خسرو کے فارسی کلام کی طرح اون کا ہندی کلام بھی ساڑھے چھ سو سال سے اونہی کا کلام مانا جارہا ہے۔ اتنے زبردست تواتر کو رد کرنے کے لئے زبردست دلائل اور بدیہی حقائق کی ضرورت ہے جوشبہہ پیدا کرنے والوں کے پاس قطعاً نہیں ہیں۔

تواتر کی اہمیت سے اگر انکار کردیا جائے تو ننانوے فی صدی پرانے شاعروں کا کلام اون سے منسوب کرنا مشکل ہوجائیگا۔ بہت کم پرانے شاعر ایسے ہیں جن

کا کلام خود اون کے ہاتھ کا یا اون کے عہد کے کسی مستند آدمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہو۔

تحریفات | اس وقت خسرو کا کلام « مشتے از خروارے » سے بھی کم باقی رہ گیا ہے۔ یہ تقلیل بجائے خود اسناد کی ایک دلیل ہے، لیکن اس کے باوجود چوں کہ یہ ساڑھے چھ سو سال سے عوام کی غیر علمی ماحول میں ہے لہذا اس پر تحریفات کا تصرف ہوجانا ایک یقینی امر ہے۔ بغیر عالمانہ نگرانی کے حس ادب پاروں کے امین، آزاد ذہن عوام ہوتے ہیں اون میں ہمیشہ اس طرح کے تصرفات ہوجاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ خسرو کے ہندی کلام کو ان تحریفات اور تصرفات سے یک لخت پاک کرنا ناممکن ہے، لیکن پھر بھی محققانہ جانچ پرتال سے تحریف و تصرف کے اجزاء کسی نہ کسی حد تک الگ ہوسکتے ہیں، مثلاً حسب ذیل بندوق کی پہیلی قطعاً خسرو کی نہیں، کیوں کہ اون کے عہد تک بندوق رائج نہ ہوئی تھی:

ایک نار وہ اوکھ کھاوے
جس پر تھوکے وہ مرجاوے
اوسکا پیا چھاتی سے لگاوے
اندھا نہیں کانا ہوجاوے

مطلب کی غلطی کے علاوہ اس پہیلی کے چاروں مصرعوں میں ایک پھوہڑ پن ہے اور خسرو سراپا سلیقہ تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے اور کچھ پہلیوں پر اظہار اشتباہ کیا ہے۔ جیسے یہ آئنے کی پہیلی:

ہاتھ میں لیجئے دیکھا کیجئے

ڈاکٹر صاحب نے اپنے شبہے کا سبب تو نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ شاید موصوف کو لیجئے اور کیجئے خسرو کے عہد کی زبان کے خلاف معلوم ہوئے ہوں۔ میں تو اس پہیلی کو خسرو سے اس لئے منسوب نہیں کرسکتا کہ اس کا مضمون ناقص ہے۔ « ہاتھ میں لیجئے دیکھا کیجئے » کسی بھی اچھی چیز کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ اس پہیلی کا لازمی جواب آئینہ نہیں ہوسکتا۔

حقے اور چلم کی یہ پہیلی بھی ڈاکٹر صاحب مشکوک سمجھتے ہیں:

نئی کی دھیلی پرانی کا تنگ
بوجھو تو بوجھو نہیں چلو میرے سنگ

حسرو کے زمانے تک حقے اور چلم کا رواج نہیں ہوا تھا۔ لہذا ڈاکٹر صاحب اسے خسرو کی پہیلی نہیں مانتے۔ میرے نزدیک نئی کی قیمت دھیلی اور پرانی کی قیمت تنگ (تقریباً دمڑی) کا لازمی جواب حقہ اور چلم نہیں ہوتا۔ دھیلے کی نئی اور دمڑی کی پرانی سیکڑوں چیزیں ہو سکتی ہیں مثلاً ہانڈی جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ لیکن اس پہیلی میں کوئی ذہانت اور جودت نہیں ہے لہذا میں اسے خسرو سے منسوب کرنے پر اصرار نہیں کرونگا۔

ایک اور چوڑی کی پہیلی:

چٹاخ چٹاخ کب سے ہاتھ پکڑا ہے جب سے

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب اسے بھی خسرو کی پہیلی نہیں سمجھتے۔ گو ڈاکٹر صاحب نے کوئی سبب نہیں بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ اس پہیلی کا لازمی جواب چوڑیاں نہیں نکلتا لہذا میں بھی اسے خسرو کی پہیلی نہیں سمجھونگا۔

اس عہد کے مایۂ ناز محقق قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے ایک مضمون «آزاد بحیثیت محقق» شائع شدہ نوائے ادب بمبئی میں خسرو کے بنائے ہوئے چمّو ساقن کے اس ڈھکوسلے پر اظہار شک کیا ہے۔

اوروں کی چوپہری باجے چمو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے رکھے جس میں ناہیں توسل
اورون کے جہاں سنگ سماوے چمو کے وہاں موسل

بھانگ بیچنے والی چمو ساقن پر گڑھا ہوا یہ ایک ڈھکوسلا ہے، جس کا واقعہ بیان کرنے میں مولانا محمد آزاد نے اپنے عہد کی دلی کا رنگ پیدا کرنا چاہا اور لکھ گئے کہ چمّو آتے جاتے خسرو کو حقہ پلاتی تھی۔ حالانکہ تماکو اور حقہ خسرو کے عہد تک رائج نہیں ہوا تھا۔ اس غلطی کی بنا پر قاضی صاحب کا خیال ہے کہ چمّو کی کہانی آزاد نے گڑھی ہے۔

میں قاضی صاحب سے اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ آزاد نے بات بڑھا چڑھا کر بیان کی ہے. لیکن چمّو ساقن کی مدح میں ڈھکوسلا بھی آزاد نے تصنیف کرلیا یہ بات قابل قبول نہیں معلوم ہوتی. ہوگا یہ کہ یہ روایت آزاد نے سنی یا پڑھی ہوگی جو مختصر اور بے کیف ہوگی. آزاد نے چیرک کو چیرہا بنایا ہے. اون کی تحریر میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ فنکار آزاد محقق آزاد سے آگے نکل جاتا ہے. بہرحال میں چمّو کے اس ڈھکوسلے کو خسرو ہی کا سمجھتا ہوں، حالانکہ شاعر نے چمّو کا ڈھکوسلا بھی چمّو ہی کی سطح کا بنایا ہے.

آب حیات میں خسرو کے تُک ٹھاپے کے متعلق ایک اور کہانی بیان ہوئی ہے کہ خسرو ایک دن گھومتے پھرتے شہر کے باہر نکل گئے، وہاں ایک کنویں پر چار پنہاریوں نے انہیں چار بے جوڑ لفظ کھیر، چرخا، کتا اور ڈھول دئیے اور خسرو نے فی البدیہہ ان پر تُک بٹھا دیا:

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
کتا آیا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اس تُک کو بعض لوگ خسرو کے لئے دون مرتبت سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چار بے جوڑ لفظوں کو فی البدیہہ ربط دیکر ایک بامعنی شعر بنا دینا خسرو جیسے مشاق ہی کا کام تھا. پھر شعر کا مضمون بھی پنہاریوں کی رعایت سے فوک (عوام) کی سطح کا رکھا جس سے وہ لطف اندوز ہوسکیں. غزلیات، قصائد لیلیٰ مجنوں اور نہ سپہر کے مصنف کا سادگی کی اس حدتک آنا اوسکے انتہائی کمال کی دلیل ہے. دیہقانی پنہاریوں سے حضرت امیر خسرو کا بات کرنا جنھیں پسند نہ ہو وہ پہلے شاعر کو دیکھے اور اوس کی شخصیت کو پہچاننے کی نظر پیدا کریں.

خسرو کی زبان | خسرو نے اپنی مادری زبان کو ہندوی کہا ہے اور اوس میں صدہا اصناف کے اشعار نظم کئے ہیں. ہندوی کے لفظ سے بعض محققین کو غلط فہمی ہوتی ہے ہندوستان میں آنے والے غیر ملکیوں نے اس ملک کے طول و عرض میں بولی جانے والی کسی بھی زبان کو ہندی کہا ہے. ان غیر ملکیوں کے نزدیک ہندی اون صدہا زبانوں میں سے کوئی بھی زبان تھی جو ہمالیہ سے لیکر راس کماری

تک اور بنگال سے لیکر سندھ تک بولی جاتی تھی۔

ہمارے بعض محققین حضرات نے خسرو کے «ہندوی» لفظ کو غیر ملکیوں کے استعمال کئے ہوئے «ہندی» لفظ کے معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ غیر ملکیوں نے بوجہہ نادانستگی ہندی کا لفظ کسی بھی معنی میں استعمال کیا ہو مگر خسرو ہندوستانی ہیں ہم اون سے اس غلطی کی توقع نہیں کرسکتے۔ وہ جہاں بھی ہندوی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے اون کا مقصد ایک خاص زبان ہوتی ہے جو اون کی مادری زبان تھی اور جو اوس وقت خاص طور سے دہلوی مسلمانوں کے گھروں میں اور عام طور سے دہلی والوں میں بولی جاتی تھی۔

خسرو کے بیان کے مطابق اس ہندوی کا وجود اون سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے بھی دہلی میں تھا۔ مسعود سعد سلمان کی زبان کو خسرو نے ہندوی ہی کہا ہے۔ اس ہندوی کے معنی غیر ملکیوں کے استعمال کئے ہوئے لفظ «ہندی» کے مرادف سمجھنا درست نہیں۔ خسرو نے ان معنوں میں ہندوی کا لفظ اپنی نثر و نظم میں کہیں استعمال نہیں کیا ہے۔

خسرو کے عہد سے کچھ قبل کا زمانہ اور خود خسرو کا عہد شمالی ہند کی لسانی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد دربار دہلی کے چاروں طرف بالخصوص اور دہلی شہر میں بالعموم ایک بڑی خوش آہنگ زبان پیدا ہو گئی تھی جسے بعد میں کھڑی بولی کہا گیا۔ ہندی کے بعض نئے محققوں نے کھڑی بولی کو کروچھیتر کی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ نظریہ قطعاً درست نہیں۔ کھڑی بولی مسلمانوں کے آنے کے بعد فارسی کے زیر اثر پیدا ہوئی ہے جس کا مزاج ہندوستان کی نرم اور پڑی بولیوں سے کسی حد تک مختلف ہے۔ اس کھڑی بولی میں دہلی کے دارالخلافہ میں آنے والی بیسیوں بولیوں کی دھاریں ہزاروں شدھ اور اپ بھرنش لفظوں کے ساتھ مل رہی تھیں۔

خالص زبانوں والے برج بھاشی، پوربی، پنجابی وغیرہ دہلی کی اس زبان کو قطعاً دوغلی زبان کہتے ہونگے۔ لیکن نئی نئی زبانوں کے سوتے اس نوزائدہ زبان

کو بے پناہ قوت دے رہے تھے اور وہ ہندوستان کی ہر زبان سے زیادہ ترقی کر رہی تھی۔ یہی ملی جلی کھڑی زبان آگے چلکر ریختہ اور اردو کہلائی۔

اس زبان کو دکن والوں نے دہلوی زبان کہا۔ دیہات والے اسے ترکوں کی بولی کہتے تھے۔ دیہاتوں میں اوس وقت ترک کے معنی تھے مسلمان۔ جیسا کہ کبیر نے کہا ہے۔

ہندن کی ہندوائی دیکھی ترکن کی ترکائی

یا

ایک نرنجن اللہ میرا
ہندو ترک دؤ ہیں نیرا

حیرت کی بات یہ ہے کہ آج سے سیکڑوں سال پہلے اس زبان کو ہندوستانی بھی کہا گیا ہے۔ گویا اس کے لئے ملک کی مشترک زبان ہونے کا فیصلہ صدیوں قبل ہوچکا تھا۔ خسرو اسی زبان کی ابتدائی شکل کو ہندوی کہتے ہیں

خسرو کے موجودہ ہندی کلام کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اون کی بنیادی زبان کھڑی بولی ہے۔ جس میں برج بھاشا جزو ثانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد مشرقی پنجاب کی اپ بھرنش اور اودھی کا اثر نظر آتا ہے۔ پھر دارالخلافہ میں آنے والی ملک کی سیکڑوں موجود اور مفقود الوجود بولیوں کے لفظ جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ بیرونی زبانوں میں فارسی اوسکے ساتھ عربی اور ترکی لفظ خسرو کی ہندوی کا جزو ہیں۔

<u>خسرو کے ہندی کلام کے باقیات</u>: خسرو کا جو ہندی کلام اس وقت باقی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صنف کلام	کل تعداد	مشکوک
دوہے	۲	
غزل	۱	
قطعہ	۱	
بوجھ پہلیاں	۲۹	۵
بن بوجھ پہلیاں	۱۱۴	۷

صنف کلام	کل تعداد	مشکوک
مکرنیاں	۶۷	۶
دو سخنے	۲۰	
دو سجنے فارسی و ہندی	۱۲	
نسبتیں	۲۲	
انمیلیاں اور ڈھکوسلے	۸	زیادہ تر مشکوک
گیت	۶	
نسخۂ چشم	۱	
خالق باری	تقریباً ۲۱۵ شعر	

---

* پروفیسر ان. ایل. کے. طالب.

سرمایۂ کلام غالب

(۱)

مرزا غالب کی شاعری سے متعلق اہل ادب کے متضاد نظرئیے

اہل قلم حضرات نے جن اردو شعرا کے کلام کی طرف خصوصیت سے اپنی توجہ مبذول کی ہے. ان میں سے علامہ اقبال مرحوم کے سوا شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس پر مرزا غالب سے زیادہ لکھا گیا ہو. منجملۂ دیگر تصانیف کے ان کے سوانح حیات اور شاعری پر مولانا حالی کی مشہور تصنیف یادگار غالب، باوجود اس کے کہ بعض کے نزدیک مولانا نے اس میں اپنے استاد سے بیحد عقیدت کی بنا پر مرزا کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے اور اپنے بیان میں توازن قائم نہیں رکھ سکے ہیں اور بعض کی راے میں وہ مرزا کے ذہن و کمال کی مکمل اور صحیح تصویر کھینچنے سے قاصر رہے ہیں، اب بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے، خاص کر اس وجہ سے کہ اس نے عوام کو مرزا کے طبعی عادات و حالات اور کم و بیش ان کے شاعرانہ کمال سے پہلی دفعہ روشناس کرا دیا. سچ پوچھئے تو «یادگار» کے منصۂ شہود پر آجانے سے پہلے مرزا کی اصلی شخصیت اور خدا داد قابلیت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور ان کی قدر دانی جس کے وہ مستحق تھے بالکل نہیں ہوئی تھی.

«یادگار» کے بعد مرزا کے کلام پر بیشمار مضامین لکھے گئے. ان کے اردو دیوان کے کئی نسخے مختلف ناشروں نے طبع کئے. اس کی بیسیوں شرحیں وجود میں آئیں. بہت سے رسائل و جرائد نے مرزا کی یادگار میں خاص نمبر نکالے

* پروفیسر ان. ایل. کے. طالب ایم. اے. ایم. او. ایل. سری نگر، کشمیر

جن میں ان کی شاعری کے محاسن و معائب پر بصیرت افروز اور سیر حاصل تحریریں شائع ہوئیں۔ اکثر سخن فہموں نے دادِ سخن دے کر ان کے اشعار سے متعلق بلند پایہ اور عالمانہ مقالے سپرد قلم کئے۔ ملک کے نامور ادیبوں نے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا اور فرداً فرداً مختلف پہلوؤں سے ان سے بحث کرکے متعدد کتابیں لکھیں۔ کسی نے ان کو پیغمبر سخن قرار دیا تو کسی نے مہمل گو، کسی نے سب سے بڑا مجدد فن اور جدت پسند ٹھہرایا تو کسی نے محض نقال اور خوشہ چیں۔ بعض کے نزدیک ان کے کلام میں لفظ ہی لفظ ہیں معنی ندارد۔ بعض کا خیال ہے کہ الفاظ سے قطع نظر ان کی شاعری جذبات کی آئینہ دار اور نازک خیالی اور معنی آفرینی کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کا صحیفۂ سخن فقط چند بے ربط اور پریشان خیالات کا مجموعۂ ہے۔ کسی کی رائے ہےکہ غالب بہت بڑے فلسفی تھے، اور ان کو فلسفی ثابت کرنے میں اتنا مبالغہ کیا کہ وہ شاعر بھی باقی نہ رہے۔ کوئی کہتا ہے خدا جانے غالب کا فلسفہ کیا بلا ہے، صرف مرزا بیدل وغیرہ کے ہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لینا فلسفہ نہیں ہے۔ کسی کے نقطۂ نظر سے ان کے اشعار میں عاشقانہ رنگ نہیں ہے اور تغزل تو چھو نہیں گیا۔ کسی صاحب کا ارشاد ہے کہ ان کے چھوٹے سے دیوان میں کیا نہیں ملتا یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا تعلق کائنات سے ہے اور لوازمۂ شاعری قرار دی جاسکے ان کے ہاں موجود نہیں۔

الغرض فقط چند حق پسند اور غیر جانبدار ادباء کے سوا بیشتر مختلف المذاق حضرات نے مرزا کے کلام پر جو رائے زنی کی ہے وہ اکثر انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں دو گروہ پیدا ہوگئے۔ ایک تو وہ جو انہیں دنیا کا بہترین شاعر قرار دیتا ہے اور ان کے اشعار کو آیات الہی کا مرادف سمجھتا ہے۔ دوسرا وہ جو ان کو اردو کا شاعر تسلیم کرتا ہی نہیں اور اگر کرتا بھی ہے تو نہایت ہی پست درجے کا۔

غالب پرستوں میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو مرزا کے کلام میں ہر عیب کو بھی ہنر سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی تعریف میں اس قدر رطب‌اللسان ہیں کہ ان کو دیوان کے وید مقدس کے برابر

ایک الہامی کتاب سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ «غالب اور گیٹے (جرمنی کا مشہور شاعر) دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے، شاعری پر دونوں کا خاتمہ ہوگیا ہے». ڈاکٹر صاحب واقعی شاعری کے وہ تمام محاسن جو مغربی فنکاروں اور انشا پردازوں نے گنائے ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور اپنے معنی پرو کر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں. شیخ محمد اکرام صاحب مصنف «غالب نامہ» نے لکھتے ہیں کہ «ڈاکٹر صاحب واقعی کئی ایسے فقرے لکھ گئے ہیں جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں انھوں نے مرزا کے کئی اشعار کو ایسے معنی پہنائے ہیں جو شاعر کے خیال میں نہیں ہوسکتے.» اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی اس کوشش سے اگرچہ مرزا کی شاعری کے بہت سے مخفی پہلو سامنے آئے اور ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ بھی ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی اس مبالغہ آمیزی نے کئی ناقدین کو چونکا دیا. چنانچہ اس ردِ عمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہمخیالوں کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئیں. ان میں سے ایک ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی تصنیف «غالب» ہے اس میں وہ اپنے نقطۂ نگاہ اور تنقیدی معلومات سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں. «مرزا کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے. ان کے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن صنعت گری نمایاں ہے اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں. ان کو زندگی میں ہم آہنگی بھی حاصل نہیں ہوئی. ان کی بے اطمینانی خود اس بات کی مظہر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے، زندگی کو پر کھنے اور کائنات کی محبوب چیزوں کو تاڑنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے بحیثیت شاعر کے وہ مبتلائے فریب رہے، ان کی شاعرانہ پیداوار میں نہ تو وہ محبت ہے. جو حیات آفریں ہوتی ہے نہ وہ ہم آہنگی جو حقائق سے پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ ہم آہنگی جو پناہ گزینی کے احساس سے ظہور پذیر ہوتی ہے .... انھوں نے ایک منتشر زاویہ نگاہ کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑ دی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے. ان کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہوسکتا.»

ڈاکٹر صاحب کے علاوہ مرزا یگانہ چنگزی ایسے غالب شکن بھی میدان میں آئے جو مرزا کو پرلے سرے کا بے سرا، سخن درد اور گونگا قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کرسکتے، صرف

ٹھونس ٹھانس کے تکبندی کرلیتے ہیں۔ مرزا یگانہ اور ان کے بعض ہمنوا مرزا غالب پر سرقہ کا الزام بھی عائد کرتے ہیں اور ان کا واحد ماخذ فارسی کے چند مشہور شعراء کا کلام بتاتے ہیں۔ اہل ادب بخوبی جانتے ہیں کہ مرزا یگانہ اپنی شاعرانہ عظمت سے کہیں زیادہ مرزا غالب کے خلاف زائد از ضرورت نکتہ چینی کا ہنگامہ برپا کرکے ادبی دنیا میں نام پیدا کرچکے ہیں۔ اگرچہ مرزا غالب کے مداحوں کے علاوہ بعض انصاف پسند حضرات نے ان کی شدید مبالغہ آمیز عیب جوئی اور بلاوجہ درشت بیانی کو بنظر حقارت اور ان کی یک طرفہ رائے کی کما حقہ تردید بھی کی لیکن وہ عمر بھر اپنی ضد پر اڑے رہے اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔

ظاہر ہے کہ کسی شاعر کا کلام جسقدر زیادہ نقادوں کی تحقیق و تدقیق کا موضوع قرار پائیگا یا ان کی خاص توجہ کا مرکز ہوگا اسی قدر اس کے افکار سخن کی خوبیوں اور خامیوں کے اجاگر ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ مرزا غالب کے مختصر سے اردو دیوان پر بہت سے شعرا و ادباء نے خامہ فرسائی کی ہے اور اپنی علمی استعداد قوت ادراک کے مطابق اظہار رائے کیا ہے۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک کی ذہنی نشو و نما ایک ہی معیار کی ہونی ضروری نہیں اس مضمون میں متضاد آراء سے دو چار ہونا نہ تو غیر متوقع ہوسکتا ہے اور نہ تعجب انگیز۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ بعض اصحاب نے فقط تصویر کے ایک رخ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور دوسرے کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ غرض انتہا پسندی کا ایسا رویہ اختیار کیا ہے کہ اس سے مرزا کی شخصیت ایک دھندلی فضا کی دھوپ چھاؤں میں کبھی تو اتنی روشن نظر آتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور کبھی اتنی تاریک کہ محض ایک مبہم عکس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح ان کی حقیقت شاعری کا صحیح تصور واضح طور پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ایک فوق البشر ہستی کی حیثیت میں پیش کئے گئے ہیں اور دوسری طرف ان کی رفعت و عظمت سے انکار کیا گیا ہے جس کے وہ حامل ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے علاوہ بہت سے دیگر سخن فہموں نے مرزا کے ایک شعر کی شرح کرتے ہوئے بال کی کھال نکالی، ان کے آئینہ کمال میں سینکڑوں ایسے عکس ڈھونڈنے کے درپے رہے جو در حقیقت وہاں موجود نہ

تھے مگر ان کو نظر آئے اور اس طرح مرزا کے اصلی خیالات و جذبات اور معانی اشعار کو بہت بڑھا دیا۔ بخلاف اس کے ان کے کمال فن سے انکار کرنے والوں نے ان کی معمولی لغزش کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور مبالغہ کی رنگ آمیزی سے چمکا دیا۔

مرزا کے حق میں اور ان کے خلاف اتنا ذخیرہ مواد موجود ہوتے ہوئے بھی کئی باریک بین علمدوست حضرات اور شعر و سخن سے ہر قسم کے مطالب پیدا کرنے والے اب بھی تشنہ لب ہیں اور پہلو بدل بدل کر ان کی شاعری کا مزید جائزہ لینے یا اس کی باریکیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اس پر دل کھول کر روشنی ڈالنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ ساماں بہم پہنچانے کی فکر میں ہیں اور تحقیق و تنقید کے شوق میں اس مضمون کو پامال و فرسودہ نہیں ہونے دیتے۔ آئندہ بھی نہ معلوم مرزا کے اور کتنے بت تراشے اور توڑے جائینگے، یہ مرزا کی شخصی عظمت اور بلند پایہ کلام کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

یہ امر باعث اطمینان ضرور ہے کہ ملک میں چند ایسے اعتدال پسند حق گو اور متوازن دماغ رکھنے والے ادیب اور ناقد بھی موجود ہیں جو بلند بانگ مدعیوں کی خود پسندانہ رائے اور یک طرفہ فیصلہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ان کے مشرقی و مغربی علوم سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر مرعوب ہوتے ہیں۔ وہ محض کسی جذبے کے تحت یا کسی ایسے نقاد کی کورانہ تنقید میں حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ جیسا کہ انصاف کا تقاضا ہے تمام متعلقات کو سامنے رکھکر مرزا کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے حسن و قبح کو معقول پیرائے میں زیر بحث لاتے ہیں۔ افراط و تفریط سے بالا ہوکر بیجا حماقت یا مخالفت سے دامن بچاتے ہیں اور واقعات کی روشنی میں دلائل و براہین کے سہارے اپنی جچی تلی رائے آزادانہ طور ظاہر کرنے سے نہیں جھجکتے۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے حضرات کا شعور تنقید پختہ اور معیار سخن شناسی ارفع ہے اور عوام میں صحیح و شستہ مذاق پیدا کرنے کی اہلیت انہی کا حصہ ہے۔ (باقی آئندہ)

*نجیب اشرف ندوی

ہندوستانی سلکشن[۱]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ کلکتہ کی طرح مدراس اور بمبئی میں بھی کمپنی کے غیر ہندی ملکی اور فوجی ملازموں کے لئے ہندوستان کی مشترکہ زبانِ اردو میں تعلیم کا انتظام کیا جائے. چنانچہ مدراس اور بمبئی میں اس طرح کے مرکز قائم کئے گئے. ہم کو افسوس ہے کہ مدراس اور بمبئی کے ان تعلیمی مرکزوں سے متعلق ہمارے معلومات نہیں کے برابر ہیں. مدراس کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مرکز میں جس کا نام کالج فورٹ سینٹ جارج تھا، ایک کتب خانہ بھی تھا. اس میں اردو کی قلمی کتابیں بھی موجود تھیں. پور انوار سہیلی کے ایک دکنی ترجمہ کا بھی پتہ چلتا ہے، یہ ترجمہ محمد ابراھیم بیجاپوری نے کیا تھا، اور سنہ ۱۸۳۴ ع میں شائع ہوا تھا. لیکن حالات سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ امتحانات کا معیار ایک رکھنے اور مزید اخراجات سے بچنے کے خیال سے بمبئی اور مدراس کے مرکزوں نے بھی فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کو ہی داخل نصاب کرلیا تھا. میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے کالج کی اکثر اہم کتابیں بمبئی میں چھاپی گئی تھیں. مدراس میں بھی وہاں کے امتحان کے لئے کالج کی مندرجہ ذیل کتابیں نصاب میں داخل تھیں[۲]:

(۱) اخلاق ہندی از بہادر علی حسینی

---

* ڈائرکٹر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی نمبر (۱).

(۱) میرا خیال ہے، کہ چونکہ فوجی افسروں کو ہندوستانی بولنے والوں سے سب سے زیادہ رابطہ رہتا تھا، اس لئے ان کو ہندوستانی زبان کے سیکھنے اور اس میں امتحان دینے پر زور دیا جاتا تھا، چنانچہ انتخاب بھی بڑی حد تک فوجی افسروں ہی کے لئے مرتب ہوا ہے.

(۲) دکنی اردو حصے مرتب (کرناٹکی) کے نام سے یاد کرتا ہے ایک بڑے حلقہ میں پھیلی ہوئی ہے اور مدراس کے سلسلے میں بھی جب اس کا ذکر آتا ہے تو اس سے وہ سارا علاقہ مراد لیا جاتا ہے جو گذشتہ نظام حکومت، کرناٹک، میسور سے لیکر قدیم صوبہ مدراس کے سارے علاقہ پر مشتمل ہے.

(۲) باغ و بہار [چہار درویش] از میر امن
(۳) اخوان الصفا ،، اکرام علی
(۴) مذہب عشق یا قصہ بکاولی ،، نہال چند لاہوری
(۵) باغ اردو ،، شیر علی افسوس

لیکن کلکتہ اور مدراس میں دو چیزوں میں اختلاف تھا، ایک تو یہ کہ کلکتہ شمالی ہند کا ایک شہر تھا، اس لئے یہاں کے اردو بولنے والے دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد وغیرہ کی زبان بولتے تھے، دوسرے یہاں کے اکثر مترجمین، مولوی اور دیسی اساتذہ بھی شمالی ہندوستان کے لسانی اور ادبی مرکزوں سے وابستہ تھے، پھر جان گلکرائسٹ اور دوسرے غیر ہندوستانی اساتذہ بھی دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کی زبان ہی کو مستند سمجھتے تھے، اس لئے وہاں کے کمپنی کے ملازموں نے نصاب کی کتابوں کو جس طرح وہ لکھی گئی تھیں باقی رکھا، لیکن مدراس میں ان کو یہ مشکل پیش آئی کہ وہاں جو لوگ اردو یا ہندوستانی بولتے تھے ان کی زبان، لہجہ، صرف و نحو اور محاوروں کے لحاظ سے ایک حد تک مختلف تھی، اسلئے مدراس کے ملازمین جب کتاب میں ایک چیز کو مذکر پڑھتے اور لوگوں کو مونث بولتے سنتے یا اردو جمع «وں» کی جگہ «اں» سے بناتے دیکھتے یا «نے» علامت فاعلی کو غائب پاتے تو پریشان ہوجاتے. پھر شاید وہاں کے کمپنی کے ملازمین فارسی وغیرہ سے بھی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، باغ و بہار، مذہب عشق وغیرہ کی بعض عبارتیں ان کی سمجھ میں نہ آتی ہوں گی اور ان کو ان کتابوں کے پڑھنے سمجھنے اور سوالات کے جوابات لکھنے میں دقت پیش آتی ہوگی، اس لئے جب اس ہندوستانی سلکشن کے مرتب کو ان سرکاری ملازموں کے پڑھانے کا موقع ملا تو اس نے اپنے طالب علموں کی دقتوں کو محسوس کیا اور وہاں کے مرکز تعلیم و امتحان کے افسر اعلیٰ سے یہ رائے ظاہر کی کہ ان کتابوں کو جہاں تک ہوسکے کرناٹکی[۱] (دکنی) اسلوب میں لکھا جائے تو امتحان دینے والوں کے لئے آسان ہوگا. افسر نے اس تجویز کو پسند کیا اور مرتب نے اس منظوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین کام کئے (۱) عبارت کو کرناٹکی زبان کی طرح لکھا، (۲) اشعار اور مشکل عبارتوں کو نکال دیا، (۳) اس کے ساتھ اخلاق کے بلند رکھنے کے لئے ایسی عبارتیں جس میں مترجمین کھل کھیلے تھے حذف کردیں یہاں تک کہ کوئی ناشائستہ

لفظ آگیا ہے تو اس کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا گیا ہے، چنانچہ مرتب اپنے سبب تالیف میں لکھتا ہے:

سبب تالیف

«امّا بعد عاصی پُر معاصی اضعف العباد سراپا عجز و نیاز غلام حسین بحیلمی ولد غلام نبی بحیلمی قلعه دار حضرت ٹیپو سلطان شہید مغفورِ مبرور و نور اللہ مرقدہُ الی یوم النشور نہایت عاجزی و انکساری کے ساتھ خدمات میں ناظرین اس نسخۂ مفید کے یہ گذارش کرتا ہے کہ یہ بندہ ایک عرصه دراز سے بذریعه سفارش غربا پرور تلطف مظہر معدنِ علم و فضل منبع جود و بذل کرنل چارلس الفرڈ برون[1] صاحب بہادر دام اقبالہُ کے اهل شمشیر سرداروں کی درس و تدریس میں اوقات بسری کیا کرتا تھا. آخرش حسن تائید سے صاحب موصوف و اجینٹ جنرل لفٹنٹ کرنل[2] اوڈس صاحب بہادر کی ملٹری یکزامننگ کمیٹی کی منشی گری سے سرفراز و ممتاز ہوکر صاحبین موصوفین کی دعا گوئی میں مشغول ہوکے سرداروں کی تعلیم و تربیت میں مستعد و مامور تھا مگر اس عرصے میں بسا اوقات اکثر سرداروں کو امتحان کے واسطے مقرر کئے گئے پانچوں اردو محاورے کے رنگینی و استعارات آمیز کتابوں کی مطاب دانی و برجسته مترادف فقروں کی نزاکت فہمی میں عاجز و قاصر اور کرناٹکی محاورے میں ترجمه لکھتے وقت دھوکا کھاتے اور رکتے دیکھ کر اپنے ذہن ناقص میں یوں تصور کیا که اگر ان کتابوں کے بعض بعض موقعوں میں لکھے گئے تھے سو عشق آمیز مطالب واگذاشت کر کر اختصار کے ساتھ حتی المقدور کرناٹکی محاورے میں بشرطیکه اصل مطلب فوت نہووے اور فصاحت میں رکاکت نه پائی جاوے تالیف کریں تو سرداروں کو امتحان کے کبُل گھاٹ سے پار ہونے کی خاطر وثیقۂ واثق وذریعۂ لائق ہوگا. نظر کرتے اس کی، خدمت عالی

---

(۱) Col. Charles Alfred Browne سنه ۱۸۶۶ ـ ۱۸۰۲ سنه ۱۸۲۰ میں مدراس کی فوج میں داخل ہوا، اس نے قواعد فارسی پر ایک کتاب لکھی ہے. مدراس کے مرکز کے فارسی و اردو کا ممتحن تھا. سنه ۱۸۶۴ع میں ملازمت سے سبکدوش ہوا، اور ۱۴ فروری ۱۸۶۶ع کو مرا.

(۲) Adjutant General Lt. Col. William George Woods

میں ایجنٹ جنرل کرنل اودّس صاحب بہادر کی جو فدوی کے حامی و مربّی معاون و مددگار اور ہندوستانی زبان کے ماہر و استاد ہیں، گذارش کیا تو بہادر موصوف کو بندے کی بہودی و ناموری اور سرداروں کی تعلیم منظور ہی تو تھی زبان درفشاں سے فرمائے کہ یہ تجویز نہایت معقول و مناسب نظر آتی ہے بلکہ تمہیں کو اس کا حکم کرتا ہوں، تب من ہیچ مدانِ کج مج بیان باوجود عدم استعداد حسب الحکم سردار عالی وقار کے بہ مضمون الامر فوق الادب کمر ہمت باندھا اور جرأت پردار ہوکے اس مجموعۂ مفید کی ترتیب میں مستعدو مشغول ہوکر عرصۂ قلیل میں انصرام کو پہنچایا اور نام اس منتخبات مفید کا مقالات حمس رکھا کہ ہم نام ہے و ہم تاریخ. صاحب ممدوح بھی بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرماکے قالب طبع میں لانے کا حکم فرمائے جب کہ یہ نسخہ ایسے سردار ذی فہم عالی ھمم کے منظور ہووے تو پھر دوسرے کیوں نہ پسند کریں بمقتضا اس ضرب المثل کے مقبول یک کس مقبول صد کس »

مقالات خمس سے سال تاریخ سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ع) نکلتا ہے. چنانچہ مرتب کا بیان ہے کہ:

« نام اس منتخبات سفیہ کا مقالات حمس رکھا ہے کہ ہم نام ہے و ہم تاریخ ہے ».

زیر نظر نسخہ میں جو کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، کتاب کا نام ہندوستانی سلکشن دیا گیا ہے. خاص سرورق نہیں ہے لیکن صفحہ اول ہی پر کتاب کی طباعت کا حال مفصل طور سے لکھا گیا ہے اور اس میں مرتب نے یہ دکھانے کے لئے کہ وہ بھی فورٹ ولیم کالج کے منشیوں سے رنگین بیانی اور مضمون آفرینی میں کم نہیں ہے اس انداز کی عبارت جیسے کالج کے منشی اپنے مقدموں اور دیباچوں میں لکھتے تھے، لکھنے کی کوشش کی ہے. یہ ورق اس طرح شروع ہوتا ہے:

ہندستانی سلکشن

« عہد حکومت میں نواب ذیشان، بلند مکان، منبع جود و احسان، داراحشمت، جمشید شوکت، ارسطو منزلت، فلاطون مرتبت، معدن جود و سخا، مخزن لطف

و عطا، خردمند دوراں، خلاصۂ دانایانِ زماں، زبدۂ نوئنیان بارگاہِ انگلستان، عدالت گستر، شفقت مظہر، جارج رابرٹ فرانسیس لارڈ ہارس[۱] صاحب بہادر دام اقبالہم کے،

اور آوان اسعد میں صاحب والا اقتدار، ذی افتخار، رفعت پناہ، بسالت دستگاہ، قدوۂ شجیعان عصر، برگزیدۂ دانایان دہر، عالی ہمت، بلند درجت، شجاعت شعار، تہوّر آثار، سپاہ سالار لفٹنٹ جنرل ہانربل جارج آنسن[۲] صاحب بہادردام ثروتہ کے،

حسب الفرمان، فیض نشان، فیاض زمان، مورد لطف و احسان، عاقل دوران، ماہر علم و فضل، سر آمد ارباب دول، عالی مناصب، والا مناقب، لشکر کے ایجنٹ جنرل لفٹنٹ کرنل الیّم جارج[۳] اوڈس صاحب بہادر راد حشمتہ کے،

تالیف کئے گئی ممتحن منشی غلام حسین کی ماہ ربیع الثانی میں سنہ ۱۲۷۲، ایک ہزار دو سو بہتر ھجری، مطابق سنہ ۱۸۵۶، ایک ہزار آٹھ سو پچاس پر چھ عیسویہ میں قالب طبع میں جو آئی تھی سرداراں اھل شمشیر کے واسطے نہایت مفید اور ہندوستانی کے ممتحن سرداران اور صاحبان گورنمنٹ مدراس کی منظور نظر ہونے سے، عہد ریاست میں نواب عالی جناب، خورشید قباب، برجیس شیم، عطارد رقم، فلاطوں فطنت، ارسطورتمت، سرآمد دانایانِ زماں، قدوۂ نوئنیان بارگاہ انگلستان، مصدر بخشش و سخا، مخزن حلم و وفا، جناب سر تھامس ڈینسن[۴]

---

(۱) اس کا اصلی نام جارج رابرٹ فرانسس نہیں بلکہ جارج فرنسس رابرٹ ہارس George Francis Robert Harris ہے۔ یہ ہارس خاندان کا تیسرا بیرن تھا، سنہ ۱۸۱۰ع میں پیدا ہوا اور سنہ ۷۲-۱۸ع میں وفات پائی۔ اپریل ۱۸۵۴ع سے مارچ ۱۸۵۹ع تک مدراس کا گورنر تھا

(۲) Hon. George An Son (سنہ ۵۷ - ۱۷۹۷ع) پہلے مدراس کا سپہ سالار تھا، (سنہ ۱۸۵۴ع) پھر سنہ ۱۸۵۶ع میں ہندوستان میں کمپنی کی فوجوں کا سپہ سالار تھا. ۲۷ مئی سنہ ۱۸۵۷ع میں کرنال میں ہیضہ سے مرا

(۳) Adjutaur Lt. Col. William George Woods.

(۴) Sir William Thomas Denison (سنہ ۷۱ - ۱۸۰۴ع) فروری سنہ ۱۸۶۱ع میں مدراس کا گورنر ہوا، ۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ع سے ۱۲ جنوری ۱۸۶۴ع تک عارضی وایسرائے کی حیثیت کیا. مارچ سنہ ۱۸۶۶ع میں مدراس سے واپس گیا اور ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۷ع کو وفات پائی. اس نے دو کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک Varieties of viceragal Life ہے اور دوسری معاشرتی و تعلیمی مضامین کا مجموعہ۔

صاحب بہادر کے۔ سی۔ بی۔ گورنر ان کونسل مدراس دام اقبالہم کے،

اور زمان با سعادت میں عالی قدر، بلند مکان، پیشوائے شجیعان زماں، رستم نہاد، ارسطو نژاد، میدان دلیری و جوانمردی کے کیقباد، دریا دل، سحبان منزل، جمشید فضائل، داراشمائل، بلند ہمت، سالت رتبت، سردار نامدار، حاب سپہ سالار سر جیمس ہوپ گرانٹ[1] صاحب بہادر کے۔ سی۔ بی۔ دام حشمتہم کے،

حسب الامر جلیل القدر، معدن فضل و احساں، منبع جود و امتناں، قدر داں علم و فضل، مصدر فنون و عقل، قدوۂ اہل دول، آفتاب آسمان عزت و رفعت، ماہتاب سمائے قدر و منزلت، لشکر کے اجینٹ جنرل لفٹنٹ کرنل اُلیّم جارج اودّس صاحب بہادر دام اقبالہ رفعتہ کے،

بار ثالث بہایت صحت کے ساتھ کمال عرق ریزی سے مطبع تعلیم الاحرار میں اہتمام سے غلام حسین ممتحن منشی متعلق کالج کمیٹی کے ماہ ذی قعدہ سنہ ایک ہزار دو سو اٹھہتر ۱۲۷۸ ہجری، مطابق سنہ ایک ہزار آٹھ سو باسٹھ ۱۸۶۲ عیسوی میں زیور طبع سے محلّٰی ہوئی۔

کتاب کی ابتداء اس حمد، نعت اور منقبت سے ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وصف کیوں کر ہوسکے پھر صانع افلاک کی
جب ہی لا احصی حدیث اس صاحب لولاک کی

حمد متوافر و ثنائے متکاثر تسلیم ہی اس حکیم مطلق حلت حکمتہ کو کہ کحل الجواہر سے وجود باوجود پنجتن پاک کے پیرواں دین متین کو بصارت عطا فرمایا اور انوار و لوامع پیکان ایمان کے ادویات سے جلا افزائے صلواۃ خمسہ کے کما حقہ افزود کیا اور شفا خانۂ خاص میں قوانین طبی شرع شریف کے جناب رسالت مآب احمد مجتبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و سلم

(۱) Sir James Hope Grant (سنہ ۱۸۰۸-۷۵ع) میں فوجی افسر تھا، ترقی کرتے کرتے دسمبر سنہ ۱۸۶۱ع سے مئی سنہ ۱۹۶۵ع تک مدراس کی فوجوں کا سپہ سالار رہا۔

کو معلوم کرایا اور ان کی معرفت سے بیماران دین کو مفرحات لولوی و معجونات یاقوتی دلوایا، صلوٰۃ اللہ وسلامہ علی المحمد المحمود وعلی آلہ واصحابہ المسعود الی یوم الموؤد».

نعت محمود حدا کی ہوسکے انساں سے کب
قامت عظمت کے آگے پست تھے افلاک حب

اور حاتمہ پر دو شعروں کا ایک تاریخی قطعہ دیا گیا ہے، اس سے تیسرے ایڈیشن کا سنہ طباعت نکلتا ہے:

تاریخ اختتام

للہ الحمد فضل حق سے جب پانچ نسخوں کو ہم کئیے حو طرح
سد کی حد باندہ کہ چکا ہاتف پنچ بستان دلکش با فرح

تمام شد

چنانچہ آخری مصرعہ میں سد کا لفظ حس کی طرف اوپر کے مصرعے میں اشارہ کیا ہے ملایا جائے تو ۶۴ + ۱۲۱۴ = ۱۲۷۸ ہوتے ہیں.

اس انتخاب کی ترتیب وہی ہے حو اوپر دی جا چکی ہے، لیکن پوری پوری کتابیں نہیں لی گئی ہیں. چنانچہ احلاق ہندی میں سے صرف قار و ہدہد کا قصہ لیا ہے، چہار درویش میں سے دیباچہ، تمام اشعار، کمت اور بعض نثری حصے حذف کر دئے گئے ہیں اخوان الصفا میں سے صرف دیباچہ غائب ہے، مذہب عشق میں دیباچہ وعیرہ نکال دیا گیا ہے. آعاز داستان سے یہ انتخاب شروع ہوتا ہے، لیکن اس کے بھی اشعار، مشکل الفاظ ہی نکال دئے گئے ہیں بلکہ ۲۶ داستانوں میں سے صرف ۱۴ داستانیں لی گیں ہیں اور ان میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے. باغ اردو کی بھی صرف ۴۱ حکایتیں لی ہیں. البتہ اس میں اشعار کا حو ترجمہ اشعار میں ہے باقی رکھا ہے.

اس زبان کی بعض خصوصیات یہ ہیں:

جہاں تک انگریزی الفاظ کے تلفظ کا تعلق ہے مرتب نے «و» کی جگہ «الف» اور «الف» کی جگہ «و» استعمال کی ہے ولیم کو الیم اور آنریبل کو ہانیوبل

لکھتا ہے۔ زبان میں اس نے زبان دکنی کی تمام خصوصیات کو باقی رکھا ہے، مثلاً:

۱ مونث کی جگہ مذکر:

جان ۔ اگر میرا جان بھی تیرے کام آوے

دکان ۔ اس کا دکان ایسا چمکا

آواز ۔ اس کا آواز سن کر

یا مذکر کی جگہ موںث:

استقبال ۔ مہماں کی استقبال

ہوش ۔ ہوش آگئی

دریا ۔ دریا راہ میں ملی

مزاج ۔ اس کی بھی مراج کو استقلال ہوا۔

۲ جمع 'وں' کی جگہ 'اں' سے، اور اکثر ایسی جمعیں موںث کی جگہ مذکر ہو جاتی ہیں، مثلاً:

مات، ماتاں: یہ ماتاں توتے میں پائے جاتے ہیں۔

دای اور سہیلی: دائیاں اور سہیلیاں حاصر تھے۔

صورت، صورتاں: اں کے صورتاں کے سے تھے۔

نہر و موج، نہراں و موجاں: نہراں لمالب مانند فرش آئینے کے بطر آتے ہیں اور موجاں لہراتے ہیں۔

خرابی، خرابیاں: یہ خرابیاں قسمت میں لکھے تھے۔

صف و قابلیت، صفتاں اور قابلیتاں: دس برس کی عمر تک جتنے صفتاں اور قابلیتاں تھے حاصل کیا۔

۳ احتراماً یا جمع کی حالت میں، موںث کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، مثلاً:

ہر چند انھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت دور اندیشی اور مہر مادری سے چھپا رکھے تھے۔

میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑے تھے۔

یا خدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کھلاتے ہو.

یا بی بی؟ تم کچھ نہ بولے

یا تاج الملک التماس کیا کہ آپ کے لئے لونڈیاں اس جگہ حیا سے نہیں آتے.

ملکہ گھبرا کر باگ کھینچے ۰۰۰ ڈوب گئے.

(ملکہ) مجھ کو بھی آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں.

جمع فعل کی جگہ واحد: وہ جوان بہت عذر اور حیلے کیا.

فعل معتدی کے ساتھ نے علامت فاعلی نہیں آتی. مثلاً:

میں بہتیری باتاں بنایا لیکن کچھ کام نہ آئے.

میں بھی ایسا ہی کیا.

خواجہ کہا اے بادشاہ.

وہ جوان زنجیراں سب دروازون کے کھول دیا.

اب عبارت کے اختصار کی چند مثالیں دی جاتی ہیں.

	اصل	سلکشن
۱	اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا آسودہ ایسے چین سے گذراں کرتے.	اس کے وقت میں رعایا چین سے گذراں کرتے.
۲	جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھای گیرے، دغا باز تھے.	جتنے چور چکار دغا باز تھے.
۳	گل بکاولی کی جستجو کروں اور اپنے زر قسمت کو محک امتحان پر کسوں اس میں اگر دامن کو گل مراد سے بھروں تو فہوالمراد،	گل بکاولی کی جستجو کروں، یہ دل میں خیال کرکے.

نہیں تو اس وسیلے سے باپ کے
ملک سے باہر نکلوں، یہ دل
میں خیال کرکے۔

اکثر جگہ پیرے کے پیرے حذف کردئیے گئے ہیں۔

یہ کتاب دو حیثیتوں سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ پہلی کوشش ہے کہ شمالی ہند کی تصانیف کو کرناٹکی زبان میں لکھا جائے، دوسرے اس کتاب کو سامنے رکھ کر اس زبان کے قواعد، محاورات وغیرہ سے متعلق کافی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔

---

* ڈاکٹر سید محمد صدرالدین

جوہری کا بارہ ماسہ

« حضرت آئت اللہ جوہری ۱۲ صدی کے بہار کے ایک بڑے صوفی اور شاعر تھے، انہوں نے اردو شاعری کے ساتھ ہی ساتھ ایک ہندی بارہ ماسہ بھی لکھا ہے۔ اس مضمون میں بارہ ماسہ کی ابتداء وار تقاء کے ساتھ ہی ساتھ ان کے بارہ ماسہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔»

یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں سال کے بارہ مہینوں کا ذکر ہوتا ہے۔ عام طور سے ان بارہ مہینوں میں کوئی عورت اپنے شوہر کی جدائی سے بے قرار رہتی ہے، روتی ہے اور طرح طرح سے اپنے شوق کا اظہار کرتی ہے، مناظر فطرت کے ذکر سے شاعر اس شوق کو اور بھی ابھار دیتا ہے، لیکن کہیں کہیں مناظر فطرت کا آزادانہ بیان ہوتا ہے۔ اس میں یہ نہیں ذکر کیا جاتا کہ برہنی کے جذبات و احساسات پر ان مناظر نے کیا اثر ڈالا۔ ایسے بارہ ماسے سنسکرت میں ملتے ہیں۔ ہندی کے قومی شاعر متھیلی سرن گپت نے اپنی کتاب ساکیت(Epico composition) میں بارہ ماسہ سپرد قلم کیا ہے، اور سیناپتی نے بھی ایک بارہ ماسا لکھا ہے، ان بارہ ماسوں میں وہی عام رنگ نمایاں ہے۔

ہندی زبان کے بعض ادیبوں نے بارہ ماسا کو لوک گیت کی ایک قسم بتایا ہے۔ بھاسکر رام چندر بھالے راو نے عوامی گیت کی چار عمومی قسمیں بتائی ہیں (۱) تقریبات کے گیت جیسے پیدائش کے گیت، جھولے کے گیت، شادی بیاہ کے گیت وغیرہ (۲) ماہواری گیت جیسے بارہ ماسا، کرشن جنم اسٹمی کے گیت، ہولی کے گیت وغیرہ (۳) سماجی گیت جیسے ہیرامن کے گیت، چندراول کے گیت، کنہیا کے گیت وغیرہ (۴) متفرقات جس میں موسمی گیت اور مذہبی گیت عقائد کے گیت وغیرہ بھی شامل کرلئے گئے ہیں جیسے فصل کاٹنے کے گیت اور بھجن وغیرہ، یہ صحیح ہے کہ مزاج اور تیور کے لحاظ سے بارہ ماسوں میں عوامی

* ڈاکٹر سید محمد صدرالدین ایم، اے، ڈی، لٹ، صدر شعبہ اردو پٹنہ کالج، پٹنہ

گیت سے مشابہت ملتی ہے لیکن میرے خیال میں دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ بارہ ماسے کسی نہ کسی شکل میں سنسکرت میں ملتے ہیں، جو علما کی میراث ہے، جس کے اصول ضو وابط اور سارے تقاضے معیاری ادب کے ہیں، لیکن عوامی گیت، عوام میں بنتے ہیں اور ان گیتوں کی روایت معیاری ادب کی روایت سے قطعاً مختلف ہے

عوام میں رائج بارہ ماسے کی ابتدا عموماً اساڑھ کے مہینے سے ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض شعرا نے اس کی پابندی نہیں کی ہے۔ سیاپتی کے بارہ ماسے کی ابتدا بسنت سے ہوتی ہے۔ سری شیام پرمار نے بہ حوالہ ڈاکٹر رگھوبنس اس کی تین صورتیں بتائی ہیں (۱) بارہ ماسے کی ابتدا اساڑھ سے ہو (۲) اس کی ابتدا چیت سے ہو (۳) ابتدا موقع کے لحاظ سے ہو۔

بارہ ماسے اپنے انجام کے لحاظ سے دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) جس میں ابتدا سے انتہا تک فراق اور ہجر سے ہی سروکار ہے (۲) جس میں آخر کار وصل محبوب میسر آئے۔ بارہ ماسوں میں ایک نسوانی انفعالیت چھائی ہوئی ملتی ہے مدہم اور نرم لہجہ اور پرستش کی حدتک بڑھی ہوئی محبت کا اظہار رہتا ہے۔ یاد محبوب، گریہ فراق اور آرزوئے وصل یہی تین عناصر ہیں جن سے بارہ ماسوں کی ترکیب ہوتی ہے۔

کامیاب بارہ ماسا لکھنے کا ایک خاص ڈھنگ ہے یوں کہئے کہ ان کی بھی ایک تکنیک ہے جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ شاعر کو چاہئے کہ جذبات کو بر انگیختہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے، اس لئے الفاظ ایسے انتخاب کرے جو عام فہم ہوں اور ترکیبیں ایسی استعمال کرے جس سے درد اور دکھ کی افسردگی ظاہر ہو۔ مناظر فطرت کے بیاں سے جدائی کی آگ کو اور بھی تیز و تند کردے، ہر مہینہ کا سلسلہ وار بیان ہو اور ہر ماہ کی خصوصیات کا ذکر ساتھ مختلف تہواروں کا تذکرہ موثر پیرایہ میں کرے۔ فنکار کا فرض ہے کہ کم سے کم الفاظ میں ہر ماہ کی تصویر سامنے لائیے۔ جن چیزوں کی تصویر کشی مقصود ہو اور جن نقوش اور رنگوں سے تصویر مرتب ہوتی ہو وہ صرف کتابی نہ ہوں بلکہ جان پہچان کے ہوں۔ ایسے پھول اور ایسے پرندوں کا ذکر ہو جن سے ہم مانوس

ہیں. خاص خاص موسموں میں جو جذبات انسانی دلوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ سارے ماحول میں بکھیر دئیے جائیں. غرض یہ کہ فطرت کی ان جانی پہچانی اشیا سے ایک ایسی فضا بنائی جائے جو خود بھی سو گوار ہو اور دوسروں کو بھی سو گوار کر سکے. اس لئے جب فضا پر ہی اداسی اور غم چھایا ہوا ہو تو برہنی فطرت کی ہر ایک شئے کو گلے لگائیگی، اپنی محبت کو یاد کرے گی، اور جدائی کے دن کاٹ دے گی.

ہر ماہ کی سچی تصویر کشی کے لئے فنکار اس کے امتیازی نشانات کو جمع کرتا ہے. اور اس کی خصوصیات اور اس کے تقاضے پر نظر رکھتا ہے تاکہ مکمل تصویر، اور موثر تصویر سامنے آسکے، جیسے اساڑھ کے لئے گھن گرج کا ذکر، ساون کے لئے رم جھم مینہ برسنے کا اور بھادوں کی بھیانک راتوں کا بیان یا پھاگن میں گھر گھر عبیر اڑانے کا تذکرہ، یہ سب کچھ اس طرح پیش ہوں کہ وہ برہنی کوئی منفرد شخصیت باقی نہ رہے. بلکہ رنج والم کا ایک علامتی نشان بن جائے اور اس کی آپ بیتی پر بیتی سے گذرتی ہوئی جگ بیتی ہوجائے.

بارہ ماسے کا رواج سنسکرت کے زیر اثر ہوا. سنسکرت میں بارہ ماسا تو نہیں ملتا ہاں سال کے چھ موسموں کا ذکر ملتا ہے. خود کالی داس کے یہاں یہ رتیو ورنس بڑے آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے، چھ موسموں کا ذکر چھ باب میں ہے. ابتدا موسم گرما سے ہوتی ہے، موسم بہار سے نہیں، گرمی کا اثر عاشقوں پر کیا ہوتا ہے اور پھر اس کا اثر پرندوں پر کیا پڑتا ہے، بڑے سلیقے سے پیش ہوا ہے. مناظر فطرت کا بھی بڑا نکھرا ہوا بیان ہے. اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محبت پر ان مناظر کا کیا اثر پڑتا ہے. لیکن اس حصہ میں کالی داس کی شاعرانہ عظمت برقرار نہیں رہتی، الفاظ معمولی ہیں، بیان میں تکرار ہے، خیالات میں خاص رفعت نہیں اور نہ کوئی پیچیدہ مسئلہ حیات ہے اس طرح کی نظموں کی تکنیک شاید کالی داس ہی کی بدولت متعین ہوئی ہے.

سور داس سولھوین صدی عیسوی کے شاعر تھے انہوں نے رادھا اور کرشن کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے اودھو پنڈت کا ذکر کیا ہے جو کرشن مہاراج کی طرف سے گوپیوں کو سمجھانے کے لئے آئے تھے، اودھو کہتے ہیں کہ کرشن تو

ہر جگہ موجود ہیں تم ان کی جدائی میں کیوں جان ہلکان کرتی ہو۔ اسی لئے گوپیاں اودھو کا نام لے کر روتی ہیں۔

बटन वटन अनक जलधर, अति मनोहर वेष।
तिहि समय सखि गगन सोमा, सवहि लैं सुवि शेष॥

रितु वसंत के आगमहि, मिलि झूमक हो।
सुख सदन मदन को जोर, मिलि झूमक हो॥

टेक- ऐसो जो पावस रितु प्रथम सुरति करि माधौ जू आवहिं।

متھیلی اور بھوج پوری میں بارہ ماسے کافی مقبول ہوئے، ان زبانوں کے علاوہ اودھی، مالوی وغیرہ میں بارہ ماسے کثرت سے لکھے گئے۔

متھیلی میں سب سے سے قدیم بارہ ماسا جو اب تک دستیاب ہوا ہے وہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے اس کے لکھنے والے ودیا پتی ہیں جو میتھلا کے واقعی ودیا پتی ہیں۔ ان کے بارہ ماسے کی چند سطریں درج کی جاتی ہیں۔

सावन मास बरीस घन वारि।
पंथ न सूझे निसि अँधियारि॥
चौदिसि देखिये बिजुरी रेह।
से सखि कामिनि जीवन संदेह॥

भादो मास वरिस घन घोर।
समदिस कुल कै दादुर मोर॥
चिहुँकि चिहुँकि पिया कोर समाय।
गुनमति सूतलि अंक लगाय॥

چند متفرق سطریں بھوجپوری کی قلمبند کی جاتی ہیں:

सावन रिमझिम बुँनवा वरिसे
पियवा भीजे ला परदेस
भादो रइनी भयावन सखि हे।
चारो ओर बरसेला धाह
पूस हे सखि, ओस परतु हे
भींजेला अँगिया हमार हे

फागुन सीख फाग खलपु हे
घर घर उडला भवरि हे
वइसखे ए सखि उखम लोग
तन से दरला नीर
जेठ मास सखि, लूक लोग
सहसर चलेल समोह

مالوی زبان کے ایک بارہ ماسا کی دو سطریں ملاحظہ ہوں۔

सखि, लागो असडे मास, प्रभु वनचालयारे
चालय, चाल्या रे दवारका नाथ, हरि मन्दर सूनोरे

متھیلی کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

बइसाख ऊधव नहिं आव श्याम
कइसे काढव हम ऊखम धाम
सूर श्याम आवत यदुराय
राधा मिलाथ अंक लगाय
आली रे घन श्याम बिना

ملک محمد جائسی کی پدماوت میں دو بارہ ماسے ہیں ایک تو سنسکرت کے قاعدے کا ہے جس میں چھ موسموں کا ذکر ہے اور ہر موسم دو مہینوں کا ہے اس میں پدماوت کی جدائی کا حال مذکور ہے دوسرا بارہ ماسا ہے جو ناگمتی کے آنسوؤں کا تار ہے۔ ناگمتی کو دنیا طلبی اور مایا کا علامتی نشان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ شاید اسی لئے اس کی زبان سے بارہ ماسا کہلوایا گیا ہے اور سنسکرت جو مقدس زبان ہے اس کے اثر چھ موسموں کا بیان پدماوت کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ پدماوت کو روحانی ارتقا کی علامت بنایا گیا ہے اور یہ دکھلانے کی کوشش ہے کہ کس طرح مادہ اور روح کسی اہم مقصد میں مجتمع ہوسکتے ہیں۔

جائسی نے پدماوتی کے حسن کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے وہ حسن حقیقی ہو، جوہری نے کنول دی کے حسن کا بیان سراسر مادی سطح پر کیا ہے جس سے ایک یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ قصہ کی صداقت ہر گوشہ سے نمایاں ہے،

رتن سین سراسرمادی دنیا میں ہے لیکن رام راجہ کے روپ میں جوہری خود عشق کو ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح مجاز اور حقیقت کی گنگا جمنی سامنے آجاتی ہے، اور داستان کی حلاوت بڑھ جاتی ہے۔ پدماوت کا چھ ماہہ چیت اور بیساکھ سے شروع ہوتا ہے اور ہر موسم میں وہ مناسب لباس زیور سے آراستہ ہوکر سامنے آتی ہے، یہ جدائی کا دکھڑا نہیں بلکہ وصل کا نغمہ ہے۔ شاید اس سے مراد روحانی فتح ہو، ناگ متی کا بارہ ماسہ فراق یار کی داستان ہے، یہ اساڑھ سے شروع ہوتا ہے، لیکن نچھتروں کا ذکر دونوں کے یہاں ہے۔

پدماوت ہے تو ایک برمیہ کہانی لیکن اس میں رزم کی لہریں بھی ملتی ہیں۔ جائسی نے سلطان دہلی کا بیان با وقار انداز میں کیا ہے۔ جوہری کے یہاں کوئی ایسا دربار تو نہ تھا، ہاں صوبہ دار تھے جن کے مظالم کے سب شکار تھے۔ علاء الدین کے حرم میں سولہ سو رانیاں تھیں اس کا ذکر اس انداز میں ہے کہ بہ ظاہر اس کی تعریف مقصود ہو، حالانکہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس کی جنسی دیوانگی ظاہر کردی ہے۔ رتن سین ایک سوکن کے بس میں تھا، رام راجہ کہاں گیا اور کہاں رہا اور کیوں گیا جوہری اس بات خاموش ہیں۔ رتن سین چتوڑ واپس آتا ہے پدماوتی بھی آتی ہے، ناگمتی اور پدماوتی کے درمیان ایک عبرت انگیز مکالمہ ہوتا ہے۔ جوہری کے بارہ ماسہ میں بھی مسلم اثر نمایاں ہے مثلاً کنول دی کا یہ کہنا « اماموں کے غموں میں مبتلا ہو » یا « چڑھاؤں اے خضر تیرا میں بیڑا » ہولی اور دیوالی ذکر جوہری کے یہاں دل کی گہرائیوں میں اترجانے والا ہے، جائسی کے یہاں وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔

ایک بڑا فرق دونوں میں پیغام بری کے انتخاب کا ہے۔ جائسی نے مختلف پرندوں کا موسم کے لحاظ سے ذکر تو کیا ہے لیکن ہر پرندے کو پیغام رسانی کے لئے نہیں چنا ہے۔ جوہری نے کنول دی کی زبانی بارہ مختلف پرندوں کو رام راجہ کی جستجو کے لئے پیغام دیا ہے۔ ناگمتی تھک ہار کے رہ جاتی ہے آخر ایک چڑیا (کوئل) خود سے یہ فرض اپنے ذمہ لے لیتی ہے، ناگمتی نے دو پیغام روانہ کئے، ایک پدماوتی کے نام کہ اس سے رحم و کرم کی بھیک مانگے دوسرا رتن سین کے نام کہ اس کی جدائی میں سرسوتی اس کی ماں اندھی

ہوگئی ہے۔ وہ چڑیا جہاں گئی آگ لگاتی گئی، سمندر خشک ہوگئے، جنگل جل گئے، مچھلیاں بھن گئیں، وہ چڑیا بھی اپنی دھن میں پکی تھی، کسی طرح پیغام پہنچا ھی دیا۔ جوہری نے پیغام رسانی کی دقتوں کا ذرا بھی ذکر نہ کیا ہے، جدائی کی شدت اور تندی جو ناگمتی کے یہاں ملتی ہے کنول دی کے یہاں نہیں۔ کانورو کے جادو کا ذکر دونوں کے یہاں ہے، لونا چمارن کے ذکر میں حادو کا اثر ملتا ہے۔ راگ اور راگنی کا بیان دونوں کے یہاں ہے۔ جوہری کی طرح جائسی نے بھی کھانے کے اقسام گنوائے ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے کبیر کے بارہ ماسے کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ بارہ ماسے کا رواج مقامی بولیوں میں بہت ہوا، اودھی، پنجابی، ہریانی وغیرہ زبانوں میں بارہ ماسے کثرت سے لکھے گئے۔ اس کی ایک شکل ہمیں خواجہ مسعود سعد سلمان کے دیوان فارسی میں بھی ملتی ہے، بلکہ اس شاعر نے تو اس طرح کے تین چیزیں پیش کی ہیں، اول غزل شہوریہ، جس میں فارسی مہینوں کے نام ہیں، بارہ غزلوں میں بارہ مہینوں کا ذکر ہے، ہر غزل میں سات اشعار ہیں، غزلیں مختلف اوزان و بحور میں ہیں، سطح میں ہر ماہ کا ذکر کرکے موسمی کیفیت کا بیان ہے اور یہ غزلیں بادشاہ کے مدح میں دعا پر ختم ہوتی ہیں ہر غزل میں ابوالملوک ملک ارسلاں ۵۰۹۔۵۱۲ ھ (۱۱۱۵ع۔ ۱۱۱۹ع) کا نام آتا ہے:

بهشت است گیتی ز اردی بهشت ٭ هلال آمد اے مه مے اندر بهشت
به شادی نشین و مے لعـــل خواه ٭ کـه بے مے نشستنت زشت ز اشت

دوم غزلیـات اسبوعیـه اور سوم غزلیات یامیه، ان دونوں میں بھی وہی رنگ ہے، فرق یہ ہے کہ بارہ مہینوں کے عوض ہفتے اور روز کا ذکر ہے، مثلاً:

زحل والی شنبه است اے نگار ٭ مرا ایں چنیں روز بے مے مدار

خواجہ مسعود سلمان ایرانی شاعر نہیں، یہ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ ان کی شاعری کا زمانہ ۴۶۹۔۵۱۵ ھ (سنہ ۱۰۷۶۔۱۱۲۲ع) کے قریب ختم ہوتا ہے۔

اردو میں سب سے قدیم بارہ ماسہ جس کی مکمل نقل موجود ہے وہ افضل جھنجھانوی کا ہے، یہ افضل شمالی ہند کے شاعر تھے جو ۱۰۳۵ ھ (سنہ ۱۶۲۵۔

۱۶۲۶ع) میں مرے ، ان کی داستان محبت کا ذکر والہ داغستانی نے ریاض الشعراء میں قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس سے ان کی شخصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

افضل کی بارہ ماسے کا ذکر تو بارہا ملتا ہے میر حسن نے اس کا ذکر کیا ہے ، سپر نگر[1] نے اپنی فہرست میں قائم چاند پوری کے حوالہ سے اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ بارہ ماسہ کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے مگر آج تک مکمل بارہ ماسہ شائع نہ ہوا۔ ڈاکٹر اختر احمد نے کل چار اشعار لکھے ، پروفیسر محمود شیرانی نے صرف ۱۶۶ اشعار نقل کئے اور ایک شعر :

به یاد دلربا خوش حال می باش
گہے افضل گہے گوپال می باش

صفحہ ۲۴۳ پر لکھ کر والہ داغستانی کے بتائے ہوئے قصہ کو صحیح مان لیا۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے بارہ ماسے کی کل ۳۲ اشعار دئے ہیں اور انڈیا آفس کے کتب خانہ کا ذکر کرتے ہوئے متعلقہ نمبروں کو بھی درج کردیا ہے۔ مکرمی قاضی عبد الودود مدظلہ نے ایک روز مجھے ایک نوٹ بک دیا جس میں افضل کے بارہ ماسے کی نقل ہے ، یہ نوٹ بک ایک بیاض کی شکل میں ہے ، کتابت اور کاغذ کی شان اور رنگ یہ بتلاتا ہے کہ یہ نقل سو سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اس میں ۱۸۹ ایک سو نواسی اشعار ہیں جن میں صرف چار تمہید کے ہیں ، اس بارہ ماسے کی ابتدا ساون سے ہوتی ہے۔ میں نے اس کا تذکرہ محترمی فصیح الدین بلخی مدظلہ سے کیا تو انھوں نے کہا « میں حیدرآباد سے ایک بیکٹ کہانی لایا ہوں ، اس میں ایک بارہ ماسہ ہے اس کا مصنف کوئی احقر ہے » میں نے یہ بیکٹ کہانی ان سے لے کر پڑھی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں جو اشعار ہیں وہ تو قاضی صاحب موصوف والی بیاض میں بھی ہیں۔ میں نے ایک ایک کرکے دونوں نسخوں کو ملایا تو پتہ چلا کہ قاضی صاحب موصوف والے نسخہ میں کل ۱۹ (انیس) اشعار ایسے ہیں جو بیکٹ کہانی میں نہیں ہیں۔ اس بیکٹ کہانی میں ۳۳۹ (تین سو انتالیس) اشعار ہیں ، لیکن چار اشعار دو بار آئے ہیں اس لئے اصلی تعداد ۳۳۵ (تین سو پینتیس) ہوئی ، اس میں ۷۵ (پچھتر) اشعار کی تمہید ہے

اور ۵۶ (چھپن) اشعار بند کے طور پر لائے گئے ہیں ، جن میں فردیات اور دوہرے ہیں. میں نے یہ بارہ ماسہ مکمل نقل کر دیا ہے اور اس کے بالمقابل بائیں جانب قاضی صاحب کے نسخہ کے اشعار کو مناسب جگہ پر لکھ دیا ہے ، اشعار کی ترتیب چونکہ دونوں نسخوں میں مختلف ہے اس لئے میں نے ترتیب وار نمبر دیکر قاضی صاحب موصوف کی بیاض والے اشعار کو نمبر کے ساتھ لکھا ہے ، بیکٹ کہانی کے خاتمہ پر جو عبارت ہے وہ خاتمہ نقل کردی گئی ہے.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیکٹ کہانی افضل کی ہے احقر کی نہیں، کاتب نے غلطی سے افضل کو احقر لکھ دیا ہے . بیکٹ کہانی اور قاضی صاحب والی نقل دونوں ہی میں کتابت کی فاش غلطیاں ملتی ہیں، میں نے املا کی ایسی غلطیوں کو صحیح کر کے لکھا ہے. کہیں کہیں مصرعے نا موزوں معلوم ہوتے ہیں، میں نے ان کو اسی طرح چھوڑ دیا ہے. ڈاکٹر محی الدین زور لکھتے ہیں کہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں جو بارہ ماسہ افضل کا ہے اس میں ۳۰۰ (تین سو) اشعار ہیں، لیکن اس بیکٹ کہانی میں ۳۳۵ (تین سو پینتیس) اشعار ہیں، انڈیا آفس میں ۳۵ (پینتیس) اشعار کم ہیں، وہ دوہروں کے ہیں یا تمہید کے یا اصل قصہ کے اس کا صحیح اندازہ اس بارہ ماسہ کو دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے .

قاضی صاحب والی بیاض میں مندرجہ ذیل اشعار ایسے ہیں جو بیکٹ کہانی میں نہیں ملتے .

۲۱ گھٹا غم کی اومک چھاتی سوں آئی
اری دو نین نے برکھا لگائی

۲۶ کوئی ایسا نہیں پیو سوں کہے ری
کہ مرا حال پیو آکے دیکھے ری

۳۴ یہ ہمراہ صنم سب سکھ کرت ہیں
تمنن بن برہنی نت دوکھ بھرت ہیں

۴۲ بھلے چاندن پیا سنگ ناریوں کوں
بھئی پیدا ہمن سے خواریوں کوں

۵۲ چلا کا تک کہو کیا کیجئے جی
سلونے بن نہیں اب راکھئے جی

٦١ اری یہ ہے نپٹ کپٹی زمانار
کنھیں بھی درد کا حق نا پچھاناں

٦٨ مجھے ناہیں خبر پیو کے ملن کی
نہیں اب آس مجھ جیو کے رہن کی

٧٧ سو سکھیو اری ٹونا کروں ری
پیا کے وصل کی دعوت پر ہوں ری

٧٩ کوئی امید میری بر نہ لایا
دیا مجھکو سبھوں نے دوکھ سوآیا

٨٥ پھری خانہ نصیب ات کاٹے ری
آیا نہ آہ تن میں مارئیے ری

٩١ تمہن بن یک گھڑی سو برس بیتے
نہ یک ساعت ترا انـــدوہ چھوٹے

١٠٩ رنگیلی چوڑیاں سب پھـــر آتیں
سبھی گھر گھر سے اپنے بنکے آتیں

١٢٠ بھروں رنگوں کے مٹکے ساتھ سب کے
اچھی پچکاریاں ہیں ہاتھ سب کے

١٣١ حو کچھ مجھکو سہا دیگا ہونگی
تری باندی کی باندی ہو رہونگی

١٢٣ پیا تجھ بن نمانی ہو رہی ہوں
نمانی چہ دیوانی ہو رہی ہوں

١٦٩ کہ بارہ مانس کوں رت کوں نہ آیا
ارے ظالم اچھوں تو گھر نہ آیا

١٧٣ و الا اختیار من تو بود آں
گرفتم دامت را پیش یزداں

١٧٩ جمال رحمت خود کن مرحمت
خلاصم کن ازیں اندوہ علت

۱۸۲ بڑی عنوان میں ہیں شمع سوزاں
بھئی ہو روشنی ساری منـــدر ماں

اکرام رہتکی المتخلص بہ قطبی نے ایک تیرہ ماسا لکھا ہے۔ تیرہ ماسا میں لوند کا مہینا بھی شمار کرلیا گیا ہے۔ یہ تیرہ ماسہ سنہ ۱۳ جلوس محمد شاہی یعنی ۱۱۴۳ ع (۱۷۳۰-۱۷۳۱) میں تتبع افضل تصنیف ہوا۔ اس میں شاعر جو خود ہی عاشق تھا۔ فراق میں تیرہ ماہ گذار دیتا ہے، آخر تلاش یار سے تھک ہار کر ایک جھونپڑی میں رہنے لگتا ہے اور تصور یار میں محو ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر حقیقی محبت کے راز منکشف ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے پاس اپنے دل میں، اور اپنے ارد گرد اپنے محبوب کو دیکھنے لگتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ارے بیساکھ من موہن کہاں رے — گئے ہیں کیا کوئی برلا مکاں رے
اگر برلا مکاں ہونگے تو کیا ہے — مجھے اس پاس بھی جانا بھیا ہے
چلو اب جیوڑے ڈھونڈھیں دولارا — بنا ڈھونڈھن نہ پائیے پیو پیارا
اگـــر السعی منی خواندۂ تو — ز محنت بس چرا درماندۂ تو
پھروں جھوں دیس کر جوگن کا بھیسا — پا آوں جے عاقبت تیرا ہی دیسا
کرو تم نحن اقرب کو صحی رے — وہی ہے سب جگاں حاضر وہی رے
ارے لوگو تمامی جگ میں جو پا — مجھے باول پنے سیں تھا بچھو پا
مرا دلدار تھا میرے ہی گھر ماں — نٹھا اک بات کے اولھے تھا پنہاں

بعض اندرونی شہادتوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ جوہری نے افضل کا بارہ ماسہ ضرور دیکھا تھا، اور فطری طور پر اس کا اثر بھی ہوا ہوگا۔ میں نے بیکٹ کہانی کے مقابل گوہر جوہری کے ان اشعار کے نمبر لکھ دئے ہیں جو اس میں ہیں لیکن افضل کے رنگ میں ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح جوہری نے اپنی اصلیت قائم رکھی ہے۔ اگر جوہری کے بارہ ماسے کو نقش ثانی بھی مانیں تو اس کی عظمت کم نہیں ہوتی، بلکہ جوہری نے حقیقت کا رنگ اتنا تیز کر دیا ہے کہ اس کا اثر افضل کے بارہ ماسے سے زیادہ نفوذ کن معلوم ہوتا ہے۔

افضل کا دوازدہ ماہہ ایک فرضی قصہ ہے۔ یہ نظم تحریر میں آئی اس

لئے نہیں کہ جذبات نے مجبور کیا بلکہ اس لئے کہ دوازدہ ماہہ کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا۔ جوہری نے مثنوی کا ایک لازمی جزو قرار دے کر اس بارہ ماسہ کو بے ساختگی عطا کر دی۔ یہاں حالات نے مجبور کیا کہ ایک بارہ ماسہ نظم ہوجائے۔ افضل کا دوازدہ ماہہ طربیہ ہے، یہاں ہیروئن اپنے صبر کا پھل پاتی ہے، لیکن جوہری کا بارہ ماسا المیہ ہے اور ایک شدید المیہ۔ رام راجہ آتا تو ہے لیکن کنول دی بیمار ہو جاتی ہے اور اس کی روح قفس عصری سے پرواز کرجاتی ہے۔ افضل نے دوہروں اور فردیات کو شامل کرکے قصہ کی روانی اور جذبات کے تسلسل کو مجروح کر دیا ہے۔ یہاں جذبات کا فطری بہاؤ رک جاتا ہے۔ شاعر نے ہیرو اور ہیروئن کا نام نہ دیکر اس واقعیت میں بھی خلل ڈال دیا ہے۔

جوہری نے اپنے بارہ ماسے کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے جس سے ان کی اختراعی صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ افضل کے اعتبار سے جوہری کا رنگ منفرد اور جدا ہے یوں کہئے کہ افضل کے بتائے ہوئے رستے سے خس و خاشاک کو الگ کرکے ایک خوش نما کیاری بنادی گئی ہے۔ سب سے پہلا کرشمہ جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، وہ اس کی بے ساختگی اور روانی ہے، جذبات، شدید جذبات کا بے پناہ احساس۔ ہر ماہ کنول دی اپنی بپتا کا حال بتاتے ہوئے سامنے آجاتی ہے، صاف بولتی ہوئی، روتی ہوئی اور آرزوئیں کرتی ہوئی۔ وہ شباب اور حسن کی رعنائیوں میں مست ہے، جوش میں آکر ایسی باتیں بھی کہہ جاتی ہے جو دوسروں کے سامنے کہنے کے لائق نہیں لیکن وہ اپنے خیال میں محو ہے، اپنی جوانی اور جوانی کی کار فرمائیوں کا واسطہ دے کر دعوت وصل دیتی ہے اور جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی شان محبوبی کو کس طرح ظاہر کرتی ہے، ملاحظہ ہو:

۱۸۱۴ پیا بن میں بھری برسات روؤں
نہ ہے بر ساتھ کس کے ساتھ سوؤں

۱۸۲۹ مرا مہ مہر سیں تیرے ہے پر نور
کلف کے عیب سین ہے اب تلک دور

۱۸۴۴ پیا کے وصل کی ہوں ایسی بھوکی
کہ جوں سورج کے پیچھوں سورج موکھی

۱۸۵۹ اکارت جائے یہ میری جوانی
پیا پردیس یہ کیا زندگانی
۱۹۶۹ کروں صورت کی اپنی کم بڑائی
مری تصویر کسی نے نہ پائی
۱۹۷۹ بہے ہے باد جاڑا ہو ہے دوناں
مری جوبن مگر پیو بن ہے سوناں
۱۹۸۵ رکھو من مار کیوں کر من سنبھالوں
پیا بن کیوں کے میں جوبن سنبھالوں
۲۰۶۸ تجھے گر حسن پہ اپنے غرور ہے
ہمارا حسن سرکش تجھ سیں رور ہے

ذیل کے چند مختصر ٹکڑوں کو پڑھئے جذبات کا سیلاب امڈ آتا ہے:

۱۸۳۹ پیا بن ہو پڑی میں آج بے بس
۱۸۴۸ گھڑی جلتی ہوں نت آنسو کے جل میں
۱۸۵۷ ملا ریں بس کے انکھوں بہ چلے نیر
۱۹۰۹ ہمارے کنت باہر کوں آسا
۱۹۲۲ کروں میں آہ تو تیرا جلے پر
۱۹۶۱ دیوانی کی کوئی سنتا نہیں بات
۲۰۱۰ جلی کوں خوش لگے کب رنگ اور راگ
۲۰۲۵ جلی ہوئی ہماری آگ لیکر

جب سے کنول دی کا پتی پردیس جاکر اس کو بھول گیا ہے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی ہے کہ وہاں رام راجہ نے کسی اور سے محبت کرلی ہے، وہ اپنی سوت اور اس کی خوش بختی کو یاد کرکے تلملا جاتی ہے اور سوتن کو جادوگرنی سمجھ بیٹھتی ہے جس نے جادو اور ٹونا کی مدد سے رام راجہ کے دل سے کنول دی کی محبت نکال پھینکی۔ عورت سب کچھ سہ سکتی ہے مگر سوت کی تکلیف وہ برداشت کر ہی نہیں سکتی۔ شاید اس کو اسی خیال نے مریض کردیا اور اسی مرض نے اسے ہلاک بھی کرڈالا۔

۱۸۴۲ رکھا پیو کوں بھورا جن ناز میں پائے
ہمارا درد و دوکھ تو اس سیں کہ جائے

۱۸۴۵ بھنور ہوکر کے الجھے کس کنول میں
رہے لپٹائے کس سوتن کے گل میں

۱۹۷۱ کیا کن بد قماش اس مہ کوں برھم
مری شمشیر کے گھائل کو دے دم

۱۹۷۲ رہا کس کا غلام ہوکر مرا تاج
کہ جس کے بن ہوا سوہاں مرا راج

۲۰۶۵ کہ جا پردیس میں گھر کو بھلاؤں ناں
کسی مہ کوں گلے ہر شب لگاؤں ناں

بارہ ماسوں میں محبوب سے جدائی کے نت نئے تجربے راگ اور نغمہ کی مدد سے ہم تک پہونچائے جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ یہ قطرات اشک ہیں جو دامن پر گرتے رہتے ہیں. ایک سال کے مختلف جذبات اور گونا گوں خیالات کو ربط اور آہنگ مل جاتا ہے. کنول دی سراپا انتظار ہے، وہ اپنے دور افتادہ شوہر کی جدائی میں بے قرار ہے اور بہ جز اشک ریزی کے دوسرا مشغلہ نہیں رکھتی، چاہتی ہے کہ اپنی ناکامیوں سے کام لے، اسی لئے جذبات بڑے تند و تیز ہوگئے ہیں، اور جب جذبات میں تندی آتی ہے تو فنی تصور (Crafts'manship) کا گذر نہیں ہوسکتا. جوہری نے بھی اس بارہ ماسے میں فنی کمال کو پاس آنے نہ دیا وہ کنول دی کے ساتھ ہر شئی کو جذبات کے طوفانی سمندر میں غرقاب کردینا چاہتے ہیں.

ہر ماہ کا اس موثر انداز میں ذکر ہے کہ اس کی ساری خصوصیتیں اور اس میں آنے والے تہوار کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے. اس میں جتنے پھول اور پرندوں کا ذکر ہے سب جانے پہچانے ہوئے ہیں. سنسکرت کے ریتو ورنن میں بھی بعض پرندوں کا ذکر آتا ہے لیکن جس اہتمام سے جوہری نے پرندوں کو پیغام بری سونپی ہے وہ کسی دوسرے بارہ ماسے میں نہیں. بارہ ماہ کے لئے بارہ پیغام بر چنے گئے ہیں، بھنگم، کوکلا، کوئل، کھنجن، سبزک، سرخاک، سارس، کبوتر، بسنتا، بلبل، کاگ اور سوا.

افضل نے صرف کاگ اور سبزک کا ذکر کیا ہے، سندیسا ان کی زبانی ضرور بھیجا ہے، کاگ اور سبزک کی شکایت بھی ہے لیکن وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو جوہری کے یہاں ہے۔

زبان کے معاملے میں جوہری ایک باشعور شاعر ہوجاتے ہیں، اس بارہ ماسے میں انھوں نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے کہ کنول دی کے منہ میں ایسی زبان دی جائے جو ان کو چھج سکے، وہی جوہری جو اس مثنوی کے دوسرے حصوں میں فارسی اشعار اور فارسی مصرعوں کو بے دریغ کام میں لاتے ہیں، اور فارسی و عربی الفاظ کی ایک فوج کھڑی کردیتے ہیں، داستان کے اس حصے میں آکر بدل جاتے ہیں اور بارہ ماسہ کے ۳۳۶ اشعار میں ایک شعر بھی فارسی میں نہیں کہتے۔ صرف تین مصرعے شعر ۲۰۷۹، ۲۱۲۴ اور ۲۱۲۶ میں فارسی کے استعمال ہوئے ہیں۔ عربی الفاظ گویا نہیں لائے ہیں اور فارسی الفاظ جو لائے بھی ہیں تو بہت کم، ہندی اور بھاشا کے نرم الفاظ اور ملائم بندشوں سے زیادہ کام لیاہے محاورات بھی ہندی کے ہی ہیں۔ فارسی کے جو الفاظ آئے بھی ہیں تو ان سے بارہ ماسے کے مزاج میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، ابتدا سے انتہا تک اس کا مزاج ہندی ہی ہے، لب و لہجہ پر دیہقانی انداز نمایاں ہیں، اور نسوانی طرز گفتگو آشکار۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کنول دی کی زبان اپنی ہے، اس کے صدمات اپنے ہیں، اس کے جذبات اور تجربات اپنے ہیں، ایسا نہیں کہ جوہری نے اپنی زبان اپنے جذبات اپنے تجربات یا اپنے صدمات کو اس کے دل میں ڈال دیا ہے یا اپنے جذبات و تجربات کو اس سے وابستہ کر رکھا ہو، اشعار مندرجہ ذیل سے اس کی صداقت معلوم ہوجاتی ہے:

۱۹۲۰ ارے اندھے کوں یہ جو وامیا ہے
رقیب بوالہوس کس کا جیا ہے

۱۹۳۴ تجھے ہر روز ملتا ہے ترا جفت
گیا وہ لال میرا ہاتھ سیں مفت

۱۹۴۲ سبھوں کو ہیگا اپنے کام سے کام
عجب خود غرض آیا ہے یہ ایام

۱۹۴۶ کہاں وے دن کہاں وہ عشق کا جوش
شراب وصل سیں رہتی تھی مدہوش
۱۹۹۲ کئی طرحوں کئی روپوں کئی رنگ
مرے شوقوں کوں کر اظہار پیو سنگ

یہی نہیں جوہری نے کمال تو یہ کیا کہ تصوف کی بعض باتیں بھی کول دی کی زبانی کیسے پیارے انداز میں کہہ دی ہیں اور فنا فی اللہ کو کس خوبی اور محبوبی کے ساتھ ذھن نشین کرادیا ہے :

۱۹۳۱ تحوں چوں چار عنصر چار دابے
ملوں تب جائے کر پیو سوں اپابے
۱۹۱۴ حواس خمس کوں تج پیت جوڑوں
رقیباں سب کے میں پنجرے کو توڑوں

مختصر یہ کہ جوہری کا یہ بارہ ماسہ دوسرے بارہ ماسوں سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔ یہ فراقیہ ہے اور فراقیہ انتہا تک رہا۔ بعد کے چار اشعار ۱۰۲ و ۱۳۷ ۱۸۳ اور ۲۵۴ اتنے فصیح اور سلیس ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور کچھ شک بھی ہوتا ہے کہ یہ الحاقی ہیں۔ بارہ ماسہ کے چند اشعار سپرد قلم ہوتے ہیں۔

۱۸۴۶ کول ہوں میں کول دی ہے مرا نام
مجھے جل بیچ بن سورج نہ آرام
۱۸۴۹ بوجھے پانی سیں نہیں یہ آگ میری
اری کیسی ابھاگی بھاگ میری
۱۸۶۳ اگن دوکھ کی نہیں جاتی سنبھالی
ہوئی ہوں جل کے میں کوئل سی کالی
۱۸۷۱ تمہیں تو دیکھنے کی پیت تھی میت
جو گھر چھوٹا کہاں تریا کہاں پیت
۱۹۴۰ اگر تجھ میں وفا کی بوے کچھ ہوے
مرے آنسوں کوں لے پیو پاس جاروئے
۱۹۵۳ کہاں ہیں وے سہاگوں کے مرے دن
پیا پوچھے نہیں کس کی سہاگن

۱۹۵۴ جو میں شادی سیں جاموں نہیں سہاتی
رہی ہوں سوکھ جاڑوں تھرتھراتی

۲۰۰۰ ارے پھاگن کے ایسے دن مزے دار
چلے جاتے ہیں مفت ہے گھر نہیں یار

۲۰۳۳ پھری پھرتی ہوں اس گل بن ڈنواں ڈول
کروں کا لیکے غنچہ کا کروں پھول

۲۰۳۴ صبائیں غنچۂ دل وا نہ کیّا
میری کلیوں کا کچھ سیوا نہ کیا

۲۰۴۱ تجھے تو گرمی بازار ہے گل
مری آنکھوں میں آتش زار ہے گل

۲۰۴۲ جلے گا گل لگے گی باغ میں آگ
اری بلبل شتابی بھاگ تو بھاگ

۲۰۵۱ نسیم نو بہا ہے زندگانی
گلوں کے بو سیں اوڑے ہے جوانی

---

* جناب عابد رضا بیدار

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سنہ ۱۸۷۳

« ۱۸۷۳ ع میں گزٹ کی آٹھویں جلد شروع ہوئی ۱۸۷۰ ع، ۱۸۷۱ ع اور ۱۸۷۲ ع کی فائل مجھے ابھی تک نہیں مل سکی ہے لیکن ان کی خاطر گزٹ کے جو فائل فی الحال میسر آسکے ہیں ان کی پیشکش میں تاخیر میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ہر سال کے مندرجات میں حاصی معقول تعداد میں اتنی اہم چیزیں مل جاتی ہیں حںکے اشاریہ کی پیشکش میں عحلت ضروری بھی ہے مفید بھی۔ ۱۸۷۳ ع کے گزٹ میں جو اہم مندرجات ہیں انہیں میں ے تاریخ وار درج کر دیا ہے، آپ انہیں بیچے کی سطروں میں ملاحظہ کر لیں۔ ویسے اس سال کی اہم ترین تجویز اور اس سلسے کی تحریروں کا حوالہ اپنی حگہ پر تاریح وار دینے کے بجائے یہ بہتر حیال کرتا ہوں کہ آپ سے تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے یہیں اس کا تذکرہ کردوں۔ یہ تجویز ایک «انگریزی اخبار» کی اشاعت کے بارے میں تھی جس کا کام صرف اتنا ہو کہ وہ «ہندوستانی احباروں» کی رایوں کا ترجمہ چھاپا کرے۔ ۲۸ فروری کے گرٹ کے اداریہ میں اس عنوان سے یہ تجویز پہلی بار پیش کی گئی۔ « تجویز» ایسے حالات میں جب انگریزوں کو یہ سمجھانا قطعاً صروری تھا کہ ہندوستانیوں کی ان کے انتظام وانصرام کے بارے میں کیا رائیں ہیں» کیسی ضروری اور کتنی مفید تھی اور کتنے دور رس نتائج کی حامل تھی، اس پر طویل گفتگو فضول ہے۔ اس گرٹ نے اس تجویز پر جو تبصرہ کیا ۲۱ مارچ کی اشاعت میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے

---

* جناب عابد رضا بیدار۔ رضا لائبریری۔ رام پور

(۱) اسے نوائے ادب اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ میں گرٹ کے پہلے چار سال کے اشاریہ کی دوسری قسط کے طور پر ملاحظہ کیا جائے۔

اور ۲ مئی کے پرچے میں، پایونیر وغیرہ اخبارات نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے «ہندوستانیوں کی رایوں کا کیا حال ہے»۔ اودھ اخبار نے اپنے ایک اداریہ میں اس تجویز پر اظہار خیال کیا جس پر گزٹ، کی ۲۳ مئی کی اشاعت میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ چند اور اخباروں نے بھی اس سلسلے میں مخالفت یا موافقت کے انداز پر اظہار خیال کیا، اینگلو انڈین اور اردو اخباروں میں اس تجویز کا عام چرچا قابل لحاظ ہے۔ ویسے گزٹ کی موجودگی میں جو انگریزی اردو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا، خود گزٹ والوں کے لئے تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس قسم کا ایک اور اخبار نکال ڈالتے، کسی اور کو اتنی توفیق نہ ہوئی۔ تجویز میں کتنی دور اندیشی اور دانشمندی، کتنی سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت پنہاں ہے! آج نوّے برس کے بعد بھی ایک ایسے انگریزی اخبار کی ضرورت ہے جو صرف اردو پریس کی رایوں کا خلاصہ پیش کردیا کرے، اور ان اہم خبروں کا ترجمہ دیا کرے جسے انگریزی پریس نظرانداز کرجاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج ایسا اخبار تو کجا ہمارے پاس گزٹ جیسا کوئی اخبار تک موجود نہیں، ایسا لگتا ہے جیسے سائنسی اکتشافات کے سوا ہر فکری میدان میں ہم اپنے پیش رو دیو زادوں کے مقابلے میں بونے بنتے جارہے ہیں۔

ایسی پیاری تجویز پیش کرنے والوں کے سامنے میں ادب سے اپنا سر جھکاتا ہوں اور ان کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ اتقوا بفراسة المومن!

اب آپ اشاریہ ملاحظہ فرمائیں:

«ہم کو اس خبر کے سننے سے افسوس ہے کہ آئندہ ہندو رفارمر، بمبئی، موقوف ہوجاوے گا» (۳ جنوری)

«اضلاع متوسط کی عدالتوں میں ناگری حروف کا جاری ہونا، ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ع سے» (۳ جنوری)

« سید حسین صاحب، پروفیسر عربی، کینگ کالج، لکھنؤ، نے دیسی زبان کے واسطے علمی اصطلاحات کی نسبت ایک رسالہ چھاپا ہے. مصنف کتاب نے جس مشکل کا ذکر کیا ہے، یعنی یہ کہ انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے واسطے ہم معنی اصطلاحات دیسی زبان میں موجود نہیں ہیں، وہ حقیقت میں ایک بڑی مشکل ہے، لیکن اگر سید صاحب کی رائے پر عمل کیا جاوے تو وہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے، حس کا حل ہونا ناممکن ہو. یہ مشکل صرف اس صورت میں خاطر حواہ رفع ہوسکتی ہے کہ یکساں الفاط استعمال کئے جاویں، چنانچہ اسی غرض سے یہ رسالہ تیار کیا گیا ہے. ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ہسٹر صاحب اس رسالے کو ملاحظہ فرماویں گے » (۱۰ جنوری)

« پنڈت دیانند سرستی، حو ت پرستی کے موقوف کرنے میں نہایت بہادری کے ساتھ کوشش کررہے ہیں، اور جنھوں نے حال میں مقام بنارس میں ایک عام مذھبی حلسہ میں بنارس کے تمام پنڈتوں کو معلوب کیا تھا اور تمام شمالی ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، بالفعل کلکتہ میں وارد ہوئے ہیں....» (۱۰ حنوری)

« صائب کا مقولہ اور آگرہ احبار: صائب حو کہ ایک عالی دماغ اور نازک خیال شاعر تھا، جب اس نے یہ شعر کہا حس کا ایک مصرع یہ ہے :-

جامہ را فاختی ساختۂ یعنی چہ

تو اس کے اس بے نظیر شعر کا نہایت شہرہ ہوا اور جو اس مذاق کے لوگ تھے اور اس نازک دماغی کے قدر شناس تھے انھوں نے صائب کی نہایت مدح کی. رفتہ رفتہ یہ شعر ایک ایسے مدرسے میں بھی پہنچا حس میں ایک شاخ عربی کی بھی تھی، وہاں کے طلبا نے جب اس شعر کو سا تو کوئی اس پر ہنسا، کسی نے اس پر کوئی اعتراض کیا. کسی نے اس کو محمل بتایا، غرض کہ آخر کار یہ شعر مدرسے کے مدرس اول کے پاس گیا، انھوں نے کمال ذہانت اور نہایت جودت طبیعت سے ہنس کر یہ فرمایا کہ «صائب خطاکرد؛ چرا کہ خطاب را بصیغۂ غائب تعبیر نمود. در شعر او لفظ یعنی کہ بیایے تحتانی است بتائے تحتانی می باید کہ مقام خطاب است» اس اصلاح کی خبر صائب کو بھی پہونچی اور تمام مراتب (جو اس شعر فہمی) میں عربی کی شاخ کے طلبا سے حل ہوئے تھے، سب صائب کے روبرو

بیان کئے گئے . صائب نے جب معلوم کیا کہ میرے بے نظیر شعر کی مٹی خراب ہوئی تو وہ بے چارہ رویا اور متاسفانہ اس نے کہا کہ «افسوس شعر مرا بہ مدرسہ کے برد» یہی کیفیت ہم کو اس وقت آگرہ اخبار مطبوعہ ۲۰ دسمبر میں ان تحریروں کے دیکھنے سے آرہی ہے جو مدرسۃ العلوم کی بابت ہیں. جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مدرسۃ العلوم کی روئداد یں اور جناب مولوی سید احمدخانصاحب کی سنجیدہ رائیں آگرہ اخبار کے دفتر میں کسی نے پہنچا دیں تو بھی ہم کو کچھ کم افسردگی نہیں ہوتی. جس شخص کی یہ تحریریں ہیں، وہ اپنے آپ کو بے تکلف غریبوں کا ہمدرد بتاتا ہے اور اپنے تمام مضمون میں لکھتا ہے کہ غریبوں کو اس مدرسے سے کیا فائدہ ہوگا اور اس کو اس بات سے بڑی مایوسی ہے کہ مسلمانوں کی فقہ، حدیث، تفسیر سے بھی غریب بے چارے محروم ہوجاویں گے، صرف امراء ہی بہرہ یاب ہوں گے. مگر ہم اس بات سے نہایت خوش ہیں کہ ظاہرا اس میں اصل مدرسے کی تدبیر کی نسبت کوئی طعنہ نہیں ہے ....» (۱۰ جنوری)

« بالفعل گورنمنٹ کی یہ رائے ہوئی ہےکہ ہر ضلع کے صدر محکمہ میں ایک ایک کتب خانہ قانون کی کتابوں کا قائم کیا جائے .....» (۱۰ جنوری)

« تتمۂ مضمون اصلاح و تہذیب اخبار » ۔ منقول از پٹیالہ اخبار (۱۷ جنوری)

« اس بات پر اظہار مسرت کہ گزٹ میں سنہ ۱۸۷۰ع میں جن انگریزی کتابوں کی فہرست چھپی تھی، اس ذیل میں کہ علی گڑھ اور بہار سین ٹیفک سوسائٹیوں کی طرف سے اس کے اردو ترجمے ہوئے تھے، اور ہوئے، ان کی کتابوں کے بارے میں گورنر جنرل نے بنگالہ، ہندی اور اڑیا میں بھی ترجمہ کی سفارش کی ہے، گزٹ کا حوالہ دیتے ہوئے» (۱۴ فروری)

« پایونیر سے منقول: یہ جو عمدہ کام سید احمد خان بہادر سی. ایس. آئی. نے تجویز کیا تھا وہ اب نہایت ترقی پر ہے، بنارس سے ہمارے پاس یہ خبر آئی ہے کہ جو اجلاس مجلس « خزنۃ البضاعۃ کا ۱۰ فروری کو ہوا تھا اس میں منجملہ ۵۲ ممبروں کے ۴۷ ممبروں کے اتفاق رائے سے یہ بات تجویز ہوئی کہ کالج مجوزہ علی گڑھ میں قائم کیا جاوے.....» (۲۱ فروری)

« جو کتاب مسٹر اسٹیپلی صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول الہ آباد نے انگریزی

سنے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کی مہارت پیدا کرنے کے واسطے لکھی ہے ... اس قسم کی کتاب کی آج کل نہایت ضرورت تھی ... » (٢١ فروری)

« انگریز لوگ اس ملک کے باشندوں سے کیوں نہیں ملتے جلتے : غازی پور میں ایک لکچر » گزٹ میں ہی انگریزی اردو دونوں زبانوں میں ہے . (١٤ مارچ)

« طریقۂ تعلیم و سلسلۂ تعلیم جس طرح پر مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان میں ہونا چاہئیے . مجوزۂ سید محمد محمود ، ممبر ، مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین » (٢١ مارچ)

« کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کی مفصل روداد » (٢٨ مارچ)

« رفع الرام » : محمد عارف کا خط سید احمد خاں کے مضمون کے سلسلے میں (١١ اپریل)

« کسی قوم سے باہمی میل جول کے لئے اتحاد مذہبی کیا ضرور ہے » (١١ اپریل)

« دار العلوم مسلمانان : منقول از تہذیب الاخلاق » (٢٨ مارچ ، ١١ اپریل)

« دنیا میں صرف شہرت ہی نیکی کا صلہ ہے » از کاشی ناتھ (١٨ اپریل)

« قول فیصل ، سید احمد خان کے باب میں » از احمد خان صوفی مہتمم مطبع مفید عام آگرہ (١٨ اپریل)

« گزرا ہوا زمانہ » (منقول از تہذیب الاخلاق) از ایس . ایم . سید احمد (١٨ اپریل)

« بحث و تکرار » ،، ،، از سی . ایف . سید احمد (١٨ اپریل)

« صاحب اودھ اخبار کے خیال پر تعجب (٢٥ اپریل) : اس سلسلے میں کہ سید احمد خان کے ساتھی ان کی جملہ رایوں سے بلا سوچے سمجھے اتفاق کرتے ہیں .

« پاینیر سے سید احمد خاں کے قیام بنارس کی ایک رپورٹ » ، منقول . (٢٥ اپریل)

« خیوا اور اس کے باشندوں کا بیان » (٢٥ اپریل)

« اودھ کو اضلاع شمال و مغرب کے ساتھ ملادیا جائے، اس تجویز کی عام طور سے مخالفت کے حلاف گزٹ بے موافقت کی ہے » (۲ مئی)

« مدرسة العلوم مسلمانان » کے سلسلے میں لاہور سے ایک خط (۲ مئی)

« اودھ اخبار کی اس تجویز پر کہ عورتوں کے لئے مخصوص اخبار نکالا جائے تبصرہ » . (۹ مئی)

۹ مئی: « دیسی زبانوں کی قابل پسند کتابوں کے مصنفوں کو انعام: بلحاظ اشتہار گورنمنٹ...... مورخہ ۲ اگست ۱۸۶۸ع . »

حناب لفٹنٹ گورنر بہادر اعلان فرماتے ہیں کہ ۲۹ کتابوں کے لئے انعام مرحمت کئے گئے جن کی کل تعداد ۵۵۵۰ روپے ہیں، کتابیں حو انعام کے لئے منتخب کی گئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اخلاق اور مضامین مختلف: ۸، تعلیم (عام) ۲، تعلیم نسوان ۵، ریاضی ۲، ہیئت ۲، طبعیات ۲، ناٹک ۲، تاریخ اور جغرافیہ ۴، علم حیوانات ۱، حفظ صحت اور صفائی ۱ کُل ۲۹.

اردو: ۱. رسالہ علم ہیئت (مولوی صمصام الحق) ۲. داستان دانش آموز، حوادث سماوی و ارضی کی ابتدائی کتاب (عبید اللہ العبیدی، ہوگلی کالج) ۳. ریاضی کے ۲۴ رسالے، سلسلہ وار (ذکاء اللہ میور کالج - الہ آباد) ۴. صبح صادق: اخلاق کا اردو رسالہ (کالکا پرشاد، کانپور) ۵. تلخیص الفوائد: رسالہ زبان فارسی کے بیان میں ۶. محبوب القلوب: تعلیم اور کسرت وغیرہ کے فوائد کے لئے باب میں (بشیشر پرشاد، گیانپور) ۷. تنبیہ التعلیم (محمد مبارک اللہ، متھرا) ۸. تشریح الفرس، (اجودھیا پرشاد، بریلی کالج) ۹. تہذیب المستدی: قصے کہانیاں، نصیحت آمیز، ترجمہ انگریزی (کشن لعل) ۱۰. کحل الجواہر: حفظ صحت اور صفائی وغیرہ کے بیان میں، (مصلح الدین آگرہ) ۱۱. رسالہ فیض عام: علم ہئیت کا ایک رسالہ، عام فہم (سید تہور علی الہ آباد) ۱۲. تعلیم نسوان: ہنود عورتوں کی تعلیم کے بارے میں، (چتر بھوج سہائے آگرہ) ۱۳. مخزن العلوم: رسالہ در باب خواص ذاتیہ اجسام و حرکت و جر ثقیل وغیرہ (للتا پرشاد، کانپور) ۱۴. تعلیم النساء (دیبی پرشاد، اجمیر) ۱۵. گلدستۂ آداب: ادب کی حکایتیں (دیبی پرشاد اجمیر) ۱۶. آئینۂ خرد: عورتوں

کی تعلیم اور ان کے کاموں کے بیان میں (عبدالرحیم آگرہ) ١٧. مرات الایشیا : جغرافیہ (کلیان رائے، میرٹھ) ١٨. وقائع درانیاں: ترجمہ ایک فارسی کتاب کا (سید احمد، نارمل اسکول، دہلی) ١٩. ماثر النسا: ترجمہ کسی کتاب کا (تفضل حسین آگرہ) ٢٠. اردو ترجمہ ٹلر صاحب کے رسالہ اثبات بہ دلالت مطالقی، حصہ اول (ولیمس سینٹ جان، آگرہ) ٢١. رونق ہند: فوائد حکومت انگریزی (حسین علی مرزاپوری) ٢٢. منہاج السعادت: تعلیم نسوان (وزیر علی، بریلی)

ہندی: سچی بیرتا: ترجمہ ایک رسالہ اردو سچی بہادری کا (پنڈت رام نرائن بریلی) ٢. استری بچار: اخلاق کی باتیں (ہری ہر ہیرا لعل. میرٹھ) ٣. بھوگول، ضلع اٹاوہ (دیبی دین، تحصیل لکھن) ۴. بھوگول چندر ادے: جغرافیہ عالم (دولت رام، کاسگنج) ۵. گنت چندر ادے: علم حساب میں (چمن لعل، کاسگنج) ٦. اتر رام چرتر: ایک سنسکرت ناٹک کا ترجمہ (پنڈت دیودت، بریلی کالج) ٧. وکرم ارویسی: ترجمہ سنسکرت ناٹک کا (رام پرشاد تیواری، الہ آباد).

انعام کی کل رقم؛ اردو: ۴۹۵۰ روپیے، ہندی: ٧٠٠ روپے.

اس کے بعد آئندہ سال کے لئے انعامات کا اشتہار ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ :-

« اس غرض سے جو کتابیں ترتیب دی جائیں وہ تصنیف ہوں یا تالیف، حتیٰ کہ اگر کسی دوسری زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے وہ سب منظور ہونگی. مگر مذہبی کتابیں یا ایسی کتابیں جن میں تہذیب اخلاق کے خلاف کوئی بات لکھی ہو قبول نہ ہونگی. سوائے اس کے اور کوئی قید مطالب یا طرز کی نسبت نہیں ہے. مضمون کتاب کا خواہ علم تواریخ سے متعلق ہو، خواہ مشہور لوگوں کے تذکرے سے یا سیر و سفر کے حالات سے، یا کسی علم و فن یا فلسفہ سے؛ اور ان میں واقعی سرگزشت ہوں یا خیالی اور فرضی، اور نظم میں لکھی جائیں یا نثر میں، صرف غرض یہ ہے کہ کتاب سے کوئی عمدہ غرض حاصل ہو؛ چاہیے تعلیم کی نسبت ہو یا تفریح یا تہذیب عقل و ادراک کی نسبت میں؛ اور اس ملک کی مروج زبانوں میں اردو یا ہندی میں لکھی جائے اور مطلب اور عبارت دونوں میں خوبی ہو ..... ہندوستان کی مستورات کے پڑھنے کے لائق جو کتابیں ہونگی وہ خاص کر پسند

اور قبول کی جائیں گی»۔ (۹ مئی)

آرٹیکل: سوختیم و سوزش ما بر کسی ظاہر نہ شد
چون چراغان شب مہتاب بیجا سوختیم

« اس شعر کی درد ناک صدا ہم کو آج کل مولوی سید احمد خان صاحب کی زبان حل سے آتی ہے اور ہم تو بشر ہیں، پتھر بھی ایسی درد آمیز آواز کو سن کر کبھی پگھل جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ » ۔ (۱۶ مئی) اودھ اخبار مورخہ ۶ مئی میں مولوی نورالحق کا ایک خط مدرسۃ العلوم کے قیام کی مخالفت میں چھپا ہے اسی پر یہ آرٹیکل لکھا گیا ہے۔

« تعزیت نامۂ محمد عثمان خاں، مدارالمہام ریاست رام پور، جو ۱۰ مئی سنہ ۱۸۷۳ ع مطابق ربیع الاول ۱۲۹۰ ھ «راہی ملک بقا ہوئے»۔ (۱۶ مئی)

« درخواست بخدمت مہاراجگاں و راجگاں و نوابان و سرداراں وایڈیٹراں و اہل علم و خیرخواہان ہندوستان » اس عنوان سے کیشب چندر متر نے تفصیل سے ملکی ترقی کے لئے ایک پلان پیش کیا ہے جس میں فنون مفیدہ کی تعلیم (پروفیشنل ایجوکیشن)، ہندوستانی طلبا کو انگلستان بھیجنا اور دیسی زبانوں میں انگریزی سے فنون مفیدہ پر کتابوں کے ترجمے پر زور دیا ہے۔ (۱۶ مئی)

« ہندوستان کی پرانی رسمیں » : از پادری رجب علی، او۔ ایس۔ ایچ۔ (۱۶ مئی)

« وفی السماء نجوم لا عداد لہا		ولیس یکسف الالشمس والقمر
وکم علی الارض من خضرویا بسہ		ولیس یرجم الا ما ھو الشجر

یہ دو شعر عربی کے بلا شبہ مولوی سید احمد خان صاحب کے حسب حال ہیں جنکا ترجمہ یہ ہے کہ آسمان میں ستارے بہت سے ہیں مگر گہن لگتا ہے تو صرف چاند اور سورج ہی کو لگتا ہے، اور گو دنیا کے پردے پر خشک گھاس پھوس بہت ہے مگر پتھر بارور درخت ہی کے مارتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ » اداریہ (۲۳ مئی)

« مولوی سمیع اللہ خان، علی گڑھ کے صدر الصدر مقرر »۔ (۲۳ مئی)

« ریویو کیا چیز ہے » : از کاشی ناتھ۔ (۲۳ مئی)

« حسن بن عبداللہ (حیدرآباد) کا ایک خط مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان کے بارے میں »۔ (۲۳ مئی)

مسٹر روتلج سابق ایڈیٹر فرینڈ آف انڈیا کے ایک مضمون مطبوعہ میکملس (لندن) کا ترجمہ بہ عنوان «ہندوستان میں بالفعل انگریزوں کی کیا حالت اور غالباً آئندہ کیا حالت ہوگی» . (٢٣ مئی)

«ہندوستانی اخباروں کا ترجمہ اور مہتمم پایونیر اخبار کی رائے.» (٢٣مئی)

اخبار عالم سے «گورنمنٹ رپورٹر» کے عنوان سے ایک مضمون منقول، جس میں گورنمنٹ کے اس رویہ پر نکتہ چینی کی ہے کہ:

«گورنمنٹ ہند کی طرف سے الہ آباد میں ایک صاحب عہدہ دار جن کا لقب گورنمنٹ رپورٹر وربیکلر اخبارات ہے، مقرر ہیں. ان کے ذمے یہ کام ہے کہ جو مضمون نسبت امور انتظامی ملک ہند کے لائق اطلاع گورنمنٹ کے ہو اس کا ترجمہ اخبارات ممالک مغربی اور پنجاب اور اودھ اور سنٹرل پراونسیس سے کرتے ہیں. اور وہ ترجمہ بطور رپورٹ انگریزی اخباروں کے چھاپے کے دفتروں میں تو جاتی ہے مگر کسی ہندوستانی چھاپہ خانے کے اخبار کو نہیں ملتی ہے». (٢٣ مئی)

«ہندوستان کے اخبار» کے عنوان سے اداریہ. (٣٠ مئی)

«مکتوب سر سید بنام راجہ جے کشن داس مورخہ ٩ جون ١٨٧٣ع»: اخبار کی پالسی اور اودھ اخبار سے گزٹ کے جھگڑے کے بارے میں. (٣٠ مئی)

«نیشنل انڈین ایسوسی ایشن، لندن». (١٣ جون)

«ہندوستانیوں کے نکاح وغیرہ کے معاملات کے تصفیہ کے واسطے قاضیوں کا تقرر» (١٣ جون)

«جلسۂ عظیم آباد، پٹنہ، واسطے ترقیء چندہ مدرسة العلوم مسلمانان، اسپیچ ستارۂ ہند مولوی سید احمد خان» (منقول از تہذیب الاخلاق). (٢ جون)

«بمبئی میں ایک عالی ہمت ہندو نے دیا سلائی بنانے کا کارخانہ جاری کیا ہے». (٢٧ جون)

«رزولیشن گورنمنٹ ہند بابت تعلیم ہندوستان، جو «ہندوستان کی رعایا خصوصاً مسلمانوں کے حق میں نہایت ہی اطمینان کا باعث ہے.......». (٢٧ جون)

« مکتوب سر سید بنام راجه رام جے کشنی داس » : سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں. (۲۷ جون)

« مدرسة العلوم مسلمانان اور ستاره ہند مولوی سید احمد خان بہادر » ، اس عنوان سے نجف علی ، گجرات ، پنجاب کی ایک تحریر . (۲۷ جون)

« روس کی نسبت انگریزی اخبار نویسوں کے خیالات » . (۴ جولائی)

« مدرسة العلوم » . (۴ جولائی)

« عوام کالا نعام کے خیالات اور روس و انگلستان کے حالات » . (۴ جون)

« سود کی ڈگریوں کی بدولت غربا کی تباہی » ، اداریه . (۱۸ جولائی)

« ممالک مغربی و شمالی کی دیسی زبان » : پایونیر سے منقول . (۱۸ جولائی)

« مدرسة العلوم مسلمانان » : سرکلر مجلس خزنة البضاعة مدرسة العلوم . (۱۸ جولائی)

« سید نصرت علی کی انگریزی ، اردو سکھانے والی کتاب « مفید عام » پر تبصره » . (۲۵ جولائی)

« بنگاله میں مذہب عیسوی کے بارے میں ایک خط از بنگالی » . (یکم اگست)

« تجویز قیام صدر انجمن مسلمانان پنجاب ماتحت خزنة البضاعة لتاسیس مدرسة العلوم » نقل خط سید احمد خان بنام محمد برکت علی خان آف پنجاب ، و نقل خط سید احمد خان بنام محمد حیات خان بہادر نجم الہند ، و نقل خط جناب محمد حیات خان ، بنام برکت علی خاں : منقول از اخبارانجمن پنجاب . (یکم اگست)

« مہاراجه پٹیاله کی فیاضی کا شکریه اور مسلمانوں کی « غیرت » پر افسوس » : مہاراجه نے مدرسة العلوم کے لئے تین سو روپے دیے ہیں . (۸ اگست)

« اخبار نویسوں کی آزادی کیاچیز ہے » . (۸ اگست)

« امید کی خوشی » : منقول از تہذیب الاخلاق . (۸ اگست)

« عرضی باشندگان ممالک مغربی و شمالی بدرخواست اجرائے حروف ناگری بجائے حروف فارسی » . (۱۵ اگست)

« تبصره ، کتاب الراحة : الموسوم بالواسطه الی معرفت مالطا وکشف المخبا عن

فنون اوربا، مؤلفۂ ۱۲۷۹ - ۱۲۸۳ ھ، مطبوعۂ توس (عربی). (۲۲ اگست)

« اشتہار کتاب حمایت الاسلام، مصنفۂ گاڈ فری ھگس، جسے سید احمد خان نے اردو میں ترجمہ کراکے مطبع صدیقی بریلی، سے چھپوایا ہے، سید احمد خان سے مل سکتی ہے ». (۲۲ اگست)

« اخبار کی بے وقعتی کے اسباب »، اداریہ. (۲۹ اگست)

« گورنمنٹ کا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھہ »، ار کے. ایں. (۲۹ اگست)

« رام پور کے نواب کلب علی خان کی تصانیف قندیل حرم اور شگوفۂ خسروی پر نوٹ ». (۵ ستمبر)

« حکیم احسن اللہ خان رئیس دہلی کے انتقال کی اطلاع »، اکمل الاخبار سے منقول. (۵ ستمبر)

« علی گڑھہ میں مسلمانوں کی ترقی کے آثار ». (۵ ستمبر)

« الہ آباد میں بھیڑیوں میں پلنے والا لڑکا ». (۱۹ ستمبر)

« لفٹننٹ گورنر بنگال. اور صوبہ بہار کے مسلمان ». (۱۹ ستمبر)

« کشمیری زبان اردو میں سیکھنے کے لئے پنڈت بشن برائن کی کتاب گلزار کشمیر »، اس پر تبصرہ. (۱۹ ستمبر)

« بابو پیارے لال، خیرخواہ شمالی ہندوستان »، از کاشی ناتھہ. (۱۹ ستمبر)

« پایونیر میں ایک صاحب نے اطلاع دی ہے کہ انھیں بچھو نے کاٹا تو اسی جگہ انھوں نے ایک مکھی مار کے لگادی، فوراً آرام ہوگیا ». (۲۶ ستمبر)

« کتاب اخلاق محمدی مصنفہ مرزا محمد علی ». (۳ اکتوبر)

« تعلیم کی طرف مسلمانوں کے خیالات »، ار تصدق حسین. (۳ اکتوبر)

« اجلاس سب کمیٹی مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ، سکریٹری سمیع اللہ خان ». (۱۰ اکتوبر)

« کیا مذہب کی بات بھی کسی کے خیال سے کچھہ یوں ہی ہوسکتی ہے ». اداریہ. (۳۱ اکتوبر)

« سلطنت انگلیشیہ : » تنقید از عطا محمد، امرتسر　(٣١ اکتوبر)

« مسودہ قواعد : سکونت و تربیت طالب علماں مدرسۃالعلوم میں. » از سید احمد خاں (٣١ اکتوبر)

« انگریزوں کا، ان کو سلام نہ کرنے پر، ناخوش ہونا. اس پر سخت تنقید » (٧ نومبر)

« تعلیم کی کمیٹیاں اور سررشتۂ تعلیم » از مشتاق حسین　(٧ نومبر)

« مکتوب نصیر الدین سکریٹری انجمن مناظرۃ الحکمت مرزا پور : » محسن الملک نے مرزا پور میں ایک لکچر دیا، اس کی روداد　(٧ نومبر)

« امدادالآفاق برخلاف تہذیب الاخلاق رسالہ از حاجی امداد العلی، ڈپٹی کلکٹر، کانپور، پر تبصرہ »　(٧ نومبر)

« فتاوی بر خلاف تہذیب الاخلاق. اس مجموعہ فتاویٰ پر تبصرہ »: منقول از کوہ نور (١۴ نومبر)

« مسٹر میل ول صاحب کا قبول اسلام: ہندوستان میں حکومت کے ایک افسر اعلیٰ کے قبول اسلام پر تبصرہ، اور اظہار مسرت » منقول از کوہ نور　(٢١ نومبر)

« ریویو کتاب مسائۂ حامد مصنفہ سید غلام حیدر خاں » (٢٨ نومبر) اسی کتاب پر رحب علی کا مضمون　(٢٨ نومبر)

«مدرسۃ العلوم کے بارے میں سید احمد خان، مولانا عبدالحق خط و کتابت :» منقول از اخبار انجمن پنجاب (٢٨ نومبر)

« ریویو گلزار ہندی (اخلاق پر) مصنفۂ رائے کنھیا لال، لاہور. ریویو رقعات نامی مصنفۂ حکیم الدین، لکھنؤ »　(٥ دسمبر)

« مولوی مہدی علی، مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر »　(٥ دسمبر)

« آگرہ میں گورنر جنرل کی آمد اور اس موقع پر پیش کئے گئے ایڈریس » (٥ دسمبر)

« پایونیر کی خبر کہ الہ آباد کے مسلمانوں کے جلسے میں یہ طے ہوا کہ سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں حروف دیوناگری کے اجراء کی نسبت جو ایک عرضی فرقہ ہنود کے بہت سے معزز شخصوں کی جانب سے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش

ہونے والی ہے ان کی نسبت اعتراض کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کی حاوے .... مولوی سید احمد خاں بہادر سی. ایس. آئی، اس کے سکریٹری مقرر کئے جاویں .....» (۱۲ دسمبر)

اداریہ: «ہندوستانیوں کی بد قسمتی»: سول سروس میں ہندوستانیوں کو لیے جانے کے خلاف ایک انگریزی اخبار نے نوٹ لکھا ہے، اس پر سخت تنقید (۱۲ دسمبر)

«ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ایک عمدہ کوشش»: پایونیر نے میسور کالج کے طلبا کی بعض کوششوں کو سراہا ہے. پایونیر سے منقول (۱۲ دسمبر)

«روئداد سب کمیٹی مرزا پور بتائید مدرسۃ المسلمین». از محمد اکرام حسین (۱۲ دسمبر)

«میور کالج الہ آباد کی بنیاد کا پتھر رکھے حانے کی تقریب»: ایڈریس وغیرہ (۱۹ دسمبر)

«جلسۂ علی گڑھ بسلسلۂ مدرسۃ العلوم» (۲۶ دسمبر)

«تقریر صدر انجمن مسلمانان پنجاب»: ماتحت مجلس خازن البضاعۃ لتاسیس مدرستہ العوم للسلمین (۲۶ دسمبر)

«ہندوستان کی موجودہ اور گزشتہ اور آئندہ کی حالت، اور آریہ لوگوں کے طور و طریق اور دستوروں کا بیان»: دیانند سرستی کے لکھنؤ کے لکچر (۲۶ دسمبر)

اخیر میں، ۱۸۷۳ ع کے گزٹ سے جن ہندوستانی اخباروں کی موجودگی کا پتا جلتا ہے، انکے نام درج کرتا ہوں:

پایونیر. انگلش مین، انڈین آبزرور، ہندو رفامر، ٹائمز آف انڈیا، ایڈیں مرر، انڈین پبلک اوپی نین، انڈین اسٹیٹسمین، انڈین ڈیلی نیوز، مدراس اتھینم، بمبئی گزٹ، فرینڈ ٹائمز آف انڈیا، بنارس گزٹ، بنگالی، امرت بازار پترکا، نارتھ ویسٹ ہیرالڈ، لکھنؤ ٹائمز، اردو گائیڈ، پنجابی اخبار، کوہ نور، اخبارنو الانوار، اودھ اخبار، اخبار انجمن پنجاب، لوح محفوظ، اخبار عالم.

تبصرے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

قول سدید   یعنی رد خلافت معاویہ و یزید.

از مولانا ضیاء احمد بدایونی ایم، اے،

سابق پروفیسر و صدر شعبہ فارسی علی‌گڑھ مسلم یونیورسٹی

صفحات ۱۵۴   قیمت: دو روپے چار آنے

ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاوس، سول لائن حامد علی بلڈنگ، علی گڑھ ۲

محمود عباسی کی کتاب «خلافت معاویہ و یزید» کے متعدد جوابات لکھے گئے، جن میں سے ایک جواب یہ بھی ہے، جس میں بڑی سلیقہ مندی سے ان کے بیانات کو بے نقاب کیا گیا ہے، اسلامی تواریخ کا سرمایہ، منصب خلافت اور بنی امیہ کے دعوے، بنی امیہ کا ریکارڈ، اور قول فیصل کے بڑے بڑے عنوانات کے ماتحت جزئی مباحث کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے. البتہ بنی امیہ کا ریکارڈ کے عنوان سے اموی خلفاء کے یک طرفہ مثالب و معائب کو جمع کرنا اور اور ان میں سے اکثر محاسن و محامد کو نظر انداز کرنا ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے، اسی طرح یزید کے صرف فسق و فجور اور اس پر لعن طعن، کے اقوال کو بیان کرنا بھی احتیاط و اعتدال ہاتھ سے چھوڑنا ہے. مجموعی اعتبار سے یہ کتاب خلافت معاویہ و یزید کا کامیاب جواب کے اور پڑھنے قابل ہے،

تازیانے   ترجمہ کتاب المنبّہات علی الاستعداد لیوم المعاد.

از مولانا ابوالبیان حماد

صفحات ۲۸۸   قیمت: مجلد تین روپیے

ملنے کا پتہ: نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، فریر روڈ کراچی (پاکستان)

کتاب المنبّہات کے مصنف کے بارے میں اختلاف ہے، عام خیال ہے یہ کتاب علامہ زین‌القضاۃ احمد بن محمد حجی کی تالیف ہے، اس سے پہلے ہندوستان

اور قسطنطنیه میں متعدد بار چھپ چکی ہے، عرصه ہوا مولوی حافظ محب الله صاحب پانی پتی نے اس کا اردو ترجمه بھی کیا تھا، یه وعظ و نصیحت کی کتاب ہے، اس میں احادیث آثار صحابه اور کلماتِ تابعین و سلف صالحین اس طور سے دس ابواب میں درج ہیں که پہلے باب میں دو نکتے والے کلمات ہیں، دوسرے باب میں تین نکتے والے اور تیسرے میں چار نکتے والے ہیں، لائق مترجم نے محنت سے کام لے کر ترجمه میں اصل روح باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، مگر کہیں کہیں بات نہیں بنی ہے، مثلاً ص ۳۲ پر قول نمبر ۲۱ کا ترجمه یوں کیا گیا ہے

«جو شخص یه چاہیے که اسے قرب آلہی نصیب ہو تو اسے لازمی طور پر عبادت کے لئے انسانوں سے کناره کشی اختیار کرنی پڑتی ہے، کیونکه گوشۂ خلوت میں دل الله کی طرف مائل رہتی ہے»

حالانکه اس کا صاف اور صحیح ترجمه یه ہے

«جو آدمی اطاعت کی وجه سے الله سے قریب ہو جاتا ہے، وه لوگوں میں اجنبی ہو جاتا ہے»

نیز اس ترجمه میں دل کو مونث استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اس طرح بعض مقامات پر ترجمه میں معمولی سقم ہے، اس کے باوجود مجموعی اعتبار سے یه کتاب اور اس کا ترجمه بہت خوب ہے اور اس میں حکمت و عبرت کا بیش بہا خزانه ہے.

اسلام کا نظام قانون

مرتبه جناب غلام علی صاحب

صفحات ۲۹۲ قیمت مجلد تین روپیے باره آنے

ملنے کا پته: مکتبه چراغ راه، کراچی (پاکستان)

یه کتاب در حقیقت چند ایسے مقالات و مضامین کا ترجمه ہے جنھیں اسلامی قوانین و اصول پر مصر کی مشہور دینی جماعت الاخوان‌المسلمون کے داعیوں اور ذمه‌داروں نے لکھے ہیں، کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصه میں الاخوان کے مرشد عام شیخ عبدالقادر عوده رح کی کتاب «الاسلام واوضاعنا القانونیۃ» کا ترجمه ہے. اس حصه میں موجوده قانون سے معذرت، وظیفۂ قانون، اقسام قانون، قوانین موضوعه کا ابطال، مصری قانون، فریضۂ جہاد، اسلام اور

استعمار کی آویزش پر نہایت مفید اور ضروری مباحث ہیں ، دوسرے حصہ میں چند مضامین کے ترجمے ہیں ، پہلا مضمون الاخوان المسلمون کے بانی الاستاذ حسن البنّا شہید رح کا ہے اور دوسرا اور تیسرا مضمون دمشق کے کلیة الشریفه کے پروفیسر شیخ مصطفے احمد زرقاء کا ہے ، اس حصہ میں مطالبۂ نفاذ شریعت ، کیا قانون ملکی کی بنا دین پر رکھنا مضر ہے ؟ مصلحی احکام پر زمانے کی تبدیلی کا اثر ، مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ پر نہایت لطیف و پاکیزہ مباحث ہیں ، اسلامی قوانین کی ضرورت اور اہمیت و افادیت کو اخوانی رہنماؤں نے جس کامیاب انداز میں پیش کیا ہے ، یہ ان ہی کا حق ہے ، پھر مترجم و مرتب کے زبان و بیان کا انداز سونے پر سہاگہ ہے .

واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے انسان کو بہت کچھ ملتا ہے ، جو لوگ اسلامی ، قانون و اصول کو عالمی سطح پر سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس طرح کی کتابیں حد درجہ مفید ہیں .

فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر (حصہ سوم)

از جناب افتخار احمد بلخی

صفحات ۵۸۲		قیمت سات روپیے

ملنے کا پتہ : مکتبہ چراغ راہ کراچی

انکار حدیث اس غلط ذہن کی پیداوار ہے جسے انگریزی دور حکومت نے ہندوستان میں پیدا کیا تھا ، عبداللہ چکڑالوی ، حافظ اسلم جیراجپوری اور پرویز کہنا چاہئے کہ اپنے اپنے وقت میں اس تحریک کے حامی رہے ہیں ، زیر تبصرہ کتاب اس تحریک انکار حدیث کے منظر اور پس منظر کو سامنے لاتی ہے اور نہایت مبلغ انداز اور داعیانہ رنگ میں انکار حدیث کے پیچ و خم اور چڑھاؤ اُتار کو ظاہر کرتی ہے ، طرز بیان مجادلانہ نہیں محاکمانا ہے اس لئے پوری کتاب میں علوم و دلائل کا وزن یکساں طور پر پایا جاتا ہے . اس حصہ میں منکرین حدیث کی علمی سطحیت ، تحقیقی دیانت سے بے پروائی ، حیلہ سازی ، بیان میں تضاد کو نہایت سنجیدگی سے واضح کرکے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس

تحریک کے علمبردار ہیں ان کا مبلغ علم و تحقیق کیا ہے اور وہ زبان و بیان کے بارے کس میں درجہ غیر ذمہ دار ہیں. جناب افتخار احمد بلخی نے تحقیق و محنت کا حق ادا کرتے ہوئے جو کام کیا ہے اس پر وہ ہر طرح لائق تحسین ہیں، اور کتاب ہر اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے، ضرورت ہے کہ منکرین حدیث کے شکوک و شبہات کے دفع کرنے کے لئے ایسی ہی مدلل اور سنجیدہ کتابیں لکھی اور پڑھی جائیں.

ق. ا. م.

ہماری آزادی (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب قیمت پندرہ روپئے
پتہ: اورینٹ لونگ مینس پرائیویٹ لمٹیڈ، نکل روڈ. بیلارڈ اسٹیٹ بمبئی ۱

مولانا آزاد مرحوم ہمارے عہد کی ہمہ گیر بلند تر شخصیت کے مالک ہی نہ تھے بلکہ اپنی جادو بیانی اور سحر نگاری کے لئے اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے. یہی وجہ تھی کہ الہلال نکلنے کے بعد مولانا کے مختلف مقربین ان سے مختلف موضوع پر کتابیں لکھنے کی درخواست کرتے لیکن مولانا کی مشغولیتوں نے ان کو فرصت نہ دی کہ وہ سب کی آرزوئیں پوری کرسکیں. البتہ جب کبھی ان کو فرصت نصیب ہوئی تو کبھی قرآن مجید کے ترجمہ کی طرف توجہ کی کبھی تفسیر سے متعلق کچھ لکھا اور اگر کچھ نہ ہوا تو اپنے خطوط ہی کے ذریعہ کارواں خیال کے ذریعہ غبارخاطر نکالتے ہوئے ایسے چمکتے ستارے چھوڑ گئے جو بڑی حد تک مولانا کے حالات، مذاق اور رجحانات کے غماز ہیں. پہلی جنگ عظیم کے داروگیر میں مولانا کو پہلی فرصت نصیب ہوئی اور رانچی کے قیام کے زمانے میں علمی و تعلیمی کاموں کے ساتھ ہی ساتھ مولانا نے تذکرہ کا پہلا حصہ بھی لکھا. اس کا بڑا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہر عہد میں پرستاران حق نے ہر قسم کی صعوبتوں کے باوجود اعلان کلمہ حق میں کوتاہی نہیں کی. اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوست اور الہلال میں اپنے رفیق کار کے پر محبت و خلوص اصرار سے مجبورہوکر تذکرہ کا وہ حصہ بھی لکھنے پرتیار ہوگئے جس کے متعلق ان کا خود یہ بیان ہے کہ:

«کتی سو صفحے روشن‌دلان سلف کے تذکرۂ آثار و مناقب سے نورانی ہوچکے ہیں، اب دو چار صفحے اپنی سیاہ روئیوں اور سیہ بختیوں کے سواد تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں.»

لیکن جس نے بھی تذکرہ کے یہ آخری ۳۰ ، ۳۱ صفحے پڑھے وہ مشتاق ہوگیا کہ کاش مولانا اپنی ساری حیات مفصل اسی طرح لکھتے لیکن افسوس حالات نے یہ موقع نہ دیا.

خدا بھلا کرے پروفیسر ہمایون کبیر کا کہ انھوں نے مولانا کی مشغولیتوں کا اندازہ کرکے ان کو کم از کم اس بات پر آمادہ کرلیا کہ مولانا اپنے حالات و تاثرات ان کو بتاتے جائیں اور وہ ان کو انگریزی میں لکھ کر مولانا کی نظر سے گذرائیں اور مولانا کی منظوری کے بعد اس کو شائع کریں. اس سے جہاں ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم مولانا کی سحر بیانی اور انشاء پردازی کی ذہنی لذت سے محروم ہوگئے وہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کے حالات و تاثرات اردو کے تنگ دائرہ سے نکل کر انگریزی کے وسیع تر دائرے میں پہنچ گئے ورنہ انگریزی میں شری دیسائی کی کتاب کے علاوہ کوئی چیز مولانا کے جاننے کے لئے نہ تھی. یہ مسودہ مکمل ہوچکا تھا کہ مولانا نے رحلت کی لیکن پروفیسر ہمایوں کبیر نے بڑی دور اندیشی اور عقل مندی سے کام لے کر اس کو INDIA WINS FREEDOM کے نام سے شائع کر دیا. زیر تبصرہ کتاب اسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے. اگرچہ مترجم کا نام ترجمہ کی صحت و خوبی کے لئے ضمانت ہے پھر بھی دل اس انشاء کو، جس کا تصور مولانا کی نسبت سے ذہن میں آتا ہے ڈھونڈتا ہے، لیکن ترجمہ پھر ترجمہ ہے. مولانا کے حالات اور ہندوستان کی پنجاہ سالہ جنگ آزادی کی داستان کے لئے یہ کتاب بڑی وقیع ہے. نفاست طباعت کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ یہ کتاب ادبی پرنٹنگ پریس میں چھپی ہے، اور اس کے تمام محاسن کی حامل.

Glimpses of Urdu Literature

از پروفیسر این. ایس گوریکر

صفحات: ۱۲۸ قیمت: دس روپئے

ملنے کا پتہ: جیکو پبلشنگ ہاؤس ۱۲۵، مہاتما گاندھی روڈ ـ بمبئی ۱

پروفیسر نظام الدین گوریکر ہمارے تعلیمی اور علمی طبقہ میں اپنی خدمات

کے لئے کافی متعارف ہیں ۔ ۱۹۵۹ ع میں جامعۂ بمبئی کی درخواست پر انہوں نے اپنی توسیعی تقریروں کے سلسلہ میں اردو ادب اور اس کی ابتدا سے لے کر آج تک کی ترقی کا جائزہ بڑی خوبی سے لیا ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب انہیں تقریروں کا مجموعہ ہے ، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ، اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ تاریخ کے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی اشارے بھی موجود ہیں ، لیکن اس کی سب سے بری افادی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس وجہ سے اس کے ذریعہ انگریزی جاننے والے بھی اردو کی حقیقت اور اس کی ترقی پر معلومات حاصل کرسکتے ہیں ۔ کتاب چار ابواب اور ایک خلاصہ پر مشتمل ہے ۔

پروفیسر گوریکر کی ان تقریوں کی اشاعت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس میں ایک وسیع مقدمہ کی صورت میں اردو ہندی تنازعہ پر ہمارے نوجوان محقق دوست ، ڈاکٹر رفیق ذکریا نے سنجیدہ اور محققانہ طریقہ پر اظہار خیال کیا ہے ، اس سے اس افسوسناک اختلاف کی پوری تاریخ اور اس کے نتائج سامنے آجاتے ہیں اور آج کل کے لسانی ہنگاموں کی فضا میں اس کا مطالعہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ طبعات نفیس کاغذ اچھا اور کتاب مجلد ہے ۔

سمندر کے نیچے

از محترمہ سلطانہ آصف فیضی

قیمت : دو روپئے پچیس نئے پیسے صفحات : ۱۱۶ مصور

پتہ : رائٹرس امپوریم ۔ فیروز شاہ مہتہ روڈ ، بمبئی ۱

محترمہ سلطانہ آصف فیضی ، اردو کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہیں ۔ سلاست ، روانی اور دلکشی ان کی تحریر کی امتیازی خصوصیتیں ہیں ۔ وہ جس چیز یا منظر کو بیان کرتی ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کردیتی ہیں ۔ خوشی کا مقام ہے کہ دوسرے دلچسپ موضوعوں کے علاوہ بچوں کے افادی ادب کی طرف بھی انہوں نے توجہ مبذول کی ہے ۔ ایک طرف بمبئی میں ساحل بحر عرب کی سکونت اور دوسری طرف مصر وغیرہ تک سفر و قیام نے ان کو سمندر کے عجائبات کے مطالعہ کا موقع دیا اور انہوں نے اب سے کچھ سال پہلے ، سمندر کے کنارے کے نام سے ایک مصور کتاب شائع کی تھی اور وہ کتاب خاص قدر و ستائش کی نظر سے دیکھی گئی تھی ۔ زیر تبصرہ کتاب اسی

سلسلہ کی دوسری کڑی ہے . اس میں سمندر کے نیچے بسنے والے جاندار اور پودوں کا حال قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے . کتاب میں رنگیں اور سادہ تصویریں بھی ہیں. امید ہے کہ یہ کتاب بھی سمندر کے کنارے ، کی طرح بچوں میں مقبول ہو گی.

« تصحیح »

گذشتہ جولائی کے پرچے میں « میسور میں اردو » پر جو تبصرہ شائع ہوا تھا . اس میں بعض باتیں تصحیح طلب ہیں. ہم کو افسوس ہے کہ تبصرہ میں یہ غلطیاں رہ گئی ہیں :

تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ دس روپئے قیمت زیادہ ہے ، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس قیمت کے تعین کا سبب یہ ہے کہ مرتبین کا یہ ارادہ ہے کہ « طباعت کے اخراجات منہا کرکے جو رقم بچے گی اس کی نصف رقم جو ڈیڑھ ہزار سے کم نہ ہوگی ، صرف ان طالبات پر بطور وظیفہ تقسیم کی جائیگی جو بی ، اے میں اردو کو میجر سبجکٹ کے طور پر پڑھتی ہیں ، اور بقیہ رقم اس مجلے کی دوسری اشاعت میں صرف ہوگی »

اسی طرح تبصرہ نگار نے حصہ دوم کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ « دوسرے حصے میں بعض طالبات کے نام سے بعض تحریریں ہیں معلوم نہیں کہ یہ حصہ کس اصول پر مرتب کیا گیا ہے » حالانکہ پروفیسر محمد خان صاحب نے تمہید میں لکھ دیا ہے کہ « مہارانی کالج کی طالبات کی حوصلہ افزائی منظور تھی ۔ ہم نے ان کے لکھے ہوئے اور انتخاب کئے ہوئے مضمون اس مجلے کے حصہ دوم میں شائع کردئیے ہیں » .

مقالـــہ نمـا

مرتب:

ڈاکٹر عالی جعفری

معـاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار داوی

علاؤ الدین جیاڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

١ اسعد گیلانی
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین
کا احساس آخرت
(عارف لاہور، ٦١ مئی ٢٩-٣٢)

٢ اصلاحی امین احسن
تفسیر سورۂ بقر
(میثاق ٦١ اپریل ٩-١٢)

٢١ ویں قسط .

٣ اصلاحی ضیاء الدین
عون المعبود کا مصنف کون ہے ؟
(معارف ٦١ اپریل ٣١٠-٣١٦)

غایۃ المقصود اورعون المعبود دونوں ابو داؤد شریف کی نہایت اہم اور مشہور شرحیں ہیں . اول الذکر مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی ہے . لیکن ثانی الذکر محض انہیں کی نہیں ہے . اس کی تیاری میں دوسرے علماء بھی شریک تھے . ویسے خصوصیت انہیں کو حاصل ہے .

٤ اصلاحی ضیاء الدین
حضرت عمر کا طریق شوریٰ
(میثاق ٦١ اپریل ٣٣-٣٨)

٥ امام الدین ابو محمد رام نگری
نظریہ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رام پور ٦١ اپریل ٣٠-٤٣، مئی ٢-٣٠ جون ٥١-٥٣)

چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں قسط .

٦ چودھری محمد اسماعیل
سود
(ثقافت ٦١ اپریل ٣٥-٥٠ مئی ٣٥-٦١ جون ٤٠-٥٠)

٧ سلطان مبین
فطرت شرک
(زندگی رام پور ٦١ جون ٤٤-٥٠، ٦٤)

٨ سید قطب
اصلاحی ابو زید (مترجم)
اسلام میں امن کا مزاج
(فاران ٦١ مئی ٢٣-٣٤)

٩ شیخ ابو زہرہ
اسلامی طلاق — اس کے فائدے اور طریقہ
(ترجمان القرآن ٢١ اپریل ٢٨-٤٠)

١٠ شیخ ابو زہرہ
اسلام کے پردے میں الحاد
(ترجمان القرآن ١٦ مئی ١٠٤-١١٩)

نئے مصر کے عہد اسلامی امور پر تبصرہ .

١١ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
قادری سید احمد عروج مترجم

دعوت دین — اکبر کی موت پر
شیخ فرید کے نام ایک مکتوب
(زندگی رام پور ٦١ اپریل ۴۴-۵۱)
نواب فرید مرتضیٰ کے نام خط
مشتمل برادعائے الوہیت، ادعائے نبوت،
تعریف رسالت، فرائض و خصائص انبیاء
و بے ثباتی دنیا.

۱۲　عبدالصبور بیگ منشور
شانِ رسالت و پیغمبرانہ سماعت
و بصارت
(عارف، لاہور، ٦٠ جون ۱۵-۲۴)

۱۳　عبدالغفار حسن
مسئلہ تصویر
(میثاق ٦١ اپریل ۱۳-۲۲)
احادیث کی روشنی میں مسئلہ
تصویر (باقی)

۱۴　عبداللہ خاں کرتپوری
نماز بوقت خطبہ پر محققانہ بحث
(برہان ٦١ جون ۳۳۷-۳٦٠)

۱۵　عمری جلال الدین
ایمان بالرسالت
(زندگی رام پور ٦١ جون ۱۳-۲۹)

۱٦　محمد بشارت علی ڈاکٹر
مذہبی‌عمرانیات کے نقطۂ نظر سے
سائنس اور سائنسیت اور ٹکنا لوجیکل
کلچر پر تبصرہ
(فاران ٦١ مئی ۳۹-۴٦)

۱۷　محمد جمیل
پاکستان میں عیسائیت کی رفتار
(ترجمان‌القرآن ٦١ اپرل ۲۰-۲۷)
تیسری قسط.

۱۸　محمد حمید اللہ
روزہ اور اس کی حکمتیں
(میثاق ٦١ اپریل ۲۳-۳۲، مئی و جون ۵-۹)
دو قسطیں.

۱۹　محمد عثمان
جہاد کی حقیقت
(ثقافت ٦١ اپریل ۵۱-٦١)

۲۰　مفتاحی محمد ظفیر الدین
اسلام کا نظام امن و امان - فتنہ و
فساد اور رہزنی
(برہان ٦١ اپریل ۹۷-۲۱۰ مئی ۲۸۴-۲۹۳، جون ۳۲۵-۳۳٦)
چوتھی، پانچویں اور چھٹی قسط.

۲۱　ندوی ابوالجلال
سورہ نمل اور اس کی تفسیر و تشریح
(فاران ٦١ اپریل ۱۰-۱۹ مئی ۷-۱۲ جون ۱۱-۲۲)
تین قسطیں.

۲۲　نیاز فتحپوری
اسلام اور جمہوریت
(نگار ٦١ مئی ٦-۱۴)

۲۳　وحید الدین خاں
اسلام کا نظریۂ آخرت
(زندگی رام پور ٦١ اپریل ۹-۲۹)

۲۴　وحید الدین خاں
قرآن کا مطلوب انسان
(زندگی رام پور ٦١ جون ۳۰-۴۳)

تذکرہ وسیرت نگاری

۲۵ انجم وزیر آبادی
علامہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی
(عارف، لاہور، ۶۱ جون ۲۹-۳۲)
علامہ نیر واسطی کی سیرت اور ان کے علمی و ادبی فضائل کا ذکر۔

۲۶ سید عبدالعلی
ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم کے چند خطوط
(الفرقان ۶۱ جون ۶۳-۷۱)
عالم جوانی کے دو خط جو ڈاکٹر سید عبدالعلی کے مذہبی شغف کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۷ زور محی الدین قادری
محمد مرتضی مرحوم
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ مئی ۳-۵)

۲۸ شاہ محمد احمد بصیر پوری
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور، ۶۱ جون ۱۳-۱۴)
شیخ داؤد بندگی کرمانی رح شیرگڑھی کے حالات۔

۲۹ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگانِ اسلام
(عارف، لاہور، ۶۱ اپریل ۱۱-۱۳)
حضرت شیخ علاؤ الدین علاء الحق بنگالی رح کے حالاتِ زندگی۔

۳۰ صدیقی محمد علی
بائرن ـــ حسون کا متلاشی
(جام نو کراچی ۶۱ جون ۱۵-۱۸)

۳۱ عتیق الرحمٰن سنبھلی
ڈاکٹر سید عبدالعلی رح
(الفرقان ۶۱ جون ۵۸-۶۲)
مولانا ابوالحسن ندوی کے بڑے بھائی اور مولانا عبدالحی (گل رعنا) کے بڑے بیٹے کے دینی شغف اور باطنی و اخلاقی اوصاف حمیدہ کا ذکر

۳۲ غوری شبیر احمد خاں
ابن سینا اور فارابی کی معنوی شاگردی
(معارف ۶۱ اپریل ۲۴۵-۲۶۶)
شیخ بو علی سینا ظاہری طور پر فلسفہ میں عبداللہ الناتلی کا شاگرد تھا اور اسی سے ظواہر منطق کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن معنوی شاگرد وہ ابونصر فارابی کا تھا۔

۳۳ غوری شبیر احمد خاں
شیخ بوعلی سینا کی عبقریت
(معارف ۶۱ مئی ۳۲۷-۳۰۹، جون ۴۴۲-۴۶۱)

۳۴ فوقانی بن شوق
علامہ شوق نیموری
(اشارہ پٹنہ ۶۱ اپریل ۲۱-۲۷)
علامہ شوق نیموری سے متعلق معلومات

۳۵ قادری نور احمد
تذکرہ بزرگانِ اسلام
(عارف، لاہور، ۶۱ مئی ۱۳-۱۸)

حضرت داتا گنج بخش ہجویری رح
کے سوانح حیات
(معارف ۶۱ جون ۴۰۵-۴۲۴)
پہلی قسط ۔

۳۶ محمد خاں
قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۱۷۴-۱۸۸)
ویلور کے ایک عالم کامل کا تذکرہ

۳۷ محمد مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی ــــ مجدد الف ثانی

۳۸ ہارنگ پرنس لعل
ڈاکٹر جانسن
(اشارہ پٹنہ ۶۱ اپریل ۲۷-۲۹)
ڈاکٹر جانسن کی شخصیت اور ادبی
کارناموں کا تذکرہ ۔

تاریخ و سیاسیات

۳۹ ادارہ
تاثرات
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ اپریل ۵-۱۱)
ادارۂ ادبیات اردو کے بارے میں
بعض نامور حضرات کے تاثرات

۴۰ ادارہ
مصروفیات ادارہ
(سب رس، حیدرآباد ۱۶ اپریل ۱۲-۲۳)
ادارۂ ادبیات اردو کی ۱۹۶۰ ع کی
علمی، ادبی و ثقافتی مصروفیات کا خلاصہ
بقید تاریخ

۴۱ اصلاحی ضیاء الدین
مقریزی اور ان کی خطط
(معارف ۶۱ مئی ۳۵۰-۳۶۹، جون ۴۶۲-۴۷۶)

۴۲ انصاری نورالحسن
خلاصۃالتواریخ اور اس کا مصنف
(برہان ۶۱ مئی ۳۰۴-۳۱۲)

۴۳ ثروت خاں
معربی افریقہ عہد اسلامی میں
(ثقافت ۶۱ اپریل ۷-۳۴)

۴۴ حکیم احمد سید
مہا بھارت پر ایک تحقیقی نظر
(نگار ۶۱ مئی ۲۱-۲۵)

۴۵ حکیم احمد سید
رامائن پر ایک تحقیقی نظر
(نگار ۶۱ جون ۶-۱۲)

۴۶ خالد کمال مبارکپوری (مترجم)
اندلس میں اسلامی تہذیب
(برہان ۶۱ اپریل ۲۴۴-۲۴۸)

۴۷ رزاقی شاہد
انڈونیشیا میں قومی بیداری کا آغاز
(ثقافت ۶۱ مئی ۴۱-۵۲)

۴۸ رزاقی شاہد حسین
انڈونیشیا پر جاپانی قبضے کا دور
(ثقافت ۶۱ جون ۵۱-۶۴)

۵۹ سید محمد
وشوا بھارتی
(سب رس، حیدر آباد، ۶۱ جون ۳۸-۴۰)
وشوا بھارتی کے قیام سے متعلق تاریخی واقعات کا بیان

۵۰ صدیقی نعیم
جمہوریت کی کہانی
(ترجمان القرآن ۶۱ مئی ۸۱-۱۰۳)
پہلی قسط.

۵۱ محمد خان
رسالۂ احکام النکاح
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۱۹۵-۲۰۲)
ٹیپو سلطان شہید کے ان حکم ناموں کا بیان جنہیں اس دور کے علمائے کرام نے ترتیب دیا تھا.

۵۲ مدنی طہیر الدین
تاریخ گجرات
(صبح امید بمبئی گجرات ۶۱ نمبر ۴۳-۵۱)
ریاست گجرات کی تاریخ

ادب تنقید لسانیات

۵۳ آفتاب اختر
جدید ایرانی شاعر کا سیاسی پس منظر
(نگار ۱۶ مئی ۱۴-۲۰)

۵۴ آفتاب اختر
فردوسی کے شاہنامہ میں رومانی عناصر
(ارمغان ۶۱ جون ۳۶۱-۳۷۰)

۵۵ آمنہ خاتون
شہادت جنگ سلطانی
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۱-۸۴)
سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے انگریزوں کی آخری جنگ کے بارے میں میر احسن اللہ کے فرزند غوثی چنگل پیٹی (مدراس) کی اردو مثنوی

۵۶ آمنہ خاتون
مفرّح القلوب
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۱۵۰-۱۰۳)
حسن علی عزت کی ایک تصنیف کا بیان جو غوثی چنگل پیٹی کی مثنوی شہادت جنگ سلطانی، سترہ سال بعد تصنیف کی گئی

۵۷ آمنہ خاتون
شاہ صدر الدین اور ان کی تصانیف
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۲۲۲-۲۳۸)
دکنی زبان کے کئی چھوٹے چھوٹے رسالوں کے مصنف اور ایک گوشہ نشین مگر باکمال بزرگ کا تذکرہ

۵۸ آمنہ خاتون
نسیم
(ریاست میسور میں اردو ۶ ستمبر ۲۴۱-۲۶۰)
میسور کے ایک مشہور و مقبول شاعر کا تذکرہ

۵۹ ابوالحیات
ٹیگور بحیثیت قوم پرست
(آجکل ۶۱ مئی ۵۶-۵۸)

٦٠ ابوالکلام
ٹیگور کی شخصیت ـ چند جھلکیاں
(جامعہ ٦١ مئی ۳۴٦ـ۳۵٠)
رابندر ناتھ ٹیگور سے اپنے مراسم دیرینہ کا تذکرہ اور ان کی شخصیت کے چند پہلو

٦١ ابوالکلام
ٹیگور کی مصوری
(آجکل ٦١ مئی ۳۲ـ۳۷)
ٹیگور کی مصوری سے متعلق اظہار خیال

٦٢ ابو علی اعظمی
مولانا شبلی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے چند خطوط
(ادیب علی گڑھ ٦١ مئی ۱۲ـ۱٦)
شبلی اور ابوالکلام آزاد کے باہمی اخلاص و روابط کا ان دونوں کی مراسلت سے اندازہ لگانے کی کوشش۔

٦٣ اثر جعفر علی خاں
اقبال پر چکبست کی ایک تنقید کا جائزہ
(جامعہ ٦١ جون ۴۱۷ـ۴۲۴)
اردوئے معلیٰ بابت اپریل ۱۹۰۴ ع میں چھپنے والے چکبست کے ایک مضمون پر خیالات کا اظہار

٦۴ احتشام حسین
ٹیگور کا اثر اردو ادب پر
(سب رس، حیدرآباد ٦١ جون ۳۵ـ۲۸)
ٹیگور کے اردو ترجموں اور اردو ادب پر اُن کے اثرات کا تنقیدی جائزہ

٦۵ اختر رضوانی
جگر مرحوم سے چند ملاقاتیں
(صبح نو پٹنہ ٦١ جگر ٦۴ـ٦٦)
ذاتی تعلقات کا بیان

٦٦ ارشاد نقی احمد
شاد بحیثیت فلسفی
(شاعر بمبئی ٦١ مئی ۱۹ـ۲۴)
شاد کے فلسفیانہ خیالات کا جائزہ

٦۷ ارشاد نقی احمد
جگر مراد آبادی پٹنہ میں
(صبح نو پٹنہ ٦١ جگر نمبر ۷١ـ۷۳)
جگر مراد آبادی کے ورود پٹنہ اور یہاں کے لوگوں سے ان کے تعلقات کا تذکرہ

٦٨ اسدالزماں
جگر کی نظموں پر ایک نظر
(صبح نو پٹنہ ٦١ جگر نمبر ٦۷ـ۷۰)

٦۹ اسرار احمد کریوی
اردو تحریک کی نوعیت
(قومی زبان کراچی ٦١ جون ٦ـ۲۳)

۷۰ اسیر عبداللہ جان
رحمان بابا
(ماہ نو ٦١ جولائی ۲۱ـ۲۴)
پشتو کے صوفی شاعر رحمان بابا کے حالات اور فن پر اظہار خیال

۷۱ اقتدا حسین
غیر ممالک میں اردو کی ترویج
(قومی زبان کراچی ۶۱ اپریل ۳۹ـ۴۴)

۷۲ امجد یوسف زئی
ترسوں زادہ اور اس کی شاعری
(صا پٹنہ ۶۱ اپریل ۱۸ـ۲۲)

۷۳ انتظار حسین
پھول اور رسم‌الخط
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ وجون ۳۹ـ۴۱)

۷۴ تمکین کاظمی
کتاب داغ سے متعلق
(شاعر بمبئی ۶۱ جون ۳۳ـ۳۵)
کتاب داغ سے متعلق شہاب مالیر کوٹلوی کے مضمون کا جواب

۷۵ ثمینہ شوکت
لچھمی نارائن شفیق کا ایک اور کارنامہ
سوسن دہ زبان
(آجکل ۶۱ اپریل ۲۷ـ۳۱)
لچھمی نارائن شفیق کے نادر کارنامہ سوسن دہ زبان کا تعارف

۷۶ جوش ملسیانی لبھو رام
ہندوستانی شاعری کے مختلف اصناف میں غزل کا مقام
(ہندوستانی ادب، حیدرآباد ۶۱ اپریل ۲۲ـ۲۴)

۷۷ حامد علی خان
ہمارا رسم‌الخط
(قومی زبان کراچی، ۱۶ مارچ و جون ۱۹ـ۲۰)

۷۸ حبیب‌الرحمن غزنوی
گجرات کے فارسی داں ناگر
(صبح امید ۶۱ گجرات نمبر ۵۵ـ۵۸)

۷۹ حرمت‌الاکرام سید
جگر اور ان کی غزلیں
(صبح نو پٹنہ جگر نمبر ۲۷ـ۳۲)

۸۰ خلیق انجم
مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط
(برہان ۶۱ اپریل ۲۳۲ـ۲۳۷)
ساتویں قسط ـ بارہ خطوط کے ترجمے

۸۱ خواتین
سوویت ناول
(شاعر، بمبئی ۶۱ جون ۳۱ـ۳۲)

۸۲ ذاکر حسین
شاعری اور جگر
(صبح نو پٹنہ، ۶۱ جگر نمبر ۱۴ـ۱۶)
جگر کی غزل گوئی پر چند نکات پر مشتمل ایک صدارتی تقریر

۸۳ رضا محمد حضرت جی
شاہ غمگین ناقدوں کی نظر میں
(ادیب علی گڈھ ۶۱ اپریل ۳۳ـ۴۴)

۸۴ رفیع‌الدین عابتی
حالی بحیثیت نقاد
(صا پٹنہ ۶۱ اپریل ۱۲ـ۱۸)

۸۵ رونق حامد
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۱۶ـ۳۲)
اردو میں آزاد نظم پر اظہار

۸۶ ریاض احمد
زرِ داغِ دل

(ماہ نو ۶۱ جولائی ۹ـ۱۵)
عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کے
کے مجموعہ «زر داغ دل» پر تبصرہ

۸۷ زہرہ سہگل
ٹیگور کی شاعری اور رقص ڈرامہ
(آجکل ۶۱ مئی ۳۸ـ۴۶)

۸۸ سچدانند واتسیاین
روشن ضمیر رویندر ناتھ
آجکل ۶۱ مئی ۴۲ـ۵۵)

۸۹ سراج الحق مچھلی شہری
خواجہ آتش سے متعلق کچھ جدید
تحقیق و تفتیش
(نگار ۶۱ جون ۱۸ـ۲۰)

۹۰ سعید احمد رفیق
نشاۃ الثانیہ میں جمالیاتی افکار
(ادب لطیف، لاہور، ۶۱ مئی ۱۷ـ۲۴)
دور نشاۃ الثانیہ کے فکری رجحانات
کے پس منظر کے ساتھ اس دور کے
جمالیاتی افکار کا جائزہ

۹۱ سعید انصاری
ٹیگور کا نظریہ تعلیم
(آجکل ۶۱ مئی ۴۷ـ۵۱)

۹۲ سکسینہ رمں راج
ٹیگور کے حالات
(ہندستانی ادب حیدرآباد، ۶۱ مئی ۹ـ۱۴)

۹۳ سکسینہ ویریندر پرشاد
بلوان سنگھ راجہ
(قومی زبان کراچی، ۶۱ جون ۲۲ـ۲۳)

نظیر اکبر آبادی کے شاگرد بلوان
سنگھ راجہ تخلص کا مختصر تذکرہ

۹۴ سلامت اللہ
ٹیگور بحیثیت معلم
(جامعہ ۶۱ مئی ۳۵۱ـ۳۵۸)

۹۵ سنت ون کمار داس
رابندر ناتھ ٹیگور
(آجکل ۶۱ مئی ٹیگور نمبر ۶ـ۱۰)
رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات
زندگی

۹۶ سید حسن
جگر کا فارسی کلام
(صبح نو ۶۱ جگر نمبر ۱۷ـ۲۳)

۹۷ سید رضا قاسم
رئیس المتغزلین
(صبح نو پٹنہ جگر نمبر ۴۰ـ۴۷)
جگر کے سوانحی حالات اور ان کی
شاعری کے موڑ

۹۸ سید عبد اللہ
اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ، جون ۱۷ـ۱۸)

۹۹ سید عبد اللہ
تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال
(اردو نامہ ۶۱ اپریل تا جون ۳۶ـ۳۸)

۱۰۰ سید مرتضی حسین بلگرامی
شاد عظیم آبادی ـ صفیر بلگرامی
(خطوط کے آئینے میں)
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جون ۸ـ۱۲)

حضرت علی محمد شاد عظیم آبادی،
سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اور
میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کی
ایک باہمی کشمکش کا تذکرہ

۱۰۱ سید مرتضی حسین بلگرامی
حگر مرادآبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ حگر نمبر ۲۴-۲۶)
حگر کی زندگی اور شاعری کے
رشتے سے بحث

۱۰۲ شانتی دیو گھوش
ٹیگور، بہ حیثیت موسیقار
(آج کل ۶۱ مئی ۸۰-۸۷)

۱۰۳ شریف ززمی
رسم الخط کا مسئلہ
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ، جون ۴۲-۴۶)
اردو کے لئے رومن رسم الخط کی
مخالفت کرتے ہوئے عربی رسم الخط قائم
رکھنے کی پر زور سفارش

۱۰۴ شمیم اعظمی
استاد اور اس کی شخصیت
(شاعر بمبئی ۶۱ جون ۲۰-۳۰)

۱۰۵ شہزاد منظر
حگر کی شاعری میں عصری میلانات
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۶۷-۶۳)

۱۰۶ شیخ محمد شریف حسٹش
ہمارا رسم الخط اور اسلام
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ، جون ۲۳-۳۶)

۱۰۷ صابر شاہآبادی:
شفا کی غزل گوئی
(اشارہ پٹنہ ۶۱ اپریل ۱۱-۲۱)

۱۰۸ صالحہ عابد حسین
ٹیگور کا ایک ناول
(جامعہ ۶۱ مئی ۳۷۷-۳۸۹)
ٹیگور کے ناول چوکھیر بالی پر تبصرہ

۱۰۹ صالحہ عابد حسین
ایک مثالی زندگی
(آج کل ۶۱ جون ۲-۳۳)
بیگم قدسیہ زیدی سے متعلق تاثرات

۱۱۰ صدیقی ابوالاعجاز حفیظ
میے خانہ حافظ
(ادب لطیف، لاہور، ۶۱ جون ۴-۱۰)
عصری زندگی سے نا آسودگی اور
احساس ناتمامی سے مغلوب ہوکر حافظ
نے ایک مثالی مجلس عشرت تعمیر کی

۱۱۱ صدیقی محمد احمد
جوش کے رنگ تغزل کا دورِ عبوری
(جام نو کراچی ۶۱ مئی ۱۹-۴۳)

۱۱۲ صلاح الدین احمد
ہماری قومی زبان اور اس کا رسم الخط
(قومی زبان کرچی ۶۱ مارچ، و جون ۶-۱۳)

۱۱۳ ضمیر علی بدایونی
اقبال، وجودیوں کے درمیاں
(ماہ نو ۶۱ اپریل ۱۰-۱۶)

۱۱۴ ضمیر علی بدایونی
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ جون ۶-۱۰)
آزاد نظم کی ابتدا اور تاریخ

۱۱۵ ضیاء الدین ایم.
ٹیگور ایک شاعر ایک مفکر
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جون ۱۹-۲۳)

۱۱۶ عابد حسین سید
ہمارے زمانے کی اردو نثر میں
طنز نگاری
(جامعہ ۶۱ جون ۳۹۵-۴۰۰)

۱۱۷ عابد رضا بیدار
جوئے کہستان، ایک اور موج رواں
(ماہ نو ۶۱ اپریل ۱۶-۲۳)

اقبال کے چند اہم خطوط

۱۱۸ عبدالحق مولوی
رسم‌الخط کا مسئلہ
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ و جون ۳-۶)
یہ بتایا ہے کہ اردو کا رسم خط
کیا ہو

۱۱۹ عبدالحق مولوی
پنڈت و نشی دھر
(قومی زبان کراچی ۶۱ جون ۴ و ۷)
ہندی زبان کے بہت بڑے ادیب اور
شاعر سے اپنے ذاتی تعلقات کا اظہار

۱۲۰ عبدالحق مولوی
گجرات میں اردو
(صبح امید بمبئی ۶۱ گجرات نمبر ۵۲-۵۴)
تاریخی حقائق کی روشنی میں گجرات
میں اردو کے ارتقا کا تذکرہ

۱۲۱ عبدالحق مولوی
رسم‌الخط کا مسئلہ
(ادب لطیف لاہور ۶۱ مئی ۱۳-۱۶)
تحریر کی ابتدا و ارتقا اور اردو
رسم‌الخط کی خوبیوں کا سرسری جائزہ
لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اردو کو رومن
رسم‌الخط میں لکھنا تہذیبی خود کشی کے
مترادف ہوگا

۱۲۲ عبدالستار صدیقی
وضع اصطلاحات
(نوائے ادب بمبئی، ۶۱ اپریل ۵-۵۸)
مولوی سید وحیدالدین سلیم کے حالات
زندگی اور وضع اصطلاحات پر تبصرہ
جو خود مصنف کی فرمائش پر کیا
گیا تھا

۱۲۳ عبدالطیف اعظمی
ٹیگور — مختصر حالات زندگی
(جامعہ ۶۱ مئی ۳۴۰-۳۴۵)

۱۲۴ عبدالماجد ایم:
ادب اور معاشرہ
(ماہ نو ۶۱ جون ۱۲-۱۳)

۱۲۵ عبدالغنی
احتشام حسین کی تنقید نگاری
(ادیب علی‌گڑھ ۶۱ اپریل ۱۳-۲۳)

۱۲۶ عرشی محمد حسین
مرزا غالب کی فارسی شاعری
(نگار ۶۱ اپریل ۱۴-۱۹)

۱۲۷ عصمت اللہ جاوید
مرہٹی شاعری پواڑے اور لاونیاں
(آج کل ۶۱ جون ۹-۱۶)

۱۲۸ غبار یاور
عزل میں ایمائیت
(حام نو کراچی ۶۱ مئی ۱۱ـ۱۸)

۱۲۹ علام عباس
ڈاکٹر گلکرسٹ کی عجیب لعت نگاری
(اردو نامہ، ۶۱ اپریل تا جون ۳۹ـ۴۳)

۱۳۰ فاروقی شمس الرحماں
غالب کے کچھ بنیادی استعارے
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اپریل ۴ـ۱۲)

۱۳۱ فاروقی شمس الرحماں
غالب کی شاعری میں صورت، نعمہ اور رنگ
(ادیب علی گڑھ ۶۱ مئی ۴ـ۱۱)

۱۳۲ فاروقی محمد طاہر
اردو قصیدہ
(گذشتہ سے پیوستہ)
(اردو نامہ اپریل تا جون ۲۹ـ۳۶)

۱۳۳ فاروقی نثار احمد
مثنوی چندر کرن فارسی
مثنوی چندر کرن فارسی کا تعارف
(نگار ۶۱ اپریل ۶ـ۱۳)

۱۳۴ فاروقی نثار احمد
موجودہ اردو تنقید
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ مئی ۶ـ۱۸)

۱۳۵ فراق گورکھپوری
رویندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پر طائرانہ نظر
(آج کل ۶۱ مئی ۱۶ـ۲۶)

۱۳۶ فضیل جعفری
ٹیگور کا روحانی نظریہ
(آج کل ۶۱ مئی ۷ـ۹)

۱۳۷ فضیل جعفری
صفیہ اختر کا تنقیدی مرتبہ
(شاعر، بمبئی، جون ۱۴ـ۱۸)

۱۳۸ قاضی اطہر مبارک پوری
امام ابن الانباری کی کتاب الاضداد فی اللغة
(برہان ۶۱ اپریل ۲۲۳ـ۲۳۱)

۱۳۹ قمر رئیس
ٹیگور کا اثر اردو نثر پر
(جامعہ ۶۱ مئی ۳۸۶ـ۳۹۱)

۱۴۰ قمر رئیس
ٹیگور کے مختصر افسانے
(آج کل ۶۱ مئی ۵۱ـ۶۶)

۱۴۱ قیصر قلندر
کشمیر میں اردو
(شاعر، بمبئی ۶۱ مئی ۱۳ـ۱۸)

۱۴۲ کرامت علی کرامت
آزادی کے بعد، اڑیا شاعری
(شاعر، بمبئی، ۶۱ جون ۱۹ـ۲۳)

۱۴۳ گوپال ریڈی، بی۔
گرو دیو کے قدموں میں
(آجکل ۶۱ مئی ۲۷ـ۳۱)
ٹیگور سے عقیدت کا اظہار

۱۴۴ گھنشام سیٹھی
(آجکل ۶۱ مئی ۲ـ۴)
ٹیگور ۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

۱۴۵ گیان چند ڈاکٹر

فضائل علی خاں فضائل کی مثنوی
(قومی زبان کراچی ۶۱ جون ۱۳-۱۷)
شاہ حاتم اور آبرو کے ہم عصر
فضائل خاں بے قید یا فضائل کی ایک بزمیہ
مثنوی کا تذکرہ

۱۴۶ مائل محمد زکریا
(اردو نامہ ۶۱ اپریل تا جون ۵-۲۸)
شاہ مبارک آبرو
شاہ مبارک آبرو کے حالات زندگی
کا بیان اور کلام پر تبصرہ

۱۴۷ محمد اجمل خان
شانتی نکیتن
(آجکل ۶۱ مئی ٹیگور نمبر ۱۰-۱۶)
شانتی نکیتن پر ان کے خیالات

۱۴۸ محمد ایوب شمیم
مہجور شمسی
(اشارہ ۶۱ جون ۳-۱۸)
مہجور شمسی کے حالاتِ زندگی
اور شاعری کا تعارف

۱۴۹ محمد جعفر شاہ پھلواری
لاطینی رسم‌الخط کس لئے
(ثقافت ۶۱ مئی ۵-۱۱)
پاکستانی زبانوں کے لئے لاطینی
رسم‌الخط اختیار کرنے کے خلاف بحث

۱۵۰ محمد خان
رسالۂ من ہرن
(ریاست میسور میں اردو ۶۰ ستمبر ۲۰۳-۲۰۶)
حضرت مخدوم سید حسینی گیسو دراز
قدس سرہ کے ایک رسالے کا تعارف

۱۵۱ محمد حسنین
پیروی مغرب اور کلیم الدین احمد
(اشارہ پٹنہ ۶۱ اپریل ۵-۱۱)

۱۵۲ محمد مسعود احمد
حضرت غمگین شاہجہان آبادی
(برہان ۶۱ اپریل ۲۱۱-۲۲۲ مئی ۲۹۴-۳۰۳)
دو قسطوں میں قاضی عبدالودود کے
چند استفسارات مطبوعہ برہان ۶۰ اکتوبر
کے جوابات

۱۵۳ محمد مسعود احمد
حضرت غمگین اور مرزا غالب کے
جواب میں ان کا ایک اہم غیر مطبوعہ
مکتوب
(معارف ۶۱ مئی ۳۸۰)
میر سید علی غمگین دہلوی و گوالیاری
کی حیات و خصوصیات کی تفصیل کے
ساتھ غالب سے ان کے تعلقات کی وضاحت
کے بعد امامت و خلافت سے متعلق غالب
کے ایک فارسی خط اور اس کے جواب
میں غمگین کے فارسی خط کی نقل

۱۵۴ محمود الحسن
شوقی - جدید عربی ادب کا ممتاز شاعر
(معارف ۶۱ اپریل ۲۹۰-۳۰۹)
دوسری قسط

۱۵۵ محمود ایوبی
رنگ جگر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۴۷-۴۸)

۱۵۶ مظہر امام
حگر مراد آبادی ۔ میری یاد داشت میں
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۴۲۔۵۶)

۱۵۷ مغنی تبسم
اکرام جاوید اور فن افسانہ نگاری
(شاعر، بمبئی ۶۱ مئی ۲۵۔۲۹)
اکرام جاوید کے افسانوں کی فنی خوبیوں کا سرسری جائزہ

۱۵۸ ممتاز حسین
فن اور فطرت فکر اقبال کے آئینہ میں
(ماہ نو ۶۱ اپریل ۶۔۱۰)

۱۵۹ ممتاز حسین
جذبات نادر
(اردو نامہ ۶۱ اپریل جون ۴۶۔۵۴)
نادر کا کوری کی حیات اور شاعری پر اظہار خیال

۱۶۰ میاں بشیر احمد
ہمارا رسم الخط
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ جون ۱۴۔۱۶)
عربی رسم الخط میں ہی اردو لکھے جانے کی وکالت

۱۶۱ نازش پرتاب گڈھی
مرحوم جگر مراد آبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۴۸۔۵۱)
بحیثیت انسان جگر کا تذکرہ

۱۶۲ ناہید نوا
شاعر شیریں نوا
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۲۵۔۲۶)
پشتو کے شاعر رحمان بابا سے متعلق خیالات

۱۶۳ ندرت ثریا محمود
شہر یار غزل
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۷۹۔۸۲)
جگر کی غزلگوئی کے مختلف پہلو

۱۶۴ ندوی احتشام احمد
فن موازنہ اور اس کی ماہیت
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اپریل ۲۴۔۳۲)

۱۶۵ ندوی عبدالسلام (مرحوم)
فارسی شاعری اور فن تنقید
(معارف ۶۱ اپریل ۲۶۷۔۲۸۹)
ایران میں اگرچہ ہزاروں ادیب، انشاء پرداز اور شاعر پیدا ہوئے، تاہم کسی نے خاص ایرانیوں کے اسلوب بیان اور فارسی شاعری کی لفظی و معنوی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر فارسی شاعری کے تنقیدی اصول مرتب نہیں کئے اس کے تنقیدی اصول عربی سے ماخوذ ہیں

۱۶۶ ندوی عبدالسلام (مرحوم)
اردو شاعری اور فن تنقید
(معارف ۶۱ مئی ۳۲۵۔۳۲۹، جون ۴۲۵۔۴۴۱)
اردو زبان میں فن تنقید کی تدریجی ترقی کا ذکر

۱۶۷ نریندر لوتھر
صحافت آزادی کے بعد
(صبا پٹنہ ۶۱ اپریل ۷۔۱۱)

آزادی کے بعد کی اردو صحافت
پر اظہار خیال

۱۶۸ نصیر الدین ہاشمی
حیدر آباد میں جواہراسرارالله کے
مخطوطات
(صبح امید مدنی ۶۱ گجرات نمبر ۷۷-۷۹)
شاہ علی جی گام دہنی گجراتی کے
دیوان جواہر اسرار الله مرتبہ شاہ علی محمد
و شاہ ابراہیم کا تذکرہ

۱۶۹ نطر محمد انصار الله
حافظ غلام رسول شوق
(نگار ۶۱ اپریل ۲۰-۲۳)

۱۷۰ نقوی اکبر
جگر مرادآبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جگر نمبر ۳۳-۳۶)
جگر کے طرز فکر اور انداز بیان
سے بحث

۱۷۱ نہال حسین رضوی
قاضی نذرالاسلام
(جام نو کراچی ۶۱ جون ۱۱-۱۴)

۱۷۲ نیاز فتحپوری
دلی اسکول کے چار بڑے شاعر
(نگار ۶۱ جون ۱۲-۱۸)
دلی اسکول کے چار بڑے شاعر
مصحفی، مومن، ذوق اور غالب پر
اظہار خیال

۱۷۳ وحید قریشی
رسم‌الخط کا مسئلہ
(قومی زبان کراچی ۶۱ مارچ، جون ۲۱-۲۲)
حل نسخ کے رسم‌الخط میں پوشیدہ ہے

۱۷۴ وقار خلیل
ٹیگور بیک نظر
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جون ۳-۷)
رابندر ناتھ ٹیگور کے سوانح حیات
بقید سنین

۱۷۵ ہاشم امیر علی
شانتی نکیتن
(جامعہ ۶۱ مئی ۳۵۹-۳۶۵)
رابندر ناتھ ٹیگور کی قائم کردہ شانتی
نکیتن وشو بھارتی کے محل وقوع، اس کی
تاریخی عظمت اور طریقہ درس کا بیان

۱۷۶ ہاشمی نصیرالدین
ٹیگور حیدرآباد میں
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جون ۴۲-۴۳)

۱۷۷ ہمایوں کبیر
ٹیگور کی عظمت
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جون ۳۵-۳۶)
ٹیگور کی شخصیت اور اس کی فنکارانہ
عظمت کا بیان

۱۷۸ یوسف بخاری سید
میر باقر علی داستان گو
(نگار ۶۱ اپریل ۲۳-۲۸)

۱۷۹ یونس احمر
قومی گیت، ایک کیف، ایک نغمہ
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۴۳-۴۸)

آرٹ

۱۸۰ فیض احمد فیض
فلم اور ثقافت
(قومی زبان کراچی ٦۱ جون ۲۴-۴۴)

۱۸۱ محمد جعفر شاہ پھلواروی
موسیقی اور نواب صدیق حسن خاں
(ثقافت ٦۱ جون ۲۹-۳۹)

تعلیمات

۱۸۲ محمود نیازی
فنِ خوش نویسی
(آجکل ٦۱ اپریل ۳-۱۲)

فنِ خوش نویسی کی تاریخ

۱۸۳ شکلا سریش چندر
تعلیم اور احساس ذمہ داری
(جامعہ ٦۱ جون ۳۱۲-۳۱٦)

گاندھی جی کی بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم کے ذریعہ طالب علم کو کام کے ذریعہ عمل کے لئے تیار کئے جانے سے احساس ذمہ داری کا پیدا ہونا

۱۸۴ فاروقی ضیاءالحسن
تعلیم و تہذیب
(جامعہ ٦۱ جون ۳۰۱-۳۱۱)

متفرقات

۱۸۵ اصلاحی امین احسن
مکۂ معظمہ میں ایک عشرہ قیام
(میثاق ٦۱ اپریل ۳۹-۴۵)

۱۸٦ خالد کمال مبارکپوری
قاہرہ کا اسلامی میوزیم جو ستر ہزار اسلامی شاہکاروں پر مشتمل ہے
(برہان ٦۱ جون ۳٦۱-۳۷۵)

۱۸۷ شریف ایم. ایم. انوار حسین
(مترجم)
اقتصادیات میں انفرادیت کا تصور
(ثقافت ٦۱ جون ۵-۱۹)

۱۸۸ غوری شبیر احمد خان
شہاب الدین مقتول اور فلسفۂ مشائیت
(برہان ٦۱ اپریل ۲۳۸-۲۴۳)

حکیم وصل الرحمٰن صواتی سے استفسار

۱۸۹ فاروق قادری، ڈاکٹر
تپ دق اور اس کا علاج
(تعمیر انسانیت، لاہور ٦۱ مئی ۲۰-۲۲)

۱۹۰ فاروقی حاجی رفیع الدین مرادآبادی

فریدی نسیم احمد (مترجم)
سفر نامۂ حجاز
(الفرقان ۶۱ اپریل و مئی ۳-۹۳)
ہندوستان کا سب سے پہلا سفر نامۂ حجاز

۱۹۱ قریشی محمد حفیظ الکبیر
سانتاکروز سے شکاگو تک
(شاعر، بمبئی ۶۱ مئی ۳۰-۳۵)

۱۹۲ ندوی محمد حنیف
علامہ ابن تیمیہ کا تصور صفات
(ثقافت ۶۱ مئی ۱۲-۴۰)
فروری ۶۱ع سے مسلسل

۱۹۳ ندوی محمد حنیف
اخوت و درواقت کے تقاضے
(ثقافت ۶۱ جون ۲۱-۲۸)
بھائی چارہ وغیرہ سے متعلق چند باتیں

۱۹۴ وحید الدین خاں
نظریۂ ارتقاء
(زندگی رام پور ۶۱ مئی ۱۰-۳۶)

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

جنوری ۱۹۶۲ء

جلد ۱۳ | ~~اکتوبر ۱۹۶۱ء~~ | شمارہ ۱

شذرات

اردو زبان و ادب کی بقا و ترقی کے سلسلہ میں جس جوش و زور سے غلغلہ بلند کیا جاتا ہے افسوس کہ عملی دنیا میں اس کا کوئی تسکین بخش و تسلی زا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر ہم گذشتہ سال کی ادبی و علمی تصانیف کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انفرادی اور ادارتی دونوں حیثیتوں سے جو اچھی اور تعمیری کتابیں شائع کی گئی ہیں ان کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے پھر ابھی تک بہت سے ایسے موضوع ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

اردو میں اقتصادیات اور تاریخ پر اب تک کتنی کتابیں لکھی گئی ہیں؟ علوم کے سلسلہ میں تو ہمارا خزانہ اب تک تقریباً خالی ہی ہے۔ یہ سائنس کا عہد ہے لیکن اس پر علمی تصانیف کا تو ذکر ہی نہیں، عام مطالعہ کے لائق بھی نصف درجن سے زیادہ کتابیں نہیں ملیں گی اور شاید اسی کمی کو محسوس کرکے حکومت ہند نے دوسرے انعاموں کے ساتھ سائنس کی ایسی کتابوں پر بھی جسے ایک عامی مطالعہ کرسکے انعامات مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اردو کی دو تصانیف کو بھی اس سال انعام ملا ہے۔

اسی طرح بچوں کا صحت مند اور صحت بخش ادب بھی اچھی رفتار اور اچھے معیار پر شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس ادب کے لکھنے والوں کے لئے ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ دماغ کی ضرورت ہے جو ملک و ملت کی تاریخ، زبان اور بچوں کی نفسیات سے واقف ہو۔ پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں تصویروں اور رنگین نقشوں کے ذریعہ بچوں کے لئے دلکش بنائی جائیں۔ اگر ہم نے آج کے بچوں میں اچھا ادبی ذوق پیدا کردیا تو یہی بچے اردو کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی محدود تعداد میں خوشگوار اضافہ کرسکیں گے۔

اس سال کی پاکستانی مطبوعات کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو میں انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں کی اہم ادبی، تاریخی، سوانحی، اقتصادی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے بھی شریک ہیں۔

طباعت کے سلسلہ میں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دونوں ملکوں کے اردو بولنے والوں نے اردو ٹائپ کو پسند کرنا شروع کردیا ہے اور اسی کا نتیجہ

ہے کہ ٹائپ میں چھپی ہوئی خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں بازار میں آ رہی ہیں. یہ سلسلہ اگر قائم رہا تو مستقبل قریب میں اپنی کتابوں کا معیار بہت زیادہ بڑھاسکیں گے. ٹائپ کے سلسلہ میں لغت نویسی میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان پر اسی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو غور و فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے ہمارے ماہرین سے جو ٹائپ کی طباعت اور لغت نویسی کے سلسلہ میں ہر لفظ کے صحیح ہجے بتانے کی مشکلات سے واقف ہیں اور جو اس سلسلہ میں سونچتے اور کسی عملی نتیجہ پر پہنچتے رہے ہیں، درخواست ہے کہ اس طرف توجہ کریں اور اس موضوع پر اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں.

ہمارے ملک میں ابتدائی درجوں کو چھوڑکر ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی ابھی تک خاطر خواہ طے نہیں ہوا ہے اور سہ لسانی تجویز کے مطابق اردو والوں کے لئے اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے ثانوی مدارس خود کھولیں بلکہ جہاں علاقائی زبانیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم ہیں وہاں اپنے کالجوں کا بھی انتظام کریں. یہ صورت بڑی حد تک نا قابل عمل معلوم ہوتی ہے. اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو کم از کم تمام سرکاری کاموں کے لئے علاقائی زبان اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کی بھی اتنی ہی استعداد جس کے ذریعہ ہم ان زبانوں میں کام کرسکیں، پیدا کرنا ہے. ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں کے اردو دوست ماہرین تعلیم بڑی سنجیدگی اور عاقبت بینی سے اس مسئلہ پر ہر زاویۂ نگاہ سے غور کریں کہ اردو کے مقام کو ہندوستان میں باقی رکھتے ہوئے ذریعۂ تعلیم کیا ہو؟ ہم کو جذبات سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں اس مسئلہ کو طے کرنا چاہئیے کہ اردو اس طرح داخل نصاب رہے کہ ہر منزل پر طالب علم اس کو کم از کم اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھ سکے.

دسمبر میں دانشگاہ تہران کے شعبۂ فنون کے صدر اور شعبۂ اشاعت و تمدن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ذبیح‌اللہ صفا نے اپنی تشریف آوری سے ادارہ کی عزت افزائی فرمائی اور ادارہ کے مقصد اور کام کی نوعیت سے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کوشش کریں گے کہ دانشگاہ تہران اور ادارے سے علمی رشتہ قائم ہوجائے. اس سلسلہ میں انہوں نے دانشگاہ تہران کی ترسٹھ کتابیں

ادارہ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ ہم ان کا اور دانشگاہ تہران کا اس کےلئے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ یہ تعلقات روز بہ روز زیادہ مستحکم اور مفید ہوتے جائیں گے۔

سنہ ۱۹۶۱ع نے جاتے جاتے ہم کو ایک اور چرکا دیا۔ ۳۱ دسمبر کو جب سال کے آخری دن کا آفتاب غروب ہو رہا تھا ہمارے آسمان ادب و اخلاق کا ایک اور درخشاں ستارہ بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ڈاکٹر سید محمد حفیظ نہ صرف یہ کہ ادبی و علمی دنیا کے ایک ممتاز رکن تھے بلکہ انسان کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بلند تھا۔ ابتداء زندگی ہی سے انہیں حصول علم کا شوق تھا۔ وہ اپنے علم سے دوسروں کو بھی سیراب کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے انھوں نے درس و تدریس کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے بی۔اے اور ال۔ٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی یہ زندگی شروع کردی تھی۔ لیکن ان کی علمی تشنگی دور نہیں ہوئی وہ مختلف اسکولوں کی ماسٹری اور ہیڈ ماسٹری کرتے ہوئے سنہ ۱۹۱۸ع میں بمبئی آئے۔ انجمن اسلام ہائی اسکول کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے بھی فرائض انجام دئیے اس کے بعد وہ پونہ میں لکچرار ہوئے اور یہاں سے ترقی کرکے الہ‌آباد پہنچے اور وہاں سے یورپ گئے اور پیرس سے ڈی لٹ وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کرکے الہ‌آباد یونیورسٹی میں اردو کی خدمت کے لئے واپس آئے۔ بمبئی اور دکن کے قیام اور صوفیاء سے عقیدت نے ان کو صوفیا کی دکنی تصانیف کا گرویدہ کردیا تھا۔ چنانچہ یورپ جانے سے پہلے انھوں نے حضرت برہان‌الدین جانم اور قاضی بحری پر انگریزی میں دو مقالے لکھے اور واپسی پر بحری کے کلیات کو ایڈٹ کرکے شائع کیا۔ وہ اردو ہی کے ایک اچھے انشا پرداز اور محقق نہ تھے بلکہ انگریزی تقریر و تحریر میں بھی ان کو کافی دستگاہ تھی۔ وہ لیڈر الہ‌آباد اور ہندو مدراس کے مستقل لکھنے والے ہی نہ تھے بلکہ ہندو میں اسلامی موضوعات اور زبانوں پر جتنی بھی کتابیں ریویو کے لئے آتی تھیں ان پر تبصرہ وہی کرتے تھے۔ پھر انھوں نے اردو اخبارات و رسائل کے مضامین سے بھی انگریزی خوانوں کو روشناس کیا، انگریزی میں بھی ان کی دو کتابیں گوتم بدھ اور کبیر پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

* مہر محمد خاں شہاب

غالب و ذوق کے سہرے

ایک تفصیلی تبصرہ

چار پانچ برس ہوتے ہیں کہ مجھے غالب پر جدید و قدیم لٹریچر کو بہ تفصیل دیکھنے کی ضرورت پیش آئی ۔ چالیس کے قریب تحریریں نظر سے گزر گئیں نتیجہ میں بہ عنوانہائے مختلف دو ڈھائی سو صفحوں کا کتابچہ وجود میں آگیا ۔ یہ مسودہ ایک فاضل دوست کے مطالعہ میں آچکا تھا ۔ انہوں نے پچھلے دنوں ایک خط میں دریافت فرمایا کہ اس کی اشاعت کی کیا صورت ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ میری اور بہت سی تحریروں کی طرح شاید گوشۂ گمنامی ہی میں پڑا رہے گا ۔ لیکن اس مطول مضمون کا ایک حاشیہ غالب و ذوق کے سہروں کی بحث پر مشتمل ہے ۔ یہ حاشیہ اصل مسودہ پر بعد میں اضافہ کردیا گیا تھا ۔ اس کے متعلق دل نے چاہا کہ چلو اور نہیں تو کم سے کم یہ تو پڑھنے پڑھانے والی برادری کے سامنے آہی جانا چاہئے ۔ اس سے کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو ، اپنے پندار کی تو آسودگی ہو ہی جائے گی ۔ اور اگر کسی عزیز دوست نے کسی حیثیت سے بھی اس پر نظر التفات فرمائی تو راقم یقیناً ان کا ممنون ہوگا ۔

دسمبر ۱۸۵۱ ع میں شہزادہ جواں بخت کی شادی ہوئی ۔ مرزا غالب نے شہزادۂ موصوف کی والدۂ ماجدہ ملکہ زینت محل کے ارشاد پر ذیل کا سہرا لکھا ۔

۱ خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

* مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیرکوٹلوی ، بمبئی ۳

۲ کیا ہی اس چاند سے چہرے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

۳ سر پر چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا نمبر سہرا

۴ ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

۵ سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

۶ رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

۷ یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

۸ جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

۹ جب کہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

۱۰ رخِ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائیں فروغِ مہ و اختر سہرا

۱۱ تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

۱۲ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بقول صاحب «آب حیات» مولانا آزاد، بادشاہ ظفر نے سہرے کے مقطع کو نہ صرف اپنے استاد ذوق پر بلکہ اپنی ذات پر چوٹ سمجھا۔ چنانچہ آب حیات میں ہے کہ:۔

مقطع کو سن حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا کہ اس کے یہ معنی ہوئے اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے

والا نہیں. ہم (ظفر) نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک‌الشعراء بنا دیا ہے، یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرفداری ہے. چنانچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ (غالب کا) سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی، «پیر و مرشد درست». بادشاہ نے کہا کہ «تم بھی ایک سہرا کہہ دو». عرض کی «بہت خوب» پھر فرمایا «ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا». (آب حیات ص ۸۸ - ۴۸۷) مولانا آزاد کا بیان آپ کے سامنے ہے. ذوق تو اظہار خفگی کرتے یا نہ کرتے مگر بادشاہ نے ذوق کو مرزا کے مقابل لا کھڑا کیا چنانچہ ذوق نے غالب کا سہرا سامنے رکھ کر سہرا لکھا جو حسب ذیل ہے۔

ذوق کا سہـــــرا

۱ اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
۲ آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک
کشتئ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا
۳ یہ کہے صلِّ علیٰ وہ کہے سبحان‌اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہـــرا
۴ تا بنی اور نہ میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
۵ دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہـــرا
۶ روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
۷. تابش حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

۸ ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

۹ اک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

۱۰ پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

۱۱ سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

۱۲ رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے رخ کو جو تو منہ سے اٹھاکر سہرا

۱۳ کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

۱۴ دُرِّ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثناگر سہرا

۱۵ حسن کو دعویٰ ہے سحر کا یہ سادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سحور سہرا

مرزا نے یہ ڈھنگ دیکھ کر معذرت پیش کی۔ اسے معذرت ہی سمجھا گیا لیکن ادا شناس جانتے ہیں کہ اس معذرت میں مرزا نے اپنی برتری کا اعلان کیا ہے۔ اس وقت گفتگو کا یہ پہلو ہمارے پیش نظر نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں سہروں نے مختلف طبیعتوں پر کیا اثر کیا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ انسانی طبیعتوں کا یہی تضاد ہے جو گلشن عالم کی رنگا رنگی کا موجب اور عالمِ ایجاد و اختراع کا میدان رستاخیز سا ہوا ہے۔

اثناء مطالعہ میں عصر حاضر کے دو اہل علم و فضل و کمال کی رائیں ان سہروں کے متعلق سامنے آئیں۔ ان فاضلوں میں سے ایک مشہور محقق شیخ محمد اکرام صاحب ہیں۔ انھوں نے سہروں کی بحث میں فرمایا کہ «مرزا کا سہرا ذوق کے سہرے سے بہتر تھا۔» اس پر میرے ایک فاضل عزیز و محترم نے نجی طور

پر مجھے لکھا کہ :۔

« یقیناً ذوق کا سہرا مرزا کے سہرے سے بہتر ہے، کیونکہ بعد میں اور اسے سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔»

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر چیز کے حسن و قبح کا فیصلہ اس چیز کو دیکھنے اور جانچنے والوں کے مذاق و نظر پر موقوف ہے، اور یہی حال ان سہروں کے حسن و قبح پر اظہار رائے کا ہے۔ دو واصلوں کی رائے ہمارے سامنے ہے۔ تا ہم کیا حرج ہے اگر ہم بھی ان سہروں کے اشعار و مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

واقعہ تو یہی ہے کہ غالب نے سہرا پہلے کہا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بقاعدۂ الفضل للمتقدم، غالب ہی کا سہرا افضل ہے، اور یہی شیخ محمد اکرام کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ادھر ایک دوسرے مسلمہ اہل علم و فضل و نظر ہیں جنھوں نے غالباً «نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول» کے مقولے کے پیش نظر ذوق کے سہرے کو غالب کے سہرے سے بہتر ٹھہرایا ہے۔ اگر چہ اس خیال پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر نقاش اول، جو غالب ہے، دوسرا سہرا کہتا تو وہ سہرا نقاش اول غالب کے سہرے کا نقش ثانی ہوتا لیکن یہاں شاید ذوق کے سہرے کو غالب کے سہرے کے بعد کہا جانے کی وجہ سے پہلے سہرے کا نقش ثانی خیال کرلیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ذوق کا سہرا نقاش اول غالب کے سہرے کا نقش ثانی نہیں کہلا سکتا۔ یہ بالکل حق ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اور یہ قیاس بھی درست ہے کہ ابتدائی نمونے میں جو کمی رہ گئی ہو، دہیں نقال اپنی نقل کو ان کمیوں سے پاک و صاف کرلیا کرتا ہے۔

ان سب خیال آرائیوں سے قطع نظر جب دونوں سہرے ہمارے سامنے ہیں، تو کیا مناسب یہی نہ ہوگا کہ ایک ایک کرکے دونوں سہرے کے شعروں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ خود ہمیں کیا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ غالب کے سہرے میں بارہ شعر ہیں اور ذوق کے سہرے میں پندرہ شعر۔ اگر ذوق کے سہرے کو بعد میں لکھا جانے کی وجہ سے غالب کے سہرے سے اچھا کہا جاسکتا ہے تو اس کے اشعار کی زیادتی بھی اس کے لئے ایک اور سبب فضیلت ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر ندرت بیان برعایت حقیقت

پسندی کوئی چیز ہے تو سرسری نظر سے معلوم ہوگا کہ غالب کے بارہ شعر بارہ مضمون یا بارہ دلکش خیال ہیں، اور اس کے بالمقابل ذوق کے پندرہ شعری سہرے کی یہ حالت ہیں۔ مثلاً ذوق نے اپنے سہرے کے اشعار ۶، ۷، ۱۳ میں جو ذیل میں درج ہیں، اس الفاظ کے ادل بدل سے ایک ہی خیال دہرایا ہے۔ اور اس خیال میں بھی نہ حقیقت کا شائبہ ہے نہ پیرایۂ بیان میں کوئی خاص دلکشی اور بانکپن۔ ملاحظہ ہو :۔

۶ روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے سا ایک سراسر سہــــرا
۷ تابش حسن سے مـــانندِ شعاعِ خورشید
رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہـــرا
۱۳ کثرتِ تارِ نظر سے ہے تمـاشائیوں کے
دمِ نظـارہ تیرے روئے نکو پر سہـــرا

یعنی تارِ بارش انوار کا سہرا، تابشِ شعاعِ خورشید کا سہرا، تارِ نظر کا سہرا خیال ایک ہے، لفظ تین طرح کے ہیں اور بات کچھ بھی نہیں۔

اور طرفہ یہ ہے کہ تماشائیوں کو بجز اصل سہرے کے جو واقعی جواں بخت کے چہرے پر بندھا ہوا تھا۔ ذوق کے بنائے ہوئے نورانی سہروں میں سے ایک بھی نظر نہیں آتا تھا۔ نہ ان شعروں میں کوئی ایسا اشارہ کیا گیا ہے جس سے ان حقائق نورانی کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کی کوئی وجہ پیدا ہو۔ ہاں شعر نمبر ۱۳ کے مصرعۂ اول کو ملاحظہ کیجئے، اور اس میں لفظ « تماشائیوں » کو دیکھئے، پورا پڑھا جانے کی بجائے « تماشایوں » یا « تماشاؤں » پڑھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خود میرے ہی پڑھنے کی غلطی ہو ورنہ ذوق کی طرف ایسی لفظی غلطی منسوب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب غالب کے سہرے کا مطلع لیجئے :

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہـــرا

غالب جواں بخت کے نام کے لفظوں سے فائدہ اٹھاکر خود بخت یا بختاوری اور خوش نصیبی سے خطاب کرتے ہیں کہ اے بخت تو خوش ہو کہ آج ترے سر سہرا ہے۔ یعنی تو بڑا خوش بخت اور کامیاب ہے اس لئے کہ تجھ کو

شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھنے کا مبارک موقع ملا ہے اس لئے اٹھ اور جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ. دیکھ تو حرف بخت ہے تجھی کو خوش ہوکر جواں بخت کے سر پر سہرا باندھنا چاہئے کیونکہ بخت کی فائزالمرامی جواں بختی ہی میں نمایاں ہوا کرتی ہے. مطلع سے ظاہر ہے کہ گویا غالب نے اپنے سہرے کے لئے قصیدے کی تشبیب کا انداز اختیار کیا ہے. اور ذوق چھوٹتے ہی جواں بخت سے مخاطب ہوجاتے ہیں جو آداب فن کی پابندی کے خلاف ہے. دیکھئے ذوق کا مطلع ہے:

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

ذوق شادی کے سہرے کو یمن و سعادت کا سہرا مان کر شہزادہ جواں بخت کو مبارکباد دیتے ہیں گویا آپ کی یہ شادی آپ کی سعادت مندی کا نتیجہ ہے، اور اس کی علامت یہ سہرا ہے. مطلع برا نہیں. صاف سیدھی بات ہے، نثر میں کہی جاتی تو یوں ہی کہی جاتی. اس میں اور تو جو کچھ ہے وہ سامنے ہے، لیکن شعریت کہاں ہے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا. حالانکہ اچھے شعر کی نفسیاتی اور حسیاتی تاثیر یہ ہونی چاہئے، اور ہوتی ہے، کہ اس کے پڑھتے اور سنتے ہی انسان چونک پڑے، اور اس کے دل و دماغ کے ریشہ ریشہ اور ذرہ ذرہ میں اہتزاز پیدا ہوجائے.

غالب کا دوسرا شعر ہے:-

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

ذوق کا دوسرا شعر ہے:-

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِّ انجم سے فلک
کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

غالب سہرا لکھ رہے ہیں اور سہرے کی موجودہ حقیقت واقعی کا اظہار کر رہے ہیں. اور جواں سال جواں بخت کے تر و تازہ جوان چہرہ مہرے کی قدرتی حسن و زیبائی کے اقرار و اظہار کے بعد کہتے ہیں کہ یہ سہرا جو تیرے سر پر بندھا ہے، تیرے اس حسنِ دل افروز کے لئے ایک زیور ہے.

کیونکہ کہا گیا ہے. ع یار زیبا به زیب زیبلہ تر. بیان واقعہ میں کوئی مبالغہ نہیں. اور شاعرانہ حسن ِ بیان صاف طاہر ہے.

ذوق کی نظر میں جواں بخت کا موجودہ سہرا اپنے اندر کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں رکھتا. گویا کہ ابھی سہرا باندھے جانے یا سہروں کے ادل بدل اور انتخاب کا موقع باقی ہے اس لئے کہتے ہیں کہ یہ «دن» تو ایسا ہے کہ دن میں تارے آتے، اور آفتاب غائب ہوجاتا، اور فلک اپنی بلندیوں سے پہلی رات کے ہلال کی کشتی بنا کر جو کسی کو دکھائی دیتا اور اکثروں کو مطلق دکھائی نہیں دیتا، اس میں آسماں کے تارے توڑ کر، ایسی نازک سی ہلالی کشتی میں سجاکر سہرا لاتا. موجودہ پر قناعت نہیں کیونکہ اس میں جاذبیت نہیں، دلکشی نہیں، تجویز ایسی پیش کی گئی ہے کہ شادی ملتوی کردی جائے، پوری مجلس اٹھ جائے. براتی اپنے اپنے گھر چلے جائیں، پھر جب کبھی ذوق کی تجویز پر عمل ہوجائے اور جب شاعرانہ نازک خیالی کا مصداق ایسا سہرا آجائے تو پھر نئے سرے سے شادی کا اہتمام کیا جائے. سوچئے اس شعر میں کونسا حسن ہے، مبالغہ ضرور ہے. اور مبالغہ بھی محض مبالغہ حسن میں کوئی بات ایسی نہیں کہ سن کر انسان متوجہ ہوجائے.

ذوق کا تیسرا شعر:

یہ کہے صل علیٰ وہ کہے سبحان اللہ دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

اس شعر کے مصرع ثانی میں البتہ جواں بخت کے موجودہ سہرے کو پسند کرکے ماہ سے صل علیٰ اور اختر سے سبحان اللہ کہلانے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے. یہ شعر بھی دوسرے شعر ہی کی مد میں آجاتا ہے کہ اگر مہ و اختر آئیں اور شہزادہ جواں بخت کی جشن عروسی کا نظارہ کریں اور صدر مجلس میں دولہا اور اس کے چہرے کو دیکھیں تو ان میں سے ایک صل علیٰ کہے اور دوسرا سبحان اللہ. یہ بھی ذوق کا محض حسن ظن ہے کہ آسماں سے چاند اور تارے زمین پر آجائیں اور شہزادہ جواں بخت کی مجلس عروسی کا نظارہ کریں تو وہ بے اختیار صل علیٰ اور سبحان اللہ کا ورد کرنے لگیں گے. ہمارے نزدیک مہ و انجم کی مجلس عروسی میں عدم موجودگی اس کارو بار وظیفہ خوانی سے عدم دلچسپی کے اظہار کے لئے کافی ہے.

پھر اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ مہ و انجم ہی صل علیٰ کیوں کہیں. کیا صرف اسی لئے کہ تاروں کو موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے. انسان کیوں نہ ہیں. فرشتے کیوں نہ کہیں. حالانکہ حسن و دلکشی کا معجزہ یہ ہوتا کہ انسان داد دیتے. داد دینے کے لئے مہ و اختر کو کیوں چنا گیا. پھر کیا ان بے زبانوں کا اجتماع ممکن بھی ہے؟ پھر مـــہ و اختر جو دو اسم ہیں اور ان کو جمع کی صورت میں لاکر «ہیں» آنا چاہئیے تھـا نہ کہ «ہے». صیغہ جمع کے لئے واحد لانا کچھ عجیب سی بات ہے.

ذوق کا چوتھا شعر ہے:

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم   گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

اس شعر میں ذوق نے دلی کی کسی پرانی رسم کا ذکر کیا ہے. کہ اگر سورۂ اخلاص پڑھ کر سہرا گوندھا جائے تو بنی اور بنے میں بنی رہتی ہے. یہاں معمولی درجہ کے لفظی تناسبات سے کام لیا گیا ہے کہ بنی (دلہن) اور بنے (دولہا) میں بنی (اتفاق) رہے. اس مقصد کے حصول کے لئے سورۂ اخلاص پڑھ کر سہرا گوندھنا چاہئیے. اس مناسبت لفظی میں پیرایۂ بیاں یا شاعرانہ تخیل کی کوئی ندرت نہیں اتنا ضرور کیا ہے کہ ذوق نے قرآن حکیم کی ایک سو بارہویں سورت کو پڑھ کر سہرا گوندھنے کی تجویز پیش کی ہے. حالانکہ اس سورت میں مجرد توحید الٰہی کو ہر قسم کے ذاتی و صفاتی شرک سے بے لاگ اور لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کیا گیا ہے. اور اسی سورت میں «لَمْ یَلِد» اور «وَلَمْ یُولَدْ» بتایا گیا ہے. اور دوسری جگہ اس کے «صاحبہ» (بیوی) اختیار کرنے سے انکار کیا گیا ہے. ازدواج اور ارواج کا مسئلہ مخلوق سے مختص ہے، اور خالق کی صفت تجرید ہے، توحید ہے، صمدیت ہے، بے مثالی ہے، سمجھ میں آنا آسان نہیں کہ مرد و عورت کے ازدواج کے وقت سورۂ اخلاص کی تلاوت کرنا کیسے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے. جب کہ یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ دعاؤں میں ذات باری کی ان صفات کا زبان پر اور ذہن میں لانا عین حکمت ہوتا ہے، جو انسانی مقصد برآری کے لئے کلید کا درجہ رکھا کرتی ہیں. جیسے اے کریم کرم فرما، اے رحیم رحم کر، یوں نہیں کہا جائے گا کہ او قہار رحم کر، او جبـار بخش دے. وقس علیٰ ھذا.

ذوق کا پانچواں شعر ہے:

دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

کہا گیا ہے کہ چونکہ گلشن آفاق یعنی دنیا میں اس سہرے یعنی ذوق کے سہرے کی دھوم ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مرغانِ نوا سنج سہرا نہ گائیں. ظاہر ہے کہ باغ و راغ میں پرندوں کا چہچہانا، ان کا ہر روز کا وظیفہ اور صبح و شام کا معمول ہے. ان کے اسی چہچہانے کو ان کا «سہرا گانا» قرار دینا محض ایک بے کیف فرضی بات ہے. اگر مان لیا جائے کہ چڑیاں سہرا گا رہی ہیں. تو معلوم نہ ہوا کہ چڑیاں جو سہرا گا رہی ہیں وہ گایا جانے والا سہرا خود چڑیوں کا تصنیف کیا ہوا تھا یا ذوق کا مصنفہ سہرا تھا. جیسے طوطے اور مینا تو دہراسکتے ہیں. لیکن باقی مرغانِ چمن سے یہ بھی نہیں ہوسکتا. آخری بات ہو نہیں سکتی کیونکہ ذوق کا سہرا تو ابھی ان کی جیب ہی میں تھا. تو پھر یہ سہرا کس نے مرغانِ چمن کو رٹوا دیا.

شعر کا مفہوم ایک شاعرانہ تعبیر کہلاسکتی ہے. مگر پیرایۂ بیان اس کی اجازت نہیں دیتا.

ذوق کا شعر نمبر آٹھ:

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دم آرائش   سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

یہاں بھی لفظی بازی گری ہے. پہلے مصرع میں «پہ» اور دوسرے مصرع میں «پہ» یہ دونوں «پہ» مل کر اس شعر کا قافیہ بن کر «اوپر» بن گئے ہیں. تاہم اس شعر کا پہلا مصرع خاصا اچھا تھا لیکن اس شعر کے دوسرے مصرع کے لفظوں کی ترتیب نے. ع سر پہ دستار ہے، دستار کے اوپر سہرا. پہلے مصرع کی جزوی خوبی کو بے روپ کردیا. ذوق صرف دستار اور سہرے کی آرائش و تزئین میں الجھے ہوئے ہیں. ان کو جواں بخت یا نوشاہ کی دلکش شخصیت اور اس کے کالے ٹھلے اور سر و سینہ میں رعنائی و دلکشی دکھائی نہیں دیتی. پھر نظر ڈالئے کیا یہ شعر غالب کے سہرے کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے.

ذوق کا شعر نمبر ۹:

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

دونوں مصرعوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ محض غلط، محض مبالغہ، اور بغیر کسی شاعرانہ نازک خیالی اور بانکپن کے ہے۔ اس میں « کان گہر » یا صد کاں گہر کی ترکیب اور دوسرے مصرع میں « لے لے کے » جیسے ٹکڑوں کی بھرتی نے شعر میں لفظاً و معناً جو نقص پیدا کردیا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور دوسرے مصرع میں یہ کہنا کہ یہ سہرا گہر لے لے کے بنوایا ہے، سہرا بنوانے والے کی مجبوری و بیچارگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ سہرا جو جواں بخت کے چہرے پر آویزاں تھا، وہ حسب تصریح ذوق جواں بخت کا ایک ایک گوہر لے کے بنوایا ہوا تھا، یا ان کے والد ماجد ظفر کا بنوایا ہوا تھا۔ اگر یہ بات ہے تو اس آخری مصرع کے انتخاب الفاظ سے ظفر کی بیش خوارگی اور بیچارگی ظاہر کرنا مد نظر معلوم ہوتا ہے۔ ایک بات اور، جہاں تک ہماری محدود معلومات ہیں سہرا پھولوں کا ہوتا ہے یا موتیوں کا، پھول ہوں یا موتی ان کا « کان گہر » سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا پھر معلوم نہیں دریائی موتیوں کے لئے « صد کاں گہر » میں کیوں جھاڑو پھیر دی گئی، کہ ہیرے کی پوری ایکسو کانوں میں ٹوٹا پھوٹا، داغی، رگ دار، اچھا برا ایک بھی ہیرا نام کا یا ہیرا نما سنگ ریزہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور جو بھی کنکر پتھر ملا اسی کو اندھا دھند پروتے چلے گئے۔ پھر شعر میں کوئی اشارہ نہیں جس سے خیال پیدا ہو کہ ان ہیروں کو پسند کرنے میں جوہریوں کی جوہر شناسانہ نگاہ سے کام لیا گیا ہو یا اور فنکاروں کی نظر انتخاب کا سایہ بھی ان پر پڑا ہو۔ اس کے مقابلے میں غالب کے سہرے کے پانچویں شعر کو رکھئے اور خود فیصلہ کیجئے۔

ذوق کے سہرے کا دسواں شعر یہ ہے:

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی باد بہار اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

پورا شعر حاصہ ہے مصرعہ ثانی سیدھا سادا، قدرتی اظہار خیال ہے۔ لیکن باد بہار کے چلنے کو اترانا بتانا تعریف نہیں اس کی منقصت ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں اللہ کا استعمال اظہار حیرت کے لئے ضرور ہے مگر تعریف کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس لئے بے جوڑ سی بات ہوگئی۔ اگر باد بہار کی عطر بیزی اور سر خوشی کو

اترائے پھرنے سے تعبیر کیا جائے گا تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ «اترانا» ایک صفت سفلگی ہے اور باد بہار کی سرخوشی اور اس کے جھونکے قدرتی اور بے اختیارانہ ہوتے ہیں، ان میں اترانے کا دخل نام کو بھی نہیں ہوتا، اس لئے بادِ بہار کے جھونکوں کو اترائے پھرنا کہنا خصوصاً دوسرے مصرع کی موجودگی میں متوازن پیرایۂ بیان نہیں کہا جائے گا۔ اگر بادِ بہاری اتراتی پھرتی ہے تو اس کی معجز نمائی غتربود ہوکر الٹا اس کا چھچھورا پن نمایاں ہوجائے گا، کہ فرض منصبی ادا کرنے پر اترانے کی بھیانک غلطی کر رہی ہے۔ حالانکہ بادِ بہار کے جھونکوں میں مظاہر قدرت کی رعنائی تو ہوتی ہے، چھچھورا پن ابداً نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسا خیال کرے تو یہ خود اس کی ذہنیت کا اوچھا اظہار ہوگا۔

اس شعر کو پڑھ کر ایک اور سوال سامنے آگیا۔ جواں بخت کی شادی دسمبر میں ہوئی تھی۔ پھول تو بے موسم بھی مل سکتے ہیں، اور ماحول کو اپنی خوشبو سے معطر کرسکتے ہیں۔ لیکن بادِ بہار ہر موسم کی ہوا کو نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے خانۂ کعبہ کا عمرہ مع تمام مناسک کے سال کے کسی دن اور کسی بھی موسم میں ہوسکتا ہے، مگر «حج» ذی‌الحجہ کی مقررہ تاریخ ہی میں مناسک حج ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ موقع سال میں صرف ایک ہی بار آتا ہے۔ یوں بھی اگر گلشن میں بادِ بہاری کا عمل دخل ہو بھی تو یہ موسم بہار کا اثر ہے، کہ تمام ماحول میں خوشبو رچی اور بسی ہوئی ہے، اور معطر سہرا اس کا مظہر ہے۔ نہ کہ سوا گز کے سہرے کی معجز نمائی۔[1]

ذوق کا گیارہواں شعر ہے:

۱۔ غالب نے تو جواں بخت کے سہرے کی لمبائی گز بھر ہی بتائی ہے مگر میں نے بڑی احتیاط سے سہرے کی لمبائی سوا گز کی بتائی ہے کیونکہ بعد میں کہے جانے والے سہرے کا مطالعہ پیش نظر ہے۔ ورنہ جہاں تک میں جانتا ہوں شمالی ہند میں خوفناک حد تک لمبے سہرے نہیں ہوتے۔ جیسے کہ ماشاءاللہ ہمارے بمبئی میں عام طور سہرے ہوتے ہیں کہ سر سے پیروں تک پھولوں کا ایک غلاف دولہا پر چڑھا دیا جاتا ہے جو تنفس میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ عموماً اسی لئے چلنے میں دولہا کو سہارا دیا جاتا ہے اور اس کے چہرے کے سامنے چلنے میں پنکھے جھلے جاتے ہیں اگر احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو تنفس کے رک جانے سے دولہا پر نیم بیہوشی کی سی حالت بھی طاری ہوسکتی ہے اور بعض وقت ہو بھی جاتی ہے۔ شہاب

سر پہ طرّہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

کیا حسن ترکیب ہے۔ « سر پر طرّہ » « منہ پر سہرا » « گلے میں بدھی » « ہاتھ میں کنگنا » ان چاروں ٹکڑوں میں « زیبا » اور « مزین » کے لفظوں کو ملاکر چاروں ٹکڑوں کو جوڑکر شعر تیار ہوگیا اس شعر میں فارسی کے مشہور ضرب المثل شعر سے کسی قدر زیادہ شعریت ضرور ہے، جس میں کہا گیا ہے :-

دندانِ تو جملہ در دہانند		چشمانِ تو زیرِ ابروانند

ذوق کے سہرے کا بارہواں شعر یہ ہے :

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے رخ کو جو تو منہ سے اٹھاکر سہرا

شاعرانہ خیال اتنا سا تھا کہ اگر جواں بخت اپنے رخ سے سہرا ہٹادے تو فلک رونمائی کے طور پر مہ و خورشید کا نذرانہ پیش کرے۔ مگر شاعرانہ مبالغہ ہے اور اس خیال پر شاعر کی خوردہ گیری نہیں ہوسکتی۔ لیکن دوسرے مصرعہ کو دیکھئے۔ کہ اس میں سہرا « منہ » سے اٹھواکر « رخ » کھلوایا گیا ہے، اگر استاد شاہ منہ کو کھلواکر سہرے کو رخ سے اٹھواتے تو کون منہ کھول سکتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ گویا صرف منہ ہی سہرے کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ جبھی تو کہا گیا ہے کہ سہرا منہ سے اٹھادو۔ اگر یہی بات ہے تو رخ کو کھول دینا بھرتی ہے۔ پھر کیا مہ و خورشید اکٹھے ہوسکتے ہیں کہ رونمائی کے طور پر دئیے جاسکیں۔ ماہ ہے تو مہر غائب۔ مہر ہے تو ماہ کا پتہ نہیں۔ قرض دوام کی ادائیگی میں تو قسطیں ہوتی ہیں۔ لیکن دولہا دلہن کی رونمائی میں ادھار کا معاملہ، وہ بھی فلک کی طرف سے۔ اونچی دکان پھیکا پکوان کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔

ذوق کا شعر نمبر ۱۴ جو مقطع بھی ہے :

درِ خوش آبِ مضامین سے بناکر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثناگر سہرا

« ذوقِ ثناگر » کی « صنعت گری »، « درِ خوش آبِ مضامین » کے ایسی ترکیبوں

اور مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے ظاہر و باہر ہے۔ مزید گفتگو کی مطلق ضرورت نہیں۔

ذوق کا شعر نمبر ۱۵، جو مقطع کے بعد کہا گیا ہے:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ! اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہـــرا

ظاہر ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا، اور ہمیں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ ذوق کے مربی بہادر شاہ ظفر نے خود فرمائش کرکے اپنے مرغوب ذوق سے یہ سہرا لکھوایا تھا۔ اس لئے مقطع میں ذوق کا ظفر سے کہنا «یہ سنادے اس کو» کسی طرح موزوں اور مناسب طریق خطاب نہیں۔ بلکہ عامیانہ بلکہ گنوارو لہجہ ہے غالب کا جواب کہا گیا ہے، ظفر کی فرمائش پر کہا گیا ہے۔ اس شعر میں ان دونوں سے گویا یوں خطاب ہے کہ «ارے او ظفر! تو اس غالب کو سنادے کہ «سن نہیں»، «دیکھ»، ہم جو سخنور ہیں یوں سہرا کہا کرتے ہیں۔»لطیفہ یہ ہے کہ قلعہ کے مشاعروں میں ذوق ظفر کا کلام سنایا کرتے تھے، اب ذوق ظفر سے کہتے ہیں کہ تو میرا جوابی سہرا غالب کو سنادے کہ «دیکھ» سہرا ایسا ہوتا ہے۔ یہ طریق گفتگو اپنے مربی اور معاصروں سے مشرقی درباری آداب کا مظہر نہیں۔ ذوق کے سہرے کا یہ حال غالب کے سہرے کے بعد اور اس کا سہـــرا دیکھ کر کہنے پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں غالب کا مقطع خطاب عام اور پیرایۂ بیان غیر جانبدارانہ اور بقول غالب محض ایک سخن گسترانہ بات ہے۔

اب آئیے اسی طرح غالب کے سہرے کا بھی شعر بہ شعر مطالعہ کرتے چلیں۔

«غـالب کے پہلے دو شعروں پر اوپر گفتگو ہوچکی ہے۔ اب تیسرا شعر ملاحظہ کیجئے۔

سر پر چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا

پہلے مصرع میں سر پہ چڑھنا جس انداز سے آیا ہے اس سے «طرف کلاہ» کی دلکشی ظاہر ہے۔ اسی کو تسلیم کرکے کہا گیا ہے۔ اے طرف کلاہ سر پہ

چڑھنا تجھے پھبتا ہے. لیکن یہاں طرف کلاہ اور سہرے میں مقابلہ ہے، کہ دیکھیں دونوں میں سے کون زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے، طرفِ کلاہ یا سہرا. غالب کو ڈر ہے کہ آج دلکشی کی بازی سہرے کے سر رہے گی، ورنہ طرف کلاہ کا محبوب و مقبول ہونا تو ایک مسلمـــہ حقیقت ہے. طرف کلاہ کی سج دھج روز کی چیز ہے، اور سہرے کا حسن صرف عارضی، رونقِ یک روزہ. غالب کہتے ہیں کہ اے طرف کلاہ مجھے ڈر ہے کہ سہرے کی یہ عارضی دلربائی تیری مستقل خوبی اور دلکشی سے نمبر یعنی بازی نہ لے جائے. یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سر چڑھنا کے دو لفظوں سے دو فائدہ اٹھائے گئے ہیں، ایک واقعہ ہے ایک حسن تعمیر.

غالب کا شعر نمبر ۴:

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

ذوق اپنے شعر بھم کی تصیف کے لئے اپنے منظوم سہرے کے لئے «صد کانِ گہر» سے ہیرے لاتے ہیں. حالانکہ سہرا ہماری معلومات ناقص کی حد تک «صدف جواہر» یعنی موتیوں سے بنا کرتا ہے، نہ کہ پہاڑ یا زمین کی کانوں سے نکلنے والے سنگ پاروں یا الماس ریزوں سے. غالب اپنے اسی چوتھے شعر میں بیان کرتے ہیں کہ سہرا جو کشتی میں لگا کر لایا گیا ہے، شاید اس سہرے میں ناؤ بھر کر ہی موتی پروئے گئے ہوں گے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کشتی میں لگا کر نہ لاتے یہاں شاعر نے «ناؤ» اور «کشتی» کے دو لفظوں سے تجاہل عارفانہ کے طور پر فائدہ اٹھـایا ہے. کیونکہ ناؤ اور کشتی ہم معنی لفظ بھی ہیں اور ناؤ کے معنی صرف کشتی ہی کے ہیں، اور کشتی ذو معنی ہے. ایک معنی اس کے ناؤ ہی کے ہیں اور دوسرے معنی تھال کے ہیں. شاعر آخری معنی سے دانستہ تجاہل کرتا ہے، اور ناؤ اور کشتی کے دو لفظ بھولے پن سے ایک لطیفہ کے طور پر لاکر آگے بڑھ جاتا ہے. جیسا کے میں نے عرض کیا یہ شعر بس ایک لطیفـہ سے زیادہ کچھ نہیں.

غالب کا شعر نمبر پانچ:

سات دریا سے فراہم کئے ہوں گے موتی تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

اس شعر میں غالب نے «سات دریا» سے موتیوں کے فراہم کرنے کا امکان ظاہر کیا ہے، کیونکہ جس انداز کا منتخب موتیوں کا اعلا درجہ کا سہرا بنا ہے، ویسا سہرا ایک دریا کے موتیوں سے بننا ممکن نہیں ہوسکتا۔ یہاں «دریا» سمندر کے معنی میں آیا ہے۔ اور فارسی اور گجراتی میں سمندر کو دریا ہی کہتے ہیں۔ ہم اپنی ہندوستانی زبان اردو میں دریا ندی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موتی ندی سے نہیں فارسی اور گجراتی کے دریا اور ہماری بولی کے سمندر سے نکلتے ہیں۔ «سات دریا» بمعنی سات سمندروں سے موتیوں کا فراہم کرنا مبالغہ ہے مگر امکانی بھی، اور یہ بات ایسے طریقے سے کہی گئی ہے جو شاعر کی حیرت کی مظہر تو ہے کسی قسم کے تیقن کی مظہر نہیں۔ اس لئے حقیقت جو بھی ہو، فہم انسانی کے قریب ہے۔ غالب نے اپنے اسی شعر میں بتایا ہے کہ جس انداز کا یہ لا جواب سہرا ہے اس انداز کا سہرا بنانے کے لئے سات سمندروں سے قسما قسم کے موتی لائے گئے ہوں گے، اور پھر ان بے شمار موتیوں میں سے بہترین موتی انتخاب کئے گئے ہوں گے، تب کہیں جاکر اس انداز کا لا جواب اور بے مثال سہرا بنا ہوگا۔ دوسرے مصرعہ میں «اس انداز کا گز بھر سہرا» کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے کہ یوہی اٹھا اٹھا کر اندھا دھند موتی دھاگوں میں دیساوری مال کی طرح نہیں پروئے گئے بلکہ اس سہرے کے بنانے میں فنکار جوہریوں نے اپنی نظر انتخاب اور فنکارانہ مہارت کا پورا ثبوت دیا تب جاکر یہ سہرا بنا ہے۔ سات سمندروں کے طول و عرض کو دیکھو، گویا دنیا بھر کے موتی جمع کردئے گئے ہوں گے، اور پھر اسی گز بھر سہرے کی صناعانہ ندرت و حسن کو سامنے لاؤ، بے اختیار تمہاری زبان سے یہی نکلے گا کہ کاریگروں نے سہرے کی تاروں میں موتی نہیں دنیا بھر کے تمام سمندروں کے جواہر کے دل پرو دئے ہوں گے۔

اس شعر کا طرزِ بیان اور یہ مفہوم پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے مصرعہ کا بظاہر مبالغہ قطعی مبالغہ دکھائی نہیں دیتا۔ غالب کے اس پیرایۂ بیان سے صرف یہ حقیقت ظاہر کرنا تھی کہ جواں بخت کا سہرا اعلیٰ درجہ کے نادر اور انتخاب اور بے مثال موتیوں سے بنایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی جھلک ذوق کے سہرے کے شعر نمبر نو میں ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی۔

یوں بھی دیکھ لیجئے دنیا میں «سات دریا» یا «سات سمندر» ایک حقیقت

واقعی ہے۔ غالب نے سات دریا کا نام لے کر ساری دنیا کے دریاؤں کو اپنے دام خیال میں لے لیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ذوق کا «صد کانِ گہر» کہنا دنیا کے تمام معادن جواہر کو محیط نہیں ہے۔ ورنہ اگر غالب کے سات اور ذوق کے سو کو حسابی قاعدہ سے جانچا جائے تو سو کا عدد سات سات کرکے ۱۴ پر تقسیم ہوجائے گا اور پھر بھی دو باقی بچ رہیں گے۔ اور یوں ذوق نے غالب کے مقابلے میں عددی زیادتی ضرور دکھا دی۔ غالب کے سات کے مقابلہ میں پورا ایک سو ایک معنی کے لحاظ سے غالب کا مبالغہ شاعرانہ حسن سے بھر پور اور ذوق کا مبالغہ محض «تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو» کی مثال کا مصداق ٹھہرے گا۔

غالب کا شعر نمبر ٦۔

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

بظاہر غالب کے اس شعر پر وہی اعتراض ہوسکتا ہے جو ہم اوپر ذوق کے سہرے کے دسویں شعر پر درج کر آئے ہیں کہ دسمبر کے مہینے میں بادِ بہار کیسے چلنے لگی۔ یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دسمبر کے مہینے میں اتنی گرمی کہاں سے آگئی کہ دولھا کے چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ غالب کے اس شعر کے دفاع میں کہا جائے گا کہ نوجوان تندرست آدمی کی حالت بوڑھوں سے جدا ہوا کرتی ہے۔ ہم نے دلی کے بعض خاندانی حکیموں کو دسمبر جنوری میں باریک ململ کے انگرکھے پہنے ٹھنڈا پانی پیتے دیکھا ہے۔ دوسرے دیوان خاص یا دیوان عام کے وسیع مسقف ایوانوں میں بھی اگر سردی کی وجہ سے پردے چھوڑ دئیے گئے ہوں اور براتیوں کا وہ مجمع ہو کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی ہو تو اتنے آدمیوں کے تنفس سے فضا کا کیا عالم رہا ہوگا۔ ایسی حالت میں غالب صرف دولھا کو دیکھتے ہیں کہ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھکا ہوا ہے، شرکائے مجلسِ عروسی کے تنفس کی گرمی اور حبس کا احساس کرکے فوراً اس شعر کا خوبصورت شاعرانہ مضمون پیدا کرلیتے ہیں۔ یہ شاعرانہ لطافت خیال اور شاعرانہ حسن تعبیر کا اچھا نمونہ ہے۔ دولھا کے چہرے سے بوجہ گرمی کے پسینہ کے قطروں کے گرنے کو رگ ابر گہر بار سے ملا دینا حسین تشبیہ ہے۔ یہ حسن نظر کی دلکش فریب خوردگی ہے۔ اگر جواں بخت کے چہرے پر موتیوں کا ایک

سہرا ہے تو دوسری طرف اس کے محجوب و مستور چہرے پر سے جو پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح لگاتار ڈھلک رہے ہیں، غالب نے ان کو بھی ایک اور خوبصورت سہرا تصور کرلیا۔ سامنے کی بات ہے کہ جواں بخت ابھی جوان تھے اور حسین نوجوانوں کا پسینہ گلاب کے قطروں سے کم عطر بیز اور تابدار موتیوں سے کم آبدار نہیں ہوا کرتا۔

غالب کے سہرے کا ساتواں شعر یہ ہے:

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

خوب شعر ہے۔ سہرا بھی لا جواب ہے۔ جواں بخت بھی جواں جامہ زیب ہے اور اس کا لباس بھی بیش بہا ہے۔ سہرا اور قبا دونوں اپنی اپنی جگہ موزوں و مناسب اور بہت ہی عمدہ ہیں۔ غالب کی فنکارانہ حسن شناس نظر دونوں چیزوں پر ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ سہرے کی درازی حسینوں کی زلف دراز کی مد مقابل نہیں بلکہ اسی حد تک ہے کہ قبا کے دامن کی زیبائش اس سے نہ چھپ جائے نہ دب جائے۔ دونوں میں حسینانہ رقابت تو تھی مگر قبا اور سہرے کی اس رقابت باہمی نے دولھا کی آرائش و زیبائش اور جامہ زیبی کو دوبالا کردیا ہے۔ اس پیرایۂ بیان میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قبا تو ہمیشہ کا لباس ہے گویا میزبان ہے اور سہرا صرف آج کے خاص دن کا خاص زیور اور یہاں کا مہمان ہے۔ آج کے مہمان نے، گوکہ آج کا دن اسی کا دن ہے، اگرچہ اکرام ضیف ہر تہذیب میں شریفانہ مسلک ہے لیکن میزبان کا احترام بھی ضروری ہے، اس لئے روز مرہ کے لباس، قبا کا ادب بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یوں بھی «قدیمانِ خود را بیفزائے قدر» تہذیب و شرافت کی کتاب آئین کا ایک جلی عنوان ہے۔

غالب کا آٹھواں شعر ہے:

جی میں اِترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

ساتویں شعر میں قبا اور سہرے کی چشمک کی طرف اشارہ تھا۔ یہاں در شہوار اور موزوں و لا جواب موتیوں کے اترا جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ مقابلۂ حسن و یکتائی میں ہمارا مد مقابل کوئی نہیں اس لئے غالب نے ان کا جواب

تجویز کردیا کہ موتیوں کی یکتائی کا جواب یہ ہے کہ پھولوں کا سہرا بھی ہوجائے.
تاکہ مقابلہ ہو تو برابر کا. اور کسی کو کسی پر بڑائی جتانے کا موقع ہی نہ ملے.
کوئی زیور اپنی پوجا نہ کرائے. بلکہ ایک مظہر شباب و رعنائی کی زیبائش کا
سامان بن جائے. غرض موتیوں کے سہرے کے ساتھ ساتھ پھولوں کا سہرا اس لئے
تجویز کیا گیا ہے کہ کہیں موتی یکتائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں ورنہ موتی اپنی
جگہ سندر ہیں، اور پھول اپنی جگہ راحتِ روح اور راحتِ چشم. موقع کی اہمیت
کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ دونوں اپنی اپنی بہار اور پھبن دکھائیں اور دولہا
کی زیبائش و جمال کو بڑھائیں. تاکہ جوان بخت کا انسانی حسن، ان دو دو
سہروں کی چمک دمک اور تازگی و خوشبو سے اور جاذب نظر و قلوب ہوجائے.

دیکھو اسی شعر میں غالب نے بھی «اترانے» کا لفظ استعمال کیا ہے، اور
اسی کے بالمقابل ذوق نے بھی اپنے سہرے کے دسویں شعر میں «اِترانے» کا لفظ
باندھا ہے غور کرو کہ کس استاد نے یہ لفظ موزوں و مناسب طور پر برتا ہے.
اور کس نے نمونہ کی موجودگی میں بعد میں برت کر بھی لفظ کی معنویت کو
کم کردیا ہے.

غالب کا نواں شعر ہے:

جب کہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

اس کار گاہ حیات میں ہر چیز جو پیدا ہوتی ہے، اس پر دور شباب آتا ہے، اور
خود بینی و خود نمائی کی کیفیت بھی طاری ہوا کرتی ہے. اس عالم میں وہ
پُر شباب چیز اپنے آپ میں لفظاً و معناً پھولے نہیں سمایا کرتی. اکثر اس کی زبان
حال سے یہ نکل ہی جایا کرتا ہے کہ انا الموجود ولا غیری (عالم وجود میں میرے
سوا کوئی اور ہے ہی نہیں). غالب دیکھ رہے ہیں کہ تازہ پھول جوانی دیوانی کے
اسی دور سے گذر رہے ہیں اسی لئے حیرت زدہ ہوکر بول اٹھتے ہیں کہ ان
دمبدم پھولنے، پھیلنے والے پھولوں کو ایک رشتہ میں کیسے گوندھا، باندھا، یا
پرویا جائے، کہ یہ جو جوش شباب یا شادی کے موقع کی مسرت کی بنا پر قابو
سے باہر ہوئے جا رہے ہیں، غالب کہتے ہیں کہ ایسے بے قابو پھولوں کو قابو میں
کیسے لایا جائے. کیونکہ ڈر ہے کہ قابو میں لانے کی کسی کوشش سے کہیں

ان کی تازگی اور نازگی کو گزند نہ پہنچ جائے۔ اور ان کی نرم و نازک پنکھڑیاں اپنی اصل سے ٹوٹ کر بکھر نہ جائیں۔

غالب کا شعر نمبر دس:

رخِ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مـــہ و اختر سہرا

اس شعر میں «رخِ روشن کی دمک» اور «گوہر غلطاں کی چمک» کہہ کر دو الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ دو مستقل کیفیتیں دکھائی گئی ہیں۔ جو ایک حسین اور پرلطافت سچائی ہے۔ دولہا کا چہرہ ماہ سے مشابہ ہے۔ اور یہ ہماری زبان میں روز مرہ کی بول چال ہے کہ انسانی چہرے کو چاند ہی سے مشابہ کہا کرتے ہیں۔ اور سہرے کی موتی بھری جھولتی اور جھومتی لڑیوں کے موتیوں کی چمک کو «گوہر غلطاں کی چمک» کہنا اظہار واقعہ اور قابل دید نظارہ کی طرف اشارہ ہے۔ خوبصورت چہرے کے حلوے اور اس پر موتیوں کی لڑیوں کی جنبش اور ان کے موتیوں کی غلطیدگی سے پیدا ہونے والی روشنی کو دکھانا یہ منظر کشی کی نہایت عمدہ شاعرانہ لفظی تصویر ہے۔ ذوق بھی مہ و انجم کو لانے لگے تھے۔ مگر یہ معنویت کہاں لا سکے۔

غالب کے سہرے کا گیارہواں شعر ملاحظہ ہو:

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار
لائے گا تابِ گرانباریٔ گوہر ســـہرا

غالب کو جواں بخت کے سہرے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ سہرے کے موتی جن باریک تاروں میں پروئے گئے ہیں۔ وہ اپنی لطافت و نزاکت میں ریشم کے تار نہیں بلکہ رگہائے ابر بہار معلوم ہوتی ہیں، ابر بہار جو آبی موتی برساتا ہے۔ تو وہ آسمانی پانی موتیوں کی لڑیاں ہی نظر آیا کرتا ہے۔ پانی کے قطرے جو موتی ہی ہوتے ہیں زمین تک پہنچتے پہنچتے بھاری ہونے کے سبب لڑیوں سے الگ ہو ہو کر بکھرتے نظر آیا کرتے ہیں۔ سہرے کے موتی بھی جو اپنی جسمانی بڑائی اور قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت گرانبار ہیں ان کو دیکھ کر غالب کو خیال آتا ہے کہ بھلا رگہائے ابر بہار کے سے نازک ریشمی تار گرانبار اور وزنی موتیوں کے کیسے متحمل ہوسکیں گے۔

غالب کے سہرے کا مقطع:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

غالب کے سہرے کا یہ آخری شعر یا مقطع ہے۔ غالب نے جیسا کہ اپنے معذرت نامے میں تصریح کی ہے مقطع کا بظاہر ادعا محض ایک سخن گسترانہ بات ہے اور شاعری میں ایسی باتیں نہ عیب ہیں اور نہ کسی دوسرے کے لئے سبب ننگ۔ مگر اسے تحدی قرار دیا گیا۔ اور جواباً ذوق سے سہرا کہلوایا گیا۔ جس میں مقطع کے بعد غالب کی تحدی کے جواب میں ذوق نے بڑے طنطنہ سے اعلان کردیا کہ

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس وقت اگرچہ دورِ حاضر کے دو فاضلوں ہی کی رائیں اس موضوع پر سامنے آئی ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت پرانی ہے اور علمی مجلسوں میں ہمیشہ زیر بحث رہی ہے ہم نے بھی کسی قدر تفصیل سے پرانی بحث کو اپنے حسب استطاعت نیا لباس پہنا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک غالب کے سہرے میں لطافت و نزاکت اور ادبی رکھ رکھاؤ ہے اور ذوق کا سہرا ایک جھنجھلاہٹ اور غصہ کا اظہار ہے۔ ناظرین پرتمکین کے سامنے دونوں سہرے اور ہماری معروضات ہیں۔ ہم نے اظہار خیال میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ ہماری رائے اوپر درج ہے۔ میدان تخیل بہت وسیع ہے۔ جتنے انسان، اتنی رائیں۔

دلی کا لال قلعہ باقی ہے۔ اس کے باسیوں کے آخری جانشین ظفر کے جوان سال فرزند موسوم بہ جواں بخت کی شادی کی تقریب میں جس کی ولیعہدی کے خواب دیکھے جارہے تھے۔ اسی لال قلعہ نے، جہاں شاہجہاں کی تخت طاؤس پر جلوہ فرمائی کا جلوہ دیکھا تھا، اس آخری شاہی شادی کے یہ ٹھاٹھ بھی دیکھے تھے، جن کی جھلک ان دونوں سہروں کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ لیکن سنہ ۱۸۵۱ ع کی یہ نمودِ بے بود سنہ ۱۸۵۷ ع میں خواب و خیال بن گئی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ تہ تیغ ہوئے۔ کچھ رو پوش اور کچھ در بدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ ظفر، ان کی ملکہ زینت محل اور دونوں سہروں کے ممدوح

ان کے فرزند جواں بخت مع اپنی دلہن کے شاہی قیدی بنا کر رنگوں میں اپنی مدت حیات پوری کرنے کے لئے بھیج دئے گئے۔ اللہ اللہ حس قافلے کے لئے ہوئے ہوے پر بھی یہ عروج تھا کہ دلی کے آخری دور کے مملکتِ شعر و سخن کے دو باکمالوں نے اپنے اپنے سہروں میں یہ جاہ و جلال دکھایا تھا، رنگون میں عبرت و عسرت اور زبوں حالی سے اپنے دن گذار رہے تھے۔ ذوق تو شاہی خاندان کے آخری زوال یعنی سنہ ۱۸۵۷ ع سے پہلے ہی اس دنیا سے سفر کر چکے تھے، مگر غالب بقیدِ حیات تھے۔ غالب حن کو اپنی مالی پریشانیوں کا بالخصوص آخری عمر میں مسلسل رونا رہا۔ ان کی حالت شاہی خاندان کے اسیروں کی اس حالت سے بدرجہا بہتر تھی جو جلاوطن ہوے والے مخلوع و مسجون شاہی خاندان کے افراد کی تھی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ۵ اپریل (چہارشنبہ) ۱۹۶۱ ع کے ٹائمز آف انڈیا، بمبئی نے سو برس پہلے کی اپنی اسی دن اور اسی تاریخ کی حسب ذیل خبر نقل کی ہے:

«مولمین (Moulmein) کے مقام پر خاندان دہلی کے سرکاری قیدیوں نے درخواست کی ہے کہ ان کے وظیفہ میں اضافہ کیا جائے۔ یعنی سابق شاہ کو تیس روپیہ ماہوار اور ان کے تمام بیٹوں کو جو دس دس روپیہ ماہوار دئے جاتے ہیں ان میں کسی قدر اضافہ کیا جائے کیوں کہ موجودہ وظیفہ میں وہ اس عیش و عشرت سے نہیں رہ سکتے جس طرح کہ وہ رہنا چاہتے ہیں۔ لارڈ کیننگ نے ان کے موجودہ وظیفہ پر اضافہ کرنے سے صاف انکار کردیا»۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دنیا کا یہی دستور ہے۔ ایک کو چڑھاتی ہے، دوسرے کو گراتی ہے۔ حق چڑھنے والا یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اسے ابدیت حاصل ہوگئی ہے۔ مگر جب اس کو بھی زمانہ اپنی عادت کے مطابق گرا دیتا ہے تو کوئی ایسے گرنے والے کو سہارا دینے والا نظر نہیں آتا۔ سچ ہے لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا، اسی کی بادشاہی سچی ہے۔

ع پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

* ڈاکٹر صفدر آہ

امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر

(۲)

خالق باری

امیر خسرو کی سب سے مقبول ہندی نظم خالق باری ہے۔ جسے پچھلے ساڑھے چھ سو برس میں ہزاروں خطاطوں نے زیورِ کتابت سے سجایا اور پچھلے سو برس میں جس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

بادی النظر میں یہ کتاب ایک مکتبی نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً تاریخ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ ہندی کا پہلا لغت ہے جو اپنے مترادف عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ بصورتِ منظوم ہمارے پاس آج بھی موجود ہے۔

خسرو کی ولادت سے تیس پینتیس سال پہلے ۶۱۷ھ میں ابو نصر فراہی نے عربی الفاظ کی تعلیم کے لئے افغانستان کے شہر فراہ میں مختلف الوزن قطعات کا ایک منظوم نصاب «نصاب الصبیان» کے نام سے تیار کیا تھا جو مکتبوں میں بہت مقبول ہوا۔ قرین قیاس یہی ہے کہ خسرو نے اپنے زمانۂ مکتب میں «نصاب الصبیان» پڑھا ہوگا۔ اور اس نصاب کے انداز و اسلوب کے جو نقوش خسرو کے ذہن میں رہ گئے شاید انہیں کا نتیجہ «خالق باری» کی تصنیف ہے۔

خالق باری کو ہندی ہی کی طرح فارسی کا بھی پہلا لغت کہا جا سکتا ہے فارسی کا باضابطہ پہلا لغت «فرہنگ نامۂ قوّاس» خسرو کی عمر کے ربع آخر میں علاءالدین خلجی (۶۹۵ھ سے ۷۱۵ھ تک) کے دربار کے ایک شاعر فخرالدین مبارک شاہ قوّاس» غزنوی نے تصنیف کیا۔

ہمارے پاس یہ ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ «فرہنگ نامۂ قوّاس» خالق باری سے مقدم ہے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ اقدام خسرو ہی نے کیا ہوگا۔ قوّاس عمر میں بھی خسرو سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام علاءالدین خلجی

* ڈاکٹر صفدر آہ، والکیشور، بمبئی

کے دربار سے روشنی میں آتا ہے. لیکن خسرو اس سے قبل بھی دربار اور عوام دونوں میں مقبول تھے.

میں تو سمجھتا ہوں کہ خالق باری خسرو نے اوایل عمر میں تصنیف کی ہے. مکتبی تعلیم میں پڑھی ہوئی کتاب « نصاب‌الصبیان » کے انداز کا اثر خالق باری میں واضح طور پر نظر آتا ہے :-

نصاب‌الصبیان

سوار دست برنجن چوپائے را خلخال
وشاح عقد حمایل رعاث و تاج آفسر

خالق باری

دست برنجن کنگن کہئے پایل ہے خلخال
پائے برنجن چوڑا کہئے خوبی حسن و جمال

نصب‌الصبیان

عقار قہوہ و راح و مدام قرقف مے
کمی دلاور و فارس سوار و صید شکار

خالق باری

بادہ شراب و راوق و صہبا مے ست مد
گر جرعہ راں جوری تو کئی کار نیک بد

یہ تاثر ظاہر ہے اوائل عمر ہی میں زیادہ گہرا رہا ہوگا. لہذا امکان اس بات کا ہے کہ « خالق باری » کی نظم خسرو نے اپنی اوایل عمر ہی میں کہی. اس صورت میں « فرہنگ نامۂ قواس » جو ۶۹۵ھ کے بعد اور ۷۱۵ھ کے قبل لکھا گیا خالق باری سے مقدم کسی طرح نہیں ہوسکتا.

خالق باری چونکہ زبانِ ہندوی کی ترویج و تشکیل کے لئے لکھی گئی ہے لہذا اسے ہندی لغت ہی کہنا زیادہ مناسب ہے. بحیثیت زبان فارسی کو خالق باری سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے. لیکن اس کتاب نے ہندوی (اردو) کی ترویج میں ایک زبردست خدمت انجام دی ہے. فارسی الفاظ کا بھی جو ذخیرہ خالق باری میں ہے وہ ہندی الفاظ ہی کی طرح ہمارا ہے اور ہم آج تک اوسے خود اہل ایران سے بہتر طریقے پر استعمال کر رہے ہیں.

خسرو کا لسانی پس منظر خسرو اس عہد کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں ایک نئی زبان پیدا ہو رہی تھی۔ اس زبان کے مستقبل پر خسرو کو پورا اعتماد تھا اور وہ اس نو عمر ادب کی نہایت خلوص سے خدمت کر رہے تھے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف اگر تفکر و ترنم ہے تو دوسری طرف اس میں تعمیر زبان ہند کی ایک زبردست تحریک بھی چل رہی ہے۔ خسرو کی ہر موقع پر یہی کوشش رہی ہے کہ فارسی اور ہندی الفاظ شیر و شکر کی طرح گھل مل جائیں تا کہ مستقبل کی ہندوستانی زبان کے لئے ارتقاء کا راستہ تیار ہوسکے۔

خسرو کے ہندی کلام میں یہ ارادی کوشش اکثر جگہ اصل شاعری سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی پہیلیاں، دوسخنے، مکرنیاں وغیرہ لطف شاعری کے ساتھ تعلیم لغت کے سبق ہیں۔ کہیں کہیں اپنے فارسی کلام میں بھی وہ اپنی مادری زبان ہندی کے الفاظ اور محاورے بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں، جن کا مقصد قطعاً یہی ہے کہ ان دونوں زبانوں کو قریب سے قریب تر لایا جائے۔ دیکھئے «دُر دُر موئے» کا نسوانی ہندی محاورہ ایک فارسی رباعی میں کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔۔

رفتم بہ تماشائے کنارِ جوئے ٭ دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے

گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود ٭ فریاد بر آورد کہ «دُر دُر» موئے

ہندی ہی کی طرح فارسی میں بھی الفاظ کی صوری و معنوی جانچ پرتال خسرو کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ انھوں نے بیسیوں حیرتناک لفظی اور معنوی صنعتیں ایجاد کی ہیں۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ خسرو لفظوں سے کس طرح شطرنج کھیلتے تھے تو ان کی تصانیف دیباچۂ غرۃ الکمال اور اعجاز خسروی پڑھئے۔ ہماری تاریخ ادب میں شاید اتنا زبردست قادرِ لغت کوئی نہیں ہوا ہے۔ خسرو عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے اور پانچوں زبانوں کے لغت پر انہیں قدرت کامل حاصل تھی۔

خالق باری کے متعلق روایات حالق باری کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جو اب مفقود ہوچکی ہے۔ موجودہ خالق باری اسی کا مکتی اقتباس ہے۔ اس روایت کی تائید کے لئے جس مواد کی ضرورت ہے وہ میرے علم میں نہیں، لیکن اس روایت کو کئی مستند اہل قلم نے نقل کیا ہے۔

اس ضمن میں ایک دلیل ضرور کان‌ملگتی ہے کہ خالق باری مختلف الوزن قطعات کے اسباق میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی سبق دس پندرہ شعر کا ہے اور کسی سبق میں صرف ایک شعر نظر آتا ہے۔ خود مصنف اگر ان اسباق کی تقسیم کرتا تو ان کے اشعار کی تعداد میں کوئی مناسبت ضرور ہوتی۔ یہ بات قطعاً معقول ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسباق کی یہ تقسیم مصنف کی نہیں۔ یا پھر مصنف کی کی ہوئی تقسیم میں وقت اور مکتب نے کافی قطع و برید کی ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ خسرو نے یہ کتاب کسی بھٹیارن کے لڑکے کو تعلیم دینے کے لئے لکھی ہے۔ اگر اس روایت کو قابل اعتنا سمجھا جائے تو ضخیم خالق باری کی روایت مشکوک ہوجاتی ہے۔ بچے کو تعلیم دینے والے نصاب کا مختصر ہونا ضروری ہے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ خالق باری ان مہاجر ترکوں اور ایرانیوں کو ہندی سکھانے کے لئے لکھی گئی جو چنگیزی فتنوں کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آگئے تھے۔ اس قیاسی روایت کی تائید کے لئے ضخیم خالق باری کا وجود پایۂ ثبوت کو پہونچنا ضروری ہے۔ جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

عام خیال خالق باری کے لئے یہی ہے کہ یہ ایک نصاب ہے جو ہندوستانی بچوں کی تعلیم کے لئے تصنیف ہوا۔ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ بھی جو خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد سنہ ۷۳۶ھ میں مخطوط ہوا اور جس کی نقل نسخۂ ندوی اور نسخۂ اردو ریسرچ اسٹیٹیوٹ بمبئی ہے، اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے اختتام کتاب پر چند اشعار تتمے کے کہہ کر لکھ دئے ہیں جن میں وہ کہتا ہے:

امید است از فضلِ حق کریم		بخوانند و گردند طفلاں علیم

۞		۞		۞

کہ صبیاں برانند از دامِ جہل		شود فیضِ الفاظِ اشکال حل

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو کے انتقال سے گیارہ سال بعد ہی یہ کتاب بچوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کاتب نے کہا ہے:

بہ تاریخ نیکو سر انجام یافت		نصاب ظریفی نکو نام یافت

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا نام نصاب طریفی ہی تھا۔ ظاہر ہے نصاب بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے تعلیم کے شوقین بالغین بھی فائدہ اٹھالیں۔

قیاس غالب یہی ہے کہ خالق باری بچوں کی کتاب ہے اور بچوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے ہر موقع پر نفسیات اطفال کا خیال رکھا ہے جیسے :

۱ اس کتاب میں ظرافت سب سے نمایاں ہے اور بچے ہنسی کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ خالق باری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہنسی ہنسی میں سیکڑوں لفظ بچوں کے حافظے میں پہنچا دیتی ہے۔

۲ یہ کتاب نظم میں ہے اور بچے نظم کو نثر سے جلدی یاد کرتے ہیں۔

۳ یہ کتاب مثنوی کی طرح ایک بحر میں نہیں لکھی گئی اس کا ہر سبق ایک نئی رواں بحر میں ملتا ہے۔ یہ تنوع بچوں کے ذہن کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔

خالق باری کے انداز پر تصنیفات | خالق باری کا اثر ابتدائی عہد میں علمی حلقوں پر کیا ہوا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن تعلیمی حلقوں میں اس کتاب نے ایک ہلچل پیدا کردی۔

ہندوستان میں ہندوی زبان کی تعلیم کا یہ پہلا اقدام تھا جو اس وقت کی سرکاری زبان فارسی کو بھی ساتھ لئے ہوئے تھا۔ جو بولی بچہ گھر میں بولتا تھا اس کے لفظ مکتب میں پہلی مرتبہ اسے پڑھنے کو ملے نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب کی مقبولیت حد سے بڑھ گئی اور تھوڑے عرصے میں اس کے نسخے دلی سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پہونچ گئے۔ یہاں تک کہ اسی انداز کی تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع ہوا ان کتابوں کی ایک طویل فہرست پروفیسر شیرانی مرحوم نے مرتب کی ہے جس میں سے چند مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱ اللہ خدائی، سنہ ۱۰۶۰ ھ مصنف تجلی، دہلی یا نواح دہلی میں لکھی گئی۔ کئی بار چھپی۔

۲ صمد باری، بارہویں صدی ہجری کا ربع اول، مصنف عبد الواسع، کئی بار چھپی اس میں الفاظ مختلف عنوانوں کے تحت جمع ہیں۔ جیسے غلہ، ادویات

ترکاریاں وغیرہ۔

۳ نصاب مصطفیٰ، سنہ ۱۱۲٦ ھ، نصابوں کے روایت کے خلاف اس میں تقریباً آٹھ سو شعر ہیں یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۴ قصیدہ لغت ہندی، ۹۵۰ھ یہ ایک چھوٹا سا قصیدہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک ایرانی حکیم یوسف ہراتی نے نظم کیا۔ جس نے بڑی کوشش سے ہندی سیکھی تھی۔ اس کے علاوہ

اللہ باری ۱۲۰۷ھ از احسن، قادر باری ۱۲۱۰ھ از فیاض اور رازق باری، ایزد باری، احمد باری، فیض جاری وغیرہ وغیرہ لکھی گئیں۔

پنجابی میں بھی اس طرح کی تصنیفیں برابر ہوتی رہیں جیسے :۔

۱ رازق باری ۱۰۷۱ھ از اسماعیل

۲ ایزد باری ۱۱۰۵ھ از کھترمل پسر سامل داس

۳ صنعت باری ۱۲۲۰ھ گنیش داس قانون گو اور

واسع باری، اللہ باری، ناصر باری، اعظم باری، صادق باری، اور درجنوں دوسری کتابیں

کہتے ہیں گجراتی اور تلگی تک خالق باری کا اثر پہونچا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ امیر خسرو کی کوئی کتاب نہ خالق باری سے زیادہ چھپی اور نہ اس سے زیادہ مقبول ہوئی۔ نیز ترویج زبان کا جو کام اس کتاب نے کیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے کوئی دوسری کتاب ہوسکے گی۔

محمود شیرانی مرحوم اور خالق باری | مرحوم پروفیسر شیرانی نے بڑی کوشش اور کاوش سے ایک کتاب خالق باری پر لکھی ہے۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مشہور و معروف نظم خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ میں شیرانی صاحب کی قابلیت اور جز ورسی کا بدل مداح ہوں لیکن ان کی اس مخصوص تصنیف میں محققانہ نکتہ سنجی سے زیادہ اپنے مفروضہ نظریے کے لئے توجیہ تراشی آگئی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ توجیہات مزاج عہد سے اتنا موافق تھیں کہ انہیں عوام کے علاوہ خواص کے ذہن نے بھی آسانی سے قبول کرلیا۔

شیرانی صاحب کے سارے نظریے کی بنیاد ۱۱۸۷ھ کا تحریر کیا ہوا خالق باری کا ایک نسخہ ہے۔ جس کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کی کتابت سورت میں

ہوئی ہے۔ اس نسخے کے کاتب سید یاسین ولد سید طاہر عرف خوب صاحب ہیں۔ اس نسخے کو ایک ایسے نسخے کی نقل بتایا گیا ہے جسے کسی بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر ضیاءالدین خسرو نے ۱۰۳۱ھ میں بطریق ریختہ عربی فارسی الفاظ کو ہندی گوالیاری میں ترجمہ کرکے نظم کیا۔ مفروضہ مصنف نے اس کتاب کا نام حفظاللسان رکھا ہے اور اس کا مادۂ تاریخ تصنیف نثر میں «نصیف آخر» نکالا ہے۔

یہ سورتی نسخہ اس کتاب کی نقل بتایا جاتا ہے جو ۱۰۳۱ھ میں بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر تصنیف ہوئی۔ میں کسی پیشے کی توہین نہیں کرتا لیکن اس پرانے جاگیردار سماج میں جو کتاب ایک حلوائی کی فرمائش پر لکھی جائے اس کے ساقطالحیثیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اگرمفروضہ مصنف ضیاءالدین خسرو کا کوئی وجود مان لیا جائے تو بظاہر وہ ایک حلوائی دوست مکتب کے مـلا ہونگے۔ ان کی شخصیت ان کی کتاب کے مادۂ تاریخ «نصیف آخر» سے واضح ہوجاتی ہے۔ بیچارے مـلا صاحب تاریخ کے لئے چند مصرعے بھی موزوں نہ کرسکے۔ پھر «نصیف آخر» مادۂ تاریخ کیا ہوا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مـلا ضیاءالدین کے پاس امیر خسرو کی خالق باری ہو اور انہوں نے اپنی قند و شیرینی کے لئے بابا اسحاق قنّاد کو فریب دے کر اپنی تصنیف بتایا ہو نیز اس کتاب کا مصنف بننے کے لئے اپنا تخلص خسرو رکھ لیا ہو۔ بابا اسحاق کا تعلق قند و شیرینی کے علاوہ اگر قند علم و فضل سے بھی ہوتا تو اس زمانے کے رواج کے مطابق مصنف کتاب مـلا ضیاءالدین ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ضرور کرتے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بابا اسحاق قنّاد کی فرمائش قرار دینے والے مصنف کو اپنے ممدوح کے لئے بابا اور قنّاد کے علاوہ کوئی اور صفت نہ مل سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسحاق محض حلوائی ہے۔

عہد اسلام کے بعض پیشہ ور علماء اور شعراء کا خیال ہندو طبقاتی کی تقسیم سے متاثر ہوکر سر مغل جاگیردار سماج پر منطبق کرنا درست نہیں۔

نظریۂ شیرانی | حیرت ہے کہ ایسے مجہولالحیثیت نسخے کو اپنے نظریے کی بنیاد بناکر شیرانی صاحب نے خالق باری کو ۱۰۳۱ھ کی تصنیف قرار دیا ہے اور اس کے

مصنف کا نام ضیاءالدین خسرو مان کر ارشاد فرمایا ہے کہ تجانس اسمی کی وجہ سے یہ کتاب امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوگئی ہے ۔

« خالق باری کے مصنف امیر خسرو ہیں » ۔ اس نظریے کو ساڑھے چھ سو سال سے برابر مانا جارہا ہے ۔ پھر خالق باری کا نسخۂ ندوی متعلقہ سنہ ۷۳۶ ھ شیرانی صاحب کے علم میں ہے اور اسے وہ مستند مانتے ہیں ۔ اس کے بعد بھی خالق باری کو سنـــہ ۱۰۳۱ ھ کی تصنیف ماننے کی کوشش میری سمجھ میں نہ آسکی ۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خالق باری شیرانی صاحب کے لئے بار ذوق ہے اور ان کی کوشش یہ ہے کہ بہ زور علمیت ایسی کتاب کا رشتہ حضرت امیر خسرو سے باقی نہ رہنے دیں ۔

خالق باری کی روایت تواتر | خالق باری کی روایت تواتر کا سلسلہ اس وقت ہمارے علم میں سنہ ۷۳۶ ھ کے نسخۂ خالق باری سے شروع ہوتا ہے جو امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد مخطوط ہوا اور جس کی خبر ہمیں نسخۂ ندوی اور نسخۂ اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی بھی دیتے ہیں ۔ اس کے بعد یہ روایت دو چار ناقابل ذکر قیاسی اور طی واقعات سے گذرتی ہوئی « اللہ خدائی » کے سال تصنیف سنہ ۱۰۶۰ ھ تک پہونچتی ہے ، اللہ خدائی ، خالق باری کے سلسلۂ نسل کی قدیم ترین کتاب ہے

اللہ خدائی کا مصنف تجلی سنہ ۱۰۶۰ ھ میں اپنی کتاب تصنیف کرتے ہوئے اپنے نقش اول کے مصنف امیر خسرو کی روح سے اس طرح امداد کا طالب ہے :

شاید از لطف و رحمتِ باری روحِ خسرو نمایـــدم یاری

مندرجۂ بالا شعر میں صرف خسرو نظم ہوا ہے ۔ لیکن اس سے شیرانی صاحب کے ضیا الدین خسرو کو مراد نہ لیا جائے ۔ تجلی امیر خسرو کے ساتھ ان کے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا سے بھی امداد کی درخواست کرتا ہے :

بہر مرغِ بہـــادم دام مددے خواستم ز روحِ نظـام

ظاہر ہے اس شعر کے بعد خسرو سے امیر خسرو کے علاوہ کوئی دوسرا مراد نہیں ہوسکتا ۔ اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ ھ میں اسی شعبے کا ایک مصنف خالق باری کو امیر خسرو ہی کی تصنیف سمجھتا ہے ۔

اس موقع پر ایک بڑا اہم نکتہ قابل غور ہے ۔ مکتب کی مقبول ترین کتاب خـالق باری بقول شیرانی صاحب سنہ ۱۰۳۱ ھ میں ضیا الدین خسرو تصنیف کرتے

ہیں. ظاہر ہے سنــــہ ۱۰۶۰ ھ تک پچیس تیس سال میں یہ کتـاب اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ آندھی کی طرح پھیلی ہوگی. جس سے متاثر ہوکر تحلی نے الله خدائی لکھنے کا فیصلہ کیا. کتنی مضحک بات ہے کہ تیس برس کے اندر مقتدی اپنے مستدی کے نام و نشان کو بھول کر امیر حسرو کی روح کے پاس امداد مانگنے پہونچ گیا. کاش شیرانی مرحوم اس پہلو پر بھی غور فرما لیتے

حالق باری کی روایت تواتر پھر قیاسات کے مبہم راستوں سے گذرتی ہوئی اردو کے پہلے محقق خان آرزو متوفی سنہ ۱۱۶۹ ھ تک پہونچتی ہے اور غرائب اللغات میں حان موصوف خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف مان کر اس سے سندیں پیش کرتے ہیں. ان اسناد کو خود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے.

حان آرزو ہندی لفظ « آنُوں » کے لئے کہتے ہیں کہ « در ہندی ابر بلند شدہ را گویند ». پھر اس لفظ کے غلط معنی رائج ہوجانے کا سبب بتاتے ہیں کہ « حضرت امیر حسرو علیہ الرحمہ در رسالۂ خود « انوں » « میغ » گفتہ » شیرانی صاحب بتاتے ہیں کہ حان آرزو کا اشارہ حالق باری کے اس شعر کی طرف ہے:

حجر و شمشیر و صمصام است تیغ ہندوی کھانڈا کہاوے « ان من » میغ

مطبوعہ خالق باری کے نسخوں میں « آنُوں » کی جگہ « ان من » ملتا ہے. لیکن شیرانی صاحب مانتے ہیں کہ قدیم قلمی نسخوں میں آنوں، اونوں، یا آنوں تحریر ہے. اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے وقت میں جو نسخے رائج تھے ان میں اب جا بجا تحریف ہوگئی ہے.

غرائب‌اللغات میں ہندی لفظ « چُھرا » کے لئے حان آرزو تحریر فرماتے ہیں کہ « کارد بزرگ بہ تازی ساطور خوانند ۰۰۰۰۰۰ در رسالۂ منظومۂ امیر حسرو چھرا بمعنی استرہ است. و مشہور در قصبات ہندوستان، نیز ہمیں است ». شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ حان موصوف کا اشارہ حالق باری کے اس شعر کی طرف ہے:

جاروب سوہنی کہ سند است ٹوکرا مقراض کترنی کہ بود استرہ چھرا

غرائب اللغات میں « ماڑھی » کے معنی حان آرزو یہ بتاتے ہیں کہ « عمارتے کہ بر قبر آتش پرستان و یہودان سازند . . . . لیکن بمعنی بام ہم است چنانچہ از رسالۂ امیر خسرو علیہ الرحمہ معلوم میشود.» شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ خـان

موصوف کا مقصود خالق باری کا یہ شعر ہے :

قصر کوشک حصن در تاری حصار حجرہ کوٹھا بام ماڑی در دُوار

یہاں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ خان آرزو نے خالق باری سے جتنے اسناد پیش کئے ہیں وہ سب ہندی الفاظ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ علمائے متقدمین خالق باری کو ایک ہندی لغت سمجھتے تھے۔

بہرحال خان آرزو بھی خالق باری کو صرف امیر خسرو کی تصنیف ہی نہیں قابل سند تصنیف سمجھتے تھے۔ خان موصوف کے بعد سے آج تک تاریخ ادب پوری طرح روشنی میں ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمام محققوں نے بالاتفاق خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے۔

مولوی عبدالحق کے سنہ ۱۱۸۷ ھ کے لکھے ہوئے ایک مشکوک نسخے کی بنا پر جو بابا اسحاق حلوائی کے سنہ ۱۰۳۱ ھ کے ایک مجہول الحیثیت نسخے کا پتہ دیتا ہے ہم ساڑھے چھے سو سال کے اتنے زبردست تاریخی تواتر کو کسی طرح رد نہیں کرسکتے۔

خالق باری کا نسخۂ ندوی متعلقہ سنہ ۷۳۶ ھ جس کی تائید اردو ریسرچ اسٹیٹیوٹ بمبئی کے نسخے سے ہوتی ہے سنہ ۱۰۳۱ ھ میں خالق باری کے تصنیف ہونے کے نظریے کو عقلاً محال سا دیتا ہے۔ جو کتاب سنہ ۷۳۶ ھ میں موجود تھی وہ سنہ ۱۰۳۱ ھ میں کیوں کر تصنیف ہوسکتی ہے۔ خود شیرانی صاحب بھی نسخۂ ندوی کے استناد کے قایل ہیں۔

نسخۂ ندوی نسخۂ ندوی محترمی جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت ہے اور اس بحث کی سب سے اہم کتاب ہے۔ افسوس ہے کہ ندوی صاحب کی نقل مکان کے سلسلے میں موصوف کی کتابیں بے ترتیب ہوگئی ہیں اور سخت کوشش کے باوجود اس وقت یہ نسخہ نہیں مل رہا ہے۔ مجبوراً میں اس نسخے کے متعلق صرف وہی معلومات پیش کروں گا جو خود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں ارقام فرمائی ہے۔

نسخۂ ندوی کے خاتمے پر حسب ذیل عبارت تحریر ہے :

« تمت ، تمام شد نسخۂ نصاب ظریفی مشہور بہ کتاب خالق باری بتاریخ ہشتم شہر ربیع الثانی۔ کاتب الحروف من بندۂ حقیر نوروز بن موبدان شاپور جی معروف

به شائستگان».

اس سے آگے کی عبارت پر سیاہی پھری ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سرقہ کرکے بیچی گئی ہے۔ سیاہی پھری ہوئی عبارت میں کوئی نشان دہی ایسی ضرور ہوگی جس سے سارق پکڑا جاسکتا تھا۔ بغیر سیاہی پھری ہوئی مندرجہ بالا عبارت سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱ اس کتاب کو خالق باری کے علاوہ نصاب طریفی بھی کہا جاتا تھا۔

۲ اس نسخے کی کتابت آٹھویں ربیع الثانی کو تمام ہوئی (بغیر سیاہی پھری عبارت میں سن مرقوم نہیں)

۳ اس کتاب کا کاتب ایک پارسی نوروز بن موبدان شاپورجی ہے۔

اوپر لکھی ہوئی عبارت کاتب نسخہ نوروز بن موبدان شاپورجی کی ہی۔ لیکن یہ نسخہ جس نسخے کی نقل ہے وہ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ ہے۔ جس کی کتابت امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد سنہ ۷۳۶ ھ میں ہوئی ہے۔

زیر غور نسخۂ ندوی کس سن کا ہے یہ تو پتہ نہیں چلا لیکن خود شیرانی صاحب بھی اسے کافی پرانا نسخہ مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی کتابت سورت یا کھمبات میں ہوئی ہے۔ اگر نسخۂ ندوی اس وقت مل جاتا تو اس کے کاغذ اور انداز تحریر سے میں خود اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اس کا زمانہ کتابت کیا ہے۔

نسخۂ ندوی میں سال کتابت کا پتہ نہ چلنے سے اس بحث پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ نسخہ جس قدیم نسخے کی نقل ہے اس میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔ سنہ ۷۳۶ ھ کے نسخے کے کاتب نے خاتمہ کتابت پر اپنا ایک منظوم تتمہ درج کیا ہے جس سے ساری ضروری باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ کاتب کا منظوم تتمہ یہ ہے:

چو بگرفت این نسخه طرز نوی	ز تصنیف آں خسرو پهلوی
ز اتمام عاشوره یک هفته شد	که این گوهر بے بها سفته شد
امید است از فضل حقِ کریم	بخوانند و گردند طفلان علیم
به تاریخ نیکو سر انجام یافت	نصـاب طریفی نکو نام یافت
ز هفت صد فزوں سی و شش سال بود	که طابع از خرد دست یاری نمود

که صبیاں برآئند از دام جہل ٭شود فیض الفاظِ اشکال حل

کاتب کی شاعری کو نظر انداز کرکے ہمیں صرف اس تتمے کے مطالب پر غور کرنا ہے. اس کتاب کو کاتب اپنی تصنیف نہیں بتاتا وہ کتاب کے مصنف کو «آن خسرو پہلوی» کہتا ہے جو صیغۂ غائب اس کی ذات سے الگ ایک اور شخصیت ہے.

خسرو پہلوی نسخۂ ندوی کے پارسی کاتب نوروز کی خامہ فرسائی معلوم ہوتی ہے. اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی میں ۱۵ رجب سنہ ۱۲٦۱ ھ کا لکھا ہوا ایک اور خالق باری کا نسخہ موجود ہے جس کے کاتب قاضی قاسم علی ہیں اور جو کسی ناگر برہمن کے لڑکے کی تعلیم کے لئے مخطوط ہوا. اس نسخے میں بھی نسخــۂ ندوی میں نقل کئے ہوئے تتمے کے اشعار من و عن موجود ہیں. لیکن «خسرو پہلوی» کی جگہ اس میں «خسرو دہلوی» مندرج ہے. سنہ ۷۳٦ ھ کے نسخے کی دو نقلیں اور ان میں تطابق اس نسخے کومستند سے مستند تر بنا دیتا ہے.

شیرانی صاحب کی دو دلیلیں | بابا اسحاق حلوائی کا نسخۂ خالق باری مجہول‌الحیثیت ثابت ہوجانے کے بعد شیرانی صاحب کی بحث کی بنیاد حسب ذیل دو دلیلوں پر رہ جاتی ہے.

۱ ـ خالق باری میں «دام» اور «دمڑا» سکّوں کے نام نظم ہوئے ہیں لیکن ان سکوں کا رواج عہد اکبر سے ہوا جو عہد خسرو سے کئی سو سال موخر ہے. لہذا خالق باری عہد مغلیہ میں تصنیف ہوئی.

۲ ـ اپنی تصنیفات میں امیر خسرو نے چند لفظ کسی اور معنی میں نظم کئے ہیں. اور وہی لفظ خالق باری میں کسی دوسرے معنی میں نظم ہوئے ہیں. لہذا امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو مختلف ہستیاں ہیں.

پہلے دلیل اول پر غور کیا جاتا ہے. خالق باری کے حسب ذیل شعر میں «دام» اور «دمڑا» نظم ہوئے ہیں:

دانگ فلوس جو آہے پیکا جیتل دمڑا جان دام واخچه کیسه کھیسه جان میکش تان

شیرانی صاحب فرماتے ہیں که دام اور دمڑا (دمڑی) سکوں کا رواج عہد اکبر سے شروع ہوا.

یه درست ہے که دام اور دمڑا (دمڑی) عہد اکبر میں رائج تھے. لیکن ان

کی ابتدا عہد اکبر سے ہوئی اس کا کوئی ثبوت شیرانی صاحب نے پیش نہیں کیا۔ سلطنت مغلیہ میں ایسے بہت سے سکے رائج تھے جن کا رواج قبل عہد مغلیہ میں بھی رہا ہے جیسے :

تنکہ ۔ سلطانوں کے عہد کا مشہور چاندی اور سونے کا سکہ یہ سکہ عہد مغلیہ میں بھی رائج تھا جس کا ذکر اکبر نامے اور ترک جہانگیری وغیرہ میں برابر آیا ہے۔

دینار ۔ علاءالدین خلجی کا سونے کا سکہ جو عہد مغلیہ میں بھی رائج رہا۔ مغل تاریخوں میں دینار کا ذکر برابر ملے گا۔

جیتل ۔ یہ سکہ سلطانوں کے عہد میں بھی رائج تھا اور اس کا رواج مغلوں کے عہد میں بھی رہا۔ ابوالفضل اور مغلوں کے دوسرے مورخوں نے اس سکے کا ذکر برابر کیا ہے۔

گانی ۔ جیتل کے برابر کا ایک سکہ تھا اور عہد خلجی میں اک گانی، دوگانی ہشت گانی، دوازدہ گانی کے حساب سے چلتا تھا یہ سکہ عہد مغلیہ میں بھی رائج رہا اور اس کا ذکر ترک جہانگیری میں موجود ہے۔

عہد اکبر کی تاریخ اتنی تفصیل میں موجود ہے کہ جزوی باتوں کی تشریحات بھی ہمیں پوری طرح مل جاتی ہیں۔ میری نظر سے آج تک کسی مورخ کا یہ بیان نہیں گزرا کہ دام اور دمڑا (دمڑی) اکبر کے زمانے سے رائج ہوئے۔ بلکہ دمڑا نام کا کوئی سکہ اکبر کے زمانے میں رائج نہ تھا۔ البتہ دمڑی ضرور چالو تھی۔ جو دام کا آٹھواں حصہ سمجھی جاتی تھی۔ دمڑی کا رواج شمالی ہند میں پچاس سال پہلے تک رہا لیکن اس وقت دمڑی نام کا کوئی سکہ نہیں تھا۔ دمڑی کی قیمت آٹھ کوڑیاں ہوتی تھیں۔

ہندوستان کے ماہر سکہ جات جناب پرمیشری لال گپتا اپنے ایک انگریزی مقالے «خلجی سلاطین دہلی کے سکے» مطبوعۂ ۱۹۵۷ ع میں «دام» کے لئے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک پرانی کتاب «درویہ پریکھا» سے پتہ چلتا ہے کہ خلجیوں کے عہد میں «دام» موجود تھا۔ اب تو ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ «دام» لفظ «درام» یا دام (غالباً اپ بھرنش) دام्म درम्म سے نکلا ہے۔ یہ دونوں لفظ مسلم حملے سے قبل قریب قریب دام ہی کے مفہوم کے ساتھ شمالی ہند میں موجود تھے۔

مولانا سلیمان ندوی مرحوم اپنی کتاب نقوش سلیمانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ « دام » در اصل یونانی لفظ « درخم » ہے جو یونانی تاجروں اور حملہ آوروں کے ساتھ عرب، ایران اور ہندوستان آیا ہے۔ عربی میں یہ لفظ «درہم» بنا. فارسی « ہ » ساقط ہوکر « درم » رہ گیا اور ہندوستانی میں « ر » ساقط کرکے « د » کی آواز بڑھائی گئی اور « دام » ہوگیا. یہی لفظ انگریزی میں « ڈرام » ہوا.

ظاہر ہے یونانی حملے کے بعد یہ لفظ شمالی ہندوستان میں رائج ہوا ہوگا جس کی تائید گپتا جی بھی اپنے فاضلانہ مقالے میں کرتے ہیں. بلکہ گپتا جی کے خیال کے مطابق اس لفظ کا تلفظ ड्राम انگریزی کے « ڈرام » سے ابتدا ہی سے مماثل تھا.

اس مختصر بحث سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ سکہ « دام » ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل بھی رائج تھا اور مغلوں کے زمانے میں بھی رائج رہا. « دمڑا » قبل عہد مغل « دمڑا » ہوگا. جو عہد مغل میں « دمڑی » ہوگیا.

امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو الگ « شخصیتیں ہیں » اپنی اس دوسری دلیل کے ضمن میں شیرانی صاحب خالق باری کے چند شعر پیش کرتے ہیں :-

(۱)

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو کبک ہنس
ہم چو یرقانست کاور ہے زریر و نسل بنس

شیرانی صاحب کا ارشاد ہے کہ مصنف خالق باری نے تدرو اور کبک کو ایک پرندہ مانا ہے. مگر امیر خسرو قران السعدین میں ان دونوں طائروں کو دو الگ پرندے مانتے ہیں :

آنکہ پریدے زپر خود تدرو ٭ ماندہ چو پر گم شدگاں زیر سرو
لالہ چو از کوہ بہ رفت از شکوہ ٭ کبک بہ بریّد دل از تیغ کوہ

خالق باری کا مصنف لائق ہو یا نالائق لیکن تدرو اور کبک کو ایک پرندہ نہیں سمجھ سکتا. علم اور لغت کو ایک طرف رکھئیے. اتنی باتیں تو مشاہدے اور سماعت سے بچوں کو بھی آجاتی ہیں. اصل میں شیرانی صاحب کو تسامح ہوا ہے. ع

فارسی سیمرغ عنقا ہست تدرو کبک ہنس

اس مصرعے میں ترتیب الفاظ لفظ اور ترجمے کے انداز پر نہیں ہے. یہاں چند طائروں کے نام لفظی معلومات بڑھانے کے لئے یکجا کئے گئے. یہ ٹکنیک خالق

باری میں کئی جگہ نظر آتی ہے، طاہر ہے سیمرغ، عنقا، تدرو، ککک اور ہنس
اس میں سے کسی طائر کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

خالق باری کی اس ٹکنیک کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض ارباب لغت
بھی غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲)

تور ستور گاؤ ہے بلد   خواہی لادو حواہی الد

شیرانی صاحب کہتے ہیں یہاں «لادو» بمعنی «لدّو» یعنی بار بردار ہے۔
ایک امیر خسرو «دول رانی خضر خاں» میں بار بردار کے لئے جو ہندی لفظ
لائے ہیں وہ «لادی» ہے:

سوم لادی گرفته بر سر این بار   که در ہندیست لادی بار بردار

شیرانی صاحب کی یہ دلیل درست نہیں ہے۔ «خالق باری» کے شعر کے
دوسرے مصرعے «خواہی لادو حواہی الد» کے معنی یہ ہیں کہ چاہو لادو چاہو
نہ لادو۔ یہ غلط ہے کہ یہاں «لادو» لدو کے معنی میں آیا ہے لدو کو ہندی
میں लाद्दू کہیں گے اور اس جگہ لفظ लादो آیا ہے۔ خسرو کی فارسی میں «لادی»
بالکل دوسرا لفظ ہے جس کے معنی بوجھ اٹھانے والے مزدور کے ہوتے ہیں۔
«لادی» کا اطلاق جانوروں پر نہیں ہوتا۔

(۳)

دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی ہے خطا   تابہ و کرگاں کڑھائی و توا

شیرانی صاحب کہتے ہیں کہ لفظ کرگاں لغت میں نہیں ملتا۔ البتہ قازقاں،
قرغان اور گزگان کے معنی فرہنگوں میں تانبے کی بڑی دیگ کے مندرج ہیں۔ شیرانی
صاحب خالق باری کے «کرگاں» کو «قارقاں» وغیرہ مان کر کہتے ہیں کہ اس
کا ترجمہ کڑھائی غلط ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مصنف خالق باری کے برعکس اس
لفظ کے معنی خود امیر خسرو دیگ سمجھتے تھے۔ ثبوت میں خسرو کا یہ شعر
درج کیا ہے۔

ولے با این ہمہ زین خوان خالی شستہ بہ دستم
کہ حلوائے رضا پختہ نہ باشد اندرین گرغاں

خسرو نے کزگاں کو گزغاں کہا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ لفظ کڑھاؤ کے

معنی میں آیا ہے۔ حلوہ دیگ میں نہیں پکتا۔ کڑھاؤ میں پکتا ہے۔ ترکی میں قزغاں کے معنی یقیناً دیگ ہیں۔ لیکن ہندوستان آ کر اس لفظ کی ہئیت بھی بدلی اور اس کے معنی بھی بدلے۔ یہاں تک کہ غیر مستند اور غیر تعلیم یافتہ باورچی آج اس لفظ کو کڑگا کہتے ہیں جس کے معنی صرف کڑھاؤ ہیں۔

بہرحال شیرانی صاحب امیر خسرو کو مصنف خالق باری سے الگ ہستی ثابت کرنے میں قطعاً کامیاب نہ ہوسکے۔

شیرانی صاحب کے بنیادی دلائل رد ہوچکے۔ اب خالق باری کے لئے صرف ان کی کچھ قیاس آرائیاں باقی ہیں جن پر روشنی ڈالی جائے گی۔

شیرانی صاحب کی ذہنی روش | اپنے مضمون میں شیرانی صاحب بار بار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ خالق باری ایسی گھٹیا ہندی تصنیف کو حضرت امیر خسرو سے منسوب کرنا امیر کی توہین ہے۔

شیرانی صاحب کا ایک عجیب خیال | شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو پچھلی صدیوں میں اس کی نہ جانے کتنی شرحیں لکھی جاتیں اور لغتوں میں اس کے حوالے ہوتے۔

خالق باری کی شرحوں کا تصور کرنے سے پہلے شیرانی صاحب نے اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ خسرو کے فارسی کلام اور ان کی ایجاد کی ہوئی ہزاروں صنائع و بدائع کی آج تک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ خسرو کی بیش بہا تصانیف نثر کم یاب سے نایاب ہوتی جارہی ہیں مگر اردو میں ان کا کوئی اقتباس بھی نہیں ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری تو ایک طرف ان کی فارسی شاعری پر بھی ابھی تک کوئی فاضلانہ مضمون اردو میں نہیں لکھا گیا۔ بے چاری مکتب کی کتاب خالق باری کی شرحیں کون کرتا۔

خسرو کے زمانے میں تدوین کا کام تو شروع ہوگیا تھا لیکن تحقیق کا کام بکتۂ ابتداء کا انتظار کر رہا تھا۔ خالق باری اردو کتاب ہے اور اردو میں تحقیق کی ابتدا خان آرزو متوفی ۱۱۶۹ھ سے ہوتی ہے۔ موصوف نے غرائب اللغات میں خالق باری سے برابر اسناد پیش کئے ہیں۔

خان موصوف کے بعد سے ادبی تاریخ کا مطلع بالکل صاف ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ خالق باری آہستہ آہستہ مکتبوں سے نکل کر ادبی صحبتوں میں

بھی پہونچنے لگی تھی. اساتذہ نے اس سے سندیں لیں. اس کے شعر ضرب المثل بنے. مولوی نذیر احمد نے اس کے نسخے میں تبدیلیاں کیں وغیرہ وغیرہ.

مقبولیت کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے خالق باری اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے. نہ معلوم شیرانی صاحب اس چھوٹی سی کتاب سے اور کیا توقع رکھتے ہیں.

فرہنگ مویدالفضلاء اور خالق باری | شیرانی صاحب کا یہ خیال بھی بے بنیاد ہے کہ خالق باری فرہنگ مویدالفضلاء سے متاثر ہے. خالق باری ۷۲۵ھ سنہ وفات امیر خسرو سے پہلے تصنیف ہوئی اور فرہنگ مویدالفضلاء ۹۲۵ھ میں لکھا گیا. ان دونوں کتابوں میں جہاں بھی یکسانیت ہے اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ مویدالفضلاء کے مصنف شیخ محمد لاڈ دہلوی نے امیر خسرو دہلوی سے استفادہ کیا. اس کے برعکس خیال خلاف عقل ہے.

شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ تدرو کے غلط معنی کبک «خالق باری» میں بیان ہوئے ہیں. ع

«فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو کبک ہمس»

فرہنگ مویدالفضلاء نے بھی تدرو کے یہی غلط معنی بتائے ہیں. لہذا خالق باری کا ماخذ مویدالفضلاء ہے.

تدرو اور کبک کی بحث مختصراً اوپر ہوچکی ہے. صاحب مویدالفضلاء نے تدرو کے معنی درّاج بتائے ہیں. لیکن ایک دوسرے فرہنگ اداۃالفضلاء کے حوالے سے اس کے معنی کبک بھی نقل کئے ہیں معلوم یہ ہوتا ہے کہ اداۃالفضلاء کے مصنف قاضی بدرالدین محمد دہلوی کو بھی شیرانی صاحب کی طرح خالق باری کے مندرجۂ بالا مصرعے سے غلط فہمی ہوئی اور امیر خسرو کی سند کی بنا پر تدرو کے معنی کبک لکھ دئے. اس غلط فہمی کی وضاحت پچھلے صفحات میں ہوچکی ہے.

۸۲۲ھ میں جب آداۃالفضلاء تصنیف ہوا تو خسرو کے انتقال کو صرف ۹۸ سال ہوئے تھے. ان کی شاعرانہ، عالمانہ اور قلندرانہ شخصیت کے اثرات بھرپور دہلی میں موجود ہونگے جن سے مصنف آداۃالفضلاء بھی متاثر ہوگا. بات سمجھنے میں غلطی مصنف لغت کی ہوئی لیکن بے چارہ خسرو کی وجہ سے دم نہ مارسکا. اس

زمانے میں شعور لغت بے حد محدود تھا۔ بمشکل دو ایک ناقص قسم کے لغت لکھے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدات‌الفضلاء میں تدرو کبک بن گیا۔

غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد اداۃ‌الفضلاء تک تدرو کو کبک سمجھنے کی طفلانہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان خالق باری کے مذکورۂ بالا مصرعے کے علاوہ کسی دوسری علمی تصنیف سے نہیں ہوسکتا۔ لغتوں کا سلسلہ خالق باری کے بعد شروع ہوا آداۃ‌الفضلاء کی غلط فہمی کا ماخذ قطعاً خالق باری ہے۔

شیرانی صاحب نے اس خیال کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ خالق باری بالخصوص مویدالفضلاء سے اور بالعموم اس عہد کے دوسرے لغتوں سے ماخوذ ہے کیونکہ جو اغلاط ان لغات میں ہیں وہی خالق باری میں بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں موصوف خالق باری کے حسب ذیل اشعار پیش کرتے ہیں۔

(۱)

نیا خال ہندی ماموں جان ٭ اور عمو کہئے چچا بکھان

نیا کے معنی بعض ارباب لغت نے صرف نانا یا دادا لکھ کر چھوڑ دئے ہیں۔ لیکن بیشتر مستند لغتوں نے اس لفظ کے معنی نانا اور دادا کے علاوہ ماموں اور بڑا بھائی بھی لکھے ہیں۔ یہ معنی مویدالفضلاء، برہان قاطع اور غیاث‌اللغات میں بحوالۂ برہان، رشیدی، لطائف، کشف، مدار اور زفان موجود ہیں۔ شیرانی صاحب سوائے نانا اور دادا کے نیا کے تمام دوسرے معنی غیر مستند بتاتے ہیں۔ ارباب لغت کے اتنے بڑے اجماع سے شیرانی صاحب کا بے دلیل اختلاف قابل غور ہے۔

شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ خالق باری میں نیا کے معنی ماموں جان مویدالفضلاء سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ خالق باری میں «نیا خال» کہا گیا ہے جس کے معنی کسی بھی صورت میں سوائے ماموں جان کے کچھ اور نہیں ہوسکتے۔ خالق باری کا مویدالفضلاء سے استفادہ کرنے کا خیال عقلاً محال ہے۔

(۲)

شب چراغ یاقوت رتن ہے ہیرا ہے الماس

اور زمرد پنّا کہے کسوت جان لباس

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ شب چراغ گاؤ دریائی کا گوہر ہے لہذا جواہر دریائی ہے اور یاقوت جواہر کانی ہے۔ سب چراغ کو یاقوت رتن کا مرادف سمجھنا غلطی ہے۔

شب چراغ کے معنی معین کرنا بہت مشکل ہے۔ توہم پرست ارباب لغت نے اسے کسی مفروضہ گاؤ دریائی کا ٹارچ لمپ اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہے۔ جس پر اعتبار کرنا دشوار ہے۔ ادب میں گوہر شب چراغ اور لعل شب چراغ وغیرہ برابر استعمال ہوا ہے۔ مصنف خالق باری نے شاید لعل شب چراغ کی رعایت سے یاقوت کو شب چراغ کا مترادف قرار دیا ہے۔

شیرانی صاحب کا یہ خیال کہ قبل عہد مغل کے ارباب فرہنگ نے شب چراغ کے معنی سمجھنے میں جو غلطی کی ہے خالق باری میں بھی اسی کا عکس نظر آتا ہے نا قابل قبول ہے کیونکہ خالق باری سارے فرہنگوں سے مقدم ہے۔

(۳)

ہندوی پلپل بود فلفل درار ٭ مرچ فلفل گرد را گویند باز

شیرانی صاحب کے اندازے کے مطابق چونکہ پلپل کے یہی معنی موید الفضلا میں درج ہیں لہذا خالق باری کے معنی موید الفضلا سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہونا چاہئے۔ موخر سے مقدم اخذ نہیں ہوسکتا۔

(۴)

چراغ است دیا فتیل است باتی ٭ بود جد دادا نبیرہ ست ناتی

نبیرہ کے معنی شیرانی صاحب فرزند زادہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی موید الفضلاء کے معنی بھی پیش کرتے ہیں جہاں تحریر ہے کہ «اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں۔» پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خالق باری میں یہ غلط معنی موید الفضلاء سے آئے ہیں حالانکہ اوپر کے اشعار میں بتایا جا چکا ہے کہ مقدم موخر کے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک نبیرہ کے معنی کا تعلق ہے ارباب لغت نے اس کے معنی نواسا اور پوتا دونوں لکھے ہیں۔ جن میں نواسا عام طور پر رائج ہے۔ فردوسی کہتا ہے۔ ع

ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

اردو میں تو نبیرہ کے معنی نواسا ہی ہونگے۔ جیسا کہ موید الفضلاء نے لکھا

ہے کہ اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد صاحب نے بے تخلص شاعر ہونے کے باوجود خالق باری پر اصلاحیں فرمائی ہیں اور نبیرہ کے معنی نواسا بدل کر پوتا لکھ دئے ہیں۔ میری نظر میں موصوف کا یہ اقدام قابل غور ہے۔ واضح رہے کہ مولوی صاحب خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے تھے اور اسے خسرو کا کلام مان کر اس پر اصلاحیں دی ہیں۔ کسی مستند نسخے سے اگر کتاب کی تصحیح کی گئی ہوتی تو اور بات تھی۔

خالق باری کے اغلاط | خالق باری تقریباً ساڑھے چھ سو سال سے مکتب کے معلموں اور طالب علموں کے زیر مشق ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں بیسیوں ناقابل اصلاح غلطیاں سرایت کر گئی ہیں۔ لفظی اور اور معنوی صحت تو ایک طرف بعض اشعار کو بہ اعتبار وزن موزوں پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ مجھے بشمول نسخۂ شیرانی آج تک خالق باری کا کوئی صحیح نسخہ نہیں مل سکا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ غلطیاں ماحولِ مکتب کی ہیں۔ ان سے مصنف خالق باری کا کوئی تعلق نہیں۔

شیرانی صاحب نے خالق باری کی جن غلطیوں کو اچھالا ہے میں ان کی گنتی میں کچھ اور اضافہ کرسکتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کتاب کو امیر خسرو ہی کی تصنیف کہونگا۔ مجھے ان مصیبتوں کا اندازہ ہے جو مکتبوں میں کتابوں پر نازل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص جب مختلف شعبہائے زندگی کے مانوس اور نامانوس الفاظ کو دو سو شعر میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیرانی صاحب کے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جو ایک معمولی سی ترمیم سے از خود درست ہوجاتے ہیں۔ جیسے:

(۱)

سیرا گھانا کور کانا بھید راز ٭ گرسنہ بھوکا پیاسا تشنہ ناز

شیرانی صاحب کا اعتراض ہے کہ کور کا ترجمہ کانا درست نہیں۔ «کانا» کی جگہ اندھا کردیجئے۔ وزن میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

(۲)

ہرن آہو جانئے آہو بچہ کہئے غزال ٭ بوزنہ بندر خرس ریچھ آمدہ گیدڑ شغال

ہرن بسکون را پر شیرانی صاحب کو اعتراض ہے. اول تو یہ ہندی لفظ ہے اور عہد خسرو میں نہ جانے کیونکر بولا جاتا تھا. میری تجویز تو نہیں لیکن فاضل محقق کے لئے ہرن کو ہنا کہا جا سکتا ہے. ع

ہنا آہو جانئے آہو بچہ کھٹے غزال

(۳)

سمندر رہے آگ میں جیو کیڑا ٭ چو بُعد است دور و چو نزدیک نیڑا

اعتراض ہے کہ بُعد کا ترجمہ « دور » میں « دوری » ہے. دور کے بعد کا واؤ یے سے بدل دیجیے. ع

چو بُعد است دوری چو نزدیک نیڑا

(۴)

زر بود سونا سیم جیتل نقرہ روپا ٭ جامہ کپّڑ ٹاٹ ٹپڑ ڈبّا کوپا

اعتراض ہے کہ سونا کا « نا » تقطیع سے گرتا ہے. مصرع یوں پڑھئے غلطی نکل جائے گی. ع

زر بُد سونا سیم جیتل نقرہ روپا

« بد » میں تأمل ہو تو اس کی جگہ « ہے » پڑھئے وغیرہ وغیرہ.

شیرانی صاحب کے غلط اعتراضات | شیرانی صاحب نے خالق باری پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سے بعض درست بھی ہیں. لیکن امیر خسرو کے کلام میں تحریف و تصحیف کے تصرفات کو میں پہلے ہی تسلیم کرچکا ہوں جس کے بعد ان اعتراضات کا تعلق امیر خسرو سے نہیں رہتا.

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ خالق باری میں چونکہ اغلاط ہیں لہذا یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہوسکتی. تحریف و تصحیف کے تصرفات کسی تصنیف کا رشتہ اس کے مصنف سے نہیں توڑ سکتے. کبیر، تلسی، سور، انیس، میر، فردوسی رومی سب ہی کے کلام میں تحریفات کا دخل ہے. کہیں کم اور کہیں زیادہ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ان عظیم شعراء کی تصنیفات ان کی نہیں رہیں. کبیر کے یہاں تحریفات بحدّ انتہا ہیں. لیکن ان کا کلام آج بھی ہندی ادب کا بہترین تحفہ ہے.

شیرانی صاحب کے اعتراضات پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے جیسے:

(۱)

دست برنجن کنگن کہئے پایل ہے خلخال ٭ پائے برنجن چوڑا کہئے خوبی حسن و جمال

اعتراض ہے کہ چوڑیاں صرف ہاتھ کی ہوتی ہیں پاؤں کی نہیں ہوتی۔ یہ درست نہیں۔ ہاتھ کی طرح پاؤں کی چوڑیاں بھی ہوتی ہیں جن کی ساخت پاؤں کے تمام زیوروں سے مختلف ہے۔

(۲)

کرم شب تاب است کیڑا چمکنا ٭ ہر گوید آتشک اورا بہ دان

اعتراض ہے کہ چمکنا بہ سکون میم غلط ہے۔ میم پر حرکت اور کاف ساکن ہونا چاہئے۔ میم متحرک اور کاف ساکن مصدر میں آئے گا۔ لیکن کرم شب تاب کے معنی دینے کے لئے میم کو ساکن اور کاف کو متحرک ہونا چاہئے۔ جس کے معنی ہوں گے چمکنے والا یعنی جگنو۔ اس طرح کے اسم ہندی میں کم ہیں مگر ہیں جیسے دھونکنی، کترنی، پٹخی، مرکھنا، کٹ کھنا وغیرہ۔

(۳)

گندم گیہوں نخود چنا شالی ہے دھان ٭ جرت جوبری عدس موری برگ ہے پان

جرت کے غلط لفظ پر اعتراض ہے۔ لغت میں لفظ یقیناً ژرت یا ذُرت آیا ہے۔ اسے تصحیف کی غلطی یا ساڑھے چھ سو برس کے ہندی لہجے کا پھیر کہنا چاہئے۔ مصنف پر اعتراض کیونکر؟

(۴)

چرخہ رہٹہ غلّہ را یا گیلہ دان ٭ رانڈ بیوہ رال را بوڑھی بحواں

پاگیلہ شیرانی صاحب کو لغت میں نہیں ملا۔ یہی حالت میری بھی ہوئی۔ لیکن خسرو کے زمانے کا ایک ہندی لفظ آج اگر مفقود ہوگیا تو محلّ اعتراض کیونکر پیدا ہوگا۔

(۵)

شبگیر و لیل و شب تو بداں رات رین نس ٭ فانیذ و قند شکّر و گڑ جان زہر بس

اعتراض ہے « شبگیر کو رات کہنا غلط ہے » شبگیر (وقتِ سحر) بھی رات کا اسی طرح حصہ ہے جیسے اشراق و عصر دن کا حصہ ہیں۔ اگر عصر کو دن کہا جاسکتا ہے تو شبگیر کو رات بھی کہا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

خاتمہ | اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ شیرانی مرحوم ایک فاضل اجل اور بالغ نظر محقق تھے۔ خالق باری کے معاملے میں مجھے ان کے نظریے سے اتفاق نہیں لیکن شیرانی صاحب کی ژرف نگاہی سے انکار نا ممکن ہے۔ خالق باری پر ان کی تصنیف ایک عالمانہ کتاب ہے جس کا علمی دنیا میں ہمیشہ احترام کیا جائیگا۔

جواہر خسروی میں مولانا امین چریا کوٹی نے خالق باری کی فصاحت و بلاغت کے جو قصیدے پڑھے ہیں وہ محض مولانا کی خوش اعتمادی ہے۔

خالق باری کی خوبی صرف یہ ہے کہ یہ اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے۔ اس وقت تک ہندی یا فارسی کا کوئی لغت تصنیف نہیں ہوا تھا ان حالات میں بے حد مختصر سہی لیکن ایک منظوم لغت تصنیف کر کے فن فرہنگ نویسی کی رہنمائی کرنا خسرو جیسے عالم اور شاعر کا کام تھا۔

نقش اول میں کمی رہجانا یقینی بات ہے اور میں خالق باری کے لئے اس کلیے سے آزاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آج اس کتاب میں جو اغلاط نظر آرہے ہیں مصنف کی ذات ان سے بالا تر ہے۔

خسرو کے ہندی کلام سے متعلق تصنیفات | میرے خیال میں خسرو کی ہندی شاعری پر کوئی تحریر یا تصنیف عالمانہ سطح کی نہیں ہے۔ اس کا سبب کچھ تو اہل قلم حضرات کی اس طرف بے توجہی ہے اور کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ اب خسرو کا ہندی کلام تبرک سے بھی کم باقی رہ گیا ہے۔ پھر اس مختصر تبرک ذخیرے میں نوے فیصدی چیستانیں اور پہیلیاں ہیں۔ جو تنقید و تبصرہ کرنے کی بہت کم گنجائش ہے۔ بہر حال میرے علم میں خسرو کی ہندی شاعری پر جا بجا جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی ایک اجمالی فہرست درج ذیل کرتا ہوں:

۱ ۔ پرانے تذکروں اور تاریخوں میں جہاں خسرو کی ہندی شاعری کا ذکر ہوا ہے ان کے نام یہ ہیں:

منتخب التواریخ (بدایونی) ۔ نقل مجلس (رجب علی)

۲ ۔ آب حیات (آزاد) میں خسرو کے ہندی کلام کا ذکر پہلی مرتبہ ایک دلکش انداز سے ہوا ہے۔ لیکن بات کہنے میں محققانہ احتیاط کی جا بجا کمی نظر آتی ہے۔ پھر بھی اگر آزاد کا قلم نہوتا تو خسرو کی ہندی شاعری کے بعض

گوشے شاید کبھی روشنی میں نہ آسکتے۔

۳۔ ڈاکٹر اسپرنگ نے ۱۸۵۴ ع میں اودھ کے شاہی کتب خانے کے مخطوطوں کو پیش نظر رکھ کر خسرو کی ہندی شاعری پر ایک مقالہ انگریزی میں لکھا جو اب بالکل مفقود ہوچکا ہے۔

۴۔ حیات خسروی (محمد سعید احمد مارہروی) غالباً اس صدی کی ابتدا میں پہلا ایڈیشن نکلا پھر دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۹ ع میں نولکشور پریس سے شائع کیا۔ کتاب بہت ضخیم نہیں لیکن اس میں خسرو کی ہندی کے متعلق بڑی مفید اور دلچسپ معلومات موجود ہے۔

۵۔ حیات خسرو (مولوی شبلی) پر از معلومات کتاب ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری پر بھی اجمالی گفتگو کی ہے۔ کتاب کا معیار یقیناً شبلی کی سطح سے پست ہے۔ علی الخصوص وہ حصہ جہاں مولانا نے خسرو کی موسیقی کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ سترھویں نامہ (شہزادۂ قدسی نظامی بھوپالی) یہ خسرو کے عرس سے متعلق ایک مختصر کتاب ہے جس میں چند صفحہ ان کی ہندی شاعری کو بھی دئے گئے ہیں۔ ادبیت سے زیادہ کتاب میں عقیدت ہے۔ ۱۳۳۱ھ میں میرٹھ سے شائع ہوئی۔

۷۔ جواہر خسروی (رشید احمد سالم اور مولانا امین چریا کوٹی) خسرو پر آج تک جتنی کتابیں نکلی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہتمام اور مصارف سے یہی کتاب شائع کی گئی ہے۔ لیکن اس میں بیس فیصدی سے بھی کم خسرو ہیں۔ اور اَسی فیصدی سے زیادہ مولانا امین چریا کوٹی کی خارج از موضوع غیر متوازن خامہ فرسائی ہے ۱۹۱۸ ع میں یہ کتاب علی گڈھ سے شائع ہوئی۔ اس میں امیر خسرو کے حسب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ منظوم رسالے شامل ہیں:

۱۔ نصاب بدیعی فارسی

۲۔ نظم گھڑیال، فارسی مشکوک

۳۔ رباعیات پیشہ وران، فارسی (غیر مطبوعہ) مشکوک

۴۔ خالق باری (ہندی) (مطبوعہ)

۵۔ چیستانیں (ہندی) (مطبوعہ)

۶۔ " (فارسی)

۸ ـ ڈاکٹر وحید مرزا کا انگریزی مضمون «امیر خسرو کی ہندی شاعری» ۱۹۳۳ع میں ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسۂ لاہور کی رویداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مضمون میں کوئی خاص گہرائی نہیں. لیکن خسرو کی ہندی شاعری سے متعلق منتشر معلومات کا ایک خاصہ قصہ یکجا کردیا گیا ہے۔

۹ ـ امیر خسرو (ڈاکٹر وحید مرزا) یہ اردو میں خسرو پر سب سے جامع اور بڑی کتاب ہے جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۹ع میں شائع کیا. اس میں خسرو کے ہندی کلام پر بھی بحث کی گئی ہے. جس میں کم و بیش وہ سب نکات آگئے ہیں جو مصنف کے انگریزی مضمون میں تھے. یہ کتاب کئی اعتبار سے خسرو پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے.

۱۰ ـ امیر خسرو (ادارۂ تعلیم و ترقی مکتبۂ جامعہ دہلی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ بچوں کے لئے نکالا گیا. جس میں امیر خسرو کا ہندی کلام بھی ہے.

۱۱ـ خسرو کی ہندی کویتا (برج رتن داس) ہندی میں یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جسے کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے ۱۹۵۳ع میں شائع کیا. اس میں ایک ناقابل ذکر چھوٹے سے مقدمے کے ساتھ خسرو کا ہندی کلام شائع کیا گیا ہے.

نوٹ:ـ پروفیسر شیرانی مرحوم نے ۱۹۲۸ع میں «پنجاب میں اردو» لکھتے وقت ہی اس شک کا کہ وہ خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف نہیں سمجھتے اظہار کیا تھا اور نسخہ حفظ اللسان کی دریافت کے بعد نہ صرف ان کا شک یقین سے بدل گیا تھا بلکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ مسئلہ آخری طور پر طے ہوگیا ہے. لیکن ہمارے یہاں اب بھی ایسے بعض بزرگ موجود ہیں جو اسے امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے ہیں. انہیں میں جناب ڈاکٹر صفدر آہ بھی ہیں. اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں علمی حیثیت سے لکھنا چاہیں تو نوائے ادب کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں. (ایڈیٹر)

* سید شہاب الدین دسنوی

اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ ؛ ایک نئی تجویز

اردو طباعت میں ٹائپ کا مسئلہ ابھی تک ایسی منزل پر ہے جہاں بسا اوقات وہ لوگ بھی جو اس طریقے کے موئد اور اس کی ترویج و اشاعت کے خواہشمند ہیں، اس کی افادیت پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا غلط بھی نہیں ہے کیونکہ ٹائپ کو ترقی دینے کے لئے جتنی توجہ دینی چاہئے تھی اتنی دی نہیں گئی۔ ایسا کوئی ادارہ نہیں جہاں لوگ اردو طباعت کے مسئلوں پر غور کرسکیں جہاں ایسے ماہرین جمع ہوسکیں جو ٹائپ بنانے، ڈھالنے اور ڈیزائن کرنے کے طریقے جانتے ہوں، جو کمپوزنگ (دستی یا میکانکی) کے اصول سے واقف ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں لوگوں کو تجربے کرنے کی سہولتیں میسر ہوں۔ ٹائپ کے مسائل صرف آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچنے اور غور کرنے سے حل نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ مختلف پوائنٹ کے (خفی و جلی) حروف اور مختلف صورتوں (Faces) کے ابھی ایسے ٹائپ تیار کرنے ہیں جنھیں ہم ایک ساتھ اور بیک وقت آسانی سے استعمال کرسکیں۔ جوڑوں کو کم کرنے کی بھی کوشش جاری رہنی چاہئے۔ ٹائپ کو خوبصورت اور پائدار بھی بنانا ہے۔ اعراب و اعلام اس ڈھنگ سے بنائے جائیں کہ طباعت میں دقتیں پیدا نہ ہوں اور تلفظ بھی صحیح ادا ہوسکے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو نہ کانفرنسوں یا جلسوں میں طئے کی جاسکتی ہیں اور جو نہ انفرادی حیثیت سے حل ہوسکتی ہیں۔

اعراب اور علامتوں کا تعلق براہ راست الفاظ کے تلفظ سے ہوتا ہے۔ یہ بلا شبہہ اردو کی بنیادی خوبی ہے کہ اس کی تحریر اعراب اور علامتوں کے بغیر آسانی سے پڑھی جاتی ہے۔ ہم اسے بنیادی خوبی اس لئے کہتے ہیں کہ اعراب کا لگانا لازمی ہوجائے تو اردو کا لکھنا اور چھاپنا اتنا دشوار ہوجائے گا کہ لوگ شائد اس رسم خط کو چھوڑ دینا ہی بہتر سمجھنے لگیں گے۔ لیکن اس خوبی کا یہ

---

* پرنسپل ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق پالی ٹکنک، بمبئی ۸

مطلب بھی نہیں کہ اعراب اور علامتوں کے مسئلے پر دھیان ہی نہ دیا جائے۔ دن به دن اردو رسالوں اور کتابوں کے لئے ٹائپ کا رواج بڑھتا جارہا ہے اس لئے یہ مسئلہ بھی اہم ہوتا جارہا ہے کیونکہ جہاں کہیں چند الفاظ پر بھی اعراب یا علامتیں لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں « ہر سطر کے بعد، یا جہاں ضرورت ہو ایک زائد سطر چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس طرح بین السطور زائد یا بے قاعدہ ہوجاتا ہے اور صفحہ میں مضمون کی سمائی اور بھی کم رہ جاتی ہے »۔[1]
اس کے علاوہ ایک اور دقت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ۔ « طریق طباعت، کتابت والی چھپائی سے زیادہ سست رفتار ہوتا ہے »[2]

یہ دونوں بڑے اہم اعتراضات ہیں جنھیں دور نہ کیا گیا تو یقیناً ٹائپ کی ترویج میں دشواریاں حائل ہوجائیں گی۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی تھوڑی سی وضاحت کردی جائے۔

« نوائے ادب » کے اس شمارے کا صفحہ ۱۲ طباعت کے لحاظ سے ٹھوس مواد کا (solid matter) کا صفحہ ہے جس پر ۲۷ سطریں درج ہیں۔ سطروں کے درمیان تین پوائنٹ جگہ (بین السطور) چھوڑی گئی ہے۔ اس صفحہ پر کوئی ایسا لفظ نظر نہیں آئےگا جس میں حروف کے درمیاں میں اعراب یا علامت کا استعمال ہوا ہو۔ اب ایک ایسے مضمون کی عبارت نیچے درج کی جاتی ہے جس میں املا اور تلفظ کی ضرورتوں کے لحاظ سے بعض لفظوں پر اعراب کا لگانا ناگزیر ہوگیا ہے اور جن کے بغیر مضمون کا مقصد بیاں کرنا دشوار ہوجائے گا:

« بیسیوں الفاظ ہیں جو عام طور سے غلط بولے جاتے ہیں، لفظ مَحَبَّتْ کا تلفظ بعض لوگ مُحَبَّتْ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح « مروت » میں میم مضموم ہے لیکن اس کا تلفظ عام طور سے بہ فتح ادا کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ اس کی ہجا کی رو سے اس میں « ر » کو مضموم ہونا چاہئے کیونکہ اصل ہجا مُرُوْءَت (تلفظ بر وزن حکومت) ہے۔ چونکہ عربی میں کہیں ہمزہ کو واؤ سے بدل دینا جائز قرار دیا گیا ہے، لہٰذا مُرُوَّت تو جائز ہے مگر مُرَوَّت درست نہیں »۔

---

۱ - اردو نامہ، کراچی، جولائی ۱۹۶۱ ۲ - ایضاً

اس عبارت میں پانچ لفظ ایسے آئے ہیں جن پر اعراب لگائے گئے ہیں کیونکہ نفس مضمون کی خاطر یہ ضروری تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سطروں کے لئے تین پوائنٹ کے بجائے بین السطور پانچ پوائنٹ جگہ چھوڑنی پڑی جس کا اثر اس صفحہ کے حسن طباعت پر برا پڑا۔ سطروں کے مابین یکساں جگہ نہ چھوڑنے سے پورے صفحہ کی طباعت بگڑ گئی اور اگر کہیں یکسانیت کی خاطر پورے صفحہ پر بین السطور پانچ پوائنٹ کی جگہ چھوڑی جاتی تو بہت سی جگہ ضائع ہوجاتی۔

بہ ظاہر لیتھو کی طباعت کے طریقہ میں یہ کمزوری نظر نہیں آتی ہے۔ کیونکہ کاتب لفظوں پر اعراب اور علامتیں اس طرح لگا سکتے ہیں کہ وہ سب زائد جگہ لئے بغیر کھپ سکیں لیکن عملی طور پر اس میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً عِلم لکھا ہو تو جزم اس طرح لگایا جاتا ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ جزم «ل» پر ہے یا «م» پر۔ کتابت میں اعرب یا علامتوں کا قطعی طور پر ان کے معیّن مقام ہی پر رکھنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ ایسی ناقابل اعتبار صورت حال کے پیش نظر لغت نویسوں نے دوسرے طریقے سے کام لیا یعنی انھوں نے اعراب کو الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ التزام زیادہ تر انھی حروف کی آوازوں تک محدود رہا جن کے بارے میں شبہ ہوسکتا ہے مثلاً:

مدّعا	بضمّ میم و تشدید دال مفتوح (قاموس الاغلاط)
مَشاطه	بالفتح و تشدید شین .... عوام (بضمّ میم و بہ تخفیف تشدید مشاطه کہتے ہیں) (ایضاً)
مَعنوں	(بوزن مُسرَہن، مدمدب) عنواں (بالکسر و بالضم) کے معنی میں (ایضاً)
ارغنون	بالفتح اور فتح سوم (جامع اللغات)
اصل	بالفتح (نوراللغات)
تہمت	بالضم و فتح دوم (بہار عجم)
خلوت	بالفتح (ایضاً)

مضامین اور مقالوں میں بھی تلفظ بتانے کے لئے اکثر یہی طریقہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ نمونے کے طور پر جو عبارت اوپر درج کی گئی اس میں بھی یہی التزام رکھا گیا پھر بھی اعراب و اعلام کی ضرورت باقی رہی ورنہ

صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ ہر حرف کی حرکت کا لحاظ رکھتے ہوئے تلفظ لفظوں کے ذریعہ بتایا جائے اور اگر ایسا کیا جائے تو صورت یہ ہوجائے گی:

محبّت	میم بالفتح، حا بالفتح، با مشدد و بالفتح اور تا به سکون.

اصطبل	بکسر الف و سکون صاد و فتح طا و سکون با و لام (نور اللغات)

اسطرلاب	بضم اول و ثالث و لام بالف کشیدہ بنائے ابجد زدہ (برہان قاطع)

اصلیت	فت ا، سکن ص، کس ل، فت ی شد (نمونہ لغات اردو، شائع کردہ اردو ترقی بورڈ، کراچی)

یہ صورتیں کافی قبیح ہیں جو نہ پہلے مقبول ہوسکیں اور نہ جن کی آئندہ ہونے کی امید ہے.

ٹائپ میں اعراب لگانے کی جس دقت کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے اس کے پیش نظر ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حروف پر کشیدہ لگا کر اعراب لگائے جائیں. اس طرح ہم اپنی عبارت یوں چھاپ سکتے ہیں: لفظ مَـحَـبَّـت کا تلفظ بعض لوگ مُـحَـبَّـت بھی کرتے ہیں..... « یا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ » اس طریقے سے بین السطور جگہ نہ تو زائد ہوتی ہے نہ بے قاعدہ لیکن کمپوزنگ کی دشواری کے علاوہ دوسرا عیب پیدا ہوجاتا ہے یعنی لفظوں کا بے ڈھنگا پن.

اردو تحریر میں ہجا کے علاوہ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہمارے مروّجہ اعراب و اعلام، حروف کی ان تمام حرکتوں کو ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جو بولنے میں مستعمل ہیں؟ ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے کتنے ہی الفاظ اردو میں داخل ہوتے جا رہے ہیں، کتنے ہی غیر مانوس نام استعمال میں آرہے ہیں، ان سب کا صحیح تلفظ ادا کرنا دشوار ہوتا جارہا ہے. یہ درست ہے کہ ماضی میں اسی قسم کی دشواریوں کو حل کرنے کی خاطر اردو اعلام میں کچھ اضافہ کیا بھی گیا ہے مثلاً واؤ معروف یا واؤ معدولہ یا یائے معروف وغیرہ کے لئے کچھ نئی علامتیں مقرر کی گئیں لیکن اب تک ان کے نام بھی نہ طے ہوسکے ہیں. ہم ان کو حروف پر (۶) یا (۸) وغیرہ نشان لگا کر پہچانتے ہیں. یہ نشانیاں انجمن ترقی اردو اور دوسرے اداروں کی مطبوعات کے ذریعہ

ایک حد تک مقبول بھی ہوچکی ہیں. لیکن یہ بھی ہماری ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتی ہیں مثلاً:

« بہتر ، مہر ، مہتر » کو صرف کسرہ سے ادا کیا جائے تو « بجلی » ، « ستر » کو کیسے لکھا جائے ؟

انگریزی لفظ Bed room یا Red Indian کیسے لکھا جائے ؟

« کیا » (کرنا سے) اور « کیا ؟ » (سوالیہ) میں کیسے فرق کیا جائے ؟

« پردہ » بالفتح لکھا جائے تو « پہلا » کیسے لکھا جائے ؟

« عہدہ » اور « عمدہ » میں کیسے فرق کیا جائے ؟

ان حالات کے پیش نظر یہ اعتراض درست ہوجاتا ہے کہ اردو لغت چھاپنی ہو یا لغت سے متعلق کوئی مضمون لکھنا ہو یا کسی اور سبب سے ایک لفظ کے ہر حرف کی حرکت بتانی مقصود ہو تو ٹائپ کا طریقۂ طباعت دشواری پیدا کرے گا اور لفظوں کے ذریعہ تلفظ بتانے کی صورت مقبول نہیں ہوگی اور یوں بھی مروّجہ علامتیں ناکافی ثابت ہوں گی[1]۔

صورت حال پر غور کرکے راقم السطور نے ایک حل پیش کرنے کی جرأت کی ہے. اس کی تفصیل نیچے درج ہے لیکن اس سے پہلے ایک کلیہ بیان کردینا مناسب ہوگا. کسی زبان میں اعراب، علامتیں یا حرف علت اسی مناسبت سے پائے جاتے ہیں جس سے اس مخصوص زبان کی مخصوص آوازوں کو ادا کرنے میں مدد ملتی ہے. یہ ممکن نہیں کہ دنیا کی کوئی ایک زبان کسی دوسری زبان کے سب لفظوں کو صحیح مخارج اور آوازوں کے سارے اتار چڑھاؤ کے انداز کو ادا کرنے میں کامیاب ہو[2]. جیسے جیسے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کا دامن دوسری زبانوں کے الفاظ کے لئے پھیلتا جاتا ہے ویسے ویسے اس میں نئی علامتوں کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے. اردو کے لئے وقتاً فوقتاً اس طرف کچھ توجہ کی گئی ہے، نئی علامتیں تجویز کی گئیں، نئے اصول مرتب ہوئے مگر سوائے چند اصولوں کے، باقی میں نہ تو کوئی باقاعدگی آسکی اور نہ پابندی کے ساتھ ان

---

١ ۔ ملاحظہ ہو اردو نامہ، کراچی جولائی ١٩٦١

٢ ۔ دیوناگری کا یہ دعوی کہ وہ مکمل طور پر صوتی رسم الخط ہے، بے بنیاد ہے. اور تو اور دیوناگری رسم الخط سنسکرت تک کے لفظوں کی ساری آوازوں کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے.

پر عمل کیا گیا۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں تلفظ کی چودہ آوازیں ہیں۔ [۱] جن کے لئے تین حروف علت (ا، و، ے) چار اعراب (زبر، زیر، پیش اور مد) جزم اور اس کے علاوہ تین نئی علامتیں (٬ ^، ٓ ،) استعمال کی جاتی ہیں۔ اور ان سے جو دقتیں ٹائپ کی طباعت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ راقم کی تحویز ہے کہ چودہ آوازوں کے لئے بین‌الاقوامی صوتی انجمن [۲] کی تجویز کردہ نشانیاں (symbols) لے کر اپنے رسم خط میں شامل کرلیا جائے۔ اور ان کی مدد سے اردو کے لفظوں میں حروف کے حرکات ادا کئے جائیں۔ یہ نشانیاں (جن میں بعض ترمیم شدہ ہیں)، اردو کی مترادف آوازیں، اور ان کی مثالیں تجویز کے مطابق حسب ذیل ہیں:

سلسلہ	آواز (اردو)	محورہ نشانی	مثال
۱	آ	a	آم
۲	اَ	ə	اجمل
۳	اِ (نصف)	ı	اِنصاف
۴	اِ (اوسط)	e	مہتر
۵	ای (کشیدہ)	e	ایماں (یائے معروف)
۶	اے (کشیدہ)	ā	ایک، دیر، سیب (یائے مجہول)
۷	اے (کشیدہ)	a	سیر، پیر (یائے لین)
۸	اے (اوسط)	â	پہلا، محمل
۹	اُ (خفیف)	u	اُجلا
۱۰	او (کشیدہ)	ū	اون، نور (واؤ معروف)
۱۱	اُ (اوسط)	û	دوپٹہ، عہدہ
۱۲	او (کشیدہ)	o	روز، زور (واؤ مجہول)
۱۳	او (کشیدہ)	ô	عورت (واؤ لین)
۱۴	ائے	æ	اِفشاء

۱ ـ ملاحظہ ہو جان شیکسپئر کی ہندوستانی انگلش ڈکشنری کے تمہیدی صفحات

۲ ـ IPA یعنی International Phonetic Association

ان میں سلسلہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۹ اور ۱۲ وہی نشانیاں ہیں جو IPA نے انہی مقصد کے لئے استعمال کی ہیں. باقی نشانیاں عام طور سے انگریزی ڈکشنری میں استعمال ہوتی ہیں.

مذکورہ نشانیوں کے ساتھ یہ اصول بھی سامنے رکھے جائیں:

(الف) لفظ کا ہر حرف الگ الگ لکھا جائے

(ب) ہر رکن تہجی (syllable) کو علاحدہ کرنے کے لئے (،) استعمال کیا جائے

(ج) مرکب الفاظ کو علاحدہ کرنے کے لئے (ـ) استعمال کیا جائے

(د) آدھی آواز کے آگے (:) لگایا جائے

(ہ) ہمزہ کی جگہ الف استعمال کیا جائے

مجوزہ نشانیوں کی مدد سے اور مذکورہ اصولوں کے تحت الفاظ یوں لکھے جا سکتے ہیں:

قلیل	ق e ، ل e ل	قلیه	ق ə ل ، ے a
قلم	ق ə ، ل ə م	قلمانا	ق ə ل ، م a ، ن a
عَلم	ع ə ، ل ə م	عِلم	ع ɪ ل م
کتاب	ک ɪ ، ت a ب	کتنا	ک i ت ، ن a
کیا	ک i ، ے a	کیا	ک e ، ے a
بیڈروم	ب e ڈ ـ ر ū م	ریڈ انڈین	ر e ڈ ـ ا ɪ ن ، ڈ ɪ ، ا ə ن
میخانه	م a ، خ a ، ن a	تئیں	ت ə : ا ɪ ں
محقق	م u ، ح ə ق ، ق ɪ ق	پیار	پ e : ے a ر
عهده	ع ū ہ ، د a	اوٹلا	ا o ٹ ، ل a
محمل	م ہٗ ح ، ف ɪ ل	تیاگ	ت ə . ے a گ
اولاد	ا ô ، ل a د	سواگت	س o : ا a ، گ ə ت
اسطرلاب	ا u س ، ط u ر ، ل a ب	برف	ب ə ر ف

دائم‌المریض　د a ، ا e ، م u ل ، م ə ، ر e ض

المسجدالاخضر　ا ə ل ، م ə س ، ج ɪ ، د u ل ـ ا ə خ ، ض ə ر

جیلر ج ة، ل ہ ر تبصرہ ت ہ ب، ص ہ، ر a

مذکورہ بالا طریقۂ کار کے اثرات بالخصوص اردو ٹائپ کی طباعت پر اس طرح ہوں گے:

(۱) یہ نشانیاں انگریزی میں (accented letters) کے طور پر مستعمل ہیں اس لئے ان کا حاصل کرنا بہت آسان ہے، نئے حروف یا نئے ڈیزائن یا میٹرس (matrix) بنانے کا سوال نہیں پیدا ہوگا۔

(۲) ان نشانیوں کو اردو ٹائپ کی کمپوزنگ میں ہم آہنگ کرنا آسان ہوگا۔ اگر اردو ٹائپ ۱۸ پوائنٹ کا ہے تو ۱۰ پوائنٹ کے انگریزی (accented letters) ۱۸ پوائنٹ کی باڈی پر ڈھالے جاسکتے ہیں تاکہ (justification) کی دقت باقی نہ رہے۔

(۳) لغت چھاپنے میں یا تلفظ ادا کرنے کی خاطر اعراب و اعلام کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ موثر ہوگا۔

(۴) طباعت میں بین السطور کی زائد جگہ، یا بے قاعدگی کا سوال پیدا نہ ہوگا۔

(۵) رفتار زمانہ کے ساتھ رومن رسم الخط بھی عام ہوتا جارہا ہے جس سے معمولی پڑھا لکھا انسان بھی آشنا ہوتا جاتا ہے اس لئے یہ نشانیاں غیر مانوس نہیں ہوں گی۔

(۶) نصف آوازوں کی ادائیگی کے لئے یہ طریقہ بہت مناسب ہوگا۔

(۷) اس سے ہر رکن تہجی الگ کیا جاتا ہے جس سے تلفظ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(۸) اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لئے بھی یہی نشانیاں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ صرف مخصوص آوازوں کے لئے حروف صحیح میں ترمیم کرنی پڑے گی۔

اس طریقۂ کار سے لغت کو ٹائپ میں چھاپنے میں کتنی سہولت ہوگی اور لغت استعمال کرنے والوں کو جو آسانی ہوگی وہ اگلے صفحہ پر دئیے ہوئے نمونے سے ظاہر ہوگی۔ نمونے کا یہ صفحہ نور اللغات سے لیا گیا ہے۔ الفاظ کی سطریں لغت کا لفظ اور مجوزہ نشانیوں میں ادا کیا ہوا اس کا تلفظ ۱۸ پوائنٹ میں اور معنی ۱۲ پوائنٹ میں کمپوز کیا گیا ہے۔

براق [ب ə، ر a ق]
۱۔ بہشت کا گھوڑا (مجازاً) گھوڑا، ۲۔ (اردو، وہ تعزیہ جسکا دھڑ گھوڑے کی شکل کا اور چہرا انسان کا سا بناتے ہیں)

براق [ب u ر، ر a ق] ع. صفت
۱۔چمکیلا ۲۔چالاک، ہوشیار، مشاق، تیز ذہن
۳۔ نہایت سفید ۴۔تیزرو

براقی [ب u، ر a ق e] م.
چمک دمک

برا [ب ə، ر a] جانا (عم)
ٹال جانا

برامکہ [ب ə، ر a م، ک ə] ع. جمع برمک کی
برمک بلخ کے آتشکدہ میں آگ جلانے پر ملازم تھا بعدہ مسلمان ہوکر بغداد آیا اور اس کا بیٹا خالد، خلیفہ منصور بن سفاح کا وزیر ہوگیا اور اس کے بعد خالد کا بیٹا اور پوتے وزیر ہوتے رہے ان لوگوں کو برامکہ کہتے ہیں لیکن اس سبب سے کہ یحیی بن خالد اور اس کے دونوں بیٹے فضل و جعفر فیاضی و سخاوت میں شہرۂ آفاق ہیں اکثر اس لفظ سے امرائے ذیشان اور سخاوت‌پیشہ مراد ہوتے ہیں

برانچ [ب ر a ن چ] انگ۔ م.
شاخ، شعبہ، — اسکول، (م) وہ مدرسہ جو کسی دوسرے مدرسہ کا ماتحت ہو؛ — پوسٹ آفس؛ وہ ڈاک خانہ جو بڑے ڈاک خانہ کی شاخ ہو، — پوسٹ ماسٹر: وہ ڈاک کے محکمے کا افسر جس کے چارج میں برانچ آفس ہو (انگریزی branch)

برانڈہ [ب ر a ن، ڈ a] ھ. م. عم
برآمدہ (انگریزی verandah)

برانڈی [ب ر a ن، ڈ e] انگ. م.
۱۔ایک خاص قسم کی تیز شراب (انگریزی brandy)
۲۔(اردو) اوپر پہننے کا موٹا کوٹ.

براوا دینا [ب u، ر a، و a] عو.
حیلہ بہانا کرنا، ٹال مٹول کرنا، دم جھانسا دینا.

براہمہ [ب ə، ر a، ہ م: ə] ع.
برہمن کی جمع (دیکھو برہمن)

براہین [ب u، ر a ہ، e ن] م. برہان کی جمع
دلیلیں

براہی [ب ə، ر a، ہ e] ھ. م
چھوٹی قسم کا گنا، ایکھ.

اس نمونے کے مطابق ٹائپ میں لغت چھاپی جائے تو ضرورت کے مطابق جگہ جگہ بلاک کی تصویروں کے ذریعہ معنی کی وضاحت بھی کی جاسکے گی جو اس وقت لیتھو کے ذریعہ دشوار ہے.

آخر میں یہ بات بھی صاف ہوجائے کہ راقم کی تجویز کا مقصد یہ نہیں کہ اعراب و اعلام سرے سے ختم ہی کردئے جائیں اور اردو رسم تحریر میں اس کا استعمال ہی نہ ہو. جب تک لیتھو کی چھپائی کا رواج ہے کاتب یقیناً مروجہ طریقے ہی کو اختیار کریں گے اور اسی میں سہولت بھی ہے. جو چیز ٹائپ میں چھپے گی اس میں بھی عام طور سے اِس، اُس، اِنھیں اُنھیں، دِل، دَل، بُراق، ترّقی وغیرہ جیسے الفاظ میں آسانی کے ساتھ ضروری اعراب لگائے جاسکتے ہیں

اور چونکہ ان میں اعراب لفظ کے شروع یا آخر یا کسی ٹکڑے کے شروع یا آخر میں آتے ہیں کمپوزنگ کی دقت نہیں ہوگی۔ البتہ جہاں لغت یا پورے لفظ کا تلفظ بیان کرنا ہو (بالخصوص لغت نویسی میں) وہاں راقم کی تجویز مفید ثابت ہوگی اور اس کے ساتھ ٹائپ کی طباعت پر جو اعتراض اور جن پیچیدگیوں کا ذکر «اردو نامہ»، کراچی کے حوالے سے مضمون کی ابتدائی حصہ میں کیا گیا وہ پیدا نہیں ہوں گی۔

تبصرے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ISLAM AND THE WORLD.
By Abul Hasan Ali Nadvi,
Translated by Mohamed Asif Qidwai, p.p. 196

قیمت : چار روپے ، ملنے کا پتہ : القادر ، ناشران کتب اسلامی
۴۱ ، امپریس روڈ ، لاہور ، پاکستان

مولانا ابو الحسن علی ندوی ، موجودہ عہد کے ان اسلامی مشاہیر میں ہیں جن کی مخلصانہ کوششیں ہندوستان کے تعلیمی گوشہ سے نکل کر ، اسلامی دنیا کے علمی ، تحقیقی ، تبلیغی اور اصلاحی میدانوں تک موثر حیثیت سے پھیل چکی ہیں. ان کے مقالے اور تصانیف خاص غور و فکر کی نظر سے پڑھی جاتی ہیں. ان کی انہی فکر زا کتابوں میں ان کی زیر تبصرہ کتاب بھی ہے ، یہ کتاب مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی کی وسعت کے لحاظ سے ابتداً اسی زبان میں ۱۹۵۰ ع میں لکھی گئی تھی پھر اس کی افادیت کی تعمیم کے پیش نظر ۱۹۵۴ ع میں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ، لیکن اس خیال سے اس کتاب تک رسائی کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو ، ہمارے ملک کے مخلص مصنف جناب محمد آصف قدوائی ، ایم . اے . پی . ایچ . ڈی . نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے . کسی زبان میں تصنیف سے ترجمہ کا کام زیادہ مشکل ہے ، اس لئے کہ اس میں ایک زبان کی جگہ دو زبانوں پر کامل عبور کی ضرورت ہے . ڈاکٹر قدوائی کا ترجمہ اور مقالات سیرۃ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں . ضرورت ہے کہ اس انگریزی ترجمہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اسلام نے اپنے عروج و قوت کے زمانے میں دنیا کے لئے کیا نعمتیں اور برکتیں مہیا کیں اور اس کے زوال نے خود دنیا کو کتنی لعنتوں اور ہلاکتوں سے قریب تر کردیا ہے . اس کے ناشر پاکستان کے ناشران کتب اسلامی ، القادر لاہور ہیں . کتابت کی طباعت صاف اور کاغذ اچھا ہے . (ن)

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ

مولفہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

صفحات: ۲۱۴ قیمت: ۳ روپئے ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: ابوالکلام آزاد اورنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خیرت آباد حیدر آباد ۴

یوں تو موجودہ اردو نثر کی ابتداء انیسویں صدی کے کچھ پیچھلے سے ہی شروع ہوگئی تھی اور سنہ ۱۸۵۷ ع تک اس نے خاصی ترقی کرلی تھی، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ سب سے پہلی کون سی قابل احترام ہستی تھی جس نے علوم جدیدہ، ریاضی، صحافت، مضمون نگاری کو اپنی ذات میں جمع کرلیا تھا، جو جذبۂ اصلاح و ترقی سے اتنا سرشار تھا کہ بڑی سے بڑی مخالفت بھی اس کو روک نہیں سکتی تھی تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک نام ہوگا اور وہ ماسٹر رام چندر کا۔

افسوس کہ ایسی لائق احترام اور قابل مطالعہ ہستی پر اردو میں کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ غائر مطالعہ و تحقیق کے بعد نہ صرف ان کے حالات لکھے، ان کے کارناموں کو ناقدانہ نظر سے پیش کیا، اردو نثر میں ان کا مقام و اہمیت بتائی، ان کے حالات و تصانیف کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں تھیں دور کیں بلکہ ہر موضوع پر ان کے مضامین کا انتخاب دے کر ان کے متنوع کارناموں سے واقف ہونے کا بھی موقع دیا۔ اردو کی تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب یقیناً قابل مطالعہ ہے۔

اردو املا

مولفہ: غلام رسول

صفحات: ۶۵ قیمت: ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد (اے۔ پی)

اس رسالے کے ابتدا میں مولف لکھتے ہیں ہماری زبان کا خط بلا اعرابوں کا ہوتا ہے اور اعراب ہی اردو خط کے اہم جز ہیں» یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اردو املا پر کئی بار بحثیں ہوئیں۔ رپورٹیں پیش

ہوئیں لیکن یائے معروف یا لین یا واؤ معروف یا لین کی علامتوں کے سوا کسی اور اصول کو اب تک اردو والوں نے بالالتزام قبول نہیں کیا. سوال اس کا نہیں ہے کہ نئی علامتوں کے نام کیا ہوں، ان کی شکلیں کیا ہوں؟ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو علامتیں یا اعراب متعین کئے جائیں ان کے بارے میں یقین ہو کہ وہ تحریر میں یا طباعت میں کھپ سکیںگے اور دوسرے یہ کہ ان کو معیاری بناکر عام طور سے مروج کیا جاسکیگا جب تک یہ دونوں باتیں طے نہ ہوں اچھی سی اچھی تجویز صرف تجویز ہی بن کر رہیگی

علام رسول صاحب نے اردو میں اعراب اور علامتوں سے بحث کرتے ہوئے ۴۲ اصول مرتب کئے ہیں جن کی مدد سے ان کے خیال کے مطابق تلفظ کی صحت کا مسئلہ حل ہوسکیگا. اس سلسلے میں انھوں نے بعض آوازوں کے لئے نئی علامتیں بھی تجویز کی ہیں جن کے بغیر بالخصوص غیر زبانوں کے لفظوں کو اردو میں ادا کرنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں. انھوں نے لفظوں کے نمونے جمع کرنے میں محنت کی ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ان کا خیال اور ان کی تجویزیں بہت سے لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہوں مثلاً.

(۱) صفحہ ۲۷ انگریزی لفظ Cat اور Man کو کیاٹ اور میان لکھنا

(۲) لفظ Hen اور Pen کو (صفحہ ۲۷ پر) ہین اور پین لکھنا اور اسی علامت کے ساتھ یائےلین کو صفحہ ۱۰ پر ادا کرتے ہوئے بیر اور پھیلاؤ لکھنا

(۳) ان کی تجویز کہ مرکب لفظوں کو زنجیر v کے ساتھ لکھا جائے، مثلاً ان v مول، آج v کل، مادر v زبان وغیرہ بلا ضرورت طریق تحریر کو پیچدہ بناتی ہے.

رسالے کے شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، معتمد ادارہ ادبیات اردو کا پیش لفظ ہے. (ش)

<u>غالب</u> مصنفہ: خورشید الاسلام

ضخامت. ۲۸۴ صفحے قیمت: چھے روپے

پبلیشرز: انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ (یو، پی)

اس کتاب میں لائق مصنف نے اپنے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کی

قوت سے ان اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جن کو غالب نے اپنے تعمیری دور میں فارسی و اردو کے ممتاز شعرا شوکت، اسیر، بیدل، غنی کاشمیری، ناصر علی، صائب اور ناسخ کے مطالعہ کے بعد قبول کیا تھا۔ خود غالب نے اپنے متعدد اشعار میں ان میں سے بعض اساتذہ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی کچھ محدود کوششیں کی گئی تھیں لیکن اس قدر تفصیل کے ساتھ اب تک کسی نے «نوجوان» غالب کی شاعری کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی تھی، یہ مفصل کوشش ہے۔ کتاب موضوع اور اپنی ترتیب و تجزیہ کے اعتبار سے دل چسپ ہے۔ کتاب چار ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں غالب کے گھریلو اور تہذیبی ماحول کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں شوکت، اسیر، بیدل، غنی، علی اور ناسخ کی خصوصیات شاعری بتاکر ان کے اسالیب کا اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر بتایا گیاہے۔ تیسرے باب میں تمثیل نگاری خیال بندی اور مناسبات لفظی پر مختصراً لکھا گیا ہے اور چوتھے باب میں غالب کا اپنا کارنامہ بتایا گیا ہے۔ پہلے ضمیمہ میں غالب کے ان اشعار کا انتخاب ہے جن سے مختلف اساتذہ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے ضمیمہ میں ان لفظوں اور تلازموں کا ذکر کیا گیا ہے جو «غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار وقیع انداز سے استعمال ہوئے ہیں۔» اس «دیدہ سوری» کے پس منظر میں مصنف کی یہ تمنا کام کر رہی ہے جس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ «ممکن ہے کہ اس ضمیمہ کی بنیاد پر غالب کے ذہنی عمل کا مطالعہ کیا جاسکے۔»

غالبیات سے دل چسپی رکھنے والوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک مفید و قابل مطالعہ تصنیف ہے۔

(ع، م)

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی

پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپواکر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

عمدۂ منتخبہ

یعنی

تذکرۂ سرور

اردو کے ۹۹۶ شاعروں کا ایک نایاب تذکرہ جو سنہ ۱۸۰۹ع
میں مرتب ہوا

تالیف: نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور
مرتبہ : ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

جسے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت
خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے

صفحات ۸۳۶ قیمت (مجلد): بیس روپئے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ : ادبی پبلشرس
۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

مقالـــه نمـا

مرتب:

ڈاکٹر عالی جعفری

معـاونین:

سید مجاہد حسـین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

مذہبات

۱ ابو الاعلیٰ مودودی
السجدہ
(ترجمان القرآن ۶۱ جولائی ۹-۲۳، اگست ۹-۳۲)
تفہیم قران کے سلسلے میں سورۂ سجدہ کی پہلی اور دوسری قسط.

۲ امام الدین ابو محمد
نظریۂ اوتار اور عقیدۂ رسالت
(زندگی رام پور ۶۱ جولائی، اگست و ستمبر)
نویں، دسویں اور گیارہویں قسط

۳ چودھری محمد اسماعیل
سود
(ثقافت ۶۱ اگست ۲۵-۵۲)
چوتھی قسط.

۴ خلیل حامدی
عرب ممالک میں اسلامی دستور کا مطالبہ
(ترجمان القرآن ۶۱ جولائی ۵۸-۶۳)

۵ عبد الغنی حسن ڈاکٹر، مصنف
خلیل حامدی، مترجم
اسلام کا بین الاقوامی قانون
(ترجمان القرآن ۶۱ اگست ۳۳-۶۰)
عربی سے ترجمہ.

۶ رزاقی شاہد حسین
اسلام کے سیاسی تصورات اور خلافت الٰہیہ اور اس کے مقاصد
(ثقافت ۶۱ اگست ۵۶-۶۳)
مولانا محمد اسحاق سندیلوی کی متعلقہ تحریروں کا خلاصہ.

۷ رزاقی شاہد حسین
ابن تیمیہ کا نظریۂ فرد و جماعت
(ثقافت ۶۱ ستمبر ۶۵-۷۰)

۸ سردار جعفری
مصحف عثمانی کے متعلق ایک عینی شہادت
(معارف ۶۱ اگست ۱۰۱-۱۰۳)
سید شہاب الدین دسنوی کے کہنے پر سردار جعفری نے اس کی زیارت کی کیفیت دوسری متعلقہ معلومات کے ساتھ بیان کی ہے.

۹ سعید رمضان ڈاکٹر
فرعون و کلیم کی داستان کشمکش
(ترجمان القرآن ۶۱ جولائی ۲۷-۴۳)

۱۰ سلطان مبین
فطرت شرک
(زندگی رام پور ۶۱ اگست ۳۹-۴۳ و ۵۵)

۱۱ عبد اللہ خاں
نماز بوقت خطبہ پر محققانہ بحث
(برہان ۶۱ جولائی ۲۵-۴۰، اگست ۲۵-۳۰)

دوسری و تیسری قسط.

۱۲ عروج قادری سید احمد
غیظ و غضب
(زندگی رام پور ۶۱ اگست ۹-۱۷)
غیظ و غضب سے متعلق رسول اکرم کی احادیث مع توضیح و تصریح درج ہیں.

۱۳ عمری جلال الدین سید
قرآن - محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کی نظر میں
(زندگی رام پور ۶۱ اگست ۱۸-۳۹)

۱۴ فارق خورشید احمد
عمر فاروق کا اجتہاد
(ثقافت ۶۱ جولائی ۷-۲۹)

۱۵ فارق خورشید احمد
حضرت عثمان کے سرکاری خطوط
(برہان ۶۱ اگست ۴۱-۴۸)
دوسری قسط.

۱۶ قاضی اطہر
فرقۂ یزیدیہ اپنے امیر کے بیان کی روشنی میں
(معارف ۶۱ ستمبر ۲۲۳-۲۳۳)

۱۷ قریشی اکبر حسین
اقبال اور حدیث نبوی
(معارف ۶۱ جولائی ۴۷-۶۲)
قرآن کے ساتھ اقبال احادیث نبوی کے بھی قائل تھے.

۱۸ محمد فاروق
قرآن مجید کی حیرت انگیز جامعیت
(زندگی رام پور ۶۱ ستمبر ۲۷-۴۴)

۱۹ معراج محمد بارق
اسلام کی ہمہ گیری
(معارف، لاہور ۶۱ جولائی ۱۷-۲۸)
تکمیل انسانیت سے متعلق اسلام کی ہمہ گیری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے،

۲۰ ندوی ابو الجلال
سورہ نمل، تفسیر و تشریح
(فاران ۶۱ جولائی ۱۲-۱۹ اگست ۸-۱۲)
چوتھی اور پانچویں قسط.

۲۱ ندوی ابو الحسن علی
ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات
(الفرقان ۶۱ اگست ۱۸-۳۱)

۲۲ ندوی رشید اختر
فقہائے شافعیہ
(ثقافت ۶۱ ستمبر ۴۳-۶۴)

۲۳ ندوی محمد حنیف
حج کی فضیلت و اہمیت
(ثقافت ۶۱ جولائی ۳۰-۴۶ اگست ۲۶-۴۴)

۲۴ ندوی محمد حنیف
اسلام میں نکاح کی حیثیت
(ثقافت ۶۱ ستمبر ۲۶-۴۲)

۲۵ نعمانی محمد منظور
اذان و اقامت سے متعلق بعض احکام
(الفرقان ۶۱ جولائی ۵-۱۰ اگست ۵-۱۷)

۲۶ نعمانی محمد منظور
مساجد، ان کی عظمت و اہمیت اور

آداب و حقوق
(الفرقان ۶۱ ستمبر ۵-۴۴)

۲۷ نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود
مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن ۶۱ جولائی ۴۴-۵۷ اگست ۱۸-۳۲)
دوسری و تیسری قسط.

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۸ ابو القاسم رفیق دلاوری
مچھیرے کی بیٹی کا شاہانہ اوج و عروج
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۱ جولائی ۲۱-۲۵)
نصیر الدین حیدر کی ایک کنیز دھیا مہری کے عروج کی داستان بیان کی ہے.

۲۹ صوفی محمد یعقوب
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف، لاہور ۶۱ اگست ۱۳-۲۲)
خواجہ عالم پیر نور محمد نقشبندی رح کے حالات درج کئے ہیں.

۳۰ ضیاء الحسن فاروقی
رشید رضا
(جامعہ ۶۱ جولائی ۴۵۸-۴۶۶)
مفتی محمد عبدہ کے ممتاز شاگرد رشید رضا شامی کے افکار و اعمال کا تذکرہ ہے.

۳۱ عبد العلی ڈاکٹر مصنف
ندوی ابو الحسن علی مرتب
ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے چند خطوط
(الفرقان ۶۱ جولائی ۳۶-۴۳ اگست ۳۲-۳۶)
مرتب کے نام سات خط جو مختلف نجی باتوں پر مشتمل ہیں. آخر کے دو خطوں میں مصر و حجاز کا ذکر ہے.

۳۲ عبد الغنی نیازی شاہ
مظہر نور خدا
(ماہ نو ۶۱ ستمبر ۲۱-۲۴)
مشہور صوفی حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویری لاہوری معروف بہ حضرت داتا گنج بخش رح سے متعلق اچھے معلومات پیش کی ہیں.

۳۳ عطاء اللہ پالوی
ڈاکٹر طٰہٰ حسین
(نگار ۶۱ ستمبر ۹-۱۶)
ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شخصیت اور علمی کاموں کا تعارف پیش کیا ہے

۳۴ غمار یاور
ابوالعلا احمد المعری
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۱ اگست و ستمبر ۲۱ - ۲۰)
ابوالعلا احمد المعری کے حالات بیان کئے ہیں اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے

۳۵ غوری شبیر احمد خان
علامہ اقبال اور اسلام کے تصور

زماں کی ترجمانی
(معارف ۶۱ اگست ۸۵ - ۱۰۳)

۳۶ غوری شبیر احمد خان
شیخ بو علی سینا کی عبقریت
(معارف ۶۱ ستمبر ۱۸۱ - ۱۹۳)
جون ۶۱ء سے مسلسل

۳۷ فصیح الدین بلخی
شبلی نعمانی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۱۵ - ۱۶)
مولانا شبلی کی حیات اور کارناموں کا سرسری جائزہ ہے

۳۸ مشیر علی صدیقی
مولوی ذکاءاللہ دہلوی
(شاعر، بمبئی ۶۱ جولائی ۳۲ - ۳۳)
مولوی ذکاءاللہ کی معلمانہ شخصیت پر تبصرہ کیا ہے

۳۹ محمد ابو ذرمانی
سارٹان کی تاریخ سائنس میں ابن سینا کا تذکرہ
(معارف ۶۱ اگست ۱۳۵ - ۱۴۲)

۴۰ محمد مسعود احمد
شیخ احمد سر ہندی
(معارف ۶۱ جولائی ۵ - ۲۱ اگست ۱۰۴ - ۱۱۹ ستمبر ۱۶۵ - ۱۸۰)
تاریخ و سیاست کے پس منظر میں شیخ احمد سر ہندی (مجدد الف ثانی) کے کارناموں کا جائزہ

۴۱ محمد موسیٰ حکیم امرتسری
علمائے امرتسر
(بیص الاسلام راولپنڈی ۶۱ جولائی ۳۳ - ۴۳)
مولانا مفتی پیر غلام مصطفیٰ قاسمی رح کے حالات زندگی اور انکے چند مستفیدین کا مختصر تعارف پیش کیا ہے

۴۲ مسعود حسن رضوی
بادشاہ بیگم
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ جولائی ۹ - ۱۴)
نواب غازی الدین حیدر تاجدار اودھ کی بیگم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے

۴۳ نصیرالدین ہاشمی
نواب سالار جنگ
(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۲۶ - ۳۰)
حیدرآباد کے نواب سالار جنگ کے کتب خانے اور ان کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے

۴۴ نعمانی محمد منظور
مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری
(الفرقان ۶۱ ستمبر ۴۳ - ۵۳)
مولانا مرحوم کی علمی، مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ

تاریخ و سیاسیات

۴۵ خالدی محمد ابوالنصر ڈاکٹر
ہندوستان کے متعلق جاحظ کے اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ
(برہان ۶۱ جولائی ۵ - ۲۷ اگست ۵ - ۲۴ ستمبر ۵ - ۲۴)

۴۶ خواجه عبدالرشید ڈاکٹر و سعید احمد اکبرآبادی

علماء اور حکومت

(برہان ۶۱ جولائی ۵۷-۵۹ اگست ۶۳-۶۱ ستمبر ۶۳-۵۹)

علماء اور حکومت کے تعلقات کے سلسلے میں دو خط

۴۷ رزاقی شاہد حسین

انڈونیشیا میں داخلی کشمکش

(ثقافت ۶۱ جولائی ۴- ۵۷)

۴۸ شریف‌النساء ڈاکٹر

حدائق‌السلاطین اور قطب شاہی سلاطین و وزراء

(صبا ۶۱ جولائی، اگست ۲۳ - ۳۰)

۴۹ عمر الہی

تاریخ کا مطالعه

(جامعه ۶۱ اگست ۵۴۰ - ۵۴۴)

تاریخ کی اہمیت اور اس کے مطالعه کے اصول بیان کئے ہیں

۵۰ قاضی اطہر

ہنگری کے مستشرقین اور ان کے علمی کارنامے

(معارف ۶۱ جولائی ۶۳ - ۷۶)

۵۱ قاضی زین‌العابدین

عہد عباسی کی معاشرت کے روشن و تاریک پہلو

(جامعه ۶۱ اگست ۵۱۳ - ۵۲۳)

خلفائے عباس کے عہد کی معاشرت کا تذکرہ کیا ہے

۵۲ قریشی، عبدالرزاق

ایم اے او کالج علی گڑھ

(جامعه ۶۱ جولائی ۴۷۴-۴۸۱)

سر سید کے قائم کردہ ایم، اے، او کالج اور اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے

۵۳ نذیر احمد ڈاکٹر

فارسی کا مستقبل ہندوستان میں

(علی گڑھ میگزین ۶۱ - ۱۹۵۹ ص ۱۲-۲۷)

فارسی زبان کے تہذیبی اثرات اور ہندوستان میں اس کے مستقبل کے بارے میں رائے دی گئی ہے

۵۴ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر

انسانیت کا عروج و زوال - ۳

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۱۰۹-۱۴۴)

تاریخ و فلسفه کی روشنی میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے

ادب، تنقید، لسانیات

۵۵ ابو محمد سید علی سریر

اردو اداروں کا ارتقا - ۲

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ جولائی ۴-۵۹)

انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین،

ہندوستانی اکیڈمی، حلقہ ادبیہ کانپور، انجمن طلبہ مدرسہ اعظم، انجمن حمایت اسلام مدراس وغیرہ کا مختصر ذکر ہے

٥٦ احتشام حسین

اردو تحقیق و تنقید

(جامعہ ٦۱ ستمبر ٥٤٠-٥٤٤)

جدید اردو ادب کے تنقیدی اور تحقیقی سرمایہ کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری جدید ثقافتی زندگی سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے

٥٧ احراز نقوی

اردو صحافت کا پہلا محقق

(قومی زبان کراچی ٦۱ یکم و ۱٦ جولائی ۱۴-۱۸)

احترالدولہ اشرف نقوی مؤلف احتر شاہنشاہی کا تذکرہ ہے

٥٨ احراز نقوی

اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ

(سب رس، حیدرآباد ٦۱ اگست ۳-۷)

ماسٹر رامچندر کے رسالے خیر خواہِ ہند، دہلی کو اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ بتایا ہے

٥٩ احسن فاروقی ڈاکٹر

ادب کی تعلیم

(قومی زبان کراچی ٦۱ یکم اگست ۸-۱۱)

ادب کی حقیقت، اس کی تعلیم اور اسلوب تعلیم پر رائے پیش کی ہے

٦٠ احمد جمال پاشا

فنِ لطیفہ گوئی

(آجکل ٦۱ ستمبر ۳۲-۳۹)

لطیفہ گوئی کو فن کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے

٦۱ احمر رفاعی

ہادی مچھلی شہری اور ان کی شاعری

(جام نو کراچی ٦۱ دہ سالہ نمبر ٥۳-٦٥)

ہادی مچھلی شہری کی شاعری پر تبصرہ ہے

٦۲ اختر انصاری

کچھ اپنے قطعات کے بارے میں

(علی گڑھ میگزین ٦۱-۱۹٥۹، ص ۴۹-٥٦)

اپنے قطعات کی تاریخی اور ادبی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے

٦۳ اختر اورینوی

پرویز شاہدی کی فنکاری

(اشارہ ٦۱ اگست ۱۳-۱۸)

٦۴ اختر اورینوی

وجہی کا نظریۂ فن و نقد فن

(علی گڑھ میگزین ٦۱-۱۹٥۹، ص ۲۸-۳٦)

قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کی تحریروں سے اس کے فنی نظریات کا پتہ لگایا گیا ہے

٦٥ اختر حسن

ٹیگور کے حالات زندگی

(صبا ٦۱ مئی، جون ۹-۲۰)

٦٦ ا۔ د۔ نسیم

دلی (بارہویں صدی ہجری) کا

شاعرانہ ماحول
(اورینٹل کالج میگزین ٦١ فروری ۳۱-۴٦)

٦۷ ا-د- نسیم
دلی (بارہویں صدی ہجری) کا شاعرانہ ماحول
(اورینٹل کالج میگزین ٦١ مئی ۵۵-۹٦)

٦۸ اسرار احمد کریوی
حرفے چند (مسلسل)
(قومی زبان کراچی ٦١ یکم اگست ۲۵-۲٦)
ہمزہ کے استعمال پر بحث کی ہے

٦۹ اسرار احمد کریوی
حرفے چند
(قومی زبان کراچی ٦١ یکم و ١٦ جولائی ۱۲-۱۳)
یائے تحتانی کے لسانی استعمال سے بحث کی ہے

۷۰ اسلوب احمد انصاری
مکاتیب مہدی
(شاعر، بمبئی ٦١ خاص نمبر ۳۷-۴۳)
مہدی الافادی کی خطوط نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۷۱ اسیر عبداللہ جان
رحمان بابا رح
(ماہ نو کراچی ٦١ جولائی ۲۱-۲۴)
رحمان بابا رح کی شاعری کا تعارف پیش کیا ہے

۷۲ اطہر پرویز
ظفر کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر
(آجکل ٦١ جولائی ۳-۹)

۷۳ ام ہانی فخرالزماں ڈاکٹر
شاہ محمد ممتاز علی آہ امیٹھوی
(معارف ٦١ ستمبر ۲۰۸-۲۲۲)
حالات و شاعری پر تبصرہ مع انتخاب

۷۴ امین چند شرما
رباعیات امجد
(نوائے ادب، بمبئی ٦١ جولائی ۵-۱۵)
امجد کی رباعیات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۷۵ ایس-اے-رحمن، جسٹس
اکبر الہ آبادی
(ادب لطیف، لاہور ٦١ جولائی ۵-۸)
اکبر مزاحیہ ادب کی تطہیر میں امام کا درجہ رکھتے ہیں

۷٦ ایس-ایل-پنڈت
ٹیگور بحیثیت ڈراما نگار
(نیا شعور، ٦١ مئی ۲۳-۲۸)
ٹیگور کے ڈراموں کی تکنیک کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ٹیگور نے بنگالی ادبی نشاۃالثانیہ میں ڈراما کو ایک خاص منزل تک پہنچادیا ہے

۷۷ اے-اے-نامی، ڈاکٹر
اٹھارہویں صدی عیسوی کے انگریزی ڈراموں میں اردو گانوں اور الفاظ کا استعمال
(نوائے ادب، بمبئی ٦١ جولائی ۱-١٦)
«سفر بنگال» اور اس کے مصنف چارلس

اسمتھ کا تعارف کرایا ہے

۷۸ بشیرالنساء بیگم
ایران کی جدید شاعری
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ اگست ۸-۱۰)
ایران کی جدید شاعری کا سرسری جائزہ لیا ہے

۷۹ پرویز شاہدی
اردو ادب آزادی کے بعد
(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۱-۱۹)
ایک ریڈیو تقریر ہے جس میں آزادی کے بعد اردو ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے

۸۰ تبسم کاشمیری
پارسی الفنسٹن ڈرامیٹک کلب
(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۲۱-۲۵)
۱۸۸۳ ع میں پارسی الفنسٹن ڈرامیٹک کلب کی لاہور میں آمد اور اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالی ہے

۸۱ ت. چ. رستوگی طاہر
آسامی ادب
(شاعر بمبئی ۶۱ جولائی ۱۲-۳۱)
آسامی ادب کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا ہے.

۸۲ جاوید نہال
دہ مجلس یا کربل کتھا
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جولائی ۱۷-۱۹)
فضلی کی تصنیف دہ مجلس کا حال بیان کیا ہے.

۸۳ جاوید نہال
ایک قدیم داستان گو اور شاعر
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۴۱-۴۵)
مطہر علی خاں ولا کی داستان گوئی اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے.

۸۴ حسن مثنیٰ ندوی
بہار میں اردو
(اشارہ ۶۱ ستمبر ۴-۲۶)

۸۵ خاور عبد اللہ
خطوط غالب
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۴-۵۱)
غالب کے خطوط کے ہیئت اور مواد کا تجزیہ کیا ہے.

۸۶ خلیق احمد نظامی
دیوان حافظ
(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۱۴۷-۱۶۲)
دیوان حافظ کے مطبوعہ ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ ہے.

۸۷ خواجہ احمد فاروقی
حضرت جگر مرادآبادی
(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ۸-۸۲)
جگر کی شخصیت و فن پر ریڈیو کی ایک تقریر کا اقتباس ہے.

۸۸ ذکی الحق
شاد کا مسلک
(اشارہ ۶۱ ستمبر ۳۲-۳۶)
شاد عظیم آبادی کی شاعری اور مسلک پر روشنی ڈالی ہے.

۸۹ رائے جانکی پرشاد

بابائے اردو
(سب رس حیدرآباد ۶۱ ستمبر اکتوبر ۲۲-۲۳)
مولوی عبدالحق مرحوم کی شخصیت سے متعلق ذاتی تاثر پیش کیا ہے۔

۹۰ رفیق خاور
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۱۶-۲۱)
آزاد نظم کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۱ رفیق خاور
آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ اگست ۱۰-۱۴)
گذشتہ سے پیوستہ

۹۲ آزاد نظم کے سراغ میں
(ماہ نو ۶۱ ستمبر ۱۲-۱۳)
اردو میں آزاد نظم کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

۹۳ ریاض احمد
زرِ داغ دل
(ماہ نو ۶۱ جولائی ۹-۱۶)
عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کے مجموعہ «زرِ داغ دل» پر تبصرہ کیا ہے۔

۹۴ زیدی سید احمر
یگانہ کی خود نوشت
(علی گڑھ میگزین ۱۵۵-۱۶۴)
مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی ایک غیر مطبوعہ خود نوشت کی نشاندہی کرتے ہوئے چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔

۹۵ سخاوت مرزا
مثنوی مراۃ الحشر
(نوائے ادب، بمبئی ۶۱ جولائی ۲۶-۴۴)
مثنوی مراۃ الحشر اور اس کے مصنف سید محمد شراقی بیجا پوری رح کے متعلق تحقیقی مضمون۔

۹۶ سخاوت مرزا
میاں سید محمود مور مہدوی حیدرآبادی مرحوم
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۶-۱۱)
سید محمود مور کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۹۷ سردار جعفری
میر تقی میر کی شاعری
(شاعر، بمبئی ۶۱ خاص نمبر ۱۹-۲۸
میر کی شاعری پر تنقید کی ہے۔

۹۸ سعادت نظیر
جگر کا تغزل
(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ص ۵۶-۶
اردو غزل کی تاریخ اور اس کے و محاسن کے ساتھ جگر کے تغزل پر روش ڈالی ہے۔

۹۹ سلام سندیلوی
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۲۷-۱
اردو کا پہلا رباعی گو شاعر
محمد قلی قطب شاہ کی رباعی گوئی تذکرہ ہے۔

۱۰۰ سلطان احمد بہزاد

شاد و صفیر

(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۳۶-۳۸)

شاد عظیم آبادی اور صفیر بلگرامی کے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

۱۰۱ سلیمان ندوی سید

شعلۂ طور ۔ تعارف نووارد شاعر

(فروغ اردو ۶۱ جگر نمبر ص ۹-۱۴)

بڑے دلچسپ انداز میں جگر مرادآبادی کا تعارف کرایا ہے۔

۱۰۲ سید حسن پرویز

جگر کا فارسی کلام

(فروغ اردو ۔ جگر نمبر حصہ دوم ص ۱۵-۳۱)

جگر کی فارسی شاعری پر مبسوط مقالہ ہے۔

۱۰۳ سید عبد اللہ، ڈاکٹر

مراۃ الاصطلاح

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست ۱-۴)

فارسی کی مصطلحات کی تشریح سے متعلق رائے آنند رام مخلص کی کتاب مراۃ الاصطلاح کا متن (پہلی قسط صفحہ ۱-۴)

۱۰۴ سید عبد اللہ، ڈاکٹر

مثمر

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست ۱-۴)

اصول علم لغت سے متعلق خان آرزو کی تصنیف «مثمر» کا متن (پہلی قسط صفحہ ۱ - ۴)

۱۰۵ سیدہ اختر

نغمہ اور اہل عرب

(جام نو کراچی ۶۱ جولائی ۱۹-۲۲)

نغمہ کی ابتدا اور اہل عرب کی نغمہ پروری کا تذکرہ ہے۔

۱۰۶ سیدہ جعفر، ڈاکٹر

حسرت کی غزل

(شاعر بمبئی، خاص نمبر ۵۰-۵۴)

حسرت کی انفرادی آواز ان کی غزلوں میں گونجتی ہے اور عمر کے ساتھ تغزل مدھم ہوتا جاتا ہے۔

۱۰۷ سیدہ جعفر، ڈاکٹر

اردو نظم اور ہیئت

(نوائے ادب بمبئی ۶۱ جولائی ۵۰-۶۵)

آزاد نظم نگاری کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

۱۰۸ شمیر احمد خان غوری

چہار مقالہ کا سال تصنیف

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۵۵-۷۱)

نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف چہار مقالے کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

۱۰۹ شریف احمد

ٹیگور اور نیا ہندوستان

(نیا شعور، ٹیگور نمبر ۶۱ مئی ۶۰-۶۹)

ٹیگور کی ہمہ جہت شخصیت اور فنکارانہ عظمت پر تبصرہ کیا ہے۔

۱۱۰ شکیل الرحمان

رابندر ناتھ ٹیگور کا رومانوی ذہن

(نیا شعور، ٹیگور نمبر ۶۱ مئی ۲۹-۵۹)

ٹیگور کے رومانوی تصورات کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

۱۱۱ شہاب جعفری

جذبی

(علی گڑھ میگزین ۶۱ـ۱۹۵۹ ص ۱۱۱ـ۱۳۴)

معین احسن جذبی کی شاعری کا فنی تجزیہ کیا گیا ہے

۱۱۲ صابر شاہ آبادی

تنقید اور زندگی

(نگار ۶۱ ستمبر ۶۵ـ۶۹)

۱۱۳ صابر شاہ آبادی

غزل کی فنی و معنوی اہمیت

(شاعر، بمبئی، ۶۱ جولائی ۱۵ـ۱۹)

غزل کی فنی ومعنوی خصوصیتوں کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی اہمیت بتلائی ہے

۱۱۴ ضمیر علی بدایونی

خیالوں کے دھارے

(ماہ نو ۶۱ اگست ۱۵ـ۲۰)

ادب اور معاشرے کے تعلق پر اظہار خیال کیا ہے

۱۱۵ ضیا احمد بدایونی

عہد خاقانی کی چند جھلکیاں

(علی گڑھ، میگزین ۱۹۵۹ع تا ۱۹۶۱ع ص ۱ سے ۱۱)

ایران کے مشہور شاعر خاقانی شروانی کے کلام میں اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی حالت کے متعلق اشارے تلاش کئے گئے ہیں

۱۱۶ طلحہ رضوی برق

خاور بانکوٹی کی شاعری

(صبح امید ۶۱ جولائی ۶ـ۳۰)

رتناگیری (کوکن) کے قصبہ بانکوٹ کے ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ ہے

۱۱۷ ظفر عالم گیر

دکن کی قدیم اردو شاعری

(صبح نو پٹنہ ۶۱ آزادی نمبر ۲۰ـ۲۳)

دکن کی قدیم اردو شاعری پر تفصیلی تبصرہ ہے

۱۱۸ عابد حسین ڈاکٹر

ترکیبی ادب

(جامعہ ۶۱ اگست ۵۰۷ـ۵۱۱)

تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کی نوعیت پر ایک تقریر ہے

۱۱۹ عابد رضا بیدار

ادب کی رفتار سنہ ۱۹۶۰ ع

(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم اگست ۱۸ـ۲۱)

سنہ ۱۹۶۰ ع کی قابل ذکر اردو تحریروں کا ایک اشاریہ ہے

۱۲۰ عابد رضا بیدار

حسرت موہانی

(برہان ۶۱ جولائی ۴۱ـ۵۶ اگست ۴۹ـ۵۲ ستمبر ۴۵ـ۵۲)

حسرت کی شاعری اور دوسرے کارناموں کا تذکرہ

۱۲۱ عابدی، وزیرالحق

باغ دودر

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ اگست)

غالب کی فارسی امید باغ دودر کا باقی

متیں (صفحہ ۹۲ تا ۱۸۸)

۱۲۲ عتیق صدیقی
اردو مرثیہ کا تہذیبی مطالعہ
(نگار ٦١ ستمبر ١٧_٢٠)

۱۲۳ علاؤالدین حبیب
ٹیگور کا آرٹ
(سب رس ، حیدر آباد ، ٦١ جولائی ١٢_١٣)
ٹیگور ، بحیثیت مصور ، کا تعارف کرایا ہے

۱۲۴ علی جواد زیدی
مولانا آزاد کی نثر
(اشارہ ٦١ جولائی ١٧_١٩)
ابوالکلام آزاد کی نثر پر اظہار خیال کیا ہے

۱۲۵ علی عباس حسینی
جرم محمد آبادی
(صبح نو پٹنہ ٦١ آزادی نمبر ٣٤_٣٥)
علامہ آرزو کے شاگرد رشید حضرت جرم محمد آبادی کا تعارفی تذکرہ ہے

۱۲۶ عمیق حنفی
کالیداس
(شاعر بمبئی ، ٦١ خاص نمبر ٥٥_٥٩)
کالیداس کا تعارف کرایا ہے

۱۲۷ غمار یاور
شاعری میں اظہاریت
(جام نو کراچی ٦١ دہ سالہ نمبر ٣٣_٣٩)
اظہاریت کے مفہوم اور اس کی فنی اہمیت کو واضح کیا ہے

۱۲۸ غلام رسول
اردو املا نامہ پر ایک نظر
(معارف ٦١ اگست ١٤٣_١٥٠)
ترقی اردو بورڈ (پاکستان) کی متعلقہ تجویزات کے ساتھ مقالہ نگار نے اپنی تجویزیں بھی دی ہیں کہ تقابلی مطالعہ ہو سکے

۱۲۹ فصیل جعفری
شاہد صدیقی کی شاعری
(سب رس حیدر آباد ، ٦١ ، ستمبر و اکتوبر ١٢_١٦)
شاہد صدیقی کے کلام پر اجمالی تبصرہ کیا ہے

۱۳۰ قاضی عبدالودود
تیغ تیز
(فکر و نظر علی گڑھ ٦١ جولائی ٤٠_٥٤)
غالب کے نثری رسالہ تیغ تیز کا تحقیقی مطالعہ ہے

۱۳۱ قطب انسا بیگم ہاشمی
ایک صف ادب
(آج کل ٦١ جولائی ١٣_١٨)
سفر ناموں پر اظہار خیال کیا ہے

۱۳۲ گوپی چند نارنگ
سوامی مارہروی
(آجکل ٦١ ستمبر ٣_٨)
سوامی مارہروی اور ان کے گیتوں پر اظہار خیال کیا ہے

۱۳۳ لال چند بسمل
مسلم صوفی کا ہندی کلام اللہ نامہ

(نوائے ادب، بمبئی جولائی ۴۵۔۵۰)

«اللہ نامہ» پر تبصرہ کیا ہے

۱۳۴ مبارز الدین رفعت

مولانا شرر کی نظم «شب غم»

ایک ادبی تحریک

(شاعر، بمبئی ۶۱ خاص نمبر ۴۴۔۴۷)

مولانا عبدالحلیم شرر کی دو نظموں «شب غم» اور «شب وصل» کا تعارف کرایا ہے

۱۳۵ مجنوں گورکھپوری

ایک نقاد شاعر

(ادب لطیف، لاہور ۶۱ ستمبر ۷۔۱۰)

خورشید الاسلام کی ادبی صلاحیتوں پر تبصرہ کیا ہے

۱۳۶ محمد احمد صدیقی

تخیلات جگر

(جام نو کراچی ۶۱ جولائی ۱۱۔۳۵)

جگر مراد آبادی کے ذہنی ارتقا اور ان کے تغزل کے مختلف عناصر پر روشنی ڈالی ہے

۱۳۷ محمد حسن

جگر کی شاعری

(آج کل ۶۱ اگست ۳۔۶)

۱۳۸ محمد حسن ڈاکٹر

اردو شاعری میں ایہام گوئی

(فکر و نظر علی گڑھ ۶۱ جولائی ۱۳۔۳۹)

ایہام گوئی کی تشریح کے ساتھ اردو شاعری میں ایہام گوئی کی روایت پر روشنی ڈالی ہے

۱۳۹ محمد شفیع

ڈاکٹر شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ فروری ۱۹۔۳۰)

آزاد سے متعلق پرانے ریکارڈوں سے معلومات فراہم کی ہیں

۱۴۰ محمد عتیق صدیقی

ابوالکلام آزاد

(جامعہ ۶۱ اگست ۵۲۴۔۵۳۳)

ابوالکلام آزاد کے اخبار لسان الصدق کے پہلے شمارے کا جائزہ لیا ہے

۱۴۱ محمد عظیم فیروزآبادی

حسرت کا مزاج

(شاعر بمبئی خاص نمبر ۲۹۔۳۳)

حسرت کی شاعری، نجی اور سیاسی زندگی کی روشنی میں حسرت کے مزاج کا خاکہ کھینچا ہے

۱۴۲ محمد مجیب

غالب کے تین شعر

(جامعہ ۶۱ جولائی ۴۵۱۔۴۵۶)

غالب کے تین اشعار کی ایک خاص انداز میں توضیح و تشریح کی ہے

۱۴۳ محمود بیگ، مرزا

ادبی مقالہ

(جامعہ ۶۱ ستمبر ۵۷۸۔۵۸۲)

ادبی مقالہ کی تعریف، خصوصیات اور اقسام سے بحث کی ہے

۱۴۴ محی‌الدین احمد
مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں
(سب رس. حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۲۴-۲۵)
مولوی عبدالحق کی چند اخلاقی خوبیاں بیان کی ہیں

۱۴۵ محی‌الدین قادری زور
انشائے فضائل حالی
(سب رس، حیدرآباد ۶۱ ستمبر و اکتوبر ۳-۵)
کرنول کی ایک قدیم تاریخ کا تعارف کرایا ہے

۱۴۶ مختارالدین احمد، ڈاکٹر
شاہ حاتم کا فارسی دیوان
(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ع ۱۳۵-۱۵۴)
شاہ حاتم کے فارسی دیوان پر تاریخی و تحقیقی مقالہ ہے

۱۴۷ معین‌الدین دردائی
یاس بہاری
(صبح نو پٹنہ ۶۱ جولائی ۱۳ - ۱۶)
سید شـــاہ امین احمد فردوسی کے صاحبزادے حضرت یاس کا تذکرہ ہے

۱۴۸ منظورالحسن برکاتی
اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا پس منظر
(آجکل ۶۱ اگست ۲۷-۳۳)

۱۴۹ وفا راشدی
حـــیدرآباد میں اردو ادب کے چودہ سال
(جام نو کراچی ۶۱ دہ سالہ نمبر ۶۷-۷۲)
حیدرآباد سندھ میں ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۱ع تک کے اردو ادب کا جائزہ ہے

۱۵۰ نادم بلخی
مومن اور وہابی تحریک
(اشارہ ۶۱ اگست ۲۷-۳۴)

۱۵۱ ناظر کاکوروی
جگن ناتھ آزاد
(اشارہ ۶۱ جولائی ۱۶۱ - ۱۶۸)
جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور شاعری پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں

۱۵۲ ناہید نوا
شاعرِ شیریں نوا
(ماہ نو جولائی ۲۶-۲۹)
رحمان بابا رح سے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے ہیں

۱۵۳ نثار احمد فاروقی
جگر مرادآبادی
فروغ اردو ۶۱ جگر نمبر حصہ ۲ ص ۴۷-۵۵)
حضرت جگر کی شخصیت اور ان سے اپنے ذاتی مراسم کا تذکرہ کیا ہے

۱۵۴ ندوی شاہ معین‌الدین
شعلۂ طور
(فروغ اردو جگر نمبر حصہ دوم ۶۱ اگست و ستمبر)
ادبی نقوش سے ماخوذ ایک مبسوط تبصرہ ہے جس میں جگر کی غزلوں کے محاسن کا بیان کیا ہے

۱۵۵ ندوی عبدالسلام
اردو شاعری اور فن تنقید
(معارف ۶۱ جولائی ۳۲-۴۶، اگست ۱۲۰-۱۳۴
ستمبر ۱۹۴-۲۰۷)

تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۱۵۶ نذیر احمد ڈاکٹر

ملک قمی اور اسکے نثری رسالے

(اورینٹل کالج میگزین ۶۱ مئی ۱-۵۴)

فارسی کے مشہور نثار اور شاعر ظہوری کے خسر ملک قمی کے نثری رسالوں کا تعارف پیش کیا ہے

۱۵۷ نذیر محمد خان

اقبال اور تصوف

(سب رس، حیدرآباد ۶۱ جولائی ۳-۱۱)

افلاطون اور حافظ کے بر خلاف اقبال کے سارے فلسفے کا خمیر اسلامی تصور زندگی سے اٹھتا ہے

۱۵۸ نصیر اختر صدیقی

البرٹ کا میو اور اس کی ناول نگاری

(سب رس، حیدرآباد ۶۱ اگست ۱۲-۱۴)

فرانس کے مشہور ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ البرٹ کامیو کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا ہے

۱۵۹ نقی احمد ارشاد

مرثیہ اور موسیقار

(صبح نو پٹنہ ۶۱ جولائی ۸-۱۲)

فن مرثیہ خوانی میں موسیقی کی گنجائش پر زور دیتے ہوئے مشہور مرثیہ خواں میر علی، میر بندہ حسن اور میر علی حسن کا تذکرہ کیا ہے

۱۶۰ نیاز فتحپوری

جگر کی شاعری

(نگار ۶۱ اکتوبر ۱)

جگر کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے

۱۶۱ وارث کرمانی

ادب اور نظریہ

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۵۹ ۱۹ ص ۷۵-۸۸)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کو پس منظر بناکر ادب اور نظریہ کا رشتہ تلاش کیا ہے۔

۱۶۲ وزیر آغا، ڈاکٹر

پطرس کی مزاح نگاری

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۴۱-۴۸)

اردو میں مزاح نگاری کی تاریخ بتاتے ہوئے مزاح نگاری کا جائزہ لیا ہے۔

۱۶۳ وقار حسن

انیس سے قبل لکھنؤ کی مرثیہ گوئی

(علی گڑھ میگزین ۶۱-۱۹۵۹ ص ۸۹-۹۹)

میر انیس سے پہلے شمالی ہند کی مرثیہ نگاری کا جائزہ ہے۔

۱۶۴ ویریندر پرشاد سکسینہ

رائے گُردھر ناتھ بلی فراقی

(قومی زبان کراچی ۶۱ یکم و ۱۶ جولائی ۱۹-۲۰)

دریا باد بارہ بنکی کے ایک گمنام شاعر کا تذکرہ ہے۔

۱۶۵ ویریندر پرشاد سکسینہ

رتن ناتھ سرشار

(قومی زبان کراچی ٦١ یکم اگست ۲۲-۲۴)
فسانۂ آزاد کے مصنف سرشار کی حیات
اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔
١٦٦ ہاشمی فرید آبادی
اردو زبان کی حقیقت
(قومی زبان کراچی ٦١ یکم و ١٦ جولائی ٣٤-٣٨)
اردو زبان کی تاریخ اور اس کے
ماخذ پر روشنی ڈالی ہے۔

تعلیمات

١٦٧ امتیاز علی عرشی
آداب المتعلمیں اور طوسی
(فکر و نظر علی گڑھ ٦١ جولائی ١-١٢)
تقابلی مطالعہ کرکے ثابت کیا گیا ہے
کہ نہ تو یہ کتاب محقق طوسی کی تصنیف
ہے اور نہ تعلیم المتعلم کا خلاصہ۔
١٦٨ محمد ریاض گھلوی
اقبال کا نظریۂ تعلیم و تربیت
(عارف لاہور ٦١ ستمبر ٢٥-٣٢)
اقبال کے نظریۂ تعلیم و تربیت کی
وضاحت کی ہے۔
١٦٩ محمد سلیمان
اصول تعلیم ، آداب درس و تدریس
از افادات علامہ محمد بن ابراہیم
کفائی (٦٣٩-٧٣٢)
(فاران ٦١ جولائی ٢٠-٣٣)

متفرقات

١٧٠ ایم۔ ایم۔ شریف (مصنف)
انوار حسین (مترجم)
فلسفۂ لذت کا اثر مغربی اقتصادیات
پر
(ثقافت ٦١ ستمبر ٦-٢٥)
١٧١ ڈار بشیر احمد
ہندی فلسفہ
(ثقافت ٦١ اگست ٨-٢٥)
١٧٢ قریشی اللہ بخش
عورت اور مرد کی مساوات
(فیض الاسلام راولپنڈی ٦١ ستمبر ٢٣-٢٩)
اسلامی و معاشی نکتۂ نظر سے عورت
اور مرد کی مساوات پر اظہار خیال کیا
ہے۔
١٧٣ محمد ہاشم سید
آزاد جنسی اختلاط
(فاران ٦١ اگست ٢٥-٣٢)
١٧٤ معین الظفر ، ڈاکٹر
ارسطو کے سیاسی نظریات
(فکر و نظر علی گڑھ ٦١ جولائی ٧٢-١٠٨)
یونان کے مشہور فلسفی ارسطو کی
زندگی اور اس کے سیاسی افکار سے
بحث کی ہے۔

نوائے ادب بمبئی

شمارہ ۲	اپریل ۱۹۶۲ ع	جلد ۱۳

شذرات

اگر یہ صحیح ہے کہ «سالے کہ نکوست از بہارش پید است» تو ہم کو خوش ہونا چاہئیے کہ یہ سال اردو ادب اور ادیبوں کے لئے انشاء اللہ بہت مبارک سال ہوگا۔ اگر ایک طرف حکومت نے اردو کے دو دیرینہ ادیبوں کو معزز خطاب (پدما بھوشن) سے نوازا تو دوسری طرف ساہتیہ اکادمی نے اردو کے ایک مستند محقق و نقاد کی تازہ ترین تالیف کو اپنے گراں قدر انعام کے ذریعہ ان کا وہ حق ادا کیا جس کے وہ عرصہ سے مستحق تھے۔

جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جناب نیاز فتح پوری وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے تقریباً نصف صدی سے اپنے رشحات قلم سے گلستان ادب کی آبیاری ہی نہیں کی ہے بلکہ اس چمن کو نئے تختوں اور روشوں سے سجا کر اس کی زیبائش و آرائش اور قیمت و افادیت کو اور بڑھادیا ہے

مولانا امتیاز علی عرشی ان خاموش کام کرنے والوں میں ہیں جو اخبار و رسائل کے صفحات پر تو بہت کم نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے عربی، فارسی، اردو کی مختلف کتابوں کے عالمانہ ترتیب و تحشیہ کے ذریعہ اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کرلیا ہے وہ ہندی سے بھی غافل نہیں اور شاہ عالم ثانی کے ہندی کلام کو اڈٹ کرکے اس مجلس میں بھی اپنی جگہ پیدا کرلی ہے

ان کا ترتیب دیا ہوا غالب کا یہ دیوان ہم کو نہ صرف غالب کے موجودہ منتخب دیوان کا اچھا اڈیشن پیش کرتا ہے بلکہ اس میں وہ کلام بھی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں موجود تھا اور اس کے علاوہ وہ بھی جو غالب نے نسخہ حمیدیہ کی ترتیب کے وقت شائد نظر انداز کردیا تھا پھر مولانا عرشی کا محققانہ دیباچہ، فکر را شرح اور معلومات بخش حواشی کے لحاظ سے، اس سلسلہ میں جو کام بھی ہوا ہے اس میں سب سے زیادہ ممتاز اور غیرفانی کارنامہ ہے۔ مولانا عرشی اپنے بلند مقام کی وجہ سے وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم ارضی انسانوں کا گذر بہت مشکل ہے۔

اس سلسلہ میں ہم کو اردو زبان کے کہنہ مشق، انسان دوست، وطن پرست، شاعر و معلم پروفیسر تلوک چند محروم کا بھی ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے اردو

شاعری کے دامن کو وسیع کرنے اور اس کو نئے نئے رنگ کے پھولوں سے بھرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اقتضا یہ تھا کہ ملک و حکومت ان کی خدمات کا عملی ثبوت پیش کرے. اردو دوستوں کی طرف سے تو اس کا اظہار ان عقیدت مندانہ اجتماعوں سے ہوتا رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن اب حکومت پنجاب نے خلعت و انعام کے ذریعہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے.

اردو کے ان فضلا کے ساتھ ہی ساتھ ہم جناب آصف علی اصغر علی فیضی صاحب کو بھی مبارکباد دیتے ہیں کہ حکومت نے ان کی عربی و قانونی تصانیف و تالیفات اور تعلیمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو بھی « پدما بھوشن » کے خطاب سے سرفراز کیا ہے جو لوگ ان کو جانتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اردو زبان سے ان کو بہت لگاؤ ہے چنانچہ خود مولانا عرشی نے دیوان غالب کے انتساب میں لکھا ہے کہ یہ فیضی صاحب کی پرخلوص فرمائش اور پیہم اصرار تھا جس نے ان کو اس کام پر آمادہ کیا ان کی علمی خدمات کے اعتراف ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جا رہے ہیں اور ان کی یہ عزت افزائی ہمارے لئے باعث فخر و مسرت ہے

ہم ان پانچوں بزرگوں کو پر خلوص دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ان کو گرانمایہ خدمات کے لئے عرصہ دراز تک عملی حیثیت سے جوان اور صحت و سکون کے ساتھ سلامت رکھے . آمین

اردو کے سلسلہ میں ایک خوش آیند حقیقت یہ بھی ہے کہ ادھر چند برسوں سے مختلف جامعوں کے اساتذہ اور ان کے تربیت یافتہ رفقائے کار نے اردو کے اہم موضوعات پر اہم کام شروع کئے ہیں کشمیر سے لے کر میسور و مدراس تک اور پنجاب سے لے کر مشرقی بنگال تک میں علمی و تحقیقاتی حیثیت سے قابل قدر کام ہورہا ہے ایک طرف نایاب تذکروں کی اشاعت ہورہی ہے تو دوسری طرف نایاب کتابوں کو اڈٹ کرکے شائع کیا جارہا ہے ، کچھ لوگ قدیم دکنی ادب کی ترتیب و اشاعت میں مصروف ہیں تو کچھ اردو ادب و زبان کی علاقائی تاریخیں ترتیب دے رہے ہیں . پھر ایک وہ باہوش و باخبر جماعت بھی ہے جو تمام کاموں

کا تعمیری جائزہ لیتی رہتی ہے۔ اگر یہی ذوق و شوق اور یہی دلبستگی باقی رہی تو انشاءاللہ اردو ادب کا سرمایہ بہت جلد وزنی و وقیع ہوجائے گا۔

ادھر انجمن ترقی اردو (ہند) نے بھی اردو زبان و ادب کی ترویج کی طرف عملی قدم بڑھایا ہے۔ اردو کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں املاء و اعراب کے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وقتاً فوقتاً انفرادی اور اجتماعی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی، چنانچہ عرصہ ہوا خود انجمن نے اپنے عہد قدیم میں اس سلسلہ میں ایک تجویز پر عمل کرنا شروع کردیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد خود انجمن کی کتابوں میں سے بھی وہ نظر انداز کردی گئی تھی، لیکن آج کل اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے اس کو سوچنا شروع کیا ہے اور اسی نئی رو سے متاثر ہوکر انجمن نے ایک کمیٹی اس سلسلہ پر از سر نو غور کرنے کے لئے بنائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کمیٹی ایسے اصول مرتب کرے گی جو اردو کے لکھنے پڑھنے اور چھاپنے کے سلسلہ میں زیادہ آسانی اور کم سے کم رکاوٹ پیدا کریں گے۔

گذشتہ شمارہ میں ہم ڈاکٹر محمد حفیظ سید کے انتقال کی خبر دے چکے ہیں۔ خاکسار کو ان کی خدمت میں تیس بتیس سال سے نیاز حاصل تھا اور نیازمندی کے صرف دو اسباب تھے۔ ایک ان کی بزرگانہ شفقت اور دوسرے اردو سے ان کی بے پایاں محبت۔ ادارہ کے قیام کے وقت ہی سے ان کو اس سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس کا زندہ ثبوت دو ہزار کی وہ رقم ہے جو انھوں نے اپنے وصیت نامہ میں ادارہ کے لئے چھوڑی ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ اس رقم کو کسی ایسے کام میں صرف کریں جس سے ایک طرف ان کی یادگار باقی رہے اور دوسری طرف زبان و ادب کے شوقین اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھا سکیں

* قاضی عبدالودود

محرق قاطع برہان

صفحہ ۱، ومن یضلل‌الله فماله من ہاد. الحمدلله که کتاب لاجواب ہدایت انتساب باسناد شعرائے اہل زبان ایران المسمّٰی به «محرق قاطع برہان [1] ۱۲۸۰» تصنیف منیف جناب [2] سید سعادت علی صاحب بجواب قاطع برہاں رقمزدۂ مرزا اسدالله غالب، در مطبع حیدری دلہائی (کذا) طبع شد صفحہ ۲، میں بعد بسم الله الخ. ۱۱ سطریں ہیں، (مسطر ۱۹ سطری) حاشیے میں بعض الفاظ کے معانی درج ہیں (ازاں جملہ درگاہ = حضرت) سطر ۱ یہ ہے: «آدم ناچیز ذرہ مانند که بتاب مہر عنایت ذرہ نوازی چیز گشت چه تواند که سپاس آلاء»

۱ غالب نے محرق قاطع برہاں کے خلاف دو رسالے لکھے، ایک کا کوئی نام نہیں، اور عبدالکریم کی طرف منسوب ہے، عبدالکریم یا تو وجود خارجی سے محروم ہے، یا بالکل مجہول الاحوال شخص ہے. دوسرا لطائف غیبی ہے جسے انہوں نے میاں داد خاں، سیاح کی طرف سے تحریر کیا ہے.

۲ لطائف غیبی میں ہے «منشی سعادت علی نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ، کسی گاؤں میں کسی گھاٹ پر، کسی بات پر ان کا نام کسی سے نہیں سنا» ص ۲ غالب نے سعادت علی کو «سر رشتہ دار معزول» لکھا ہے. تیغ تیز مصنفہ ۱۸۶۰ع میں یہ عبارت ملتی ہے «میں تم کو صاحب محرق کا مقلد کہہ سکتا ہوں، اس شخص کو مجھ سے جامع برہاں کی محبت کے سبب سے عداوت شدید ہو گئی تھی کیا عجب ہے کہ اس نے تم کو ڈھونڈ نکالا ہو، اور عرائض عجز آمیز، حشم انگیز متواتر لکھ کر مجھ پر برسر قہر لایا ہو. وہ تھا کوڑیالا (کوڑیالا سانپ بھی ہوتا ہے، اور اسی کی رعایت سے یہ لفظ آیا ہے)، یعنی مالدار. بھلا اگر دستمرد تحریر نہیں، نہ سہی صرف مطبع و کاغذ اپنے بیت المال خاص سے بھجوا دیا ہوگا. خیر، اب منشی جی کے واسطے دعائے تخفیف عذاب.. مانگتا رہوںگا» ص ۲۷. ان کا علمی و ادبی مرتبہ پست ہو یا بلند، سماج کے باعزت لوگوں میں ان کا شمار ہوگا، اور یہ ہرگز گمنام محض نہ ہوںگے انہوں نے اجمیر میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جس کی تاریخ سبد چین اور باغ دو در دونوں میں موجود ہے. انہیں «معزول» کہنا بھی صحیح نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ محرق قاطع برہان کی تحریر کے وقت اپنے عہدے سے علحدہ ہوچکے ہوں یہ بات کہ صاحب موید برہان (تیغ تیز اس کا جواب ہے) کو سعادت علی کا «صرف مطبع و کاغذ» بھیجنا کہیں سے ثابت نہیں، بلکہ اس کی مطلقاً شہادت موجود نہیں که دونوں میں کسی قسم کا تعلق تھا. قاطع القاطع (رد قاطع برہان) کے مصنف کی طرف البتہ محرق میں اشارہ ہے ص ۶۴ تیغ تیز کی عبارت منقولہ امر پر مشعر ہے کہ اس کے سپرد قلم ہونے سے قبل، سعادت علی کی وفات ہوچکی تھی

* قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنہ

تمہید مصنف کی عبارات ذیل قابل توجہ ہیں:

« پیش ازیں چند سالی[۱] کتابی مسمّٰی بحدائق العجائب[۲] بتقدیم لغات ہندی مستعملۂ زبان اردو و تاخیر لغات فارسی و عربی ہم معنی لغات ہندی مذکورہ مندرجۂ کتاب برہان قاطع، و فرہنگ رشیدی، و غیاث اللغات، و شمس اللغات وغیرہ فارسی، و صراح، و قاموس، وغیرہ عربی تالیف کردہ بودم (ص ۲). اکنوں شنفتم کہ مرزا اسد اللہ غالب بکمال استعداد نظم و نثر و وفور اخلاق کہ از مبدء فیاض عطا شدہ، نظیری ندارند، رسالہ باعتراض نادرست بودن لغات فارسی مرقومۂ کتاب برہان قاطع نگاشتہ اند... پشیمان گشتم کہ چرا ایں قدر عرق ریزی در انتخاب لغات از برہان قاطع و تالیف ایں کتاب کردم. چوں آں رسالہ بردم رسید، دیدم کہ دو صد و ہشتاد و چہار لغت اعتراض کردۂ مرزا... دریں ممقوشند. اکنوں خرد مندان... داوری فرمایند کہ در اکثر کتب لغت زیادہ از پنج یا شش ہزار لغت نمی باشد، و در برہان قاطع ہژدہ ہزار و ہشت صد و ہشتاد ہفت لغت و در ملحقات آں سہ ہزار و چہار صد و سی و پنج لغت... اند... احدی از فرہنگ نویساں چنیں عرقریزی در ترتیب نکردیدہ، اگر سہو و غلط... سرزدہ باشد... جای طعنہ و سرزنش نیست. ہرگاہ کہ ایں نگارندہ لغات نادرست شمردۂ مرزا... در تالیف خویش پژوہید بیست و چہار لغت ازاں جملہ برآمدند... تصدیق و تصحیحش بدوں از کتب لغت مندرجہ اشعار اسناد اساتذہ سخنوران اہل زباں مناسب نداستم. فرہنگ رشیدی و فرہنگ جہانگیری و مدار الافاضل و موید الفضلا و بہار عجم را نگریستم. اسناد تحریر لغات صاحب برہان قاطع و اجتہاد در رقم اعتراض مرزا... ہویدا گشت، دانستم کہ مرزا... کہ نام رسالہ را قاطع برہان کردہ ازیں قبیلست کہ ع برعکس نہند (ص ۳) نام زنگی کافور... خواستم کہ ازیں اوراق... را خاتمۂ... حدائق العجائب سازم مگر ایں اوراق کہ بہ آگاہی اندفاع اعتراضہا و صحاح لغات برہان قاطع

۱ عرق مطبوعہ میں ”سالی“ لیکن کسی نے ”سال“ بنانے کی کوشش کی ہے۔ رسالۂ عبد الکریم میں ”سالی“ پر اعتراض ہے۔

۲ کوئی غالب شناس اس کتاب سے واقفیت کا مدعی نہیں۔ خبر نہیں کہ چھپی بھی تھی یا نہیں۔

مندرجۂ حدائق العجائب انـد ، گویا بمنزلۂ معرّف . . . اند ، لهذا ایں اوراق راٰ مسمٰی به محرق قاطع برہان کردہ ، دیباچۂ نخستین کتاب پنداشته ، اول از دو دیباچۂ آں کتاب جادادہ ام ، و خاتمۂ دگر بستم ، و ترتیب رقم پاسخها بروش ترتیب رسالۂ مرزا . . . کردہ شدہ که سر آغاز لغت مع تعبیرش . . . برہان قاطع ، و سر آغاز اعتراض که قاطع برہاں و تسمیه و فائدہ است براں لفظ قوله اضافه ساخته بعدش بر سر پاسخ اعتراض لفظ اقول نگاشتم ، و از بیست و چهار لغت در لغت نخستیں افسوس را در ضمن پاسخ اعتراض ساختم ، دوم فراز را در ضمن جواب اعتراض آنچیں نوشته ام (ص ۴) »

ذیل میں محرق کے مختلف مقامات سے اس کی کچھ عبارات نقل کیے جاتے ہیں . غالب نے لکھا ہے که جامن ایران میں نہیں ہوتی ، اس کی فارسی کہاں سے آگئی ، اس کا جواب یه ہے :

« افمشه[1] ار ولایت انگریزاں . . . می آید ، ہندیاں یک قسم جامه را بیں سکھ و قسم دیگر را لٹھ گویند ، حال آنکه ہر دو جامه در ہند نمی باشد ، و بیں سکھ و لٹھ انگریزی ہم بیست . . . باغبانی بوتۂ درخت آوردہ در صحن خانۂ ما نشاند ، گفتم چیست ، گفت درخت انگریز است ، نام ایں گل فانوس . گفتم نام انگریزی چیست . گفت ما گل فانوس میگوییم دگر ہیچ . . . واقعی گلش بنقش گلهای که در فانوس شیشۂ انگریزی می شود مانا شد . بہمیں روش اہل ہر ولایت چیزہای آمدۂ دیگر ولایت را نامی بمناسبتی میدارند » ص ۱۰ .

غالب نے وا اسفا کو افسوس سے مستخرج بتایا ہے ، اس کے باب میں صاحب محرق نے لکھا ہے :

مبدء فیاض ایں صنعت بخاص قالۂ فکر « طبع سلیم[2] غلط مپسند جز براستی

۱　جامن کی فارسی آلوسیه بتائی گئی ہے . محرق کے جواب میں لطائف غیبی میں صرف یه مرقوم ہے که ,, یوں کا پته دے کر منشی جی جامن کھانے چلے گئے . اور آلوسیه کا جھگڑا نکالا ، ہم کو آلوسیه میں الوسیه کی صورت نظر آئی ، مرجھر و متنفر ہوکر بھاگا ،، ص ۱۱

۲　یه الفاظ غالب کے ہیں ، اپنے متعلق . قاطع برہاں ص ۸۰

مپیوند» مرزا[1] ... عطا شد که سه لفظ تازی توام کهٔ یک ازان با سراپا یعنی مع وا حرف ندبه و الف مد صوت هست از بطن یک لفظ پارسی جامد استخراج کرده، و شور زمزمهٔ زاج سور این عجیب الخلقت در گوش رہروان وادی گفتار ایجاد زبدانی انداختـه. حیرانم که مرزا ... بیان مولود شریف لغات عجائب المخلوقات کرده، یا اظهار اصغاث احلام حود فرموده.

بہرحال این تعبیر مرزا ... بمثابهٔ این شعر است:

پہلے توروغن گل بھینس کے انڈے سے نکال ٭ پھردوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال» ص ۱۹

تو من (تمن) کی بحث میں ہے:

یاد دارم ہنگامی که میر منشی دفتر فارسی محکمۂ عالیه صاحب انتظـام کل امور ... متعلقهٔ ... راجستـان بودم کاغذات از قصبهٔ جادو ... مضاف گوالیار معرفت محکمه نیمچھ می‌آمدند، در آن جای لفظ تحصیلدار تمندار نگاشته میشد، نه معلوم که چندین ده تحت وی بودند و پیش ازیں در فوج بادشاه دہلی در یکهزار پیاده ده تمن صد صد کس می بودند و افسر صد کس را تمدارمینامند ... تومن ... ترکیست ده ست را گویند ہرچه باشد و در محاورهٔ ہر ملک تمن بمعانی مختلف مستعملست و تومان در ملک روم نام زر مسکوک و بدانست خاکسار ... در آن ده که تمندار قیام داشته‌باشد، آن راتمن گفتـه باشند ازروی مجاز. ص ۳۷

بحث جمدھر میں ہے:

ہمه کسان بل ہمه اطفال دہلی که بریسمان بادفر میپرانند و بران بادفر نقش برینصورت که برحاشیه نگاشته ام از کاغذ رنگین تراشیده میچسپانند و آن بادفر را کٹار دار جمدھر نیز گویندو. ورای این تحریر حکایت و کمت و دوہره بیان کردهٔ پندت دامودردت باشنده ںلبگڈھ اکنون قیام پذیر دہلی بوجه ثبوت اتحاد مصداق کٹار و جمدھر بقلم می‌آرم که ظالم سنگھ قرابتـدار راجه اجیت سنگھ جداجد راجه ناہر سنگھ رئیس بلب گڈھ مہلوک بجرم سرکار انگریزی پیش از ہفتاد و دو سال بر ہانیدن بہرهٔ زمین از راجه

---

۱ اس مقالے میں جہاں بھی مرزا کے بعد نقطے ہیں «مرزا» کے بعد «اسد الله غالب» مرقوم ہے لطائف ص ۴ میں اس کی شکایت ہے: «آدھا نام لکھتے ہیں یعنی «مرزا اسد الله غالب» ہائے فردوسی ... کیا خوب لکھتا ہے: «چون اندر تبارش بزرگی نبود نیارست نام بزرگان شنود»

اجیت سنگھ متقاضی بر روڑجی سیندھیہ گشت ، سیندھیہ مذکور کہ مہربانی بحال راجہ احیت سنگھ داشت خواست کہ از خشم لفظ کوار (کذا) نسبت ظالم سنگھ از زبان بر آرد ، ظالم سنگھ بی اتمام لفظ کوار از کٹار کار سیندھیہ و راجہ اجیت سنگھ ساخت کہ کبت و دوہرہ سریں دالست

کبت : پت [1] جاتی پرتیت جاتی کُل بُوکی ریت حاتی ہمت حاتی کدر جاتی سبھی یا نام دھاری کی . بانکوں میں مانک حاتی امینڈوں میں مینڈ جاتی دکھن میں ساکھ حاتی ہند کی کٹاری کی . کہیں ہر نام حائے گنگاکے پرتنگا نہ ہوتی تو حد جاتی حالم سنگھ کھش کراری کی . حابی ایسی دل میں کٹاری موٹھ چلتی تو دل کی بینٹھ حاتی بیچ پن مالی کے .

دوہرہ ، [2] : اون گنگا مکھ سے کہا ان کھیچی جمدھار
وار کتھی پایا نہیں ان کر دینی پار

پس ازیں (ص ۴۱) ••• احقر العماد ار پندت ہری چند عمرش دراز ماد کہ در علم شاستر و سنسکرت و دیگر علوم ہندیہ نظیر حود در ینجا ندارد ، پرسید کہ لفظ جم چہ معنی دارد ، گفت کہ « چیزی ناگوار و شخصی ناگوار و سخت مزاج و حاکم جابر و بیرحم را گویند » . گفتم کہ بعض میگویند کہ جم در سنسکرت عزرائیل راگویند ••• گفت ،ی نی ، مگر بمناسبت معانی مذکورہ تواں گفت ، دگر گفت کہ جم نخست در زبان شاستریم ••• بود بکثرت استعمال و تغیر لہجۂ مردم عوام جم گفتن آغازید ••• ویم در شاستر بمعنی اثنین است کہ آن راجم نیز خوانند . باز پرسیدم کہ لفظ دھر کہ در جمدھر است و آن راکٹار نیز گویند چہ زبانست ، گفت دھر مخفف دھار است ، بس بوادید جم (ص ۴۳) بمعنی چیزی ناگوار ، جم دھار بمعنی بسیاربد دھار است ، و بوادیدجم بمعنی اثنین ••• جمدھار بمعنی دو دھارہ این وجہ اقرب مطلوبست ••• دکر [3] مقوش خاطر

---

(۱) و (۲) مطابق اصل ، میں صحت متن کا ضامن نہیں . بہت سی فارسی عبارتیں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں ، یہ بھی مطابق اصل نقل ہوتی ہیں

(۳) ,, دگر ,, سے ,, تصحیف دلدان عزرائیل ,, تک نسخہ کتبخانہ خدابخش کے حاشیے میں ہاتھ سے لکھا ہوا ہے ، میں جاننا چاہتا ہوں کہ دوسرے نسخوں کا کیا حال ہے .

نگرندگان این صفحه میکنم کـه حکیم حسین تبریزی نه جم راعزرائیل، نه دهر را دندان نشته که مرزا اسد الله غالبؔ بردندان عزرائیل اعتراض کرده بل بمشابهت جمدهر باباب که دندان نشتر است، جمدهر را دانت نگاشت و به نبودن جان بری رخمی جمدهر آن را دانت عزرائیل گمت چه درآن زمان بزبان بندی آن ملک جمدهر را دانت عزرائیل گفته باشند از تصحیف دندان عزرائیل ص ۴۴.

لطائف ص ۳ کی عبارت دیل غالباً محرق کی عبارت ہذا کے جواب میں ہے: «منشی حی [1] اپنے نزدیک بہت دور ہیں لکین اقتضای المرء یقیس، علی نفسه، سے مجبور ہیں، جس طرح منشی حی پر استاد سے فتح باب ہوا ہے جانتے ہیں کہ ہر شاگرد اپنے استاد سے اسی طرح فیضیاب ہوا ہے»

اگر برد مرزا ... بتعلیم ہرمزد ... وراواں کمال و دانش آمرزگار از دوارده تا چهارده سالگی زیر شدن درست و پسند است، صاحب برہان قاطع آن ہم نوشته کـه فکانـه ... بکسرهٔ کاف عربی ہم آمده ... مرزا ... ہنگام شوق وفور اعتراض تا آخر عبارت ماسد عامل «لاتقربو الصلٰواة» پیش ندیدند، اگر میدیدند (کذا) زیر وزبر راہم میدیدند ص ۵۴.

شورامه [2] شورطعم ذائقه وہم عوغاست و امه بالف و میم وہای ہوز بمعنی دوات و توده و پشته است ص ۶۳.

ایک جگه غالب کے لئے ایک نسخه تجویز کیا ہے، اور حکیم محمود خاں کی طرف رجوع کرنے کا مشوره دیا ہے:

«مرزا ... غالب باروا دل رامیسوزاند، و برائے رفع سوزش دل ... نسخهٔ عجیب سریع التا ثیر محور است که قرص کاهور عجب و پندارنکردن خود بین خود پسند نبودن برگروه دیگر رشک و حسد نبردن صندل شکیبائی و تحمل و بردباری و شربت اناریں شیریں زبانی و ترش کلام نکردن ہر روز صبح و شام استعمال فرمایند ....و وصد اسلیق بسما یشهای خویش بیک کار دیگر راسد نسبت نکردن ہمراه عرقی

(۱) میں نے عبدالصمد پر جو مضمون لکھا ہے اس کی تحریر کے وقت محرق موجود نه تھی، اس کے چند اقتباسات تھے، جن میں ,,اگر برد الخ'' نه تھا.

(۲) شورامه مستعملهٔ غالب، عبارت محرق حاشیه محرق میں ہے لطائف میں اس پر اعتراض ہے که شورامه کو شورابه سمجھے. میں نے اگر کہیں یه لکھا ہے که صاحب محرق نے اس لفظ کو غلط کہا ہے اور سند مانگی ہے تو یه ٹھیک نہیں غالباً صاحب موید برہان نے اسے غلط کہا ہے میں نے کسی فرہنگ میں اسے نہیں دیکھا

در ابتدا ہم درست مگر بنظر پیری و نقاہت ۰۰۰ و نیز بایکہ این مرض از پنجاہ و دو سالست اخراج خون ۰۰۰ پس ازیں قدر مدت کہ یبوست لازم ایچنیں سوزشست سب زیادتی یبوست گردد، بہتراینست کہ . . . پیش حکیم محمود خان[۱] کہ مسیح زماں خود ... اند، اظہار ایں مرض فرمایند و آنچہ حکیم محمود حاں ... رقم رنند، یا تحویز ماءالجس کند، ہماں نمایند ص ۶۵

عبارت ذیل عبدالصمد والے مضمون میں میں سے نقل کی ہے۔

«مرزا دو سال در عمر سیزدہ و چہاردہ سالگی در میوہ حوردن و کلاہ زردوری کج نہادن روبروی ہرمزد ... گررانیدہ باشد و سوای چند الفاظ پارسی غیر مشہور کہ وی ہمیں دانستہ باشد، بیاموحتہ، و اگر باور کنم کہ وی زباندان و عالم پارسی بود تا ہم بچۂ سیزدہ و چہاردہ سالہ بجز حور و پوش بدیگر امور علم افزای حرد و ہوش کے می پردارد و استعداد فارسی و سخنوری کے پیدا کردن می تواند۔ مرزا ... ہرچہ می حواہد از راست و ناراست بحوالۂ آموزگار مذکور می گوید و حاشا ثم حاشا می حواند۔» ص ۶۸

۲۲ فصول کا خاتمہ ص ۸۶ میں ہوتا ہے اور اسی صفحہ سے خاتمے کا آغاز ہے، خاتمہ مشتمل «بر دو لطف ویک قبح» لطف اول میں غالب کے تین اصولی اعتراضوں کے جواب ہیں۔ (۱) مشتقات کا مصدر پر تقدم (۲) لغات مشہورہ کا اندراج (۳) ایک لغت کی ایک سے زیادہ شکل۔ لطف دوم میں فرہنگ جہانگیری[۲] و فرہنگ رشیدی کے ماخذ کے نام ہیں قبح میں غالب کے وہ قبیح[۳] الفاظ درج ہیں جو انھوں نے صاحب برہان قاطع کے حق میں استعمال کئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: «چادر را گذاشتن و مادر را آوردن بیحیائیست» «این مرد در ژاژ خوانی ہمتا ندارد» «عامی اعمیٰ» «کفش آورد کہ ہمیں را درخوراست» (غالب

(۱) لطائف میں اس پر یہ اعتراض ہے کہ ایک خاص طبیب کا نام اس جگہ کیوں لکھا

(۲) اس میں بہت سی ایرانیوں کی فرہنگیں بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غالب نے لطائف میں یہ دعوی کیا کہ کسی زمانے میں کسی ایرانی نے فرہنگ نہیں لکھی، سب فرہنگیں ہندوستانیوں کی مولفہ ہیں۔ یہ بات جس کا اعادہ قاطع برہان اشاعت ۲ میں بھی ہے، لطائف سے قبل ان کے قلم سے نہیں نکلی

(۳) محرق میں سب جمع نہیں کئے

نے بجائے است « دانست » لکھا ہے). « ہیچ کس نمیبیند که از دہان این کس چه فرو میریزد» (اس سے قبل بول و غائط ، کا ذکر ہے) « چغد ...ویرانه و غول...بیابان.. » « به (؛ با ، غالب) کدام خرس در جدال شده ام » « بعد از دغدغۂ رفع ایلاوس میگوید » («رفع دعدغۂ ، غالب) « آیا کسی از غمخواراں .. نبود که ہرگاه این بیچاره آہنگ نوشتن برہان قاطع کرد ، و آن مقدمۂ جنون بود ، حون خرس بگلو می ریخت ، و ببیی میدمید و بکف پای میمالید ، تا از رنج سودا میرست و لب از ہذیان می بست » « دکنی سوحتی» « دکنی ... اینحا واژگوں خفت » « اگر تمسحر بیست حںوں حوابد بود » « نزد جمہور کلام فحش و منکر بدتر ار حبس و قتال و صرب وغیره است ... عـــلاوه ازیں الغیبة اشد من الزنا ، ورای بد گفتن زندہا مرده ہا ہم ممنوع ... است که حدیث ... بدیں داست ، اذکرو محاسن موتا کم و کفو عن مسا ویہم ... نه معلوم که مرزا ... با وجود ادعای حود باسلام خلاف قرآن و حدیث ... و قانون عیسائیاں و شاستران ہندواں و تورۂ حاکماں بکه رہبر و از که مذہب و ملت احد کرده ». اس کے بعد لکھا ہے که محمد حسین قیامت میں داد خواہ ہوگا ، اور بطور سزا غالب کے اعمال میں سے وہ حو پسند آئینگے محمد حسین کے اعمال قرار دئے حائینگے [1] « والا آنچه شد نیست خواہد شد »

خاتمے کے آخر میں یه عبارات ہیں « قد حصل الفراغ من تسوید ہذه‌الاوراق فی یوم‌الجمعه التی وقعت فیه غرة محرم‌الحرام سنة ثمانین و مأتین والف من ہجرة‌النبویة صلی‌الله علیه وسلم »

اس کے بعد شیخ احمد کاتب کا قطعۂ تاریخ فارسی ہے ، اور بالکل آخر میں یه عبارت ہے [2] : در مطبع احمدی واقع شاہدره دلہائی باہتمام امو جان طبع شد » ص ۹۶

میر سعادت علی کو نثر لکھنے کا سلیقه نہیں، محرق میں اغلاط طباعت بھی ہیں ، جن کی تصحیح کے لئے غلط نامه شامل نہیں.

---

(۱) لطائف میں اس کا جواب یه ہے که اگر ایسا ہوا تو صاحب محرق کے اعمال حسنه غالب کے اعمال قرار دئے جائینگے ... غالب رند مشرب برابر رہا ، دکنی بچارہ مفت میں دھرا گیا ».

(۲) یه آخری صفحه محرق کا ہے ، قاطع برہان اشاعت اول بھی ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی تقطیع بھی (غالباً) وہی ہے جو محرق کی ہے ، لیکن قاطع کا مسطر ۲۳ سطری ہے ، اور اس کی ایک سطر میں محرق کی ایک سطر سے زیادہ عبارات ہیں

* جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب

آئینہ سکندر

یعنی

بمبئی کا پہلا اردو اخبار (۱۸۳۴ ع)

اردو اخباروں کے متعلق کئی ایک کتابیں اب تک شایع ہوئی ہیں جن میں شمالی ہند اور دکن کے اردو اخباروں کی صراحت درج کی گئی ہے ۔ ان کتابوں میں خصوصیت سے دو کتابیں جو حال میں شائع ہوئی ہیں قابل تذکرہ ہیں یعنی (۱) ہندوستانی اخبار نویسی، از مولوی محمد عتیق صاحب صدیقی ۔ (۲) تاریخ صحافت، ار مولانا امداد صابری ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں بڑی تحقیق ، تجسس اور کد و کاوش سے لکھی گئی ہیں ، مگر ابھی ان کو جامع و مکمل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آئے دن کوئی نہ کوئی جدید اخبار کا پتہ چل جاتا ہے ۔ چنانچہ ایک جدید اخبار آئینۂ سکندر کا پتہ چلا ہے جو بمبئی سے سنہ ۱۹۳۴ ع میں جاری ہوا تھا ۔

آئینۂ سکندر کا ایک فائل حیدر آباد میں محفوظ ہے جو ہم کو عبدالحی صاحب ایم ۔ اے ۔ کی مہربانی سے دستیاب ہوا ہے ۔ یہاں اس کی صراحت کی جاتی ہے

آئینۂ سکندر در اصل فارسی اخبار ہے مگر سنہ ۱۸۳۴ ع میں اس کا ضمیمہ اردو ہی میں شائع ہونے لگا ہے اخبار (۸ X ۱۲) سائز کے بارہ صفحے پر ہفتہ وار ہر پنجشنبہ کو بمبئی سے شائع ہوتا رہا ہے ۔ اس کے ایڈیٹر فضل حق صاحب تھے اور مسٹر رامس کے پریس میں طبع ہوتا تھا ۔ اس فائل میں فارسی اخبار سنہ ۱۸۳۳ع سے شامل ہیں ۔ صفحات کی تعداد مقرر نہیں ہے بلکہ کم و زیادہ ہوتی رہی ہے ۔ کاغذ دیدہ زیب مضبوط ہے ۔ اس فائل میں اردو ضمیمے کے صرف چار پرچے ہیں جن کی تاریخیں حسب ذیل ہیں ۔

---

* جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب ۔ کٹل منڈی ، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

(۱) ۳ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۲۳ شہر ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۹ ھ
(۲) ۲۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۹ ھ
(۳) ۲۶ جون سنہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۷ صفر سنہ ۱۲۵۰ ھ
(۴) ۲۴ جولائی سنہ ۱۸۳۴ ع

اخبار کا ٹائیٹل یعنی پہلا صفحہ اس طرح ہے۔

بمبئی
آئینۂ سکندر

نمبر ۱۰۵ تاریخ ۲۴ اپریل سہ ۱۸۳۴ ع مطابق ۱۴ شہر ذیحجہ سہ ۱۲۴۹ ھ روز پنجشنبہ

آئینــۂ سکندر جام جہاں نمــا ہے ٭ ملکوں کی کیفیت ہے اور طرفہ ماجرا ہے

اس کے بعد دو کالموں میں نفس مضموں کی صراحت ہوئی ہے۔ ہر ملک کی خبر علاحـدہ علاحدہ لکھی ہے مگر اسی شہر یا ملک کے مختلف واقعـات ایک ساتھ بلا کسی فصل یا علاحـدہ فقرہ کے لکھے گئے ہیں یعنی گویا مسلسل مضمون بن گیا ہے۔ ابتدائی شعر تبدیل بھی ہوگیا ہے چنانچہ کئی اخباروں میں یہ شعر ہے۔

از فضل حق بمبئی مطبوع شد منور ٭ آئینـۂ سکندر حسب الامر گورنر

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ گویا یہ نیم سرکاری اخبار تھا کیونکہ گورنر کے حکم سے شائع ہوتا تھا۔

یہاں فارسی اخبارات کو متروک کرکے اردو پرچوں کی مزید صراحت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ صراحت کی گئی ہے۔ اس میں مختلف شہروں کی خبریں درج ہوتی رہی ہیں۔ اور اکثر عنوان کا آغاز کسی شعر سے کیا گیا ہے۔ عبارت کے درمیان بھی اشعار آتے گئے ہیں۔

چند عنوان اور چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) بغداد کی خبر (۲) عجیب خبر (۳) مدراس کی خبر (۴) دہلی کی خبر (۵) اندور کی خبر (۶) منی رام سیٹھ کے احوال (۷) گوالیر کی خبر (۸) یورپ کی خبر، روسیوں اور ترکوں کی خبر (۹) بمبئی کی خبر (۱۰) چوری کی خبر۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شہروں کا ماجرا بد ست و قلم؟ ٭ چیدہ چیدہ کیا ہے میں نے رقم

اسپین کی خبر

کچھ نہیں دنیا دوں کو اعتبار ٭ لیک کار حیر ہیں مت برقرار

خبر شاہ فراس و سلطان امریکا

ہے زمانے کا بس یہی اسلوب ٭ ایک عالم ہے دوسرا معلوب

خبر دار السلطنت لکھنؤ

مالک ملک شاہ عالی جاہ ٭ رہے حاتم (قائم؟) ہمیشہ شام پگاہ

سردھنہ کی خبر

اپنی دانائی سے جو کوئی ہو مشیر ٭ کار مشکل اس کے ہوں رونق پذیر

خبر لاہور

میں کروں ہوں رقم پہ حال وررا ٭ جو ہے مشہور اعظم الامرا

ان عنوانوں کے تحت جو واقعات لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو جو دار السلطنت لکھنؤ کے تحت لکھا گیا ہے۔

واضح ہو کہ اس زمانہ میں سلطنت اودھ موجود تھی سلاطین اودھ حکومت کرتے تھے۔ یہ سلطان نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا[1]۔

«حضور کا حکم اشرف روش الدولہ بہادر کے نام سے یوں ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کی شہادت کے روز تابوت جو حضرت عباس کے روضہ میں لے جاتے ہیں اثناء راہ میں بہ سبب مذہب کے دونوں فرقوں سے جنگ و جدل ہمیشہ ہوا کرتا ہے ایسا بندوبست کیجیو کہ کوئی بات بے موقع نہ ہونے پاوے اور کسی کی زباں سے بری بات نہ نکلے۔ چنانچہ بموجب ارشاد فیض بنیاد کے خوب ہی کارپردازان اہتمام عمل میں لایا اور ساری رعیت کو امن و امان کا منہ دکھلایا۔ راجہ درشن سنگ سے فرمایا کہ ہماری مرضی مبارک یوں ہے کہ تم ہمیشہ بارگاہ سلطانی میں حاضر رہا کرو اور ہمارے حضور برکت معمور سے جدا

۱۔ نصیر الدین حیدر بن غازی الدین حیدر ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ع مطابق ۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ ھ تخت نشین ہوئے اور ۷ جولائی سنہ ۱۸۳۷ ع مطابق ۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۳ ھ کو وفات پائی

نہ ہونا راجہ نے زمین خدمت کی چوم کر بہت ہی محظوظ اور نپٹ خورسند ہوا ۔

ایک روز خود بدولت و اقبال نے بادشاہ باغ میں تشریف فرما کر زینت باغ کی رونق زیادہ بڑھائی اور وہاں سیر گل گشت میں مشغول تھے ۔ اچانک نظر مبارک کئی درویشوں پر جاپڑی ۔ راجہ مذکور سے مخاطب ہوکر پوچھے کہ یہ لوگ کون ہیں اس نے عرض کی کہ یہ درویش ہیں کامل اور فقیر ہیں روشن دل ۔ حکم ہوا کہ پندرہ ہزار روپئے بطریق دعوت ان کے حوالے کرو ۔

میرزا علی رضا بیگ کے آدمی اور راجہ درشن سنگھ کے کئی نوکروں کے فی مابین کوئی گذری ہوئی بات پر لڑائی ہوئی ۔ یہاں تک کہ تلوار کی نوبت پہنچی ۔ راجہ نے حضور اعلی میں میرزا کے نوکروں کی زیادتی ظاہر کی ۔ حکم غضب ہوا کہ دو ہزار روپئے جرمانہ میرزا کے سپاہ سے لیویں کیونکہ بانی فساد وہی لوگ ہیں ۔

بخشی پتر چند نے عرض کی کہ میرزا برق کی پلٹن کی تنخواہ بہت دنوں سے نہیں ملی ۔ ظفر الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ تیس ہزار روپئے خزانہ عامرے سے لے کر بخشی گیری کی کچہری میں بھجوا دیں تا انہیں تقسیم ہو ۔

منا سنگھ ہرکارہ نے پرچہ نذر گذرانا اس مضمون پر کہ دو سو روپے بخشی لال جی نے رام چند سے بطور رشوت کے لئے ہیں ۔ حکم قہر ہوا کہ راجہ درشن سنگھ فی الفور اس بدکردار کو ایسے برے اطوار سے منع کرے اور جس سے رشوت لی ہے وہی پیسا اس کے حوالے کرے ۔

ظفرالدولہ کو ارشاد ہوا ہے سبھوں نے بالاتفاق تخت پر بٹھلایا تمام مملکت اس کے قبضے اقتدار میں دے کر آپ مطیع اور فرمانبردار ہوئے ۔ کہتے ہیں یہ بھی بادشاہ عادل اور سخی دیر ہمیشہ دریا دل رہا ہے » (۹)

عبارت بالا سے واضح ہوتا ہے کہ ایک جگہ کی مختلف خبریں کو علاحدہ علاحدہ لکھنے کی جگہ مسلسل لکھا جاتا تھا ۔ اخبار ٹائپ میں طبع ہوا ہے اور بعض الفاظ خاص صورت میں لکھے گئے ہیں ۔ مثلاً روپیہ کو « روپے » اعلی کو « اعلا » وغیرہ ۔

اقتباس سے شاہ اودھ کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی سخاوت، عدل اور انصاف، بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے۔ رشوت لینے کی خبر بادشاہ کو معلوم ہوتی تھی اور اس کا انتظام کیا جاتا تھا۔

«سردھنہ کی خبر» کا کسی قدر اقتباس موجب دلچسپی ہوسکتا ہے۔

«ایک دن ساری رعیت نے بیگم سمروکے در دولت پر حاضر ہوکر فریاد کی کہ ہمیں غلے کی گرانی نے برباد کیا اور غلے فروشوں نے اپنے گھروں کو آباد۔ ہماری جانیں لبوں پر آئیں۔ رنج و تعب سے بہت گھبرائیں، غربا، فقراء، نادار مارے افلاس کے ہوگئے۔ ... بلکہ دولت مندوں کی بھی گذراں عسرت پر آرہی ہے۔ گرانی سے سب کے ہوش و حواس جاتے رہے ... . بیگم موصوفہ نے دو تین غلے فروشوں کو بلوا کر تاکید شدید کی کہ اتنا اناج مہنگا بیچنا اور سستا نہ کرنا مناسب نہیں، چاہئیے کہ روپے کے بیس سیر گیہوں بیچیں اور نہیں تو ہماری قید میں سب پابند ہوں گے۔

«غلہ فروش بیگم سمرو کے حکم پر راضی نہیں ہوئے اور بیس سیر کے بجائے دس سیر بیچنے سے بھی انکار کیا اور سب کے سب واپس ہوگئے۔ بیگم سمرو نے اپنے حکم کی تعمیل کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ تالابوں پر سپاہی متعین کر دئیے اور غلہ فروشوں کو پانی دینا بند کردیا۔ اس ترکیب سے غلہ فروش مجبور ہو گئے اور حسب ذیل عرض کیا۔

«جس طور سے کہ بیگم صاحبہ نے ٹھیرایا تھا اسی پر چھ ماہ تک راضی ہوئے اور عدول حکمی سے توبہ کئے اور گزارش کی کہ اگلا برس جو اچھا آئیگا تو اس سے زیادہ ارزاں بیچینگے۔»

اس کیفیت سے واضح ہوتا ہے کہ گرانی کے انسداد کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا گیا۔

سنہ ۱۸۳۴ ع کو آج سے مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ غلہ کی ارزانی کس طرح ہوئی اور بیگم سمرو نے رعایا کی پریشانی کا کس طرح انسداد کیا تھا۔

۲۴ جولائی سنہ ۱۸۳۴ ع کے اخبار کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

دہلی کی خبر

« وہاں کے اخبار سے جو اٹھارھویں جون کی ہے دریافت میں آیا کہ شاہ شجاع الملک جو اندیس ندی کے اس پار فتح کرتا ہے اس کی تلاش میں ہم بہت امیدواری سے رہکر ڈھونڈھتے ہیں. ان دنوں کابل سے خبر آئی ہے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ دوست محمد خان کے مرنے کی خبر چند روز کے آگے اڑی تھی سو سکھوں کی بندش کی افواہ تھی کہ پشاور کے حکومت والے کابل جائیں اور وہاں لوٹ مچائیں تو اطراف اکناف میں ہنگامہ فتنہ و فساد گرم نہ ہو، قندھار کی حکومت کرنے والوں کو شاہ شجاع الملک نے محاصرہ کیا ہے. قلعہ اس کے ہاتھ میں نہیں آیا. دوست محمد خان سے سنا کہ پشاور کو سکھوں نے ہی اس سبب اپنے بھائیوں کے مدد کی خاطر خود آپ قندھار جانے والا ہے ....»

منی رام سیٹھ کا احوال

منی رام سیٹھ کا چھٹکارا پچاس لاکھ رپے کے دینے سے ہو گیا. ہم یوں جانتے ہیں کہ اس شخص کو محنت و مشقت سے بچانے کی خاطر مسٹر کاوندش نے بھامنی اور خوبی سے اس کا ضامن اور مبلغ کا واجب الادا اپنے سر پر لیا ہے جبتک یہ شخص یعنی مسٹر مذکور درمیان نہ تھا تب تک اس سیٹھ کے سبھی برا اور نا سرا کہتے تھے. ایسے لوگ کام تو اچھے محنت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن آخر میں اسے نحوبی انجام (نہیں) دیتے ہیں ،

اخبار ۲۶ جون کا ایک اقتباس

بمبئی کی خبر

کچھ کارخیر کرلے بہت کم ہے زندگی ٭ نیکی نہووے تجھ سے تو صد حیف زندگی

« ہرکارہ بمبئی یہ خبر دیتا ہے کہ جو مجلس گداؤں محتاجوں کی پرورش کے واسطے اوایل میں مقرر ہوئی تھی اوس کی بعض تجویزیں رہگئی تھیں، سو ابھی جمعہ کے روز نویں تاریخ اس مہینے کی مجلس میں تمام اکابران شہر جمع ہوکر یہ مقرر کیا جو صلاح کار و مختار اس مجلس کے تھے

ان کے نام یہ ہیں: جان فرش اسکویر، ریوریندر جے لاری، میجر مور. ریورنگ یانگ، فرام جی کاوس جی. جگناتھ شنکر سیٹھ، مسٹر میکنٹ. کپتان جیک، ہررکیسو ۰۰۰۰۰۰۰۰۰

بمبئی کی ایک دوسری خبر

« تھوڑے دنوں سے اس دارالحکومت میں وبا کا مرض شدت سے پھیلا ہے. اس لئے سرکار دولت مدار بیک نام علی مقام نواب مستطاب گورنر صاحب بہادر احلاس کوسل دام اقبالہ نے ہر ہر محلے اور ہر ہر کوچے میں دوا خانے بنا کر دواوں سے معمور کرکے کنٹری ڈاکٹر [1] یعنی معالج اس ملک کے متعین کئے ہیں. ہر ایک شخص کو جو اس مرض میں گرفتار ہوجائے فی الفور اسے دوا دینا خوبی اور نیکی سراوار کمپنی بہادر کی سرکار کی ہے.»

۲۴ اپریل سنہ ۱۸۳۴ ع
آئینہ سکندر جام جہاں

احوال پیالا شاہ حکیم کاظم علی خاں کے باب میں. تاریخ بارھویں جمادی الثانی ۱۲۴۹ ھ کو آئینہ سکندر میں احوال پیالا شاہ اور می رام کا بڑودے میں راجہ سیا جی راؤ کے پاس امرا میں حکیم کاظم علی خان نے بدذاتی اور عداوت سے ۰۰۰ کروایا تھا سو اب لکھے معتبر احوال مفصل حکم کی ابتداء سے معلوم ہوا وہ مختصر ظاہر کیا جاتا ہے کہ حکیم کاظم علی خان گوالیار میں دولت راؤ سندھئے کے پاس نوکر تھا. ایک قحبہ عورت بازارن کے واسطے بھائی حقیقی اپنےکو نوکروں سے مروا ڈالا سندھیہ نے تلاش قاتلوں کو حکم دیا حکیم نے ذمہ اپنا کرکے پہلوتھی کی کہ خود بانی حرکت تھا اور اس عورت کو اپنے گھر میں رکھا کہ اس کو دولڑ کے پیدا ہوئے کہ اب حکیم کے پاس بڑودے میں ہیں ان کا نام ہاشم علی خان اور دوسرے کا نام عالم علی خان ہے.

Country doctor 1

ایک حرکات نالایقی سرکار میں ظاہر ہوئی اور یہ بات بھائی کو مروا ڈالنے کی بھی ثابت ہوئی. تب سرکار سے نکالا گیا کہ یہ بات ظاہر ہے وہاں سے خراب خستہ تباہ حال حیدرآباد کو گیا ۔ حکیم شفائی خان کہ مرد بزرگ اور مشہور ہیں ان سے ملاقات کی انہوں نے حکیم کاظم علی خان کو مہاراج چندو لال کے پاس نوکر رکھوایا. چند مدت کے بعد بد گوئی و غیبت شفائی خان پر روا رکھی. حق اور خوبی ان کی فراموش کرکے فعل بدذاتی کا نکالا. قول بزرگ کا درست ہے:

نکوئی با بدان کردن چناں است ٭ کہ بد کردن بجائے نیک مردان

سوائے اس کے اور حرکت نالائق نسبت مہاراج چندو لال کے درمیان لایا، تب مہاراج چندو لال نے اس بدذات کو راتوں رات شہر حیدرآباد سے بدر کیا ...»

حکیم کاظم علی خان کی اعلی قابلیت اور اخلاق حسنہ کے متعلق حیدرآباد کے ایک معتبر تاریخ گلزار آصفیہ کا اقتباس ملاحظہ ہو.

« حکیم کاظم علی خان آصفجاہ ثالث کے زمانہ میں گوالیار میں دولت رائے سندھیہ کے یہاں تین ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم تھے. سندھیہ کے فرزند سے ناواقفیت کی وجہ حیدرآباد آئے. راجہ چندو لال کے پاس تین ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے. دوسرے حکماء جس قسم سے علاج کرتے ہیں اس سے آپ اپنے فن میں بلند مرتبہ رکھتے تھے. فنی مہارت کے علاوہ اپنے اخلاق اور سخاوت بلند ہمتی ارباب احتیاج سے سلوک کے لحاظ سے ان کا درجہ اور بلند تھا. دو سال کے بعد جب اپنے وطن کی کشش غالب آئی تو دوبارہ گوالیار کو واپس ہوگئے اور وہاں خوبی سے اوقات بسر کرتے ہیں.»

تاریخ اور اخبار کا اختلاف اس سے واضح ہوسکتا ہے.

اخبار کے ان اقتباسات سے اخبار کے انداز بیان اور اس کے اسلوب کے علاوہ زبان کی بھی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے آج سے ایک سو تیس سال پہلے کی بمبئی کی زبان کا ایک صحیح اندازہ ہوجاتا ہے.

* پروفیسر طالب کشمیری

سرمایۂ کلام غالب

(۲)

حقیقت شعر و شاعری

شعر کی ماہیت یا حقیقت سے کیا مراد ہے اور شاعری کی تعریف کیا ہے. اس موضوع پر مغربی و مشرقی عالموں ، ادیبوں اور نکتہ سنجوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ اور انداز تفکر سے اظہار خیال کیا ہے. اس سلسلے میں چند خیالات ملاحظہ فرمائیے : (۱) شاعری ایسا موزوں کلام ہے جو متکلم نے بالقصد موزوں کیا ہو. (۲) شاعری تخیل کا نام ہے اور تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسیقدر الگ ہوتا ہے. (۳) مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوشنما ثابت کرنا شاعری ہے. (۴) شاعری وہ کلام ہے جو جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کرسکتا ہو. (۵) شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے لیکن مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے ، یعنی شاعری کسی چیز کا اسطرح بیان کرنا ہے کہ اس کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہوجائے یا بالفاظ دیگر جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے بوی ادا کرسکتا ہو وہی شاعر ہے. (۶) شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں. شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو. اس کی طبیعت پر جو خاص اثر پڑتا ہے اور موزوں الفاظ کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے. اسی کا نام شاعری ہے. (۷) شعر الفاظ ، وزن ، نغمہ اور رقص کا نام ہے. (۸) جو

---

* پروفیسر ان الل کے طالب کشمیر ایم. او. ایل جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر

خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعے سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں خواہ نثر میں. (۹) شعر حقائق زندگی کی گہرائیوں، تصوف یا عرفان اور فلسفہ بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے. (۱۰) شاعری وجدانی دنیا کا دوسرا نام ہے. شاعر اپنے فکر کی قوت، احساس کی ذکاوت اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیات ہی کی ترجمانی کرتا رہتا ہے. (۱۱) شاعری کا موضوع استقصاء حسن و عشق ہے. (۱۲) شاعری شیریں زبان مصوری ہے جس کا تعلق وقت سے ہے. (۱۳) شاعری خیال و احساس کے باطنی زمان و مکان کی توضیح و تعبیر ہے. (۱۴) شعر ایک سریلا خیال ہے. (۱۵) شاعری مثالیت کے مترادف ہے. (۱۶) شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو اور یہ ایسا عالمگیر علم ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معرا رہی اور نہ کوئی صاحب علم قوم گریزاں. (۱۷) شعر جذبات کا ایک شعلہ اور خوشی کی کوئی لہر ہے. (۱۸) وہ کوئی ربانی چیز ہے. جو علم و حکمت کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی. بہترین اور پر نشاط دماغوں کی بہترین پیداوار اور پر نشاط گھڑیوں کا مرقع ہے. (۱۹) وہ علم و فن سے بے بیار علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ بول ہے جو ہیجان کے ساتھ ساتھ وفور لذت کا سرچشمہ بھی ہے. (۲۰) شاعری تخیل کے لئے جذبات عالیہ کا مجسم نغمہ ہے. (۲۱) خاص خدا ہی کی کوئی چیز ہے. (۲۲) شاعری دانش منظوم کا نام ہے. (۲۳) نظم دراصل ایک آلہ ہے جس سے شاعر اپنے باطنی تجربے کو اوروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے. یہ گویا اس کی واردات قلب کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے. (۲۴) شاعری جذبات کی وجدانگیز عکاسی اور تفریح طبع کا نام ہے. (۲۵) شاعری قوانین حسن و صداقت کے تابع تنقید حیات یا تفسیر حیات ہے. (۲۶) شاعری ذوق حسن اور لطافت جذبات کی مصوری ہے. (۲۷) شاعری دلی جذبات یا خیالات کا اظہار ہے جو شاعر وزن اور مناسب الفاظ کے ساتھ ادا کرتا ہے. (۲۸) شاعری جذبات کا اظہار اس طرح ہے کہ اس میں زندگی کی تنقید بھی ہو، تصویر بھی ہو اور تفسیر بھی. (۱۹) شاعری جزویست از پیغمبری.

(۳)

شاعری میں مرزا کا مقام

شعر و شاعری کی مقولۂ بالا تعریفوں اور اس سے متعلق کم و بیش اسی قسم کے خیالات کا دفتر بے پایاں مدنظر رکھا جائے تو وہ شخص جس کے کلام میں ان میں سے کوئی بھی پہلو جلوہ گر ہو عام طور پر شاعر کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے لیکن اگر مجموعی طور پر ان سب نظریوں کو سمیٹ کر ایک معجون مرکب تیار کی جائے اور اس میں وہ تمام نکات بھی شامل کئے جائیں جو بعض خوردہ بین نگاہیں شعر و سخن میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے کے درپے رہتی ہیں تو مرزا تو کیا شاید دنیا کا کوئی شاعر پورے معنوں میں شاعر کہلائے جانے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اہل ادب کے نزدیک مجموعی طور پر شاعری کا عام مفہوم کیا ہے اور خاص کر مشرقی نقطۂ نظر سے اس سے کیا مراد ہے اور پھر یہ کہ کیا مرزا اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ ان کا کلام بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجائیگی کہ اس لحاظ سے وہ بعض کوتاہیوں اور عیوب کے باوجود یقیناً گراں قدر شعراء کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں اس کے خلاف جہاد کرنا نہ صرف تنگ نظری ہے بلکہ انصاف سے بعید اور ہٹ دھرمی کا کھلا ثبوت۔

مرزا ایسے شاعر کے کلام کو جانچنے اور اس کی خصوصیات کو پرکھنے سے پہلے اس دور اور ماحول سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔ یہ اس لئے کہ شاعر کے جذبات و خیالات جن کی وہ ترجمانی کرتا ہے کسی نہ کسی رنگ میں اس سے پرتو پذیر ہوتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ایک طرف تو سلطنت مغلیہ کا اقتدار دم توڑ رہا تھا اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت روز بروز زور پکڑتی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کی سرکاری و دفتری حیثیت ختم ہوئی۔ اس کے باوجود ایک مدت تک ایسے لوگوں کی خاصی تعداد باقی رہی جو فارسی ادب اور زبان سے محبت رکھتے تھے اور اس پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ مرزا انھیں میں سے ایک تھے۔

علاوہ ازیں ان کے ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کا پس منظر، عوام کا مذاق سخن، ان کے پیشرو استادوں کے نزدیک مفہوم شاعری اور خصوصاً موضوع غزل کی نوعیت، ان کے ہمعصروں کا انداز بیان اور زبان کے اعتبار سے اردو کا ابتدائی مراحل سے گذر کر اس کی ارتقائی تشکیل اور ناتراشیدہ تراکیب و اسالیب وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ مزید برآں شاعری میں ان کا صحیح مقام پہچاننے کے لئے خاطر خواہ علمی استعداد، وسیع مطالعہ اور بالغ نظری کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

آج تک ان کا کلام جن اہل ادب حضرات کی رائے زنی کا تختۂ مشق بنا ہے اگر ان کی نظریوں کا تجریہ کیا جائے تو ان میں سے انتہا پسندوں کے رویہ کی ایک بڑی وجہ ان واقعات سے دانستہ یا نادانستہ آنکھیں بند کرلینا ہے۔ مرزا کے کلام کو سراسر الہامی ٹھہرانا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا ان کو پرلے سرے کا بے سُرا اور گونگا قرار دینا یا یہ حکم لگانا کہ ان کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے محاسن و معائب کلام کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ اس عرض سے ہم حسب ضرورت ان کے مختلف اشعار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خصوصیات کا مختصر سا خاکہ کھینچ کر یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ ان کی شاعری کی حقیقت کیا ہے۔ اس میں ان کی جدت کہاں تک کار فرما ہے۔ انہوں نے فارسی و اردو کے دیگر شعراء کے کلام سے کیا کچھ اخذ کیا ہے اور کس حد تک وہ استفادہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ دیگر شعرا نے ان سے اکتساب فیض میں کس قدر حصہ لیا ہے۔ تکرار مضمون کا عیب یا ہنر کن اشعار میں پایا جاتا ہے وغیرہ۔ اس سے ہماری مراد نہ بلا وجہ مدح سرائی ہے اور نہ بیجا نکتہ چینی اور نہ مرزا پر خواہ مخواہ سرقہ کا الزام عائد کرنا مقصود ہے اگرچہ بعض سخن فہموں کی نظر میں وہ اس کے بھی مرتکب ہیں۔ غرض فقط یہ ہے کہ مرزا کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تاکہ یکطرفہ رائے قائم کرنے والوں کے نظریوں کی حقیقت واضح ہوجائے کہ وہ مرزا کو دنیا کا بہترین یا نہایت پست درجے کا شاعر قرار دینے میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور یہ کہ مرزا کی شاعری کا پایہ متعین ہوسکے۔

(۴)

محاسن کلام

مرزا کی شاعری کے دلدادوں کی اس مبالغہ آرائی سے قطع نظر حس کے زیر اثر وہ ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کا کلام بحیثیت مجموعی قابل قدر ہے اور بعض صورتوں میں بے نظیر۔ ان سے پہلے اردو شاعری اور خصوصاً غزل کا میدان بہت محدود تھا۔ شعراء کی توجہ زیادہ تر زبان کے چٹخارے، نشست الفاظ، حسن بندش، محاورے کی چستی، لفظی رعایت، صنائع بدائع اور مشکل سے مشکل قافیہ کے کھپانے پر مرکوز رہتی تھی۔ نفس مضمون کے اعتبار سے اچھی غزل کا معیار یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں گل و بلبل، زلف و سنبل، خط و خال، ہجر و وصال، شمع و پروانہ، ساقی و پیمانہ، عاشق کی گریہ و زاری و وفا شعاری اور معشوق کی کج ادائی و بے وفائی غرض فقط عاشقانہ مضامین کی ترجمانی ہو۔ شعراء تو دام زلف میں الجھ کر رہ جاتے تھے یا معشوق کے دہن موہوم اور کمر معدوم کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ ان کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو اس قول کی تصدیق ہوجائے گی۔ موضوع غزل کی روایتی پابندی نے انھیں اکثر مطالعہ کائنات کی وسیع النظری سے محروم رکھا تھا۔ پرانی روش سے انحراف کرنا خلاف دستور سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شاعر احیاناً کسی نئی ترکیب یا اچھوتی تشبیہ کو استعمال کرتا تو اس پر اعتراض کیا جاتا اور قدیم اساتذۂ فارسی یا اردو سے سند طلب کی جاتی، سند کی عدم موجودگی میں اس کا کلام قابل التفات یا وقیع نہیں سمجھا جاتا۔ لہذا زبان اور موضوع کی روایتی پابندی کے پیش نظر شعراء اسی محدود چکر میں پھنسے رہے۔ غالب سے پہلے اگر کسی نے اس روایت سے بغاوت کی تو وہ میر تقی میر تھے جنھوں نے عشقیہ مضامین کے علاوہ عوام کی زبان میں زندگی کی واردات کو سادہ اور موثر انداز میں پیش کیا۔

یہ درست ہے کہ مرزا نے عشق و عاشقی کا دامن نہیں چھوڑا مگر انھوں نے اس طلسم کو توڑا کہ غزل میں دوسرے خیالات اور مضامین ادا نہیں کئے جاسکتے۔ اس میں مختلف قسم کے مسائل سمو دئے۔ مختصر سے اردو دیوان میں ایسے متنوع

عناصر داخل کئے، جن سے غزل کے موضوع میں معنوی وسعت پیدا ہوئی حالانکہ پھر بھی ان کو یہ شکایت رہی کہ :

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ٭ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا ایک جدت طراز فنکار ہیں۔ وہ شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالتے ہیں اور ہر صورت اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔ ادائے مطالب کے لئے لفظ و معنی کا ایک نیا رشتہ دکھاتے ہیں۔ تازہ تشبیہوں اور نادر استعاروں سے نازک خیالی اور معنی آفرینی کے دریا بہا دیتے ہیں۔ ترکیب سازی و الفاظ گری، ایجاز و اختصار اور تمثیل و کنایہ سے کام لے کر عبارت قلیل میں معنیٔ کثیر ادا کرتے ہیں۔ جدت ادا سے مفہوم شعر میں رنگینی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ متقدمین و متاخرین اور بعض اوقات معاصرین کے خیالات و مضامین میں لفظی و معنوی تصرفات سے کہیں پرانے خیال میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہیں خیال کے ایک پہلو کو بدل کر اس کا دوسرا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ کہیں دو مختلف خیالوں سے ایک نئے خیال کو جسم دیتے ہیں اور اس طرح پامال و فرسودہ مضامین کو طرفگی اور ندرت کا جامہ پہناتے ہیں۔ کبھی پیش پا افتادہ مضموں کو اپنے زبردست تخیل کی مدد سے بلند کرکے اس میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ وہ فکر و ذہن کے نئے نئے گوشے نکال لیتے ہیں۔ بقول ایک سخن فہم کے ان کے یہاں آنسو بھی ہیں اور شبنم بھی، غنچے بھی ہیں اور خار بھی، ایک فلسفی کے خشک نظرئیے بھی ہیں اور ایک رند خرابات کا مستی بھرا نعرہ بھی ہے۔ ان کے یہاں غنچے چٹکنے کی لطیف آواز بھی ہے اور رعد کی کڑک بھی۔ ان کے یہاں نہ خواب جوانی کی تعبیریں ہیں اور نہ سوز الفت کی ترجمانیاں۔ وہ کتاب دل کی تفسیریں ہیں۔ واقعیت و مثالیت، اشاریت و ایمائیت، پرواز تخیل، قوت ادراک، حسنِ وجدان، امید و ناامیدی کی کشمکش، درد کی کسک، گداز کی کیفیت اور ذہنی تصورات نے ان کی شاعری کو وہ رنگ بخشا جس کا پرتو اردو کے دوسرے غزلگو شعراء کے ہاں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ نظر فریبی کا رنگ جمانا اور بات سے بات پیدا کرنا ان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ غزل میں جو موضوعات داخل کئے ہیں انسانی زندگی کی پیداوار ہیں۔ انہیں فلسفی کہنا شاید درست نہ ہو اس لئے کہ ان کے غیر مربوط فلسفیانہ خیالات میں زندگی کا کوئی مستقل فلسفہ نہیں پایا

جاتا لیکن وہ ایک فلسفی شاعر ضرور ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ نظریات کا شعور ہے۔ حقائق اشیا کی جستجو میں قوت تخیل سے جلوہ گر ہونیوالے تاثرات کو نہایت کامیابی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ عملاً صوفی تھے یا نہ تھے ان کے ان اشعار سے جن میں انھوں نے متصوفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی مختلف تحریروں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے وہ صوفی تھے۔ انھوں نے کائنات اور انسانی زندگی کے بعض مسائل کو صوفی کے دل سے محسوس کیا۔ نفسیاتی حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے انداز فکر میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور شوخی میں لطف انگیزی اور ظرافت میں متانت و شائستگی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی شیرینی ہے جو ذہنی انبساط کا باعث ہوتی ہے اور روح کو تازگی و شگفتگی بخشتی ہے۔ ان کے ہاں جذبات غیرت و خود داری اور رشک سے متعلق مضامین بھی پائے جاتے ہیں ان کے کلام میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں ہر شعر کا مضمون الگ الگ ادا کرنے کی بجائے ایک ہی مضمون پر مسلسل اشعار لکھ کر طبع آزمائی کی ہے۔ دیوان میں پہلودار اشعار بھی موجود ہیں جن میں اگرچہ تصنع کو دخل ضرور ہے لیکن ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ زبان پر ایسی قدرت رکھتے ہیں جو ہر ایک کو نصیب نہیں۔ ان کے انداز فکر اور ذہنی تصورات میں ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب بیان سے خیالات و مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں تبدیل کرتے ہیں۔ گو انھوں نے عمر قنوطی ماحول میں بسر کی جو بعض اشعار میں منعکس ہے لیکن چونکہ فطرتاً رجائی واقع ہوئے تھے آلام و مصائب پر ہنسی اڑانے میں انہیں لطف آتا ہے۔ وہ داخلی کیفیات کے مصور ہیں خارجی حالات کے نہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا شعور عطا کیا۔

مرزا کے کلام کا بیشتر حصہ جو متذکرۂ صدر محاسن کا حامل ہے اور جس پر ان کی شہرت و عظمت کا انحصار ہے واقعی اردو زبان کا سرمایۂ ناز ہے۔ جب تک نیرنگیِ تصورات، روح پرور خیالات اور وجد آفریں نغمات انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہیں گے اور بزم ہستی کو فانوس خیال سے روشن کرنے کی تمنا اہل بصیرت کے دلوں میں باقی رہے گی یہ پیش گوئی کرنا مشکل نہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی رفتار کے ساتھ ساتھ موضوع سخن اور مفہوم شاعری میں انقلاب

آنے کے باوجود ان کا کلام قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جائیے گا اور ان کے متنوع خیالات کی بنا پر ان کی مقبولیت میں روز افزون اضافہ ہوتا رہے گا ۔

(۵)

معائب کلام

کوئی صاحب عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ بقول : « الانسان مرکب من الخطا والنسیان » مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے یا یہ کہ دیوان غالب ایک آسمانی صحیفہ ہے اور اسی پر شاعری کا خاتمہ ہوگیا ہے ۔ جس طرح ان کے پرستاروں نے ان کو دنیا کا بہترین شاعر ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اس طرح ان کے مخالفوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عیب نکالنے کے شوق میں ان کی شاعری کو در خور اعتنا نہیں سمجھا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان انتہا پسند مخالفوں کی رائے سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ان کے جزوی کلام میں عیب موجود ہیں جن کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں اور جن کو ایک انصاف پسند نقاد نظر انداز نہیں کرسکتا ۔ مثلاً بعض اشعار میں فارسیت کی اس قدر بھرمار ہے کہ ان پر بہ مشکل اردو اشعار کا اطلاق کیا جاسکتا ہے ۔ یہ کہنا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا در اصل فارسی زبان کے دلدادہ اور بلند پایہ شاعر تھے یا یہ کہ وہ شروع شروع میں مرزا بیدل کی تقلید کرتے تھے اور اس وجہ سے ان کا ایسی زبان سے احتراز کرنا ناگزیر تھا ان کو اس عیب سے بری قرار نہیں دے سکتا ان کے ہاں گنجلک ہے ۔ بعض موقعوں پر پیچیدہ اور غیر مانوس تراکیب نے ان کے اشعار کو معما بنا دیا ہے جس سے « المعنی فی بطن الشاعر » کی صورت پیدا ہوگئی ہے ۔ بعض اشعار گتھلی دار ہیں اور بعض اگر سراسر بے معنی نہیں تو ابہال کی حد تک ضرور پہنچ جاتے ہیں ۔ ان اشعار کے علاوہ جن میں مرزا نے اپنی قوت تخیل اور فنکارانہ کمال سے اوروں کے خیالات و مضامین سے استفادہ کرکے ان کو ترقی دی ہے اور اردو زبان کو مالا مال کیا ہے ان کے ہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں ، جن کا مضمون انہوں نے فارسی و اردو کے قدیم شعراء بلکہ بعض معاصرین سے یا تو اخذ کیا

ہے یا صاف اڑا لیا ہے یا پھر ترجمہ کرکے اپنا لیا ہے۔ کلام میں الفاظ کی ثقالت اور غرابت کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو کانوں کو ناگوار گذرتی ہیں۔ اس میں قواعد و زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں بے ضرورت تکرار مضمون کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ بعض اشعار سوقیانہ اور بازاری ہیں۔ اور کلام میں ناہمواری بھی ہے۔

(باقی آئندہ)

* پروفیسر یوسف سرمست ایم۔اے

مومن کی عشقیہ شاعری

«دنیا میں عشق ہی سب کچھ ہے وہ تو خدا ہے»

عشق انسانی جذبات میں «دل» کا مقام رکھتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا محور ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے «نغمہ تارِ حیات» بجنے لگتا ہے اور اسی کے دم سے «نور حیات» کی روشنی بھی رہتی ہے اور «نار حیات» کی گرمی بھی اس جذبہ کے تحت انسانی اعمال و افعال کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور بعض وقت یہ کچھ ایسا پیچ در پیچ اور ایسی عجیب و غریب صورتیں اختیار کرتا ہے کہ اس کے بہروپ کو دیکھ کر اس کے اصلی روپ کا پتہ چلایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ صد ہزار جلووں کی صورت اختیار کرتا ہے اور ہر جگہ اس کی جلوہ گری ایک نئی شان رکھتی ہے۔ کبھی تو یہ انسانوں کے باہمی تعلقات میں رگ جاں کی طرح نظر آتا ہے اور اس طرح تصویر کائنات میں رنگ بھرتا ہے اور کبھی یہ انسان اور خدا کی وابستگیوں کی وجہ سے معراج پر پہونچ جاتا ہے اور انسان کی زندگی میں تقدس اور الوہیت کی خیرگی اور برگزیدگی پیدا کرتا ہے اور کبھی انسان کی فطرت پرستی کا مظہر بن کر کائنات کے سارے حسن کو شعر و ادب کے آئینہ خانہ میں منعکس کرتا ہے۔ عشق کی اسی ہمہ گیری اور بے کراں وسعت کو دیکھ کر ایک مغربی مفکر نے اسے خدا کہہ دیا ہے۔

لیکن شاعری میں عشق جہاں رس گھولتا ہے اور آب حیات کی شیرینی پیدا کرتا ہے وہیں زہر کی ہلاکت خیزی بھی پیدا کرسکتا ہے۔ عشق «سایۂ شاخ گل» کے بجائے «افعی» اسی وقت نظر آتا ہے جبکہ اس میں حقیقت کی روشنی اور گرمی نہ رہے۔ عشقیہ شاعری کو جذبے کی سچائی ہی رفعت اور بلندی بخشتی ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ لیکن اردو میں عشقیہ شاعری زیادہ تر عشق حقیقی اور عشق مجازی تک محدود رہی۔ عشق حقیقی میں شاعری میں «ارضیت» کم ہوتی جاتی ہے۔ اور شاعر اگر بہت زیادہ اس میں گم ہو

* جناب یوسف سرمست صاحب حیدرآباد۔ دکن

تو « سرحد ادراک » سے پرے چلا جاتا ہے اور دوسروں کو اس کی شاعری کا « قبلہ نما » ہی نہیں ملتا ۔ ایسی صورت میں شاعر کا ساتھ دینا بہت مشکل ہوجاتا ہے ۔ عشق مجازی میں بھی شعر میں حسن اور تازگی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ وہ صحت مند ہو ، فطری ہو ، ایسی شاعری میں اگر « حادثات شباب » ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور صرف انھی کو شعر کا موضوع بنانے کی کوشش کی جائے تو پھر عشقیہ شاعری کی رنگینی ، تازگی اور اس کا جمالیاتی بانکپن مجروح ہوجاتا ہے ۔ اس میں ایک ہی دائرہ میں چکر کاٹنے سے فرسودگی اور تھکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے ۔ ایک ہی بات کی تکرار سے شاعرانہ خلوص و اعتماد کا فقدان ظاہر ہوتا ہے ۔ اور عشق بیمار نظر آنے لگتا ہے وہ ایک مصیبت اور روگ بن جاتا ہے ۔

مومن کی عشقیہ شاعری میں نہ تو عشق بیمار اور روگی نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ ماورائیت میں گم ہوتا ہے ۔ ان کی شاعری صحت مند انسانی جذبات پر روشنی ڈالتی ہے ۔ غزل کے مختلف شاعروں کے یہاں عشقیہ شاعری کا آہنگ مختلف رہا ہے ۔ لیکن مومن ہمیشہ ایک طرف خاص رعنت اور جھکاؤ رکھنے کی اپنی انفرادیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے میر کے پاس ہجر و فراق ، مایوسی اور ناکامی نے جو فضا پیدا کی ہے ، مومن اس سے بھی بہت حد تک دور ہیں مومن لکھنوی شعرا سے ایک حد تک متاثر نظر آتے ہیں لیکن وہ کبھی ان کی طرح مبتذل نہیں ہوتے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ہاں معاملہ بندی ملتی ہے اور خارجی پہلو کی نقش گری بھی دکھائی دیتی ہے عشق مجازی ہی ان کے لئے سب کچھ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود جرأت کے پاس جو معاملہ بندی اور کھل کھیلنے والا ماحول ہے اس سے بھی انھیں کوئی واسطہ نہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی کے شکار نہیں ہوئے ان کے پاس ہجر و فراق ، مایوسی اور ناکامی کا بیان ہوتا بھی ہے تو اس میں زندگی سے بیزاری یا فرار نام کو نہیں ملتا وہ ہر حالت میں زندگی کو عزیز رکھتے ہیں ۔ وہ « شبِ فراق » میں بھی زندگی پر مرتے ہیں :۔

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں ٭ کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

زندگی کی یہ عزیز داری ایسی حالت میں بھی ایک صحت مند رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ اردو شاعری میں زندگی سے یہ محبت کم ہی ملتی ہے، ورنہ عشق میں ہر شاعر بعض وقت خواہ مخواہ جان سے بیزار نظر آتا ہے۔ لیکن مومن کہتے ہیں:

جینا امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا ٭ مرتا ہوں زندگانی دشوار کے لئے

«زندگانی دشوار» پر مرنے کا یہ حوصلہ مومن کے ہاں اکثر جگہ نظر آتا ہے:۔

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں ٭ کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود زندگی کی مسرتوں اور دل آویزیوں کا انھیں احساس رہتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس کوشش میں اگر ان کی جان بھی چلی جاتی ہے تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے:۔

دل لگانے کے تو اٹھائے مرے ٭ جی سے لا سے رہا نہ رہا

لیکن وہ موت کو زندگی پر کبھی بھی ترجیح نہیں دیتے۔ «زندگی بھر» میں بھی وہ موت کی مسیحائی کے قائل نہیں:۔

زندگی بھر بھی اک موت تھی ٭ مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

یہی وجہ ہے کہ مومن کی شاعری کی عام فضا میں مایوسی، محرومی یا حرماں نصیبی پرتوفگن نہیں ہے اس کے بجائے وہ انبساطیت کا رنگ لئے ہوئے ہے ان کی شاعری کی لے بڑی حد تک مسرت اور جولانی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لیکن مومن باوجود اپنی لذت پسندی کے کھل کھیلتے نہیں کیونکہ وہ لذت پرست نہیں ہیں۔ چھیڑ چھاڑ سے بھی انہیں کچھ ایسی زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور کھل کھیلنے کی طرف بھی وہ راغب نہیں۔ لیکن فطرت مسرتوں سے بہرہ ور ہونے کو وہ جائز سمجھتے ہیں اور ان ہی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کی جن واردات اور کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کا اطلاق ہر انسان پر ہوسکتا ہے۔ وہ حسن و عشق کی جن منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں اس سے ہر جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند انسان گزرتا ہے۔ مومن کی شاعری میں یہ جو ہمہ گیری اور عمومیت آگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے «جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے وقوف جذبات کو اپنی شاعری کا خاص مقصد قرار

دے لیا تھا». مومن کی غزلیں ایک صحت مند انسان کے اس فطری رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں :-

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے — یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے
اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
ہوش میں آؤ مجھ میں جان نہیں — غفلت جرأت آزما کب تک
اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے — مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا
اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دلکو تھام لو

مومن اپنے تغزل میں صرف ایسے ہی جذبات کو جگہ دیتے ہیں جن کی نوعیت فطری ہونے کے باوجود بہیمانہ نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے بہیمانہ جذبات میں اپنے لطیف اور مہذب احساس سے انسانیت کا رنگ بھرتے ہیں۔ اگرچہ مومن کی شاعری کی بنیاد جنسیت ہے جیسا کہ نیاز فتحپوری نے کہا ہے «مومن کی شاعری بالکل جنسیاتی شاعری ہے». لیکن مومن کے ہاں جنسیت کا ارتقا ملتا ہے جیسا کہ فراق گورکھپوری نے کہا ہے :-

> «جنسیت اور جنسی جبلتیں خیروشر کی آماجگاہ ہیں۔ اس تخلیقی قوت کے لئے اہرمن اور یزداں کی مسلسل جنگ رہتی ہے جنسیت کی مادی بنیاد لمسیات میں پنہاں ہے۔ پھر لمسیات سے ابھر کر جنسیت تصور جمال اور جذبہ عشق بنتی ہے۔ پھر یہ تصور اور یہ جذبہ عاشق کی شخصیت میں جاری اور ساری ہوجاتا ہے۔»

مومن کے ہاں جنسیت کا یہ تدریجی ارتقا نظر آتا ہے اور «ہوس» کا سلسلہ «پیار» تک پہونچ گیا ہے

جنسیت سے جذبہ عشق تک سلامتی سے پہونچ جانا کچھ کھیل نہیں۔ مومن بھی اس راہ میں ذلیل ہو جاتے اگر ان کے پاس اپنی تہذیبی قدروں اور معاشرتی معیاروں کا اتنا گہرا شعور نہ ہوتا۔ کیونکہ مومن نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے، اس میں شاہدان بازاری کے عشق کے چرچے تھے۔ مومن بھی اس کوچہ میں گئے اور «سر کے بل» گئے۔ مومن نے عشق کیا تھا اور ایسی «بے جگہ» آنکھ لڑائی تھی کہ انھیں کیا کچھ نہ کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس شعر سے ہوسکتا ہے۔

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کرینگے ٭ کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

مومن کو کن کن کٹھن مقامات سے گزرنا پڑا ہے اور کیسی کیسی آزمائشوں پر پورا اترنا پڑا ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہے:

لے شب وصل غیر بھی کاٹی ٭ تو مجھے آزمائے گا کب تک

اس بدنام شعر میں اظہار کرب کے ساتھ الفاظ میں جو روک تھام ہے وہ مومن کے معاملات عشق پر روشنی ڈالتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں کوچہ گردی کی بو آتی ہے اور اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ رشک اور غیر کا بیان ان کے ہاں ایک حد تک ضرورت سے زیادہ ملتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے مومن اس خار زار سے جس انداز میں دامن کشاں گزر جاتے ہیں وہ ان کے عشقیہ جذبات کی صحت کی دلیل ہے۔ ایسے موضوعات پر اسطرح کے شعر کہنا مومن کا حصہ ہے۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیراں ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

غیر سے سر گوشیاں کو لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آررو پائے دل و رشک آشنا کہنے کو ہیں

حال نہ کہا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جاے ہے

ہے حرم پائمال عدو کو کیا کیا
مجھ کو خیال بھی تری سر کی قسم نہیں

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

مومن کی عشقیہ شاعری کی بنیادیں حقیقت میں پیوست ہیں۔ عشق کی منزل تک پہونچنے کے لئے «حسن پرستی» کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس راہ سے گزرتے ہوئے حسین تاثرات کو انھوں نے شعر کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے:

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں ٭ اے ہم نفس نزاکت آوار دیکھنا
تھا محو رخ یار میں کیا آئینہ دیکھوں ٭ معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ ٭ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ ٭ غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاے ہے
شمع سے کس نے یہ ذکر اس محفل آرا کا کیا

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

ہر آں آن دگر کا ہوں میں عاشق زار ٭ وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے ناز تو دیکھو ٭ ہے بوالہوسوں پہ بھی ستم ناز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک ٭ شعلہ سا لپک جائے ہے آوار تو دیکھو
باد بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی ٭ تم آجکل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

مومن کی عشقیہ شاعری میں کیفیات حسن اور معاملات عشق کی ترجمانی کو نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ ترجمانی مومن کے ہاں خیالی یا تصوری نہیں

ہوتی۔ بلکہ شاعری کی اس شیشہ گری میں حقیقت اور واقعیت کا زنگار لگا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک آئینہ خانہ بن گیا ہے اور اس شیش محل میں ہر ایک کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مومن نے خود عشق کیا تھا اور ساری عمر اسی کوچے کی خاک چھانتے رہے۔ ان کا ایک عشق تو کافی مشہور بھی ہوا حس کی یادگاران کی مثنوی «قول غمیں» ہے۔ میری مراد امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی والے عشق سے ہے۔ یہ تو ایک عشق ہوا اگر ہمیں مومن کی زندگی کے تمام حالات مل جائیں تو نہ جانے ایسی کتنی عشق کی داستانیں دستیاب ہوں۔ لیکن ان تجربات کی وجہ سے مومن کی شاعری میں «نگاہ یار» کی «معجز بیانی» آگئی ہے اور ہر ایک کو گماں ہوتا ہے کہ یہ اسی کے دل کی بات ہے۔ مومن کے پاس گو ایک ابتہاجی کیفیت ہے لیکن اس میں سوز و گداز اور دردمندی بھی پائی جاتی ہے۔ نرم آنچ کی لپک ان کے کلام میں کیوں نہ آتی انھوں نے عشق کیا تھا اور اس «آگ کے دریا» میں سے ڈوب کر جانا پڑا تھا۔ اس لئے مومن کی عشقیہ شاعری «سوز و ساز» کی لے پر رقصاں نظر آتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ٭ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ٭ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے ٭ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو ٭ کہیں دامان تر نہ ہو جائے
وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا ٭ مجھے رونا ہے خندہ گل کا

شبنم خرابِ مہر و کتاں سینہ چاک ماہ ٭ لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے ٭ صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال ٭ ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
وصل کی بات کب بن آتی ہے ٭ دل سے دفتر بنائے لوگوں نے
نہ مانونگا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا ٭ کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا
تا نہ پڑے خلل کہیں آپکے خواب ناز میں ٭ ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

دیدہ حیران نے تماشا کیا ٭ دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
چارہ دل سوائے صبر نہیں ٭ سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں ٭ یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ٭ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا ٭ وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کیلئے
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا ٭ تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

کیا تحمل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

عشق کی نیاز آگہی ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ نیاز عشق کی بلندی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ مومن شب فراق میں بھی زندگی پر مرتے ہیں۔ ہجر کی شب دراز میں کمی کا خیال بھی انہیں ناپسند ہے کیونکہ ان کو اپنے آرام سے زیادہ خواب یار کی ناز برداریاں منظور ہیں۔ وہ اپنے آنسو صرف اس لئے خشک نہیں کرتے کہ ان کا محبوب تر داماں نہ ہو جائے وہ نہیں چاہتے کہ معشوق ان کی حالت زار دیکھے کیونکہ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں اس کو «اپنی نظر نہ ہوجائے» مومن کی عشقیہ شاعری کا یہ وہ حصہ ہے جو اردو کی بلند ترین عشقیہ شاعری کا جز ہے،

مومن نے اپنی عشقیہ شاعری میں ناز حسن اور نیاز عشق کی تفصیل کو پیش کرتے ہوئے گہرے نفسیاتی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ مومن کی نفسیاتی ژرف نگاہی ان کے کلام میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہے۔ مومن خود حسن و عشق کی مختلف منزلوں کو طے کرچکے تھے، اس لئے ان کی نفسیات کا انہیں عملی تجربہ تھا۔ مومن نے انہی تجربات اور احساسات کو منفرد و شاعرانہ بانکپن کے ساتھ پیش کیا۔ مومن نے عشقیہ احساسات و جذبات کو پوری شدت سے محسوس کیا اور انکا وقوف حاصل کیا لیکن ان پر فلسفہ و فکر کی چھاپ نہیں لگائی۔ اسی وجہ سے مومن کے ہاں نہ تو فکر کی گہرائی پیدا ہونے پائی ہے نہ کسی فلسفیانہ رنگ کا جلوہ نظر آتا ہے فلسفہ و فکر مومن کے مزاج میں تھا ہی نہیں پھر شاعری میں کہاں سے آجاتا۔ لیکن مخصوص انداز اور منفرد آہنگ نے مومن کی شاعری کو جمالیاتی اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ جمالیاتی اظہار اور اس کا

نیا سانچہ مومن کے ہی ساتھ مخصوص ہے. ان کے ہاں اس جمالیاتی اظہار میں نہ میر کی سادگی اور آہستہ روی آتی ہے نہ غالب کی سی تندی اور پرکاری جگہ پاتی ہے. انھوں نے ان دونوں کے اسلوب سے جداگانہ اسلوب پیدا کیا ہے. اس اسلوب میں دونوں پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج نظر آتا ہے. جس نے مومن کی عشقیہ شاعری کو زیادہ دل نشیں اور دلاویز بنا دیا ہے. مومن کی عشقیہ شاعری میں نہ تو نری داخلیت ہے اور نہ ہی نری خارجیت انھوں نے ان دونوں گلدستوں سے عطر کھینچا ہے اور اسے یکجا کر دیا ہے اور یہی ان کی عشقیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے.

* سید محمود حسن قیصر، امروہوی

سید عبد اللہ جائسی لندنی

سید عبد اللہ جائسی، ہندوستان کے ان گنے چنے افراد میں ہیں جنھوں نے یوروپین ممالک میں ہندوستانی ادب کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا اور اس لحاظ سے ان کی خدمات بجا طور پر سراہنے کے قابل ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کے تذکرہ سے تاریخ و ادب کی تمام کتابیں یکسر خالی ہیں جس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ متعین نہیں کی جاسکتی کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ یوروپین ممالک میں بسر ہوا اور کوئی تصنیف ان کی محفوظ نہیں رہ سکی ورنہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے وہ ان لوگوں میں نہ تھے جن پر اہل و علم و ادب کی نگاہیں نہ پڑتیں مجھے بڑی تلاش کے بعد موصوف کے جس قدر حالات مل سکے ہیں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

ولادت و نسب | سید عبد اللہ لندنی، قصبہ جائس، ضلع رائے بریلی (اودھ) میں انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے، ان کا نسب نامہ بائیس پشت کے بعد حضرت امام علی نقیؑ پر منتہی ہوتا ہے۔ موصوف نواب نجم الملک سید نجم الدین نقوی سبزواری فاتح جائس متوفی ۷۲۰ھ کی نسل سے تھے[1]

یہ خاندان کئی نسلوں سے سیادت و امارت اور علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ ان کے والد سید محمد اس نجات علی اپنے زمانہ کی ممتاز اور سر برآوردہ شخصیتوں میں تھے، موصوف ایک عرصہ تک جبل پور میں تحصیلدار یا سب کلکٹر آف ریونیو کی حیثیت سے رہے[2]، نیز ان کے بیٹے سید عبد اللہ کی تصریح کے مطابق چالیس سال تک انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی ملازمت کی۔ غدر ۱۸۵۷ ع میں انہوں نے انگریزوں کے آفیسر کی حیثیت سے ان کی حمایت میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا جس کے صلے میں گورنر جنرل ان کونسل نے سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری سے ۱۸۶۰ ع میں ان کے لئے لائف پنشن مقرر کردی اور خان بہادر

---

* جناب سید محمود حسن قیصر امروہی، اسسٹنٹ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

۱ ۔ اکابر جائس، قلمی مولفہ سر جائسی

۲ ۔ میمورنڈم سر ڈاللہ عریل

کا خطاب عطا کیا۔ آخر عمر میں اپنے وطن لکھنؤ آگئے تھے جہاں ۳۰ نومبر ۱۸۶۷ ع کو ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا[۱]۔

ان کے انتقال پر ای. ایچ. پالمر[۲] نے ۱۰ فروری ۱۸۶۸ ع کو ۱۰ صفحے عربی میں (جن میں ایک مرثیہ اور تاریخ وفات بھی شامل ہے) اور آٹھ صفحے انگریزی میں لکھے ہیں۔ انگریزی حصے کا عنوان ہے:

"An address to the people of India" یہ چند سطریں اس نے جس جذبہ کے تحت لکھی ہیں اس کا اندازہ خود اس کی حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

> ... I feel that in this expressing myself I am but performing my duty, my duty as a friend, to my best of friends, his son, Sayed Abdulla, and my duty as an Englishman

> (میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے اس بیان میں واقعی طور پر اپنا فرض انجام دے رہا ہوں جو مجھ پر دو حیثیتوں سے عائد ہوتا ہے، ایک اس حیثیت سے کہ مرحوم کے بیٹے سید عبداللہ میرے سب سے بڑے دوست ہیں، دوسرے اس حیثیت سے کہ میں ایک انگریز ہوں)

اس کتابچے میں شائع الوقت ممتاز اور مشہور انگریزی اخباروں کے ان تعزیتی نوٹوں کے اقتباسات بھی شامل ہیں جو سید محمد مرحوم کے انتقال پر لکھے گئے۔ یہ نوٹ انگریزی اخباروں کے عام تعزیتی نوٹوں کی طرح ہیں اور ان میں بس سید محمود مرحوم کے حالات زندگی بیان ہوئے ہیں[۳]۔

اس کے علاوہ ان کے کچھ حالات مسٹر ای. ایچ. پالمر کے "Address to the people of India" مورخہ ۱۸۶۸ ع سے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پورا ایڈریس میرے سامنے نہیں البتہ میرے دوست کلب مصطفےٰ صاحب

---

۱ ۔ حاشیہ میمورنڈم سر ڈانلڈ مریل

۲ ۔ ای. ایچ پالمر انگلینڈ کا ایک زبردست ماہر مشرقیات تھا جس نے ان علوم پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جو لندن اور کیمبرج سے شائع ہوچکی ہیں ان میں حسب ذیل تین کتابیں میرے مطالعہ سے گذری ہیں۔

1. Haroun al Rashid (ہارون الرشید), London, 1894
2. Oriental Mysticism! a treatise on the sufistic and unitarian theosophy of the Persian Cambridge, 1857.
3. Concise dictionary of the Persian Language, London, 1949.

۳ ۔ مکتوب جناب کلب مصطفےٰ صاحب جائسی نام مولف مورخہ ۲۲ اکتوبر سنہ ۶۰ ع

جانسی نے اس کے چند اقتباسات مجھ کو ارسال کئے ہیں جو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

یہ ایڈریس ص ۳ سے شروع ہوتا ہے، ممکن ہے پہلے صفحے پر An address to the people of India رہا ہو اور دوسرا صفحہ خالی ہو، صفحہ ۳ پر انگریزی سلطنت کے فیوض کا تذکرہ کرکے صفحہ ۵ پر سید محمد کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے۔ اختصار کی غرض سے صرف ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں،

« سید محمد خان بہادر ابن نجابت علی ابن السید؟ المقوی، ہندوستان کے مسلمانوں میں جس طرح اپنی شاندار ولادت اور علم و فضل میں ممتاز اور متعارف ہیں اسی طرح اپنی سچائی اور وفاداری میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔

مرحوم ہندوستان کے ایک شریف خاندان کی فرد تھے، جس کا سلسلۂ نسب محمد صاحب کے چچا زاد بھائی، علی سے ملتا ہے، وہ سنہ ۱۲۱۵ ھ میں جائس (اودھ) میں پیدا ہوئے، جہاں انہوں نے ایسی تعلیم حاصل کی جو ان کے عہدے اور حیثیت کے لئے موزوں تھی لٹریری سوسائٹی کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوئے اور پالی ٹکس میں دلچسپی پیدا کرنے کے بعد وہ ہمارے گرمجوش حامیوں میں ہوگئے اور بالآخر اپنے نصب العین کو پاگئے ... برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ان کا تقرر ایک ذمے دار اور ممتاز عہدے پر ہوا اس پوزیشن میں انہوں نے ہر شخص کی زریں رائے اپنے حق میں جیت لی، ہر جن لوگوں کا ان سے سابقہ رہا تھا ان کے دل میں مرحوم کی محبت اور عزت کا جو جذبہ تھا وہ ان کے موت کے دن تک برابر بڑھتا رہا میرے لئے ان کی تعریف میں زیادہ کہنا غیر ضروری ہوگا اس لئے کہ (TIMES) کا حسب ذیل اقتباس کافی طور پر ان لوگوں کے جذبۂ احترام اور محبت کو ظاہر کرتا ہے جن کے درمیان مرحوم کی قسمت کو ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے عربی داں طبقے کے فائدے کی غرض سے اس اقتباس کا عربی نظم میں ترجمہ کردیا ہے، یہ امید کرتے ہوئے کہ اس طرح ہندوستان کی ایک ممتاز شخصیت اور برٹش گورنمنٹ کے ایک سچے دوست کی یادگار قائم رہے »

اس کے بعد (TIMES) مجاریہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۸ ع کے (Deaths) کالم

میں ان کے لڑکے سید عبداللہ کی طرف سے حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"At Lucknow on the 30th Nov. 1867 in the 70th year Meer Syed Mohammad Khan Bahadoor formerly the distinguished magistrate and Revenue Collector of Jubbulpore, who after a faithful service of fifty years had received from the British Government an honourary title and a handsome pension ..."

(۳۰ نومبر ۱۸۶۷ ع کو میر سید محمد خاں بہادر نے جو جبل پور میں ایک ممتاز مجسٹریٹ اور ریونیو کلکٹر کی حیثیت سے رہ چکے تھے، ستر سال کی عمر میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا، جنھوں نے آخر میں اپنی پچاس سالہ خدمات کے صلے میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی خطاب اور معقول پنشن حاصل کی)۔

پھر "Death of a distinguished Indian" کے عنوان سے بقیہ ص ٦ اور ص ۷ نیز ص ۸ کے حصے پر (TIMES) کا مفصل ادارتی نوٹ ہے۔ جس کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

Contrary to the majority of his Muslim brethren who are enthralled by the greatest superstition and bigotry and opposed to English education and improvement. ... this enlightened Mohamedan cast off all those illebral feelings... . sent his son at once to the Government college established in Jubbulpore in 1839. This young gentleman, Syed Abdulla was the first Mohamedan boy who commenced learning English here.

(برخلاف اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے جو تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہیں اور اس بنا پر انگریزی تعلیم اور ترقی کے خلاف ہیں...اس روشن خیال مسلمان نے تمام تنگ نظرانہ محسوسات کو نکال کر پھینک دیا... انھوں نے اپنے لڑکے کو فوراً جبل پور کالج جو ۱۸۳۹ ع میں قائم ہوا تھا، بھیج دیا، یہ شریف نوجوان سید عبداللہ پہلے مسلمان طالب علم تھے جنھوں نے وہاں انگریزی کی تعلیم حاصل کی)[1]۔

سید عبداللہ کے ایک چچازاد بھائی سید واجد بن سید محمد حسین، صاحبِ تصنیف تھے، جنھوں نے «اسرار الاشرار» کے نام سے اردو میں ٹھگوں کی واردات پر مشتمل ایک بہت ہی دلچسپ اور مفید کتاب لکھی ہے جو $\frac{۲۲\times۱۸}{۸}$ سے بڑی

---

۱ ۔ مکتوب کلب مصطفےٰ صاحب جائسی بنام راقم ۲۷ اکتوبر سنہ ٦۰ ع

تقطیع کے ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے ، ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک قلمی نسخہ (فل اسکیپ تقطیع پر) «مخزن البکا» کا بھی موجود ہے جس کا نام انہوں نے «کنز البکا» رکھا تھا یہ کتاب ایک مقدمے چودہ مجلسوں اور ایک خاتمے پر جس میں امام حسین ع کے آٹھ خطبوں کا ذکر ہے ، مشتمل ہے . یہ ترجمہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۹ ع بمقام جوہری محلہ لکھنؤ پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا ، آخر میں یہ دعا ہے ، «محتاج ہوں اللہ مجھے زاد سفر دو»

اس کے علاوہ انہوں نے «غصے کا قصہ» کے نام سے بھی ایک کتابچہ تصنیف کیا تھا . مگر اب وہ گویا ناپید ہے . ان کا انتقال شروع دسمبر ۱۹۱۹ ع کو عالم مسافرت میں ہوا [1]

اس خاندان میں اب تک اہل علم و فضل کا سلسلہ قائم ہے ، چنانچہ کلب مصطفےٰ صاحب جائسی جو اس وقت مشاہیر اہل ادب میں ہیں ، سید عبد اللہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں .

سید عبد اللہ حسینی اسی خاندان کے ایک ہونہار فرزند تھے ، افسوس ہے کہ ان کے سوانح زندگی اس قدر تاریکی میں ہیں کہ سنہ ولادت کا بھی متعینہ طور پر پتہ نہیں چل سکا ، البتہ اس قدر تحقیق سے معلوم ہے کہ ۱۸۴٦ ع وہ لاہور رزیڈنسی میں ٹرانسلیٹر (مترجم) ہوکر چلے گئے تھے اور اس وقت تک جبل پور کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد بنارس کالج سے بھی فارغ التحصیل ہوچکے تھے . اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ انگریز آفیسرس کو ہندوستانی کا درس بھی دیتے رہے . اس لحاظ سے ۱۸۴٦ ع میں ان کی عمر بیس سال سے کم کسی طرح تجویز نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ اعلیٰ تعلیم کے مراحل عموماً بیس پچیس سال سے کم میں طے نہیں ہوتے . اس کے علاوہ اس سے کم عمر میں سرکاری ملازمت کا ملنا بھی بعید از قیاس ہے ، اس طرح ان کی ولادت ۱۸۲۵ ع کے کچھ قبل یا بعد قرار دی جاسکتی ہے .

سید عبد اللہ کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی ؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا ، البتہ جبل پور کالج میں ان کا داخلہ ۱۸۳۹ ع میں ہوا ہے ، وہاں انہوں نے بہت جلد انگریزی میں غیر معمولی استعداد پیدا کرلی چنانچہ وہاں جو انگریز آفیسرس

---

۱ - حاشیہ میموریلم سرڈا ملڈ فریل

تھے وہ ان کی ذہانت اور قابلیت سے بڑے متاثر تھے، اور یہی تاثر ان کی آیندہ ترقیوں کا سبب بنا. جبل پور کالج میں تعلیم ختم کرنے کے بعد، ان کے والد نے ان کو تکمیل علم کی غرض سے بنارس کالج بھیج دیا، یہاں تھوڑے ہی عرصے میں وہ انگریزی کے ایک جید الاستعداد فاضل ہوگئے، اسی کے ساتھ انہوں نے اردو، فارسی اور عربی میں بھی قابل ذکر استعداد حاصل کرلی[1].

بنارس کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد انہوں نے اسسٹنٹ اورسیری کا بھی ایک امتحان پاس کیا[2] اور کچھ عرصے بعد وہ انگریزوں کو اردو، فارسی پڑھانے پر مقرر ہوگئے.

بنارس چھوڑنے سے قبل ۱۸۴۶ع میں ان کا تقرر لاہور رزیڈنسی میں ٹرانسلیٹر کی جگہ پر ہوگیا جہاں وہ دو سال رہے، اس کے بعد ۱۸۴۸ع میں اسی عہدے پر پنجاب بورڈ کو ان کا تبادلہ ہوگیا، اتفاق سے اسی زمانے میں ان کا انگلینڈ جانا ہوگیا. جس کا سبب یہ ہوا کہ پیر ابراہیم، برٹش ایجنٹ کی حیثیت سے نواب بہاول پور کے یہاں متعین تھا چونکہ "Multan campaigns" کے زمانے میں اس نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لئے ریاست کے ایک معتمد رکن کی حیثیت اس کو انگلینڈ بھیجا جانا طے ہوا[2]، اس موقع پر سید عبد اللہ اس کی ہمراہی کے لئے بحیثیت سکریٹری اور مترجم کے چلے گئے[3].

قیصر التواریخ حصہ دوم میں بحوالہ اخبار کلکتہ جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے آپ سفارتخانۂ کلکتہ میں محافظ دفتر تھے، اس کے بعد لندن گئے وہاں ایک افسر فوج کی لڑکی سے شادی کرلی، جب واجد علی شاہ معزول ہوکر کلکتہ گئے تو سید عبد اللہ کی ایک عرضداشت آئی تھی جس پر شاہ معزول نے «اصلاح الدولہ» کی مہر کندہ کراکے بھجوائی تھی[4].

یہاں سے سید عبد اللہ کی زندگی کا نیا موڑ پیدا ہوتا ہے. انگلینڈ پہنچ کر انہوں نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلی چنانچہ پیر ابراہیم کے مشن کی مدت ختم ہوجانے کے بعد بھی انہوں نے وہیں رہنا طے کرلیا، جلد ہی یہاں ان کو السنۂ مشرقیہ کی ٹیچری کی جگہ مل گئی، رفتہ رفتہ اس پیشے میں انہوں نے اتنی ترقی حاصل کی کہ

---

۱ - میمورنڈم سرڈانلڈ فریل.　۲ - حاشیہ سید عبد اللہ بر میمورنڈم سرڈانلڈ فریل　۳ - ایضاً.

۴ - اکابر جائس قلمی مولفہ مہر جائسی

لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا[1] ۔ اس جگہ پر انھوں نے سات سال کام کیا[2] ۔ اب انھوں نے ہندوستان پلٹنا چاہا لیکن اس وقت تک ان کے لئے لندن چھوڑنا ناممکن تھا جب تک ہندوستان میں ان کو کوئی اچھا عہدہ نہ مل جائے[3] ۔ سید عبد اللہ اب تک جو مقام حاصل کرچکے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی چنانچہ یہ معہ اپنی بیوی کے ہندوستان واپس آگئے اور یہاں آکر محکمۂ تعلیمات میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر مقرر ہوگئے[4] ۔

انتقال | اکابر جائس میں ہے : دورے پر تھے کہ بمقام منھیاری صوبہ اڑیسہ میں انتقال کیا ، کلکٹر یا جج کے پاس ان کا سر بمہر وصیت نامہ تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں مذہب شیعہ رکھتا ہوں ، چنانچہ ان کی تجہیز و تکفین مطابق مذہب امامیہ کے ہوئی ، ان کی بیوی نے اپنے شوہر کے انتقال کی اطلاع خان بہادر سب جج سید غلام حیدر جائسی کو دی انھوں نے اس کے جواب میں تعزیتی خط لکھا اور اسی میں ان کے بلانے کے لئے لکھا لیکن وہ لندن واپس چلی گئیں ۔

سید عبد اللہ کی صرف ایک حقیقی بہن تھیں ، جن کی شادی جائس میں ہوئی تھی ، ان کی نسل جائس میں ہے خان بہادر سب جج غلام حیدر ان کے سوتیلے بھائی تھے ، جن کا انتقال ۱۹۱۱ ع میں ہوا ان کے دو لڑکے سب جج سید احمد حسین اور منصف سید وجاہت حسین قابل ذکر ہیں ۔

سید عبد اللہ کی اولاد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں مل سکی « اکابر جائس » میں صرف اس قدر ہے ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام « کلیرا » تھا ، اس سے اور بعض اعزاء جائس سے خط و کتابت تھی ۔ مسٹر رکس ڈپٹی کمشنر رائے بریلی ان کے نواسے تھے ، ان کو اس وقت اس کا علم ہوا جب وہ ۵ نومبر ۱۹۱۸ ع کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوکر جانے لگے ،

اردو نظم و نثر کا نمونہ | سید عبد اللہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ، فارسی

---

۱ ۔ حاشیہ سید عبد اللہ پر میمورنڈم سرڈانلڈ فریل
۲ ۔ ایضاً
۳ ۔ میمورنڈم سرڈانلڈ فریل
۴ ۔ اکابر جائس قلمی

اور عربی کے بھی جید الاستعداد فاضل تھے اور یورپین ممالک میں ایک عرصے تک ان ہی زبانوں کی انھوں نے تعلیم دی اس بناپر یہ ناممکن ہے کہ انھوں نے ان علوم پر کوئی کام نہ کیا ہو جبکہ ان کے دوستوں میں ای۔ ایچ۔ پامر جیسے قابل ذکر مولفین کے نام ملتے ہیں، لیکن ان کی کوئی تالیف اس وقت دستیاب نہیں، البتہ ۱۸۶۸ ع میں «اخلاق ہندی» مولفہ میر بہادر علی حسینی کا دوسرا ایڈیشن سید عبداللہ کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوا تھا جو آج قریب قریب بالکل نایاب ہے۔ مجھ کو «رضا لائبریری» کی پرانی کتابوں میں اتفاق سے اس کا ایک (Specimen) مل گیا ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے۔

اخلاق ہندی، جس کی، اصل مفتی، تاج الدین کی مفرح القلوب، فارسی ہے اور میر بہادر علی حسینی، نے زبان ہندوستانی میں اس کا ترجمہ کیا اور وہ، ترجمہ ۱۸۰۳ ع کے مطابق ۱۲۱۸ ھ کے شہر کلکتہ، میں چھاپا ہوا تھا اب بعہد دولت مہد ملکہ معظمہ انگلستان و ہندوستان، کوئن وکٹوریہ دامت سلطنتہا بوزارت رایٹ آنربل سر اسٹافورڈ، نارتھ کورٹ بیرونٹ میمبر آف پارلیمنٹ سکریٹری آف، اسٹیٹ فار انڈیا بہ تصحیح خاکسار بیمقدار سید عبداللہ بن سید محمد، خان بہادر عمران، بپاہ مطبع صاحبان ذیشان ڈبلیو۔ ایچ۔ ایلن اور کمپنی، واقع نمبر ۱۳ واٹرلو پلیس ویسٹ منسٹر لندن میں، پھر مطبوع ہوا، ۱۸۶۸ ع، مطابق ۱۲۸۵ ہجری،

اس کے بعد خاتمے کی عبارت اور ایک قصیدہ ہے جس کو ذیل میں نقل کرتا ہوں، اس سے موصوف کی اردو نثر نگاری اور قوت نظم کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔

خاتمـــــہ

ہو الاول ہو الآخر الحمـد للہ کہ اس کتاب کا اختتام ہوا اور عہد وزارت امیر کبیر سر اسٹافورڈ نارتھکوٹ صاحب بہادر بالقابہ میں نسخہ تمام ہوا اور ان کی توجہ بے غایت اور الطاف و عنایت سے نہ فقط اس کتاب کا بلکہ خود اس فدویت انتساب کا رتبہ بڑھا بقول سعدی۔

سزد گر بدورش بنازم چناں　　　که سید بدوران نوشیرواں

اوصاف اس مجمع علم و کمال اور مرکز حاہ و جلال کے میری کیا جان اور قلم کی کیا زبان ہے جو بیان کروں اس کی ذات حسنہ صفات فضل حی و قیوم سے موجود ہے، میرا تعریف کرنا فضول اور بے سود ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار گوید، عیاں را چہ بیان، مگر جو امر حق ہو اس کو چھپانا گویا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے اور اپنے ولی نعمت کا شکر نہ کرنا کفر ہے من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ اس واسطے بالکل ساکت بھی نہیں رہ سکتا:

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا ٭ چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل بہرحال الفاظ چند سطر اظہار حق بہ خوشامد سے عرض کرتا ہوں، گر قبول افتد زہے عز و شرف. حقیقت حال یہ ہے کہ جس تاریخ سے یہ امیر اس امیر مدبر امور ہند مقرر ہوا ہر طرح سے خیال بہبود ہند اور ہندیوں کا مد نظر رہا. افضال الٰہی اور اقبال شاہی اس وزیر خوش تدبیر کی نیک نگاہی سے سارا ہندوستان آباد ہے اور ہر دل انصاف پسند شاد ہے

یہ سچ ہے کہ اقلیم ہندوستاں ہوئی اس کے اقبال سے بوستاں
شگفتہ ہیں گل، بلبلیں نغمہ سنج شکستہ ہیں سب خار اندوہ رنج

ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بے خطر نہ جاسکتا تھا راہیں ٹھگوں اور ڈکیتیوں سے، بازار دغا بازوں اور جیب کتروں سے، دوکانیں اور گھر نقب زنوں اور چوروں سے حفاظت میں نہ تھیں اور ایک وقت یہ ہے کہ حکومت سرکاری میں راہیں خشکی اور تری کی ریل گاڑی اور دود کش کی آمد و رفت سے پر شور و غوغا ہیں، مال تجارت کڑوڑوں کا آتا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ موتی لئے جاتے ہو یا پوت، سونا لئے جاتے ہو یا پتھر، بازاروں میں جتنی مال و اسباب کی کثرت ہے اتنی ہی کیسہ بروں کی قلت، دوکانوں اور گھروں میں کچھ چوکی پہرے کی حاجت نہیں، رعب سیاست سرکاری ان کا پاسباں ہے، جہاں لڑائی اور خونریزی ہر روز سننے میں آتی تھی وہاں اب سنسان ہے، ہر روز علم کی ترقی اور جہل کی کمی ہے. انصاف سے ظلم کی خرابی اور برہمی ہے، جہاں گائے بیل کی قربانی منع اور آدمی کی از مباحات تھی. بچہ کشی اور ستی ہونا گویا منہ کی بات تھی وہاں مار پیٹ کا توکیا ذکر ہے

کوئی کسی کو گالی بھی اگر دے یا آدمی کے بدلے جانور کی بھی جان کو ناحق لے تو ایسی سزا پائے کہ چھٹی کا دودھ زبان پر آئے۔ بردہ فروشی اور کسب حرام حفاظت رعایا کو تھانے اور پولیس۔ حفاظت ملک کو فوج جرار پیادہ اور سوار ، بری اور بحری ہمیشہ تیار ، مخالف سرکاری زبوں ، اور نشان جہازات عالم کے ، سامنے رایت دولت انگلیزیہ کے سرنگوں ہوتے ہیں۔ یہ عزت کیا کم ہے کہ حکومت ملکہ معظمہ کی سرکوب عالم ہے ، پھر وزیر ایسے پادشاہ ظفر پائگاہ کا کیوں کر ویسا نہو شعر :

وزیرے چنیں ، شہریارے چناں   جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

ہند پر شکریہ اس کا فرض ہے کہ زیر حکومت ایسے بادشاہ معدلت پناہ کے ہے کہ جس کا وزیر آصف جاہ سلیمان سے عقل اور تدبیر میں بڑھ کر ہے۔ میرے اوصاف اس حکومت کے اگر کوئی شخص خوشامد پر محمول کرے تو اس کو لازم ہے کہ احوال ہند کو ایک نظر بچشم انصاف دیکھے۔ مدرسے ، تھانے ، نمایش گاہیں ، دواخانے ، تار برقی ، ڈاک ، مراکب دودی ، ترقی تجارت ، دادرسی مظلوماں ، سرکوبی ظالماں ، رئیس نے انتظام کو معزول کرنا ، اور حاکم منتظم کو اختیار دینا یہ سب باتیں رفاہ کی میرے دعوی پر دلیل ہوں گی اور مخالف کی دلیلیں سب ذلیل ہوں گی ، انصاف شرط ہے جو حصہ ہندوستان کا سرکار نے نہیں لیا دیکھو تو وہاں کیسی خرابی اور ویرانی ہے ، حاکم وہاں کے تھپنی کے تھپنا ، گوبر گنیش مائی کے طیب ، جو الف کے نام لٹھا بھی نہیں جانتے ، رات دن رنڈیوں میں بسر کرتے ہیں۔

صبح تو جام سے گذرتی ہے   شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گذرتی ہے

ان کا وجود کالعدم ہے « چہ خفتہ و چہ بیدار » مگر سب حکام اور راجہ ایسے نہیں ، جناب معزز خطاب مہا راجہ سرگباشی والی پٹیالہ کو دیکھئے کہ اپنے حسن انتظام اور عقل و فہم سے کیسے نیکنام رہے اور پیشگاہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام ملکہا سے تغمائے عزت اور خطاب فرزند خاص ، منصور زماں امیرالامراء مہاراجہ دھراجہ راجیشر مہا راجۂ راجاجگان نرندر سنگھ مہندر بہادر کا ملا اور اب فی زماننا

سری مہاراجہ ادھراج والی کپور تھلہ دام دولتہ جو سرکار انگریز کے خیر خواہ جانی رہے اور جانفشانی میں جان و مال سے دریغ نہیں کیا اور مہمات کابل اور پنجاب میں کیسے کارنمایاں کئے خصوصاً بلوائے ۱۸۵۷ ع میں جو شجاعتیں اور بہادریاں کیں ان کا کیا کہنا یہی کافی ہے کہ بہ جلدوئے حسن خدمات پیشگاہ ملکہ معظمہ سے خطاب فرزند دلبند راسخ الاعتقاد راجہ اندھیر سنگھ بہادر اور ستارۂ ہند کا تمغہ عطا ہوا، جاگیر بھی ملی اور امید قوی ہے کہ اور ترقی مناصب بھی ہو، یہ سب خوبیاں ان کے حسن انتظام اور سرکار کی قدر شناسی کا ثمرہ ہے، تعریف دولتِ انگریزی کا کرنا گویا توصیف ارکان دولت کی ہے، اگر وزراء ایسے نہ ہوتے تو یہ رونقِ سلطنت کہاں ہوتی؟ اگر رائٹ آنریبل سراسٹا فورڈ نارتھکوٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کی نیک نیتی، خوش نصیبی اور تدبیر رسا شریک نہ ہوتی تویہ نیکنامی جو فتح حبش پر ان کی وزارت کے ایام میں حاصل ہوئی، کب ہوتی؟ کیا اعانت ربانی ہے کہ جتنا کام ان کے تحت میں ہے سب مزین بحسنِ انتظام و کامرانی ہے جس قدر اس امیر کبیر کے اوصاف بیان کرو تھوڑے ہی ہیں، اس نیاز مند کو خود ان کی خدمت میں نیاز ہے اس لئے جو کہتا ہوں آنکھوں دیکھی ہے فقط کانوں سنی نہیں جو خوبیاں اس مختصر میں اس عالی ہمت والا دودماں مجمع علم، منبع فیض، معدن جود و احسان کی لکھوں وہ اس سے بہت کم ہونگی جو تواریخ عالم میں ابدالآباد کو نام پر میرے ممدوح کے لکھی جائینگی، میں فقط دعا پر اپنا کلام تمام کروں گا کیونکہ اس کے اوصاف کرنا اور دریا کو کوزہ میں بھرنا میرا کام نہیں جو کچھ میں نے کہا ہے «اندکے از بسیار و مشتے نمونہ از خروارے» ہے

تازیب زباں بود بہ تقریر ٭ تا زینت کاغذ است تحریر
نامت نرود ز نیکنامی ٭ ہر خامہ کند ترا غلامی
سر چشمۂ فیض تو رواں باد ٭ اقبال چو دولتت جواں باد

اس کے بعد حسب ذیل قصیدہ ہے:

قصیدہ

گو نہیں حاصل بخوبی قوت نطق و بیاں
پر مناسب ہے کہ ہوں حمدِ خدا سے تر زباں

وہ خدائے پاک و برتر جس نے احمد کو کیا
رہنمائے جن و انساںؑ، پیشوائے مرسلاں

وہ نبی جس نے علی کو جانشیں اپنا کیا
جانتے ہیں سب، غدیر خم کے جو ہیں راز داں

دونوں کو پہونچے درود اور دونوں کو پہنچے سلام
ان کے لائق اور کیا ہے پاس میرے ارمغاں

شکر خالق میں رہے مصروف خلقت، چاہئے
یعنی بندوں پر وہ ایسے ہے نہایت مہرباں

سلطنت وکٹوریہ کو کی عطا اللہ نے
ہندیوں پر ہے یہ احسانِ خداوندِ جہاں

کون ایسی کوئی گذری ہے نہ آگے ہوئیگی
فیض بخش و داد گستر اہل جود و امتناں

ختم اس پر ہے رعیت پروری و منصفی
ہے عجب عاجز نواز، اہل عطا و مہرباں

خلق و اکرام و مروت میں نہیں اس کا نظیر
قدر اس کی جانتے ہیں خوب جو ہیں قدر داں

پیر گردوں خم پئے تسلیم ہے اس کے حضور
عقل و بخت اس کو دئے ہیں حق تعالیٰ نے جواں

بے سخن وہ باعث اوروشی اخلاق ہے،
کیوں فدا اس پر نہ کیجئے اے دل اپنا مال و جاں

حکم اس کا ماہ سے ماہی تلک حاوی ہے واہ
کیوں نہ ہو توصیف میں اس کی مرا خامہ رواں

اس کے حق میں کر رہے ہیں، اوج و حشمت کی دعا
ساکن انگلینڈ و ہر باشندۂ ہندوستان

ہوں عدو پامالِ غم آفاق میں اس کے مدام
دوست جو دل سے ہوں اس کے وہ رہیں سب شادماں

کیسے کیسے اہل دانش ہیں امیر اس کے رفیق
ہے بجا اک اک کو گر کہئے فلاطون زماں

انتظام ملک کرتے ہیں بآئین بہیں
بندوبست ان کا ہے بیشک باعث امن و اماں

منتخب ان میں سے ہے ممدوح میرا بارتھکوٹ
رائٹ آنریبل سر اسٹافورڈ، مشہور جہاں

وہ مدار کار عالم، مستقل، ذی اختیار
رائق و فائق وہی ہے از پئے ہندوستاں

اس کے اوصاف حمیدہ سے ہے خوش وکٹوریہ
والی روئے زمیں، شاہنشہ ہندوستاں

بادشہ کوئی نہ ویسا ہے نہ ایسا ہے وزیر
دونوں کو رکھے سلامت خالق کون و مکاں

کس قدر اخلاق نے پایا ہے عالم میں رواج
کبر و نخوت کا نہیں باقی رہا نام و نشاں

علم و اخلاق و ادب میں بے نظیر و بے مثال
مفتی تاج الدین کا اک نسخہ ہے مشہور جہاں

بارہ سو اٹھارہ ہجری میں ہوا تصنیف جو
تھے اٹھارہ سو اور تین از سن عیسائیاں

ترجمہ اردو زباں میں پھر کیا اک شخص نے
رکھدیا اخلاق ہندی نام ہو کر شادماں

اسم سامی مترجم ہے بہادر سے شروع
خاتمہ ہے نام کا اس کے علی پر بے گماں

تھی کتاب خوب و زیبا بسکہ علم خلق میں
اور سکھلاتی تھی ہر اک کو زبان ہندیاں

صاحبان عقل و دانش کو خوش آئی اس قدر
کر دیا مشروط اس کو از برائے امتحاں

میں نے جب اس پر نظر کی خوب غور و فکر سے
بیشتر اغلاط پائیں، دیکھیں کمتر خوبیاں

جس قدر ممکن ہوا، میں نے کمال جہد سے
صرف ہمت کو کیا بہر سرور دوستاں

بعد تصحیح مزید آخر اسے چھپوا دیا
دیکھ کر تا اہل دانش اس کو ہوں سب شادماں

ختم طبع اس کا ہوا مطبع میں با لطف تمام
ڈبلیو، ایچ، ایلن اینڈ کو مخر مانی ہیں جویاں

سیزدہ نمبر کے ساکن ہیں یہ واٹرلو پلیس
خاص لندن میں جونزھت بخش ہے بہر رواں

ہو اگر ادراک سال طبع، مطبوع مزاج
ہوئے گا اس بیت کے پڑھنے سے ہر اک کو عیاں

یک ہزار وہشتصد اور شصت وھشت عیسوی
یک ہزار و دو صد وھشتاد و پنج مسلماں

با وجود اہتمام صحت و غور بلیغ
کچھ بھی گر سہو و خطا کا ناظریں پاویں نشاں

لطف و الطاف بزرگانہ سے یہ امید ہے
دامن عفو و عطا میں اس کو فرمائیں نہاں

انکشاف نام کی خواہش اگر بندے کے ہو
انکسار و عجز سے دیتا ہوں میں اپنا نشاں

سید عبداللہ ھندی، نام اس عاجز کا ہے
نام نامی باپ کا میرے ہے مشہور جہاں

حضرت سید محمد، خاں بہادر جائسی
صاحب اعزار و مکنت، افتخار خاندان

ہیں امام عاشر ان کے جد امجد فخر خلق
کون بہتر ان سے ہوگا اور والا دود ماں

رحمت اللہ ان پر ہوئے تا روز قیام
جو ھوئے اس سال ھی میں داحل باغ جناں

اسی کے متصل دوسرا قصیدہ مسٹر ای، ایچ، پامر کا ہے، جس میں اس نے اصل کتاب «مفرح القلوب» اور اس کے مولف «مفتی تاج الدین» نیز مترجم «میر بہادر علی حسینی» کا تذکرہ کرتے ہوئے، آخر میں سید عبداللہ اور ان کے والد «سید محمد» کا ذکر کیا ہے اور کتاب کی تاریخ اشاعت ھجری اور عیسوی دونوں طریقے پر نظم کی ہے۔

چونکہ یہ قصیدہ ایک انگریز کی تصنیف ہے اس لئے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کلام کی روانی اور سلاست، الفاظ اور تراکیب کی برجستگی کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ کلام ایک غیر ملکی کا ہوسکتا ہے۔

قصیدہ من تصنیف مسٹر ای، ایچ، پامر

چونکہ ہے حمد خدا، تاج سر نطق و بیاں
چتر نعت عیسیٔ گردوں نشیں ہو سائباں

کیا عجب، برسائے اختر کے جواہر آسماں
کہکشاں کے جوہری بازار سے ہو شادماں

مورچھل طاؤس لائے اور کلغی خود ہما
دے زر گل کی بنا پوشاک پر زر بوستاں

بوتلیں غنچے بنیں، گلہائے گلشن ہوں گلاس
اور گلابی ہوئے بس رنگ بہار گلستاں

شاہد ناز چمن، رقاص ہوکر آئیں پھر
دے انہیں نقد ثریا کا وہ جھومر آسماں

سب جوانان چمن گائیں بجائیں پیش گل
نغمۂ بلبل کو سن، چکر میں آئے باغباں

یوں صدا نکلے بہم مل کر بجائیں ساز جب
دھوم دربر دھوم درپر دربہ تیرے شادماں

کہکشاں تو ہو سڑک، ذرات تاباں ہوں ہجوم
روشنی میں اس پہ سیاروں کی دوڑیں بگھیاں

آسماں بن جائے پل، خورشید و مہ ہوں لالٹین
اور بجائے سلسلہ تار شعاعی ہوں عیاں

چرخ بنجائے عماری، برق تاباں جھول ہو
فیل ہو ابر سیہ اور رعد ہوئے فیل باں

دھن میں مستی کی ہوا پر جب چلے وہ جھوم جھوم
موج دریا اس کی بیڑی ہو قدم کوہ کلاں

ہمرکابِ ابلق دوراں ہو یہ سارا جلوس
اور سواری میں مرے ممدوح کی ہووے رواں

کون ہے وہ صاحب اقبال و عزت نارتھ کوٹ
رائٹ آنریبل سر اسٹافورڈ ممدوح زماں

حاص خاص ملکۂ عالم، کوئن وکٹوریہ
جس کے ہے زیر قلم، انگلینڈ اور ہندوستاں

گرچہ ہے بلقیس، لیکن ہے سلیمانی اسے
زیر سایہ جس کے ہے عنقا نے ڈھونڈھا آشیاں

وہ سکندر، یہ فلاطوں، وہ سلیماں زمن
آصف عہد اس کو کہئے، بلکہ میں بھولا یہاں

وہ شنیدہ ہیں یہ دیدہ ، اس کا ہے یہ اقتدار
سر جھکائیں والی چین و ختن آکر جہاں

ہر حباب بحر سے ہے بس عیاں ان کا شمار
ہفت کشور میں بنی ہیں جتنی اس کی کوٹھیاں

شغل ہے اس کے جوانوں کا یہی روز مصاف
توپ ، زنبورک ، جزائر رھکلہ ، بندوق و بان

باد پاؤں پر لگائے پھرتے ہیں اس کے سوار
بانک ، برچھی ، تیر و شمشیر و سپر ، ترکش ، کماں

اسکی وہ سنگیں ہے سنگیں ، سنگدل ہوں جسسے موم
کرچ اسکی کرچیں کرتی ہے عدو کی استخواں

ملکۂ کشور ترے سر پر رہے ظلِ اله
خیر خواہ ہند تیرا لطف حق ہو پاسباں

عندلیب خامہ اس گلشن سے نکلا ، نغمہ سنج
اور شاخِ مدعا پر بیٹھ کر ہے سجع خواں

نسخۂ مفتی تاج الدین ، « مفرح القلوب »
در ہزار و ہشتصد ، سہ ، سن و سال عیسیاں

یک ہزار و دو صد و ہجدہ تھے سال احمدی
جسمیں ایک عالم ہوا ہندی میں اسکا ترجماں

نام نامی ہے مترجم کا بہادر یا علی
ترجمہ کا نام ہے «اخلاق ہندی» بے گماں

مطبع مطبوع طبع اہل علم و فضل میں
جسکے مالک ڈبلیو ، ایچ ، ایلن اینڈ کو صاحباں

کارخانہ جن کا ہے واقع بہ واٹر لو پلیس
سیزدہ نمبر بناف شہر لندن ہے دکاں

اس کی ہر کاپی سے کانپے ہاتھ بس بہزاد کا
اس کی ہر کل سے ہے ہیکل نقشۂ ارژ نگیاں

اس کو چھپوایا بصحت، میر عبداللہ نے
میرے مخدوم و مکرم، میرے مشفق مہرباں

حضرت سید محمد خاں بہادر کے پسر
نام نامی حن کا ہے ممدوح و مشہور جہاں

محسن اس احقر کے تھے وہ سید عالی مقام
داغ جن کا ہے دلوں پر حود ،ہ گلرار جناں

چھپ چکی جس دم کتاب انتخاب و لاحواب
تازگی بحشِ عیوں اہل فطنت، نکتہ داں

اس کا ہر صفحہ خیاباں ہے ، روش بین‌السطور
ہر ورق گلرار معنی وہ گلستاں بوستاں

حلد سالِ طبع لکھ اڈورڈ ہنری پالمر
تا کہ ہجری عیسوی، دونوں کا ثابت ہو نشاں

یک ہرار وہشت صداور شصت وہشتِ عیسوی
یک ہرار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلماں

آحر میں ہم «میمورنڈم سر ڈانلڈ فریل» اور اس پر سید عبداللہ کا جو حاشیہ ہے بعینہ نقل کرتے ہیں تا کہ ان کے سوانح حیات کا ایک اہم ماحذ محفوظ ہوجائے۔

* پروفیسر امین چند شرما .

اکبر ۔ ایک مطالعہ

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے ٭ اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر ٭ نظارۂ شاہد معانی کے لئے ۱

اکبر کی زبردست شخصیت ایک عہد آفریں شخصیت ہے . وہ بڑے بذلہ سنج ، مشرق نواز ، ظریف ، محتسب ، شاعر اور صاحب کمال تھے . انکی شاعری کے مخصوص رجحانات اور بذلہ سنجی و ظرافت کی گہری خصوصیات اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی صدائے بازگشت ہے . جدید اردو نظم میں اکبر حالی کے بعد ایک نئی راہ کے خالق ہیں .

ان کے طنز و ظرافت میں تخلیق ہے اس میں اصلاحی پہلو ہے . اکبر کے طنز خالی تیر نہ تھے وہ قوم کے افراد کی اصلاح چاہتے تھے . وہ سماج سے برسر پیکار تھے . معاشرہ میں جہاں ان کو نقص نظر آیا . انھوں نے بھر پور حملہ کردیا . ان کا کلام اس امر کا شاہد ہے .

مشرقیت کے دلدادہ اکبر مغربی طریقوں سے بیزار تھے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور اقدار کے صحت مند عناصر جنہیں مغربی طریقے پیچھے ڈھکیل رہے تھے . ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے . ان کی « رحلت » اکبر کو گوارا نہ تھی . مگر وہ سمجھ رہے تھے : ع یہ موجودہ طریقے راھئی ملک عدم ہونگے .

ان کے تحفظ کی خاطر اکبر قلم لے کر میداں میں آگئے . وہ اخلاق اور مذھب کے امٹ اور تابناک اصولوں سے مسلح تھے . ان کی ہر ضرب کاری کا اثر ہوا . مگر آھستہ آھستہ ان کے دل و دماغ میں ایک بے پناہ کرب پیدا ہو رہا تھا . اس درد سے جو آواز نکلی وہ اکثر کرتی گئی .

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے ٭ مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں
ایسا سنیئے کہ کہنے والا اُبھرے ٭ ایسی کہیئے کہ بیٹھ جائے دل میں ۲

---

* پروفیسر امین چند شرما صدر شعبۂ اردو و فارسی مہاکوشل مہاودیالیہ جبل پور
۱ ۔ کلیات اکبر جلد اول صفحہ ۱۴۱ ۲ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۸

اکبر نے اردو شاعری اور سیاست کو ایک دوسرے کا ترجمان بناکر وقت کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

حالی کی سر سید پسندی اکبر کو گوارا نہ تھی. نہ وہ مغرب کی نقالی کو پسند کرتے تھے . نقالوں کے جسم میں مغربی روح نہ تھی. « ز،ون انجام بہروپیئے » اس تقلید کے مضر اثرات سے بے خبر تھے . اکبر کی دور رس نگاہیں ان کو تاڑ چکی تھیں. اکبر نے ایک جگہ کہا ہے کہ :

آگاہ ہوں معنئ حوش اقبالی سے ٭ واقف ہوں ننائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر ٭ چلتا نہیں کام صرف نقالی سے [1]

مغربی معیشت کے تمام اسباب کی فراھمی وہ اقدار ھندی دل و دماغ میں پیدا نہیں کرسکتے تھے حو اس قوم کی مایہ افتخار ہیں.

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ٭ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ٭ یورپ کا تری رگوں میں کچھ حون بھی ہے [2]

اکبر مغرب ردگی کا خاکہ اڑاتے ہوئے کہتے ہیں :

رفتار ترقی نہ کہیں ناچ نہ ہوحائے ٭ یہ قرأت مصری کہیں کھماچ نہ ہوحائے
توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دل ٭ مغرب کی مگر کوک سے یہ واچ نہ ہوجائے [3]

سر سید پر اکبر کے کلام میں جابجا طنز بار اشارات ملتے ہیں. ذیل کے اشعار میں سر سید کی دھریت اور حالی کی سید مریدی پر اشارہ دیکھئے .

مرید دھر ہوئے وضع مغربی کرلی ٭ نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی
نگاہِ ناز بتاں پر نثار دل کو کیا ٭ زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کرلی [4]

اکبر مشرق پرست اور سر سیــــد کی تحریک مغرب نواز تھی. اکبر اس تحریک کو مشرقی اقـدار کے لئے مضر تصور کرتے تھے اس لئے بلا جھجک

---

۱ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۵۵
۲ ـ ,, ,, ,, ۱۵۵
۳ ـ کلیات اکبر حصہ دوم صفحہ ۶۲
۴ ـ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۳۰ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی مصرعہ کی طرف اشارہ ہے. (حالی)

کہہ دیا : ع زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کرلی :

« دشمن سے دوستی » اپنے اصولوں کو اپنے ہاتھوں مٹانا اور اپنی کمتری اور غیر کی برتری کا احساس و اعتراف ہے ۔ اکبر اس « احساسِ کمتری » کو کسی قیمت پر گوارا نہ کرسکتے تھے ۔

مشرق پرستی میں اکبر کا قلم صرف سر سید اور حالی کے خلاف ہی نہ اٹھا بلکہ انھوں نے حکومتِ وقت پر بھی طنز کیئے ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکبر نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود جس جرأت اور بے باکی سے حکومت وقت اور اس کی تہذیب و تمدن پر شدت سے بھر پور وار کیئے یہ ان کا ہی دل و جگر تھا ۔

وہ مغربی تہذیب کو گمراہ کن تصور کرتے تھے ۔ حالی کی تقلید مغرب کی تحریک پر اکبر کا طنز ملاحظہ کیجئے :

بے ہنر ہوکر جو بیٹھو طعنۂ حالی سنو ۔ با ہنر ہوکر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہمکو تو پیر طریقت نے یہی دی ہے صلاح ۔ قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سنو [1]

اکبر کے کلام کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے عوام سے متعلق ہر تحریک سے دلچسپی لی اور ہر مضر تحریک کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا ۔ جس طریقہ اور تحریک کو اکبر نے غلط سمجھا اور قوم اور اس کے افراد کے حق میں مضرت رساں معلوم ہوئی ۔ اس سے دور رہنے کی انھوں نے ہدایت کی اور پھر اس کی پرواہ نہ کی کہ کس کو برا لگ رہا ہے اور کون ناراض ہو رہا ہے جو حق بات تھی کہہ دی ۔

آئینِ جواں مردان حق گوئی و بے باکی ۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی [2]

اشعار کے پردہ میں انھوں نے سخت تنبیہ کی ۔ یہی اشعار کے باریک پردے ان کی بقائے دوام کے ضامن ٹھہرے ۔ بقول میر

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا ۔ سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا [1]

---

۱ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۲۵۰ ۲ بال جبریل صفحہ ۸۳

اس فنِ منحوس پر اکبر کا ذیل کا شعر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ[1] شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

طنر و ظرافت کے ان نازک پردوں میں آپ کو معاشرتی زندگی کے چند مسائل — پردہ کی موافقت، انگریزی لباس کی تحقیر اور مخالفت، نماز پڑھنے والوں کی مذمت کا رجحان، سر سید تحریک کی مخالفت، مشرق پرستی اور مغربی تقلید سے بیزاری۔ وغیرہ نظر آئینگے۔ اور یہی مسائل اکبر کا پیام ہیں۔ اس پیام کو اکبر نے قطعات اور رباعیات کے مختصر لباس میں بیان کیا ہے جو کچھ کہا ہے مختصر کہا ہے مگر اثر خیز۔ کیونکہ عام طبیعت پند و نصیحت کے طومار کو سننا پسند نہیں کرتی۔ اس کے لئے تو بات مختصر ہو مگر اثر ڈالنے والی۔ ان قطعات اور رباعیات میں آپ کو طنز کے بے پناہ تیر ملینگے۔ آئیے سطور ذیل میں اکبر کے کلام کا سرسری جائزہ لیں۔

ظاہر ہے کہ اکبر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ سر تا سر مذہبی تھا۔ اس میں مذہب اور اخلاق کے اعلیٰ اقدار کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ اقدار اکبر کی ذات میں رچ گئے تھے۔ اکبر کے کلام کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اکبر کی ہر تان مذہب پر ٹوٹتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی ان کو مذہب پر بڑا حملہ معلوم ہوتی ہے۔ جب مغرب پرستی کے طوفان نے مذہب کی اہمیت کو ختم کرکے بے دینی کے رجحانات کو عام کرنا شروع کیا، تو اکبر چلا اٹھے۔

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم
مسجد سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا مذہب جو مٹا تو زور ملت معدوم[2]

مذہب سے آدمیت ہے اور مذہب نہیں تو آدمیت نہیں۔

۱۔ کلیات میر صفحہ ۲۸
۲۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۵

گرجیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں [١]

معاشرت جب تک مذہب کے تابع رہتی ہے، مذہب سے بیگانگی اسے وحشت اور بربریت کا شکار بنادیتی ہے، مذہب سے آزاد معاشرت صرف گناہ کی تاریک پرچھائیں بن کر رہ جاتی ہے۔

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال دونوں جو ہوں مجتمع تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال [٢]

مذہب قانون اور قوم کا محافظ ہے، دونوں کو مخالف تصور کرنا کوتاہ نظری اور جہالت کی دلیل ہے۔

مذہب قانون و قوم کا بانی ہے خالص طاعت عروج روحانی ہے
توہین اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے [٣]

اکبر کے سرتا سر مشرقی ذہن نے مذہب کے بارے میں بہت سنجیدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

تری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست خدا گواہ کہ پکی یہی ہے بات اے دوست
طلب مدد کی نہیں ان سے جو ہیں خود محتاج طلب مدد کی ہے بالصبر والصلوٰۃ اے دوست [٤]

دوسری جگہ کہتے ہیں:

خاطر مضبوط دل توانا رکھو امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہوجائینگی مشکلیں تمہاری آساں اکبر اللہ پر بھروسا رکھو [٥]

نیک اعمال کی ہدایت ذیل کی رباعی میں کرتے ہیں۔

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو [٦]

اس تبلیغ میں انھوں نے لوگوں کے ہنسنے کی پرواہ نہیں کی۔

---

١ - کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ١٤٦
٢ - کلیات اکبر حصہ سوم صفحہ ١٣٨
٣ - " " " " ١٥٥
٤ - " " " اول " ١٤٣
٥ - " " " " ١٤٨
٦ - " " " " " ١٤٨

تائید وضع ملت و دیں کی کرونگا میں اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر[۱]

قوم کی اس لا علاج بیماری پر اکبر کی ہمتِ اصلاح دیکھئے کہ اسے اجل سے تعبیر کر کے اصلاح میں مصروف ہیں۔ دوسری جگہ ڈنکے کی چوٹ کہا ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں[۲]

دین کی پابندیاں لادینی سے ہر حالت میں بہتر ہوتی ہیں اور ان کے نتائج قوم اور سماج کے حق میں ہمیشہ مفید اور صحت مند ہوتے ہیں۔

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے ایک خصلتِ بد واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا[۳]

عموماً یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ اکبر مغرب کے علوم و فنون کے مخالف تھے، حقیقت اس کے برعکس ہے ان کی دور رس نگاہوں نے ان مضرت رسانیوں کو بھانپ لیا تھا۔ وہ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے مانع نہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ عوام مذہب سے بیگانگی اور بیزاری نہ اختیار کرلیں۔

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو لیکن قرآن کی بڑی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو خالق کا کرو خیال تکبیر پڑھو[۴]

وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام اپنی بیش بہا میراث کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کورانہ تقلید کریں۔

رسوا وہ ہوا جو مست پیمانہ ہوا لپکا جو سائے پر وہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست محروم ادھر ادھر سے بیگانہ ہوا[۵]

سطور ذیل میں اکبر کے تعلیم کے متعلق کیا خیالات تھے۔ بیان کئے گئے ہیں۔

اکبر اور تعلیم! اکبر کے اشعار کے مطالعہ سے عموماً عامی کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ وہ تحصیل علم کے خلاف نہ تھے، وہ مغربی تعلیم کے ان اثرات سے ڈر رہے تھے جو مشرقی اقدار کی اعلیٰ روح کو

۱ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۱
۲ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۲۴
۳ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۲
۴ ۔ " " " " صفحہ ۱۴۹
۵ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۲

فنا کر دیتے ہیں۔ مغرب زدگی کے نتائج ان کے سامنے تھے اور ان کی دور رس نگاہوں نے آنے والی تباہ کاریوں کو دیکھ لیا تھا۔

مغرب میں علم و ہنر کی روشنی بہت ہے مگر اس ظلمات میں آب حیات نہیں۔ یہ زندگی کُش امور کی تعلیم دیتا ہے عصر حاضر پر اکبر کے چار مصرعہ ملاحظہ کیجئے۔

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم　　گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
پر چرب زبان نہیں ہے شمع اخلاص　　جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم [1]

اکبر چاہتے ہیں کہ بزم میں اخلاص کی شمع روشن رہے، وہ دلسوزی چاہتے ہیں، موم کا پگھلنا انہیں گوارا نہیں۔ شب کی شمع شبیں محل نظر ہے۔

مغربی علوم اور مغرب زدگی اور اس کی پرستاری نے جو گھناؤنا پن پیدا کردیا ہے وہ ظاہر ہے اس نے اخلاق کی حالت خراب کردی ہے۔

عزت کا راز نیکی میں مضمر ہے۔ تحصیل علم سے وہ انکار نہیں رکھتے۔ مگر اس علم کے وہ مخالف ہیں جو عزت کا نیلام کردے۔

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو　　باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر　　اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو [2]

وہ اخلاق کی صحت اور درستی پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اخلاق کی نادرستی معاشرت میں بڑی خرابی پیدا کردیتی ہے۔ اور یہ وبا کی مانند عام ہوکر پوری زندگی کو سر تا سر معصیت آلود بنا دیتی ہے۔ عشرت کو نصیحت کرتے ہیں۔

تحصیل علوم کر کہ دولت ہے یہی　　اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت　　محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی [3]

یہ نصیحت عشرت (فرزند اکبر) کے نام ہے۔ عام نوجوانوں کی اخلاق کی درستی کی ہدایت کرتے ہیں معصیت سے محفوظ رہنے میں عزت ہے۔

اکبر اس علم کی تحصیل پر زور دیتے ہیں جو صحت مند عناصر کی تعلیم دے۔ اقبال کی نظر میں مفید علم کونسا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

---

۱ - کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۵　　۲ - کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۴۹
۳ - " " " " صفحہ ۱۵۰

من آن علم و فراست با پرِ کاهے نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانه سازد مردِ غازی را

علم حاضر سے دین کی زبونی کے جواب میں علامہ اقبال کے پیر رومی کا ارشاد بھی ملاحظہ کیجئے:

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود [۱]

اکبر نے کہا ہے:

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے [۲]

دوسری رباعی میں کہتے ہیں:

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے اس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے [۳]

ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم سے انسان کے دل و نظر میں نور پیدا ہو سکے بصیرت سوز علم بالکل بے کار ہے۔

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نور طبع پایا نہ گیا پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہوئے [۴]

مذکورہ اشعار سے اکبر کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں علم کے اخلاق سوز نتائج کا ذکر ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں [۵]

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے «دلہن» خوشی سے خود اپنی برات میں [۶]

اطفال میں بو آئے کہاں ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہے، تعلیم ہے سرکار کی

---

۱ ۔ بال جبریل صفحہ ۱۸۰
۲ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۵۲
۳ ۔ کلیات اکبر حصہ اول صفحہ ۱۵٦
۴ ۔ " " " صفحہ ۱۵٦
۵ ۔ " " " " صفحہ ۲۴۹
٦ ۔ کلیات اکبر حصہ سوم صفحہ ۴۷

مختصر یہ کہ اکبر کے کلام کے غائر مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کے کلام میں ایک دور اندیش فنکار کا پختہ شعور ملتا ہے ۔ اس شعور سے اس نے نہایت چابکدستی سے فائدہ اٹھایا ہے اس کی گہری تہوں میں آپ کو شاعر کا خلوص پنہاں ملے گا ۔ اس خلوص کے ساتھ ہی قدرت بیان کے بے پناہ عبور اور اختیار نے حسن بیان کو نکھار دیا ہے ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اکبر کو دل پر بجا طور پر ناز ہے جو باتیں اس کے دل پر گذری ہیں ان کو اس کے سحر بیاں قلم نے اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ اس پہ کشف و کرامات کا شبہ ہونے لگتا ہے ۔ اس نے اپنے مواد اور فن میں دلکش ہم آہنگی پیدا کر کے اور الفاظ کو معنی کا تابع بنا کر اچھوتے اور گوارا انداز میں نہایت کڑوی کڑوی باتیں بیان کی ہیں طرزِ بیان کی اس ندرت میں اس کی عظمت اور مقبولیت کا راز مضمر ہے اکبر اردو کا تنہا شاعر ہے جس نے ہماری سیاسی ، تمدنی ، اخلاقی زندگی کے احساسات کو شعر کے حسین پیکر میں پیش کیا ہے ۔
اقبال نے ذیل کے شعروں میں اکبر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

سر ذروۂ طور معنی کلیمے   بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابر بہارے   گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے [1]

---

١ ۔ تنقیدی اشارے آل احمد سرور صفحہ ٣١

* ڈاکٹر گیان چند

اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ

یکم فروری ۱۹٦۲ ع کے ہماری زبان میں جناب احسن اللہ بی. اے کا مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے اردو کو رومن حروف میں لیکن اردو اعراب کے ساتھ لکھنے کا مشورہ دیا. جنوری ۱۹٦۲ ع کے نوائے ادب میں جناب سید شہاب الدین دسنوی کا فاضلانہ مضمون « اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ : ایک نئی تجویز » ، شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے لغات میں تلفظ کی وضاحت اور ٹائپ کی حد تک سفارش کی ہے کہ تمام حروف منقطع لکھے جائیں جن میں مصمتے (حرفِ صحیح) اردو کے اور مصوتے (حرفِ علت) بین الاقوامی صوتیاتی انجمن I. P. A کے ہوں. موخرالذکر رسم الخط رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے. میں دونوں تجاویز پر محوحیرت ہوں. اگر رومن حروف کا ایک جزو ٹائپ کے لئے موزوں تر سمجھا گیا ہے تو انھیں کلیتاً اختیار کیجئے ورنہ اپنے رسم الخط ہی کی اصلاح کیجئے کھچڑی رسم الخط خسرو کے انمل سے کم نہیں. جو قارئین رومن ہی نہیں بین الاقوامی صوتیاتی مصوتے شناخت کرنے پر قادر ہوں گے وہ رومن مصمتے بھی پڑھنے کے اہل ہوں گے ر e ڈ ـ i i ن ، ڈ i ، ا ɔ ں قسم کی معجون مرکب نہ اردو ہے نہ رومن. یہ دونوں رسوم خط کے ساتھ تشدد ہے.

آج کل اردو رسم الخط کی اصلاح کے بارے میں مختلف مضامین نظر سے گزرتے رہتے ہیں. ان میں اکثر مروجہ رسم الخط ہی میں چند اصلاحیں یہاں اور چند ترمیمیں وہاں ہوا کرتی ہیں. ان مضامین کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اعراب میں کچھ اضافہ کر لیا جائے تو اردو رسم الخط ہمارے تمام الفاظ کا تلفظ بالکل صحت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے لیکن وہ ٹائپ کے لئے اتنا مفید نہیں جتنا منقطع الحروف رسم الخط.

اردو ہندی میں عام طور سے دس مصوتے فرض کئے جاتے تھے. راقم الحروف نے اپنے مفصل مضمون « اردو مصوّتوں کی صحیح تعداد » شائع شدہ نیا دور بابت ستمبر ٦١ ع میں تین نئے مصوّتوں کی نشان دہی کی اور اس طرح اردو میں ۱۳ مصوّتے

---

* ڈاکٹر گیان چند ایم. اے. پی. ایچ. ڈی پروفیسر اردو حمیدیہ کالج بھوپال

قرار دئے. مجھے خوشی ہے کہ محترم دسوی صاحب نے بھی اپنے طور پر ان تین مصوتوں کی طرف توجہ دلائی اور انہیں اِ (اوسط). اَے (اوسط). اُ (اوسط) کا نام دیا. میری رائے میں ان تینوں کا نام بالترتیب خفیف اے یا زیر معروف. خفیف اَے یا زیر اماله دار، خفیف اُو یا پیش معروف ہوسکتا ہے. دسوی صاحب نے نمبر ۱۴ پر جس آواز کا ذکر کیا ہے میں اس کو صحیح نہیں پڑھ سکا لیکن اگر یہ آواز [اَئے] ہے تو یہ مفرد مصوّتہ نہیں جڑواں مصوّتہ (Diphthong) ہے. اس کو اردو کے مصوّتوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا.

صوتیاتی رسم الخط کے دو چارٹ مشہور ہیں .I. P A اور امریکی چارٹ دسوی صاحب کی بیشتر علامات کسی بھی چارٹ کے مطابق نہیں. میری رائے میں دس معروف مصوّتوں کو (.I. P. A) چارٹ کے مطابق لکھا جائے اور بقیہ تین نو دریافت مصوّتوں کو امریکی چارٹ کے مطابق کیونکہ (I P A) میں ان کے لئے کوئی علامت نہیں. اس طرح اردو کے ۱۳ مصوّتوں کی شرح یہ ہوگی

نمبر شمار	اردو نام	اردو علامت	صوتیاتی علامت
۱	یائے معروف	اِی	i
۲	زیر معروف	ـِـ	ɪ
۳	یائے مجہول	اِے	e
۴	زیر مجہول	ـٖـ	E
۵	یائے لین	اَے	ɛ
٦	زبر اماله دار	ـــ	æ
۷	زبر ساده	ـَ	ə
۸	الف ممدوده	آ	a
۹	واو لین	اَو	ɔ
۱۰	پیش مجہول	ـٗـ	ʊ
۱۱	واؤ مجہول	اُو	o
۱۲	پیش معرف	اُ	u
۱۳	واؤ معروف	اُو	u:

ان میں تین نو دریافت خفیف مصوّتوں کے لئے ربر . زیر اور پیش کے آخری حصے کو خفیف سا داہنے ہاتھ موڑ دیا گیا ہے .

دسنوی صاحب کی دو اور تحاویر سے مجھے اتفاق نہیں . آپ چاہتے ہیں کہ رکن تہجی کو علیحدہ کرنے کے لئے (،) استعمال کیا جائے . صورت یہ ہے صوتیات میں رکن کی تعین ایسی ٹیڑھی کھیر ہے کہ بعض اوقات علما بھی شش و پنچ میں پڑجاتے ہیں . عام لکھنے پڑھنے والوں کے لئے اس کی شناخت ناممکن ہے چنانچہ خود دسنوی صاحب سے بھی دو مقامات پر سہو ہوا ہے مثلاً آپ نے کیا (استفہامیہ . ص۵۸ کالم ۲) اور براقی (ص ٦٠) دونوں میں ۲ رکن ظاہر کئے ہیں جب کہ واقعتاً کیا میں ایک رکن اور براقی میں تین رکن ہیں [۱] . در اصل صوتیاتی رکن اردو تلفظ کے لئے کسی مصرف کا ہے بھی نہیں . عام تصور میں «قلم» میں ایک اور «تبصرہ» میں دو رکن ہیں حالانکہ صوتی اعتبار سے اول الذکر دو اور مرخر الذکر تین ارکان پر مشتمل ہے . اس لئے رکن کی تقسیم سے چشم پوشی کرجانے ہی میں عافیت ہے .

دسنوی صاحب کی دوسری تحویز ہے کہ آدھی آواز کے آگے [:] لگایا جائے . مجھے برار عاجری کے ساتھ اس سے بھی اختلاف ہے . صوتیات میں [:] نشان مصوّتے کو طویل اور مصمّتے کو مشدد دکھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے قطع نظر جن آوازوں کو دسنوی صاحب نے نصف فرض کرلیا ہے وہ نصف ہیں ہی کہاں . کیا (سوالیہ) ، پیار ، سواگت ، کی اصل یہ ہے کہ ان الفاظ کی ابتدا میں دو مصمّتے ہیں جن کے درمیاں کوئی مصوّتہ نہیں اس کی وجہ سے یہ مصمّتے ملاکر ادا کئے جاتے ہیں . ان میں سے پہلا مصمّتہ ساکن ہے اور دوسرا متحرک . دسنوی صاحب کے مجوزہ قاعدوں کے مطابق ان الفاظ کا صحیح صوتیاتی املا یوں ہوگا .

کیا ـ ک ے a ; پیار ـ پ ے a ر ; سواگت ـ س و a گ ə ت

ان الفاظ میں پہلے مصمّتے کے بعد کسی مصوّتہ کا شائبہ نہیں .

۱ـ اس سے پہلے کا لفظ «براق» صحیح لکھا گیا ہے براقی بھی حرف ر اور a کے بعد (،) چھپنے سے رہ گیا تھا (ادارہ)

لیکن ہمارے تلفظ میں محض مصوّتوں ہی میں التباس کا اندیشہ نہیں اور بھی کئی مشابہ اصوات ہیں جن میں ہمارا رسم الخط امتیاز نہیں کرپاتا. ان پر غور کئے بغیر بحث تشنہ رہ جاتی ہے مثلاً ذیل کے الفاظ میں [ن] کی مختلف آوازیں ملاحظہ ہوں.

۱ گنوار ، پانچ
۲ ڈھنڈھورا ، گونڈا
۳ رنج ، رنگ
۴ رندا ، ڈنکا
۵ انقلاب ، تنکا ، کان پور

ان میں سے اگر ۳ اور ۴ کو بھی ہم ایک فرض کرلیں تب بھی ن کی غنائیت کے کم از کم چار درجے ظاہر ہوتے ہیں. اسی طرح انگریزی لفظ pen کے حرف علت کو صحت سے پیش کرنے پر اصرار ہے تو love, call, lord اور ہندی لفظ माधव, अवतार کے صحیح تلفظ پر بھی توجہ کیجئے اعراب کی مدد سے مروجہ رسم خط میں تلفظ کی یہ تمام نزاکتیں کما حقہ واضح کی جاسکتی ہیں چنانچہ راقم الحروف کی اس نوع کی تجاویز ہماری زبان اور ماہ نو کراچی میں زیر اشاعت ہیں جو ان سطور کی اشاعت تک غالباً سامنے آچکی ہونگی لیکن ٹائپ کے سلسلے میں ان پر وہی اعتراض کیا جاسکتا ہے جو موجودہ رسم الخط پر ہے.

خالص اردو نیز سے بھی ایسا منقطع الحروف رسم الخط تیار کیا جاسکتا ہے جو صوتیاتی بھی ہو اور اعراب کا استعمال کم سے کم کرے لیکن رسم الخط کے معاملے میں زمانہ کسی انقلابی ترمیم پر صاد نہیں کرسکتا اس لئے فی الوقت محض خفیف سی اصلاحوں ہی پر قناعت کرنی پڑتی ہے

[« اردو ٹائپ اور تلفظ کا مسئلہ » کے عنوان پر « نوائے ادب » کے پچھلے شمارے میں فاضل مضمون نگار نے جو تجویز پیش کی تھی وہ محدود مقصد لئے ہوئے تھی. یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اردو میں تلفظ کی مروجہ علامتیں نا کافی ہیں اس لئے ان میں اضافہ ہونا چاہئیے. کن کن حرکتوں کے لئے علامتیں مقرر ہونی چاہئیں اس پر بھی تقریباً اتفاق ہے. اس کے بعد بحث کا دائرہ صرف

دو نکتوں پر مشتمل رہ جاتا ہے۔ اولاً تو یہ کہ حرکتوں کی نشانیوں کی شکل کیا ہو، دوم یہ کہ یہ نشانیاں کس طرح لگائی جائیں یا کہاں رکھی جائیں جن سے تلفظ کی ادائگی میں آسانی ہو؟ دسوی صاحب نے اپنی تجویز کو ٹائپ کی طباعت میں لغت نویسی اور لغت کے مضامین تک ہی محدود رکھا ہے۔ ان کی تجویز ایک ٹکنکل دقت کا حل پیش کرتی ہے اور اس میں مذکورہ بالا دونوں نکتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک علامتوں کی شکل کا تعلق ہے، ان میں مناسب ردّو بدل ممکن ہے۔ اصل مسئلہ ان کے مجوزہ اصولوں کا ہے۔

گیان چند صاحب کا اعتراض کہ اردو رسم خط میں IPA کی علامتوں سے کھچڑی کا مزہ پیدا ہوگا، زیادہ وقیع نہیں، اولاً تو یہی محل نظر ہے کہ IPA کی علامتیں کس حد تک رومن رسم خط کے حروف مانی جا سکتی ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اردو میں رومن حروف کا استعمال بڑی آزادی کے ساتھ علم کیمیا کی کتابوں میں کرتے رہے ہیں اور کسی نے اب تک اس کے خلاف نہ تو آواز اٹھائی ہے نہ نعم البدل تجویز کیا ہے۔ کیمسٹری کے symbol اور equations رومن حروف اور ہندسوں میں لکھے جاتے ہیں جس طرح وہ طریقہ محدود مقصد کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح دسوی صاحب کی تجویز کا دائرہ بھی محدود ہے۔ عام طریقہ تحریر کے لئے نہ صرف لیتھو بلکہ ٹائپ میں بھی مروجہ اعراب ہی قائم رہینگے کیونکہ یہ کہیں کہیں صرف اشارے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

دسوی صاحب نے لغت کا جو نمونہ اپنی تجویز کے مطابق شائع کرایا ہے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی ہے عام طور سے انگریزی ڈکشنری میں ہر صفحے کی نچلی سطر میں مخصوص علامتیں نمونوں کے ساتھ درج ہوتی ہیں جو تلفظ کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح اردو ڈکشنری میں بھی یہ التزام قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے ڈکشنری کی طباعت میں جو سہولتیں میسر ہونگی ان کا ذکر دسنوی صاحب اپنے مضمون میں کرچکے ہیں۔

رکن تہجی کے بارے میں گیان چند صاحب کا مشورہ ایک طرح سے فراریت کی دعوت دیتا ہے۔ انگریزی سے زیادہ بے اصول شاید ہی کوئی اور زبان ہوگی نہ ہجا کا اصول برتا جاتا ہے نہ تلفظ کا، پھر بھی انگریزوں نے ساری

ہے اصولی کو معیاری بناکر صحیح طریقے سے اپنی زبان سیکھنے کا سامان مہیــا کردیا ہے۔ ہم بھی اپنے الفاظ کے رکن تہجی (syllable) کو چاہیں تو معیاری بنا سکتے ہیں اور اس کام میں خود گیان چند صاحب جیسے محققین کافی مدد پہنچا سکتے ہیں۔

یہ سارا مسئلہ اہم ہے ، ضرورت ہے کہ دوسرے ماہرین بھی اس طرف توجہ فرمائیں۔ چونکہ یہ بحث اردو ترقی بورڈ کی محسوس کی ہوئی ایک دقت سے شروع ہوتی ہے اس لئے ہم اس بورڈ کے ارکان سے بھی امید کرتے ہیں کہ وہ تحریر اور اعتراض پر روشنی ڈالیں۔ ادارہ]

ہندوستانی سلکشن

نواے ادب بابت اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ ع میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اس میں صفحہ ۳۷ پر ایک غلطی رہ گئی ہے۔ اس کی طرف جناب محمد خاں صاحب نے توجہ دلائی ہے۔

صفحہ ۳۷ میں ایک بیان یہ ہے کہ:

« جمع «ون» کی جگہ «ان» سے اور اکثر ایسی جمعیں مونث کی جگہ مذکر ہوجاتی ہیں۔ »

یہ بیان نا مکمل اور گمراہ کن ہے۔ اصل عبارت یہ ہونا چاہئے کہ بعض جمع «ون» یا «ی ن» کی جگہ «ان» سے بنائی گئی ہیں۔ اور اگرچہ واحد میں یہ سب الفاظ مونث ہیں لیکن جمع بن جانے کے بعد ان کو مذکر کی طرح استعمال کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

تبصرے

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ابن ماجه اور علم حدیث

از مولانا محمد عبدالرشید نعمانی،
ناشر: نور محمد مالک اصح المطابع، آرام باغ، کراچی،
کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ تقطیع کلاں، کل صفحات ۳۶۰
قیمت: مجلد مع گرد پوش آٹھ روپیے۔

ابتدا میں دو صفحات پر اجمالی فہرست مضامین ہے، پھر چھ صفحات پر تفصیلی فہرست ہے، پھر صفحہ ایک سے ۲۴۸ تک اصل کتاب ہے، اس کے بعد صفحہ ۲۵۱ سے صفحہ ۳۵۳ تک اشاریہ ہے جس میں اسماء رجال، اسماء اماکن اسماء قبائل و جماعات اور اسماء کتب کی فہرستیں ہیں، آخر میں دو نقشے مشرق وسطی سے متعلق ہیں اور ایک نقشہ خاص رسول‌الله صلی‌الله علیه وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ سنہ ۱ ھجری سے سنہ ۴۰ ھجری تک کے احوال و مقامات پر مشتمل ہے، اور تین صفحات میں غلط نامہ درج ہے

احادیث کی کتابوں میں صحاح ستّہ مشہور مجموعۂ احادیث ہے جسے مسلمانوں نے تیسری اور چوتھی صدی ھجری سے لیکر آج تک نہایت اہم شمار کیا ہے، اس مجموعہ میں ایک کتاب سنن ابن ماجہ رحمۃاللہ علیہ کے نام سے ہے یہ کتاب ان ہی امام ماجہ رح کے احوال میں ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ تیسری صدی ھجری کے مسلمانوں کی محدثانہ سرگرمیوں کی نہایت معتبر و مستند اور مفصل تاریخ ہے۔ اس کتاب کے لئے یہ تعارف کافی ہے کہ۔

«کہنے کو یہ امام ابن ماجہ رح کی سوانح عمـــری ہے، لیکن در حقیقت تدوینِ حدیث کی تفصیلی تاریخ ہے، اور مسلمانوں کی ان جانفشانیوں کا مرقع ہے جو انہوں نے محمد رسول‌الله صلی‌الله علیه وسلم کی تعلیمات کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کے لئے اٹھائی ہیں تا کہ امانت وحی کی ذمہ داری میں جو اس

امت کے سپرد کی گئی تھی، کسی قسم کا رخنہ نہ آنے پائے، اور اللہ کی حجت تمام اہل ملل و ادیان پر تمام ہوجائے» مصنف بجا طور پر اپنی تلاش و جستجو میں کامیاب ہیں، اور اردو زبان میں علم حدیث اور تاریخ حدیث پر جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جارہا ہے یہ کتاب اس میں بیش بہا اضافہ ہے. چونکہ مصنف کے سامنے منکرین حدیث کا مطار اور پس منظر ہے اس لئے کتاب میں بغیر کسی تصریح کے ان کی ہفوات و مزعومات کا پردہ بھی چاک ہوگیا ہے. امام اعظم رح اور ان کے تلامذہ کی حدیث دانی پر مصنف نے جو ضمنی روشنی ڈالی ہے. وہ بھی اس کتاب کا قابل قدر حصہ ہے. فٹ نوٹ کی کثرت اگرچہ بظاہر ذوق پر گراں گزرتی ہے مگر مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کیسی کیسی نادر باتیں ہیں، ضرورت ہے کہ اس طرح کی خالص علمی اور دینی ٹھوس کتابیں لکھی جائیں تا کہ اوچھے ذہن و فکر کے لوگ دینی احکام و قوانین خصوصاً احادیث رسول کے بارے میں اپنی بے بضاعتی کے با وجود غلط راہ نہ پیدا کرسکیں، اللہ تعالی مصنف اور ناشر کو جزائے خیر دے وہ اس طرح کے کام کرکے اسلام کی خدمت کر رہے ہیں.

ملفوظات شاہ عبدالعزیز رح

مترجمین مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام‌اللہ شہابی،
ناشر. پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، ۱۲ میری روڈ، کراچی ۳
کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط تقطیع کلاں قیمت غیر مجلد سات روپے بارہ آنے.

یہ کتاب شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رح کے سوانح حیات، ملفوظات، کمالات اور مجربات پر مشتمل ہے، پیش لفظ ڈاکٹر سید معین‌الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے لکھا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ

« شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات بھی اس طرح آپ کے ایک مرید نے جمع کئے، جو دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے، افسوس کہ جامع کا نام نہ معلوم ہوسکا .... مولوی سراج‌الدین نے مولوی عظمت الہی ن مولوی محمد ہاشم سے ملفوظات کا اردو ترجمہ کراکے طبع و شائع کیا، اس میں ترجمہ کی بیشمار غلطیاں ہیں اور اکثر عبارتیں ترجمے سے چھوٹ گئی ہیں. مدت سے یہ کتاب نایاب

تھی » ص ۷ . کمالات عزیزی اور مجربات عزیزی کے بارے میں یہ نوٹ ہے :
« کمالات و مجربات کا متن دستیاب نہ ہوسکا، اس لئے سابق ترجمہ کے آخر میں جیسا موجود تھا بعینہ نقل کردیا گیا ہے ص» ۲۲۵. سابق ترجمہ کی غلطیوں اور عبارتوں کے چھوٹنے ہی پر بات موقوف نہیں بلکہ مترجمین نے یہ لکھا ہے کہ :
« بعض مقالات قابل توجہ ہیں، کہیں کہیں موضوع اور ضعیف روایات سے استدلال کیا گیا ہے، شاہ صاحب کی ممتاز شخصیت اور علمی حیثیت بالخصوص علم حدیث پر عبور اور مہارت کے پیش نظر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شاہ صاحب کے ملفوظات کا جزو ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات نے مکمل احتیاط سے کام نہیں لیا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی قول کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا، بہر حال ہم نے چند عبارتوں کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ کسی طرح بھی ملفوظات کا جزو نہیں ہوسکتیں ترجمہ کرنے میں حذف کردیا ہے » ص ۴.
کتاب کے مترجمین اور محققین کی ان عبارتوں کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا معیار علم و تحقیق کی دنیا میں کیا ہوگا؟ افسوس کہ مترجمین مصححین نے ترجمہ پر نظر ثانی کے باوجود کتاب کو تقریباً پرانی ہی زبان میں باقی رکھا ہے

اس کتاب میں حقائق کے مقابلہ میں عجائب و غرائب زیادہ معلوم ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رح کی سوانح اور ان کے علوم و فنون پر کوئی صاحب ذمہ دارانہ کام کرکے، ایک اہم قرضہ کو ادا کردیں، افسوس کہ حضرت شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد اس خاندان میں سب سے زیادہ صاحب تصانیف ہوئے اور علم و فضل میں ان کی جامعیت و مرکزیت کے باوجود آج تک ان کی کوئی جامع سوانح عمری نہیں لکھی جاسکی، ان تمام باتوں کے باوجود اس کتاب میں اہل علم و اہل نظر کے لئے بہت سی باتیں کام کی ہیں.　　(ق ـ ا ـ م)

تبسم

از ادیب مالیگانوی
ملنے کا پتا: قصر الادب، مالے گاؤں، ضلع ناسک
قیمت: پانچ رُپے۔

« تبسم » ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ادیب کے کلام میں غزل کی تقریباً تمام پاکیزہ و شستہ روایات پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے جذبات عشق و واردات قلبی کی اچھی عکاسی کی ہے ان کے یہاں حسن کی نیرنگی، عشق کی تڑپ اور عاشق کی نیاز مندی کے خوشگوار مرقع ملتے ہیں ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی رجائیت ہے ان کو آنسوؤں میں بھی تبسم نظر آتا ہے اگرچہ ان کا کلام زبانوں کی غلطیوں سے پاک نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ان کا اسلوب بیاں اچھا ہے۔ اس میں شگفتگی ہے۔ متانت ہے۔ نرمی ہے۔ ان کی متانت نے ان کے کلام کو وقار اور وزن بخشا ہے ان کے نرم لہجہ نے اسے موثر بنا دیا ہے مندرجۂ ذیل اشعار میں ان خصوصیات میں سے بعض کو دیکھا جاسکتا ہے:

رکھ کے سر تیرے آستانے پر عشق ہنستا رہا زمانے پر
اڑ گئے ہوش سامنے ان کے دور پہنچے فریب جانے پر

میں سناتا تو ہوں روداد محبت لیکن درمیاں میں جو تیرا نام نہ آنے پائے
ویرانیاں دیار محبت میں ہیں وہی تم غیرت بہار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

مجھے تو چین نہیں ہے کشاکش غم سے وہ شے ہے کیا جو تمھیں بیقرار کرتی ہے
اب جو کچھ راز محبت کو سمجھا ہوں ادیب لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جاتا ہے

ادیب اگرچہ غزل کے شاعر ہیں اور ان کا کلام جیسا کہ اوپر کہا گیا بہ حیثیت مجموعی عشق کی نیرنگیوں اور کیفیتوں کی عکاسی تک محدود ہے۔ لیکن وہ صرف تصور جاناں ہی کئے ہوئے نہیں بیٹھے رہتے۔ وہ رفتار زمانہ اور حوادث

عالم پر بھی نظر رکھتے ہیں. مگر انھوں نے اپنی شاعری کو پروپگنڈا نہیں بنایا. ان کے اس قسم کے اشعار میں بھی شعریت برقرار ہے. ان کے یہاں چیخ پکار اور نالہ و شیون نہیں، اضطراب ہے. اضطراب کے ساتھ ولولہ ہے، عمل کا پیغام ہے، انقلاب کی امید ہے. مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار پڑھئے:

نشاط زیست سے معمور کوئی افسانہ　　یہ آنسوؤں سے بھری واردات ختم کرو
عطر کش ہیں جن کے پسینوں سے حرم　　وہ کیوں تنگ ہوں دانے دانے کی خاطر
شور تو یہ ہے کہ تقدیر چمن جاگ اٹھی　　پھول کیوں شاخ پہ خنداں نہیں ہونے پاتے
ظلمت شب میں دیکھتا ہوں ادیب　　اہتمام اک نئے چراغاں کا

کتاب صوری حیثیت سے بھی اچھی ہے. کتابت نہایت عمدہ ہے. جلد بھی دلآویز ہے.

(ع. ر. ق)

مقالـــه نمـا

مرتب.

حامد اللہ ندوی

معاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین خیاڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱ آر ۔ اے مہرا

اسلام اور اجتماعی زندگی

(الفرقان لکھنؤ ۔ جمادی الاول ۸۱ ھ ص ۶ ۔ ۵۱)

ایک ہندو وکیل کے مقالے کا اردو ترجمہ ہے ۔

۲ ابو الاعلی مودودی

ایک اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ

(ترجمان القران لاہور ۶۱ نومبر)

۳ ابوالاعلی مودودی

سنت کی آئینی حیثیت — ایک اہم مراسلت

(ترجمان القران لاہور منصب رسالت نمبر ۶۱ ستمبر)

اس میں وہ مراسلت درج ہے جو ڈاکٹر عبدالودود اور مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے درمیان سنت کو اسلامی آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلہ پر ہوئی تھی ۔

۴ ابوالاعلی مودودی

عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ

(ترجمان القرآن لاہور منصب رسالت نمبر ۶۱ ستمبر)

اسلامی قانون کے بعض بنیادی مسائل پر جسٹس محمد شفیع کے دیے ہوئے فیصلہ کا ترجمہ اور اس پر مولانا مودودی کا تفصیلی تبصرہ ۔

۵ امام الدین ابو محمد

نظریہ اوتار اور عقیدۂ رسالت

(زندگی رامپور ۶۱ نومبر دسمبر)

مذکورہ مضمون کی تیرھویں اور چودھویں قسط

۶ امین احسن اصلاحی

حروف مقطعات

(جامعہ ۶۱ نومبر ۔ ص ۱۵ ۔ ۱۹)

حروف مقطعات قرآنی پر مولانا حمید الدین فراہی کے نقاط نظر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے ۔

۷ امین عفیفی عبدالاله

(معارف اعظم گڈھ ۶۱ نومبر)

اسلام اور دور جدید کے اقتصادی مذاہب

۸ رحمانی عبدالروف

جب اسلام کارفرما تھا

(تجلی دیوبند ۶۱ اکتوبر نومبر دسمبر)

اسوۂ رسول و صحابہ کا تجزیہ قسط ۲ ۔ ۳

۹ رشید احمد سید

اسلام کا نظام زکوٰۃ

(فاران کراچی ۶۱ اکتوبر ۱۵ ۔ ۲۸)

۱۰ سمپورنانند

مسلمان اور ہندوستانی پوروج

(الفرقان لکھنؤ جمادی الثانی ۸۱ ھ ص ۱۰ ۔ ۵۲)

مولانا ابوالحسن ندوی کے مضمون کا جواب اور مدیر الفرقان کی طرف سے جواب الجواب ہے ۔

١١ شاہ محمد جعفر
صوفیا اور تطہیر رقص
(ثقافت لاہور ٦١ اکتوبر ۴٧-۵۵)
رقص کی تعریف اور اس کے تعمیری پہلوؤں کا تجزیہ

١٢ صدیقی عبدالحمید
نبوت کی ضرورت
(ترجمان القرآن لاہور ٦١ دسمبر)

١٣ ظفر احمد عثمانی
اسلام میں عورت کا عائلی مقام
(فاران کراچی ٦١ نومبر ۵-۴۴)
ممتاز جہاں بیگم کی کتاب «عورت کا عائلی مقام» پر ایک تفصیلی بحث

١۴ عامر عثمانی
پرویزیات
(تجلی دیوبند ٦١ اکتوبر نومبر)
منکرین حدیث کے ان نگارشات کا تجزیہ جو احتہاد کے نام سے مسلمانوں کے سامنے پیش کی جارہی ہیں.

١۵ عبداللہ خان
نماز بوقت خطبہ پر محققانہ بحث
(برہان دہلی ٦١ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
مذکورہ مضمون کی چوتھی پانچویں اور چھٹی قسط

١٦ عمری جلال الدین
رسول کی پہچان
(زندگی رامپور ٦١ اکتوبر)
ان خصوصیات کی تفصیل جو ایک رسول کو عام آدمی سے الگ کرتی ہیں

١٧ قمر عثمانی
اسلام کی اخلاقی تعلیمات
(فاران کراچی ٦١ دسمبر ١٧-٢۴)

١٨ ندوی ابوالجلال
ہمارا قانون میراث
(نیا راہی کراچی . ٦١ دسمبر ص ١٣-١٦)
قرآن مجید کی روشنی میں اسلامی تقسیم میراث کی تشریح کی گئی ہے.

١٩ ندوی ابوالحسن علی
مسلمان اور ہندوستانی پوروج
(الفرقان لکھنؤ . جمادی الاولی ٨١ ھ ص ۵-١٣)
مسلمانوں کے ہندوستانی اسلاف کا پتہ لگایا گیا ہے.

٢٠ ندوی شاہ معین الدین
دین رحمت
(معارف اعظم گڈھ ٦١ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
اسلام کا تعارف دین رحمت کی حیثیت سے پہلی دوسری اور تیسری قسط

٢١ ندوی محمد حنیف
غزالی اور آداب معاشرت
(ثقافت لاہور ٦١ اکتوبر، نومبر)
غزالی کے بیان کردہ آداب معاشرت کی تفصیل دو قسطوں میں

٢٢ نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن لاہور ٦١ نومبر، دسمبر)

مذکورہ مضمون کی چوتھی اور پانچویں قسط

۲۳ ہاشم امیر علی
قرآن مجید کے حروف مقطعات
(جامعہ ۔ ۶۱ نومبر ص ۳۔۱۴)
خدا نے اپنے رسول کو انفرادی طور پر جن طریقوں سے مخاطب کیا ہے ان کی وضاحت کی ہے ۔

۲۴ یعقوب شاہ
مسئلہ سود
(ثقافت لاہور ۶۱ دسمبر ۳۳۔۴۷)

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۵ خالدی ابونصر محمد
ہندوستان کے متعلق جاحظ کے اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ
(برہان دہلی ۶۱ اکتوبر، نومبر دسمبر)
مذکورہ مضمون کی چوتھی پانچویں اور چھٹی قسط ۔

۲۶ دردانی معین الدین
حضرت نجم الدین کبری فردوسی
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ دسمبر)
حضرت فردوسی اور سلسلہ فردوسیہ کا تعارف ۔

۲۷ سروری عبد القادر
حافظ عبد الرحمان احسان
(اجکل ۶۱ نومبر ۱۷۔۲۷)
شاہ عالم ثانی کے عہد کے ممتاز استاد حافظ عبد الرحمان احسان کا تعارف پیش کیا ہے ۔

۲۸ ضیاء الحسن فاروقی
جمال الدین افغانی
(جامعہ دہلی ۶۱ دسمبر ص ۵۹۔۶۸)
انیسویں صدی کے ایک اسلامی مفکر و عالم کا تذکرہ ہے ۔

۲۹ غلام مرتضی
حکیم سائی کا سال وفات
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ اکتوبر)

۳۰ غوری شبیر احمد خان
شیخ بو علی سینا کی عبقریت
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ اکتوبر، نومبر)
مذکورہ مضمون کی، دوسری اور تیسری قسط ۔

۳۱ مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی ۔ مسلسل
(الفرقان لکھنؤ ربیع الثانی ۸۱ ھ ص ۲۰۔۴۱)
مجدد الف ثانی کے حالات زندگی تاریخ کی روشنی میں پیش کئے ہیں ۔

۳۲ مسعود احمد
شیخ احمد سرہندی ۔ مسلسل
(الفرقان لکھنؤ جمادی الاول ۸۱ ھ ص ۱۴۔۲۱)
مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے حالات زندگی بیان کئے ہیں ۔

۳۳ مسعود احمد

شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
مسلسل
(الفرقان لکھنؤ جمادی الثانی ۸۱ھ ص ۲۵-۳۸)
مذہب و شریعت کے میدان میں شیخ مجدد الف سرہندی کے اصلاحات کا تذکرہ ہے۔

۳۴ مسعود احمد
شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے
(معارف اعظم گڈھ ۶۱ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
مذکورہ مضمون کی پانچویں چھٹی اور ساتویں قسط۔

۳۵ مظہر امام
مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی
(صبح نو پٹنہ ۶۱ اکتوبر ص ۱۵-۱۹)
مشہور صحافی اور مصنف مولانا ملیح آبادی کی زندگی کا جائزہ ہے۔

۳۶ ملا واحدی
شاہ ولی اللہ صاحب رح
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۱ اکتوبر ۲۵-۳۱)
شاہ ولی اللہ کی مختصر سوانح عمری پیش کی ہے۔

۳۷ مہدی نواز جنگ
مہاراجہ کشن پرشاد
(صبح امید - گجرات نمبر ۲ ص ۷۷-۸۰)
حیدر آباد کے سابق مدارالمہام سر کشن پرشاد کے بارے میں تاثراتی ریڈیو تقریر ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۳۸ بوہیرے عبد الحمید
گجرات کی سیر
(صبح امید بمبئی - گجرات نمبر ۲ ص ۹۹-۱۰۷)
مدیر صبح امید کا رپورتاژ ہے۔

۳۹ پشکر چندر واکر
کھمبایت میں مسلم عہد کی تعمیرات
(صبح امید - گجرات نمبر ۲ ص ۹-۶۳)
مسلمانوں کے فن تعمیر پر ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔

۴۰ شفیع الرحمان
ہندوستان میں چینی سیاح
(جامعہ دہلی ۶۱ دسمبر ص ۶۳-۸۱)
چین کے کئی ایسے سیاحوں کا ذکر ہے جو ہندوستان آتے رہے۔

۴۱ شفیق عہدی پوری
مزدک اور مزدکیت
(ثقافت لاہور ۶۱ اکتوبر ۳۱-۳۴)
مزدک کی تعلیمات کا تعارف۔

۴۲ فارق خورشید احمد
حضرت عثمان کے سرکاری خطوط
(برہان دہلی ۶۱ نومبر
مضمون کی تیسری قسط۔

۴۳ محبوب اللہ مجیب

گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت
(آجکل ۶۱ نومبر ۳۴-۳۷)

۴۴ مسلم ضیائی
اسباب سرکشی ہند (سر سید)
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۲۶-۳۵)
سر سید کی تصنیف اسباب سرکشی ہند کا بصراحت تعارف پیش کیا ہے۔

۴۵ نیاز فتحپوری
حکومت اسلام کا محکمۂ برید
(نگار ۶۱ دسمبر ۱۸-۲۰)

تنقید، ادب، لسانیات

۴۶ احتشام حسین
ٹیگور کا اثر اردو ادب پر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ اکتوبر ۱۲-۱۰)
رابندر ناتھ ٹیگور کے اردو ادب پر اثرات کیا ہوئے۔ ایک سنجیدہ نشریہ ہے۔

۴۷ احرار عظیم آبادی
ادب فرائڈ اور مارکس
(شاعر ۶۱ اکتوبر ۱۲-۱۷)

۴۸ اختر حسن
تابع مہمل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۹۵-۱۰۰)
تابع مہمل الفاظ کی تشکیل اور ان کے استعمال کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۴۹ اکبر الدین صدیقی
رسم الخط کا مسئلہ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۵-۷)
اردو ٹائپ سے متعلق تجویزیں پیش کی ہیں۔

۵۰ اکبر حسین قریشی
اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۲۲-۲۸)
مغربی ادب کی بعض تخلیقات اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ ہیں۔

۵۱ امجد نجمی
شاعری میں انا کا اظہار
(آج کل ۶۱ دسمبر ۱۰-۱۷)

۵۲ اُم حبیبہ
پرویز شاہدی رقص حیات کے آئینہ میں
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ص ۱۲-۳۲)
پرویز شاہدی کے کلام پر تبصرہ ہے

۵۳ انتظار حسین
سرشار کی الف لیلہ
(ماہ نو ۶۱ نومبر ۶-۷)
سرشار کی الف لیلہ پر تبصرہ کیا ہے

۵۴ انجم اعظمی
نئی غزل
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ۶۱ اکتوبر، نومبر)
نئی غزل کیا ہے اور اس کے عناصر ترکیب کیا ہیں اس کی تشریح

۵۵ انجم فاطمی
جگر — ایک تاثر
(صبح نو پٹنه ٦١ اکتوبر ص ٢٠-٢١)
جگر کی غزلوں کے چند پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے

۵٦ اولیا محمد ایوب
(مہر نیمروز کراچی ٦١ دسمبر ٢١-٢۴)
سودا بحیثیت غزل گو

۵۷ بیدار عابد رضا
حسرت
(برہان دہلی ٦١ اکتوبر، نومبر، دسمبر)
حسرت پر سودا، اردوئے معلی کی تفصیلات چوتھی پانچویں اور چھٹی قسط

۵۸ تحسین سروری
غالب کی ایک غیر مطبوعه تحریر
(اردو نامه، کراچی ٦١ جولائی تا ستمبر ٩-١٢)
عبدالقادر سروری کے ذاتی کتب خانه میں فن تاریخ گوئی سے متعلق ایک مخطوطه ہے جس کے آخر میں غالب کی تحریر ہے مضمون نگار نے کتاب و تحریر دونوں کا تعارف کرایا ہے

۵۹ تمکین کاظمی
پرورش علی سخی
(صبح امید بمبئی ٦١ نومبر ص ٢٣-٢٦)
الهٰ آباد کے رہنے والے ایک غیر معروف شاعر پرورش علی المتخلص به سخی کا تذکرہ ہے۔

٦٠ جاوید عقال
اردو کا ایک بنگالی ادیب
(شاعر بمبئی ٦١ نومبر ٢٣-٢٦)
اردو کے ایک بنگالی ادیب راجه جنم جئے متر ارمان کا تعارف

٦١ حوش ملیح آبادی
لغوی تشریح اور قواعد
(اردو نامه کراچی ٦١ جولائی تا ستمبر ۵٢-۵۵)
اماله کی لغوی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے که اردو کے کون سے الفاظ اماله قبول کرتے ہیں اور کون سے نہیں کرتے

٦٢ حنیف نقوی
منشی عبدالعزیز اعجاز
(آج کل ٦١ دسمبر ٢٧-٣٢)
نواب شاهجہاں بیگم صاحبه کے عہد حکومت کے ایک شاعر عبدالعزیز اعجاز کا تعارف پیش کیا ہے

٦٣ حورشید عاصم
نیاز کے افسانے
(نگار ٦١ نومبر ٦-١٧)

٦۴ رحشاں ابدالی
عروج بہار
(مہر نیمروز کراچی ٦١ دسمبر ٢٦-٣٠)
انسیویں صدی کے اواخر اور بسیویں صدی کی ابتدا میں شائع ہونے والے بعض گلدستوں کا تعارف

٦۵ رشید حسن خاں
قاموس الاغلاط پر ایک نظر
(اردو ادب ٦١ ص ٩١-١۴۵)

٦٦ روش صدیقی
محروم وادیٔ غزل میں
(جامعہ دہلی ٦١ دسمبر ص ٦٩-٧١)
تلوک چند محروم کی غزل گوئی پر ایک تشریہ ہے

٦٧ رئیس مینائی
حضرت نفیس سنگلوری کے ادبی استفسارات
(نگار ٦١ دسمبر ١٣-١٧)

٨٦ زور محی الدین
اردو کی علمی ترقی کا ایک باب
(اردو نامہ کراچی ٦١ اکتوبر دسمبر ٣٣-٥٦)
اردو کی علمی ترقی سے متعلق ان خدمات کا سرسری جائزہ لیا ہے جو حیدرآباد میں کی گئیں

٦٩ سلام مچھلی شہری
نغمۂ ٹیگور
(جامعہ ٦١ نومبر ص ٣٦-٤١)
ٹیگور کی شاعری کے مختلف رخ پیش کئے ہیں

٧٠ سلیم خاں گمّی
آزاد کشمیر کے پہاڑی لوک گیت
(ماہ نو ٦١ نومبر ٣٨-٤٤)

٧١ سیدہ جعفر
حسن نظامی کی انشائیہ نگاری
(آج کل ٦١ دسمبر ٣٨-٤٤)
حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے

٧٢ ش. اختر
آگ کا دریا اور قرۃ العین حیدر
(شاعر بمبئی ٦١ اکتوبر ٨-١١)

٧٣ شاہد احمد
مولوی نذیر احمد دہلوی
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ٦١ اکتوبر نومبر)
نذیر احمد کے حالات زندگی ذاتی مشاہدات کی روشنی میں

٧٤ شاہد حمید الدین
حضرات امجد حیدرآبادی
(اردو نامہ کراچی ٦١ جولائی تا ستمبر ١٣-٢١)
امجد نے اپنے کلام کو کبھی تصوف اخلاق اور انسانیت کے معیار سے گرنے نہیں دیا

٧٥ شفیع منصور
عربی رسم الخط کا تجزیہ
(اردو نامہ کراچی ٦١ اکتوبر تا دسمبر ٣٦-٤٢)
صوت نگاری کی تصریح کرتے ہوئے صوتیات اور صوت نگاری کی روشنی میں عربی رسم الخط کا تجزیہ کیا ہے

٧٦ شفیق النساء بیگم
نظیر اکبر آبادی
(ادیب علی گڑھ ٦١ اکتوبر، نومبر ص ٢٣-٣٠)
نظیر کی شخصیت اور شاعری پر تبصرہ ہے ۔

٧٧ شکیل الرحمان
پریم چند کا ایک افسانہ
(سب رس حیدر آباد ٦١ نومبر ٣-٦)

پریم چندکے ایک کردار «مس پدما» کا نفسیاتی مطالعہ.

۷۸ شمس الرحمان فاروقی
غالب کی محرومیاں
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر، نومبر ص ۴-۱۱)
غالب کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ جملہ انسانوں کی طرح وہ بھی اپنا مقصد تخلیق پورا کرنے سے مجبور تھا.

۷۹ شمس بمن گرامی
شعر ، شعریت اور شاعر
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ص ۱۷-۲۰)
شعر کی تعریف ، شعریت کی اہمیت اور شاعرکی حیثیت کو اجاگرکیا گیا ہے .

۸۰ شوکت سبزواری
اردو کی ترقی کے مسائل
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۲۹-۳۲)
اردو قواعد کی موجودہ ترتیب کو ناقص بتاتے ہوئے علمی بنیاد پر نئی ترتیب کی نشاندہی کی ہے .

۸۱ شہاب برنی
آغا حشر کے منظوم ڈرامے
(اردو ادب . ۶۱ع ۹-۴۵)

۸۲ شہاب مہر محمد خان
اقبال اور اس کا عہد
(شاعر بمبئی ۶۱ اکتوبر ۱۸-۲۳)
جگن ناتھ آزاد کی کتاب اقبال اور اس کا عہد پر تبصرہ .

۸۳ صابر شاہ آبادی
مقالات تلہری
(شاعر بمبئی ۶۱ نومبر ۹-۲۲)
اختر علی تلہری کے تیسرے مجموعہ مقالات تلہری پر ایک تفصیلی تبصرہ .

۸۴ صدر الدین
جوہری کا بارہ ماسہ
(نواے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۴۰-۵۶)
بارہویں صدی کے ایک بہاری صوفی حضرت آئت اللہ جوہری کے بارہ ماسہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے .

۸۵ صفدر آہ
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر
(نواے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۵-۲۴)
امیر خسرو کے ہندی کلام سے متعلق تحقیقی مقالہ ہے .

۸۶ این . ال . کے . طالب
سرمایۂ کلام غالب
(نواے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۲۵-۲۹)
مرزا غالب کی شاعری سے متعلق اہل ادب کے متضاد نظریوں کا جائزہ لیا ہے .

۸۷ ظفر قریشی
اردو اور افغان
(ماہ نو ۶۱ دسمبر ۱۱-۱۸)

۸۸ عالم خوندمیری
حالی - ایک مناجات
(صبا ۶۱ نومبر ۳۲-۳۴)

۸۹ عبد الستار

املا و تلفظ

(اردو نامہ کراچی ٦١ جولائی تا ستمبر ۳۳-۴۵)

عربی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن کی اردو املا عربی سے مختلف ہے مضمون نگار کے خیال میں انھیں عربی کے اعتبار سے صحیح لکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

۹۰ عصمت اللہ جاوید

ملک محمد جائسی کی پدماوت

(نگار ٦١ دسمبر ٦-۱۳)

ملک محمد جائسی کی پدماوت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۹۱ عین الحق

وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

(اردو نامہ کراچی ٦١ اکتوبر تا دسمبر ۷-۲۵)

اس نظریے پر زور دیا ہے کہ شمالی ہند کی زبانیں براہ راست سنسکرت کے بجائے ان پراکرتوں سے نکلی ہیں جو سنسکرت سے متاثر تھیں۔

۹۲ غبار یاور

ابو العلا احمد المعری

(تعمیر انسانیت لاہور ٦١ اکتوبر)

المعری کے افکار کا تجزیہ، دوسری قسط۔

۹۳ غبار یاور

غالب کا نظریۂ شاعری

(جام نو کراچی ٦١ نومبر ص ۱۵-۲۳)

مرزا غالب کے اشعار کی روشنی میں ان کے شعری نظریات کا ذکر ہے۔

۹۴ غلام حسین ذو الفقار

اکبر اور اردو غزل

(اردو نامہ کراچی ٦١ اکتوبر تا دسمبر ۴۳-۵۲)

اکبر نے غزل کی زبان میں وسعت پیدا کی اور اسے عصری میلانات سے ہم آہنگ کیا

۹۵ غلام ربانی

اردو ہندی ڈکشنری

(صبا ٦١ نومبر ۵-٦١)

اردو ہندی ڈکشنری مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند پر تبصرہ کیا ہے

۹٦ غلام رسول

اردو املاء کے مسائل کا حل

(اردو نامہ کراچی ٦١ اکتوبر تا دسمبر ٦۳-۷۵)

اردو املاء سے متعلق بعض مسائل کا حل پیش کیا ہے

۹۷ فاروقی محمد احسن

جدید ناول کا فن

(مہر نیمروز کراچی ٦١ اکتوبر ۱۳-۱۵)

جدید ناول کے فن سے متعلق ہنری جیمس کے نظریات کی تشریح۔

۹۸ فاروقی محمد احسن

ناول نگاری میں خواتین کا حصہ

(خاتون پاکستان کراچی ٦١ اکتوبر، نومبر ۱۱-۱۵)

ناول اور صنف نازک کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

۹۹ فرمان فتحپوری
عالب کا نفسیاتی مطالعہ
(نگار ۶۱ نومبر ۲۰-۲۶)

۱۰۰ فضیل جعفری
تلامذۂ میر
(شاعر بمبئی ۶۱ نومبر ۲-۳۲)
میر کے بارہ تلامذہ کا تعارف.

۱۰۱ فکر تونسوی
کنہیا لال کپور
(ہندوستانی ادب حیدر آباد ۶۱ دسمبر)
کپور کا تعارف ذاتی مشاہدات کی روشنی میں.

۱۰۲ فیض الرحمان اعظمی
جگر کی شاعری
(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۱۲-۱۶)
جگر کی شاعری کے مختلف رخوں پر روشنی ڈالی ہے.

۱۰۳ قاسم شبیر نقوی
ساحر نجمی اور ان کا فن
(صبح نو پٹنہ ۶۱ نومبر ۱۰-۱۶)
ابھرتے ہوئے ترقی پسند شاعر ساحر نجمی فتحپوری کی شاعری پر تبصرہ ہے.

۱۰۴ قدوس صدیقی
آصف بنارسی
(جام نو کراچی ۶۱ نومبر ۳۱-۳۳)
علامہ عبد الرحمان آصف بنارسی کا تذکرہ ہے.

۱۰۵ قریشی اکبر حسین
تلمیحات اقبال کا ایک جائزہ
(برہان دہلی ۶۱ دسمبر)

۱۰۶ کبیر احمد جائسی
ذکر عبدالسلام
(ادیب علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۴-۵۲)
مولانا عبدالسلام ندوی کے سوانح و علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے

۱۰۷ گوہر حسین
فیاض علی خان فیاض اور ان کی شاعری
(مہر نیمروز کراچی ۶۱ اکتوبر ۲۹-۳۲)

۱۰۸ گیان چند
اردو کے جڑواں مصوتے
(آج کل ۶۱ نومبر ۶-۱۲)

۱۰۹ گیان چند
واسوخت امانت
(نگار ۶۱ نومبر ۳۴-۴۰)
امانت کے واسوخت پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے

۱۱۰ ل. احمد اکبر آبادی
صناعت ادب
(اردو ادب ۶۱ ص ۶-۶۶)
لاسلی کرامبے کی کتاب «ادبی تنقید کے اصول» Principles of Literary Criticism کے پہلے باب کا ترجمہ

۱۱۱ ماہر القادری
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ دسمبر ۴-۵۹)
نگار جگر نمبر بابت جولائی ۶۱ پر

تفصیلی تبصرہ اور بیار کے اعتراضات کے حوالات

۱۱۲ محمد احمد صدیقی

اقبال کا ساقی نامہ

(جام کراچی ۶۱ نومبر ۲۵-۳۰)

اقبال کے ساقی نامہ پر تبصرہ ہے

۱۱۳ محمد حسین سند

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

(مہر بمروز کراچی ۶۱ دسمبر ۱۱-۲۵)

علی عباس حسینی نے کلیم الدین احمد اور مصنف گل نغمہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم پر اپنے ایک مضمون میں تنقید کی ہے ۔ اس میں اسے تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے

۱۱۴ محمد حسین

مختصر تاریخ حروف تہجی

(صبح امید بمبئی ۶۱ دسمبر ۱۵-۱۶)

عربی و فارسی حروف تہجی کی مختصر کی مختصر تاریخ ہے

۱۱۵ محمود علی خاں

جگر کی نظریاتی شاعری (مسلسل)

(جامعہ ۶۱ نومبر ص ۲۱-۳۵)

جگر کی شاعری کے دور سوم یعنی ۱۹۳۰ ع سے ۴۰ ع تک کا تذکرہ ہے

۱۱۶ مدنی طہیر الدین

غالب کے گجراتی احباب و تلامذہ

(صبح امید بمبئی گجرات نمبر ۲ ص ۶۷-۷۵)

منشی میاں داد خاں سیاح ، نواب علام بابا خاں اور حکیم احمد حسن قنوجی وغیرہ کا تذکرہ ہے

۱۱۷ معتصم حکیم رشید احمد

جگر اور دیپ سائکالوجی

(برہان دہلی ۶۱ اکتوبر)

۱۱۸ مفتون کوٹوی

مولانا ابوالکلام آزاد

(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۱-۲۲)

غبار خاطر کے دھندلکوں میں ابوالکلام کی شخصیت کو تلاش کیا ہے

۱۱۹ میکش اکبر آبادی

فانی بدایونی

(اردو ادب ۶۱ ص ۶۰-۹۰)

۱۲۰ نادم سیتا پوری

کچھ آسودگان خواب کے بارے میں

(نگار ۶۱ نومبر ۲-۳۳)

میر ناسخ اور آتش کے مدفن سے متعلق اظہار خیال کیا ہے

۱۲۱ نثار احمد فاروقی

تذکرۂ بہار بے خزاں

(اردو نامہ کراچی ۶۱ اکتوبر تا دسمبر ۳-۵)

غلام میاں ساحر کاکوروی کے تذکرۂ بہار بے خزاں کے ایک خطی نسخے کا تعارف کرایا ہے

۱۲۲ ندوی احتشام احمد

فن موازنہ (چوتھی قسط)

(ادیب علی گڑھ ۶۱ اکتوبر نومبر ۳۵-۶۰)

ے ادب ، بمبئی

فن موازنہ کے ایک پہلو «شعری تصویریں» پر
روشنی ڈالی ہے

۱۲ ندوی عبدالسلام
دو شاعری اور فن تنقید
(معارف اعظم گڑھ، ۶۱ اکتوبر نومبر دسمبر)
مذکورہ مضمون کی پانچویں چھٹی اور
ساتویں قسط

۱۲۴ ندوی نجیب اشرف
ہندوستانی سلیکشن
(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اکتوبر ۳۰-۳۹)
غلام حسین بحیلمی کی ایک کتاب
ہندوستانی سلیکشن کا تعارف پیش کیا ہے

۱۲۵ ندیر محمد خان
شاہد صدیقی
(شاعر ۶۱ اکتوبر ۲۰-۳۰)
شاہد صدیقی کی شاعرانہ خصوصیات
کا تجزیہ

۱۲۶ نسیم امروہوی
سچل کی اردو اور فارسی شاعری
(اردو نامہ کراچی ۶۱ جولائی تا ستمبر ۱-۸)
اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک سندھی
شاعر عبدالوہاب سچل کی اردو اور فارسی
شاعری کا تعارف کرایا ہے

۱۲۷ نسیم علوی
مولوی عبدالحق اور تنقید
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۱ دسمبر ۶۱-۶۹)
عبدالحق کی تنقید نگاری کا تجزیہ

۱۲۸ یوسف سرمست
جدید نفسیاتی ناول
(صبا ۶۱ نومبر ۳۵-۴۱)

متفرقات

۱۲۹ ڈار بشیر احمد
چینی تصوف
(ثقافت لاہور ۶۱ نومبر ۲۱-۵۶)
چینی تصوف کے آغاز اور اس کے
نشو و نما کی تفصیلات

۱۳۰ محمود الحسن
جدید ترکی ادب میں معاشرتی موضوعات
(برہان دہلی ۶۱ دسمبر)

۱۳۱ یوسف مرزا
عربوں کے علم الہئیت پر ہندو
جوتش کا اثر
(آج کل ۶۱ دسمبر ۴۰-۴۴)

ایڈیٹر: نجیب اشرف ندوی
پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ | جولائی ۱۹۶۲ ع | شمارہ ۳

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	۲
۲	تلامذۂ میرزا مظہر	عبدالرزاق قریشی	۵
۳	امثال و اقوال	ایم . اے . حفیظ	۱۹
۴	مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط	نثار احمد فاروقی	۴۰
۵	نسیم میسوری اور تذکرۂ ساقی	ڈاکٹر حبیب النساء بیگم	۴۷
۶	ریختہ ثناء گجراتی بزبان ہیکلی	سخاوت مرزا	۶۶
۷	ادبی نقوش (تبصرہ)	محمد شعیب اعظمی	۷۲
۸	تبصرے		۷۶
۹	مقالہ نما (ضمیمہ)	ڈاکٹر عالی جعفری و دیگر مرتبین	۱۔۱۴

شذرات

گذشتہ شذرات میں ہم نے اس بات پر اظہار مسرت کیا تھا کہ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ و طلبہ نے اردو کی علمی و تعلیمی ترقی کی طرف نئے جوش و ولولہ کے ساتھ قدم اٹھایا ہے اور یہ اردو زبان و ادب کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی وہ علمی، تحقیقی، ادبی اور تنقیدی رسالے ہیں جو متعدد جامعوں کی طرف سے نکلنا شروع ہوئے ہیں ان میں مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کا ششماہی « مجلہ علوم اسلامیہ » ہے۔ اس وقت تک اس کے چار شمارے نکل چکے ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا رسالہ کسی بھی ادارہ کے لئے قابل فخر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جامعہ دہلی کا ششماہی رسالہ اردوے معلیٰ بھی اردو ادب سے متعلق مضامین شائع کرنے ہی میں ممتاز نہیں ہے بلکہ اس نے لسانیات نمبر شائع کرکے ہماری تحقیقی عمارت کے ایک بڑے اہم و وسیع گوشہ کو منور کرنے کی کوشش کی ہے، ادھر چند برسوں سے پونہ کا ادارۂ لسانیات ہند ملک کے مختلف علاقوں میں لسانیات کی تعلیم و مطالعہ سے متعلق سہولتیں مہیا کرکے اردو زبان کے اس شعبہ کے مخلص و پر جوش اصحاب کی توجہ بھی اس طرف منعطف کرارہا ہے، قریب کے چند برسوں میں لسانیات صوتیات وغیرہ سے متعلق جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اسی کے رہین منت ہیں، اردوے معلیٰ کے اس شمارہ میں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اسی جامعہ کے لائق استاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لسانیات ہی سے متعلق ایک کتاب انگریزی میں اردوے دہلی کی کرخنداری بولی (Kor Khandari Dialect of Delhi Urdu) کے نام سے لکھی ہے، اور یہ در اصل اردو کے دوسرے مرکزوں کے ارباب تحقیق کو دعوت ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں، ان کا رسالہ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو پر ایک وقیع اضافہ ہے۔

ڈاکٹر زور نے جو ہمارے یہاں اردو لسانیات سے متعلق کام کرنے والوں کی صف اوّل میں ہیں اس ذوق کو دکن سے لیجا کر کشمیر تک پہنچا دیا ہے اور وہاں بھی نہ صرف اردو بلکہ کشمیری زبان سے متعلق بھی یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے، اس کا ثبوت وہاں کی اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز (Acedami of Culture and Languages) کے اس وقیع رسالہ، شیرازہ سے ہوتا ہے جو حال میں اس اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوا ہے اسی جموں و کشمیر کی یونیورسٹی نے اپنے شعبہ اردو کی طرف سے نیا شعور شائع کرکے اپنے اساتذہ و طلبہ کو ٹھوس کام کرنے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع پیدا کردیا ہے

اس کے ساتھ مختلف کالج بھی اپنے ذریعوں اور حوصلوں کے مطابق اپنے ششماہی یا سالانہ رسالے شائع کرتے رہتے ہیں۔ بھوپال کے نوجیر سیفیہ ڈگری کالج کا نو نہال رسالہ مجلۂ سیفیہ جس کو اس کے نوجوان اساتذہ و طلبہ نے سلیقے سے مرتب کیا ہے ایک امید بخش اضافہ ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں، کالج اور علمی ادارے بھی جنہوں نے اب تک اس طرف قدم نہیں بڑھایا ہے متوجہ ہوں، تاکہ ہماری زبان کی علمی و تعلیمی تعمیر میں وہ بھی صرف شریک ہی نہ ہوں بلکہ شریک غالب ہوں۔

لیکن اس سارے علمی و ادبی چکاچوند میں ہم کو اردو کے عوامی و تعلیمی مسائل کی طرف سے بے خبر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اردو کو ایک عام اور علمی زبان کی حیثیت سے مستقبل میں باقی رکھنے کی طرف اگر توجہ اور قوت منعطف نہیں کی گئی تو ملک کے مختلف گوشوں میں جو حالات پیدا ہورہے ہیں اس کی روشنی میں درد بھرے تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اپنا موجودہ مقام بھی کھو بیٹھے گی اور اس ملک کی پالی، مگدھی، پراکتوں اور اپ بھنشاؤں کی طرح وہ بلند پایہ علمی تحقیقات کا موضوع تو بن جائیگی لیکن عوام کی زبان اور خیالات کی ترجمان نہیں رہے گی۔

موجودہ اتر پردیش حکومت نے جس سے بہت سی توقعات قائم کرلی گئی تھیں، اس سلسلے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اور سہ لسانی نسخہ میں جو اجزا پیش کئے جارہے ہیں ان کا اثر مریض اردو پر یقیناً مہلک ثابت ہوگا۔ اس حکومت نے بڑی سنگدلی کے ساتھ یہ طے کرلیا ہے کہ ہندی کی مخالفت کے دیو کا جو

سیلاب بلا جنوب سے بڑھتا آتا ہے اسے اردو کی قربانی دیکر بچالیا جاسکتا ہے اور اس طرح ایک طرف اس دیوتا کی تسکین ہوجائیگی، اور دوسری طرف نہایت آسانی اور خاموشی سے اردو خود اپنی موت مرجائے گی۔ یہ اس وقت ہورہا ہے جب کہ سارے ملک کو یکجہتی کی تعلیم دیجارہی ہے، اس کے علاوہ جنوبی سیلاب کو روکنے کی کیا تدبیر اختیار کی جائیگی۔ پھر ایک گروہ وہ بھی ہے جو سنسکرت کو یہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنانا چاہتا ہے، اس گروہ میں بڑے بڑے ارباب علم و اصحاب اثر شریک ہیں اس کا پتہ اس خطبۂ صدارت سے چل سکتا ہے جو حال ہی میں ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں کی کانفرنس میں بمبئی کے بھارتیہ ودیابھون میں دیا گیا تھا۔

اگر ہم کو اردو کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو ہمکو اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے کہ کس طرح وہ ایک تعلیمی زبان کی حیثیت سے باقی رکھی جاسکتی ہے۔ ہر ریاست کے حالات مختلف ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ کل ہند انجمن ترقی اردو جلد از جلد پورے عزم و قوت کیساتھ اس طرف ہمہ تن عملاً متوجہ ہوجائے، ورنہ ڈر ہے کہ ہندوستان میں اردو کی کتابیں پڑھنے والے بھی نہیں رہ جائیں گے۔

بابائے اردو کی موت نے انجمن ترقی اردو پاکستان کو جو حالت نزع میں تھی ایک نئی زندگی بخش دی ہے اور جو لوگ بابائے اردو کی علمی و عملی خدمات، ایثار و قربانی اور ان کے اردو کے عشق اور اس کی اہمیت و تاثیر سے واقف تھے ایک مرتبہ پھر انھوں نے عملاً یہ ثبوت پیش کردیا ہے کہ وہ اس مینارۂ نور و ہدایت کو درخشاں سے درخشاں کریں گے کہ اردوستان کے سارے گوشے اس سے منور و روشن ہوجائیں۔ رسالۂ اردو اور قومی زبان کے متعدد شمارے نکل چکے ہیں، کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور منزل مقصود کی طرف پہنچنے کے لئے قدم بڑھائے جارہے ہیں، اردو یونیورسٹی کا استقلال و استحکام بھی انجمن کا ایک اہم کام ہونا چاہئیے کہ اس طرح اردو کا خزانہ بہت زیادہ مالا مال کیا جاسکتا ہے۔

---

* عبدالرزاق قریشی

تلامذۂ میرزا مظہرؒ

میرزا مظہرؒ ایک بلند مرتبہ صوفی اور نغز گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دقیقہ رس، سخن سنج و نکتہ شناس استاد بھی تھے۔ اس زاویۂ نگاہ سے ان کی عظمت و رفعت کا اندازہ عشقی عظیم آبادی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر جیسے با کمالوں نے ان سے استفادہ کیا اور شعر و سخن کے نکات سیکھے۔ خود عشقی کے الفاظ یہ ہیں:

«اکثری از سخنوران آن عہد مثل میرزا رفیع سودا و میر تقی میر باریاب صحبتش می گردیدند و دقائق فنون شعر و سخن بطریق استفادہ می پرسیدند.» [۱]

سراج الدین علی خان آرزو کے مرتبہ کے عالم اور رموز شعر و سخن اور زبان کے ماہر ہندوستان نے کم پیدا کئے وہ میرزا مظہر کی سخن سنجی و نکتہ شناسی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

«در دقت فہم و ذکای طبع یکتای لیل و نہار بلکہ بی مثل روزگار است.
حدت طبع و جودت بمرتبہ دارد کہ بمصداق این مصرع است:
کہ سخن نگفتہ باشی بسخن رسیدہ باشد.» [۲]

آزاد بلگرامی کا شمار بھی ممتاز رجال ہند میں ہوتا ہے ان کی علمیت و فضیلت زبان دانی و نکتہ رسی مسلم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

---

* عبدالرزاق قریشی، رفیق انجمن اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی ۱۔

۱ شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی، تذکرۂ عشقی، قلمی، بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ)

۲ خان آرزو، مجمع النفائس، قلمی اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنا

«میرزا جامع فقر و فضلیت و سخن گستری است و باقتضای اسم خود روح الروح معنی پروری.»[۱]

قائم چاند پوری کہتے ہیں کہ

«(میرزا مظہر) سر آمد ارباب تحقیق و پیش رو اہل تدقیق است.»[۲]

یہی وجہ ہے کہ بزم مظہر میں اگر ایک طرف روحانی تربیت کا سامان تھا تو دوسری طرف ذوق سخن کی بھی تربیت ہوتی رہتی تھی۔ اس بزم سے اگر قاضی ثنا اللہ پانی پتی، مولوی ثناء اللہ سنبھلی، شاہ غلام علی، مولوی غلام یحییٰ بہاری وغیرہ نے روحانی تربیت پاکر حقائق و عرفان کی روشنی پھیلائی تو انعام اللہ خاں یقین، خواجہ احسن اللہ بیان، محمد فقیہہ درد مند، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ جیسے نغز گو شاعر بھی اٹھے اور اپنے سوز جگر سے دلوں کو گرمایا اور قلوب کو تڑپایا۔

بھگوان داس ہندی میرزا صاحب کے ہم عصر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ «شاگردان او سیار بودند.»[۳] لیکن عام طور پر ان کے ان «شاگردان سیار» کے حالات تو الگ رہے نام بھی تذکروں میں نہیں ملتے۔ متعدد تذکروں کی ورق گردانی کے بعد ہمیں مندرجۂ ذیل نام ملے ہیں:

۱	شرف الدین مضمون	۱۰	شاہ قلندر
۲	مصطفےٰ خاں یکرنگ	۱۱	میر ناصر سامان
۳	انعام اللہ خاں یقین	۱۲	سگم لال عزت
۴	خواجہ احسن اللہ بیان	۱۳	محمد خاں طاہر
۵	محمد فقیہہ درد مند	۱۴	کشن چند مجروح
۶	ہیبت قلی خاں حسرت	۱۵	حمید بیگ اظہر
۷	محمد باقر حزیں	۱۶	بساون رائے بیدار
۸	شاہ قدرت اللہ قدرت	۱۷	منعم
۹	غلام احمد منشی	۱۸	ملال

---

۱ میر غلام علی آزاد بلگرامی، سرو آزاد (لاہور ۱۹۱۳ ع) ص ۲۳۱
۲ قیام الدین قائم چاند پوری مخزن نکات (اورنگ آباد ۱۹۲۹ ع) ص ۴۴
۳ بھگوان داس، سفینۂ ہندی (پٹنا) ص ۱۸۸

ان شعرا میں بعض صاحب دیوان ہیں اور استادی کا درجہ رکھتے ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جن کا صرف نام اور چند اشعار تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن کی متاع سخن صرف دو چار شعر تک محدود ہے۔ اس مضمون میں ہم ان کا سرسری تذکرہ کریں گے لیکن جو صاحب دیوان ہیں ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ سلسلہ بڑی حد تک شاگردوں کی زندگی کی تاریخی حیثیت سے مرتب ہوگا۔

(۱)

شرف الدین مضمون

شیخ شرف الدین مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔[۱] اپنے سلسلۂ نسب کی طرف خود انھوں نے اس شاعرانہ شوخی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید که دادا ہمارا ہے بابا فرید[۲]

لب شیریں سے دے مضمون کو میٹھا که ہے فرزند وہ گنج شکر کا[۳]

ان کا سال پیدائش کسی تذکرہ میں ہمارے نظر سے نہیں گذرا۔

ان کی وطنیت سے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کے مندرجۂ ذیل بیانات ملتے ہیں:

میر تقی میر:

«متوطن جاجمؤ که قصبه ایست متصل اکبر آباد.»[۴]

حمید اورنگ آبادی:

«متوطن احمد آباد.»[۵]

---

۱ میر تقی میر، نکات الشعراء طبع ثانی (اورنگ آباد ۱۹۳۵ ع) ص ۱۵

۲ ایضاً

۳ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، چمنستان شعرا (اورنگ آباد ۱۹۲۸ ع) ص ۲۵۲

۴ میر، نکات الشعرا ص ۱۵

۵ خواجه خان حمید اورنگ آبادی، گلشن گفتار (حیدرآباد) ص ۱۹

قائم چاند پوری :

« مولدش جای است در نواح گوالیار که اورا جاجیومی گویند [۱]

میر حسن :

« متوطن جاجو که قصبه ایست متصل اکبر آباد . » [۲]

قدرت الله شوق :

« متوطن قصبه جاجیو متصل اکبر آباد . » [۳]

میرزا کاظم مبتلا لکھنوی . »

« وطنش ۰۰۰۰ [۴] از قصبات اکبر آباد . » [۵]

عشقی عظیم آبادی :

« متوطن جاجمؤ که قصبه ایست از مضافات اکبر آباد . » [۶]

امیر احمد :

« وطن اصلی وی جاجمؤ که قصبه ایست متصل اکبر آباد . » [۷]

قدرت اله قاسم :

« اصلش از نواح مستقر دارالخلافۂ اکبر آباد است . » [۸]

اکثر تذکروں میں مضمون کا وطن حاجمؤ بتایا گیا ہے . یہ در اصل کتابت کی غلطی ہے . جاجمؤ اکبرآباد میں نہیں بلکہ کان پور میں ہے . یو پی ڈسٹرکٹ گزیٹیر (ضلع کانپور) کے مرتب نے لکھا ہے کہ جاجمؤ گنگا ندی کے کنارے کان پور چھاؤنی سے مشرق جانب واقع ہے . اب اس جگہ کو بازید پور کہتے ہیں . لیکن عام زبانوں پر اب بھی جاجمؤ ہے . [۹] اکبرآباد میں جاجو نام کی بستی

۱　قائم نکات ص ۲۱

۲　میر حسن ، تذکرۂ شعراے اردو (دہلی ۱۹۴۰ ع) ص ۱۳۶

۳　قدرت اله شوق ، سبھل طبقات الشعرا تلخیص (علی گڑھ) ص ۱۷

۴　لفظ پڑھا نہیں گیا .

۵　مبتلا لکھنوی ، گلشن سخن ، قلمی ، رضا لائبریری (رام پور)

۶　عشقی ، تذکرۂ عشقی ، قلمی

۷　ابوالحسن امیر احمد ، مسرت افزا بحوالۂ معاصر (پٹنا) نمبر ۸ ص ۱۹۷

۸　میر قدرت الله قاسم ، مجموعۂ نغز حصہ دوم (لاہور ۱۹۳۳ ع) ص ۱۹۷

۹　ایچ ، آر ، نیول ، یو ، پی ڈسٹرکٹ گزیٹیر ، کان پور (الہ آباد ۱۹۰۹ ع) ص ۲۹۹

ہے . گزیٹیر کا مرتب لکھتا ہے کہ جاجو اُتن گن ندی کے بائیں کنارے پر اس راستہ کے قریب جو آگرہ سے دھول پور کو جاتا ہے ، واقع ہے . یہ ایک بہت پرانی ہندو بستی ہے . لیکن تاریخ میں اس کا نام پہلی بار ۱۷۰۷ع میں آتا ہے جب اعظم و معظم کی فوجیں یہاں صف‌آرا ہوئی تھیں . اس معرکہ میں اعظم مارا گیا اور معظم بہادر شاہ کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا . اس نے اپنی اس فتح کی یادگار کے طور پر ایک بڑی سرائے بنوائی جو راستہ کے مغرب جانب ندی کے کنارے واقع ہے .[1]

مخزن نکات اور طبقات‌الشعرا میں بھی جاجیو غلط طبع ہوا ہے . میر حسن کے صاف بیان کے علاوہ کہ مضمون حاجو کے رہنے والے تھے تقریباً تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مضمون کا مولد یا وطن « متصل اکبرآباد » تھا اور اکبرآباد میں جاجو نام کا قریہ ہے نہ کہ جاجمؤ . اس لئے یہ قطعی ہے مضمون کا وطن جاجو تھا .

قائم نے « نواح گوالیار » لکھا ہے . اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبرآباد اور گوالیار میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس لئے قائم نے بجائے اکبرآباد کے « نواح گوالیار » لکھ دیا ہوگا . دوسرے یہ کہ متعدد تذکرہ نگاروں کے بیان کے مقابلہ میں ایک قائم کے بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی . اسی طرح صاحب گلشن گفتار کے بیان کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ بجائے اکبرآباد کے احمدآباد غلط چھپ گیا ہے . یہ غلطی اس قدر نمایاں ہے کہ اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں .

مضمون ابتدائے جوانی میں شاہ جہان‌آباد گئے .[2] میر حسن نے انہیں « نوکری پیشہ »[3] اور قدرت‌اللہ قاسم نے « سپاہی پیشہ »[4] لکھا ہے . قائم چاند پوری کہتے ہیں کہ جب ان کا سن چالیس سال سے متجاوز ہوگیا تو وہ علائقِ دنیا سے کنارہ کش ہوگئے اور زینت‌المساجد میں جو لب دریا واقع ہے اپنا مسکن بنایا

---

۱ نیول ، یو ، پی گزیٹیر ، آگرہ (الہ‌آباد ۱۹۰۵ع) ص ۲۹۵ و ۲۹۶

۲ میر ، نکات‌الشعرا ص ۱۵

۳ حسن ، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶

۴ قائم مجموعۂ نغز ، حصۂ دوم ص ۱۹۷

اور توکل کی زندگی گذارنے لگے۔ چوں کہ خوش مزاج و خوش صحبت تھے شہر کے اکثر شرفا شام کے وقت ان کے حلقۂ مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ آخر وقت موعود آپہنچا اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔[۱] میر حسن، عشقی اور لطف کا بیان ہے کہ مضمون ابتدائے جوانی میں اکبرآباد سے شاہ جہاں‌آباد آئے اور زینت‌المساجد میں قیام کیا۔ چوں کہ قائم مضمون کے معاصر تھے اور دہلی میں رہ چکے تھے اس لئے ان کے بیان کو میر حسن، عشقی اور لطف کے بیان پر مقدم رکھنا ہوگا۔ اسی طرح صاحب مسرت‌افزا لکھتے ہیں کہ مضمون نے ایک مدت تک اکبرآباد میں زینت‌المساجد میں قیام کیا۔ اس بیان کی غلطی بھی اس قدر نمایاں ہے کہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

نزلہ کے سبب سے مضمون کے دانت گر گئے تھے اس لئے سراج‌الدین علی خاں آرزو از راہ مزاح انہیں «شاعر بے دانہ» کہا کرتے تھے۔[۲]

صاحب مسرت‌افزا لکھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ انتقال کے روز ان کے دوست احباب ان کے گرد جمع تھے اور ہر ایک کسی نہ کسی تقریب سے شدائد قیامت کا ذکر کررہا تھا۔ مضمون نے مندرجۂ ذیل شعر پڑھا اور علائق دنیا سے چھٹکارا پالیا۔

شور محشر سیتی واعظ نہ ڈرا مضمون کو ہجر کے صدمے اٹھایا ہے قیامت کیا ہے[۳]

ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ بالا واقعہ محض زیب داستان کے لئے گھڑا گیا ہے۔ کسی کے حالت نزع کے وقت شدائد قیامت کا ذکر کرنا خلاف قیاس و تجربہ ہے۔

گارساں دتاسی نے مضمون کا سال وفات ۱۱۵۸ھ / ۴۶-۱۷۴۵ع لکھا ہے۔[۴] اسپرنگر نے بھی اس کی تائید کی ہے۔[۵] اسپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ قائم مضمون سے زینت‌المساجد میں دو تین بار ملے تھے۔[۶] لیکن خود قائم کے تذکرہ میں اس قسم کا کوئی بیان نہیں ملتا۔

---

۱ قائم، مخزن نکات ص ۲۱
۲ میر، نکات‌الشعرا ص ۱۵
۳ امیر احمد، مسرت افزا، بحوالۂ معاصر (پٹنا) نمبر ۸ ص ۱۹۷
۴ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات ہندوستانی (پیرس ۱۸۷۰ع) جلد دوم ص ۳۰۱
۵ طفیل احمد (مترجمہ) یادگار شعرا (الہ‌آباد ۱۹۴۳ع) ص ۱۸۹
۶ ایضاً

تقریباً تمام ہم عصر تذکرہ نگاروں نے مضمون کے حسن اخلاق اور خوش مزاجی کی تعریف کی ہے۔ مثلاً میر تقی میر لکھتے ہیں کہ

«حریف ظریف، بشاش شاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا.» [۱]

. پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

«فقیر زماں آخر اورا دریافتہ بودم. بسیار گرم اختلاط اگر چہ برودت پیری غلبہ داشت.» [۲]

گردیزی کا بیان ہے کہ

«با وصف برودت پیری و فرط ضعف و ناتوانائی‌ها مردی بود بغایت گرم جوش و چسپاں اختلاط.» [۳]

قائم چاند پوری ان کے صفات و حسنات کی ان الفاظ میں مدح کرتے ہیں:

«بہ جمیع صفات موصوف و ہمہ حسنات معروف بود.» [۴]

پھر آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ

«بسکہ ملین و خوش صحبت بود اکثر مردم بجا آخر روز بطریق سیر در حلقۂ مجلس وارد می شدند.» [۵]

کہا جاتا ہے کہ ایک بار مضمون نے نواب عمدۃالملک سے اپنے کسی ملنے والے کی سفارش ملازمت کے لئے کی۔ نواب نے اسے ملازم رکھ لیا۔ انہوں نے سمجھا کہ اسے تنخواہ مل رہی ہے اور اس «نوکر کم زبان» نے سمجھا کہ میں نوکر ہوگیا ہوں۔ جب دس مہینے گذر گئے اور اسے تنخواہ نہ ملی تو اس نے صورت حال کا ذکر مضمون سے کیا۔ مضمون نے فی‌البدیہ یہ شعر کہا اور نواب عمدۃالملک کی خدمت میں بھیجا:

عرض حال اپنی سے ہیں اہل شرافت بے نصیب
نہیں سخن رکھتے زباں کے بیچ گویا یہ نجیب

۱　میر، نکات‌الشعرا ص ۱۵
۲　ایضاً
۳　سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں (اورنگ‌آباد ۱۹۳۳ع) ص ۱۳۵
۴　قائم، مخزن نکات ص ۲۱
۵　ایضاً

نواب قدر شناس نے اس شخص کی تنخواہ پوری مدت ملازمت کی اسی وقت لا دی۔[1]

مضمون کے مزاج میں قناعت تھی۔ اوپر ہم قائم کا بیان پڑھ آئے ہیں کہ مضمون نے ترک دنیا کرکے زینت المساجد میں اپنا مسکن بنایا اور توکل کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حمید اورنگ آبادی انہیں «شاعر متوکل» کہتے ہیں۔[2] خود انہوں نے بھی اپنی اس افتاد طبع کی طرف اشارہ کیا ہے:

یک قرص ناں کی خاطر کیوں تو پھرے ہے بھٹکا

میر تقی میر مضمون کو سراج الدین علی خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

«شاگرد خان صاحب آرزو۔»[3]

لیکن گردیزی کا بیان ہے کہ

«مشق سخن از میرزا مظہر و خان آرزو کردہ۔»[4]

میر صاحب کے بیان کی تائید میر حسن، شوق اور عشقی کرتے ہیں اور گردیزی کی تائید میں شفیق، شورش اور ابو الحسن امیر احمد ہیں۔

گردیزی کا تذکرہ نکات الشعرا کے بعد ترتیب پاتا ہے اور جیسا کہ مولوی عبد الحق نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے نکات الشعرا گردیزی کی نظر سے گذر چکا تھا۔[5] اور «دیباچہ میں جو اس نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہر اگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہے۔»[6] اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ گردیزی نے میرصاحب کے بیان کو درست تسلیم نہیں کیا اور صحیح بات اپنے تذکرہ میں درج کردی۔ گویا گردیزی کے بیان کو میر کے بیان کی تصحیح کہنا چاہئیے۔ شاید اسی لئے شفیق نے گردیزی کے بیان کو ترجیح دی اس کے سامنے نکات الشعرا

---

۱ حسن، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶
۲ حمید گلشن گفتار ص ۱۹
۳ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۴ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۴۴
۵ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان (مقدمہ) ص ۱۱ و ۱۳
۶ ایضاً ص ۱۱

اور تذکرۂ ریختہ گویاں دونوں تھے۔ گردیزی کا بیان یوں بھی زیادہ قابل قبول ہے کہ وہ اور مضمون ہم مشرب تھے اس لئے میر کے مقابلہ میں ان کے تعلقات زیادہ گہرے رہے ہوں گے۔ بہرحال جب تک اس کی تردید کسی معاصر ذریعہ سے نہ ہوجائے ہم مضمون کو تلامذۂ میرزا مظہر میں شمار کریں گے۔

مختلف تذکرہ نویسوں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ مضمون کو ذوق شعر گوئی ضرور تھا لیکن وہ بہت کم کہتے تھے۔ مثلاً میر تقی میر لکھتے ہیں کہ

«کم گو بود۔» [1]

شفیق کہتے ہیں:

«گاہی بتفنن گوہر سخن بسلک نظم می سفت۔» [2]

اپنی کم گوئی کی طرف خود مضمون نے بھی اشارہ کیا ہے:

درد دل سے جس طرح بیمار اٹھتا ہے کراہ
اس طرح ایک شعر مضموں بھی کہے ہے گاہ گاہ [3]

یہی وجہ ہے کہ بقول میر ان کا دیوان صرف دو سو اشعار پر مشتمل تھا۔ [4] شفیق نے تین سو اشعار کا مجموعہ بتایا ہے۔ [5] لیکن تین سو اشعار کا مجموعہ بھی مختصر ہی کہلائے گا۔ افسوس کہ یہ مختصر مجموعہ بھی نایاب ہے۔

مضمون ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کو اردو شاعری میں رواج دینے میں پہل اور کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ حمید اورنگ آبادی انہیں «موجد ایہام ریختہ» کہتے ہیں۔» [6] مصحفی نے اس بات کو ذرا کھل کر کہا ہے۔ حاتم کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں کہ

«روزی پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہ جہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ

---

۱ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۲ شفیق، چمنستان شعرا ص ۲۵۴
۳ ایضاً
۴ میر، نکات الشعرا ص ۱۵
۵ شفیق، چمنستان شعرا ص ۲۵۴
۶ گلشن گفتار ص ۱۹

ما دو سه کس که مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنای شعر ہندی
را به ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم .» [۱]

خود مضمون نے بھی اپنی اس کوشش پر فخر کا اظہار کیا ہے :

ہوا جگ میں ترا مضمون شہرہ طرح ایہام کی جب سیں نکالی

لیکن مضمون کا جو کلام مختلف تذکروں میں پایا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوتا که وہ محض ایہام گو نہ تھے . ان کا کلام شستہ و لطیف اشعار سے خالی نہیں . ان کا دیوان میر کی نظر سے گذرا تھا . وہ صنعت ایہام کو نا پسند کرتے تھے اور اسی لئے انہوں نے حاتم ، ناجی وغیرہ کی ، جو صنعت ایہام کے علم بردار تھے ، مذمت کی ہے . مثلاً ناجی کے متعلق وہ لکھتے ہیں :

« مزاجش بیشتر مائل به ہزل بود .» [۲]

مگر مضمون کے متعلق ان کی یہ رائے ہے :

« کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیاد .» [۳]

شفیق کی نظر سے بھی ان کا دیوان گذرا تھا . وہ اس کے مطالعه کے بعد اس نتیجه پر پہنچے تھے که

« شاعریست زود رس و سخن پروریست معنی رس . مضمون شیرینش شرف برنبات می دارد و کلام شکریش مذاق جان را لذت خاص می بخشد .» [۴]

اگرچہ گردیزی نے اپنے تذکرہ میں اظہار نہیں کیا لیکن بہت ممکن ہے که ان کی نظر سے بھی مضمون کا دیوان گذرا ہو . بہر حال ان کی رائے مضمون کے متعلق یہ ہے :

« از شعرای قراردادۂ ریختہ .» [۵]

اگر مضمون صرف ایہام گو ہوتے تو گردیزی ان کے لئے یہ الفاظ استعمال نہ کرتے . پھر وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :

---

۱ شیخ غلام ہمدانی مصحفی ، تذکرۂ ہندی (دہلی ۱۹۳۳ ع) ص ۸۰
۲ میر ، نکات الشعرا ص ۱۵
۳ ایضاً
۴ شفیق ، چمنستان شعرا ص ۲۴۳ و ۲۵۴
۵ گردیزی ، تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۴

«شعرش خالی از نزاکت نیست.» [۱]

قائم چاند پوری نے ان کی شاعری کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

شعر ریختہ را بتلاش الفاظ و معنی تازہ می گفت.» [۲]

میر حسن نے ان کے متعلق یہ رائے دی ہے.»

«ہر چند کم گو بود لیکن خوش گو» [۳]

میر حسن کی یہ رائے حقیقت میں میر تقی میر کی صدائے بازگشت ہے.

قدرت اللہ قاسم کہتے ہیں کہ

«در جرگہ اساتذۂ [۴] آن وقت محسوب و شعرش دلخواہ مردم آں عہد مرغوب است.» [۵]

یہاں سودا کا ایک شعر نقل کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے. اس سے مضمون کے متعلق ان کے تأثرات کا بھی اظہار ہوتا ہے اور مضموں کے کمال شاعری کا اعتراف بھی.

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضموں دنیا سے، رہا سودا سو دیوانہ

خود مضمون کو بھی اپنی استادی کا احساس تھا فرماتے ہیں:

نہیں چلا افسوں کسی کا حسن اُپر ریختہ اس کو ہوا جادو میرا

کہاں صائب جو کرتا تھا وہ تبریز سے آہند کے طوطی کی اب ریر

مندرجہ بالا تذکرہ نگاروں نے مضمون کے کلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی قدر مبالغہ ہے. صنعت ایہام کے استعمال کی وجہ سے ان کا کلام ایسے اشعار سے خالی نہیں جو متانت و تہذیب سے گرے ہوئے ہیں. لیکن ایسے اشعار کی تعداد یقیناً کم ہے. مجموعی حیثیت سے ان کا کلام اچھا ہے. ذیل میں

---

۱ گردیزی تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۱۳۵

۲ قائم مخزن نکات ص ۲۱

۳ حسن، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۶

۴ بعض تذکروں میں مضمون کے شاگردوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً مجموعۂ نغز میں میر افضل علی دانا (حصہ اول ص ۲۳۹)، گلشن ہند میں عارف اکبرآبادی (ص ۱۷۶)، تذکرۂ شورش میں سید حاتم علی حاتم (ص ۲۳۷) اور داؤد بیگ داؤد دہلوی (ص ۲۷۹) وغیرہ کے نام ملتے ہیں.

۵ قاسم، مجموعۂ نغز، حصۂ دوم ص ۱۹۷

ہم ان کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں انھوں نے صنعت ایہام برتی ہے:
یہ اشعار صرف یہی نہیں کہ تہذیب و متانت کا دامن سنبھالے ہوئے ہیں بلکہ لطافت خیال و شگفتگی بیان سے بھی خالی نہیں.

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج - ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

گر حرف حق زبان سے ہماری کبھو سنے احوال اپنا دیکھ کے حلاج سر دھنے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

کیا ہوا جو خط میرا پڑھتا نہیں جانتا ہے خوب وہ مضمون کو

مرا دل تھا ترے گلشن کا مالی محبت اس سپتی تو کیوں نہ ڈالی

شرم سیں پانی ہوجاویں سب رقیب گر مرا یوسف ملے آ چاہ سیں

کرو یا مت کرو اب باغباں گلزار کا در وا
پھنسے ہم دام میں صیاد کے رکھتے نہیں پروا

اس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں جب کہ اس بات کو اثبات کرو

جب سے چاہا ہے ترا چاہ ذقن آب چشموں سے مرے جاری ہے

ترا مکھ ہے سر چشمۂ آفتاب نہ لاوے ترے حسن کی ماہ تاب

مضمون، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ترک دنیا کر کے تصوف و درویشی کی طرف مائل ہوگئے تھے. اس لئے ان کے کلام میں کیفیات عشق اور واردات قلبی کی اچھی عکاسی پائی جاتی ہے. مندرجہ بالا اشعار میں سے اکثر میں یہ

خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان بھی ان کے عہد کی روش کے مطابق صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ واردات قلبی کی عکاسی اور اسلوب بیان کی عمدگی نے ان کے کلام میں درد و تاثیر پیدا کردی ہے۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں استعارات کی بہتات ہے۔[1] لیکن جو اشعار ہمارے سامنے ہیں وہ دتاسی کی اس رائے کی تصدیق نہیں کرتے۔ ذیل میں ہم مضمون کے چند اور اشعار نقل کرتے ہیں جو مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں۔

جو دو پیالہ سحر کو بھر کے اور دو شام کو لے گا
وہ تحت اپنے میں جوں خورشید چاروں جام کو لے گا

تجھے خورشید رو کرتے ہیں سجدہ   اگر ثانی ہے یوسف کا تو توں ہے

کیا سمجھ باندھا ہے بلبل نے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا ہے تس پہ جور باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد   کہو، سب سے اسے جدا کر کر

بلبلو شور چمن میں نہ کرو   کون سنتا ہے تمہاری فریاد

کرنا تھا نقش روی زمیں پر ہمیں مراد   قالی نہیں تو نہیں بوریا تو ہے

سجن یہ خوبرو تجھ سے چراویں کیوں نہ پھر آنکھیں
جو کوئی خورشید کو دیکھے سو ہو محجوب جاتا ہے
کہو کیوں کر زلیخا کی نہ ہو آنکھوں کا گھر روشن
جہاں یوسف سا نور دیدۂ یعقوب جاتا ہے
میرا یہ اشک قاصد کی طرح ایک دم نہیں تھمتا
کسی بیتاب کا گویا لئے مکتوب جاتا ہے

---

۱ دتاسی، تاریخ ادبیات ہندستانی، جلد دوم ص ۳۰۱

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا
صبر ایوب کیا ، گریۂ یعقوب کیا[1]

اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح مضمون کے یہاں بھی اس دور کی لسانی خصوصیات موجود ہیں . کدھی ، سیتی ، سوں ، کبھو ، آگو وغیرہ ان کے یہاں استعمال ہوئے ہیں . ان کے علاوہ مخصوص دکنی انداز بھی ان کے یہاں پایا جاتا ہے . مثلاً

کیا ہے یاد مجکوں بعد مدت　　　مگر ان طفل نے اب سدھ سنبھال
بہت گلرخاں کا ہوا رنگ زرد　　　سجن جب سے تم لال جیرا سجا

بعض ساکن الفاظ کو متحرک استعمال کیا ہے . مثلاً

دراز اس زلف کی ہوئے عمر یارب　　　کدھی ہووے نہ اس کا بال بیکا

۱　مولانا محمد حسین آزاد نے اس شعر سے متعلق آب حیات میں مندرجہ ذیل دلچسپ لطیفہ لکھا ہے .

" استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمون کے زمانہ میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے . ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی . وہ حقہ بھر کر لائی اور سامنے رکھا . نواب صاحب کی زبان پر اس وقت مضمون کا یہ شعر تھا

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　　　صبر ایوب کیا ، گریۂ یعقوب کیا

ماما سن کر بولی ، الہی تیری اماں ' اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑرہا ہے . بچارے نوکروں پر کیا گذرے گی . چلو ماما یہاں سے . " (مولانا محمد حسین آزاد ، آب حیات ، طبع ہشتم [لاہور ۱۹۰۷ع] ص ۹۶)

حاشیہ میں مولانا لکھتے ہیں

" دلی میں غریب ، مفلس ، فقیر کسی سے سوال کیا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ عیالدار ہیں ، مفلس ہیں ، ہم پر پیغمبری وقت پڑا ہے للہ کچھ دو . اصل اس کی یہ تھی کہ جس پر سخت مصیبت پڑتی ہے وہ زیادہ خدا کا پیارا ہوتا ہے اور چوں کہ پیغمبر سب سے زیادہ خدا کے پیارے ہیں اس لئے ان پر زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں ، جو مصیبتیں پیغمبروں پر پڑی ہیں وہ دوسروں پر نہیں پڑیں . رفتہ رفتہ پیغمبری وقت اور پیغمبری مصیبت کے معنی سخت مصیبت کے ہوگئے . " (آب حیات ص ۹۷ حاشیہ)

* ایم . اے . حفیظ

امثال و اقوال

امثال ، قصے ، کہانیاں اور اقوال انسانی طبع کی مرغوب چیزیں ہیں . دنیائے ادب میں اول مقام ان اصناف سخن کو حاصل ہے جن میں بہادری کے قصے ، عشق و عاشقی کی حکایتیں ، انمول کارناموں کی داستانیں ، مشرقیوں میں بہت مقبول ہوئیں . ان کہانیوں میں اشخاص کے ذاتی کردار سے زیادہ عجیب و غریب واقعات کی آمیزش ہوتی تھی اور ان کے بیان کرنے کے ڈھنگ و انداز مختلف اور مرغوب طبع تھے . کبھی تو چرند اور پرند کی زبان میں قصے و حکایات بیان کی جاتی تھیں ، کبھی عورتوں کی زبان کا سہارا لیا جاتا تھا ، کبھی بہادر اپنے تجربے تجربہ انداز میں بیان کرتے تھے جن سے « امثال و اقوال » اخذ ہوتے تھے .

امثال و اقوال یہ ایسے اصناف سخن ہیں جو انسان کی عقل و فہم سے خطاب کرتے ہیں اور نہایت آسانی کے ساتھ یاد رہتے ہیں برخلاف اس کے منطقی استدلال سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور وہ جلد بھول بھی جاتے ہیں . ہندوستان کے قدیم ادب میں ان کا درجہ بڑا رہا ہے ، اس قسم کی تصنیفات میں ہندوؤں اور عربوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی .

بھارت کے لٹریچر میں « پنچ تنتر » ایک ایسا مشہور و معروف مجموعہ ہے جس کے بارے میں بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ یورپ کے ایسا اپ [1] نے اپنی تصنیفات میں اس مجموعہ سے اقتباس کیا ہے لیکن « پنچ تنتر » کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں جمع کئے گئے ہیں کیونکہ اس میں ایک مہندس کا نام آیا ہے جس کا زمانہ چھٹی صدی مسیحی کا تھا . اس صدی کے نصف اول میں

---

* جناب ایم . اے . حفیظ . دارالشفا ، حیدرآباد ۲ (دکن)

۱ یہ شخص ان مشہور و معروف حکایات ، امثال اور اقوال کا لکھنے والا ہے جو اس کے نام سے آج تک معروف ہیں . کہا جاتا ہے کہ یہ غلام تھا اور آزاد ہونے کے بعد کریشس لائی ڈیا کے بادشاہ سے اس کی بڑی قدر کی جس کی سال پیدائش ۶۱۹ قبل مسیح اور سال وفات ۵۶۴ قبل مسیح تھا .

نیتی لٹریچر کا شہرہ ایران تک پہنچا تھا اور ساسانی خاندان کے خسرو نوشیرواں نے جس کا زمانہ حکومت ۵۳۱ ع سے ۵۷۹ ع تک رہا ہے اپنے دربار کے ایک پردل عزیز حکیم باردوئی کو ہندوستان بھیجا تھا اور اسے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ وہ بھارت سے «آب حیات» ساتھ لائے۔ حکیم ہندوستان آیا اور شہنشاہ کے حکم کی تعمیل میں «آب حیات» کو بہت تلاش کیا لیکن اسے یہ امرت نہ مل سکا۔ جب وہ اپنے ملک کو مایوس واپس ہونے لگا تو کسی نے «پنچ تنتر» کا ایک نسخہ حوالہ کیا اور کہا کہ اپنے شہنشاہ کے لئے «آب حیات» لے جاؤ۔ حکیم باردوئی اس کی اہمیت اور حقیقت کو نہ سمجھ سکا اور لا علمی میں اس نے اس نسخہ کو ڈرتے ڈرتے شہنشاہ خسرو کے حضور میں پیش کیا۔ نوشیرواں اس نسخہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں کروایا اور ایران کے شاہی کتب خانہ میں اس کا ترجمہ ۶۵۲ ع تک رہا اور لوگ نسلاً بعد نسلٍ «پنچ تنتر» کے حکیمانہ اقول و امثال سے فائدے اٹھاتے رہے۔ اس کے بعد عرب ایران پر قابض ہوئے جن کے زمانے میں امثال و اقوال بکثرت لکھے گئے۔ اندلس اور یورپ والوں نے ان کے بہت سے امثال و اقوال کو اخذ کیا اور ایک بہت بڑا حصہ ان حکیمانہ اقوال و امثال کا جو سینکوپین زا [1] کی زبان سے بیان کیا گیا ہے یہ عربوں سے ماخوذ ہے

اس کے سو برس بعد المنصور کو اس پہلوی ترجمہ کا ایک نسخہ مل گیا تھا جو خردبرد زمانے سے بچ گیا تھا اور اس نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کرایا اور دن بدن یہ مجموعہ ساری دنیا میں مشہور ہوتا چلا گیا۔ دسویں صدی میں اس کا ترجمہ فارسی نظم میں ہونے کے بعد سلطان سلیمان کے دورِ حکومت میں اس کا ترجمہ ترکی نظم میں بھی ہوا۔

گیارھویں صدی میں اس کا ترجمہ یونانی میں بھی ہوا۔ جہاں کا وہ خیالی شخص لقمان جو اقوال و امثال اور حکایات لکھنے میں سب میں مشہور ہے اور جس کی

---

۱ اسپینی زبان میں ایک نہایت مشہور قصہ "ڈان کوئک زوٹ" کا ہے جو زمانہ متوسط کا ایک سردار ہے جس کی بہادریوں کے بیان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ "سینکوپینزا" اس سردار کا نوکر تھا جو گدھے پر سواری کرتا تھا اور ہر وقت اس کی زبان سے مثلیں اور حکیمانہ اقوال نکلتے تھے۔

عقلمندی کی مثال قرآن پاک میں بھی دی گئی ہے. اس کے حکیمانہ امثال و اقوال دنیا میں مشہور ہیں اور آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں. اس کے بعد تیرھویں صدی میں عبرانی اور اسپانی میں اس کے ترجمے شائع ہوئے. چودھویں صدی میں جرمن ترجمہ ہوا اور اسی صدی میں «ریمان دے بے زئیے» نے اسپانی ترجمہ سے جوکہ خود عربی سے نوار کی شہزادی ژین روجہ فلپ کے لئے ترحمہ ہوا تھا، لاطینی میں ترحمہ کیا. غرض اس بے بہا مجموعہ کا ترجمہ تقریباً ہر زبان میں ہوا اور زمانہ متوسط کے ادب میں ان ترحموں کا بہت بڑا اثر پڑا. یورپ کی کہانیوں اور امثال کا بہت بڑا حصہ جس میں خود لافانٹیس شامل ہے ان ہی ہندو حکایات سے ماخوذ ہے.

اس سلسلے کی ایک اور کڑی «ہتوپدیش» کے نام سے مشہور و معروف ہے جو «پنچ تنتر» کے بہت بعد کی ہے جس میں قصے، کہانیاں، حکایتیں اور امثال و اقوال مذہبی و تاریخی پیرائے میں درج کئے گئے ہیں. ہندوستان کے اس قدیم ادب میں انسانی جذبات کو اس عمدگی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے خواہ مخواہ طبیعت کو فرحت ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی ندی کی مثال ہے جس کی ریتی میں سونے کے ریزے ملے ہوئے ہیں، جب تک کہ اس سے لت پت کیچڑ دھوکر صاف نہ کی جائے یہ قیمتی ریزے ہمیں نہیں ملتے. ان تمثیلوں قصوں اور کہاوتوں کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر ایک قوم کی مثلیں اس قوم کے تحریروں کا لب لباب ہیں. چونکہ بھارت کا قدیم لٹریچر قصوں اور حکایتوں سے بھرا ہوا ہے جس کے ہر قصہ اور کہانی میں جا بجا امثال و اقوال سے کام لیا گیا ہے اور جو اقوام کے تحریراتی سچوڑ سے مالا مال ہے وہ اشتباہ معنی اور عدم تحقیق والی بات ان امثال و اقوال میں نہیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ان کے معنی صاف اور صریح ہیں جو عوام کے خیالات کا حاکہ ہیں اور ان کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں.

قصص اور حکایات کی کتابوں میں سب سے زیادہ عجیب اور مشہور الف لیلہ و لیلہ ہے، جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے قصوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے کیونکہ اس کے بعض حصے دسویں صدی کے ما قبل کے ہیں. اس میں ہندی

اور ایرانی الاصل کہانیاں بھی ہیں لیکن اس کا ایک بڑا حصہ تیرہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں مصر کے عربوں نے لکھ کر جمع کیا۔ موسیو وائل جو ہای ڈل برگ میں مشرقی السنہ کے استاد تھے اپنے جرمن ترجمہ الف لیلہ و لیلہ کے مقدمہ میں جو انھوں نے اصل عربی سے کیا ہے لکھتے ہیں کہ بلا شک و شبہ الف لیلہ کی زیادہ تر حکایات عربی ہیں اور یہ حکایات ان سے بالکل علحدہ ہیں جو اوائل سنین اسلام میں ایران و ہندوستان کی کہانیوں سے جمع کی گئی تویں۔

الف لیلیٰ اپنے زمانوں کی معاشرت و طرز زندگی اور اوضاع و اطوار کا خاصا ذخیرہ رکھتی ہے اس میں غیر ضروری اجزاء کے ساتھ ساتھ کام کی زرین باتیں کچھ اِس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان میں اس زمانوں کے نقش و نگار نمایاں صورت میں ابھر آتے ہیں اور اس میں مشترک امثال و اقوال جو عملی زندگی کے تجربات میں ڈوبی ہوئی ہیں ان سے اس زمانے کے ہر رخ کی تصویر کا نقشہ کھینچ جاتا ہے اور جب یہ چھن کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں تو « مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید » والی بات بن جاتی ہے اور ان کے الفاظ مختصر مگر با معنی اور برمحل ہوکر انسان کے لئے مرغوب طبع بن جاتے ہیں جس کا لطف نیکی اور بدی کی کشمکش میں چٹخارہ دار بن جاتا ہے۔

ذیل میں ان امثال و اقوال کے چند انتخابات دئے جاتے ہیں جن سے زندگی کے مختلف مسائل و مراحل اور عملیات اخلاقی و سچائی اصول پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں قسمت کے عقیدے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ممالک مشرق میں ایک خاص خطۂ زمین کے لوگوں میں قسمت کا زبردست اعتقاد پایا جاتا ہے۔ ان اقوام میں بلا لحاظ مذہب و ملت یہ ایقان موجود ہے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ قسمت کے آگے کسی کی کچھ نہیں چلتی۔ اس اعتقاد میں روسی، عیسائی اور ہندوستانی سبھی شامل ہیں جو اس مرزبوم میں رہتے ہیں۔ انسان کو اپنے ارادوں میں جب ناکامی ہوتی ہے اور اپنے « ناخن تدبیر » سے ان مسائل کو حل نہیں کرسکتا جو اس کے لئے باعث الجھن بن جاتے ہیں تو ایسی صورت میں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے وہ قسمت کا سہارا لیتا ہے تاکہ صبر و سکون سے ان مشکلات پر سے گذر جائے۔ مشرقی اقوام میں اس رواج کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ بالعموم کاہلی و سستی ان کی

فطرت کا ایک جز ہوگیا ہے اور ان ممالک میں روزی کا مسئلہ آسانی سے حل ہوجاتا ہے کیونکہ یہ زرعی ممالک ہیں اس لئے « کھاؤ، پیو اور خوش رہو » کے مقولہ پر عمل کرتے ہیں. چونکہ یہ ممالک بالعموم گرم ہیں اس لئے زیادہ دوڑ دھوپ ان کے بس کی بات نہیں اور چونکہ جو کچھ مل جاتا ہے اسی کو قسمت کا لکھا سمجھا جاتا ہے. یہ لوگ چونکہ قدیم روایات کے حامل ہیں اس لئے نئی نئی چیزوں کی دریافت اور فطرت کے رموز حل کرنے کی جستجو ان میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے مادیت سے زیادہ روحانیت کے قائل ہوگئے ہیں اور جب اس کا جواز ان کو مذہبی کتابوں سے مل جاتا ہے تو اسی پر اکتفاء کرنا کافی سمجھتے ہیں. چنانچہ مسلمانوں میں تسلیم و رضا کے مسئلہ نے اس کو بڑی حد تک سہارا ہے اور ہندوؤں میں مذہبی کتابوں نے اقوال و امثال کے ذریعہ اس رجحان کی پشت پناہی کی ہے. ذیل میں چند نمونے دئے جاتے ہیں.

قسمت

« قسمت نے ہماری پیشانی پر ایک سطر چند حروف کی لکھی ہے. جس کو ہمارا عالم سے عالم شخص اپنے علم سے مٹا نہیں سکتا. » [پنچ تنتر دوسرا منتر شعر ۱۷۲]

« جو نہیں ہونے والا وہ ہرگز نہیں ہوتا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا یہ فکر کے زہر کا تریاق ہے بس ہمیں کیوں نہ کام میں لائیں. » [ہتوپدیش باب اول شعر ۲۷]

« جو سمندر میں ڈوب جائے یا پہاڑ پر سے گرے یا آگ میں گرجائے یا اسے سانپ ڈسے اگر اس کی زندگی ہے تو وہ سلامت رہے گا. » [ہتوپدیش باب دوم ۱۶]

« اس دنیا کے کل کام قسمت پر ہی ہیں اور انسان کی کوشش پر بھی، لیکن ان دونوں میں قسمت کو کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہے لیکن انسانی کوشش سے کام لیا جاسکتا. » [منوشاستر[1] ساتواں باب ۲۰۵]

---

[1] منوشاستر: ہندو قوانین کا مجموعہ جس میں جائداد کی تقسیم، راجہ اور رعایا کے فرائض. چار ذات (برہمن، کشتری، ویس اور شودر) کے فرائض انسانی زندگی کے مختلف حصوں یعنی چار آشرموں (برہم چریہ، گرہست، بان پرستھ اور سنیاس) کے متعلق تفصیلی ہدایات مندرج ہیں جس کو منوسمرتی کی تصنیف کہا جاتا ہے جو ہندوؤں کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا واضع قوانین تھا، اس کا قانون علی العموم اخلاقی اصول پر مبنی تھا. اس کی تالیف کے بارے میں مختلف بیانات ملتے ہیں. سر ولیم جونس نے اس کو آٹھ سو سال قبل مسیح قرار دیا تھا اور بعض دوسرے محققین نے پانچ سو سال قبل مسیح لکھا ہے لیکن جدید تحقیقاتوں میں اس کا زمانہ دو تین سو سال قبل مسیح ثابت کیا گیا ہے

«انسان کو چاہئیے کہ قسمت کا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنی کوشش نہ چھوڑے بلکہ بلاکوشش کے کوئی سرسوں سے تیل نہیں نکال سکتا.» [ہتوپدیش دیباچہ ۳۰]

لیکن یہ چیز فکر و عمل کی راہوں کو بند کردیتی ہے. چنانچہ مغرب ایک زمانہ میں مشرق سے بہت پیچھے تھا لیکن اپنی دوڑ دھوپ، تگ و دو اور جستجو و کوشش میں آج آگے بڑھ گیا ہے، اس پر فطرت کے کئی راز منکشف ہوچکے ہیں اور وہ قسمت کے لکیروں کو میٹ رہا ہے پھر:

«روشنی تدبیر کی تقدیر کو چمکائے گی»

والی بات پر عمل کررہا ہے. انسانی زندگی کے ارتقاء میں فکر و عمل کی راہوں نے کئی نئے باب کھول دئیے ہیں اور آج کا انسان ایک مہماتی انسان بن گیا ہے جو پرانی قدروں کی نفی کرتے ہوئے اور آگے کی جستجو میں چلا جارہا ہے. ممکن ہے کہ اسے اپنے اس ارتقائی سفر میں کئی نئی نئی منزلیں ملتی جائیں. پتہ نہیں کہ اس کی آخری منزل کہاں ہوگی؟

ماہرین نفسیات نے انسان کی «جبلتوں» کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے. ان کا کہنا ہے کہ «جبلتیں» وراثۃً ملتی ہیں اور وہ کبھی مر نہیں سکتیں. البتہ تعلیم و تربیت ان کا رخ موڑ سکتی ہے اور ان کو نشیب سے فراز کی طرف لے جاسکتی ہے. جس طرح پانی کی سیال خاصیت کی وجہ سے ہم اس کو گندی نالی کی طرف لے جاسکتے ہیں اور اس کا رخ گلاب کی باڑ کی طرف بھی موڑ سکتے ہیں. بالکل یہی حال انسان کی «جبلتوں» کا ہے. شاید اسی کو عام زبان میں انسان کا ظرف کہا گیا ہے جو اپنی جگہ اٹل ہوتا ہے. ذیل میں چند امثال و اقوال درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کی اہمیت پر روشنی پڑے گی.

جبلتیں

«جبلت نصیحت سے نہیں بدلتی. پانی کتنا ہی گرم کیا جائے آخر جل کر ٹھنڈا ہوجاتا ہے.» [پنچ تنتر پہلا منتر شلوک ۲۵۷]

«اگر آگ ٹھنڈی ہوتی یا چاند میں جلانے کی خاصیت ہوتی تب البتہ اس دنیا میں بھی انسان کی جبلت بدل سکتی ہے.» [پنچ تنتر باب اول شعر ۲۸۸]

«ہر شخص کے جبلت ہی کا امتحان ہونا چاہئے اور خصائص کا امتحان

ضروری نہیں۔ کل خصلتوں میں جبلت سب سے اوپر چڑھ کر بیٹوق ہے۔»
[ہتوپدیش تیسرا باب ۵۸]

«انسان اپنی جبلت کو بہ مشکل بدل سکتا ہے اگر کتے کو بادشاہ بنا دو تب بھی وہ جوتے چبانا نہیں چھوڑے گا۔» [ہتوپدیش باب سوم ٦١]

«جس شخص کے اخلاق ایسے ہوں جو آریوں کے شایاں نہیں یعنی اس میں سختی، بے رحمی اور ہمیشہ اپنے فرائض کی طرف سے غفلت ہو تو وہ شخص کم نسل ہے۔» [منوشاستر دسواں باب ۵۸]

«کم نسل شخص اخلاق میں یا تو اپنے باپ سے مشابہ ہے یا اپنی ماں یا دونوں سے۔ وہ کبھی اپنی جبلت کو چھپا نہیں سکتا۔» [منوشاستر دسواں باب ۵۸]

لیکن ان اقوال و امثال میں جو کڑے پن (Rigidity) کا عمل پایا جاتا ہے اس پر انسان کی تدبیریں اور کوششیں دیر پا اور گہرے اثرات بھی پیدا کرسکتی ہیں، جب تعلیم اچھے اور برے کی تمیز پیدا کرتی ہے تو ان جبلتوں کا رخ مڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک انسان فطرتاً ضدی واقع ہوا ہے، اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت کی جائے تو وہ بجائے خود پرست (Self Centred) ہونے کے ایک بہترین بیرسٹر بن سکتا ہے۔ جو اپنے خیالات پر سختی سے اڑ کر اپنی بات منوا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جبلتوں کی تبدیلی کا نام تعلیم ہے۔

ہزارہا خطرات کے باوجود بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے عقلمندوں نے حدود کے اندر رہ کر زندگی سے حظ اٹھانے کی دعوت دی ہے۔ اسی لئے شادی بیاہ آل و اولاد، بیوی بچے، عزیز و اقاریب ہمسایہ سب کے حقوق مقرر کردئے ہیں اور سب سے متمتع ہونے کی تلقین کی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسانوں کو چاہئے کہ وہ زندگی کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی تلخیاں اور موت کی مایوسی کو نہ بھولیں کیونکہ انسان جب بوڑھا ہوجاتا ہے اور موت سے گلے ملتا ہے اس وقت اس کو اپنی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور غلطیوں پر نادم ہوتا ہے لیکن اس وقت تیر کمان سے چھوٹ جاتا ہے اور تلافی نا ممکنات سے ہوجاتی ہے۔ عقلمندوں کے چند مقولے و مثالیں اس سلسلے میں درج ذیل ہیں۔

زندگی بڑھاپا اور موت

۱ «جو کوئی بے مقصد کی زندگی بسر کرتا اور کچھ امیدیں نہیں رکھتا اس نے سب کچھ پڑھا اور سب کچھ سیکھا ہے اور وہ کچھ کرچکا ہے.»
[ہتوپدیش باب اول ۳۳]

۲ «جو کوئی مصیبت میں رنج نہیں کرتا. فلاح پر خوش نہیں ہوتا. اور لڑائی کے وقت نہیں ڈرتا. وہ دنیا میں تلک ہے. بہت کم مائیں ہیں جو ایسے پوت جنتی ہیں.» [ہتوپدیش باب اول ۳۳]

۳ «جوانی، حسن، زندگی، دولت اور حکومت اور پیاروں کا ساتھ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ نہیں رہتیں عقلمند کو ان کی فکر میں نہیں پڑنا چاہئے.»
[ہتوپدیش باب چہارم ۷۱]

۴ «عقلمند علم اور دولت حاصل کرتے وقت نہ بڑھاپے کا خیال کرے نہ موت کا. لیکن نیکی کرتے وقت وہ یہی خیال کرے کہ موت اسے بال پکڑ کر کھینچ رہی ہے.» [ہتوپدیش دیباچہ ۳۸]

۵ وہ کون شخص ہے جو اپنے سے نیچے طبقے کے لوگوں کو دیکھے اور اس کو اپنی بڑائی نہ معلوم ہو. جب اپنے سے اوپر کے لوگوں پر نظر ڈالے تب اپنی کمی معلوم ہوتی ہے.» [ہتوپدیش کتاب دوم ۲]

۶ «سانپ ہوا پی کر رہتے ہیں اور پھر کمزور نہیں ہوتے. جنگلی ہاتھی سوکھی جھاڑیاں کھا کر مضبوط ہوتے ہیں. ریاضت کرنے والے راہب (جو بہت کم کھاتے ہیں) زندہ رہتے ہیں. اصل میں قناعت انسان کے لئے سب سے بڑی دولت ہے.» [پنچ تنتر باب دوم شعر ۲۰]

۷ «جو شخص اپنے مال کو نہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے نہ کسی دوسرے کو دیتا ہے اس کی زندگی مثل لوہار کی دھوکنی کی ہے جو سانس لیتی ہے لیکن زندہ نہیں ہے.» [ہتوپدیش کتاب اول ۱۶۸]

۸ «دہرم کیا چیز ہے؟ کل ذی روح پر رحم کرنا. آسودگی کیا چیز ہے؟ ہر ایک مخلوق کے لئے صحت. محبت کیا چیز ہے؟ نیک طبیعت. علم کیا چیز ہے؟ برے بھلے میں امتیاز.» [ہتوپدیش باب اول ۱۵۶]

۹ « عقلمند کبھی ان چیزوں پر افسوس نہیں کرتے جو تلف ہوگئی اور نہ مردے پر یا کھوئی ہوئی چیز پر روتے ہیں کہ عقلمند اور بے عقل میں یہی فرق ہے ۔ »
[پنچ تنتر]

۱۰ « انسان کو چاہئیے کہ خاندان کی خاطر سے کسی فرد خاندان کو چھوڑدے ۔ گاؤں کی خاطر سے خاندان کو چھوڑے ۔ ملک کی خاطر سے گاؤں کو ۔ اور خود اپنے فائدہ کے لئے دنیا جہاں کو ۔ » [پنچ تنتر تیسرا منتر ۸۱]

۱۱ « عقلمند کو چاہئیے کہ اپنی جان کو بیٹے اور بی بی کی جانیں کھو کر بھی بچائے ۔ جس وقت خود انسان زندہ رہا تو اس کو سب کچھ مل سکتا ہے ۔ »
[پنچ تنتر]

۱۲ « جب ہمارا یہ جسم جو پانچ عناصر سے بنا ہے مرنے کے بعد اپنے اصلی اجزأ میں مل جاتا ہے تو افسوس کس بات کا کیا جائے ۔ » [پنچ تنتر]

ان مقولوں اور مثلوں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان میں بھرپور صداقت موجود ہے کیونکہ انسان اس زندگی میں ایک مسافر ہے جس کا سفر اچانک طور پر نامعلوم کب ختم ہوتا ہے اس لئے اس کو چاہئیے کہ زادِ راہ ہمیشہ ساتھ رکھے اور یہی اس کا عمل ہے ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)

انسانی افعال و محرکات میں قدیم زمانے کے دانشمندوں نے خوف کو اول جگہ دی ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ ضبط و تنظیم اور کارکردگی کے لئے سزا ضروری اور لازمی ہے کیونکہ تمدن کا مدار ضبط و نظیم پر منحصر ہے اور یہی ایک چیز ہے جو انسان کو اپنے ادائی فرض پر قائم رکھتی ہے اور گمراہی سے روکتی ہے ۔ خوف اور سزا کے بارے میں چند اقوال درج ذیل ہیں ۔

افعال و محرکات

۱ سزا تمام بنی آدم کو راہ پر لاتی ہے کیونکہ ایسا شخص جو حلقۂ نیک چلن ہو مشکل سے ملتا ہے ۔ سزا ہی کا ڈر وہ چیز ہے جو دنیا کے لوگوں کو ان نعمتوں کا مزا اٹھانے دیتا ہے جو ان کو عطا کی گئی ہیں ۔ [منو شاستر]

۲ بنا ڈر کے یا لالچ کے یا کسی خاص غرض کے انسان نہ کسی کے ساتھ خلق سے پیش آتا ہے نہ کسی کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۳ پیڑ کا پھل جب ہوچکتا ہے تو چڑیاں اسے چھوڑ دیتی ہیں۔ سوکھے تالاب سے بگلے اڑ جاتے ہیں۔ جلے جنگل کے کنارہ سے ہرن چمپت ہوجاتے ہیں۔ کنچنیاں مفلسی سے کوسوں بھاگتی ہیں۔ اور نوکر چاکر تباہ راجہ سے۔ ہر شخص اپنے فائدہ کی تلاش سب سے مقدم سمجھتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۴ آگ جو جنگل کو جلا دیتی ہے ہوا اس کا ساتھ دیتی ہے پر چراغ کو گل کردیتی ہے۔ کمزور کا کون دوست؟ [پنچ تنتر]

۵ جب تک کچھ خدمت نہ کی جائے کوئی کسی سے کسی قسم کی محبت نہیں کرتا۔ دیوتا بھی منت تب پوری کرتے ہیں جب کوئی چڑھاوا ان پر چڑھایا جائے۔ [پنچ تنتر]

۶ محبت کا وجود دنیا میں اسی وقت تک پایا جاتا ہے کہ جب تک اس کا کوئی صلہ ملے۔ گائے کا بچھڑا جب دیکھتا کہ تھن میں دودھ نہ رہا تو ماں سے جدا ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۷ آدمی، آدمی کا نوکر نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کا۔ آبرودار اور معتبر ہونا یا بے حقیقت ہونا اس پر موقوف ہے کہ انسان دولت مند ہے یا مفلس۔ [ہتو پدیش]

۸ اگر کوئی جھوٹ بولتا ہے یا ایسے کی تعظیم کرتا ہے جو تعظیم کا مستحق نہ ہو یا غیر ملکوں کا سفر کرتا ہے تو اپنا پیٹ پالنے کے لئے۔ [پنچ تنتر]

۹ دنیا میں مرد اپنے ہر فعل کا مختار ہوتا ہے تا وقتیکہ کسی عورت کی بکواس آنکس اسے رام نہ کردے۔ [پنچ تنتر]

۱۰ مرد کیسا ہی عاقل کیوں نہ ہو لڑائی کے میدان میں کیسا ہی سورما بیر کیوں نہ ہو عورت کے سامنے بہت ہی ذلیل و خوار بن جایا کرتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جو مرد عورت کی بات پر چلتا ہے وہ غیر ممکن کو ممکن، نا دستیاب کو دستیاب، اور نا خوردنی شے کو کھانے کے قابل سمجھتا ہے۔ [پنچ تنتر]

لیکن ان اقوال و امثال میں سزا کو جو بنیادی حیثیت دیگئی ہے تجربات اس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ کسی انسان کی اصلاح اس کے خیالات میں پاکیزگی آنے سے کی جا سکتی ہے نہ کہ بیرونی دباؤ و ڈر اور خوف سے، تاریخ شاہد

ہے کہ سزا نے رد عمل کا جذبہ پیدا کیا، ڈر اور خوف سے جو کام ہوا اس میں خلوص و نیک نیتی کو ذرا بھی دخل نہ رہا۔ یہاں تک کہ جسمانی سزا نے بڑے بڑے جرائم کی بھی روک تھام نہ کی بلکہ «جتنا بھی دبار تم اتنا ہی ابھرے گا» والی بات ہوجاتی ہے اس لئے یہ افعال افراط و تفریط سے گلے ملتے ہیں۔ گو ان میں بڑی حد تک صداقت ہے لیکن ان میں تحدید نہیں ہے۔

بھارت میں عورت کا جو درجہ قائم کیا گیا ہے اس میں اسے ایک «ادنیٰ حسین مخلوق» سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی بے وفائی کو لاعلاج تصور کیا گیا ہے اس کو مرد کا جز زندگی سمجھ کر وہ ایک ملکیت قرار دیگئی ہے۔ بحیثیت ایک انسانی فرد کے اسے کسی قسم کی آزادی نصیب نہیں منو سمرتی جیسا موجد قوانین اس بارے میں یک طرفہ رائے رکھتا ہے۔ ذیل کے اقوال اس زمانے کے دانشمندوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عورت

۱ تلو کی تقسیم کے مطابق عورتوں کا خاص حصہ یہ ہے۔ پلنگ سے محبت، بیٹھنے کی چوکی سے محبت، زیور کا شوق، شہوت پرستی، غصہ، برے کی طرف میلان، اذیت رسانی سے رغبت اور ضدی پنا۔ [منو شاستر]

۲ عورت کی طبیعت کا تلون جیسے سمندر کی موجیں، اس کے جذبات بالکل بے ثبات، جیسے شفق کے بادلوں کی صفیں۔ جب اس کی ہوس پوری ہوجاتی ہے اور مرد اس کے کام کا نہیں رہتا تو اس سے کنارہ کش ہوجاتی ہے جیسے کوئی اس لاکھ کو پھینک دیتا ہے جس پر چھاپہ ہوچکا ہو۔ [پنچ تنتر]

۳ ایک سے باتیں کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیان اس کا ہوتا ہے تیسرے کی طرف جس کو وہ دل ہی دل میں رہنے دیتی ہے۔ فی الحقیقت وہ کون ہے جس کو عورت دل سے چاہتی ہے۔ [پنچ تنتر]

۴ عورتیں ہمیشہ بے وفا ہوا کرتی ہیں حتیٰ کہ یوگ کہتے ہیں دیوتاؤں کی استریوں کا بھی یہی حال ہے خوشا حال ان مردوں کا جن کے عورتوں کی پوری حفاظت کی جاتی ہے اگر کوئی عورت پاک دامن ہے تو اس کی وجہ یہ

نہیں کہ اس میں حیا ہے یا حجاب یا طبیعی نیک خصلتی یا خوف بلکہ صرف یہی کہ اس سے کوئی کسی عنایت کا طلبگار نہیں ہوا۔ [ہتو پدیش]

۵ پاگل، کیکڑا، نیل، تلوار اور استری چمٹنے سب برابر ہیں۔ [پنچ تنتر]

۶ عورت کو کوئی نہ جبر سے زیر کرسکتا ہے نہ نصیحت سے یہ ایک ایسی کائنات ہے کبھی مغلوب ہی نہیں ہوتی۔ [پنچ تنتر]

۷ عورت کا حال گائے کا سا ہے جو جنگل میں نت نئی ہریلی گھانس کے کھوج میں رہتی ہے۔ عورت بھی سدا نئے نئے کی چاہت میں رہتی ہے۔ [ہتو پدیش]

۸ عورت کی محبت بجلی کی چمک سے بھی جلد مٹ جاتی ہے۔ دُھن اس کو کسی اور کی ہو پر بناوٹ سے پیار تم کو کرے۔ گلے تم کو لگائے اور ٹھنڈی سانس تمہارے کسی رقیب کے لئے بھرے۔ طبیعت کے برخلاف چال چلنے کا کوئی کیوں ارادہ کرے۔ کنول کا پھول پہاڑیوں کی چوٹیوں پر نہیں پھولتا۔ خچر کا بوجھا اور ہوتا ہے گھوڑے کا اور۔ جَو کے دانہ سے دہان نہیں اگتا۔ عورت کی روح میں پارسائی کا وجود ڈھونڈھے نہیں ملتا۔

۹ شہوت ناک عورت کو جسے ہمیشہ کسی مرد سے لگاؤ رہتا ہے خاندان کی ذلت، دنیـــا کی ملامت، حتیٰ کہ اسیری اور جان کا خطرہ سب کچھ منظور ہوتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۰ جو بات عورت کے دل میں ہوتی ہے وہ اس کے زبان پر نہیں آتی۔ جو زبان پر آتی ہے وہ منہ سے باہر نہیں نکلتی اور جو باہر نکلتی ہے اس پر وہ عمل نہیں کرتی۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جہاں استری راج ہو۔ جہاں کوئی جواری ہو اور جہاں بچہ مالک ہو اس گھر کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۲ محبت سے بالکل پرہیز کرنا مناسب ہے اور اگر نہ ہوسکے تو اپنی ہی اہلیہ سے محبت کرے کیونکہ وہی اس کا شافی علاج کرسکتی ہے۔ [ہتو پدیش]

۱۳ یہ دبدہوں کا بگولا، شوخی کا مسکن، بیباکی کی نگری، گناہوں کا مخزن، ہزار مکاریوں کا محل، بدگمانیوں کا ڈیرا، یہ پٹاری جس میں ہر قسم کا جادو منتر بھرا ہے، یہ معمہ جس کے حل کرنے میں بڑے سے بڑے اور نامور سے نامور مرد قاصر رہے ہیں، یہ کل جس کا نام عورت ہے، یہ امرت

ملا ہوا زہر، اس کو دنیا میں کس نے پیدا کیا کہ پارسائی کو میٹ دے۔
[پنچ تنتر]

۱۴ پس جب شوہروں کو معلوم ہے کہ خداوند عالم نے مخلوقات کی پیدائش کے وقت ان کو کیا خصلت عطا کی ہے تو ان کو لازم ہے کہ ان کی حراست میں از حد کوشش کریں۔ [منو شاستر]

لیکن ہندوستان کی استری اپنی وفاداری میں ضرب المثل رہی ہے۔ اس نے اپنی ہستی کو اپنے پتی کی ہستی میں ضم کر دیا وہ اس کے ساتھ زندہ رہی اور اسی کے ساتھ جل مری۔ ستی کی رسم نے ثابت کردیا کہ وفاداری کس کو کہتے ہیں۔ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کی نگرانی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے بھارت کی عورت نے مثال قائم کردی ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا اتنا احساس ہے کہ اپنی ذات سے اسے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ جوانمردی، بہادری اور ایثار کی بڑی بڑی مثالیں ہندوستان کی عورت نے قائم کی ہیں۔ دنیا میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ وہ دھرتی کی ماں ہے وہ رشی اور پیغمبر نہیں بلکہ وہ رشی اور پیغمبر پیدا کرتی ہے۔ ان کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری اسی کے سر ہے اس کے باوجود اسے انسانی فرد کی حیثیت سے آزادی نہ دی جائے یہ انصاف نہیں۔ اسلام نے عورت کے درجے کو بہت بڑایا ہے اسے مساوات کا درجہ دیا ہے۔ اس کی اہمیت و معنی اور اسے زندہ رہنے کا حق دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کو بھی اپنے جوہر دکھانے کے موقع ملے۔

بھارت کے قدیم دانشمندوں نے اس وقت علم کی قدر و قیمت کی جب کہ مغرب اس باب میں سویا ہوا تھا۔ وہ علم کو روپیہ پیسے سے بھی بڑی دولت سمجھتے ہیں اور جہالت کو افلاس سے کمتر درجہ قرار دیتے ہیں علم کی تعریف میں ان کے پاس «دھیان گیان» پر بہت زور دیا گیا ہے وہ جو بھی نتیجہ منضبط کرتے ہیں اس میں سوئچ و بچار اور تجربہ کو بڑا دخل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب مغرب میں علم کی روشنی پھیلی تو مشرق کے سرچشموں سے استفادہ کیا گیا اور یہاں کی کتابوں کو بہت اہمیت دی جا کر ان خیالات کو اپنایا گیا۔ بعد میں مغرب کے مفکرین نے ان بنیادی پتھروں پر اپنے تخیلات کے محل بنائے، بات کو پھیلانے کی کوشش کی اور بات میں بات پیدا کی جس میں گھات کو دخل حاصل ہے۔

کو بڑی حد تک تیقن کے ذرات شامل ہوتے گئے۔ اسی لئے مشرق میں عالم کا درجہ بادشاہ سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ ذیل کے امثال اس کی گواہی دیتے ہیں۔

علم و جہالت

۱ کوئی اس میں اختلاف نہیں کرتا کہ علم انسان کا بہترین زیور ہے علم مال کا ایک پوشیدہ دفینہ ہے علم ایک ایسا دوست ہے کہ ہر ایک سفر میں ساتھ دیتا ہے۔ علم دولت جاوید ہے۔ علم جاہ و جلال کو پہنچاتا ہے اور پوری محفل کو فریفتہ کرلیتا ہے۔ علم وہ آنکھ ہے جو سب سے بالا ہے۔ علم ہی ہم کو دنیا میں زندہ رکھتا ہے۔ علم کے بغیر انسان وحشی جانور کے برابر ہوتا ہے۔ [ہتوپدیش]

۲ کہتے ہیں کہ سب دولتوں میں علم بڑا ہوتا ہے کیونکہ نہ کوئی اس کو کسی دوسرے سے چھین سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے اور پھر وہ لازوال ہوتا ہے۔ [ہتوپدیش]

۳ دانائی اور بادشاہی کبھی برابر نہیں ہوسکتی بادشاہ کی حرمت اسی کے ملک میں ہوتی ہے اور دانا کی حرمت ہر جگہ۔ [ہتوپدیش]

۴ تعلیمیافتہ آدمی میں سب اوصاف پائے جاتے ہیں اور جاہل میں عیب ہی عیب ہوتے ہیں پس ایک تعلیمیافتہ کڑوڑوں جاہلوں سے بہتر ہوتا ہے۔ [ہتوپدیش]

۵ انسان جب تک خوش خوش دنیا کی گردش نہ کرے اور ملک ملک نہ پھرے تب تک پوری طرح سے نہ علم حاصل کرسکتا ہے نہ دولت نہ ہنر۔ [پنچ تنتر]

٦ علم سے عقل بہتر ہے۔ عقل کو علم پر فوقیت ہے جس میں عقل مفقود ہوتی ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۷ جو کوئی خلقتاً عقل سے مبرا ہو اس کو کتابوں کے مطالعہ سے کیا فائدہ ہے جس کی دونوں آنکھیں جاتی رہی ہوں اس کے لئے آئنہ کس مصرف کا [ہتوپدیش]

۸ تیر انداز کی کمان سے جو تیر نکلتا ہے وہ یا تو ایک فرد بشر کو ہلاک کرتا ہے یا خالی جاتا ہے مگر جب دانشور کی دانشمندی پرواز کرتی ہے تو ایک پورے ملک اور ملک کے مالک کو خاک کردیتی ہے۔ [پنچ تنتر]

۹ افلاس کی سب سے بڑی قسم وہ ہے جس میں علم کا قحط ہو۔ [پنچ تنتر]

۱۰ جاہل پر روز ہزار قسم کی مصیبت کا ہجوم رہتا ہے اور خوف کی سو باتوں کا اس پر حملہ ہوتا ہے مگر عالم کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ [ہتوپدیش]

۱۱ محفل میں جاہل کی چمک دمک صرف اس کے لباس کی بدولت ہوتی ہے جاہل کی نمود اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ سکوت اختیار کرے اور زبان نہ کھولے۔ [ہتوپدیش]

۱۲ بالیاقت اکلوتا بیٹا سیکڑوں جاہل بیٹوں سے بہتر ہوتا ہے۔ چاند اکیلا اندھیارا دور کرنے کو بس ہے۔ پھر یہ کام بے شمار ستاروں کی جمگھٹ سے نہیں ہوتا [ہتوپدیش]

۱۳ جن آدمیوں میں اوصاف ہوتے ہیں وہ اپنی لیاقت کے زور سے اقبال کے اوج کو پہونچ جاتے ہیں۔ ان کے حاسدان کو کون پوچھتا ہے ؟

لیکن اقوال بالا علم و فراست کی پوری پوری حمایت کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ عالم « آنکھ والا » اور جاہل « اندھا » ہوتا ہے۔ اگر علم و فراست ایک جا جمع ہوجائیں تو پھر روشنی ہی روشنی ہے۔ عالم کو ظاہری شان و شوکت اور بے جا چمک دمک کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے علم کی روشنی سے محفل پر چھا جاتا ہے اور وقت پڑے اپنی دانشمندی سے کمال اوج حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک چاند ہزاروں ستاروں سے بہتر ہے جو اپنی روشنی سے دنیا کی تاریکی کو دور کرسکتا ہے۔ عالموں نے آنے والی نسلوں کے لئے ایسا ذخیرہ چھوڑا جو کبھی فنا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی اولاد اس ورثے میں اضافہ ہی کرتی ہے۔

عالم کے لئے نسل و خاندان کے بھی اچھے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی. اس کا علم اگنی کی طاقت ہے جو ہر چیز پر فوقیت لے جاتا ہے.

بھارت کے حکماء کے نزدیک علم کے بعد دولت کا درجہ ہے لیکن تقسیم دولت کے فلسفہ میں ان کے پاس افرط و تفریط ہے. دولت کمانا ان کے نزدیک زندگی کا اہم مقصد ہے لیکن ذات پات کی تقسیم نے غریب اور امیر کے درمیان بڑی گہری اور عمیق خلیج حائل کردی ہے، ایک طرف دولت مندوں کا خاص گروہ ہے تو دوسری طرف غریب و مفلس کا انبوہ کثیر. مذہب نے بھی کچھ اس قسم کا حواز دے رکھا تھا کہ غریب، غریب رہے اور امیر، امیر رہے. دونوں کے درمیاں کی دوری کو پاٹنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ انسان، انسان میں فرق رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے بھارت سونے کی چڑیا ہونے کے باوجود بھی غریبوں کا ملک رہا. حالانکہ اس بات پر اہمیت دیگئی ہے کہ اس دنیا میں جس کے پاس دولت نہ ہو تو وہ فقط نام کا انسان ہے اور اگر بوڑھے کے پاس دولت موجود ہو تو وہ جوان ہے. لیکن دولت کی مساوی تقسیم پر زور نہیں بلکہ اس کا انحصار ذاتی سعی پر رکھا گیا اور پس منظر میں ذات پات کی تقسیم اس عمل میں حائل رہی. نمونے درج ہیں

دولت اور افلاس

۱ « بعض ہوشمندوں کا قول ہے کہ سب سے بڑی نعمت نیک خصلتی اور دولت ہے. بعض کہتے ہیں عیش اور دولت، بعضوں کے نزدیک فقط نیک خصلتی اور اوروں کی رائے میں صرف دولت ہی نعمت عظمیٰ ہے مگر سچی دولت ان تینوں کے اکٹھا کرنے سے حاصل ہوتی ہے. » [منوشاستر]

۲ « لوگ دولت کے حصول میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے پس ہوشمند کو لازم ہے کہ بجز دولت حاصل کرنے کے اور کسی کام میں اپنی کوششوں کو صرف نہ کرے. » [پنچ تنتر]

۳ « جو امیر ہے اس کے دوست احباب ہوتے ہیں، جو امیر ہے اس کے عزیز و اقارب ہوتے ہیں جو امیر ہے وہ اس دنیا میں ایک شخص ہوتا ہے، جو امیر ہے وہ درحقیقت زندگی بسر کرتا ہے. » [پنچ تنتر]

۴ «اس دنیا میں امیروں کے واسطے دشمن بھی عزیز بن جاتا ہے . غریبوں کے لئے عزیز بھی فوراً دشمن بن جاتا ہے .» [پنچ تنتر]

۵ «جو حرمت کا اہل نہ ہو اس کی حرمت کی جائے جس سے کوسوں بھاگنا چاہئے اس کے سب طلب گار ہوں . جس کو تعریف کا کچھ بھی حق نہ ہو اس کا لوگ ڈنکا بجائیں . اس کو کہتے ہیں دولت کا زور . » [پنچ تنتر]

۶ بڈھے کے پاس اگر دولت ہو تو وہ جوان ہے اور نادار عین عالم شباب میں بڈھا ہے . » [پنچ تنتر]

۷ « اس دنیا میں جس کے پاس دولت نہ ہو وہ فقط نام کا انسان ہوتا ہے . » [پنچ تنتر]

۸ « جب آدمی کی دولت جاتی رہتی ہے تو اس کی آبرو آن بان حسن و جمال ذہانت سب دفعتاً غائب ہوجاتی ہیں یہ کہنا بے سود ہے کہ حواس خمسہ برابر بے نقص رہتے ہیں یہ فقط کہاوت ہے یا یہ کہ عقل برابر سالم رہتی ہے . یہ بھی کہنے کی بات ہے . جس آدمی کی دولت جاتی رہتی ہے وہ گھڑی میں کچھ کا کچھ ہوتا ہے . » [ہتوپدیش]

۹ « انسان کے لئے افلاس نیستی مجسم ہے اور قبائح کا مسکن غرض کہ ایک قسم کی موت ہے . » [پنچ تنتر]

۱۰ « کبھی کبھی مٹی بھی کام آتی ہے بشرطیکہ خالص ہو . پر اس دنیا میں مفلس آدمی کسی مصرف کا نہیں ہوتا . » [پنچ تنتر]

۱۱ « افلاس سے ہمیشہ ڈرنا چاہئے کیونکہ مفلس کے لئے کچھ نہیں ہوتا غریب اگر احسان کرنے کو بھی آئے تو لوگ اس کو کتے کے برابر سمجھتے ہیں . » [پنچ تنتر]

۱۱ نیک آدمی اگر افلاس میں مبتلا ہو تو اس کے اوصاف حمیدہ چمکنے نہیں پاتے . دولت ذاتی جوہر کو ایسا روشن کردیتی ہے جیسا آفتاب کائنات کو . » [پنچ تنتر]

۱۳ « انسان کیسا ہی تیز فہم کیوں نہ ہو کھانے کپڑے کی روز مرہ کی فکر اس کی عقل کو فنا کردیتی ہے . » [پنچ تنتر]

۱۴ « مکان کیسا بھی خوشنما کیوں نہ ہو افلاس اس کو بے رونق کردیتا ہے جیسے

تاروں بن آسمان، پانی بن تالاب یا جیسے کوئی مہیب گورستان.» [پنچ تنتر]

۱۵ «جب افلاس آتا ہے تو آدمی* خفیف ہوجاتا ہے اور جب خفیف ہوگیا تو وہ ایماندار نہیں رہتا اور جہاں کہیں ایمانداری کی گئی تو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جب اس کی حقارت ہونے لگی تو وہ ہمت ہار جاتا ہے اور ہمت ہار نے کے بعد آتی ہے مایوسی. اور جب مایوسی اس پر غالب ہوگئی تو اس کی عقل سلب ہوجاتی ہے اور جب عقل سلب ہوگئی تو وہ سیدھا تباہی کی راہ لیتا ہے. ہائے رے افلاس! تو سب قباحتوں کا سرچشمہ ہے.» [ہتوپدیش]

۱۶ «دانشمند آدمی موت کا گلہ نہیں کرتا لیکن افلاس سے کبھی راضی نہیں ہوتا ہے آگ بجھ جاتی ہے پر ٹھنڈی نہیں ہوتی.» [ہتوپدیش]

۱۷ «کہتے ہیں کہ افلاس کو موت پر ترجیح دینا چاہئے. موت سے تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے پر افلاس ایک ایسا عذاب ہے جس کی برداشت نہیں ہوسکتی.» [ہتوپدیش]

۱۸ «زندگی اس وقت تک سودمند ہے جب تک اس کے ساتھ استغنا بھی ہو جس کا گذارا دوسروں پر ہو اس کے لئے زندگی اگر موت نہیں ہے تو کیا ہے.» [ہتوپدیش]

۱۹ «جو عروج غلامی سے حاصل ہو اس سے بہتر ہے جنگل کی گشت اس سے بہتر ہے گدا گری اس سے بہتر ہے بوجھا اٹھانا اس سے بہتر ہے آدمی کا بیمار ہوجانا.» [پنچ تنتر]

لیکن دنیا میں دولت، روپیہ پیسہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی سب کچھ نہیں. دولت فرد کی شخصیت کو ابھار سکتی ہے اس کی ظاہری شان و شوکت کو بڑھا سکتی ہے اس کے عیش و آرام کے سامان کو مہیا کرسکتی ہے لیکن اس کے اندرونی صلاحیتوں کو گٹھا دیتی ہے اور اس کے زندگی کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے. دنیا میں شاذ و نادر لوگ ایسے ہیں جو باوجود دولت مند ہونے کے حلم، انکساری، تواضع، دانشمندی، علم و تدبر کو وضعداری بنائے رکھتے ہیں اور انسانی اعلیٰ صفات کا دامن نہیں چھوڑتے، بالعموم دولتِ انسان کو غلط راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ اپنی ہستی کو ابھارنے سے معذور ہوجاتا ہے. اسی لئے دولت

کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ برقرار نہیں رھتی بلکہ اپنا وزن کھو دیتی ہے۔ گو دولت ایک طاقت ہے لیکن سب سے بڑی طاقت نہیں۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

اے زر تو خدا نہ ای و لیکن بخدا ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

اس شعر سے یہ مطلب واضح ھوتا ہے کہ دولت میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو خدا کے درجے تک لے جاسکتی ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں جاکر انسان قعر منزلت میں گرجاتا ہے جہاں دولت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور صرف اس کا حسن عمل باقی رھتا ہے۔

انسان کی زندگی ایک آزمائش ہے، اس امتحان میں پورا اترنا ایک کٹھن کام ہے کیونکہ دنیا «خیر و شر» کی کشمکش کا ایک مرقع ہے۔ معمولی کاموں سے لے کر بڑے کاموں تک اسے مختلف قوتیں متاثر کرتی رھتی ہیں۔ قدم قدم پر مشکلات اس کی راہ تکتی ہیں اور اس کشمکش میں اس کے لئے دو چیزیں بہت مشکل بن جاتی ہیں ایک مختلف پگڈنڈیوں میں سے سیدھا راستہ اختیار کرنا اور دوسرے اپنے ارادے پر ثابت قدمی کا ثبوت دینا۔ یہ دو مشکلات ایسی ہیں جو انسان کو کھوکھلا دیتی ہیں اور وہ مختلف الجھنوں میں گرفتار ھوجاتا ہے۔ اسی لئے ہر مذہب و ملت کے اکابرین نے عملی زندگی میں «مکارم اخلاق» کی زندہ مثالیں پیش کی ہیں تاکہ انسان کے رفتار و کردار میں ایک توازن پایا جائے اور اس کی زندگی یک رخی راستہ اختیار نہ کرے۔ پھر غصہ، حسد، تعصب، جھوٹ، برائی اول غلطیوں سے بچے اور دوسرے انسان کو انسان سمجھے اور اس کی حق تلفی نہ کرے۔ ذیل کے اقوال زندگی کی راھوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن ان امثال میں دنیا سازی کا بھی جوار شامل ہے۔

چال و چلن

۱ اخلاق کے اصول عامہ کی اس بات کو کان لگا کر سنو، یہ نیکی کا جوہر ہے اور جب سن لو تو اس پر غور کرو۔ یعنی جو چیز اپنے کو آزار پہونچائے اس کا عمل دوسرے پر نہ ہونے دو۔ [پنچ تنتر]

۲ جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے وہ دوسرے کی عورت کو ماں کے برابر

سمجھتا ہے اور دوسرے کے مال کو ڈھلیے کے برابر اور کل کائنات کو اپنے برابر۔ [پنچ تنتر]

۳ دوسروں کو خوش اخلاقی کا وعظ دینا ایک اسانیت ہے کہ اس کو ہر شخص بہ آسانی حاصل کرسکتا ہے مگر خود صلاح کاری کو عمل میں لانا ایک ایسی بات ہے جو فقط برگزیدہ ارواح سے ہوسکتی ہے [ہتوپدیش]

۴ بعضوں کی رائے میں علقمندی لفظوں ہی میں ہوتی جیسے طوطے کی عقلمندی بعضوں کے نزدیک دل میں جیسے گونگے کی اوروں کے قول کے مطابق دل میں اور لفظوں میں برابر برابر ہوتی ہے۔ [پنچ تنتر]

۵ انسان اگر سو کوس کی مسافت بھی طے کرلے تو اس کے برے اعمال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہی حال فیاض آدمی کے اعمال کا بھی ہوتا ہے۔ [پنچ تنتر]

٦ ہر ایک حرکت جو انسان کے خیال سے یا قول سے یا فعل صادر ہوتی ہے اسکا ثمرہ یا اچھا ہوتا ہے یا برا اور یہ اس پر موقوف ہے کہ خود وہ حرکت اچھی ہے یا بری۔ انسان کی ہر ایک حالت اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ [منوشاستر]

۷ خلوص قلب، ہوائے نفسانی پر قابو، نفس کشی اور ریاضت، داد و دہش، دوسروں کی ضرر رسانی سے اجتناب، قرض کا ہمیشہ ادا کرنا، ان ہی باتوں سے ہماری قدر ہوتی ذات اور اصلیت کی کم کوئی پرواہ کرتا ہے۔ [مہا بھارت]

۸ جو کودو کنگنی بوئے گا وہ کودو کنگنی کاٹے گا جو بدی کا پودا لگائے گا۔ وہ بدی پھل پائیگا۔ [تامل مثل]

۹ انسان کی بد اطواری ایک ایسا درخت ہے جس کے پھل بیماری، رنج و الم سوختہ دلی اور مصیبت ہوا کرتے ہیں۔ [ہتوپدیش]

۱۰ سانپ اور بد نفس آدمی اور جو دوسروں کا مال چراتے ہیں ان کی بندشیں اور منصوبے پورے نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا وجود اب تک باقی ہے۔

لیکن مندرجہ بالا اقوال زندگی کے طویل گزرگاہ پر چلنے میں سہارے کا کام کرتے ہیں کیونکہ انسان فرشتہ تو نہیں اس لئے دنیاداری اور دنیا سازی اس کی ضرورت بن جاتی ہے ۔اس عمل میں بعض دفعہ اسے « خیر و شر » دونوں کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اعمال زندگی میں انسان کو اچھائی و برائی دونوں سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ دونوں ستون انسان کا کردار بناتے ہیں اور اس کے چال چلن کی راہیں متعین کرتے ہیں ۔ ان امثال و اقوال میں انسانی الجھنوں کو سلجھانے کی بڑی طاقت ہے وہ ایک طرح سے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور عقلمندوں کے لئے اشارہ بن جاتے ہیں ۔

(باقی آئندہ)

---

* نثار احمد فاروقی

مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط

مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں مولانا فضل حق خیرآبادی ۱۲۷۸ھ - ۱۲۱۲ھ کا ایک غیر مطبوعہ خط ملا ہے ، اس کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ اس کا کاتب ایک اہم علمی و ادبی شخصیت ہے . بلکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت قابل غور و فکر ہے . انیسویں صدی کی اقتصادی حالت اور معاشی زبوں حالی کا جو نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ۱۸۵۷ع کی شورش پر ختم ہوتا ہے . اٹھارہ سو ستاون کا ہنگامہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم سانحہ ہے اور اس کے بارے میں مورخوں کی مختلف رائیں ہیں . کوئی اسے محض « فوجی بغاوت » کہتا ہے ، کسی کو اس کی پشت پر گہری سازش نظر آتی ہے ، کوئی اسے بے سوچے سمجھے ہنگامے سے تعبیر کرتا ہے تو کسی نے اسے طے شدہ اور منظم قومی تحریک قرار دیا ہے ، لطف یہ کہ ہر مورخ کے پاس قوی دلائل بھی موجود ہیں .

مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس خط سے یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں علماء کا طبقہ اقتصادی معاملات میں کس انداز سے سوچتا تھا اور کمپنی کی معاشی پالسی کا اثر ہندوستان کی عوام پر کیا پڑ رہا تھا جس نے رفتہ رفتہ انہیں انگریزوں کی حکومت سے اتنا بیزار اور متنفر کردیا کہ وہ یک لخت بغاوت پر آمادہ ہوگئے .

یہ خط کس کے نام لکھا گیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا ، عنوان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر ہے . یہ خط مکمل بھی نہیں ہے اچانک تمام ہوجاتا ہے اس لئے سال کتابت کا تعین بھی دشوار ہے . اس خط میں مولانا فضل حق خیرآبادی نے « حضرت جہاں پناہ » کی توجہ اس امر کی طرف

---

* نثار احمد فاروقی ، شعبۂ علوم مشرقی ، دہلی یونی ورسٹی ، (دہلی) .

مبذول کرائی ہے کہ اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان میں کچھ کسان اور کاشتکار ہیں کچھ روزگارپیشہ، کچھ تاجر اور اہل حرفہ، کچھ لوگ لاخراجدار اور روزینہ دار ہیں، کچھ کی معاش محض در یوزہ گری پر ہے۔ یہاں کے باشندے مسلمان بیشتر اور ہندو کمتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک کرکے کسی زمانے میں یہاں آکر آباد ہوئے۔ جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی، اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی کیوں کہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات اسی ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلے اور لیاقت کے موافق تجارت، حرفہ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پالیتا تھا۔ مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے، اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہوگئی ہے۔ کیوں کہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں اور روزگار کے دروازے بند ہوگئے ہیں، سوائے معدودے چند لوگوں کے جنہیں عدالت دیوانی، کلکٹری، فوجداری پرمٹ، تھانہ، یا تحصیل کے عملے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے، وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آرہا ہے کہ ان لوگوں سے چھن جائیگی۔ چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے سارے گرُ اپنے قبضے میں رکھے ہیں، اور تمام اجناس مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کرکے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے اس لئے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دست بردار ہوگئے ہیں۔

اور معافی داروں کا حال یہ ہے کہ سنہ ۱۸۰۳ع اور ۱۸۰۵ع کے قوانین کی رو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کئے تھے کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری سنہ ۱۸۰۱ع اور یکم جنوری سنہ ۱۸۰۳ع سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہوں گی، چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور

خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار ہو یا نہ ہو ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائیگا. مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کرلی گئیں ہیں اور معافی داروں کے لئے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی، اور کسانوں کا حال یہ ہے کہ ان پر اِتنے محاصل واجب کردیئے گئے ہیں کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے، ان کی بے استطاعتی اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹری کے ریکارڈ سے ظاہر ہوجاتی ہے. پس جب کسی کے لئے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا تو اب اہل حرفہ کس کے لئے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے؟ اور جب سارے ہی لوگ تنگی معاش میں مبتلا ہوں تو بھک منگے کو کون خیرات دے؟ یہ مختصر سی کیفیت رعایائے ہندوستان کی معاشی تنگی کی ہے اور علاقہ شاہجہاں آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل و پلول و بتین و نجف گڑھ و سالکہ و فیروزآباد و ڈیگ و لوہاپانا و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوہانہ و حرسٹھ و کھرکھودہ و روہتک و مہم و ہانسی و حصار یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی فوج، انتظامیہ، اور شاگرد پیشہ کی خدمات پر مامور تھے. ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے اب یہ سب پرگنے اور دیہات و اراضیات سرکار انگریز نے ضبط کرلیں اور لاکھوں کسان یک لخت بے روزگار ہوگئے اور تمام عالم میں روزگار عنقا کی طرح ناپید ہوگیا، سیکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دار و مدار چرخہ کاتنے رسیاں بٹنے، یا چکی پیسنے پر موقوف کئے ہوئے تھے، اب ریسمان کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعہ معاش بھی جاتا رہا، اسی طرح اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہوگئے اور جو کچھ سرمایا انکے پاس تھا کھا پی کر برابر کردیا اور اپنے دوالے نکال دئے.

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی پیشی سے حکم ہوا کہ ہم غریب «زر چوکیداری» ادا کریں، اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانے میں یہ رسم نہیں رہی مگر حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر اسے بھی قبول کیا اور اب تک ادا کرتے رہے، اب ڈسٹرک مجسٹریٹ کا نیا حکم آیا ہے جس میں انہوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے، جن کا

فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر، سامان گروی رکھکر یا بیچ کھوچ کر، ہزارہا روپیہ خرچ کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کردی۔ اب ان نو تعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات یا چوکیدار کے تساہل سے ہم لوگوں کو آئے دن تکلیف کا سامنا ہے مگر اسے بھی جھیل لیا، اس جبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پانچ پنچوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔

بس یہاں یہ عرضی ختم ہوجاتی ہے اگر اس کا پورا متن دستیاب ہوجاتا تو یقیناً نہایت اہم چیز ہوتی۔ اب بھی اس خط سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ نہ صرف انیسویں صدی کی معاشرت اور اقتصادی حالات پر کام کرنے والے محقق کے لئے معلومات افروز ہیں بلکہ ان سے اس ذہن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ع کی بغاوت کے پیچھے کام کررہا تھا۔

جس بیاض سے یہ خط نقل کیا گیا ہے، بظاہر وہ «غدر» سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے، اس کے جامع کا نام معلوم نہیں، لیکن اس نے بہت سے نثر نگاروں کی نثر کے نمونے جمع کئے ہیں، ان میں بیشتر غیر مطبوعہ اور اہم ہیں یہاں صرف مولوی فضل حق خیرآبادی کا مکتوب نقل کیا گیا ہے، باقی اہم تحریریں کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی، مولانا خیرآبادی مرحوم کے اس خط کا مکمل متن درج ذیل ہے، کہیں کہیں میں نے قیاسی تصحیح کی ہے، پھر بھی ایک آدھ لفظ سمجھ میں نہیں آیا تو اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے

(۲)

عرضی رقم زدۂ مولوی فضل حق صاحب، از طرف رعایائے شہر، در باب امتناع ٹکس وغیرہ*

حضرت جہاں پناہ خلّد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ بعرض اقدس واعلیٰ (می رساند) بر رائے جہاں آرائے اقدس روشن و مُبرھن است کہ رعایائے ایں ملک، چہ ھنود و

* جس بیاض سے یہ خط نقل کیا گیا ہے وہ راقم الحروف کے ذخیرۂ ذاتی سے تعلق رکھتی ہے۔

چه مسلمان، برخے ازاں ها مزارعان و کشاورزاں و اکثر روزگار پیشه و بعض ازاں ها تجار و اکثرے اهل حرفه و بعض لاخراج دار و روزینه دار و بعض دریوزه گر بوده اند. و اکثرے از اهل اسلام و بعض هنود اصل متوطن ایں جانیستند بلکه به همراهی حکام و سلاطین ترک اوطان خود ها (کرده) دریں (جا) توطن گزیده اند. تا وقتیکه مملکت هندوستان بقبض و تصرّف سلاطین و راجگان بود وجه معیشت سکان ایں دیار هیچ گونه تنگی نکرده بود، که همگی وجوه معاش که حدمات عمده وجه روزگار سپاه، صرف بسکنۂ ایں دیار اختصاص داشت. هرکس از سکنۂ همیں ملک بقدر حوصلۂ و فراخور لیاقت خود روزگارے در اهل مناصب یا در زمرۂ سپاه، یا در پیشۂ تجارت یا در حرفه میداشت. از زمانے که عملداریٔ سرکار انگریزی در مملکت هندستان رسیده است، بتدریج تنگی روزی و ضیق معاشی رفته رفته الحال بحدے رسیده است که نوبت بجان و کارد باستخوان رسیده، زیراکه در سرکار انگریزی همگی وحوه معاش مفقود و ابواب روزی مسدود شده اند بجز معدودے چند، یعنی چند کس در عملۂ عدالت دیوانی و کلکڑی و فوجداری و پرمٹ و تهانه و تحصیل بمشاهرۂ قلیل ملازم اند، و پس از تبدیل دفاتر و تغیّر طرز نوشت و خواند کچهری ها، چناں تخیل می گردد که در چندے ایں روزگار هم نصیب ایں بے چارگان نخواهد ماند. ایں است حال تنگی معاش روزگار سکان ایں دیار.
و حال تجار اینست که سرکار انگریری همه وجوه تجارت خود اختیار نموده، و همگی اجناس از قسم پارچه و ریسمان و ظرف و اسپان وغیره دوّاب، حود از ملک انگلستان وغیره بهم رسانیده، در ایں ملک برائے فروش علی التواتر در هر قریه و بلده از بلاد ایں ملک می آرد، و منفعتے برائے کسی از سکنۂ ایں دیار نمی گزارد. ازیں جهت همه تجار ایں دیار از پیشۂ خود دست بردار شدند، و حال لاخراجیداراں اینست که همه لاخراجی باوجود ایں که در قوانین سنه ۱۸۰۳ع و سنه ۱۸۰۵ع اهالی سرکار انگریزی عهد و میثاق نوشته اند که هر اراضی لاخراجی که پیش از غرۂ جنوری سنه ۱۸۰۱ع وغرۂ جنوری سنه ۱۸۰۳ع بقبض و تصرف لاخراجیدار خواهد بود، گو، سند باشد یا نه، یا واهب آں اختیار عطا داشته باشد یا نه، گاهے بضبطی نه خواهد آمد. الحال بلا هیچک تحقیقات و بلا تامل در هر یک ضلع ضبط شده می شود. حالا از وجه معیشت لاخراجیداراں بالمره مسدود شده است و روزیکه یک قلم در همه اضلاع

موقوف شده است این وجه معیشت هم باقی نمانده، و حال مزارعان و کشاورزان
اینست که بر آن ها آن چنان جمع خراج مقرر شده است که دران حالتے و استطاعتے
باقی نمانده است، و حال بے استطاعتی و بے مقدوری آنها خود از دفاتر کلکٹری ظاهر.
و هر گاهیکه برائے این همه سکان این دیار وجه معیشت باقی نماند اهل حرفه چه کار
برائے کدام کس توانند که بذریعه آن برائے خود کسب معیشت توانند نمود.
هر گاهیکه همگی خلائق از معیشت خود تنگ باشد بدریوزه گر کدام کس تواند داد؟
این همه حالات اجمالی تنگی معاش جمله رعایائے هندوستان است، و حال تنگی
معاش رعایائے علاقهٔ شاهجهان آباد مجملاً اینست که در ابتدائے عمل سرکار انگریزی
پرگنه هوڈل و پلول و بیتں و نجف گڈھ و سالکه و فیروز آباد و ڈیگ و پوناهانه
و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوهانه و خرسه و کهرکهوده و روهتک و مهم
و هانسی و حصار وغیره پرگنات در جاگیر بودند و در سرکارات جاگیرداران این
همه پرگنات هزارها کسان در هر کار و در فوج و شاگرد پیشه ملازم بودند، و
اکثر دیهات در وست و اراضیات لاخراجی متصرفه در معافی بودند، این همه
پرگنه و دیهات و اراضیات بحیطهٔ ضبطی در آمدند، و معیشت لکوک کسان بالمرّه
موقوف شده. حالا در تمام عالم روزگار همچو عنقا ناپدید است، و بیوه ها و بیچارگان
از مسدودی روزینه و ضبطی املاک مدار بر سربرد اوقات خود ها بر چرخه ریسی
و ریسمان فروشی و آسیا سائی می داشتند بسبب اینکه سرکار تجارت ریسمان اختیار
کرده، و آسیباهائے آبی نصب نموده است، این وجه معیشت آنها بالمرّه مسدود
گردید، و هم چنین اهل حرفه و دکانداران و ساهوکاران (سه) بے بضاعتی خلائق از
انتفاع مایوس گشته سرمایهٔ که داشتند بصرف خور و نوش در آورده دواله ها بر
آورده اند. باین همه تنگی ها از مدش سر چارک مٹکاف صاحب بهادر مصادرهٔ
ادائے زر چوکیداری بر ما بے چارگان، چار و نا چار که «حکم حاکم مرگ
مفاجات است» دادن مصادره با وصف آن که گاهے از عهد سلاطین و حکام سلف
علت آن نداشتیم بذمهٔ خود نهاده تا حال کرده ماندیم. حالا چند روز است که
صاحب مجسٹریٹ حال در هر کوچه و برزن و بازار به تعمیر پهاٹک هائے قدیم و
جدید که هیچگ فائده بر آن مترتب نیست و گاهے مترتب نه خواهد شد حکم دادند.
ما غربا جبراً و کرهاً تکالیف فاقه کشی و بیع و رهن اسباب خور و نوش بر داشته

ے ۔ ہزارہا روپیہ تعمیل حکم نمودیم و تکالیف ہر روزہ (کہ) از مسدود
، دروازہ ہائے نو تعمیر و اعماض چوکیداران ہر یک محلہ، در بست و کشاد
عاید حال مایاں می شود، بر خود گوارا می نمائیم۔ الحال علاوہ ازیں خبر،
ب مجسٹریٹ حال حکم تقرر پنچ پنچ کس پنچاں در کوچہ و محلہ ...... »

(۳)

یہ عرضی اچانک یہاں ختم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد مولوی امیر علی کا
دربارۂ شطرنج شروع ہوجاتا ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس مکتوب
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اقتصادی اور سیاسی رفتار پر پوری نظر
ے تھے اور مختلف طبقات کی معاشی زبوں حالی کا انہیں اندازہ تھا۔ اس سے
یں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ع کی شورش میں خواہ مولانا خیرآبادی نے کوئی
حصہ نہ لیا ہو، لیکن اصولی طور پر ان کی ہمدردیاں ضرور «باغیوں» کے
رہی ہوں گی۔ مولانا فضل حق پر بغاوت فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۹ع میں
ہ چلایا گیا تھا جس کی پوری تفصیل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ریکارڈ کی
سے جناب مالک رام لکھ چکے ہیں[1]۔ انتظام اللہ شہابی وغیرہ نے مقدمہ
ت کے ضمن میں جو واقعات لکھے ہیں وہ محض بے اصل ہیں۔

حضرت مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری نے دارالانشائے رام پور میں محفوظ
، دستاویزوں کی روشنی میں یہ ثابت کردیا تھا کہ مولانا فضل حق کی گرفتاری
، دوسرے ملزم فضل حق شاہجہاں پوری سے التباس اسمی کے بنا پر ہوئی تھی[2]۔
وہ آخر تک اپنی صفائی میں کوشش کرتے رہے تا آں کہ نواب کلب علی خان
رام پور کی سعی سے ان کی رہائی کا حکم ہوا، مگر ان کے صاحبزادے مولوی
ں الحق یہ پروانہ لے کر جب انڈمان پہنچے تو ایک دن قبل (۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ھ)
نا فضل حق کا انتقال ہوچکا تھا[3]۔

۱۔ ملاحظہ ہو رسالہ تحریک دہلی جولائی سنہ ۱۹۶۰ع مضمون بعنوان «مولوی فضل حق خیرآبادی اور فتوای جہاد»۔
۲۔ ملاحظہ ہو ماہ نامہ تحریک دہلی ماہ اگست سنہ ۱۹۵۷ع۔
۳۔ عبدالسلام ندوی۔ حکمائے اسلام جلد دوم ۳۳۱ - ۳۳۴ (اعظم گڑھ ۱۹۵۶ع)۔

* ڈاکٹر حبیب النساء بیگم.

نسیم میسوری اور تذکرۂ ساقی

اردو زبان کی خدمت میں اردو کے بڑے بڑے مرکز دہلی، لکھنؤ، رامپور، اور حیدرآباد کی طرح میسور بھی پیش پیش رہا، اور اس دور دراز سرزمین میں بھی اردو زبان و ادب کے دہارے بہتے رہے، لیکن بد قسمتی سے کسی نے یہاں کے جواہر پاروں کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کی جس کی وجہ سے ہمارے یہاں کے صد ہا ادیب و شاعر آج تک ایسے ہی گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں. البتہ گذشتہ چند سالوں سے متعدد مضامین یہاں کی ادبی خدمات کے متعلق شائع ہورہے ہیں اور علم و ادب کے وہ دفینے جو میسور اپنے سینے میں پوشیدہ رکھتا ہے ایک ایک کرکے منظر عام پر آرہے ہیں. میں نے اپنی کتاب «میسور میں اردو کی نشو و نما» میں یہاں کی ادبی ہستیوں کو متعارف کرایا اور ان کے ادبی کارناموں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کتاب کی تنگدامنی، جس میں صد ہا شعراء و ادبا کا ذکر کیا گیا ہے، کسی ایک ہستی پر وضاحتی مضمون لکھنے سے مانع ہوئی، لہذا میں نے مضمون ہذا میں میسور کے ایک مشہور معروف شاعر نسیم کی بعض ادبی صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو ہنوز تشنۂ تحقیق نظر آئیں.

میسور میں اردو زبان کی داغ بیل سرکار خداداد سے صدہا سال پہلے بہمنی سلاطین کے دوران حکومت میں ہی پڑ چکی تھی. ریاست میسور کا بڑا حصہ عادل شاہی حکومت میں داخل تھا، اور بیجاپور کی طرح یہاں کے باشندے بھی گیسوئے اردو کے سنوارنے میں مصروف تھے. بیجاپور اور گولکنڈہ کی بساط سلطنت کے الٹ جانے کے بعد میسور، وہاں کے تباہ حال شعراء اور ادبا کا ملجا و ماوا بنا. حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مضبوط حکومت ان بکھری ہوئی صلاحیتوں کی

* ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ایم. اے. پی. ایچ. ڈی. میسور یونی ورسٹی (میسور).

شیرازہ بندی کا باعث ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کے مختلف حصے یکے بعد دیگرے غیر اقوام کی مضبوط گرفت میں آرہے تھے اور ہندوستان، جس کی قسمت میں صد سالہ غلامی لکھی ہوئی تھی، خانہ جنگی میں گرفتار اپنا گھر آپ جلانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت جنوبی ہند کی اس چھوٹی سی ریاست میں شہر میسور آزادئ ہند کا علم تھامے اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتا ہے، لیکن اس بھیانک سیاسی پس منظر کے باوجود سرکار خداداد نے اردو کی نشو و نما میں جو دلچسپی لی اور جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اردو کی تاریخ میں زریں حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اگر حیدرآباد کی طرح یہاں بھی تحقیق و تلاش کا کام مخلصانہ اور بے لوث طریقے سے کیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ میں کئی بیش بہا باتوں کا اضافہ ہوگا۔ سرکار خدا داد کے عہد کے بعد بھی علم و ادب کے چشمے اسی طرح سے بہتے اور اپنی مدھر راگنیوں سے فضا کو معمور کرتے رہے۔ رسل و رسائل کی آسانیوں نے جب حد نظر کو وسیع کردیا اور شمالی و جنوبی ہندوستان قریب تر ہوگئے تو میسور کی ادب نواز ہستیوں نے دہلی اور لکھنؤ کی اردو دوستی اور خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ اردو کا پہلا مطبع سنہ ۱۸۴۷ع میں فردوسی پریس کے نام سے قائم ہوا اور اس میں اردو کی متعدد کتابیں تصنیف و تالیف ہوتی رہیں۔ سنہ ۱۸۶۱ع میں اردو کا پہلا اخبار، بنگلور سے بنام «قاسم الاخبار» نکلا، اسکے بعد لوگوں کے ذوق و شوق کی وجہ سے متعدد مطبعے قائم ہونے لگے اور رسائل و اخبارات کی مانگ بڑھ گئی۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں نسیم میسوری نے پرورش پائی، یہ دور میسور میں اردو کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے، کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہاں کے بڑے بڑے علماء و فضلا، قلمے، درمے، سخنے، اردو زبان کی خدمت میں منہمک تھے، ان ہی با وقار ہستیوں کی پر خلوص خدمت کا نتیجہ تھا کہ اس دور دراز سرزمین میں بھی اردو کا طوطی بول رہا تھا، اس دور میں میسور کے دوسرے ارباب ذوق و خادمان اردو کے درمیان نسیم کی مسحور کن شخصیت ایک مشہور و معروف شاعر کی حیثیت سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ریاست میسور کے اس مقبول خاص و عام شاعر پر متعدد مضامین لکھے جاچکے ہیں جن کا ماخذ عموماً محمد علی خاں میانہ کا تذکرہ نسیم خود نسیم ہی کا دیوان ہے جس کی داخلی شہادتیں

اس زمانے کی سماجی، ادبی اور سیاسی زندگی کی غمازی کرتی ہیں۔ مذکورہ بالا ماخذوں کے علاوہ ایک دو مضامین میں عبد الحمید خاں ساقی کے تذکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی عدم موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجھے یہاں کے ایک کتب خانے میں یہ تذکرہ ملا ہے اس مضمون میں اسی تذکرے کے پیش نظر نسیم میسوری کی بعض ان خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہنوز پردۂ اخفا میں ہے۔

یادگار ضیغم' مولفہ نواب عبد اللہ خان ضیغم، میں سنہ ۱۸۸۴ع تک کے شعرائے کرام کے حالات زندگی لکھے گئے ہیں۔ میں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں دیکھا ہے اس میں نسیم کا فوٹو چسپاں ہے، زری کی ٹوپی، لمبے بال، ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں ہیں، شیروانی اور گھڑی معہ زنجیر پہنے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے:

«نسیم تخلص، محمد حسین علی سلطان نام ہے، ان کے دادا ٹیپو سلطان کے ہمشیر زادے تھے، اور نانا ان کے نسکی نواب تھے، طرفین سے رئیس اور قوم کے شیخ قریشی ہیں، سرکار انگریزی سے وثیقہ معقول ملتا ہے، جاگیردار ہر پور اور متوطن میسور ہیں، خوش اخلاق اور نیک صفات ہیں، مختلف لوگوں سے شعر و سخن میں مشورہ رہا اور اردو میں حافظ شمس الدین محمد فیض مرحوم حیدرآبادی سے تلمذ تھا پچاس کی عمر ہے».

نسیم کی سوانح حیات سے متعلق محمد علی خاں میانہ کا تذکرہ ہے جو اس سے پہلے شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پر نانا نسکی نواب محمد رضا علی خاں شہید کی قبر پر نصب شدہ ایک کتبہ ہے جس کی نقل، ہماری زبان، مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۵۸ع میں چھپ چکی ہے۔ اس سے نسیم کے آبا و اجداد اور ان کی ٹیپو سلطان سے رشتہ داری پر روشنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ کچھ سال پیشتر یہاں سے نسیم کا دیوان مع ایک طویل دیباچے کے شائع ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے نسیم کے حالات کے مرتب کرنے میں مولف نے محمد علی خاں میانہ اور عبد الحمید خاں ساقی کے تذکرے سے مدد لی ہے۔ میں نے بھی ساقی کا تذکرہ ایک دیوان میں لکھا ہوا دیکھا، نیز اس میں نسیم کے تین چار خطوط ساقی کے

نام پائے. یہ یہاں کی مروجہ زبان کے آئینہ دار ہیں. چونکہ یہ نہایت ہی خستہ حالت میں ہیں مبادا کے زمانے کی دستبرد کا شکار ہوجائیں چنانچہ میں نے سوچا کہ یہ خطوط مع ساقی کے تذکرے کے بجنسہ شائع کردئیے جائیں.

میانہ لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۷۵ع میں نواب صاحب[۱] ناسودہ متخلص بہ وحشی نے اپنے فرزند دلبند کے بیاہ کی خوشی میں نواب صاحب نسیم سے ایک غزل سہرا کی ردیف میں لکھنے کی فرمائش کی تھی، تب مرحوم نے دو تین گھنٹوں کے عرصہ میں ایک سہل اردو خط اور ایک مثنوی اور ایک فرمائشی غزل لکھ کر بھجوادی تھی. شاہ ظفر نے بھی اپنے فرزند کی شادی میں اسی ردیف کی غزلیں لکھنے کی فرمائش اپنے شعرائے نامدار سے کی تھی.

خط

مئے گلگوں پلا ساقی کدہر ہے — کہ ہر نخل تمنا پرُ ثمر ہے

سبحان اللہ بحمدہ، آج علیٰ الصبح کیا مبارک خواب دیکھا جس کے خیال میں جشن جمشیدی ایک دور ساغر بھی نہ تھا، ڈاک کا ہرکارہ نصرت الاخبار دہلی لایا، میں نے تعبیر پائی یعنی کیفیت جشن شادی نوشاہ محمد حیدر علی خاں صاحب بہادر صاحبزادۂ بلند اقبال مطاعی ام نواب محمد عمر علی خاں صاحب بہادر والی ناسودہ مع حسن ایمائے شعر و سخن نشدہ نظر آئی، اس کی خوشی و انبساط کا حال، بیچارہ قلم چہ ر نگارد.

میں نے فرمائشیں حسب حوصلہ بجا لائیں الامرفوق الادب بلکہ ایک مثنوی طرہ ہے. لیکن حیران ہوں کہ الٰہی لچھے دار عبارت کیا لکھوں، فقط لغت سے بھر دوں، مقفیٰ یا مسجع لکھوں تو سراسر آورد، رعایت قافیہ میں بھرتی کے الفاظ آجاتے ہیں زبان کا مزا نہیں آتا، خیر نثر مرجز سہی، یہ بھی نظم کا بھائی ہے ہم منشی نہ شاعر نہ مولوی نثر عاری لکھنے سے کیا عار

---

۱ محمد عمر علی خان والی ریاست ناسودہ کو نسیم سے دلی عقیدت تھی. چنانچہ میں نے ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۵ع کے ،، میسور اخبار ،، میں نواب صاحب کی ایک نظم چھپی ہوئی دیکھی، جس کا ایک شعر ہے:

خداوندا کرے صدقے اپنے حضرت کے ○ کہ ہم ہوں باغ ہو ،وحشی، ،نسیم، بنگلوری

آگے چل کر لکھتے ہیں:

جس جا پہ نہ ہو نسیم وحشی ○ سرسبزہ وہ بوستاں نہیں ہے

ہے. اگر ہم سے کچھ قصور بھی ہوجائے ہم دہلی اور لکھنؤ والے تو نہیں محبت دلی حاضر ہے جو دل میں آیا قلم سے نکلا چشم بد دور چشم دید خود نواب صاحب نے وہ رنگین عبارت لکھی ہے کہ نسیم و صبا کا رنگ اڑگیا صاحب نصرت الاخسار نے جھوٹھ نہ لکھنے کے الزام کے ساتھ سماعی مضمون کا گلدستہ ایسا باندھا کہ بلبل کا دم بند ہوگیا، ہم قیاسی تشبیہ کیا دیں، بنگلور کے لال باغ کا نظارہ نواب صاحب نے کیا ہے، کہتے ہیں اس کا ثانی آج کل ہند میں نہیں.

ہنگام شادی میمنت آبادی روئے زمین باسودہ بغیہ باغ موصوف کے سرو شمشاد و صنوبر کے قسم کے دو رویہ لب جو ہوں گے، حس قدر انسان کے علم میں پھول پھل جڑی بوٹی ہیں کیاریوں میں موقع پر لگائے گئے ہوں گے، ہر رنگ و ہر قسم کے پھولوں کے تختے الگ الگ قرینے سے رہیں گے، اور ہر روش پر سبزے کی جدولیں ہوں گی، باد بہاری ہر سمت رواں ہوگی، نکہت گل دل و دماغ تر و تازہ کرتی ہوگی، کہیں آب رواں، کہیں فوارے ہوں گے، رقاصان پری وش مطربان خوشنوا راگ رنگ میں مشغول ہوں گے، اهل محفل خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہوں گے، دورِ شراب صالحین و مثلث ہوگا، چشم بد دور نو شاہ با خلعت شاہانہ جلوہ افروز ہوں گے، نواب صاحب مبارکبادیاں بہ خوشی و فرحت لیتے ہوں گے. ہم کم یاد آوری کا گلہ کیا کریں اگر ہم ہوتے ہمارے یہ ارماں نکل جاتے نوشاہ جوان صالح پر بصد دل نقد جاں نثار کرتے، تصدق ہوتے، گھوڑا تھامتے، براتیوں کے ساتھ ساتھ چلتے، ہر ہر قدم پر دعائیں دیتے، مبارکباد کہتے، میرے ہمصفیر نواب مرزا فیروز حسین خان صاحب بہادر صبا، بھی من حال و قال هر دو مبتلائے فراق بہ مصداق اس بیت کے ہے:

چوں بیک شمع دو پروانہ تولا دارند حال آں ہر دو بیک سوزش و سازش باشد

جناب نواب صاحب، آداب!

سال تاریخ عروسی چہ خوش آمد زسیم ٭ جلوہ شادی نوشاہ مبارک باشد
۱۲۹۴

اب روئے سخن سراپا مسرت بخدمت نواب محمد حافظ قلی خاں صاحب بہادر والیء محمد گڑھ ہے ، اگرچہ مثل صورت پرستان جمال مبارک ہم نے نہیں دیکھا ، لیکن برنگ معنی آشنایاں محو سابقہ اتحاد و عالم ارواح ہوں :

مصاحبت چہ ضرور است آشنائی را ہنوز باد یمن محو نکہت عربی است

اور دوست کے دوست بڑے پیارے ہوتے ہیں :

از بس سار و برگ دو رنگی نزاع ست ٭ یک سجدہ بر دو قبلہ ہم از اقتراع ما ست

داماد جوان صالح شیریں قلم خسرو ملک علم و فضل مبارکباد بالنون و الصاد .

سنتے ہیں کہ نواب صاحب باسودہ کا ارادہ زیارت بیت اللہ شریف کا ہے :

بہ سفر رفتنت مبارکباد بہ سلامت روی و باز آئی

بندہ بھی ہم رکاب ہوجاتا ، کچھ ایک نمبر باقی رہ گئے ہیں ، مجبور ہے ، امید کہ نواب صاحب موصوف کی سرکار کے سوائے اس خاکسار کو ، جو اردو اخبار آتے ہیں ان میں طمع ہوں .

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مورخہ ۵ ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۷۵ع

والراقم

محمد حسین علی سلطان نسیم قریشی ، بمقام : بنگلور

نسیم کے مندرجۂ ذیل خطوط ساقی کے نام ملاحظہ فرمائیے :-

اخی او مہرباں بط شراب احساں سلمہ الرحمٰن ، السلام علیکم

ابھی تمہارا خط پہونچا میسور میں بے پر کی اڑی سی کسی مٹھو میاں کی ٹیں ٹیں معلوم ہوی ، یا کسی سبز قدم کی طوطی دل کی شکر شکنی ہے . کیا عجب جہاں سرشاہیں زرین بال مہر محشر طلوع ہو ، جن لوگوں کی لگڑ جھگڑ میں اوقات بسر ہوں ، اس سرخاب کے پر سر میں کیوں نہ کھولیں اپنی بولی میں گالیاں دی لیں کون فاختہ مانع ہو ، گر مرغ دل گھبراتا ہے کہ سننے والے الّوؤں کو کیوں باور آتا ہے ، قاز کی سی گردن اٹھاتے ہیں بگولوں سی بال شادی بجاتے ہیں ، آدھے تیتر آدھے بٹیر ، واہ ری زمانے کے

پھیر تم نے اکتوبر کے خط میں لکھا ہے حصرت کا جواب درست تھا ، پر قاعدے کے رو سے سست تھا غرض یہ شعر پڑھا:

کیوں نہ مشہور ہو سخن اپنا میر صاحب سے ہے صلاح سخن

یہ کس چم حچر کی صلاح ہے کسی تذکیرےمیں سخن میر کے شاگرد دیکھے ہیں ، سحن کا دیواں کتب خانہ اہل اسلام سے مگوا کے دیکھا چھوٹاسا ہے یہ بیت اُنکی نہیں کلام سے طاہر ہے میر سے مشہور کی کیا رعایت ، کیا میر عنقا کا بچہ ہے وہ کڑا فقرا تمہارے لئے شایاں نہیں تھا ، بذات حود تم تو اُستاد کامل فں س گئے ہو میری اصلاح پر معترص ہو کیا فائدہ یہ تُو تُو میں میں داتا کل کل بھاتا نہیں . مجھے بری کو اچھا لکھا منہ سوانا چونچلا کرنا آتا نہیں .

اے موتراش دست تو باید بریدن است ہ اصلاح می دہی حط پروردگار را میں تمہیں اللہ آمین کا دوست سمجھتا ہوں ، دعائیں مانگتا ہوں . مرغ آمین را کہے فقط .

یم یسار عط بمع و ضرر کے ساتھ ھمدم ہوں
صدف کے منہ میں گوہر ہوں دہاں یار میں ہم ہوں

دیگر نامہ

ساقی خمخانۂ محبت دام محبتہ

رنگ رندوں کر خود بھکتا ہے تو بھی کیا بادہ بوار ہے ساقی

کیا غضب ہے کہ تم بے پر کی اڑی ' یقیں جانتے ہیں ، اسی کو مانتے ہیں ، تمہیں شیفتہ پری کہوں کہ ولی کہوں . شہاب الدیں صاحب شہاب و بخشی اسحاق صاحب سے بحد ہو کے میں بیمار ہوں سو دیکھ بھال اور مجھے ان دنوں مشق زیادہ نہیں کر کے فی البدیھا مشاعرہ کئے حضرت ایک بیت نہیں‌لکھے تک غزلیں لکھے پھیکا ، منہ پر ہوائی چھوٹی رونے لگے ، بد دعا دینے‌لگے بنگلور سے حبر لو ، ان کے شاگرد تخلص قادر پیراں سے پوچھو ، تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں کر کے یہی ذکر نکلا یا نہیں تم کیوں پڑے

اچھلتے ہیں، بےطریق چلتے ہیں، خیر تو ہے کیا شاعری ایک بحری پر ختم ہے کیا بڑے عابد صاحب اور چھوٹے عابد صاحب کے سریکا ایک ایک غزل کے شاعر ہیں. کبیر صاحب تحصیل تخلص سے ہزاروں غزلیں خمسہ لکھا ہے اور ہمیشہ روانہ کرتے ہیں تمہارے دیکھنے کے واسطے ان کے چند اشعار اسکے ساتھ روانہ کیا ہوں اور تمہارا مجرا بھی ٹھیک ہے. لیکن اچھا لکھا کرکے ساقی صاحب مست نہ ہوجانا.

مشق کر مشق کہ تا لطف سخن پیدا ہو
خود بخود شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو

تم سال دو سال میں غزل یا خط لکھے تو جواب نہیں لکھوں گا، ہمیشہ لکھو، ہمیشہ لکھتا ہوں فقط.

(۳)

ساقی صاحب سلمہ

مار ڈالا یار تری جواب طلبی نے

اس چرخ کجرفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا توڑا پھیکا تھا جواب تک لکھنے کی فرصت نہ ہوئی، افسوس کہ میں ساقی سے اور ساقی مجھ سے الگ الگ حم کے حم لنڈھای، کبھی غم اور کبھی عیش کا لطف اٹھائے الٰہی پھر وہی گاڑی چھنے میں اس کا وہ میرا نے رقیب کباب سا بھن جائیں، مئی تو کیا تلچھٹ نہ پائیں، بھیہ ساقی سچ پوچھو تو ان دنوں تمہارے میں مستی نظر نہ آئی، اصلاح سے طبعیت گھبرائی، بجائے اصلاح تم صلاح لکھتے ہو. اول رسم خط دیکھو بعد شعر کی پوچھو روز مرہ محاورہ ڈھونڈو، دیکھو تو کیسی کڑی بات ہوئی، سعادت سمجھتے ہوں تو بات ہوی، اجی میاں ساقی اپنی طرحی زمینوں میں کیوں تعمیر پر تم نے کمر باندھی.

کس نے شی دی اور زیادہ لکھوں تو مشکل کا سبق ہوگا. مزاج نازک پر قلق ہوگا، خدا کے فضل سے ڈول ڈیل خوب خلق ظاہری مرغوب لیکن

مات ہوئی بازاریوں کے سلامن پچوتروں پر بحالو الکل پچونہ سناؤ ، یہاں قیام ، تحصیل ، روشن ، کیفی، اثر وغیرہ شعراء غزلیں لکھا کرتے ہیں ، ہمیشہ سنایا کرتے ہیں ، یہ لو کیا لکھنا تھا کیا لکھ رہا ہوں ، تمہاری قلعداری تمہیں مبارک ہو جیو جاگو چشم ما روشن و دل ماشاد ، ھو المراد ۔ ابھی ایک رباعی مالیہ یا دو تین ذیل میں لکھتا ہوں زیادہ فکر نہیں کرسکتا ہوں ٹپال کا وقت قریب ہے ۔ ہاں تم تاریخ کو داتوں کر ریخ بھی حاتے نہ ہیں ۔ ماہ تو ماہ روز بروز سال سال ہے ۔ مہیے گدرے حطوں میں تاریح نہیں دیکھی ۔ لیکن حواب نہ آنے پر شکوے تھے دل یہ کہتا تھا ساقی کو اس طرح کے ذکر سے آزردہ نہ کر ، حواب نہ آنے سے آزردہ ہوں تو ہوں ۔ شفیق من میرے قصور پر نطر نہ فرمانا تمہیں سلام لکھوں تو ہم عمر نہیں ، دعا لکھنے بندہ فقیر نہیں ، مجرا تسلیم بندگی باہم گریز نہیں ، قصور معاف کیجئے غبار آئنہ خاطر کو صاف کیجئے ، اپنے مزاج میں وہ حودت نہیں وہ فرصت نہیں واہی تباہی لکھتا ہوں عرض جنگل میں سڑی سے پڑا ہوں ، فقط ۔ رباعی

ہے گرچہ کلام ان کا روکھا پھیکا بھوکا رہتا نہیں ہے شیدا ان کا
کھاتا ہے مرے سے غم ملا نوش نسیم کیا رنگ ہے سانولا سلونا ان کا

رباعی

بے ہوش جو کرچکا غصہ ان کا تصویر سادیا ہے نقشہ ان کا
شامت لائی نہ شامہ طیبو دیگر ہے لخلخہ بس مجھے پسینہ ان کا

مندرجہ ذیل خط بھی عبدالحمید خان صاحب تخلص ساقی کے نام اس دیوان میں مندرج ہے :

اے ساقی بادہ فصاحت ، اللہ رکھے تجھے سلامت ، حط آیا مع غزل تمہارا اصلاح کی احتیاج کیا تھی دو چار بیت یا زیادہ ، کیوں خلل مزاج میں ہوا ہے ، ہاں ایسی غزل کو کیجئے اصول ۔ یہ شعر کو مختصر نہ کیجئے : ساقی جو لکھے مدام کاغذ ، رکھواؤں سبیل مئی کی گھر گھر ، لٹواؤں تمام گنج دنیا ، اندر کی سبھا کروں پریسے ، دریائے شراب ہی بہادوں ، دن رات چلاؤں کشتی مئی ، نیک پیراں بھی آئے ہیں یاں اور دوست کئے ہیں جمع اپنے ،

ساقی جو نہیں نہیں حلاوت، ہے تلخ مجھے شراب شیریں، اس نثر کا نام کیا ہے
لکھو، خالق دیوے تمہیں سعادت، تاریخ ہے جنوری کی سات آج، سن آٹھ
سے یکھزار ایکہتر، وستادی سے خط لکھا ہے میں نے، یعنے یہ نسیم باغ الفت۔

الغرض نسیم کے یہ چاروں خطوط ساقی کے ساتھ ان کے گہرے روابط، سچی محبت اور سچے خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی اشاعت سے ایک عرض تو ان کرم خوردہ مکتوبات کو محفوظ کرنا اور دوسری اس زمانے کی میسوری زبان اور عام طرز تحریر سے قارئین کو روشناس کرانا ہے۔ ان خطوط کی اہمیت اس زمانے میں خصوصاً اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں نسیم کے معاصرین اور ماحول کا صحیح علم ہوسکتا ہے، اور یہاں علمی سر گرمیوں کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے، مثلاً دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میسور میں اکثر ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، لہذا ایک مشاعرے میں شہاب الدین شہاب اور بخشی اسحاق صاحب نے فی البدیہ اشعار پڑھے، پھر عابد نامی دو شاعروں کا ذکر ہے جنہیں نسیم ایک ایک غزل کے شاعر کہتے ہیں۔ ساقی نے بخشی اسحاق سالم اور زین العابدین عرف عابد میاں صاحب کو نسیم کے استاد بتایا ہے ممکن ہے علمی رقابت کی بنا پر نسیم کی اپنے استادوں سے ان بن ہوگئی ہو۔ نیز ان مکتوبات سے کبیر صاحب، تحصیل، اور خود ساقی کی شاگردی کا پتہ چلتا ہے۔ تیسرے خط سے اس زمانے کے شعراء میسور، قیام، روشن، کیفی اور اثر کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ ایک خط میں میر صاحب کا جن الفاظ میں انہوں نے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی عظمت و شہرت سے وہ مرعوب نہیں تھے، اور ان کی فنکاری کے آگے سر عقیدت خم کرنا معیوب سمجھتے تھے، نیز ان خطوط کی آسان اور سہل زبان اور طرز تحریر کی بے ساختگی اور بے تکلفی مرزا غالب کی یاد تازہ کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادبی انقلاب جو نثر نویسی میں غالب کی بنا پر شمالی ہندوستان میں رونما ہورہا تھا، میسور جیسے دور دراز خطے میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہورہے تھے۔ نواب صاحب باسودہ کے خط کی زبان ہنگامی اور روایتی ماحول کی ترجمانی کرتی ہے، اور نسیم کی قادر الکلامی اور قدرت بیانی کی شاہد ہے۔ یوں تو مقفیٰ اور مسجع عبارت کے لکھنے میں بھی انہیں استادانہ قدرت حاصل تھی لیکن نسیم ساقی کے خطوط میں اپنے اصلی رنگ و روپ

میں نظر آتے ہیں۔ الغرض نسیم کا زمانہ وہ عبوری دور تھا جس میں نئی چیزیں بھی تھیں اور پرانی بھی۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر زندگی نئی قدروں اور نئے اسالیب کے ساتھ جلوہ‌ریز ہورہی تھی ادب کو زندگی کے قریب لایا جارہا تھا، واقعیت اور اصلیت معنی آفرین اور نازک خیالی کی جگہ لے رہے تھے، اشارہ تشبیہ اور صنائع و بدائع کے بوجھل زیوروں سے ادب کو آزاد اور بے نیاز کرنے کی بڑی شد و مد سے کوششیں ہورہی تھیں۔ نسیم نے بھی زمانے کے رجحان کے مطابق حقائق کے چہرے سے نقاب کشائی کو بہتر جانا اور اپنے نجی خطوط میں اس اختصار صفائی اور بے ساختگی کو جگہ دی جو غالب کا طرۂ امتیاز تھی۔ با ایں ہمہ نسیم کی لافانی شہرت کا باعث ان کی شاعری تھی۔ اس میدان میں ان کی جولانئی طبع اور استادانہ قابلیت سے متعلق بہت کچھ لکھا جارہا ہے لیکن ساقی نے اپنے تذکرے میں ان سے متعلق کچھ لطائف و ظرائف داخل کرکے نسیم کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کی صلاحیت کو اُجاگر کردیا ہے، لہٰذا ساقی کا یہ تذکرہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

تذکرۂ ساقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست — آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

میں نہایت حیران تھا کہ میرے لڑکپن کے دوست سراسر مغز بے پوست، فنِ شاعری کے استاد، جن سے میں نے ایک مدت شعر کی اصلاح لی، کی وصیت کیونکر ادا کروں۔ شکر ہے کہ دفعتاً اپنے حسب خواہش تمام سامان اس مسبب الاسباب نے مہیا کر دئیے۔

از دست و زبان کہ بر آید — کز عہدہ شکرش بدر آمد

یہ خاکسار شاعران ہند کا ذلہ خوار ہیچمیداں ازلی منشی عبدالحمید خان متخلص بہ ساقی متوطن میسور التماس کرتا ہے کہ جب استادی مصراللہ بنکی نواب محمد حسین علی سلطان قریشی نسیم تخلص ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ع میں سخت بیمار ہوئے تو میرے شوق نے مجھکو اس امر پر مجبور کیا کہ ہمیشہ

بیمار داری میں رہا کروں. افسوس ہزار افسوس کہ قسمت نے میری آرزو پوری نہ ہونے دی. پاسن ہائی اسکول کی منشی گری پر مبدل کر دیا. ع آخر جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی. زمانہ اپنے لئے ایسا بھی نہ رہا کہ روزگار سے دست بردار ہو جاؤں اور میرے دوست کی تیمارداری کروں. یہ سعادت میرے نصیب نہ تھی. مجبوراً جب مجھے پاسن جانے کی ضرورت ہوئی برائے عیادت و رخصت نواب نسیم صاحب کے مکان پر گیا. بالا خانے کی ایک کوٹھری میں نہالی پر داہنی کروٹ روبہ شمال پڑے ہوئے تھے، ایک ملازم پنکھا جھل رہا تھا، اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بالکل نہ تھی. نواب نے مجھکو دیکھکر اپنی حسب عادت تبسم فرمایا. میں نزدیک بیٹھ کر پوچھا کہ حضرت اب طبیعت کیسی ہے، فرماتے ہیں کہ خواجہ ساقی کیا کہوں ع سب جاتا ہے پیشاب کا جلنا نہیں جاتا. اللہ ری طبیعت.

یہ جواب اُن کے منھ سے نکلتے وقت ہوش تک درست نہ تھے اور انکا ہاتھ نتھنوں پر بار بار دوڑتا تھا یہ حالت دیکھتے ہی جی بھر آیا، یقین ہو گیا کہ نسیم کا ضرور باغ خلد کو جانا ہوگا. تاسف سے پوچھا آپکا مرقع روحانی نگارستان معانی دیوان کہاں ہے. فرمایا کہ لوگوں کی زبان پر، ہاں وکچھ مسودے رہگئے ہیں لیجاؤ اور لکھنؤ میں چھپوادو. میں اس وقت ایک بوسیدہ کتاب کو جسمیں اشعار مرقوم تھے اور میز پر دھری تھی اٹھا لیا اور:

حق پہ سونپا انہیں جدا کر کے دل سنبھالا خدا خدا کر کے

بصد اندوہ و ناکامی وہاں سے لوٹا اور جی ہی جی میں کہا کہ انکو مرتب کرنا تو ضروری ہے لیکن اشعار بہت کم اور اکثر ردیفیں چھوٹ گئی ہیں کیا کروں. اسی فکر میں رہا، مارے بڑی جانکاہی سے اور بھی کئی شعر ادھر ادھر سے احباب کی معرفت فراہم ہوئے، رات دن اسی سوچ میں رہنے لگا کہ کیا کروں اور کیونکر چھپواؤں، اس اثنا میں نواب نسیم صاحبؒ کے بہنوئی میرے پرانے یار محمد علی خان صاحب ڈپٹی عملدار ترویکرہ نے راقم سے کہا کہ تم نواب نسیم صاحب مرحوم کا دیوان مرتب

کردیں تو میں اس کو لکھنؤ بھیج کر چھپوا دوں گا۔ میں بیساختہ کہہ اوٹھا:
للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری ٭ طے ہوی آج کی منزل میں مسافت میری
جھٹ سے دیوان مرتب کردیا اور نام اس کا «مخزن الفصاحت» رکھا،
۱۳۰۷ھ
جس میں ترتیب دیوان کی تاریخ نکلتی ہے۔ نواب نسیم صاحب گو میسوری تھے مگر اہل دہلی و لکھنؤ کی زبان سے زیادہ آشنا اور ان کی تقلید کرتے تھے۔ ہمیشہ آپ کے پاس دو ملازم ایک شیخ ابراہیم لکھوی دیگر مولا بخش دہلوی رہتے تھے اور ان سے ہی بات چیت کرتے رہتے اور بار بار مجھ سے آپ نے فرمایا ہے کہ خواجہ ساقی یہ دونوں میری ڈکشنری ہیں۔

یہ نواب نسیم صاحب مرحوم سنہ ۱۲۵۶ھ/۱۸۳۹ع میسور میں پیدا ہوئے جب ان کی رسم بسم اللہ خوانی ہوئی انہیں مکتب میں بٹھا دیا۔ ان کے والدین گو سنی المذہب تھے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ آج بھی شیعوں میں ان کے قرابت دار موجود ہیں۔ ان کے والدین اپنے حسب منشاء ماہ محرم میں نسیم صاحب کو عشرے تک مجنوں بناتے اور کہتے تھے کہ یہ حسین کا فقیر ہے۔ مجنوں کا لفظ ان کے لئے مبارک فال ہوا کہ آخر عاشق مزاج ہو نکلے۔ غرض آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کرکے دسویں سال تک اس زمانے کے دستور موافق آمدن نامہ، کریما، نام حق، عقاید جامی وغیرہ کتابیں پڑہیں پھر بنگلور میں کئی مدت اونکو رہنا ہوا۔ وہاں ایک بڑے ایک فاضل شہر استاد علام زین العابدین عرف عابد میاں صاحب سے درسی کتب (اور[1] جناب شاہ باقی صاحب، باقی تخلص اور جناب بخشی سید اسحٰق صاحب سالم تخلص سے) علم عروض و قوافی و علم بیاں و علم بدیع وغیرہ وغیرہ پڑھ کر ہئیت، حساب، رمل، نجوم وغیرہ علوم کو جناب منشی غلام حسین صاحب منجم سے میسور میں سیکھا۔

نسیم صاحب مرحوم سولا برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ بموجب رسم زمانہ کے حضرت مولوی حافظ میر شمس الدین فیض حیدرآبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ طبیعت آپ کی خوب موزوں اور شعر سے نہایت مناسبت

---

۱ قوسین کی عبارت اس نسخے میں کاٹ دی گئی ہے

رکھتی تھی، اسی وجہ سے ملک میسور میں فن شعر کے آفتاب ہو کر چمکے ان کی استادی نے اپنا علم بلند کیا، اور ان کے سامنے ہی، ان کے صدہا غزلیں، مخمس، مسدس، مثنوی، رباعی، سلام، مرثیے وغیرہ مشہور ہو گئے. جس مجلس میں آپ کی غزل پڑھی نہ جاتی وہ مجلس پھیکی معلوم ہوتی تھی. افسوس ہزار افسوس ہے کہ زمانے کا الگ الگ طور پر ہیں.

دنیا خوابیست کش عدم تعبیر است صید اجل است گر جوان و پیر است
هم روئے زمیں پر است و هم زیر زمین ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

آخر مقام ہاسن میں میرے ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ نکی نواب نسیم صاحب نے ١٣٠٥ھ / ١٨٨٨ع شعبان کی بارھویں تاریخ کو دنیائے فانی سے نقل مکان فرمایا. آہ صد آہ اس خبر وحشت اثر کے سنتے ہی جاں میں جاں نہ رہی دیر تک روتا رہا اور بار بار میرے منہ سے یہ مصرع بیساختہ نکلا تھا.

ع شاعری کی آج رحلت ہوگئی

دوسرے تیسرے دن اون کے انتقال کی تاریخ لکھ کر جریدۂ روزگار مدراس کو بھیج دی، وہ تاریخ یہ ہے. تاریخ وفات نکی نواب محمد حسین علی صاحب قریشی تخلص نسیم:

سنا ہائے میں نے کہ حضرت نسیم گئے شوق سے نزد اللہ آج
نہ ایسا رہا جب سخن دان دھر سخن گوئی نے اپنی لی راہ آج
نہ تاریکی غم نہ آنکھوں میں آہ منور ہوئیں مہر اور ماہ آج
قیامت بپا کیوں نہ ہو شہر میں جہاں سے اٹھا ایسا ذیجاہ آج
فلک سے جو پوچھا تو سال وفات ندا غیب سے آئی ناگاہ آج

که ساقی بر آه و زاری سے لکھ
گیا مالک نظم و نثر آہ آج
١٨٨٨ع

ایک ہفتہ کے بعد خیال کیا تو وہی مصرع « شاعری کی آج رحلت ہوگئی » جو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا بعینہ سالم اور الہامی تاریخ تھی. حقیقت میں نواب صاحب کا اردو دیوان دیکھیں تو جوہر کلام کے

اعتبار سے ایک مرصع یا یوں کہو کہ نگارخانہ چین معلوم ہوتا ہے، تمام غزلیں دلچسپ بحروں میں ہیں، اکثر اشعار ایسے بھی فصیح ہیں کہ ان کی فصاحت و بلاغت مضامین کے چمن میں اپنا قدرتی جوبن دکھاتی ہیں. اس میں کچھ کلام نہیں کہ یہ با کمال طوطی و بلبل کے طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے تھے. سیدھی سادھی باتیں بیساختہ کہہ دیتے تھے، گویا وہ باتیں سامنے تصویر بن کر کھڑی ہیں، خدا نے آپ کو ایسی طبعیت دی تھی جو شعر اور فن انشا ھی کے لئے موصوع تھی. ان کے کلام کا مزہ محاورے کی چاشنی اور لفظوں کی بندش پر ہے محاورے کی جان ہے تو ان کا کلام ہے. ان کا کلام حسن و عشق کے معاملات عاشق و معشوق کے خیالات سے مملو نظر آتا ہے انکے محاورے کی خوش بیانی نے مضامین عاشقانہ کو فصاحت و بلاغت کے رنگ میں سر تا پا ڈوبا دیا ہے.

آپ کی زبان صاف و شستہ کلام عمدہ سے عمدہ، بیان ایسا پاکیزہ جیسے عاشق و معشوق باتیں کرتے ہیں، دل کے خیالات کو سب کی طبعیتوں کے موافق محاورہ کا رنگ دیکر باتوں باتوں ہی میں ادا کرنا ان کا جوہر اصلی تھا، اور اس کی شعر خوانی کا بھی نرالا انداز تھا جس سے شعر کی شان اور لطف کلام دوبالا ہوجاتا تھا، اور شعر کو بہت بانکپن سے لفظ لفظ جدا کرکے پڑھتے تھے اور آپ کو موسیقی میں بھی اچھی مہارت تھی.

حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جب کسی کے منہ سے شعر ایک بار سنتے تو فوراً کچھ کم و بیش پڑھ دیتے تھے، آپ کی طبعیت میں آزادی تھی کوئی امیر یا فقیر آجاویں تو بے تکلف بہ کشادہ پیشانی ملاقات کرتے تھے، مگر مزاج میں رنگینی اور ظرافت ایسی تھی کہ ہر قسم کا خیال لطایف و ظرایف ہی میں ادا ہوتا تھا، ان کے چند لطیفے ذیل میں لکھتا ہوں.

لطیفہ: ایک دن نواب صاحب نے کئی معزز عمایدکے ساتھ حسب عادت عین کھانے میں پانی پیا، جھٹ سے ایک صاحب نے کہا کہ نواب صاحب آپ کھاتے کم ہیں اور پیتے بہت، تو جواب دیتے ہیں:

مری شراب کے دشمن خراب ہوں یارب
نہ کسی کے کھانے میں ہوں نہ کسی کے پینے میں

لطیفہ: نواب صاحب کو ایک اور نواب صاحب سے اتحاد قلبی تھا، جب وہ علیل ہوے انکی عیادت کو آپ گئے، بعد مزاج پرسی کے انھوں نے کہا کہ بھئی بنکی نواب دعا کر. آپ نے کہا کہ ہاں بھئی خدا کرے تری، بیماری بی ماری جائے، خدا کی قدرت اسی سال اتفاقاً ان کی پہلی بی بی نے انتقال کیا.

لطیفہ: ایک صاحب نواب صاحب کی ملاقات کو آئے اور بطور گلہ کہنے لگے کہ آپ تریکرے سے تشریف لائے سو میں کیا جانتا آپ کیوں بول نہ بھیجے، جھٹ سے فرمائے کہ شیشہ نہ تھا.

لطیفہ: ایک دن نواب صاحب کے ہاں راقم حاضر ہوکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک مے فروش نے اپنی ساقی کی مل لائی ہے اور آپ فکر مند بیٹھے ہیں. مجھے جو دیکھا کہنے لگے آئیے آئیے خواجہ ساقی آئیے، میں سلام کر کے بیٹھ گیا اور پوچھا چہرے سے آزردگی ظاہر ہے، اور یہ کیا تحفہ ہے تو آپ فوراً کہہ اُٹھے،

ڈھو دیئے بیٹھا ہے در پر مئی احمر والا دشمنی کرتا ہے داماد سے دختر والا

لطیفہ. ایک دن ایک بندو . ... دربار میں نواب صاحب گئے جب ادب گہ پر پہونچے جوتا پاؤں سے اتارنے فراموش ہوگئے پھرے والے نے ٹوکا، آپ فرماتے ہیں.

چھوڑ دو جوتا ادب گہ پر وہ کہتے ہیں نسیم
کیا نشان ھند کی ہے آبرو پاپوش میں

لطیفہ: رمضان کا مہینہ تھا جمعہ کی صبح کو عمر خان صاحب درابی کی مسجد کے پیش امام چند دانے آم کے لائے. نواب صاحب نے کہا کہ یہ آم کہاں کے ہیں پیش امام نے کہا کہ عمر خان صاحب نے فروخت کے لئے دیا ہے. جھٹ آپ فرماتے ہیں.

صباح جمعه شنیدم امام مزدور است چرا نه پیر مغاں قمله ام شود تا شام

لطیفہ: جمعدار محمد حسین صاحب ہمیشہ نواب نسیم صاحب کے پاس رہا کرتے تھے اور یہ جمعدار صاحب بڑے عقلمند کرکے مشہور ہیں. ایک موقع پر کہے:

بہت شیر مردوں کی روزی گئی جمعدار جیسے کہ کولا ہوا

لطیفہ: دھوپ کالے کے موسم میں نواب صاحب کو نیلگری کے پہاڑ پر رہنے کی عادت تھی، ایک دن کرنل اسکاٹ صاحب کے بنگلے میں نواب نسیم صاحب اور چند یورپین لیڈیاں اور یورپین صاحبان دوپہر کے بعد بیٹھے باتیں کررہے تھے. اس اثناء میں ایک پرندہ درخت کی ڈالی پر بیٹھکر بولنے لگا. ان میں سے ایک لیڈی نے کہاکہ بکی نواب یہ جانور کیا بولتا ہے. آپ نے کہا کہ (ٹی پو ٹے ٹو - ٹی پو ٹے ٹو، برنگ برنگ برنگ) بولتا ہے. سب نے قہقہہ مارا فوراً جائے اور آلو مکوائے نوش کئے.

لطیفہ: ایک دن نواب صاحب عملدار محمد علی خان صاحب کے گھر تشریف لیگئے وہاں ایک حکیم جی بیٹھے باتیں بگھار رہے تھے. اثنائے گفتگو میں خان صاحب نے کہا کہ ہمارے حکیم جی اس زمانے کے بو علی سینا ہیں. نواب نے فرمایا کہ ہاں جناب بو تو سچ ہیں لیکن علی سینا نہیں.

لطیفہ: نواب نسیم صاحب کے ہاں ایک سوداگر صاحب مہمان تھے اور زیادہ مے نوشی کے بھی عادی تھے. جب سوجاتے، اٹھتے وقت ان کا ملازم سوڈا واٹر کا شیشہ لاکر اس کا کارک نکالتا، اس آواز کے ساتھ ہوشیار ہوجاتے تھے، میں نے یہ دیکھ کے نواب صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا حالت ہے آپ نے جھٹ سے کہا سنو ساقی. شعر:

آنکھیں نہ شور حشر سے کھولیں نسیم نے ٭ بوتل کا کارک اُڑتے ہی بیدار ہوگئے

نواب نسیم صاحب کی مزاج میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مگر اسکی بنیاد نازک مزاجی پر تھی، خدا نہ کرے غرور یا بد نیتی یا کسی کی عزت ریزی کا خیال مطلق نہ تھا. آداب محفل کا خیال آپ کو ہمیشہ رہتا تھا. آپ کوٹھے پر تکیہ لگائے ہمیشہ بیٹھے یا آرام کرسی پر لیٹے رہتے تھے. شاگردوں سے اصلاح لیے کوئی آتے تو فرماتے کہ غزل پڑھو، وہ پڑھتے، آپ سنتے، کہیں کہیں کہہ بھی دیتے تھے کہ اس لفظ کو نکال کر یہ لفظ لگادو یا اس شعر کو کاٹ دو یا اس کی بندش ٹھیک نہیں یا فلاں حرف گرجاتا ہے.

نواب صاحب نہایت رنگین طبع، شگفتہ مزاج، خوش وضع، خوش لباس

تھے. قد اونچا اور جسیم، کمان ابرو، گورا رنگ، گرد چہرہ، سر میں نرمۂ گوش تک چھڑی دار بال. جملہ قوانین شرافت اور آئین خانداں میں اپنے مانا نواب قاسم علی خان بہادر کے پابند تھے، مگر ڈاڑھی گھٹوایا کرتے تھے، سر پر چوحاشیہ بنارسی قور کا ڈوپٹہ اکثر باندھتے تھے یا دلی کے نواب زادوں کی سی زرین ٹوپی رکھتے، تن میں تن زیب کا انگرکھا یا لانگ کوٹ، سفید پاجامہ کبھی پتلون، کمر میں پٹکہ، ہاتھ میں قمچی. پاؤں میں ترچناپلی کی نوک کا جوتا، کبھی شوز کبھی ہاف بوٹ داھنے ہاتھ میں کھربے کے بڑے بڑے منکے، ہاتھ میں عطر بسا ہوا ریشمی رومال، کں انگلی میں طلائی انگشتری سنگ سلیمانی نصب کی ہوئی تھی، اور اس انگوٹھی پر ایک تصویر شیرہ کی اور انگریزی میں تین حرف یعنی بی. ین. ٹی. کندہ تھے. اس انگشتری کو چیف کمشنر مسٹر ایل بورنگ بہادر نے کندا کرواکے دیا تھا مذکورحروں سے یہ اشارہ ہے کہ بی، سے بنگی نواب، ین. سے نسیم اور ٹی. سے ٹیپو سلطان والی سریرنگ پٹن مراد ہیں. فقط

ساقی کا تذکرہ نسیم کے حالات کا سب سے زیادہ مستند ماخذ ہے، جو اب تک پردۂ اخفا میں تھا. بقول ساقی محمد علی خان میانہ نسیم کے بھوی تھے جنھوں نے اس کا تفصیلی تذکرہ لکھ کر انھیں زندۂ جاوید بنادیا. ساقی نسیم کے محبوب دوست و شاگرد تھے جو ان کی ادبی تخلیقات کی ہر ہر قدم پر داد دیتے اور ان کی غیر معمولی ذہانت اور رچے ہوئے مذاق شاعری کے معترف تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اپنے تجربے کی بنا پر لکھا چشم دید واقعات قلمبند کئے. دہلی اور لکھنؤ کی ادبی قیادت پر پورا جنوبی ہندوستان متفق الرائے تھا یہی وجہ تھی کہ نسیم نے بھی دہلی اور لکھنؤ والے ملازم اپنے یہاں رکھ لئے تھے اور انھیں اپنی ڈکشنری کہا کرتے تھے، اور شمالی ہندوستان کی اردو کی پیروی قابل فخر سمجھتے تھے. نسیم بحیثیت شاعر کے بڑے کامیاب رہے جس کی زندہ شہادت ان کے اشعار ہیں جو آج تک زبان زد خاص و عام ہیں گو کہ ان کے کلام کا تجزیہ میرے موضوع سے متعلق نہیں لیکن اتنا تو ضرور

کہنا پڑے گا کہ شگفتگی بیان رنگینی مضامین دلکشی اسلوب نگارش کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نسیم کی زندگی کے حالات کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انکی عمر کا بیشتر حصہ فارغ البالی اور عیش و عشرت میں گذرا۔ انگریزوں کی رفاقت اور دوستی انہیں میسر تھی اگر چاہتے تو اپنے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاکر بڑے سے بڑا منصب حاصل کرتے کیوں کہ ایک تو خاندانی نجابت کی بنا پر اور دوسرے اپنے اخلاق و عادات اور علم و فضل کی وجہ سے فرمانروایان ملک سے خراج تحسین وصول کررہے تھے انھوں نے ایک مرتبہ ایک بڑا منصب پایا بھی لیکن اپنی بے چین اور متلون مزاج طبعیت کے سبب اس کو سنبھال نہ سکے۔ گذر معاش سے مطمئن ہوتے ہی فوراً ہی اس عہدے سے مستعفی ہوکر علم و ادب کی پیاس بجھانے میں شبانہ روز مصروف ہوگئے، اور درحقیقت اس میلان طبع، ذوق ادبی اور مساعدت وقت نے انہیں اس کا موقع دیا کہ آج ان کا نام اس زمانے کے میسوری شعراء و ادبا میں سرفہرست نظر آرہا ہے۔

* جناب سخاوت مرزا

ریختہ ثناء گجراتی بزبان ہیکلی

شیخ ثناءاللہ المتخلص بہ ثناء مولانا قاضی نور الدین حسین خان، مؤلف مخزن شعراء گجرات نے ثناء احمد آبادی کا اس طرح تعارف کرایا ہے:

ثناء تخلص[1] شیخ ثناء اللہ از شیخ زادگان احمد آباد بوده و از اجل تلامذه محمد ولی المتخلص بہ ولی و کسب فیض باطنی از خدمت مخدوم العالم مولانا محمد نور الدین حسین صدیقی سہروردی حاصل ساختہ، و در زمان محمد شاه در ہنگام زحمی شده، حضرت مولانا شربت شہادت چشیده و عمر گرا نمایہ خود را بصدق دل نثار پیر خود کرده محاوره اش با محاورۂ حال فرقے دارد و بعید مضامین درست می یابد، تا این یک دو شعر کہ موافق محاوره جدید اہل گجرات است از مضامین قدیمہ بہم رسید، در این اوراق ثبت گردید.

یہ ہوگئی ہے اسے نام سے ثنا کے ضد ٭ کہ ثنا خدا کی بھی وہ بت نہیں کیا کرتا
ثنا کا کام یہی ہے کہ اپنے منہ سے بس ٭ سدا ثنا، دہن یار کی کیا کرتا

آگے اس قاتل خونریز کے مقتل کے ثنا ٭ حس نے سر اپنا جھکایا وہ سرافراز ہوا

گویا، شیخ ثناء اللہ، احمد آباد کے شیخ زادہ تھے، تعلیم و تربیت ظاہری و باطنی اور علوم کی تکمیل گجرات کے مشہور و معرف علامہ شیخ نور الدین[2] حسین صدیقی سہروردیؒ المتوفی (سنہ ١٠٦٤/١١٥٥ع) سے کی، جو علوم ظاہری میں اخوند احمد، مولانا سلیمان اور ملا فرید الدین احمد آبادی کے شاگرد تھے. اس طرح ثناء کا سلسلۂ شاگردی مولانا اخوند احمد، مولانا سلیمان اور ملا فرید الدین سے ملتا ہے، اور علوم باطنی میں، ثناء چونکہ مولانا نور الدین ہی کے مرید تھے، لہٰذا ثنا سہروردی

---

* جناب سخاوت مرزا، بی. اے. ایل. ایل. بی. حیدرآباد، دکن.

١ مخزن شعراء گجرات مطبوعہ ص٣٥

٢ تذکرہ اولیاء دکن، عبدالجبار خان ملکاپوری، مطبوعہ جلد دوم.

الطریقه تھے ان کا سلسله ارادت بیک واسطه حضرت سید محمد ابو المجد محبوب عالم[1]
بخاری (سنه ۱۰۴۷/۱۱۱۱ھ) معاصر شاهجہاں و عالمگیر ابن سید جعفر بدر عالم[2]
بخاری (وفات سنه ۱۰۸۵ھ) از اولاد سید جلال بخاری المعروف به مخدوم[3] جہانیاں
جہانگشت قدس سره المتوفی (۷۸۵ھ) تک پہنچتا ہے۔

اردو شاعری میں بابائے ریختہ، ولی گجراتی، المتوفی ۱۱۱۹ھ سے تلمذ تھا
اور اجل تلامذه ولی میں شمار تھا۔ وفات ثناء گجراتی زمانه محمد شاه دہلی
(۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) مطابق (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) کسی معرکہ میں زخمی ہوکر جام
شہادت نوش فرمایا۔ اس طرح ثناء نے تین سلاطین مغلیہ یعنی شاهجہاں کے آخری
عہد میں پیدا ہوئے، عالمگیر اورنگ زیب سنه ۱۰۶۸ھ - ۱۱۱۷ھ کا زمانہ دیکھا اور
شاید اوایل عہد محمد شاه دہلی میں مابعد سنہ ۱۱۳۱ھ واصل بحق ہوئے۔ اپنے استاد
ولی، اور استاد صوری و معنوی شاه نور الدین رح سے پورا پورا استفاده کیا۔ چونکہ ولی
بھی شیخ نور الدین رح کے شاگرد تھے، اس لئے ثناء ولی کے خواجه تاش تھے، اور
ریختہ میں ولی سے تلمذ تھا۔ کتبخانہ دانش گاہ پنجاب میں اسی ثناء الله ثناء گجراتی
کا مکتوبہ دیوان ولی کا ایک نسخہ ہے جس کا سنہ کتابت سنہ ۸ جلوس محمد شاهی
مطابق ۱۳۳۸ھ ہے مگر کاتب نے اپنا نام ثناءالله لکھا ہے اور تخلص فانی، یا شاید
ثناء الله ثانی یا ثناء کو ثانی لکھ دیا ہے جو سہو کتابت معلوم ہوتا ہے، اگر یه صحیح
ہے تو ثناء گجراتی سنه ۱۱۳۸ھ تک بقید حیات تھے۔ مقام کتابت احمد آباد ہے۔
اس نسخه کا حواله کلیات ولی مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی میں نہیں ہے، اور یہ
نصیر حسین خان خیال کے نسخه کے بعد سب سے قدیم ہے

ثناء کے کلام کے متعلق فائق نے لکھا ہے کہ «محاوره اش با محاورۂ حال
فرقے دارد ببعید» «مضامین درست می یابد، با این یک دو شعر که موافق محاورۂ
جدید اہل گجرات است از مضامین قدیمه بہم رسید» جس سے واضح ہے کہ ثناء کا ابتدائی
کلام قدیم طرز میں تھا، اور جدید طرز اور محاوره میں بھی دستگاه حاصل کی تھی،
اور اپنے استاد ولی سے اپنے کلام میں بہت زیاده صفائی حاصل کرلی تھی جو نمونہ
فایق نے دیا ہے اوس میں دکنیت نہیں پائی جاتی ہے۔ کس قدر صاف شعر کہا ہے:

---

۱ تذکره اولیاء دکن ص. ۸۸۱ جلد دوم مطبوعه ۱۳۳۲ھ حیدرآباد دکن

۲ ایضاً ص. ۵ - ۸۰۵ نزهة الخواطر عربی مطبوعه ص. ۲۸ دائرة المعارف حیدرآباد۔

یہ ہوگئی ہے اسے نام سے ثنا کیے ضد ہ کہ ثنا خدا کی بھی وہ ست نہیں کیاکرتا اور ہیکلی زبان (توتلی) میں جو غزل ریختہ کہی ہے اوس سے بھی صفائی زبان و بیان، خوشگوئی و خوش طبعی ظاہر و باہر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ثناء کو علم عروض پر کامل عبور تھا، اور صنعت تنافر ہیکلی زبان (توتلی) میں آج سے ڈھائی سو سال قبل خوب غزل کہی ہے جس کے نمونے فارسی شعراء کے کلام میں ملتے ہیں. ریختہ میں اس کا سہرا شیخ ثناء اللہ کے سر ہے اور «دیوان پرتو مدراسی مطبوعہ میں جو یہ لکھا ہے کہ «غزل ہیکلی زبان میں اردو نظم کہنے کے موجد حضور مصنف ہیں» غلط ہے. موجودہ دور میں قاضی عباس حسین ظریف دہلوی کی دو غزلیں اسی طرز میں شائع ہوئی ہیں، اس صنعت کا موجد حکیم قاآنی مشہور شاعر بیان کیا جاتا ہے.[1] متاخرین ثناء میں سید شاہ کمال الدین کڑپوی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) ہے جو عربی و فارسی کی فاضل اجل اور ریختہ کے بھی ایک جید شاعر تھے، اسی صنعت تنافر میں دو ایک غزلیں فارسی میں لکھی ہیں چند اشعار بطور نمونہ و تقابل ہدیۂ ناظرین ہیں:

ہیکلی زبان | یہ بھی ایک صنعت شعر ہے جس کو فارسی زبان میں شاید صنعت تنافر کہتے ہیں. جنوبی ہند کے ایک صوفی شاعر شاہ کمال فرماتے ہیں:

ح ح ح ح حبیب حور پیکر   خ خ خ خ خدمت خورشید انور
ق ق ق ق قد و زلف دو تایت   س س س س سہی و سنبل تر
ک ک ک ک کمال الدین کلامت   ہ ہ ہ ہ ہمہ چوں در و گوہر

خ خ خ خط تو خضر و ل ل ل لعل تو عیسیٰ   ش ش ش تو یوسف، ی ی ی ید تو بیضا

مدراس کے ایک شاعر رؤف احمد خان المتخلص پرتو، معاصر داغ دہلوی نے بھی منجملہ اور لطائف کے اس طرز میں ایک غزل کہی ہے جسکا مطلع یہ ہے:

تَ تَ تیری فُ فُ فرقت میں یہ مضطر ہوں میں   پَ پَ پیارے سَ سَ سے بڑھ کر دَ دَ دلبر ہوں میں

---

۱ رسالہ صنعت جولائی ۱۹۵۹ع ص ۴۶ کراچی.

ریختہ بیکلی زبان، شیخ ثناء اللہ ثناء جو نادر و نایاب ہے بغرض صیانت طبع درج ذیل ہے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے، اس لئے کہ ثناء کا کلام کمیاب ہے، تذکرہ نویسوں نے ان کے دو چار شعر سے زائد نہیں لکھے ہیں:

دہ، دہ، دہ، دلبر آیا سہ، سہ، سہ، مانکی ادا کا
پیہ پیہ پیہ پیہ پیہ پیہرا[1] ہے جامہ ر ز رری رربفت نما کا
ہیہ ہیہ ہیہ ہاتھ میں دستا[2] خہ، حہ، حہ، حنجر خوبی
لہ، لہ، لہ، لہو[3] سے بھرا ہے دہ، دہ، دامن سو قبا کا
غہ، غہ، عہ، عمزدہ اوپر اآ، اآ، اآ، آح میاکر[4]
تہ، تہ، تہ، تجھ کو دیا ہوں قہ، قہ، قہ، قسم خدا کا
کہ، کہ، کہ، اوس کو کہا میں سہ، سہ، سہ، ہیں تیری دو نا؟
مہ، مہ، مہ، مست مدن ہو پہ، پہ، پہ، پھول حنا کا
سہ، سہ، سہ، ساری عمر میں حہ، حہ، حہ، حاں کی رباں سے
ارر[5]، رر، حب ہی کہا ہے شہ، شہ، شہ، شعر ثنا کا

چونکہ یہ غزل ہم کو ایک کشکول شعراء سے دستیاب ہوئی ہے، حس میں بعض شعراء گجرات مثلاً حافظ شیخ داؤد دلکش، میاں عبدالرحمن عرف میٹھا میاں شیخ پربین گجراتی کی اردو غزلیں، اور بعض ہندو شعرائے گجرات فارسی گو مثلاً آتما رام، مکند رام، اور منشی شیو لعل کے کہے ہوئے قطعات تواریخ نوابان گجرات، یعنی نواب میر خیرالدین خان المتوفی ١٢٣٥ھ و نواب میر نصیرالدین قطب الدولہ المتوفی ١٦٣٦ھ وغیرہ کی درج ذیل ہیں. مثلاً آتما رام نے تاریخ کہی:

عقل چوں سال رحلتش را جست ٭ وے شدہ در بہشت ہاتف گفت
١٢٣٦ھ

از مکند رام (نواب فلک قدر والی صوات الخ):

سن رحلتش را ز آہ دروں ٭ کاندا. زد، خرد «رفتہ آں ماہ تاباں»
١٢٣٦ھ

از شیو لعل منشی: «نصیرالدین شہ مہمان فردوس»
١٢٣٢ھ

(١) پہنا. (٢) دکھائی دیتا ہے. (٣) لہو. (٤) محبت. (٥) یعنی ارے، رے، رے.

جس سے نوابان سورت (گجرات) کا غیر مسلم اقوام سے رواداری اور ہمدردی کا پتہ چلتا ہے ، اس لئے یہ غزل ثناء گجراتی تلمیذ ولی کے ہونے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے ، اور اس میں تخلص ثناء موجود ہے .

ہم یہاں بعض اور گجراتی شاعروں کے کلام اور انشاء پردازی کا نمونہ درج کرتے ہیں جو کمیاب ہے . تاریخ شادی میر معین الدین[1] خان خلف نواب صفدر جنگ از حافظ محمد داؤد دلکش[2] :

دلکشم گفت چه تاریخ صفائے طبعش ٭ او ر دہاں شست ز آب گہر بسم اللہ

اس بیاض میں مسدس شیخ پیربین کے دس بند ہیں ، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اپنے مضمون « گجرات کی مثنویاں[3] » میں ان کی ایک مثنوی قصۂ ہیرا لال تصنیف ۱۲۱۶ھ کا نمونہ پیش کیا ہے ، تخلص پربین کی متعلق یہ تاویل کی ہے کہ یہ لفظ پرویں ہونا چاہئے ، مگر اس مسدس میں تو « پربین » ہی لکھا ہوا ہے . لغت میں پُر بمعنی بسیار آتے ہیں ، جیسے (پُر ، معنی (پردل) اسی طرح « پربین » شاید صحیح ہوگا :

جب تُہیں صبح و شام سب مل کر پیا پیا ٭ جو سگدل تھے ان کا بھی پل میں کھلا ہیا
ستی[4] کی دید ہی سیں وو بڑے لگے شیا[5] ٭ آڑے سوں کے آیا کچھ اون کا دیا لیا
سب کو کئے نمازی بڑا مرتبہ دیا ٭ اس دور میں خدا نے اپس[6] کا فضل کیا

چھوٹے بڑے نمازاں پڑیں مل کے دمبدم ٭ پڑنے درود کلماں ، وو قرآن کریں ختم
دل پر میرے عزیزاں ایکا ایک ہوا عرم ٭ سن بارہ سے تے تیس میں باندہا ہے یہ نظم
۱۲۳۰ھ

سب کو کئے نمازی بڑا مرتبہ دیا

گویا اس مسدس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۰ ھ ہے جس کا ذکر مدنی صاحب نے نہیں

---

۱ کشکول قلمی ص ۱۹۰ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن .

۲ تذکرۂ سخن شعراء گجرات ص ۶۰ مطبوعہ دلکش عدالت سورت کے منصف تھے ، ان کی ایک مثنوی لطائف الظرائف بطرز بوستان سعدی بھی بیان کیجاتی ہے

۳ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۴ع ص ۱۰-۱۲ .

۴ ستی : ست جماعت

۵ شیعہ کا قدیم املا .

۶ اپنا .

کیا ہے، اس کشکول میں گجراتیوں کے بعض اردو انشا پردازی کے نمونے بھی ہیں، جس کا ایک خط بطور نمونہ درج ہے، اردو میں دو رقعے شبیر حسین کے نام میر شمس الدین قلمی درج ہیں، جن کے مہملہ ایک رقعہ درج ذیل ہے، یہ اردو میں فارسی طرز انشا پردازی کا ایک نمونہ ہے جو گجرات میں مروج تھا، اور یہ تیرھویں صدی کے ربع اول سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

میر صاحب قبلہ امان و امانی و کعبۂ گلشن کامرانی سلامت

بعد بندگی و بسیار گذارش جناب مستطاب کے ہو جیو، اشہب ارادت ہمارا کئی دن سے اگاڑی پچھاڑی توڑ رہا ہے کہ آپ کے میدان کرم میں حاضر ہوکے کچھ جھندگی کرے، لیکن موبہ روری اس زمانے کہنہ لنگ نے ایسا تنگ کر رکھا ہے کہ اصلا راضی نہیں دیتا اس واسطے اس وادی ناتمام سے اقدام کرکے مطلب گذارش کرتا ہے کہ اس وقت صاحب والا فراست کے توسن طبع میں یوں جولانی آئی کہ کتاب خالق باری کہیں سے منگواؤ یہ ما کنند محبت؟ سوائے آپ کی، نعل عقیدت کسی سے نہیں رکھتا ہے اس لئے بلا تکلف عرض کرتا ہے کہ عیال مطلب ہمارا اگر آپ کے زمام اختیار میں ہو تو عنایت فرماویں، زیادہ بندگی۔

تنقید و تبصرہ

محمد شعیب اعظمی *

ادبی نقوش

دار المصنفین اپنی علمی، تاریخی، تحقیقی اور تالیفی خدمات کے لئے ایک زمانے سے مشہور ہے۔ یہاں کے اہل قلم نے اپنی ادبی اور علمی سرگرمیوں سے تشنگاں و دلدادگان ادب کی پیاس بجھائی ہے۔ انہیں لوگوں میں مولانا شاہ معین الدین ندوی کی ذات گرامی ہے جو اپنی مدیرانہ مصروفیت کے باوجود وقتاً فوقتاً علمی، ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہونے کے بعد اب یہ « ادبی نقوش » کے نام سے مجموعہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

ادبی نقوش میں (۹) مضامین ہیں، اور تقریباً ہر مضمون توجہ سے پڑھے جانے کا مستحق ہے لیکن « اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات » « اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی اهمیت » اور « کیا اقبال فرقہ پرست تھے » خصوصاً زیادہ اہم ہیں۔

اردو شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ وہ محض گل و بلبل یا حسن و عشق کی شاعری ہے اور اس کا ماحول اور فضا غیر ملکی اوس کی تشبیہیں اور استعارے ہندوستانی سامانوں کے بجائے ایرانی سامانوں سے آراستہ ہیں۔ ان سب اعتراضات کا جواب شاہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔

اردو شاعری میں خالص ہندوانہ، مذہبی اور ثقافتی الفاظ اصطلاحات اور خیالات جس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اون کی مثالوں میں شاہ صاحب نے وہ ترکیبیں بھی لکھی ہیں جو فارسی کے اثر سے بنیں۔ دیوتاؤں کے نام اردو شاعری کا موضوع بن کر تشبیہ استعارہ کی دنیا میں جس طرح داخل ہوئے ہیں، اون کی مثالیں بھی دی ہیں، ہندو دیومالا کے اقسام جیسے کھنیّا، پاربتی، شیوجی برہما، بھیم، گردباری

---

* محمد شعیب اعظمی ایم۔ اے بی ایڈ۔ انجمن اسلام بمبئی۔

کالی اور رام کا ذکر ولی، آتش، ذوق وغیرہ کے اشعار سے لیکر آج تک کے شعرا کے کلام میں ملتا ہے۔

اسی طرح اردو شاعری میں ہندی بحروں کا اثر یا استعمال ہندو دیومالا کے قصے، ہندو مذہب سے مسلمان شعراء کا تعلق، ہندو تہوار، ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی سسنت، شادی غمی کے رسوم، سہرا، رنڈاپا، توہمات، ہندوستانی زیورات، آلات موسیقی، ناچ رنگ پھر جغرافیائی اثرات کے تحت، حبِّ وطن، ہندوستانی مناظر، موسم غرض کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا تذکرہ فاضل مصنف نے نہ کیا ہو اور اس کی مثالیں شعراء کے کلام سے نہ دی ہوں۔ یہ مثالیں بیشتر متوسطین کے کلام سے لی گئی ہیں قدیم شعراء جیسے محمد قلی قطب شاہ، محمود بحری، وجہی وغیرہ کے کلام سے نہیں دی گئی ہیں حالانکہ قدما کا کلام ہندوستانی عناصر سے پر ہے اور ان کے یہاں ہندوستانی فضا متوسطین اور متاخرین سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ہندی بحروں اور تلمیحات کا تعلق ہے اس پر بھی دوسرے موضوعات کی طرح تفصیل سے لکھا جاسکتا تھا۔

حبِّ وطن کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے قدیم شعراء کی وطنی نظموں کا تذکرہ نہیں کیا، حالانکہ ان کا کلام اس قسم کے جذبات سے خالی نہیں، اگر قدیم شعراء کو اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ ان کے یہاں حبِّ وطن کے موضوع پر براہ راست کچھ نہیں لکھا گیا تو کم از کم شیفتہ کی اس نظم کا ذکر تو انھیں ضرور کرنا چاہئے تھا جس کا مطلع یہ ہے:

ہند کی وہ زمیں ہے عشرت خیز ٭ کہ نہ زاہد کریں جہاں پرہیز

یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری وطنی نظموں سے پر ہے، دور جدید میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر بیشمار نظمیں لکھی گئی ہیں، اس لئے ان تمام کا مطالعہ تو کیا ذکر بھی مشکل ہے لیکن آنند نرائن ملاّ کی نظم «زمین وطن» کے چند بند کا ذکر ضرور کرنا چاہئے تھا، یہ بڑی پاکیزہ و شگفتہ نظم ہے مثلاً مندرجہ ذیل بند پڑھئے:

زمین وطن! اے زمین وطن!!

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں

که جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمین وطن! اے زمین وطن!!

«اردو کی لسانی اہمیت» کو اگر حاصل کتاب کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا. اگر چہ اس موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی نے «نقوشِ سلیمانی» میں شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے وہ ناکافی نہیں ہے، مگر شاہ صاحب نے اعادہ کے طور پر اس موضوع میں تھوڑی سی اور وسعت پیدا کی ہے کہ کس طرح اردو زبان نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک خاص مقام حاصل کرکے دنیا کے بیشتر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے سلسلہ میں اظہار خیال کے لئے الفاظ کا ذخیرہ اپنے خزانہ میں جمع کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی اور دوسری زبانوں کی ہم پلّہ بن کر ایک علمی زبان بن گئی. اس مضمون کا دلچسپ حصہ خود اردو کی وسعت دامنی کا ہے کہ کس طرح دیسی زبان کے سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھی اپنالیا ہے، آخر میں اردو زبان کی قواعدی دشواریاں، حروف تہجی کی آسانی، اس کا دوسری زبانوں سے رشتہ، اس کی تہذیبی اور تمدنی روایت کی رنگارنگی اور اردو شاعری کی ان خصوصیات کے ساتھ اس کے سیاسی اثرات کا تذکرہ مضمون کی افادیت اور اہمیت کو بڑھاتا ہے. اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے مگر وزن اور اہمیت کے لحاظ سے بڑا گراں قدر ہے.

اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے، مصنف نے اس کی تردید میں جہاں اقبال کی حکومت الٰہیہ کے تصور اور ان کی خالص اسلامی شاعری کو پیش کیا ہے وہیں اسلامی عقاید کی مثالوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے وہ موضوعات جو خالص ہندوستانی ماحول، فضا، زمین اور اس کے سپوتوں سے متعلق ہیں اور جن سے اقبال کی اپنے وطن سے گہری عقیدت اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے، بہترین مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے. مادر وطن کی غلامی پر جس قدر سینہ کوبی اور ماتم سرائی کی ہے اس کی نظیر ہندوستان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی. مثلاً:

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیز خاطر صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز — درمیان خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخم غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردار آں ارواح زشت

ان کے اسلامی عقاید کے ساتھ ہندوستان کے صلحا و اخیار مثلاً رامچندرجی، گوتم بدھ، گرونانک، بھرتری وغیرہ کے ساتھ ان کی بے پناہ عقیدت کے نمونے بھی

ملتے ہیں. پھر سمجھ میں نہیں آتا اقبال پر کس بنا پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے.

ریاض، مجذوب، اصغر اور جگر کے کلام کے مجموعوں پر شاہ صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے ان میں ہر ایک کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، اس ضمن میں مناسب موقعوں پر ان کے مناسب اشعار پیش کئے ہیں.

« سہیل اور نعت » نبوی مندرجہ بالا مضامین سے مختلف ہے. اس میں سہیل کی نعت گوئی پر تبصرہ ہے، نعت ایک مشکل صنف ہے جس میں قادر الکلام سے قادرالکلام شاعر بھی احتیاط و احترام سے قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے، لیکن سہیل نے اپنی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں اور عربی اور فارسی زبان پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے اس میدان میں اپنی شہسواری کے خوب جوہر دکھائے ہیں اور نازک موقوں پر اس کامیابی سے قلم اٹھایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اس مضمون سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سہیل کے بیان میں زور اور طرز ادا میں دل کشی اور بانکپن ہے.

ادبی نقوش کا آخری مضمون «مولانا عبد السلام ندوی» ہے. جن لوگوں نے مولانا عبد السلام مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی صحبت میں رہے ہیں، وہ اس مضمون کی عمدگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں. شاہ صاحب نے ایک طویل رفاقت کا وہ حق ادا کیا ہے جو اہل علم ہی کا حصہ ہوا کرتی ہے. شاید مولانا عبد السلام کا یہ زندہ جاوید سراپا کوئی نہ کھینچ سکتا. مرحوم کے علمی و ادبی ذوق، عادات و اطوار ان کی بے پیاری سادگی کے ساتھ پرکاری اور معصومیت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ آج بھی مولانا عبدالسلام آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں.

شاہ صاحب دار المصنفین کے ایک دیرینہ رفیق ہیں. ان کی زبان میں وہی سادگی. سلاست اور ساتھ ہی رنگینی جھلکتی ہے جو دبستان شبلی کا خاص امتیاز ہے. شاہ صاحب مشرقی تنقید کے پیرو ہیں اور مرنجان مرنج تنقید کا رنگ ان کے مضامین میں غالب ہے.

ادبی نقوش کی اشاعت اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں ایک خوش گوار اضافہ ہے.

تبصرے

عظمت رفتہ

مصنف: جناب ضیاء الدین احمد برنی بی. اے.
صفحات: ۵۰۱ ـ ۵۱۲ قیمت: دس روپے.
ملنے کا پتہ: تعلیمی مرکز کراچی نمبر ۱ (پاکستان)

آج سے پندرہ سترہ برس پہلے بمبئی کی کوئی اسلامی علمی، ادبی تعلیمی اور شاید سیاسی مجلس ایسی نہ تھی جس سے جناب ضیاءالدین برنی صاحب کو بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق نہ رہا ہو، اس لئے وہ لوگ جو اس زمانے کے بمبئی میں رہتے تھے ان سے اچھی طرح واقف ہی نہ تھے بلکہ ان کو ایک انجمن سمجھتے تھے. وہ دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ دنوں کانپور میں رہ کر بمبئی آگئے، اس لئے ان کے ملنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت سے ان شہروں سے رہا ہے. خواجہ حسن نظامی اور ریورنڈ اینڈ ریوز کی روحانی و ذہنی تعلیم نے ان کو مرنجان مرنج، یار دوست، صاحب درد اور تبسم بار بنا دیا ہے. وہ اپنی وضع کے بڑے پابند اور اپنے اصولوں میں بڑے مستقل ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم و مذہب اور ہر دبستان فکر و نظر کے افراد سے یکساں تعلقات رکھ سکے. ان کی نیک دلی کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ انھوں نے بابائے اردو کو ملا کر ۹۴ ممتاز اشخاص کے حالات لکھے ہیں جن سے بلا واسطہ وہ کم یا زیادہ ملے تھے، اور ان میں سے کسی کے خلاف بھی اس میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان میں سے کسی ایک کی کسی بھی کمزوری یا کمی کا پتہ چل سکے. یہ تذکرہ در اصل ایک ایسا تاریخی مرقع ہے جس کے ذریعہ ایک مصنف یا محقق اپنے لئے مواد حاصل کرسکتا ہے. پھر تصویروں نے اس کتاب کی اہمیت و حسن کو اور بڑھا دیا ہے، ابتدا میں جناب مولانا عبد الماجد دریابادی کا مقدمہ ہے، اور ہم کو ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہ کتاب ایسی کتابوں میں جن سے انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں اجاگر ہوتی ہیں ایک خوشگوار

اضافہ ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کا مطالعہ ذوق و شوق سے کیا جائے گا۔

«ن»

نساخ سے وحشت تک

مصنف : سید لطیف الرحمن

صفحات : ۳۵۰　　قیمت : ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

کاغذ، کتابت، طباعت اوسط درجہ کی

ملنے کا پتہ : عثمانیہ بک ڈپو، لور چیت پور روڈ کلکتہ ۱

اس کتاب میں مصنف نے «ایک سلسلۂ استادی کے چار بنگالی شعرائے اردو. یعنی نساخ، انسخ، شمس اور وحشت کی شاعری سے ارباب ذوق کو متعارف کرایا ہے» فورٹ ولیم کالج، مرشدآباد اور ہگلی کے بعض شعراء کے کارناموں کے علاوہ ہم کو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس علاقہ کے شعرائے اردو نے اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں کیا حصہ لیا ہے، اس لئے یہ کتاب کسی حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا چاروں اساتذہ کے حالات زندگی اور ادبی و شعری کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے حالات و واقعات کے بیان میں بیجا عقیدت کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن بعض واقعات کے بیان کرنے میں درایت سے کام نہیں لیا، مثلاً پانچ چھ برس کے نساخ کا اپنے استاد کو پستول لے کر دوڑانا یا اپنے دوسرے استاد کو پٹک مارنا خلاف قیاس ہے۔ اس طرح مصنف کا کہنا کہ نساخ «بحیثیت مترجم ماہوار ہزار روپے تک کمانے لگے» تھے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مصنف نے وحشت کے حالات زندگی خصوصاً تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر ان کی ایک اچھی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شاعری سے متعلق بھی کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، زبان و بیان کئے بعض خامیوں سے قطع نظر کتاب مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

«ع. ر. ق.»

کلمۃ الحقائق

از : شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری

مرتبہ : (۱) محمد اکبر الدین صدیقی (۲) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

ملنے کا پتہ : (۱) ادارہ ادبیات اردو خیرت آباد حیدرآباد . (اے . پی .)
(۲) مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد

تحقیق و تنقید کی راہ بڑی دشوار گذار ہے ، جن لوگوں کا مبلغ علم محدود ، شعور نا پختہ اور طلب غیر صادق ہو وہ اس راہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتے . ہمیں خوشی ہے کہ گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں اردو زبان و ادب کی قدیم ترین کتابوں کی تحقیق و تنقید کی طرف بعض صائب الرائے اور اہل علم حضرات نے توجہ فرمائی ہے ، یہی وجہ ہے کہ آئے دن اس قسم کی تحریریں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن سے اردو کی قدامت ، ہردلعزیزی اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے .

حال ہی میں حضرت سید شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری کے مواعظ کا ایک مجموعہ « کلمۃ الحقائق » کے نام سے ایڈٹ ہوکر شائع ہوا ہے ، اس کتاب کی تاریخی عظمت اور لسانی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اسے بیک وقت جناب محمد اکبرالدین صدیقی نے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے اور محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مجلس تحقیقات اردو ، حیدآباد دکن کی جانب سے ایڈٹ کیا ہے . عجیب اتفاق یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۹۶۱ع ہی میں طبع ہوئیں .

« کلمۃ الحقائق » کہنے کو سلوک و معرفت کے مختلف موضوعات پر ایک رسالہ ہے لیکن اس کے استدلال کی گہرائی و گیرائی اور سب سے بڑھ کر اسکی لسانی حیثیت کو خاص اہمیت حاصل ہے یہ اس دور کی کتاب ہے جب اردو زبان سیالی حالت میں تھی ، باالخصوص اردو نثر کی نیو رکھی جارہی تھی ، جس طرح شاہ بندہ نواز گیسو دراز کی نثری تصنیف « معراج العاشقین » اردو نثر کی ابتدائی اسالیب میں اولیت کا شرف رکھتی ہے ، اس طرح کلمۃ الحقائق بھی اردو نثر کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے . یہاں ہمیں رسالۂ مذکور کی ادبی اور لسانی حیثیت پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ دونوں مذکورۂ بالا ایڈیشنوں میں کونسی ایسی باتیں ہیں جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں .

پروفیسر صدیقی نے اپنے ایڈیشن کے مقدمہ میں حضرت میراں جی شمس العشاق اور ان کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم ، صاحب کلمۃ الحقائق کا شجرہ اور

مختصر سوانح پیش کئے ہیں، ان بزرگوں کی شہرت اور ان کی دینی خدمات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد رسالہ کلمۃ الحقائق کے مختلف معلوم شدہ مخطوطات سے بحث کی ہے، اس کے سن تصنیف اور سنہ کتابت کا بھی پتہ لگایا ہے، اس کے بعد اس کی لسانی خصوصیات کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے اس کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے، اصل متن کتاب صفحہ ۲۱ سے ۱۱۲ تک پھیلا ہوا ہے، حواشی بھی دئے ہیں اور آخر میں چھ صفحات پر مشتمل ایک فرہنگ بھی شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے ایڈٹ کئے ہوئے نسخہ میں پروفیسر عبد القادر سروری کا پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں انہوں نے کلمۃ الحقائق کے مطالعہ کی ضرورت کو واضح کیا ہے، ڈاکٹر سلطانہ نے اپنے مقدمہ میں حسب ذیل ذیلی سرخیاں قائم کی ہیں۔

مصنف	ص	۲ — ۵
حالات زندگی	ص	۵ — ۸
سنری رسالے	ص	۹ — ۱۰
اسلوب اور زبان	ص	۱۰ — ۱۱
تشبیہ و استعارہ کا استعمال	ص	۱۱ — ۱۳

اس کے بعد رسالہ میں پائے جانے والے قواعد کے اجزا مثلاً اسماً، تعداد، ضمیر، صفات، افعال، مضارع وغیرہ سے بحث کی ہے، شاہ حاتم رح کی دیگر تصانیف کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے، رفیعہ سلطانہ صاحبہ کے مقدمہ میں دو خاص سرخیاں اور بھی ہیں یعنی معراج العاشقین اور کلمۃ الحقائق کا موازنہ اور کلمۃ الحقائق کا بھگتی تحریک سے تعلق رسالہ کے مختلف نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے، اس کتاب میں فرہنگ وغیرہ نہیں ہے البتہ ضروری حواشی موجود ہیں۔

پروفیسر صدیقی اور ڈاکٹر سلطانہ کے نسخوں کا متن ایک ہی ہے مگر اسکی ترتیب میں کچھ فرق ہے مثلاً، صدیقی صاحب نے ابتدائی عربی عبارت اور کچھ فارسی عبارت بجائے اصل متن میں دینے کے حاشیہ میں دے دی ہے، ڈاکٹر سلطانہ نے اسے بھی اصل کتاب میں شامل کردیا ہے۔

«س۔ م۔ ح۔»

جوالا مکھی

از : اننت گوپال شیوڈے

مترجمہ : ڈاکٹر محمد حسن

قیمت : دو روپے پچاس نئے پیسے ، ص ۲۵۲

پتہ : ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈیویژن ، اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

قیدخانوں میں جسم بند کئے جاتے ہیں ، لیکن یہی بندش دل و دماغ اور قلب و روح کے کتنے دروازے کھول دیتی ہے ۔ دنیا کی ہدایت و ادب کے قیمتی سرمایے میں ، جیل خانوں کا پیدا کیا ہوا سرمایہ بہت اہم ہے ۔ جوالا مکھی بھی در اصل دل و دماغ کی اسی شعلہ بار شوق آزادی کی زندگی بخش اور حرارت را جد وجہد کی ایک صحیح روئداد ہے ، اس ناول نے ہماری جنگ آزادی کے ایک مخصوص پرُشکوہ عہد کی بڑی اچھی منظرکشی کی ہے فنی اور ادبی حیثیت سے بلند ترین ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ، یہی وجہ ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ نے صحیح طور سے یہ طے کیا کہ اس ہندی ناول کے مطالعہ سے ملک کی دوسری زبان والے محروم نہ رہیں اور اب یہ اردو کے جامہ میں ہمارے سامنے موجود ہے ۔ ترجمہ کی خوبی و صحت کے لئے مترجم کا نام کافی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ جس زبان میں یہ ترجمہ پیش کیا گیا ہے اگر یہی زبان ملک میں رائج ہوجائے تو زبان کا مسئلہ اور اس سے متعلق مشکل ہونے کی شکایت بڑی حد تک دور ہوجائیگی ۔ یہ ناول اس پایہ کا ہے کہ اسے ہر ادب دوست محب وطن کو پڑھنا چاہئیے ۔

« ن »

مقالـــه نمـا

مرتب:

حامد اللہ ندوی

معـاونین:

سید مجاہد حسین حسینی

عبد الستار دلوی

علاؤ الدین حیناڑے

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱ اصلاحی صدر الدین
روزہ ۔ اسلام کا چوتھا ستون
(زندگی رام پور ۶۲ فروری ۴۵ ۔ ۹۸)

۲ امین محمد تقی
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر
(برہان دہلی ۶۲ جنوری ۔ فروری)
مذکورہ مضمون کی دوسری اور تیسری قسط

۳ جرمانوس عبد الکریم
اسلام کے متعلق ہنگری کے نومسلم ڈاکٹر جرمانوس کے تأثرات
(عارف لاہور ۶۲ فروری ۳۵ ۔ ۴۲)

۴ خواجہ بدر : مترجم
نظریہ ارتقا اور مذہب
(ثقافت لاہور ۶۲ مارچ ۱۹ ۔ ۳۲)

۵ درد کاکوری
حج اور اس کا فلسفہ
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ فروری ۔ مارچ ۵ ۔ ۸)

۶ رحمانی عبد الرؤف
جب اسلام کارفرما تھا
(تجلی دیوبند ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
صحابہ کرام کے اخلاق حسنہ کی تفصیلات . (مسلسل مضمون تین قسطیں)

۷ صدیقی عبدالحمید
موت کی ضرورت
(ترجمان القرآن لاہور ۶۲ فروری)
مذکورہ مضمون کی دوسری قسط

۸ عثماں شمس نوید
کیا ہم مسلمان ہیں
(تجلی دیوبند ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
آج کے مسلمانوں کے اخلاق کا مقابلہ صحابہ کرام کے اخلاق حسنہ سے .
(ایک مسلسل مضمون کی تین قسطیں)

۹ عمری جلال الدین
خدا کی تلاش ، خدا کی کتاب میں
(زندگی رام پور ۶۲ جنوری ۹ ۔ ۲۸)
خدا کی ذات و صفات اور اس تک پہنچنے کا راستہ قرآن کی روشنی میں

۱۰ عمری جلال الدین
خدا کی ذات
(زندگی رامپور ۶۲ فروری ۲۴ ۔ ۴۴)
خدا کی ذات ، اس کی صفات اور اس کے دائرۂ عمل کی تشریح قرآن کی روشنی میں

۱۱ غوری شبیر احمد خان
اسلام میں علم و حکمت کا آغاز
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مارچ)
مسلمانوں نے علوم عقلیہ کی ترویج

میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کی تفصیلات

۱۲　فضل الرحمن
«کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت»
کا تنقیدی جائزہ
(برہان دہلی ٦۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
جعفر شاہ پھلواروی کی کتاب «کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت» کا تنقیدی جائزہ قسط ۱ ، ۲ ، ۳

۱۳　فضل قدیر
فرمودۂ رسول
عبادت کا دعا سے تعلق
(فیض الاسلام ، راولپنڈی ٦۲ جنوری ۱۹-۲۲)

۱۴　ماہر القادری
اسلام کیا ہے
(فاران کراچی ٦۲ فروری ۱۷ ۔ ۲۵)

۱۵　منظور نعمانی
معارف الحدیث (مسلسل)
(الفرقان لکھنؤ ، سنہ ۸۱ رجب ٦ ۔ ۱۴)
نماز میں امامت کے مسئلہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے

۱٦　منظور نعمانی
معارف الحدیث (مسلسل)
(الفرقان لکھنؤ ، سنہ ۸۱ رمضان ۵ ۔ ۱۱)
نماز پڑھنے کے طریقوں سے بحث کی ہے

۱۷　ندوی شاہ معین الدین
دین رحمت
(معارف اعظم گڈھ ٦۲ جنوری ۔ فروری)

۱۸　ندوی محمد حنیف
قرآن میں رمزو اشارہ کی چند مثالیں
(ثقافت لاہور ٦۲ فروری ۷ ۔ ۱٦)
مضمون کی پہلی قسط

۱۹　نذیر احمد صوفی
سیرت مومنانہ کی تعمیر کے مرکزی نقاط
(برہان دہلی ٦۲ جنوری ۔ فروری)
مذکورہ مضمون کی پہلی اور دوسری قسط

۲۰　نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب
(ترجمان القرآن لاہور ٦۲ جنوری ، مارچ)
مذکورہ مضمون کی چھٹی اور ساتھویں قسط

۲۱　وحید الدین خان
قرآن اور علم جدید
(زندگی رام پور ٦۲ جنوری ۲۹ ۔ ۳٦)
ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب « قرآن اور علم جدید » پر تفصیلی تبصرہ

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۲　ابولقاسم رفیق دلاوری
تاریخ کے آئینہ میں

قاضی منذر اور خلیفہ الناصر الدین اللہ
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ جنوری ۱۹ ـ ۲۵)

۲۳ بابو علی
مولانا عبد الرحمن بلگرامی
(فاران کراچی ۶۲ فروری ۴۰ ـ ۴۶)

۲۴ « ادارہ »
صدیق رض کا جمال و جلال
خطوط کے آئینے میں
(فیض الاسلام، راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۳ ـ ۸۴)

۲۵ « ایم . ایم . »
بزرگان دین
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ فروری ۲۵ ـ ۳۶)
سید برکت علی شاہ گیلانی کے حالات قلمبند کئے ہیں

۲۶ جعفر شاہ
عقل و عشق کا حسین امتزاج
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۶۵ ـ ۴۷)
حضرت صدیق رض کی زندگی کے بعض واقعات کی تشریح کرکے بتایا ہے کہ وہ عقل و عشق کا حسین امتزاج تھے

۲۷ جعفر شاہ
صدیق اکبر رض کا پہلا خطبہ
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ ـ اپریل ۲۱ ـ ۲۵)
صدیق اکبر رض کے پہلے خطبے کی عمرانی تشریح کی ہے

۲۸ خلیق انجم
میرزا مظہر کے فارسی خطوط
(نگار مارچ ۶۲ ص ۶ ـ ۱۱)
مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کی تاریخی و ادبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مرزا کی شخصیت کو ان آئینوں میں دیکھا ہے

۲۹ رشید اختر
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ جنوری ـ فروری ـ مارچ)
مسلم مورخین کے حالات زندگی قسط ۱ ، ۲ ، ۳

۳۰ ظہیر احمد
ماضی کا انقلابی کردار ـ اسمعیل شہید
(تعمیر انسانیت، لاہور ۶۲ فروری ـ مارچ ۱۲ ـ ۱۴)
اسمعیل شہید کے مختصر سوانح حیات بیان کئے ہیں

۳۱ عبد اللہ یسین حسی
پہلا مرد مومن
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مارچ اپریل ۱۶ـ۲۰)
حضرت صدیق رض کی فضیلت بیان کی ہے

۳۲ غبار یاور
ابن ماجہ
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ جنوری ۱۵ـ۱۸)
عباسیہ دور کے ایک زبردست عالم حدیث ابن ماجہ کا تعارف کرایا ہے

۳۳ فاطمہ شجاعت
حالی کی زندگی اور سیرت
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ـ اپریل ۱۱۳ ـ ۱۴۴)

۳۴ قاضی اطہر
علمائے اسلام کے القاب کی تاریخ

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری ۴۲ ـ ۶۰)

۳۵ قریشی عبدالرزاق

آزاد بلگرامی

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری ـ فروری ـ مارچ)

آزاد بلگرامی کے حالات زندگی
قسط ۱، ۲، ۳

۳۶ مسعود احمد

شیخ احمد سرہندی

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جنوری ۲۹ ـ ۴۲)

۳۷ مسعود احمد

شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے

(الفرقان لکھنو ۸۱ ھ رجب ص ۱۵ ـ ۲۷)

شیخ مجدد الف ثانی نے رد بدعات
میں جو کچھ کیا یا کہا اس کا بیان ہے

۳۸ مسعود احمد

شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے

(الفرقان لکھنؤ ۸۱ ھ شعبان ص ۱۴ـ۲۷)

شیخ مجدد کی اسیری کا تاریخی ذکر ہے

۳۹ مسعود احمد

شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے (۷)

(الفرقان لکھنؤ ۸۱ ھ رمضان المبارک ص ۲۱ـ۳۰)

شیخ مجدد الف ثانی کی نظر بندی
اور رہائی کا تذکرہ ہے

۴۰ مسیح اللہ

زیب النساء

(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۱۵ـ۱۸)

اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی
لڑکی کی ذہانت و فطانت کا تذکرہ ہے

۴۱ مشفق خواجہ

«علم الاقتصاد» اقبال کا پہلا علمی
کارنامہ

(اردو کراچی ۶۰ جولائی، اکتوبر ۱۶۱ـ۱۷۸)

اقبال کی پہلی تصنیف «علم الاقتصاد»
سے متعلق تحقیقی مقالہ ہے

تاریخ و سیاسیات

۴۲ ابوالحسن علی ندوی

انسانی دنیا میں عربوں کا مقام

(الفرقان لکھنؤ ۸۱ھ رمضان ۱۲ـ۲۰)

عربوں کا تاریخی اور سماجی مقام
متعین کیا ہے

۴۳ تاراچند

مغلیہ دور میں حکومت اور سماج

(آج کل ۶۲ فروری ۸ ـ ۱۳)

ریڈیو تقریر کے اقتباسات ہیں

۴۴ خان رشید

شاہ عالم کا ہندوستان

(نگار لکھنؤ ۶۲ مارچ ۱۲ـ۲۶)

سنہ ۱۱۷۴ھ سے سنہ ۱۲۲۱ تک
کے ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے

۴۵ راج بہادر گوڑ

دکھنی رواداری

(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری ـ فروری ۳۵ـ۳۷)

قطب شاہی دور کی گنگا جمنی تہذیب

کا سرسری جائزہ لیا ہے

۴۶ راما راجو، بی

بھاگیرتھی پٹنم اور بھاگ نگر

(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۷-۴۸)

شہر گولکنڈہ سے متعلق ایک مختصر تحقیقی مقالہ ہے

۴۷ رچرڈ پائپس، شاہد احمد

سویٹ وسطی ایشیا کے مسلمان

(ساقی کراچی ۶۲ مارچ ۲۰۹-۲۳۵)

۴۸ رشید الدین

دستور ہند کے چند خاص نکات

(شاعر بمبئی ۶۲ جمہوریت نمبر ۳۴-۳۶)

۴۹ سبزواری شوکت

پاکستان کا دستور اساسی

(ساقی کراچی ۶۲ مارچ ۱۹-۲۴)

۵۰ سراج الدین علی

چند قطب شاہی فرامین

(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۲-۴۵)

۵۱ شریف النساء

حدیقۃ السلاطین میں حقیقت نگاری و فطرت کی عکاسی

(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۴۰-۴۱)

عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت کی تاریخ «حدیقۃ السلاطین» سے حقیقت نگاری وفطرت کی عکاسی کے چند نمونے پیش کئے ہیں

۵۲ ضیاء الدین احمد

ہندوستان میں قومی اتحاد کا مسئلہ

(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۳۵-۴۳)

حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں عام جذبۂ اتحاد کا علمی مطالعہ ہے

۵۳ علی اصغر بلگرامی (مرحوم)

سلاطین قطب شاہیہ کے تعلقات خارجہ

(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۱۰-۱۹)

۵۴ قاضی اطہر

نارحیل سے بحیل تک

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مارچ)

ہند و عرب تعلقات تاریخ کی روشنی میں

۵۵ ماہ منیر خان

ہندوستان قومی یکجہتی کے آئینے میں

(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۲۵-۳۰)

تاریخی حیثیت سے ہندوستان میں قومی یکجہتی کا ذکر کیا ہے

۵۶ محمود الحسن

جدید ترکی ادب میں معاشرتی موضوعات

(برہان دہلی ۶۲ جنوری - فروری - مارچ)

مضمون کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۵۷ نرمدیشور پرشاد

قومی یکجہتی

(اشارہ پٹنہ ۶۲ جنوری - فروری ۱۵-۲۲)

ہندوستان کی قومی یکجہتی کا جائزہ ہے

۵۸ وقار خلیل

ادارۂ ادبیات اردو ایک سرسری جائزہ

(سب رس حیدرآباد ۶۲ مارچ ۴-۶)

تنقید، ادب، لسانیات

٥٩ آزاد، جگن ناتھ
اقبال کی شاعری
(نگار لکھنؤ ٦۲ جنوری ۱۰-۲۰)
اقبال کی شاعری کے مختلف اصناف کا جائزہ ہے

٦۰ ابن فرید
سرود رفتہ
(ادیب علیگڑھ ٦۲ جنوری ص ۴۳-۴٦)
سیفو نامی شاعرہ کا تذکرہ اور اسکی نظموں کے ترجمہ پر تبصرہ ہے

٦۱ ابوالفضل صدیقی
حالی ایک زندہ فیصان
(ماہ نو ٦۲ جنوری ۸-٥۴)
خواجہ حالی کی سماجی و علمی خدمات کا ذکر ہے

٦۲ ابوالفیض عثمانی
اردو ہندی کا تاریخی رشتہ
(ادیب علی گڑھ ٦۲ جنوری ۲۳-۳۱)
اردو ہندی لسانیات کا تاریخی اور فنی مطالعہ ہے

٦۳ ابوالفیض عثمانی
اردو اور ہندی (۲)
(ادیب علی گڑھ ٦۲ مارچ ۲۸-۳٥)
اردو ہندی کا لسانیاتی مطالعہ ہے

٦۴ احتشام احمد ندوی
فن موازنہ (٥)
(ادیب علی گڑھ ٦۲ جنوری ۳۲-۳٥)
فن موازنہ کے چند عناصر مثلاً معانی و مقاصد وغیرہ کا بیان ہے

٦٥ احتشام احمد ندوی
فن موازنہ (٦)
(ادیب علی گڑھ ٦۲ مارچ ۳۹-۴۸)
فن موازنہ کے ایک اہم عنصر اسلوب کی بحث ہے

٦٦ احتشام بن حسن
پریم چند کی شخصیت
(ادیب علی گڑھ ٦۲ جنوری ۲٦-۴۲)
پریم چند کو بحیثیت انسان پیش کرکے ان کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے

٦۷ احتشام حسین
اقبال کی شاعری عملی نقطۂ نظر سے
(نگار لکھنؤ ٦۲ جنوری ۸۳-۹۲)
اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے

٦۸ احراز نقوی
اردو کا پہلا ظریف اخبار
(ادیب علی گڑھ ٦۲ جنوری ٦-۸)
شواہد سے ثابت کیا گیا ہے اردو کا پہلا ظریف اخبار اودھ پنچ نہیں بلکہ «مذاق» رامپور ہے

٦۹ حسن فاروقی
دنیا کی عظیم ترین ناولیں
(اردو کراچی ٦۰ جنوری، اپریل ۳۹-٦۲)
«پرائڈ اینڈ پریجوڈس» پر تنقید کی ہے

۷۰ احمر رفاعی
جگر کی شاعری کا واقعاتی پس منظر
(اردو کراچی ۶۰ جنوری ۰ اپریل ۔۱۸۔۲۰۳)

۷۱ اختر حسن
قطب مشتری اور سب رس کے مصنف
ملاؔ وجہی کے متعلق بعض نئی معلومات
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری ۔ فروری ۲۸۔۳۴)

۷۲ ارتضی حسین
اقبال ایک فلسفی شاعر
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۲۱۔۱۲۴)
اقبال کے بنیادی عقاید کے اہم اجرا
کا مطالعۂ ہے

۷۳ عبد اللطیف
تراجمہ
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۴۴۔۰۰)
سنہ ۶۱۔۶۰ کے درمیان دیگر زبانوں
سے اردو میں ہونے والے تراجمہ پر تبصرہ

۷۴ اقبال قادری
مہاراشٹر اور صحافت
(صبح امید بمبئی مہاراشٹر نمبر ۔۱۱۔۱۲۱)
دکھایا ہے کہ صوبۂ بمبئی میں صحافت
کا ارتقا کیوں کر ہوا

۷۵ اقتدار حسین صدیقی
اردو زبان عہد وسطی میں
(ادیب علی گڑہ ۶۲ مارچ ۳۶۔۳۸)
تیرھویں صدی عیسوی سے سولھویں
صدی عیسوی تک زبان اردو کے ارتقا
پر روشنی ڈالی گئی ہے

۷۶ انجم فاطمی
جدید اردو افسانہ نگاری، ایک جائزہ
(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۲۷۔۳۰)

۷۷ باقی عبد القیوم
مطالعۂ اقبال غلط زاویۂ نگاہ سے
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۹۷۔۱۰۴)
اقبال پر مجنوں گورکھپوری کے
کے اعتراضات کے جوابات

۷۸ بیدار عابد رضا
حسرت
(برہان دہلی ۶۲ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ)
اردوے معلیٰ مرتبہ حسرت کے
مضامین کی تفصیلات قسط ۷، ۸، ۹

۷۹ تسکین قریشی
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جنوری ۲۳۔۹۶)
نگار کے جگر نمبر پر ایک تفصیلی
تبصرہ

۸۰ ثناء الحق
اردو شاعری اور روایات
(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۹۔۱۴)
بتایا گیا ہے کہ اردو شاعر نے کس
طرح ہندی کے خیالات اور روایات کو
محفوظ رکھا ہے

۸۱ جاوید نہال
ملا عرفی، حیات اور شاعری
(صبح نو پٹنہ ۶۲ مارچ و اپریل ۱۱۔۵۵)
عرفی شیرازی کا مختصر تذکرہ اور
ان کے کلام پر تبصرہ ہے

۸۲ جمیل مظہری
بنام خداے زباں آفریں
(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۹-۲۲)
اردو زبان کی اہمیت پر ایک عالمانہ خطبہ ہے جو سنہ ۱۹۳۳ع میں لکھا گیا تھا

۸۳ چشتی یوسف سلیم
خدا اور خودی
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۴۲-۶۰)

۸۴ حفیظ جمال
نصیر الدین ہاشمی
(صبح امید بمبئی ۶۲ جنوری ۶-۱۰)
ذاتی تأثرات ہیں

۸۵ حمیدہ سلطان
غالب کا تصور عشق
(ماہ نو ۶۲ فروری ۲۲-۲۴)
عشق کے متعلق غالب کے نظریات پیش کئے ہیں

۸۶ خان رشید
مثنوی گلزار نسیم
(اردو کراچی ۶۰ جنوری - اپریل ۶۳-۱۱۲)
گلزار نسیم کا تاریخی و سیاسی پس منظر بتاتے ہوئے مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

۸۷ دسنوی شہاب الدین
اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ ایک نئی تجویز
(نواے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۵۲-۶۱)

۸۸ رشید حسن خاں
نظم
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۶۲-۸۹)
سنہ ۱۹۶۰ع اور ۱۹۶۲ع میں شائع ہونے والے مجموعوں پر تبصرہ ہے

۸۹ رضا انصاری
نگار کا جگر نمبر
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جنوری ۷-۲۲)
نگار کے جگر نمبر پر اظہار خیال

۹۰ رفعت مارز الدین
مدرسۂ محمود گاوان بیدر
(آج کل دہلی ۶۲ جنوری ۹-۱۲)
دکن کے ایک تاریخی مدرسہ کا تذکرہ

۹۱ رفعت مارز الدین
مولانا آزاد
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ص ۵)
مولانا آزاد کے صاحب طرز ہونے پر اظہار خیال ہے

۹۲ رفیق سعید احمد
فرائڈ کا نظریہ ادب
(ادب لطیف ۶۲ جنوری ، مارچ)

۹۲ رئیس مینائی
چند گراں مایہ خطوط
(آج کل دہلی ۶۲ جنوری ۳۸-۴۱)
حضرت نفیس بنگلوری کے نام عزیز لکھنؤی ، یگانہ چنگیزی ، آرزو لکھنوی جلیل مانکپوری ، عزیز یارجنگ ، اثر لکھنوی اور ناطق گلاؤٹھوی کے خطوط ہیں

۹۴ زور محی الدین قادری

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری
(سب رس، حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۸۰۔۷)

۹۵ سخاوت مرزا
ایک گمنام شاعر خروشی معاصر ولی
(اردو کراچی ۶۰ جنوری، اپریل ۲۳۔۳۸)
خروشی کا تعارف کراتے ہوئے اسکے اردو کلام کا انتخاب پیش کیا ہے

۹۶ سخاوت مرزا
ترکی زبان اور کائیستھ
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۸۱۔۹۴)
ہندوستان میں ترکی زبان کے رواج کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ایک کائستھ ادیب کاسی ابن بیربل اور اس کی ترکی تصنیف « ہفت اختر » کا تعارف کرایا ہے

۹۷ سہل الرحمن انجم
کیا اکبر رجعت پسند تھا
(اشارہ پٹنہ ۶۲ مارچ ۲۱۔۲۳)
اکبر الہ آبادی کا نفسیاتی تجزیہ ہے

۹۸ سید عبد اللہ
اقبال ایک ادبی فنکار
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۱۔۱۶)

۹۹ سیدہ جعفر
مرقع نگاری
(ادب لطیف لاہور ۶۲ فروری - مارچ)

۱۰۰ ش اختر
اردو ادب کا جمہوری کردار
(شاعر بمبئی ۶۲ جمہوریت نمبر ۲۹۔۳۳)

۱۰۱ شاہد خواجہ حمید الدین
سلطان محمد قلی قطب شاہ کی گنگا جمنی شاعری
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۲۳۔۲۷)

۱۰۲ شبیر علی کاظمی
قواعد کلیہ بھاکا
(اردو کراچی ۶۰ جنوری، اپریل ۱۰۔۲۲)
عہد عالمگیر کی ایک غیر مطبوعہ کتاب « تحفۃ الہند » کے باب چہارم، فصل دوم کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ہندوستانی کے قواعد سے متعلق ہے۔

۱۰۳ شروانی ہارون خاں
تلگو ادب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں
(سب رس حیدرآباد ۶۲ جنوری - فروری ۲۰۔۲۲)

۱۰۴ شفیق النساء
مکتوبات غالب
(ادیب علی گڑھ ۶۲ جنوری ۹۔۱۸)
مرزا غالب کے مکتوبات پر ذاتی تأثرات

۱۰۵ شفیق النساء
ملا وجہی کی سب رس
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۱۲۔۱۵)
ملا وجہی کی تصنیف سب رس کا فنی مطالعہ ہے

۱۰۶ شہاب مہر محمد خان
غالب و ذوق کے سہرے
ایک تفصیلی تبصرہ
(نوائے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۵۔۲۶)

۱۰۷ شیدا راجندر ناتھ

پچھلے دو سال کا تحقیقی اور تنقیدی ادب
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۱۵۔۲۶)
۱۹۶۰۔۱۹۶۱ع کے تحقیقی و تنقیدی ادب کا جائزہ ہے

۱۰۸ شیدائی اسد الحق
بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری
(ساقی کراچی ۶۲ فروری ۲۳۔۲۷)

۱۰۹ شیرانی محمود خان
عروض جدید
(اوریئنٹل کالج میگزین لاہور ۶۱ نومبر ۱۔ ۴)
حافظ محمد شیرانی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ہے جس میں علم العروض کو تفصیل کے ساتھ سمجھایا ہے

۱۱۰ صبیح احمد کمالی
اقبال کے یہاں ڈرامائی عنصر
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۷۵۔۸۱)
ڈرامہ کے متعلق اقبال کے نظریات اور ان کے کلام میں ڈرامائی عناصر کا پتہ لگایا ہے

۱۱۱ صفدر آہ
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر
(نوائے ادب بمبئی ۶۲ جنوری ۲۷۔۵۱)

۱۱۲ صوفی نذیر احمد
اقبال و رومی کا مقام اور ان کے نظریات اسلام
(عارف لاہور ۶۲ مارچ ۱۹۔۲۶)

۱۱۳ طاہر فاروقی
ہمارا رسم الخط
(ماہ نو ۶۲ مارچ ۴۵۔۸۶)
اردو کے رسم الخط کا فنی مطالعہ ہے

۱۱۴ عابد رضا بیدار
لخت لخت
(ماہ نو ۶۲ فروری ۲۷۔۳۶)
غالب کی شخصیت پر مختلف حیثیتوں سے روشنی ڈالی ہے

۱۱۵ عبارت بریلوی
پاکستان کی اردو مطبوعات
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۳۔۱۴)
پاکستانی مطبوعات اردو کا جائزہ ہے

۱۱۶ عبدالغنی
کلام بیدل میں معنی خیز علامتیں
(ساقی کراچی ۶۲ فروری ۹۔۱۸)

۱۱۷ عبداللہ چغتائی
مثنوی نل و من
(ماہ نو ۶۲ مارچ ۹۸۔۱۰۸)
فیضی کی مثنوی کا تحقیقی مطالعہ

۱۱۸ عبداللہ ولی بخش قادری
آتش گل کے اشعار آئینہ ایام میں
(جامعہ دہلی ۶۲ جنوری ۱۲۵۔۱۴۳)
جگر مرادآبادی کے آخری دور کے مجموعہ کلام میں نبض دوراں کی دھڑکن سننے کی کوشش کی ہے

۱۱۹ عثمان صدیقی
مظہر جان جاناں اور ان کی شاعری
(ادیب علی گڑہ ۶۲ مارچ ۱۶۔۲۷)
مرزا مظہر کی شاعری پر تبصرہ ہے

۱۲۰ عرشی صالح الکبری

اقبال کی زندگی کا گمشدہ ورق
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۶۱-۷۴)
جلسوں میں اقبال کی شعر خوانی،
کالج میں ان کا انگریزی پڑھانے کا طریقہ
اور ان کے لب و لہجہ پر روشنی ڈالی
گئی ہے

۱۲۱ عظیم فیروزآبادی
اقبال کی حیات معاشقہ
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۴۲-۴۷)
اقبال کے خطوط، ان کے اشعار اور
احباب کے بیانات کی روشنی میں ان کے
معاشقوں کا ذکر کیا گیا ہے

۱۲۲ علیم اللہ حالی
یگانہ چنگیزی
(صبح نو پٹنہ ۶۲ فروری ۱۹-۲۲)
تذکرہ ہے یگانہ کے آرٹ کا

۱۲۳ غبار یاور
شاعری میں عقلیت
(جام نو کراچی ۶۲ فروری ۱۱-۱۵)

۱۲۴ غلام ربانی عزیز
اقبال اور نظریۂ جمہوریت
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۵۵-۶۴)
اقبال کے جمہوری تصورات پر روشنی
ڈالی ہے

۱۲۵ فراق گورکھپوری
غزل کیا ہے
(آج کل ۶۲ فروری ۳-۶)
صنف غزل پر چند تاثرات ہیں

۱۲۶ فرقت غلام احمد
سنہ ۶۱-۱۹۶۰ع کا مزاحیہ ادب
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۳۴-۴۳)
دوران سنہ ۶۱-۶۰ع میں اردو میں
مزاحیہ ادب کا جائزہ ہے

۱۲۷ فرمان فتح پوری
اقبال و غالب کا تقابلی مطالعہ
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۱۰۵-۱۱۸)
اقبال و غالب کے افکار و خیالات
کا تقابلی تجزیہ ہے

۱۲۸ فروغ احمد
اقبال کا تصور خودی اور عقیدۂ آخرت
(اقبال ریویو کراچی ۶۲ جنوری ۱۷-۴۱)

۱۲۹ فصیل جعفری
در دانشوراں
(شاعر بمبئی ۶۱ مارچ ۲۰-۲۶)
« سوغات » کے نظم نثر پر ایک
تبصراتی مقالہ ہے

۱۳۰ قاضی عبدالودود
غالب کے فارسی خطوط
(ماہ نو ۶۲ فروری ۷-۱۰)
محمد علی خان بھوپالی کے نام غالب
کے خطوط کے مجموعہ کا ذکر ہے

۱۳۱ قدرت نقوی
غالب کون ہے
(ماہ نو ۶۲ فروری ۱۱-۲۱)
غالب کے مذہبی عقائد سے بحث
کی ہے

١٣٢ قمر رئیس
اردو افسانہ اور ناول
(جامعہ دہلی ٦٢ فروری ٢٧-٣٣)
سنہ ٦١ع میں ہندوستان میں افسانوں کے مجموعوں اور اہم ناولوں کا تذکرہ ہے

١٣٣ کریم الدین احمد
امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ عاشقانہ مثنوی
(اردو کراچی ٦٠ جولائی ، اکتوبر ٣-١٦٠)
تبصرے کے ساتھ امیر مینائی کی ایک عاشقانہ مثنوی پیش کی ہے

١٣٤ کریم اللہ پالوی
تصورات اقبال کا سرسری جائزہ
(نگار لکھنؤ ٦٢ جنوری ١٢٥-١٢٨)
تصورات اقبال کا سرسری جائزہ ہے

١٣٥ کلیم عاجز
تحقیق عتیق
(صبح نو پٹنہ ٦٢ جنوری ١١-٣٣)
عتیق صدیقی کی تصنیف «گل کرسٹ» پر تنقید ہے

١٣٦ گوہر نوشاہی
مولانا غنیمت کنجاہی
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ١١ نومبر ٥٥-٨٠)
فارسی کے ایک مشہور پنجابی شاعر مولانا غنیمت کی سوانح حیات سے متعلق مقالہ ہے

١٣٧ ماہر القادری
اقبال کی اردو شاعری
(فاران کراچی ٦٢ جنوری ٨-٣٦)

١٣٨* محسن انصاری
اقبال کی شاعری
(ادیب علی گڑھ ٦٢ جنوری ١٩-٢٢)
اقبال کی شاعری پر چند ذاتی خیالات کا اظہار ہے

١٣٩ محمد باقر
شیوۂ خط فارسی
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ٦١ نومبر ٤١-٥٤)
املا اور نقطہ گذاری سے متعلق فارسی کے مروجہ طریقے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے

١٤٠ محمود الٰہی
دیا شنکر نسیم
(ہندوستانی ادب حیدرآباد ٦٢ جنوری - فروری ٣٩-٤٠)
دیا شنکر نسیم کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے

١٤١ مسعود احمد
حضرت غمگین شاہجہاں آبادی
(اردو کراچی ٦٠ جنوری ، اپریل ١٤٥-١٨٤)
غمگین کی حیات اور کلام سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے

١٤٢ مظہر امام
ہندی میں اردو
(شاعر بمبئی ٦٢ جمہوریت نمبر ١٨-٢٤)
ہندی میں اب تک شائع ہونے والی اردو کتابوں کا سرسری جائزہ لیا ہے

١٤٣ ناصر نصیر احمد
اقبال اور وحدت الوجود
(اقبال ریویو ٦٢ جنوری ٧٥-٩٩)

۱۴۴ نامی عبدالعلیم
اردو کا پہلا ڈرامہ نویس
(صبح امید بمبئی مہاراشٹر نمبر ۸۷_۸۸)
ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کا تذکرہ ہے

۱۴۵ ندوی عبدالسلام
اردو شاعری اور فن تنقید
(معارف اعظم ۶۲ مارچ)
مضمون کی پانچویں قسط

۱۴۶ نصیرالدین ہاشمی
علامہ شبلی کی رنگین زندگی
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مارچ ۴_۸)
یہ دکھایا ہے کہ علامہ شبلی کی رنگین زندگی میں کیا صرف علامہ شبلی کو مورد الزام قرار دینا چاہیئے

۱۴۷ نصیر کوٹی
وحیدہ نسیم کی نظمیں
(جام نو کراچی ۶۲ فروری ۱۷_۲۲)

۱۴۸ نقی احمد ارشاد
سنتھالی زبان میں اردو و فارسی کے الفاظ
(صبح نو پٹنہ ۶۲ جنوری ۱۸_۲۱)

۱۴۹ نیاز فتح پوری
اقبال کا ذہنی ارتقا
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۲۱_۲۹)
اقبال کی شاعری کو ان کی شعوری پختگی سے ہم آہنگ کیا ہے

۱۵۰ نیاز فتح پوری
اقبال کے سیاسی رجحانات
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۳۴_۴۱)
اقبال کے سیاسی افکار کا تذکرہ ہے

۱۵۱ نیاز فتح پوری
اقبال کا فلسفۂ خودی
(نگار لکھنؤ ۶۲ جنوری ۴۸_۵۴)
اقبال کے کلام میں ان کے فلسفہ خودی کو تلاش کیا ہے

۱۵۲ وقار عظیم
اکبر اور انگریز
(ماہ نو کراچی ۶۲ مارچ ۳۴_۴۰)
اکبر الہ آبادی کے انگریزوں سے متعلق خیالات کا احاطہ کیا ہے

۱۵۳ وہاب اشرفی
اختر قادری کی شاعری
(شاعر بمبئی ۶۲ مارچ ۱۵_۱۹)
اختر قادری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے

متفرقات

۱۵۴ ڈار بشیر احمد
تصوف
(ثقافت لاہور ۶۲ جنوری ۲۴_۳۴)
تصوف کی تعریف اور اس کی خصوصیات

۱۵۵ سلامت اللہ
بنیادی قومی تعلیم کا سماجی کردار
(جامعہ دہلی ۶۲ جنوری ۱۱۵_۱۲۴)

قومی تعلیم پر ذاتی تاثرات ہیں

۱۵۶ سلطان احمد

کتب خانے اور ان کی اہمیت
(صبح نو پٹنہ ۶۲ مارچ ۔ اپریل ۲۱۔۲۲)

فن مطالعہ پر معلوماتی مضمون ہے

۱۵۷ ضیا الحسن فاورقی

ارسطو کے سیاسی افکار
(جامعہ دہلی ۶۲ مارچ ۲۸۵۔۲۹۶)

مشہور فلسفی حکیم ارسطو کے سیاسی افکار کا بیان ہے

۱۵۸ محمد حسین حسّان

بچوں اور بالغوں کی کتابیں
(جامعہ دہلی ۶۲ فروری ۵۵۔۶۱)

گزشتہ ایک سال میں بچوں اور بالغوں کے لئے اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر ہے

۱۵۹ محمد مجیب

مغربی دنیا پر ایک نظر (۱)
(جامعہ دہلی ۶۲ مارچ ۲۷۵۔۲۸۴)

یورپ اور امریکہ کا مسلسل سفر نامہ ہے

۱۶۰ مفتی محمد شفیع

رویت ہلال
(الفرقان لکھنؤ ۸۱ھ شعبان ۲۸۔۳۸)

رویت ہلال کی حقیقت اور چاند دیکھنے کے لئے آلات کے استعمال پر بحث کی ہے

ایڈیٹر : نجیب اشرف ندوی

پرنٹر پبلشر حامد اللہ ندوی نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا

نوائے ادب بمبئی

جلد ۱۳ | اکتوبر ۱۹۶۲ع | شمارہ ۴

شذرات

اردو دوست اصحاب اردو کے سلسلہ میں جیسے جیسے جذباتی دور سے گذرتے جاتے ہیں علمی و تعمیری حیثیت سے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے ہیں۔ اردو املاء کی اصلاح اور اعراب و مواقف کے تعین کے ساتھ ہی ساتھ طباعت کے ذریعہ اس کے حسن و افادیت میں اضافہ کی صورتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا ہے، آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھی اعراب کے سلسلہ میں کوششیں کی گئیں تھیں اور پھر وقتاً فوقتاً بعض افراد اور ان کے افکار کے مشوروں کی روشنی میں انجمن ترقی اردو نے اس طرف توجہ بھی کی تھی، لیکن افسوس کہ ہم نے اجتماعی حیثیت سے ان چیزوں کی جانب دھیان نہیں دیا اور یہ معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ اب ادھر ڈیڑھ دو برسوں سے یہ مسئلہ پھر جاذب توجہ ہورہا ہے، اس کے ساتھ ہی طباعت کے سلسلہ میں نہ صرف ٹائپ اور لیتھو کا جھگڑا ہے بلکہ بعض حلقوں سے لاطینی حروف اختیار کرنے کی صدا بھی بلند ہورہی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اب جب کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اپنا سالانہ اجلاس منعقد کررہی ہے اس کام کی طرف پورے خلوص و سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو کیوں کہ اسی ایک ادارہ کو اردو کے سلسلہ میں سب سے اہم، سب سے وقیع اور سب سے ہمہ گیر مقام حاصل ہے۔ اسے چاہئے کہ اب وہ ایک ایسی کمیٹی مقرر کرے جس میں اردو کے ملکی اداروں کے نمائندوں کے ساتھ مطبعوں او[ر] مکتبوں کے نمائندے بھی شریک ہوں اور اگر ممکن ہو تو اس سلسلہ میں ہندوستا[ن] سے باہر کی اردو دنیا سے بھی استصواب کیا جائے تاکہ جو فیصلہ ہو وہ سار[ی] اردو دنیا کے لئے ہو، یہ اردو کی تعلیم و تحریر کی یکسانی کا سب سے [illegible] کارنامہ ہوگا۔

اس سہ ماہی میں ہم کو تین ادبی و علمی حادثوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مو[لانا] حفظ الرحمن، جناب شاہد صدیقی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ہم[یشہ] دائمی جدائی ہے۔ مولانا حفظ الرحمن ایک مجاہد تھے اور حق کے لئے خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، لسانی ہو یا معاشی ہمیشہ سینہ سپر رہتے، اگرچہ ان کی گفتگو جذ[باتی]

گرمی سے خالی رہتی لیکن حق کا وزن و اثر اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا . وہ تمام عمر ہر محاذ پر حق کے سچے سپاہی کی طرح لڑتے رہے اور اسی جہاد نے ان کے جسم کو مجروح کردیا اور اس طرح اندرونی زخم کی صورت میں ان کو اپنی حق گوئی کی قیمت ادا کرنا پڑی. اردو زبان کی حفاظت و ترقی کے سلسلہ میں انہوں نے ہر وقت اور ہر مقام سے آواز بلند کی ، وہ انجمن ترقی اردو ہند کے ممتاز و جاندار رکن اور اس کے لئے باعث عزت تھے. افسوس کہ اردو کا یہ مجاہد جس میں ایک سچے انسان کی خوبیاں بھی موجود تھیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا.

شاہد صدیقی نے شاعر و ادیب کی حیثیت سے ایک خاص حلقہ میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا. ایک طرف انھوں نے اپنے اخلاق سے اپنے تمام ملنے والوں کو گرویدہ بنا لیا تھا تو دوسری طرف شعری دنیا کو اپنی طرف معترفانہ حیثیت سے متوجہ کرلیا تھا. ان کی اچانک موت ایک صدمہ ہے جس کا اثر بزم شعر و ادب اور حلقہ احباب میں دیر تک رہے گا.

ڈاکٹر زور کی خبر وفات ایک بجلی تھی جو گری اور اس نے اردو دوستوں کے صبر و قرار کو خاک میں ملادیا . وہ چند دنوں پہلے بمبئی تشریف لائے تھے ، اس وقت ان کی صحت میں کسی قسم کا کوئی اضمحلال نہ تھا مگر اس کے تیسرے ہی دن دوش برق پر سوار اس ہوشربا و غمناک خبر نے سکتہ کی سی حالت پیدا کردی. ڈاکٹر زور اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے نہ صرف علمی حیثیت سے ممتاز تھے بلکہ اردو کی توسیع و ترقی کا جذبہ جو ان کے سینہ میں موجزن تھا ، اپنا اظہار کرنے لگا تھا. ان کا وقت ، خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا انگلستان و فرانس میں اسی زبان کے گیسو سنوارنے میں گذرا. اردو ادب میں شاید ہی کوئی فن ایسا ہوگا جس پر انھوں نے کام اور وہ بھی کامیاب کام نہ کیا ہو. دکنی ادب کو دلی و لکھنؤ کے بوجود غلط ادعاء نے فراموش کردیا تھا اس کو ایک مرتبہ پھر زندہ کرنے کا سہرا بڑی حد تک انہی کے سر ہے. موجودہ لسانیاتی اصول پر زبان اردو کے مطالعہ کی کوشش میں بھی وہ پہلی صف میں نظر آتے ہیں. وہ ایک اچھے نقاد ، انشاء پرداز ، سوانح نگار ، مورخ ادب ، مرتب فہرست اور جفاکش اڈیٹر تھے . اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی ایک اور بڑی خوبی ان کی تنظیمی صلاحیت تھی ، جس کا بین ثبوت ادارۂ ادبیات اردو اور

آزاد اکیڈمی کی صورت میں ملتا ہے ۔ دوسروں کو ساتھ لےکر کام کرنے کا سلیقہ بھی خداوند تعالیٰ نے ان کو دیا تھا۔ ان کی حوصلہ مند روح ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہی، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بھاگ نگر کی رنگین فضا میں گزرا ، اس کے بعد سری نگر کی جنت ارضی میں انھوں نے قدم رکھا لیکن شاید ان کی ترقی پسند، حسن دوست طبیعت اس جنت ارضی سے بھی مطمئن نہ رہ سکی اور ایک قدم اور بڑھاکر وہ یکایک اصلی و دائمی جنت میں داخل ہوگئے ۔

مرحوم سے میرے تعلقات تقریباً تیس برس سے تھے ان میں زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ زیادہ استحکام و خلوص پیدا ہوتا گیا ۔ اب ایسے کام کے دھنی شاید کم ملیں گے ۔ ان کا نقصان صرف دکن کا ، صرف ہندوستان کا نہیں بلکہ ساری اردو دنیا کا نقصان ہے ۔

اللہ پاک ان تینوں مرنے والوں کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ عنایت فرمائے ۔

اس مہینہ کے آخر تک انشاءاللہ ادارہ کی دو کتابیں شائع ہوجائیں گی ۔ ان میں ایک «دیوان عزلت» ہے جسے ہمارے رفیق کار عبدالرزاق قریشی نے مرتب کیا ہے اور دوسری «لغات گجری» ہے ، جس کے متعلق خیال ہےکہ اردو کا سب سے پہلا لغت ہے اور گجرات میں مرتب ہوا ہے ۔ اسے راقم‌الحروف نے مرتب کیا ہے ۔

* پروفیسر ہارون خاں شروانی

اردو الفاظ کا رومن املا

میں ڈاکٹر گیان چند کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے مضمون میں، جو اسی موضوع پر اردو نامہ، کراچی، بابت اپریل تا جون ۱۹۶۲ع میں شائع ہوا ہے، میرے کتابچے «اردو رسم خط اور طباعت» کو مفید اور بصیرت افروز فرمایا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند ہندوستان کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر اردو دوستوں کو فخر ہے، اور ان کے قلم سے کتابچے کی بابت یہ الفاظ نکلنا میرے لئے تشکر اور امتنان کا باعث ہے۔ یہ ایک توارد ہے کہ جنوری ۱۹۶۲ع کے رسالہ نوائے ادب، بمبئی، میں اردو زبان کے مشہور مفکر جناب شہاب الدین دسنوی کا مضمون، «اردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ: ایک نئی تجویز» کے عنوان سے چھپا ہے۔ چند ہفتے ہوئے جناب دسنوی صاحب حیدرآباد آئے تھے تو انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے، مگر بد قسمتی سے میں اب تک اس بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میری دانست میں دونوں مضمون ایک اعتبار سے اردو رسم خط کی کم مائگی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ حروف علت اور علامات علت[1] کے لئے رومن علامتوں کا آسرا ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے علاج کے لئے دونوں فاضل مصنفوں نے رومن علتی حروف سے مدد لی ہے، مگر جہاں ڈاکٹر گیان چند نے اردو الفاظ کا صحیح اور علتی دونوں قسم کے رومن حرفوں کا سہارا لیا ہے وہاں دسنوی صاحب نے صحیح حروف تو اردو ہی کے رکھے ہیں

* جناب پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے ایل ایل سی ہمایت نگر حیدرآباد دکن۔

۱ میں ایسے الفاظ جیسے «مصوتے» اور «مصمتے» کو اردو زبان کے لئے بوجھل اور نامناسب سمجھتا ہوں۔

مگر علتی حروف اور علتی علامتوں کے لئے رومن حروف کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔

میں ڈاکٹر گیان چند صاحب کی اس رائے سے پوری طور پر متفق ہوں کہ بہترین رسم خط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی ہو صحت سے مراد صرف ایک ہی ہوسکتی ہے وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو، کسی زبان کی آوازیں اس زبان کے رسم خط کے ذریعے سے ادا کی جاسکیں۔ ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ کسی رسم خط میں لہجے کے اتار چڑھاو کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، گو معمولی بول چال میں بھی کسی لفظ پر زور دینے یا کسی لفظ کو ذرا جھٹکے کے ساتھ ادا کرنے سے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہوجاتا ہے۔ بہر حال کم سے کم یہ تو لازم ہے کہ رسم خط کے ذریعے سے صرف الفاظ کو صحیح طور پر ادا کیا جاسکے۔ اعراب محض مصنوعی علامتیں جو مختلف زبانوں کے مخارج اور ان کے باہمی ربط کو ظاہر کرنے کی غرض سے وضع کیگئی ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے حروف اور اعراب کسی ایک زبان سے ٹکر کھاتے ہیں تو اس زبان کے مخرجوں کے اظہار کے لئے یا تو یہ حروف بجنسہ قائم رکھے جاتے ہیں ورنہ ان کی آوازوں میں تبدیلی ہوجاتی ہے، اور بعض مرتبہ کسی زبان کی آواز دو دو تین تین حرفوں کو ملاکر اس مجموعے سے نکالی جاتی ہے ہمارے حرف ض کو لیجئے اس کا تلفظ اردو میں کچھ ہے، عربی میں کچھ، فارسی میں کچھ، سندھی میں کچھ۔ اسی طرح ق کا مخرج حجاز اور مصر میں جداگانہ ہے اور مصر میں مسجد کو مسگد کہتے ہیں اور اس کے عکس کی طور پر قاہرہ والے کہیںگے کہ ہم اس لفظ کا تلفظ مسجد کیوں کرتے ہیں! خود ہمارے ملک میں پنجاب میں ق کا تلفظ ک کیا جاتا ہے اور دکھنی عام طور پر اسے خاف۔ اور خ کو قے کہتے ہیں۔ دیوناگری श اور تلگو శ کا تلفظ شمالی ہند میں ش کا اور جنوبی ہند میں س کا کیا جاتا ہے مغربی زبانوں کو لیجئے۔ حرف t انگریزی میں ٹ، اطالوی اور دوسری جنوبی زبانوں میں ت، فرانسیسی خاص کر پیرس اور اس کے نواح کی زبان میں ت اور ٹ کے درمیان کی آواز کے لئے لکھی جاتی ہے۔

یہ حال تو صحیح حرفوں کا ہے علتی حرفوں کے تلفظ میں تو اس سے بھی زیادہ فرق نمایاں ہے۔ انگریزی زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، وہاں تو ہر علتی حرف کا تلفظ گویا ہر لفظ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ فرانسیسی میں u کا تلفظ «او» اور «ای» کے درمیاں ہوتا ہے، اطالوی اور جرمنی میں u پیش کا کام دیتا ہے، شمالی زبانوں میں پیش کے لئے اور دوسرا مخرج و کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ «مفرد آوازوں کے لئے دو حروف کا استعمال بے اصولی ہے» میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حروف کی حیثیت ایک حد تک محض معانی علامتوں سے زیادہ نہیں تو پھر دو یا دو سے زیادہ حروف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تاہم بہاد دو یا دو سے زیادہ حرف ایک دوسرے سے ادغام کے بعد اپنی اپنی حیثیت کو کھو کر گویا ایک ہی آواز کی علامت بن جاتے ہیں۔ مثال کی طور پر انگریزی میں بجائے اس کے کہ چ کی آواز کےلئے کوئی جداگانہ حرف بناکر انگریزی حروف تہجی میں اضافہ کیا جائے اس کےلئے عام طور پر ch لکھا جاتا ہے۔ یہ ch ایک جداگانہ آواز کی قائم مقام ہے اور اس میں گویا نہ c باقی رہتا ہے نہ h بلکہ دونوں کے ذریعے سے ایک نیا حرف بن جاتا جو نہ c کے آواز کا قائم مقام ہے نہ h کی آواز کا اسی علامت ci کی آواز فرانسیسی میں ش کی، اطالوی میں ک کی، اور جرمن میں ح کی ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ کسی خاص آواز کے اظہار کے لئے تین تین چار چار مفرد ملا دئیے جاتے ہیں اور یہ حرف اپنی اپنی آواز کھو کر ایک نئی آواز کے لئے ایک مدغم حرف بن جاتے ہیں، جیسے ش کے لئے اطالوی میں sci اور ج کے لئے جرمن میں tsch پہلی حالت میں s اور c اپنی اپنی حیثیت کو کھو دیتے ہیں اور sci گویا ایک نیا حرف بن جاتا ہے۔ اور دوسری شکل میں tsch مرکب ہوکر ایک نئے حرف کی جگہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح دیوناگری اور دوسری ہندی نما لپیوں میں سیکڑوں سندھیاں ہیں جن کے ذریعے سے دو یا دو سے زیادہ حروف کو ایک دوسرے سے ملا کر گویا ایک نئی آواز پیدا کردی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے میری دانست میں بھ، پھ، تھ، ٹھ، دھ، وغیرہ میں ب، پ، ت، ٹ، د، اور ھ اپنی اپنی اصل کو ایک حد تک کھو کر ایک نئی آواز اور نیا مخرج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ان آوازوں کے لئے جداگانہ مفرد حروف کے بوجھ کو کم کردیتے ہیں. بہت سے ناگری پریمیوں کا کہنا ہے کہ بجائے ख، घ، झ، ढ، اور ایسے ہی دوسرے نصف حروف کے لئے اگر क، ग، ज، ह، کے ساتھ ह کا ایک حصہ ملا دیا جائے تو ناگری حرفوں کی گنتی میں بہت کچھ کمی ہوجائے گی. ڈاکٹر گیان چند کا یہ فرمانا درست نہیں کہ چونکہ اردو رسم خط میں کھ، گھ، ٹھ، ڈھ، وغیرہ کے لئے دوسری مفرد علامتیں نہیں اس لئے ہم مخلوط شکلیں لکھنے پر مجبور ہیں. حقیقت یہ ہے کہ اردو لپی بنانے والوں کا یہ احساس ہے کہ نئی علامتیں بنانے کے بجائے انھوں نے ان آوازوں کو مخلوط حروف ہی سے لکھنے پر اکتفا کیا.

ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں کے مضمونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اعراب اور ہمارے علتی حروف خود ہماری زبان کی آوازوں کو ادا نہیں کرسکتے. ایک دقت یہ بھی پیش آتی ہے کہ ہماری زبان ایک حادث زبان ہے اور اسے دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کا خاص ملکہ حاصل ہے. جیسے کسی زمانے میں عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ اس میں آکر گھل مل گئے اسی طرح اب انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں کے لفظ اس میں شامل ہورہے ہیں، اور یہ رفتار روز بروز زیادہ تیز ہوتی جارہی ہے. اردو زبان کی ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہندی کے الفاظ کو اردو میں لکھنے کے لئے بعض جدید حروف اختراع کئے جیسے ٹ، ڈ، ڑ، لیکن بہت جلد ہی جدائی اختراع کا دروازہ بند ہوگیا اور اردو والے اپنی لپی کو اتنا مکمل سمجھنے لگے کہ وہ اردو حروف میں کسی قسم کی اختراع کا نام بھی سننے کے روادار نہیں رہے. سب سے بڑی دقت اعراب کے مسئلے حل کرنے میں پڑی. ہمارے اعراب اور علتی حرف نہ صرف غیر زبانوں کے اعراب کی تاب نہیں لاسکتے بلکہ وہ خود اردو کے بعض اعراب کو ہُو بہو تحریر میں لانے سے عاری ہیں. یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند اور دسنوی صاحب دونوں نے اعراب اور علتی

حروف دونوں کے صحیح تلفظ کے لئے « رومن » اور « بین قومی » علامتوں پر حصر کیا ہے۔

جناب شان الحق حقی نے اردو زبان کی آوازوں خصوصاً اعراب اور علتی آوازوں کا پورا مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اردو میں تیرہ « مصوتے » یعنی علتیؔ آوازیں ہیں گیان چند صاحب ان کی تعداد چودہ بتاتے ہیں۔ ہماری لیپی کی کم مایگی کی یہ کیفیت ہے کہ معمولی طور پر معروف اور مجہول کے تحریری اظہار میں فرق نہیں کیا جاتا اور زبر، زیر، پیش کی لمبی، وسطی، اور چھوٹی آوازوں کے لئے کوئی اعراب نہیں۔ اردو زبان کو پنجاب کا ممنون ہونا چاہئیے کہ اس نے نون غنہ کے لئے غیر منقوط « ں » اور مدغم « ہ » کے لئے « ھ » کو عام کردیا ہے، ورنہ پچاس برس پہلے تک تو مدغم اور غیر مدغم « ہ » کے درمیان فرق کرنا ناممکن تھا اور اب بھی اس صحت مند قاعدے کی کبھی پابندی کی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی جو انگریزی لفظ اردو میں آگئے ہیں ان میں متعدد ایسی آوازیں پنہاں ہوتی ہیں جن کے لئے ہمارے یہاں اعراب نہیں اور ان کی املا من مانی طرح سے کی جاتی ہے۔ cap کے « a » کو شمالی ہند اور پاکستان میں « کیپ » لکھا جاتا ہے اور جنوبی ہند میں « کیاپ »۔ اسی طرح pen میں e کی جو آواز ہے اس کے لئے اردو میں کوئی علامت نہیں

یہ دوسری مشکل تو اس وقت پیدا ہوگی جب ہم غیر زبانوں کے نامانوس الفاظ اردو میں لکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کوشش میرے نزدیک ناممکن عمل ہوگی جیسا کہ اوپر دکھایا جاچکا ہے کوئی ایسا حرف مشکل سے ایسا ہوگا جس کا تلفظ دو زبانوں میں یکساں ہو۔ رومن حروف کے لئے انگریزی کا سانچا ڈھونڈھنا ایسا ہی ہے جیسے اردو میں جو عربی حروف رائج ہیں ان کی آواز کے لئے عربوں کا سا تلفظ ڈھونڈھنا۔ اگر ہم ایسی علامتوں کے پیچھے پڑجائیں گے جو دو یا تین اہم یورپی زبانوں کے مخرج کو ادا کرسکیں تو ہمیں علامتوں کے ایسے گھنے جنگل میں سے گذرنا پڑے گا جس سے ہم کبھی بھی نہ نکل سکیں گے۔ پچیس برس کے قریب ہوئے اس وقت جامعہ عثمانیہ میں اس کی کوشش کی گئی تھی کہ مختلف زبانوں کے اعلام کو اردو کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس پر بہت کچھ محنت کی گئی اور علتی حروف ہی کے لئے نہیں بلکہ بعض صحیح حروف

کے لئے بھی دو تین یورپی زبانوں کے تلفظ کو اردو کا جامہ پہنانے پر وقت صرف کیا گیا. مگر انتہائی پیچیـــدگی اور تنوع کی وجہ سے یہ کوشش بالکل ناکام ثابت ہوئی۔

ہمیں اردو تحریر میں دو طرح کے بیرونی لفظوں سے سابقہ پڑے گا. ایک وہ جو ہماری زبان کا گویا جزو بن گئے ہوں اور دوسرے وہ اعلام اور دوسرے لفظ جو اتفاقاً ہماری تحریر میں آ جائیں۔ پہلے قسم کے لفظوں کو ایک طرح کی ٹکسالی شکل دی گئی ہے۔ Station کا صحیح انگریزی تلفظ تو Steyshn ہے مگر اسے اسٹیشن کہتے ہیں. اسی طرح Council کا انگریزی تلفظ Khownsl ہے مگر اسے محض کونسل کہتے ہیں۔ انگریز جب اپنے کسی لفظ میں علتی حرف کا تلفظ کرے گا تو وہ لازماً دو علتی آواز Dephthong سے ادا کرے گا مگر ہم اسے روا نہیں رکھتے۔ غرض غیر زبانوں کے جو لفظ ہمارا زبان کا جزو بن گئے ہیں ان کی بابت تو وہی مسئلے پیش آئیں گے جو خود اردو کے ٹکسالی لفظوں کی تحریر میں پیش آتے ہیں۔ باقی جو غیر زبانوں کے لفظ خصوصاً اعلام ایسے ہیں جو اردو سے بے گانہ ہیں ان کی بابت میری رائے ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے اصل لفظ کو کھوجا جائے اور اسے مسخ کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ انھیں ہُو بہو رومن حروف میں لکھ دیا جائے۔

مروجہ اردو رسم خط کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ جب تک ہم کسی لفظ سے پہلے سے آشنا نہ ہوں اس وقت تک اسے صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ سب سے پہلے صحیح حرفوں کے چار مجموعوں کو لیجئے۔ [۱] ح، ہ، [۲] ث، س، ص، [۳] ذ، ز، ض، ظ، [۴] الف، ع، همزه. اردو زبان میں ان میں سے ہر مجموعے کے حروف کا مخرج بالکل ایک سا ہوتا ہے اور تاوقتیکہ کوئی شخص ان کی ماہیت اور ان کے ماخذوں سے واقف نہ ہو اس وقت تک محض اس کے سننے سے اس کی املا سے متعلقؔ کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا. علتی حروف کی املا کی دقت صحیح حروف کی املا سے کئی گنا زیادہ دقت طلب ہے۔ ہم نے عربی زبان سے صرف تین اعراب، یعنی زیر، زبر، پیش، [فتحہ، کسرہ، ضمہ] لے لیے مگر اس کا خیال نہیں کیا کہ یہ تین اعراب اردو زبان کے چڑھاؤ کے لئے کافی نہیں ہوں گے، اور اردو میں ایسی بہت سی دوسری آوازیں بھی ہیں جن کا اظہار صرف

یہ تین اعراب نہیں کرسکتے۔ اس کے علاوہ ان اعراب کا تلفظ عربی میں معروف کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اردو میں یہ مجہول سمجھے جاتے ہیں ہم نے صحیح حرف کی حد تک ٹ، ڈ، ڑ، کا اضافہ کرلیا مگر اعراب میں جو اضافہ ہوا ہے وہ حال حال میں ہوا اور وہ صرف اتنا ہے کہ کھچی ہوئی آوازوں کے لئے الٹا پیش اور سیدھا زیر استعمال کیا جائے۔ ان کے علاوہ اعراب میں کبھی کسی اضافے یا ترمیم کی کوشش نہیں کی گئی اس کے برعکس ہم نے تنوین کو بھی اپنالیا اور اس کی وجہ اپنے رسم خط میں ایک اور دقت پیدا کردی اگر اردو لپی کے مؤسس اردو کی ضرورتوں کے پیش نظر صحیح حرفوں کی طرح علق علامتوں کا بھی اضافہ کرلیتے تو جو دقتیں اردو تلفظ کے اعراب میں پیش آ رہی ہیں ان میں بہت کچھ کمی ہوجاتی۔ دسنوی صاحب اور ڈاکٹر گیان چند «بہترین رسم خط» کی تعریف میں صحت کے علاوہ اس کے سہل ہونے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں ذرا ان لپیوں پر غور کیجئے جن کے رسم خط حال ہی میں بدلے گئے ہیں۔ ان میں ترکی، انڈونیشیا، اور ملایا پیش پیش ہیں۔ مگر پہل کرنے کا سہرا وسطی ایشیا کے سوویت جمہوریوں ہی کو حاصل ہے جنھوں نے ۱۹۲۰ ع میں ترکی اور فارسی رسم خط کی جگہ رومن حروف کو اختیار کرلیا اور چند علامات لگاکر ان زبانوں کو ان کے سانچوں میں ڈھال لیا ۱۹۲۰ ع سے ۱۹۳۶ ع تک ترکمنستان، ازبکستان، آذربائیجان، قزاقستان، وغیرہ میں ترکی اور فارسی کے لئے رومن حروف ہی رائج رہے، لیکن ۱۹۳۶ ع میں انھیں ان زبانوں کے لئے روسی حروف اختیار کرنے پڑے اور اب ارمنستان کے علاوہ سوویت روس کے جمہوریوں میں روسی رسم خط ہی کا رواج ہے۔

ترکی، اور اب حال میں انڈونیشیا اور ملایا نے بھی اپنے اپنے قدیم رسم خط کی جگہ رومن رسم خط اختیار کرلیا ہے ان تینوں ملکوں میں رسم خط کو آسان بنانے کے لئے تلفظی (phonetic) طریقے کو اختیار کیا ہے، یعنی بلا لحاظ حرف کی اصل کے، جیسے بھی ملک والے کسی لفظ کو بولتے ہیں اس طرح اس حرف کے لئے رومن حرف مقرر کیا گیا ہے مثال کے طور پر چونکہ ترکی میں ح کا تلفظ ح ہی کیا جاتا ہے اس لئے «یئی ترکچہ» یعنی نئے ترکی رسم خط (رومن) میں صرف h کو کافی سمجھا گیا ہے اور خ کے لئے کوئی علامت

نہیں۔ اس کے برعکس غ کا ترکی میں بہت کچھ استعمال ہے اور اس کے
Ğ کا حرف رکھا گیا ہے۔ اس طرح چ کے لئے c (جو اس آواز کی ہین قو
علامت ہے،) ج کے لئے ç ، ڈ ترکی میں معقود ہے اس لئے د کے لئے d ہ
اور علتی حروف اور علامتوں کے لئے رومن علتی حروف یا .. لگاکر تر
زبان کی ضرورتیں پوری کی گئی ہیں۔ اس طرح طباعت کی اغراض کے لئے ہ
۶۷۱ علامتوں کے فرمے کے (جن کی عربی رسم میں ضرورت تھی) اب رو
ترکی رسم خط کے فرمے کے لئے ۱۰۰ علامتوں کی ضرورت باقی رہ گئی ہ
ترکوں نے اپنی زبان کی کسی آواز کے لئے مخلوط حروف کی ضرورت نہیں سمجھ
مگر انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں مخلوط اور مدغم حروف کو بھی استعما
کیا گیا ہے۔

اس تفصیل کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ ہم خود اردو زبان کو بعد
خاص حالات میں رومن املا میں لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ اس
ایک مطلب یہ بھی ہے کہ غیر زبان والوں کے لئے اردو تلفظ کو پیش
جائے اس لئے جہاں تک ہوسکے نئی علامتوں میں پیچیدگی پیدا نہیں کرنی چاہ
ورنہ جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا ہمارا موجودہ رسم خط نقطوں
شوشوں سے بھرا پڑا ہے اور یہ نقطے محض بے کار نمائشی چیز نہیں بلکہ حرو
کا جزو ہیں، چنانچہ اردو کی رومن املا میں بھی نقطوں اور شوشوں کے ذریع
سے بعض حروف کو دوسرے حروف سے ممتاز کیا جاسکتا ہے۔

پہلے صحیح حرفوں کو لیجئے دسوی صاحب نے جو اسکیم پیش
ہے اس میں صحیح حرفوں کی موجودہ شکلیں برقرار رکھی ہیں اور علتی حرو
کے لئے رومن شکلیں اختیار کی ہیں۔ جو مثالیں دسوی صاحب نے دی ہیں ان
ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی عبارت لکھنے پڑھنے میں بہت تکلف ہوگا۔ رو
حروف کی کشش بائیں سے دائیں طرف اور اردو حروف کی کشش دائیں س
بائیں کو ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ڈیشوں اور الٹے واو سے بھی جو ٹھہراو کی علام
قرار دی گئی ہیں اور جو ہر لفظ کی املا کا گویا جزو بنادی گئی ہیں لفظ دو
بلکہ چوگنی جگہ گھیرلیںگے۔ ایک معمولی لفظ «کتاب» کو «ک i ت a ب
لکھا گیا ہے! اس کے کمپوز کرنے لکھنے اور پڑھنے ہر کام میں دقت ہوگی ا

طباعت کے لئے حروف کا فرق دوگنا چوگنا رکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر گیان چند کی اسکیم منطقی اعتبـار سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں صحیح اور علتی دونوں قسم کے حروف کے لئے رومن حروف کو ترجیح دی گئی ہے اور نفس حروف کے لئے صحیح حرف کے ساتھ h کا اضافہ کیا گیا ہے۔ نیز ٹ، ڈ، ڑ کے لئے بنیادی حرفوں پر نقطے لگائے گئے ہیں جیسے ṭ، ḍ، ṛ، لیکن انہوں نے ن، گ، کے لئے ایک خاص علامت ŋ کا اضافہ کیا ہے حالانکہ اس کےواسطے ng عام فہم بھی ہوگا اور ن، گ، کی مخصوص آواز پر حاوی بھی۔ اس طرح ش کے لئے š، ژ کے لئے zh، اور غ کے لئے (لا کی جگہ جس سے بے کار التبـاس ہوگا) gh، کافی ہوگا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے بعض آوازوں کے لئے بڑے رومن حرف اور بعض کے لئے چھوٹے رومن حرف کیوں تجویز کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ طباعت کا کرشمہ ہو۔ سہولت تو اس میں ہے کہ رومن اردو میں بڑے حروف capital letters بالکل استعمال نہ کئے جائیں۔

اس طرح صحیح اور نیم صحیح حروف کی رومن شکلیں یہ ہونگی:
الف a، ب b، پ p، ت t، ٹ ṭ، ث س ص s، ج j، چ c، ح • h، خ x،
[یہ بین قومی علامت ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے خ کے لئے یہی علامت رکھی ہے]
د d، ڈ ḍ، ذ ز ظ ض، z، ر r، ڑ ṛ، ژ zh، ش sh یا ṣ، ع کے لئے الٹا پیش،
غ gh، ف f، ق q، ک k، ل l، م m، ن n، و w۔

علتی حروف کے اتار چڑھاو کی رعایت سے کچھ نئی علامتیں نکالنی پڑینگی، زبر کے لئے سادہ a زیر کے لئے سادہ i، پیش کے لئے سادہ u کے بارے میں بحث کی کوئی گنجایش نہیں۔ کشیدہ آوازوں کے لئے انھی حروف پر ایک چھوٹی سی لکیر کردی جائے تو جگہ بھی نہیں گھرے گی اور کام بھی نکل جائے گا جیسے ā، ī، ū۔ یہ تو چھ اعراب ہوگئے۔ ان کے علاوہ اَے اَو کے واسطے آسانی اس میں ہےکہ ان کا اظہار ai اور au سے کیا جائے۔ اب یائے مجہول اور و مجہول کو لیجئے۔ ان کے لئے e اور o مناسب ہونگے اور انہیں کھینچ کر پڑھا جائے جیسے [دیر اور روز] تو ان آوازوں کے لئے e اور ō کو خط کشیدہ لکھا جاسکتا ہے، جیسے rōz, dēr جس حرکت کو دسنوی صاحب واو اوسط کہتے ہیں اور جن کی

مثالیں انہوں نے ڈوپٹہ اور عہدے سے دی ہیں وہ اصل میں او کشیدہ ہی کی مثالیں ہیں اور انہیں dopatta اور ohda لکھا جائیے گا. اب صرف ایک حرکت اور رہی جسے دسنوی صاحب اے اوسط کہتے ہیں اور جو «پہلا» کی پ اور «محفل» کی م کے اعرابوں سے ملتی ہے. اس کے لئے ایک نئی علامت نکالی جاسکتی ہے جس سے زیادہ جگہ بھی نہ گھرے اور تلفظ بھی ادا ہوجائے اور وہ دونقطوں والی e ہے، جیسے pëhla اور mëhfil .

اس طرح بغیر کسی بڑے اختراع کے اردو علتی حروف اور اعراب کی رومن شکلیں یہ ہوئیں :-

a، ā، i، ı، u، ū، ai، au، e، o، ē

اس اسکیم کے بموجب ڈاکٹر گیان چند کی علامات ū، u، n، e، ɔ، Ɛ، سے واسطہ نہیں پڑے گا اور بین السطور جگہ بڑھنے کا بھی اندیشہ نہیں رہے گا.

آج کل بہت سے اردو رسالوں میں خط کی اصلاح اور اسے رومن حروف کے سانچے میں ڈھالنے کی طرح طرح کی اسکمیں نکل رہی ہیں. اس بارے میں دو باتیں نہایت ضروری ہیں: ایک تو یہ کہ ہم فی الفور اس دقیانوسی طرز طباعت کو خیر باد کہیں جسے لیتھو کہتے ہیں. دنیا بھر میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جسے لیتھو میں چھاپا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے بہترین اخبار، کتابیں رسالے بدتریں طور پر طبع ہوتے ہیں. دوسرے اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے چیدہ چیدہ اہل فکر سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ طے کریں کہ اردو زبان کے لئے رومن املا میں کیا کیا تصورات کئے جائیں کہ دوسری بیسیوں بلکہ سیکڑوں زبانوں کی طرح اردو بھی بشرط ضرورت اس لپی میں ڈھل سکے. اگر اس قسم کا اجتماع نہ ہوا اور کوئی متفقہ اسکیم نہ نکلی تو بڑے سے بڑے مفکروں اور دانشوروں کے بہترین خیالات صدا بصحرا ثابت ہونگے.

وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور کسی کا انتظار نہیں کرتا. کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم اردو رسم خط کو سہل اور کارآمد بنانے کے لئے بٹھیں تو اس وقت یہ انکشاف ہوکہ اردو پڑھنے والے ہی نہیں رہے. اب اس کے رسم خط پر غور کرنے سے کیا فائدہ!

* ایم. اے. حفیظ

امثال و اقوال

(۲)

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جتنے فسادات یا جھگڑے ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر « غلط فہمی اور بدظنی » کا ہاتھ ہوتا ہے، یہ بات شخصی زندگی سے لے کر ملک و قوم پر بھی عائد ہوتی ہے، اس لئے غلط فہمیوں سے بچنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی پر کم سے کم بھروسہ کیا جائے، اور اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرے. غلط فہمی کی جڑ بدظنی اور برا برتاؤ ہے. عقل مند کم سے کم بولتا ہے لیکن بات تول کر کرتا ہے ذیل کے اقوال اس چیز کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں.

بدظنی اور گرد بینی

۱ « عاقل کو اگر اپنی بہبودی، عمردرازی اور خوش بختی منظور ہے تو کسی پر بھروسہ نہ کرے. » [پنچ تنتر]

۲ « کمزور بھی اگر بدگمانی اپنا شیوہ کرے تو قوی سے قوی اس کو ہلاک نہیں کرسکتا اور زور آور اگر نیک ظن ہو تو کمزور اس کو حاسد مار ڈالتا ہے. » [پنچ تنتر]

۳ « جس دشمن سے پہلے کبھی لڑچکا ہو وہ اگر دوست بھی ہوجائے تو اس پر اعتماد نہ کرے. » [پنچ تنتر]

۴ « عاقل کو چاہئیے کہ اپنا مال کسی کو نہ دکھائے مقدار میں وہ کیسا ہی کم کیوں نہ ہو، کیوں کہ مال کو دیکھ کر جوگی کے دل میں بھی ہلچل پڑجاتی ہے. » [پنچ تنتر]

۵ « زور آور سے لڑنا کمزور کی موت کا باعث ہوتا ہے. مثلاً جس پتھر سے

---

* جناب ایم. اے. حفیظ، دار الشفاء، حیدرآباد ۲ (دکن)

ہانڈی ٹوٹ جاتی ہے وہ کھڑے کا کھڑا رہتا ہے۔ [پنچ تنتر]

٦ جو شخص ایسے کام میں دخل دیتا ہے جس سے اسے کچھ سروکار نہ ہو وہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے، جیسے وہ بندر جو پچڑ کو نکال لیتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۷ سمجھدار آدمی تھوڑے کے پیچھے بہت کو نہیں گنواتا ہے اس دنیا میں دانائی یہ ہے کہ تھوڑا گنواکر بہت کو بچائے۔

۸ جو یقینی کو چھوڑ کے مشکوک کے پیچھے دوڑتا ہے وہ یقینی اور مشکوک دونوں سے منہ موڑتا ہے۔ [ہتھوپدیش]

۹ برے کام پر کمر باندھنا، کسی عزیز سے دشمنی رکھنا، جو اپنے سے طاقتور ہو اس سے مقابلہ کرنا اور عورتوں پر بھروسہ کرنا یہ موت کے چار کھلے دروازے ہیں۔ [ہتھوپدیش]

۱۰ اس دنیا میں عاقل سے جب کوئی سوال پوچھا جائے تو اس کو بیدھڑک ہوکر بولنا چاہئے جب کوئی نہ پوچھے تو بولنا ایسا ہے جیسا جنگل میں رونا۔ [پنچ تنتر]

۱۱ جو سودائی کسی ایسے شکاری سے بات کرے جس کی محنت رائگاں گئی ہو یا کسی ایسے احمق سے جو مصیبت میں گرفتار ہو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے اوپر آفت نازل کرتا ہے۔

۱۲ تیر کا چھدا گھاؤ بھر جاتا ہے، تلوار کا کٹا زخم اچھا ہوجاتا ہے، پر بدزبانی کا ایک لفظ نفرت کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے۔ جو زخم تیغ زبان کے وار سے پیدا ہو وہ کبھی مندمل نہیں ہوتا۔

لیکن ان اقوال میں اس بات پر اہمیت دی گئی ہے کہ زندگی کو سکھی بنانے میں انسان کو ایک خاص قسم کی احتیاط لازمی ہے یہ احتیاط زبان و عمل دونوں پر منطبق ہوتی ہے۔ محتاط آدمی اپنی زندگی کو الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے اور بے احتیاط آدمی نئی نئی اور غیر ضروری مشکلات اپنے اوپر عائد کرلیتا ہے۔ زندگی کا سفر بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، نت نئی الجھنوں، بدنظمیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا ایک کامیاب زندگی کے لئے شرطِ اول

ہے ۔ حکماء اور دانشمندوں نے ہمارے لئے ایسے نشانِ راہ چھوڑ دئے ہیں جن پر عمل کرنے سے افراد و اقوام ایک پرسکون زندگی گذارسکتے ہیں اسی لئے غور و فکر انسان کا وہ ہتھیار ہے جس کا وار کبھی اوچھا نہیں ہوتا بلکہ ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو مثبت اقدار کی رہنمائی کرتے ہیں ۔

دنیا کے بہت سے کام صبر و شانتی سے انجام پاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ « صبر تلخ است و لیکن بر شیریں دارد ۔ » اور یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ جو شکر سے مرسکتا ہے اسے زہر کی کیا ضرورت ہے ۔ اس لئے نرمی و ملائمت سے جو بات بن سکتی ہے اور اتحاد و اتفاق سے جو کام آسانی سے نکل سکتے ہیں وہ نفاق اور تردد سے انجام نہیں پاسکتے ۔ دوستی اور اتحاد میں بڑی طاقت ہے اور آپس میں صلح و آشتی ایک انمٹ جوہر ہے اس لئے دانشمند چند مشورے اقوال کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں جو درج ذیل ہیں ۔

صبر اور شانتی

۱ جو لوگ کار پردازی میں ماہر ہیں ان کو لازم ہے کہ ہر معاملہ میں اول ملائمیت سے کام لیں کیوں کہ جو کام ملائمیت سے طے ہوتا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں پڑتی ۔ [پنچ تنتر]

۲ انسان کے لئے اتحاد سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی خصوصاً کسی دوست کے ساتھ ۔ جب دھان کا چھلکا اتر جاتا ہے تو اس سے کچھ اگتا نہیں ہے [پنچ تنتر]

۳ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اکٹھا ہونے سے بڑا نتیجہ پیدا ہوتا ہے ۔ گھاس کے پتے جب بٹ کر رسی بن جاتے ہیں تو اس سے مست ہاتھی بھی بندھ سکتا ہے ۔ [ہتھوپدیش]

یہ مختصر اور زرین امثال آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کیونکہ یہ مشکل مسائل کے حل کرنے میں بڑے خلوص کے ساتھ مدد دیتے ہیں ۔ ان کو اپنانا مشکل ہے لیکن ان پر عمل کرنے سے کھرے اور کارآمد نتیجے برآمد ہوتے ہیں ۔ جس نے صبر و تحمل کا ساتھ دیا اور اتحاد و اتفاق سے کام لیا اس کا بیڑا پار ہے اور اس کی راہ میں کانٹے کم اور پھول زیادہ ہیں ۔ اس کی زندہ مثال ہمارے دیش کی آزادی ہے ۔ مہاتما گاندھی نے جس صبر و تحمل اور صلح و آشتی سے

کام لےکر ملک کو غیروں کے پھندے سے بچایا وہ بے مثال ہے ۔ عدم تشدد اور اہنسا کے استعمال نے دنیا میں ایک مثال قائم کردی کہ حق کی حفاظت بغیر ایک قطرہ خون بہائے بھی ہوسکتی ہے۔ ایک ، دو نہیں چالیس کروڑ انسانوں کے حقوق کی حفاظت وہ بھی بغیر جنگ و جدال کے ایک معجزہ سے کم نہیں۔ جو صرف صبر و تحمل، اتفاق و اتحاد کا ایک مظاہرہ ہے ۔ مہاتما اور ان کے ساتھیوں کو اپنے اس بے ہتھیاری کے ہتھیار پر پورا پورا بھروسہ تھا اور جب یقین ایمان کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو کامیابی خود قدم چوم لیتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ باپو کی زندگی امر ہوگئی جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے ۔

ایک شاعر کا قول ہے کہ

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

تسخیر قلوب اسم اعظم سے کم نہیں ہے ۔ دلوں کو توڑنا جتنا آسان ہے ان کو جوڑنا اتنا ہی مشکل امر ہے لیکن انسانی پیدائش کا مفہوم بھی یہ ہے کہ انسان، انسان سے محبت کرے۔ مگر یہ کام بہت محال و مشکل ہے کیوں کہ انسان کی طبعیتوں میں تضاد پایا جاتا ہے اس لئے تسخیر قلب حاصل کرنا ہو تو طبعیتوں کے رجحان کا اندازہ لگانا ضروری ہے ۔ بخیل کی دلجوئی روپیہ ، پیسہ سے ، ضدی آدمی کی اطاعت سے ، اور دولت مند کی خوشامد سے ، دل دہی کی جاسکتی ہے اور اسے قابو میں لایا جاسکتا ہے لیکن دلوں پر فتح پانے کے لئے ذیل کے اقوال ہمارا راستہ معین کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے ۔

تسخیر قلب

۱ ہر ایک شخص سے اس کی طبعیت کے مناسب سلوک کرنا چاہئیے ۔ جب عاقل کو کسی دوسرے کے خیالات جذبات پر عبور ہوجاتا ہے تو وہ بہت جلد اس کو اپنے قابو میں کرلیتا ہے ۔ [پنچ تنتر]

۲ دوست کی دلجوئی اچھے جذبات سے ہوتی ہے ، والدین کی ان کی حرمت کرنے سے ، عورتوں اور نوکر چاکروں کی تحفہ تحائف دینے سے اور رعایت کرنے سے اور اوروں کی اپنے سلیقہ سے ۔ [ہتوپدیش]

۳ بخیل کی دلجوئی روپیہ سے کرنی چاہئیے ۔ سخت گیر آدمی کی اطاعت سے ،

جاہل کی ملائمیت سے اور تعلیم یافتہ آدمی کی کشادہ دلی سے ۔ [پنچ تنتر]

تالیف قلوب کی اہمیت مسلم و مقدم ہے اور اس راستہ میں جو بھی مشکلات پیدا ہوتے ہیں اس عظیم مقصد کے لئے انہیں گردِ راہ سمجھنا چاہئیے ۔ دلوں کے اتحاد سے بگڑی بات بن جاتی ہے ، ہر آدمی کچھ نہ کچھ انسانی نفسیات سے واقف ہوتا ہے اور یہ ایک نفسیاتی عمل ہے کہ کس طرح دلوں میں جگہ پیدا کی جاسکتی ہے ۔ بعض مرتبہ مخلص بھی دھوکہ کھا جاتا ہے اور بہت بخیر ہونے کے باوجود بھی اپنے نفسیاتی علم کی کمی کی وجہ سے وہ دوسرے کا دل توڑ بیٹھتا ہے اس لئے اس نازک معاملہ میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ۔

دنیا خود ایک مکر و فریب کی جگہ ہے اور یہاں کے کاروبار زیادہ تر سیاست اور مکاری سے آسانی کے ساتھ انجام پاتے ہیں ۔ فطرت پر بھی ہم غور کریں ، تو اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ شکاری کو تھوڑے بہت فریب سے کام لینا ضروری ہے ورنہ وہ شکار سے محروم رہے گا بہ الفاظ دیگر یہی دنیا سازی ہے اور یہی دنیا کی ریت ہے ۔ صاف باطنی ایک اچھی صفت ہونے کے بعد بھی ہرجگہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتی کیوں کہ وہ ایسا آئینہ ہے جس میں ہر صورت حال کی تصویر اصلی شکل میں ظاہر ہوجاتی ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے محاسن کو بڑھا چڑھاکر دیکھ سکتا ہے لیکن نقائص و عیوب سے منہ موڑ لیتا ہے اور بنتا کام بگڑ جاتا ہے ۔ اس لئے وہ ہتھیار ہی کیا جو اپنے وار کو کھودے اس لئے دنیاوی کاموں میں تھوڑا بہت مکر و فریب ناگزیر ہے ، یہ پرانی ریت ہے جو ہر عہد اور ہر زمانے میں کارگر ثابت ہوئی ہے ۔ اس لئے کہ شوگر کوٹیڈ (Sugar Coated) کونین حلق سے اتر سکتی ہے لیکن سادہ کونین کا پینا محال ہوجاتا ہے ۔ ذیل کے مقولے انسانی فطرت کی اس کمزوری یا خوبی کی گواہی دیتے ہیں ۔

صاف دلی اور مکر و فریب

۱ صافؔ دلی جوگیوں ہی کے لئے بہت خوب ہے جو ہمیشہ دھیان میں مصروف رہتے ہیں مگر جو دولت کے طلب گار ہیں ان کے لئے اور خصوصاً بادشاہوں کے لئے نازیبا ہے ۔ [پنچ تنتر]

۲ جو شخص عورت سے ، دشمن سے ، یا نالائق دوست سے ، صاف باطنی کرے وہ زندہ نہیں رہتا ۔

۳ مینڈھا جب پیچھے ہٹتا ہے تو حملہ کرنے کو۔ شیر ببر بھی جب غصہ میں سکڑ جاتا ہے تو جست کرنے کی نیت سے، جب عاقل کے دل میں عداوت بھری ہوتی ہے اور وہ خفیہ طور پر سونچتارہتا ہے تو حب کوئی منصوبہ وہ ٹھان لیتا ہے تو اس کو ہر چیز کی برداشت ہوتی ہے۔ [ہتوپدیش]

۴ جس عاقل میں یہ مادہ ہو کہ جس سے وہ مخاطب ہوا کرے اس کی طبیعت کو فوراً پہچان جائے وہ جلد اپنی حکومت اس پر جما لے گا۔ [ہتوپدیش]

لیکن باوجود ان اقوال کی اہمیت کے مکر و فریب کا حد سے گذر جانا خود شکاری کو شکار بنا دیتا ہے اور اپنی مقصد برآری کے لئے جو کنواں وہ دوسروں کے لئے کھودتا ہے خود اسی میں گرجاتا ہے۔ کیوں کہ نظام کائنات میں ہر چیز میں توازن لازمی ہے اس توازن کو قائم رکھنے کے لئے جو بھی حربے استعمال کئے جائیں وہ متناسب و متوازن ہوں ورنہ شکر جیسی میٹھی چیز جب حد سے زیادہ کسی شئے میں ڈالی جاتی ہے تو اس کو کڑوا کردیتی ہے۔ انار کی مٹھاس ہی اس کے اندر کیڑے پیدا کرتی ہے اور مکاری و دنیا سازی ایسا حربہ ہے جو وقتی طور پر دنیاوی کاموں کو بنا ڈالتا ہے لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ منفی کو مثبت سے بدل دے۔

روایت ہے کہ نیپولین نے اپنی لغت سے ناممکن کے لفظ کو نکال دیا تھا کیوں کہ انسان کی ہمت اور ارادہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو باوجود دشوار گزار راستوں پر سے جانے کے اسے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ثابت قدمی اور استقلال جو اٹل قانون ہیں کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھتے۔ اسی کی بدولت انسان نے زمین کے چپہ چپہ کا نشان دریافت کیا، ہوا و پانی کی قوت کو آزمایا، ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر ٹین سنگھ نے جھنڈا گاڑ دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ تیمور جب اپنے ملک میں ناکام و نامراد ہوکر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا تو اس نے ہمت و استقلال کا سبق ایک چیونٹی سے سیکھا تھا۔

تیمور نے ایک مورچہ زیرِ دیوار دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سر بام لے کے پہنچا مشکل نہیں پیش ہمت دشوار

پایہ ثبات اور استقلال کی کہانی انسانی ارتقاء کی کہانی ہے جس کا عزم اور ہمت جوان ہو وہ ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ اس باب میں چند مقولے پیش کئے جاتے ہیں۔

ثابت قدمی اور ہمت

۱ کسی کام کا شروع کرنا عقلمندی کی پہلی نشانی ہے اور جو کام شروع ہوچکا ہو اس کو اختتام پہونچانا دانشمندی کی دوسری نشانی ہے۔ [پنچ تنتر]

۲ کاروبار میں کامیابی کوشش سے ہوتی ہے نہ مراد مانگنے سے۔ سوتے شیر کے منہ میں ہرن آپ سے آپ نہیں بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ [پنچ تنتر]

۳ وہ کونسا بوجھ ہے جس کو طاقتور نہ اوٹھاسکے؟ کونسی مسافت ایسی لمبی ہے جسے ہمت والا طے نہ کرسکے؟ تعلیم یافتہ آدمی کے نزدیک کونسا ملک بالکل اجنبی ہے؟ جو ملائمت سے بات کرے اس کا کون دشمن ہے۔ [پنچ تنتر]

۴ جس آدمی کا دل مضبوط ہو وہ بدوں دولت کے بھی دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے اور لوگ اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ ضعیف آدمی کے پاس کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو لوگ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ [پنچ تنتر]

۵ جو شخص کسی بلا میں مبتلا ہوجائے اور اس حالت میں اس سے سوائے بیہودہ گلہ شکوہ کے کچھ نہ ہوسکے تو اس کی مصیبت بڑھتی ہی جائے گی اور کبھی ختم نہ ہوگی۔ [پنچ تنتر]

لیکن دنیا کے بڑے بڑے کام ہمت و استقلال کے رہین منت ہیں۔ شہسوار وہی ہے جو گرنے کے باوجود اٹھ کر کمر ہمت باندھ لیتا ہے۔ ناکامی اس کا منہ چڑاتی ہے لیکن وہ کامیابی کی طرف رواں دواں ہے جب وہ اس جذبہ پر فتح پا لیتا ہے تو اس کے عزم و ارادے کی کہانی اس کی زندگی بن جاتی ہے اس لئے یہ امثال و اقوال زندگی کی راہوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور آج کے انسان کے ارادوں کی داد دیتے ہیں کیونکہ بیسویں صدی کا نوجوان اپنے ہمت و ارادے کی مستقل مزاجی کی وجہ سے کائنات خلا پر فتح پانے کے خواب کو پورا کردیا ہے۔ اس کا اگلا قدم چاند و مریخ پر ہوگا کیا ایک بزدل سے یہ کام ممکن ہے؟ نہیں! یہ کام تو صرف باہمت لوگوں کا ہے کہ عدم کو وجود میں لائیں۔ اور خلا کو پر کریں۔

انسانی جذبات میں غصہ ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس میں انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی اور اس سے ایسے افعال سرزد ہوجاتے ہیں جو کہ وہ خود کرنا نہیں چاہتا ہے، اسی لئے غصہ کو حرام کہا گیا ہے۔ جہاں تک ہوسکے انسان کو اپنے آپ پر قابو پانا چاہئے تاکہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کے لئے بعد میں اس کو پشیمان ہونا پڑے غصہ میں اکثر نقصان ہی ہوا کرتا ہے۔ فائدہ کی کم امید رہتی ہے۔ پھر بھی ہر جاندار کے لئے غصہ اس کے بچاؤ کا ہتھیار ہے لیکن یہاں بھی یہی سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ غصہ کا حد سے گزر جانا کسی قیمت میں مفید نہیں۔ ذیل میں چند امثال دئے جاتے ہیں جو غصہ کی منفی حیثیت کو پیش کرتے ہیں۔

غصہ

۱　شہد کی مکھی جب غصہ میں جھلائی ہوئی اس رس کی لالچ میں جو اس کے چھتہ کے اندر ہوتا ہے منڈلاتی پھرتی ہے اور ہاتھی کو ڈستی ہے تو ہاتھی گوکہ بہت طاقتور ہے غصہ نہیں کرتا۔ جو زور آور ہوتا ہے وہ جب ہی جھنجھلاتا ہے جب اس کے مقابل والا زور میں اس کے برابر ہو۔　[پنچ تنتر]

۲　کمزور کا غصہ اس کی بد بختی کا باعث ہوتا ہے۔ جو پتیلی آگ میں حد سے زیادہ دہک جاتی ہے اس کے اپنے ہی کنارے اکثر جل جایا کرتے ہیں۔
[پنچ تنتر]

۳　جو شخص آزار رسانی نہ کرسکتا ہو وہ اس دنیا میں کیوں ایسی بیہودہ حرکت کا مرتکب ہوتا ہے جیسے غصہ کرنا۔ مٹر کے دانے کو جب تلتے ہیں تو وہ ناحق اچھلتا ہے، اس سے کڑاہی نہیں ٹوٹ سکتی۔　[پنچ تنتر]

۴　جب کوئی ڈھیٹھ کتا پہاڑ پر بھونکتا ہے تو کس کا کچھ بگڑ جاتا ہے پہاڑ کا یا کتے کا (؟)۔　[پنچ تنتر]

لیکن غصہ کی آگ کے شعلے جب بھڑک جاتے ہیں تو ان کو بجھانا مشکل ہوجاتا ہے اس لئے اپنے آپ سے انصاف کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس آگ کو مشتعل ہونے سے بچایا جائے کیونکہ غصہ دو دھاری تلوار کا کام کرتا ہے اس کی زد میں وقت واحد میں دونوں فریق آجاتے ہیں۔ اسی لئے دانشمندوں نے

اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا. مگر غصہ سے بالکل محروم ہوجانا بھی بزدلی کی نشانی ہے. ہر خوددار و غیور طبیعت یہ کبھی گوارا نہیں کرتی کہ اس کی حق تلفی ہو یا اس کی ہتک و ذلت ہو اور اس کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے یہ ایک ناممکن العمل بات ہے اس لئے انسانی فطرت کو غصہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا. پھر بھی اس کے حدود غیر متوازن نہ ہوں ورنہ نتیجہ غیر مفید رہیگا. غصہ افراد و اقوام دونوں کے لئے زہر ہے گو زہر کبھی کبھی تریاق کا کام بھی کرجاتا ہے.

رقیب مد مقابل ہوتا ہے، یہاں دونوں فریق کے جذبات میں ٹکراؤ ہونا ضروری ہے. جس کے نتیجہ میں برتن بھی کھنکھنا اٹھتے ہیں اور پھر انسان انسان کے مقابل کھڑا ہوجاتا ہے. رقیب سے مقابلہ کی صورت میں جذبات کا مشتعل ہوجانا فطری ہے. بڑی بڑی ہستیاں اس مقابلہ میں سوکھی ٹہی کی طرح ٹوٹ کر گرجاتی ہیں. اردو شاعری رقیب کے گلے شکوہ سے بھری پڑی ہے. مقابل کمزور ہو یا طاقت ور، بھلا ہو یا برا، حسین ہو یا بد صورت، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، مستعد ہو یا نکما، ہر صورت میں قابل برداشت نہیں ہوسکتا وہ جو مقولہ ہے «اپنی آنکھ کا شہتیر اور دوسروں کی آنکھ کا تنکا» والی بات یہاں صادق آتی ہے. ہر چھوٹی بات بڑی بن جاتی ہے اور کبھی بڑی بات بھی چھوٹی بن جاتی ہے. انسانی فطرت کے آبگینہ کو رقابت کی ٹھیس کچھ ایسی دردانگیز ہوتی ہے کہ آبگینہ کے آنسو بہہ جاتے ہیں. یہ جذبہ انسانی جذبات کے نازک ترین گوشہ سے تعلق رکھتا ہے. رقابت میں انسان حد درجہ حساس بن جاتا ہے اس کی مثال اس شمع کی مانند ہے جو اپنی ہی تپش میں آپ گھل جاتی ہے اور بھڑک بھی نہ سکے. ان احساسات کی تشریح ذیل کے اس ایک مقولہ ہی سے کی جاسکتی ہے

رقابت

۱ عالم جاہل کو کراہت سے دیکھتا ہے. امیر غریب کو، پرہیزگار بے دین کو، پارسا عورت فاسقہ کو. [پنیچ نستر]

رقیب کی تائید میں چند شعر درج ذیل ہیں.

۱. تجھے وہ شاخ سے توڑیں رہے نصیب تیرے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب تیرے [اقبال]

۲ رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں [غالب]

۳ سرمہ رقیب جب سے بنا ان کی آنکھ کا
آنسو کی طرح گر پڑے ان کی نظر سے ہم [نا معلوم]

۴ کھی ہے مجھ سے کھی ہے رقیب سے وعدہ
خجل کرے نہ کسی دن تری زبان تجھکو [حلیل]

۵ رقیب تھا وہ مرا رازداں کے دھوکے میں
ہماری حان گئی پاسباں کے دھوکے میں [احتر]

۶ حدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہو رقیب حدا
ہے اپنا اپنا مقدر حدا نصیب جدا [ذوق]

۷ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آحر تھا جو رازداں اپنا [غالب]

۸ حور رقیب آحر و ظلم فلک کا نہیں خیال
تشویش ایک حاطر نامہرباں کی ہے [داغ]

۹ تم بھی اچھے رقیب بھی اچھا
میں برا تھا مری گزر نہ ہوئی [ایاس یگانوی]

۱۰ رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا [نا معلوم]

۱۱ باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و حیال کا ساماں کئے ہوئے [عالب]

۱۲ وہ آئے، وعدہ پہ، آئے مگر رقیب کیساتھ
عجب مذاق کیا مجھ سے غم نصیب کیساتھ [تاباںؔ]

۱۳ روشن کیا جمال سے بزم رقیب کو
اے ماہ، داغ دل کے سوا ہم کو کیا دیا [روشن]

۱۴ فرقت قبول، رشک کا صدمہ نہیں قبول
کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے [ناسخ]

۱۵ ذکر سن کر تیرا رقیب سے آج
ہم خفا ہو گئے نصیب سے آج [جعفر شیرازی]

کہا جاتا ہے کہ ہم مذاق اور ہم عمر آدمی ہم پرواز ہوتے ہیں. اس لئے دوستوں کا انتخاب ایک نازک مسئلہ ہے، طبیعتوں میں نشیب و فراز ہو تو دوستی باقی نہیں رہتی، یا اگر دولت اور عزت کا ملاپ ہو تو تب بھی دوستی خطرہ میں رہتی ہے دنیا میں دوست سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شیطان کو بھی ساتھی کی ضرورت ہے لیکن لفظ دوست بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوستوں کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں دنیا میں اس سے زیادہ خوش‌قسمت آدمی کوئی نہیں جس کے مخلص اور سچے دوست ہیں، لیکن مخلص، دوست کا ملنا بہت مشکل ہے، وہ دنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور حق دوستی کے ادا کرنے میں چھوٹے بڑے نقصان کی پرواہ نہیں کرتا. مخلص، مصلحت اور کاروبار سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا لیکن وقت پڑے اپنی بے لوثی اور بے نفسی کا پورا پورا ثبوت دیتا ہے اور اس کی یہ بے لوثی اس کے تمام نقصان کی تلافی کر دیتی ہے اس لئے دنیاوی کاروبار میں ایک مخلص دوست بہت بڑی طاقت ہے ایسی بڑی قوت جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قیمتی چیز نہیں کرتی. اس لئے دوستوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے اور جب ایک مرتبہ کسی ہستی کو چن لیا گیا تو شرافت کا یہ تقاضہ ہے کہ موت ہی اس کو جدا کرے.

بھارت کے دانشمندوں نے اس باب میں اپنے جن خیالات کو اقوال و امثال کی صورت میں جمع کیا ہے وہ درج ذیل ہیں

دوستی اور تعلقات

۱ جس کسی کی طاقت سے، خاندان سے، چال چلن سے، واقفیت نہ ہو اس سے کوئی ربط نہیں پیدا کرنا چاہئے. [پنچ تنتر]

اس ایک آدمی کے ہاتھ میں کڑوڑوں مخلوق خـــدا کی قسمت بند ہیں اور اس کی ایک عقل و تدبر پر عوام کی بھلائی و برائی کا انحصار ہے. شاہی میں مرکزی حیثیت وزیر کو حاصل ہوتی ہے. کہا جاتا ہے کہ بادشاہ مورکھ اور وزیر عاقل ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اختیارات وزیر کو حاصل ہیں وہ بادشاہ کو بھی نہیں یا جو کچھ وزیر چاہتا ہے وہ بادشاہ سے منواکر رہتا ہے. سیاست گتھیوں کی ایک زنجیر ہوتی ہے جو صرف مصلحت اور دانشمندی سے سلجھائی جا سکتی ہے، خصوصاً شاہی سیاست بری خطرناک چیز ہے کیونکہ بادشاہ پر مختلف قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں جو رعایا کے لئیے فائدہ مند بھی ہوسکتی ہیں اور نقصاں دہ بھی، اس لئیے کہ رعایا کی آواز کا بادشاہ تک پہچنا بہت مشکل ہے. درمیانی کڑیاں جو بادشاہ اور رعایا کے بیچ میں حائل ہیں وہ رعـــایا کے مطالبات کو بادشاہ وقت تک پہچانے میں بھی کا کام کرتی ہیں اسی لئیے شاہی حکومت میں انقلابات عجیب اور اتفاقی طور پر رونما ہوتے ہیں. پھر بھی بھـارت کے قدیم دانشوروں نے بادشـــاہ اور وزیروں کے لئیے چند ہدایات بطور اقوال ورثے میں چھوڑی ہیں جو درج ذیل ہیں.

سیاست |

۱ ں حکومت کی ابتدا ملائمت سے ہوتی ہے اور انتہا سزائیے جسمانی سے. [پنچ تنتر]

۲ اگر بادشاہ بلا عملت کے جو کوئی سزا کے قابل ہو اس کو سزا نہ دے تو طاقتور ناتواں کو ایسا کباب کرے جیسے سیخ پر مچھلیاں ہوتی ہیں. [نمو شاستر]

۳ جو کوئی ظلم نہ کرتا ہو اس کو شاں و شوکت کی امید فضول ہے آدمی سانپ کا لحاظ کرتا ہے پر گردا کی حرمت نہیں کرتا گو وہ سانپ کا مارنے والا تھا. [پنچ تنتر]

۴ جس راجہ کا بید اور گرو اور دیواں اس کی خوشامد کرے وہ بہت جلد اپنی تندرستی اور اپنا دھرم اور اپنا مال و گنج کھو بیٹھتا ہے. [ہتو پدیش]

۵ اگر تم اختیار ایسے آدمی کے ہاتھ میں دیدو جس نے تمہاری بہت خدمت کی ہو تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم اس سے کبھی ناراض نہ ہوگے. ایسا

وزیر اپنی خدمتوں کو ایک جھنڈا سا لیتا ہے اور راج کے اندر ہر چیز کو درہم برہم کردیتا ہے [ہتو پدیش]

۶ کسی وزیر کو، وہ کوئی بھی ہو، مالدار نہ بنانا چاہئیے۔ دولت آدمی کی طینت کو بدل دیتی ہے۔ [ہتو پدیش]

۷ وزیروں کو اگر دباؤ تو ان میں سے بادشاہ کا مال بہ نکلتا ہے اکثر ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جیسا پھوڑا، روئے زمیں کے بادشاہوں کو چاہئے کہ اپنے وزرا کو لگاتار ایذا دیتے رہیں۔ نہانے کی لنگی کو اگر ایک ہی مرتبہ نچوڑیں تو کیا اس میں سے بہت پانی نکلے گا۔ [ہتو پدیش]

۸ جو شخص ایسے خادم کو قتل نہ کرے جو دولت میں اس کا برابر ہو، طاقت میں اس کا برابر ہو، دانشمند اور دل کا مضبوط ہو اور آدھی سلطنت پر اپنا قبضہ کئے ہوئے ہو وہ خود ہی قتل ہوجاتا ہے۔ [ہتو پدیش]

۹ راجہ کی ماں اور رانی اور راج کمار اور دیوان اور پروہت اور دربان سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے جیسا راجہ سے [پنچ تنتر]

۱۰ جو راجہ علم سیاست میں لائق ہو اس کو ویسا کرنا چاہئے جیسے کچھوا کرتا ہے کہ دشمن کے حملہ کا صدمہ برداشت کرنے کو اپنی سنگی سپر کے اندر سما جاتا ہے اور جب وقت آئے تو اس کو ایسا سر اٹھانا چاہئے جیسے مہیب ناگ۔ [ہتو پدیش]

۱۱ تالیف قلوب، رشوت اور پھوٹ ڈالنا، یہ وہ ذرائع ہیں جن کو دشمن پر فتح مندی حاصل کرنے کے لئے چاہئے کہ بادشاہ علیحدہ علیحدہ یا اکٹھا استعمـــال کرے مگر اس کو قوت بازو سے مغلوب کرنے کا ارادہ ہرگز نہ کرے۔ [ہتو پدیش]

۱۲ انسان دشمن پر ہتھیاروں سے ایسی فتح نہیں پاتا ہے جیسی کہ حیلہ سازی سے۔ جو حیلہ ساز ہوتا ہے وہ اگر پست قد ہی ہو تو خود رستم وقت اس کو مغلوب نہیں کرسکتا۔ [پنچ تنتر]

۱۳ دشمنوں میں نااتفاقی کا بیج بونے میں وارث تخت و تاج سے بہتر مشیرکار

نہیں مل سکتا۔ پس اپنے دشمن کے وارث کو بڑھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا چاہئے۔ [ہتو پدیش]

۱۴ چال چلن کے یہ تین اصول جن کی پیروی لازم ہے۔ یعنی بھلائی، اپنی غرض اور عیش و عشرت ان کو جو کوئی جانتا ہو اس کو بہت رحمدل نہیں ہونا چاہئے۔ حقیقت میں جو کوئی نامروت ہوتا ہے وہ اس چیز کو بھی نہیں بچا سکتا جو اسکے قبضہ میں موجود ہے۔ [ہتو پدیش]

۱۵ ناتواں دشمن کو اس سے پہلے قتل کرنا چاہئے کہ وہ توانا ہوجائے جب وہ اپنی پوری قوت حـــاصل کرلیتا ہے تو اس کو مغلوب کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۶ دشمن کے ساتھ بہت مضبوط عہد و پیماں ہی نہیں کرنا چاہئے، پانی کیسا ہی گرم ہو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ [ہتو پدیش]

۱۷ جو دشمن ہتھیار سے مارا جاتا ہے وہ در حقیقت قتل نہیں ہوتا۔ مگر جو عقل کے زور سے مارا جاتا ہے وہ پوری طرح سے قتل ہوتا ہے۔ ہتھیار سے آدمی کا جسم ہی قتل ہوتا ہے عقل سے اس کا گھرانہ اس کی دولت اس کی نیک نامی سب کا خون ہو جاتا ہے۔ [پنچ تنتر]

۱۸ زمین اور دوست اور سونا یہی تین چیزیں ہیں جن کے واسطے لڑائی لڑی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو ہرگز نہیں لڑنا چاہئے۔ [پنچ تنتر]

۱۹ چھوٹی سی فوج چنے ہوئے آدمیوں کی بہتر ہے ایک بڑے سے لشکر سے جس کو جنگ کی تعلیم نہ دیگئی ہو، نکمے سپاہی دشمن سے مغلوب ہوجاتے ہیں اور بہادروں کی شکست کے باعث ہوتے ہیں۔ [پنچ تنتر]

۲۰ جب لڑائی شروع ہوجائے تو بادشاہ کو لازم ہے کہ اپنے ان خادموں کو بھی جن کو وہ دوست رکھتا ہے اور جن کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے۔ سوکھی لکڑی کے برابر سمجھے۔

لیکن آج بھی دنیا میں شاہی حکومت کے چند ممالک واقع ہیں مگر وہاں

کے بادشاہ شاہ شطرنج سے بڑھ کر نہیں، جس کی صرف پرستش کی جاتی ہے لیکن اسے اختیارات نہیں دئے جاتے۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ، روم اور جاپان کا شاہ ان کی اچھی اور تازہ مثالیں ہیں، کیونکہ انسان کے بڑھتے ہوئے شعور نے عوام کو بڑی حد تک ذہین بنادیا ہے اور ان میں بھلے برے کی تمیز تعلیم و تجربے نے پیدا کردی ہے اس لئے فی زمانہ بادشاہ سے زیادہ جمہوریت عام ہے جس کو مختلف صورتوں میں ڈھال کر ممالک اپنے اپنے دور حکومت میں تجربے کر رہے ہیں پھر بھی دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جمہوری حکومت بھی اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتی ہے اور وقت پڑے کھوکھلی ثابت ہوسکتی ہے اسے پتہ نہیں کہ مستقبل کا نظام حکومت کیا ہو جس میں عوام بھلائی کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط بھی موجود رہے۔

ذیل میں چند چیدہ چیدہ امثال و اقوال دئے جاتے ہیں جو زندگی کی راہوں میں سوچ سمجھ کر چلنے میں مدد دیتے ہیں۔ جس زمانے میں اندلس عربوں کے تحت تھا اور عرب اپنی ایک خاص معاشرت و تہذیب یورپ میں پھیلا چکے تھے ان کا علمی سرمایہ بھی بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ یہ مقولے مشرق و مغرب کے اتصال تہذیب پر دلالت کرتے ہیں اور انسان کی طاقت پرواز بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اقوال در حقیقت وہ موتی ہوتے ہیں جو چن چن کر سلیقہ سے پروئے گئے ہیں اور اپنی ایک خاص قیمت پیدا کرچکے ہوں۔ ان میں وقت اور زمانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہر زمانے کے رہنما ہیں، ہر جنگ کے سپہ سالار ہیں اور ہر مشکل کے خضر ثابت ہوسکتے ہیں۔

متفرق

۱ مکھی کے پر کے نیچے زندہ رہنا قبر کے سونے سے بہتر ہے۔

۲ جو کچھ کرنا ہے جوانی میں کرلے زندگی بس ایک پل کی ہے۔

۳ اپنے رنج کو آج دور کرلے نہیں معلوم کل کیا ہوگا۔

۴ اگر تو لہار کے پاس کھڑا ہوگا تو تیرے کپڑوں کو کالک لگے گی۔

۵ اور اگر عطار کی دکان پر کھڑا ہوگا تو کپڑے معطر ہوجائیں گے۔

نعمت اور عیش و عشرت میں گزرا اور جوانی کم و بیش خوش حالی میں بسر ہوئی. پھر حالات نے پلٹا کھایا، ان کی تنخواہ اور سرکاری پنشن بند ہوئی اور وہ تنگدستی و عسرت کا شکار ہوئے. اس طرح زندگی کے مختلف ادوار میں ان کو غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑا. مغلیہ دور کی معاشرت اور خاندانی پس منظر نے ان میں خود پسندی و انانیت اور آزاد روی و وضعداری کا جذبہ پیدا کردیا تھا. بدلتے ہوئے حالات میں گزشتہ آسودہ حالی اور وجاہت کی حسرت بھری یاد اور غیر متوقع پیش آنے والے واقعات کی تلخی ماحول نے ان کے جذبات میں ایک تلاطم برپا کردیا، اگرچہ وہ تمام شدائد کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان پر آلام و مکروہات روزگار اثر انداز نہ ہوئے، یہ اور بات ہے کہ چوں کہ وہ فطرتاً رجائیت پسند تھے اور طربیہ جذبات میں ڈوبے رہتے تھے وہ ان سے مغلوب نہ ہوئے. دل شکستگی کی حالت میں بھی عزم تازہ پیدا کرنے کا خیال انہیں ہمیشہ دامن گیر رہا. ان نامساعد حالات نے ان کو ایک ذہنی اور جذباتی کشمکش میں ضرور مبتلا کردیا. اور وہ اپنی قوتِ ادراک سے اس کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے. ذاتی احساسات اور تجربے کی بنا پر جو اشعار انھوں نے کہے ہیں ان میں انھوں نے اپنی رنگا رنگ اور ادبی شخصیت سمودی ہے. پروفیسر آل احمد سرور کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ مرزا کے پیشرو شعراء میں سے کسی کے ہاں اتنی رعنائی اور رنگینی نہیں پائی جاتی حتی کہ ان کے ہاں. ان کے ہاں امید و بیم' عیش و غم، آرزو و شکستِ آرزو، حسرت و مسرت اور شاعرانہ لطافتوں کے پردے میں فکر کا گہرا سرمایہ ملتا ہے. ان کا مطالعہ ہمارے اندر ایک وسعت نظر پیدا کرتا ہے. وہ اپنے خیالات کی ترجمانی میں کبھی کبھی انداز فکر کے پہلو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ ایک عام بات بھی انوکھی معلوم ہوتی ہے. نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی، اس کے بیان کرنے میں اپنی فنکارانہ محاکات کا ثبوت دیتے ہیں. کبھی خوشنوائی سے کام لیتے ہیں تو کبھی تلخ نوائی پر اتر آتے ہیں. عالم خیال میں وارد ہوکر اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں سے افسردگی میں وارفتگی اور غم میں لذت کی کیفیت پیدا کرتے ہیں. نیرنگیِ کائنات کی بوقلموں منظر کشی اور انسانی جذبات کے مد و جزر کا سماں گونا گوں دلفریبی کے رنگ میں دکھاتے ہیں. بعض اوقات تخیل کی پرواز ان کو معنی آفرینی کے شوق میں ایک ایسے

عالم میں پہنچا دیتی ہے جہاں خود ان کے الفاظ اور وسیع المعنی اچھوتی ترکیبیں مطلب کی تہ تک پہنچنے میں مساعدت نہیں کرتیں اور ان کے خیالات پیچیدگیوں میں الجھکر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ تمام تر قوتِ فکر سے کام لینے کے باوجود ایک تعلیم یافتہ مذاق بھی ان کے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے اور ان کے ذہن اور شعور کا پتہ لگانا دشوار ہوجاتا ہے۔

(۷)

عشقیہ شاعری

جس طرح مرزا نے بحیثیت مجموعی اپنے کلام میں جدت طرازی اور ندرت پسندی سے معنی آفرینی کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے اور پاستگیِ رہ و رسم عام کو نظر انداز کرکے اپنے منفرد اسلوب بیان کی ایک جدا گانہ راہ اختیار کی ہے وہ عشقیہ شاعری میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ ان کا تصور عشق اوروں سے مختلف ہے جو متنوع پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اور جس میں آفاقیت کی شان اور کائناتی رنگ کی بہار جلوہ گر ہے۔ شروع شروع میں ان کے ہاں عشق کا روایتی تصور ضرور ملتا ہے جو بندھے ٹکے خیالات اور فارسی و اردو کی روایتی شاعری کی خصوصیات تک محدود تھا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ اس کے پابند نہ رہے۔ انفرادیت پسند جذبے کے تحت انھوں نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں ان کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی دنیائے عشق و عاشقی بہت وسیع ہے، اس میں خیالات کا تنوع بھی ہے، رنگینی و رعنائی کی بہار بھی اور کیف و سرمستی کا لطف بھی۔ جن اشعار میں وہ حسن و عشق کے جذبات و احساسات اور دل پر گزری ہوئی واردات کی مختلف حالتوں کا نقشہ کھینچتے ہیں ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے ہاں عشق حقیقی کا تصور کمیاب ہے۔ کبھی عالم روحانیت کی سیر کرتے ہیں تو ایک چھچھلتی ہوئی نظر سے، تصوف یا معرفت پر قلم اٹھاتے ہیں تو رسمی طور پر اور خود بقول ان کے محض آرائش شعر کے لئے۔ در حقیقت اس قسم کا بیان ان کی ذہنی عشق یا حسی تصور عشق کا رد عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کے اکثر عشقیہ اشعار میں جسمانی لذت پرستی و تعیش اور عشق کے جنسی و مادی تصور کا رنگ صاف جھلکتا ہے جس سے

نفسیاتی حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا معشوق طوائف کے بھیس میں نظر نہیں آتا ہے لیکن ان کے عشق مجازی کا بیان ایسا ہے کہ اس میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جن سے اس کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ معشوق کا ناز و انداز، عشو و ادا، شرم و حیا، چھیڑ چھاڑ، راز و نیاز، درد ہجر، کیفیت وصل، خواہش بوس و کنار، لذت دشنام، عاشق کی سادگی تمنا، جوش جنوں، ذوق صحرانوردی، بےاثری آہ و نارسائی نالہ وغیرہ سب کچھ ان کے ہاں موجود ہے۔ غرض فطرت انسانی کے اکثر تقاضے جو جذبۂ عشق سے متعلق ہیں اور معاملہ بندی کے محرک ہوتے ہیں وہ اپنی فنکاری سے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ ان کی مثال اوروں کے ہاں بمشکل ملےگی۔ ان میں حسن پرستی کا شدید احساس ہے، وہ ذوق نظارہ میں گم ہوکر ذوق جمال کی مجسم تصویر بن جاتے ہیں، خالص جذبۂ عشق اور بوالہوسی میں امتیاز کرتے ہیں، عاشق کو راہ عشق میں جن دشوار گزار مقامات اور کٹھن منزلوں کو طے کرنا یا جن حالات و واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کی ترجمانی بوجۂ احسن کرتے ہیں۔ جن ناکامیوں سے مقابلہ کرنے میں عاشق صبر و شکیب، ضبط و تحمل اور عزم و حوصلہ کا ثبوت دیتا ہے ان کے بیان کرنے میں جو رنگا رنگ تصویریں پیش کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔ دور حیات کی دھوپ چھاؤں میں ان کے تنعم اور افسردگی سے جو مختلف الاثر نقوش ان کے ذہن پر مرتسم ہوئے چوں‌کہ ان کا ہمرنگ یا ہم آہنگ ہونا ممکن نہ تھا ان کا تصور عشق بھی پلٹے کھاتا رہا اور اس میں یکسانیت قائم نہ رہ سکی۔ اسی وجہ سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک مربوط تصور عشق نہیں ملتا۔ پروفیسر سرور لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں جذباتی سطحیت نہیں۔ عام طور پر یہ درست ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا کے بعض اشعار میں رکاکت اور سوقیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ان کے کلام میں سوز و گداز نہیں، یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس میں وہ شدت نہیں جو فارسی کے بعض شعراء اور اردو میں خصوصاً میر کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں، اول یہ کہ بخلاف دیگر شعراء کے ان کے کلام میں زندگی کا سوز و گداز زیادہ ہے جس میں ان کی بلندی تخیل کے ساتھ ساتھ ان کے بےپناہ جذبۂ خود داری اور غیرت

کو کافی دخل ہے دوسرا یہ کہ اس میں انسانی نفسیات سے وابستہ ان کے تخیل انداز فکر و جذبہ کی دلفریب آمیزش کار فرما ہے۔

اب عشقیہ مضامین سے متعلق مرزا کے خیالات اور اسلوب بیاں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے: ان کے نزدیک مجنوں جیسا اور کوئی عاشق کامل پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور عاشق مرد میداں بن کر سامنے نہ آیا۔ شاید صحرائے عشق حاسد کی طرح تنگ نظر تھا، اس نے کسی اور کا اس صحرا میں قدم بڑھانا گوارا نہ کیا:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

اس کے برخلاف وہ فرہاد کو عاشق کامل نہیں مانتے کیوں کہ وہ مرنے کے لئے بھی رسم و راہ کا پابند رہا، تیشہ سے سر پھوڑا تو کہیں مرا، اس کا جذبۂ عشق کامل ہوتا تو سر پھوڑے بغیر مرگیا ہوتا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

وہ زندگی کو ایک درد سمجھتے ہیں اور عشق کو اس کی دوا، حالانکہ عشق خود ایک درد بے دوا ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

وہ آہ میں اثر اور نالہ میں رسائی اس واسطے نہیں پاتے کہ دل دشمن یعنی معشوق کا دوست بنا ہوا ہے اور اس پر کوئی بھروسا نہیں:

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم　آہ بے اثر دیکھی نالہ نا رسا پایا

وہ عشق کو نبرد پیشہ قرار دیتے ہیں جس کے لئے مرد نبرد آزما کی ضرورت ہے، جو مرد میدان عشق نہیں وہ اس کی دھمکی ہی میں مرجاتا ہے:

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا　عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

دنیا میں لوگ لفظ وفا کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے تسلی ہوسکتی ہے، جب وفا کرکے تسلی نہ ہوئی تو لفظ وفا کچھ معنی نہیں، لہذا ان کے خیال میں وفاداریٔ عشاق ایک بےمعنی بات ہے:

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

دل افسردہ میں خیال یار کے رہنے کی گنجائش نہ ہو وہ اس کو بھلا نہیں سکتے، اس کا پرتو باقی رہتا ہے:

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

عاشقوں کو قتل گاہ میں سامانِ قتل دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی ہے۔ شمشیر کا عریاں ہونا ان کے لئے ہلالِ عید کا نظارہ ہے:

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

معشوق نے انہیں قتل کیا تو اس کے بعد جفا سے توبہ کی اور پشیمانی کا اظہار کیا، دیکھئے اس خیال کو طنزاً کس طرح ادا کرتے ہیں:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

عاشق وحشتِ ہجر میں اپنے گریباں کو پھاڑ ڈالتا ہے اور وصل کی حالت میں شوخیِ معشوق کے ہاتھوں اس کے پرزے اڑائے جاتے ہیں، گریباں عاشق کا یہ چار گرہ کپڑا بھی کس قدر بدنصیب ہے:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

معشوق کا ہاتھ مہندی اور اس کا رخسار غازہ کا منت پذیر ہے، آرائشِ حسن کو ایسی چیزوں کی احتیاج ہے اور یہ حسن کے استغنا کی رسوائی کا باعث ہیں:

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

وہ کہتے ہیں کہ وصالِ یار ان کی قسمت میں لکھا ہی نہیں تھا اس لئے اچھا ہوا کہ مر گئے، اور زندہ رہتے تو بھی انتظار ہی کرنا پڑتا، وصل میسر نہ ہوتا:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

وہ دل کے لئے غم کا ہونا بہرحال لازم سمجھتے ہیں، کہتے ہیں غمِ عشق نہ ہوتا تو غمِ روزگار ہوتا:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

شبِ غم میں ان کو برابر مرنا پڑتا ہے، ایک دفعہ مرنا ہوتا تو برا نہ مانتے:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رقیب کا عشق محض ہوس ہے جو شعلہ خس کی طرح بے ثبات ہے، اسے ناموسِ وفا کا کچھ خیال نہیں:

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں کہ ہر بُن مو سے خون نہ بہ نکلے:

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

محض محبوب کی جھلک دیکھ کر ان کی تسلی نہیں ہوتی، وہ اس سے ہمکلام ہو کر ہی مطمئن ہوسکتے ہیں:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

محبوب کو ان کے عشق کا اعتبار آگیا تو ان کی تباہی کا باعث ہوا۔ غیر بھی آہ کرتا ہے تو محبوب اس سے منسوب کرتا ہے اور خفا ہوتا ہے۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

وہ معشوق سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے کے آرزومند ہیں خواہ وہ دشمنی ہی کا کیوں نہ ہو:

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

وہ کسی حالت میں درِ معشوق سے ہٹنے والے نہیں:

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

وہ شکایت کرتے ہیں کہ معشوق اربابِ وفا سے اسقدر دشمنی رکھتا ہے کہ لطف و کرم تو درکنار ان پر ستم کرنا بھی اسے ناگوار خاطر ہے:

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ان کا خیال ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے حسین محض ان کی خاطر ناز و غمزہ کی کشمکش میں مبتلا تھے، مقام شکر ہے کہ ان کے مرنے کے بعد حسینوں کو اس کشمکش سے رہائی ہوگئی:

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

مرزا کے نزدیک صرف عاشق ہی مستحق جفا ہے، اگر جفا عام ہو تو عشق کی آبرو باقی نہیں رہتی:

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

معشوق کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ کسی پر فریفتہ نہیں ہوتا غلط ہے، آئنہ میں اپنی صورت دیکھ کر خود عاشق ہوگیا:

آئنہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہگئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

غمِ عشق کا داغ عاشق کے لئے بے انتہا خوشی کا باعث ہے:

نشاط داغِ غم عشق کی بہار نہ پوچھ   شگفتگی ہے شہیدِ گل خزانی شمع

وہ کہتے ہیں کہ خیال میں رعنائی تھی محبوب کے تصور سے:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے   اب وہ رعنائی خیال کہاں

وہ عشق کو رونقِ ہستی کا راز سمجھتے ہیں:

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے   انجمن بے شمع ہے گر برق حرمن میں نہیں

معشوق ان سے بات تو کرتا نہیں لیکن ان کی خبر کا طالب رہا کرتا ہے، وہ اس کی اس خاص مہربانی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں:

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

وہ جادۂ راہِ وفا کو تلوار کی باڑھ قرار دیتے ہیں جو انسان کو فوراً قتل کرڈالتی ہے راہِ وفا ایک دم میں طے ہوجاتی ہے یعنی پہلے ہی قدم پر موت آتی ہے اور لذت آزار کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی ہے:

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے   جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

محبوب آئنہ میں اپنے حسن و جمال کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے تو اس کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں:

تماشا کر اے محو آئنہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

وہ مرجانے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے لیکن اس طرح راز معشوق کے فاش ہوجانے کا اندیشہ ہے، ان کا جان دینا معشوق کی رسوائی کا باعث ہوگا، اور یہ انہیں گوارا نہیں:

رازِ معشوق نہ رسوا ہوجائے   ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

ان کے نزدیک محبوب کا آنکھ چرانا لگاوٹ اور عتاب میں بگڑنا بناؤ سنگار سے کم نہیں:

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ اپنی بے زبانی کی وجہ سے معشوق کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتے، رقیب کی چکنی چپڑی باتیں کام کرگئیں اور معشوق اس کو اپنا عاشق سمجھنے لگا، ہوگئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر   عشق کا اس کو گماں ہم بے زباں پر نہیں

وہ نالہ کرتے ہیں تو اس لئے کہ محبوب اسے ظلم و ستم کے خلاف شکایت سمجھ کر کر غصے ہوجائے اور زیادہ ظلم کرنے پر آمادہ ہو:

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

کہتے ہیں کہ جوشِ اختلاط اور کثرتِ بوس و کنار میں محبوب کے ساتھ ہم آغوش ہونے سے بڑھکر عاشق کے لئے اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

عشق کی غارت گری نے گھر کو بھی برباد کرڈالا، اب اسے تعمیر کرنے کی حسرت کے سوکچھ باقی نہیں رہا. انہیں اسبات کی شرمندگی ہے کہ اب عشق غارت کیا کریگا:

ہوا ہوں عشق کی غارت‌گری سے شرمندہ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

محبوب کا حسنِ تابناک قوت نظارہ کو جلاکر رکھدیتا ہے، کوئی اس کو دیکھ ہی نہیں سکتا، کہتے ہیں پھر اسے پردے میں رہنے کی کیا ضرورت ہے:

جب وہ جمالِ دلفریب صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو جب نظارہ سوز پردے میں مہ چھپائے کیوں

معشوق کا غمزہ جاں لینے والے خنجر اور اس کا ناز ایک بے پناہ تیر، کسی کو اس کے سامنے نہ آنا چاہئے، اگرچہ وہ خود اس کا عکسِ رخ ہی کیوں نہ ہو.

دشنۂ غمزہ جانستاں ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکس‌رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

محبوب کو اپنے حسن پر اعتماد ہے یعنی جانتا ہے کہ وہ کون ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہوگا، پھر رقیب پر حسن ظن بھی ہے کہ وہ بھی ضرور اس کا چاہنے والا ہوگا اس لئے وہ رقیب کو آزماتا نہیں، اسی میں اس کی شرم رہگئی.

حسن اور اس پہ حسن ظن رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

عاشق باوجود محبوب کی بے رخی اس کی محبت سے باز نہیں آتا، لوگ اسے سمجھا رہے ہیں کہ محبوب خدا پرست نہیں، وہ بے وفا ہے اس کا خیال چھوڑ دو، عاشق اس کی برائی سننے کی تاب نہیں لاسکتا اور بگڑ کر جواب دیتا ہے، چلو وہ خدا

پرست نہیں نہ سہی بیوفا ہے تو اچھا ہی سہی، جس کو دین و دل عزیز ہو وہ اس کی گلی میں نہ جائے، مجھے ایسی نصیحت کی ضرورت نہیں:

ہاں وہ نہیں خـــدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

وہ عاشق کا فریاد کرنا شانِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں:

کسیکو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

انہوں نے عشق و وفا کا دعوٰے کیا تو معشوق نے اسے غلط قرار دیا اور کہا کیسی وفا اور کہاں کا عشق؟ اس کے جواب میں کہتے ہیں تم کہتے ہو کیسی وفا اور کہاں کا عشق! اگر مجھ میں عشق و وفا نہیں تو اے سنگدل پھر سر پھوڑنے کے لئے تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں تلاش کیا جائے اور کسی پتھر سے بھی سر پھوڑا جاسکتا ہے:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

معشوق ان کے جذب دل کی بنا پر کشاکش کی شکایت کرتا ہے تو اس کی وجہ وہ خود معشوق کا کھچ کے رہنا بتاتے ہیں۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو تم گر اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

وہ اس دن کی تمنا کرتے ہیں کہ دوست سے شوق وصل اور شکایت ہجر کا اظہار کر سکیں۔

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ان کے نزدیک غمگین دلوں کی فریاد بے اثر ہے حسینوں کی اپنے چاہنے والوں کے ساتھ وفاداری کرنا ایک اتفاقیہ امر ہے:

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

وہ چاہتے ہیں کہ کسی صورت میں یار سے چھیڑ کی راہ نکل آئے اگر انہیں وصل نصیب نہ ہو تو اظہار حیرت ہی سے ایسی صورت پیدا ہوجائے:

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

محبوب کی طرفداری کرتے ہوئے اس کو بدخو قرار دینے والوں کی تردید اس طرح کرتے ہیں:

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

محبوب اس واسطے انداز تغافل اختیار کرتا ہے کہ راز عشق کی پردہ پوشی ہو لیکن وہ اس کے سامنے جاکر ایسے بدحواس ہوجاتے ہیں کہ اس پر رازِ عشق کھل جاتا ہے۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

ان کا محبوب ایسا نازک ہے کہ اگر کسی اور کے عشق میں مبتلا ہوکر اس کا رنگ اڑا جاتا ہے تو زیادہ نکھر جاتا ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

معشوق ساز و سامانِ قتل سے آراستہ نہ ہو تو اس میں سادگی کی شان پائی جاتی ہے، وہ ایسی سادگی پر جان فدا کرنا چاہتے ہیں، مگر وائے بدقسمتی! معشوق نے پھر خنجر ہاتھ میں لے لیا، سادگی پر مر جانے کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی:

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

معشوق کی لذت تقریر کا اثر یوں بیان کرتے ہیں:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کہتے ہیں کہ لذت فراق سے چھاتی پھٹ جاتی ہے تو زخم جگر کو چھپانے کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہے :

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذت فراق تکلیف پردہ داریٔ زخم جگر گئی

شوخ رفتاری میں معشوق کے نقش پا کا انداز کس قدر دلفریب ہوتا ہے :

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

بوالہوس کے حسن پرستی اختیار کرنے پر عاشقان صادق کی آبرو باقی نہیں رہی :

پر بوالہواس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر نگاہ رخ یار تک پہنچ کر ایسی مست ہوجاتی ہے کہ اس کے تار بکھر بکھر کر نقاب کی صورت اختیار کرتے ہیں ، یعنی خود نظارہ مانع دیدار ہوتا ہے :

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

آسمان کی گردش بھی عاشق کے حق میں سست رفتار ہے :

عشق کی راہ میں ہے چرخ بکوکب کی یہ چال سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

معشوق کو غم سنانا چاہیں تو بات نہیں بنتی ، اس کو باتوں کے پھیر میں الجھا کر بھی مقصد برآری نہیں ہو سکتی ، وہ بات کاٹ دیتا ہے :

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ جذب دل معشوق کو آنے پر مجبور کرے :

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ستائے بغیر معشوق کو چین نہ آئے :

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

مرزا موت کا انتظار کرنا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ وہ آئے بغیر نہ رہیگی ، وہ معشوق کو چاہتے ہیں ، اگر وہ نہ تو آئے اس کا بلانا بھی ممکن نہیں ، اس کا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے :

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

عشق اختیـــاری شے نہیں، یہ وہ آگ ہے کہ لگائے لگ نہیں سکتی اور بجھائے بن نہیں پڑتی یعنی اگر چاہیں کہ محبوب کے دل میں بھڑکائیں تو یہ ممکن نہیں اور اگر یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھادیں تو نہیں بجھا سکتے :

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
که لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ان کے معشوق کی طرح اور کوئی معشوق تیغ نگاہ کو آب دینا نہیں جانتا :

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

ان کو بوسہ نہ ملے تو نہ سہی وہ اس بات پر بھی راضی ہیں کہ معشوق آخر کچھ جواب تو دے خواہ وہ انکار ہی ہو اور جنبش لب ہی سے ان کا کام تمام کردے :

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

ان کو معشوق کے پاؤں دبانے میں بے انتہا خوشی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اس طرح ان کے ہاتھوں کو معشوق کے قدموں تک پہنچنے کا فخر حاصل ہوگا :

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

وہ اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے معشوق کا خنجر تیز ہے جو دم بھر میں فیصلہ کردیگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ کند ہوتا تا کہ ان کا گلا رک رک کر کٹتا اور جتنی دیر میں گلا کٹتا اتنی دیر ان کو معشوق کو دیکھنے کا موقع ملتا اور حسرت دیدار پوری ہوجاتی :

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے نا کامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

انہیں عشق کی مجبوریوں کا احساس ہے اس لئے اپنے نامہ بر کو جو معشوق کے حسن پر فریفتہ ہوکر ان کا رقیب بن گیا خطاوار نہیں ٹھہراتے :

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

وہ اس قدر سخت جاں ہیں کہ تیغِ نگاہِ یار کے متواتر واروں سے ان کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا گویا تیغ نگاہ کے لئے وہ سنگ فساں بن گئے ہیں جو تلوار کے بار بار رگڑنے سے کٹتا نہیں:

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

وہ امتحانِ عشق میں اپنی آزمائش کو مجنوں و فرہاد سے زیادہ مشکل پاتے ہیں. اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مجنوں و فرہاد کے لئے لیلیٰ و شیریں کا قد و گیسو فتنہ و بلا ہے لیکن ان کو ایک ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے جو عشق قامت کی سزا میں سولی اور سودائے زلف کی سزا میں پھانسی کے پھندے کے تجربے کرتا ہے:

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ان کی داستان عشق اس قدر طویل ہے کہ قاصد بھی سن کر گبھرا جاتا ہے پھر معشوق اسے سننا کب گوارا کریگا:

وہ بد خو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

معشوق انہیں منہ نہیں دکھاتا تو نہ سہی، کم از کم آنکھ تو دکھائے یعنی خفگی ہی سے ان کی طرف دیکھے:

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے

وصل میں سبھوں کو خوشی ہوتی ہے مگر کوئی مر نہیں جاتا، معلوم ہوتا ہے کہ شب ہجر میں انہوں نے مرنے کی تمنا کی تھی وہ شب وصل میں ان کے سامنے آئی یعنی شادی مرگ ہوئے:

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ان کے نزدیک معشوق کی بے رخی کی شکایت کرنا مناسب نہیں، اس کی خوبیوں کا ذکر کرنا چاہئیے آخر وہ معشوق ہے:

نہیں نگار کو الفت نہو نگار تو ہے　　روانیِ روش و مستیِ ادا کہئیے

وہ کہتے ہیں کہ عشق میں رونے سے رسوائی ہو تو بے باکی اور بڑھ جاتی ہے:

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

عاشق زخم عشق کھا کر ہی التفاتِ معشوق کی توقع رکھ سکتا ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

عاشق کی تمام عمر بھی معشوق کے ایفائے وعدہ کے لئے کافی نہیں:

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

حالتِ جنوں میں عاشق سے بیکار نہیں بیٹھا جاتا، کچھ نہیں تو سر پیٹنے ہی کا مشغلہ اختیار کرتا ہے:

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

محبوب آئے یا نہ آئے، وہ وعدہ خلافی ہی کیوں نہ کرے، لیکن مرزا اپنی بات کو نباہنا ضروری سمجھتے ہیں اور برابر اس کا انتظار کرتے ہیں:

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دل دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

عشق مجبوری کا معاملہ ہے، ارادے کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا، گرفتاریِ عشق کا دعویٰ کرنا ایسا ہے کہ ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دب جانے کی وجہ سے نکل نہ سکتا ہو اور یہ کہا جائے کہ پتھر سے عہد وفا باندھا ہے اور محبت کو نباہ رہے ہیں:

مجبوری و دعویِ گرفتاریِ الفت　　دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

وہ اپنے دم آتشیں کے شرر برسانے والے نالوں سے چراغاں کا نظارہ پیش کرتے ہیں

اور اس تماشا سے محظوظ ہوتے ہیں:

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

وہ جذبۂ عشق کے تحت خریدار یعنی معشوق کی تلاش کرتے ہیں اور عقل اور دل و جان کو اس کے لئے بیچنے کو تیار ہیں:

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

وہ معشوق سے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، کہتے ہیں اگر قاتل کی دراز دستی کا امتحان لینے کے لئے انہیں اس سے دور رکھا جاتا ہے تو یہ کوئی وجہ نہیں، اس کے لئے صرف ایک وہی تو نہیں رہ گئے ہیں، اس کے لئے اوروں کا بھی انتخاب ہوسکتا ہے:

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

(باقی آئندہ)

* از جناب سعادت نظیر

علی اختر کی شاعری

تکلف برطرف مردہ پرستی بھی انسان کی دوسری خصوصیات کی طرح ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر قوم اور ہر طبقے میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ شاید ایسے ہی مشاہدات و تجربات کے نتیجے کے طور پر « قدر نعمت بعد از زوال » کا مقولہ وضع کیا گیا ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ خصوصیت اہل مشرق میں زیادہ نظر آتی ہے کہ یہاں کسی شاعر، ادیب یا فنکار کی زندگی میں اس کی مناسب اور ضروری حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نہ اس کی جگر کاوی کی کما حقہ قدر۔ وہ نکبت و افلاس کا شکار ہوکر فاقوں کے مارے ادھ موا اپنی کٹیا میں سسکتا پڑا رہتا ہے اور اس بےکسی کے عالم میں کوئی جھوٹے منہ آدھی بات بھی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہاں! جب وہ مرجاتا ہے اور منوں مٹی تلے دب کر مٹی ہوجاتا ہے تو اس کی مرقد پر پھول چڑھتے ہیں، میلے لگتے ہیں، سوگ منایا جاتا ہے، ماتمی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں، یادگاریں قائم کی جاتی ہیں، خوشنما قبر اور قبر پر شاندار گنبد بنایا جاتا ہے، اس کی تخلیقات اور شاہکاروں کی چھان بین کی جاتی ہے، ان کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، ان پر مقالے لکھے جاتے ہیں اور قصہ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو انسان کرسکتا ہے اور ان سارے مادی افادوں کے استفادے سے مرحوم فنکار محروم ہی رہتا ہے۔ اتنی پیش بینی اور « قدر نعمت قبل از زوال » کی صلاحیت ہم میں ہے ہی نہیں اور شاید ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ صاحبان فن کی ناقدردانی سے فن کی ترقی محدود اور فن پامال ہوجاتا ہے مگر علی اختر مرحوم ان چند خوش نصیب ارباب کمال سے ایک ہیں جن کی اور جن کے فن کی قدر خاطر خواہ نہ سہی پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کی گئی، مرنے سے پہلے بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کے اوسط زمانے میں قیاس غالب ہے کہ ان کا کمال ہی ان کی خوش حالی کا باعث رہا اور

* جناب سعادت نظیر، ایم۔ اے۔ حیدرآباد، ۲

۱۹۳۲ ع و ۱۹۳۳ ع میں جب کہ وہ بقید حیات تھے، حضرت نیاز نے «ماہنامہ نگار» میں مسلسل مضامین لکھ کر یہ ثابت کرنے کوشش کی تھی کہ ان کی شاعرانہ عظمت جوش ملیح آبادی سے کہیں زیادہ ہے اور جب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو مختلف رسالوں میں متعدد مضامین کے ذریعے ان کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت بھی ادا کیا گیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۰۸ ع کی صبح کو علی اختر نے رام پور جیسے مرکز شعر و ادب میں آنکھ کھولی، تعلیم کی غرض سے آگرہ گئے، پھر اٹاوہ گئے اور ایک مدت تک علی گڑھ میں بھی رہے۔ انہوں نے وہاں کی علمی و ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا، شعری مذاق ورثے میں ملا تھا اس لئے بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور اپنے والد جناب کاظم علی باغ مرحوم تلمیذ داغ دہلوی کی رہنمائی میں اپنے ذوق سلیم کو فروغ دیتے رہے۔

علی گڑھ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو صاحب فراش ہوگئے اور نظیر حیدرآبادی کا بیان ہے کہ ان کی اس علالت میں بیماریٔ دل بھی شامل تھی اس کا مداوا یوں کیا گیا کہ ان کی ایک نہیں، تین تین شادیاں یکے بعد دیگرے رچائی گئیں۔

میٹرک کامیاب کرکے اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد آئے، سررشتۂ آبکاری میں ملازمت حاصل کرلی لیکن کثرت عیال و قلت مال کے سبب پریشان رہے، ان کی نظم «واقعے کی ایک شام» جو بہت ہی درد انگیز ہے، اسی درد کی ایک یادگار ہے، اگرچہ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور اس میں کئی متمول اور صاحب ثروت بھی تھے مگر ع «مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ» اس خود دار فطرت نے کبھی کسی پر اپنی مصیبت ظاہر ہونے نہ دی اور کہہ اٹھے:

خدا شاہد! بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے
اگر ساحل ملے بمنت پذیر ناخدا ہوکر

جب محکمۂ تعمیرات میں مددگار معتمدی کے عہدے پر فائز ہوئے تو تنگدستی سے نجات ملی، معاشی مشکلات رفع ہوئیں اور چین سے بسر ہونے لگی۔

پھر بہار آئی، نشاطِ روح کا منظر کھلا
ساز جاگے، جام چھلکے، میکدے کا در کھلا

۱۹۴۸ع کی بات ہے کہ گردش روزگار نے انہیں حیدرآباد سے پاکستان پہنچا دیا جہاں وہ عزلت گزیں ہوگئے اور سکون و سرور کھو بیٹھے:

عشرتِ منزلِ سکوں، اختر! اک غریب الدیار کیا جانے؟

اور دس سال کے بعد ۱۱ جنوری ۱۹۵۸ع کو ابدی نیند سوگئے:

موت آئی خواب شیریں کی طرح ہم نے آنکھیں بند کیں اور سوگئے

وہ زمانہ جب کہ حیدرآباد کی فضا شعر و سخن کے پُرکیف نغموں سے معمور تھی، اور باغ کے مشاعرے بہار پر تھے، ان کی ہر محفل کو جلیل مانک پوری، وحید الدین سلیم، مرزا ہادی رسوا، آزاد انصاری، عبد اللہ عمادی، ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی اور صفی اورنگ آبادی جیسے مشاہیر ادب اپنے دل فروز و روح پرور شعروں سے گرماتے رہے، انہی تاریخی مشاعروں میں علی اختر بھی مدتوں اپنے جوہر دکھاتے رہے اور داد حاصل کرتے رہے:

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمن حیات میں عشق نے جان ڈال دی پیکر کائنات میں

علی اختر نے ۱۹۱۳ع سے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ جب ۱۹۱۶ع میں پہلی بار «رسالہ ذخیرہ» کے مئی نمبر میں ان کی نظم «بہار کا آخری پھول» شائع ہوئی تو «ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات» سارے ملک نے یہ جان لیا کہ اختر کا مستقبل کیا ہوگا؟

سلیقہ تھا کسے انجمن میں سوزِ باطن کا؟ حقیقت کر دیا میں نے محبت کے فسانے کو

اس کے بعد اردو زبان کا شاید ہی کوئی معیاری رسالہ ایسا ہوگا جس میں ان کی کاوشوں کے کچھ نقوش نہ ہوتے ہوں۔

بے پردہ جو وہ جلوۂ پنہاں نظر آیا اٹھتا ہوا اک حسن کا طوفاں نظر آیا

انھوں نے بہت سی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں، جن میں سے اکثر تاثراتی ہیں۔ ان کے موضوعات میں الجھاؤ نہیں، سیدھا سادہ انداز ہے، کیفیات کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ ہم آہنگی بھی ملتی ہے جس کی باں سطحیت پر نہیں ٹوٹتی۔ «کفر اور شاعر، شعر جدید، حیات ناتمام، ماضی و حال اور اپنے بچے سے آخری باتیں» ان کی شاہ کار نظمیں تصور کی جاتی ہیں، ان کی طویل نظمیں ان کی طباعی اور پُرگوئی کا بہترین مظہر ہیں جن میں کہیں کہیں ان کا اپنا انفرادی رنگ پھیکا پڑتا ہوا نظر آتا ہے مگر لفظوں کی روانی اور بندش کی چستی میں شاید ہی

کہیں فرق آتا ہو، طرزِ ادا میں جگہ جگہ ان کا اپنا درد دل نمایاں معلوم ہوتا ہے اور کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اوروں کے پردے میں بےتابانہ اپنا ہی غم بیان کررہے ہیں، الفاظ و معنی کا تناسب قدرتِ کلام کو ظاہر کرتا ہے اور اکثر اشعار آورد کے الزام سے بری ہوجاتے ہیں، ان ہی گونا گوں خصوصیات کے اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت وقیع ہوجاتی ہے۔

اس شخص کے سوا جو ان کی زندگی کے اول و آخر سے واقف ہے، اوروں کے لئے اس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی افتاد طبیعت پر ان کے اپنے ماحول کے نامور افراد میں سے کس کس کا اور کتنا اثر مرتب ہوا؟ جس نے مجموعی طور پر ان کے مزاج کو ایک خاص رنگ دیا اور جو ان کے ہم عصروں سے جدا ہے۔ شاید انھوں نے کچھ تو اپنے فطری تقاضے اور کچھ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوکر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور اپنی اسی ڈگر پر سب سے ذرا ہٹ کر نشیب و فراز کا لحاظ کئے بغیر منزل مقصود کی طرف تیز گام دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۳۱ع میں ان کی نظم «منکرانِ خدا سے خطاب» شائع ہوئی، اس سے ان کے مذہبی عقاید پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

جوش ملیح آبادی کی نظم «حرفِ آغاز» کے جواب میں بارہ سو ابیات کی ایک طویل اور معرکۃ الآرا نظم «قولِ فیصل» لکھی جو لکھنؤ سے ۱۹۴۸ع میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی، اس کے متعلق محترم نیاز رقم طراز ہیں کہ «قولِ فیصل» میں بحث و استدلال کے تمام پہلو سامنے آگئے ہیں، ایسے دقیق مسائل کو نظم کرنا آسان نہ تھا لیکن اختر اپنی زبردست قوتِ شاعرانہ سے کام لے کر مشکل سے مشکل مقامات کو بھی اس خوبی سے طے کرگئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

علی اختر صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی زندگی پامالِ گردشِ دوراں ہی رہی، چنانچہ وہ اپنی نظم «اپنے بچے سے آخری باتیں» میں لکھتے ہیں:

زندگی بھر کشتۂ بے مہریٔ دوراں رہا میں رہا لیکن رہینِ کاوشِ پنہاں رہا

ان کا ابتدائی اور آخری زمانہ مصیبتوں میں گزرا، ان کی زندگی ایک مسلسل تڑپ سے عبارت رہی:

کیا زمانے کو یاد رکھیں گے چار دن چین سے بسر نہ ہوئی

اختر مرحوم کے جذبات میں کیف و سرور، عیش و نشاط اور مستی و رندی کا فقدان ہے۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرشاریوں سے چور تھے اور نہ ان کی نظر حسن و شباب کے جلووں سے معمور ہی تھی بلکہ وہ تھے اور زمانے کی تلخیاں، اور جب یہی تلخیاں شدید ہوگئیں تو ان میں «دنیاگریزی» کا وہ جذبہ موجزن ہوا جس کا ثبوت ان کی اکثر نظموں اور غزلوں سے ملتا ہے:

عیاں جتنی زمانے کی حقیقت ہوتی جاتی ہے
خود اپنی زندگی سے مجھ کو نفرت ہوتی جاتی ہے

بقول ماہرالقادری ان کی نگاہ میں ہر حقیقت ایک فریب، دنیا کی ہر لذت ایک سراب اور ہر خیال ایک دھوکا ہے۔

جہاں ہے اک افسانۂ دل فریب سبھی کچھ ہے لیکن حقیقت نہیں ہے

علی اختر کی نظم «موج گہر» کے ماحصل کو کہ شاعر کھویا کھویا سا رہتا ہے مگر اس کے کلام میں بیدردیٔ دل انگڑائیاں لیتی ہے، بظاہر وہ اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے اپنی تخلیق میں جادو جگاتا نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ شاعری الہام کے سوا کچھ بھی نہیں، جب عہد رفتہ کی رنگینیاں فضائے یاد میں پرکشا ہوتی ہیں تو وہ گم کردۂ ہوش و حواس ہوجاتا ہے اور اس کو انسانی ہستی ایک اڑتا ہوا سا سایہ معلوم ہوتی ہے» ان کے جذباتی پس منظر کی عکاسی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ علی اختر نے اپنی وسعت خیال سے ایک پہناور و نظرافروز فضا پیدا کردی ہے اور ندرتِ بیان کی دل فریبیوں سے نئی نئی عنوانی گنجائشوں کی تخلیق میں اپنی جولانیِ طبع کے قابلِ قدر جوہر دکھانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے، زندگی اور اس کے متعدد پہلوؤں کو جو صرف حکیمانہ و فلسفیانہ اور خشک و سادہ پیرائے ہی میں اچھے رونما ہوسکتے ہیں، شعر کے رنگین و دلفریب لباس میں امکانی حد تک موثر طور پر جلوہ گر کیا ہے اور اس خصوص میں وہ اپنے مایۂ ناز معاصرین سے کچھ کم نہیں، تعمقِ فکر و نظر کے تقاضوں سے قطعِ نظر بیان میں رنگینی، خوش اسلوبی میں جدت اور ادائیگی خیال میں انوکھا پن بھی

بڑی بات ہے اور مسائل عنوانوں کو داخلی و شخصی رنگ دینا اور ان کو نظر فریب و دل کش انداز میں پیش کرنا قابل ستائش ھے۔

اک صبر شکن احساس ملا، اک درد بھری تقدیر ملی
جو خواب ازل میں دیکھا تھا، اس خواب کو یہ تعبیر ملی
اک نہ اک دن زندگی سے ہاتھ دھونے ھی تو ہیں
قصر وایوان کیا ہیں؟ مٹی کے کھلونے ھی تو ہیں

(اپنے بچے سے آخری باتیں)

ہر چند کہ مٹھی میں ھوائیں ہیں اسیر
ھے پیش نظر شمش و قمر کی تسخیر
دنیا کو بنانے کے جنوں میں لیکن
انسان نے بھلا دی ھے خود اپنی تعمیر

طرزِ سخنِ عام نہ آیا، نہ سہی میں قابل تسلیم نہ ٹھیرا نہ سہی
ایسے بھی تو ہیں، عقل ھے بالغ جن کی لڑکوں نے اگر مجھکو نہ سمجھا، نہ سہی

علی اختر کی شاعری کے بارے میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ وہ کچھ مناسبت رکھتے ہیں، غور و فکر کی عادت کچھ زیادہ ھے لیکن جذبات نوخیز و خام ہیں، کلام میں کوئی حدت، ناریکی یا گہرای بھی نہیں ھے۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ اقبال کی نادر ترکیبیں، اصغر کا لطیف تغزل اور ہلکا تصوف اختر کے یہاں پایا جاتا ہے، خیالات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ھے۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی راے ھے کہ علی اختر کے کلام میں ھمکو ایک ئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ھے لیکن نظموں میں وہ اپنی شخصیت شعری کو زیادہ اچھی طرح ظاہر کرسکتے ہیں، غزل میں وہ کچھ کمزور پڑ جاتے ہیں۔

حضرت نیاز فتح پوری تحریر فرماتے ہیں کہ علی اختر صاحب اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جو غزل کے حدود کو بہت وسیع دیکھنا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کائنات کے تمام جھگڑے اس سے طے ہوسکتے ہیں تو «بیان حسن و عشق» کے ترک کردینے میں بھی مضائقہ نہیں۔

ان کی غزل سے ہم کو کسی جگہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے واقعی کبھی کسی سے محبت کی ھے اور اسی لئے جب وہ بر بنائے رسم و رواج معاملات

محبت بیان کرتے ہیں تو ان میں مطلق جان نہیں ہوتی، اس کا فطری میلان تفلسف کی طرف زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص بیان حسن و عشق میں کبھی لوچ اور درد مندی پیدا نہیں کر سکتا.

علی اختر نظمیں خوب لکھتے تھے اور ان کے فکر کی بلندی ان میں بہت کامیاب نظر آتی ہے لیکن چونکہ غزل کی زبان اور غزل کے انداز بیان دونوں نظموں سے مختلف ہیں اس لئے تغزل میں کامیاب نہیں ہیں اور مشکل ہی سے کوئی شعر ان کی غزل کا ایسا ہوتا ہے جو ہمارے دل پر دیر پا اثر چھوڑ جائے اور جب ان کے ایسے ہی شعروں پر نظر پڑتی ہے تو ہم ان کی شعریت اور تغزل کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے:

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں نبض دل دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش! اے جلوۂ جانانہ

جب میں نے سنا ہے نام اس کا
دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

بہت دنوں کی خموشی کے بعد آیا ہے
مری زبان پر ترا نام، دیکھئے کیا ہو؟

رہ گئے کانپ کے کھلتے ہوئے لب
نالہ تا حد شکایت نہ گیا

ستانے سے میرے فرصت تو مل جائے زمانے کو
چلوں، خود بجلیوں کی نذر کر دوں آشیانے کو

بقدر شوق نہ تھا اہتمام سوز و گداز
خمیر خاک میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

حریم کعبہ بنا دی وہ سر زمیں میں نے
تیرے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوت جانفزا تو نہیں
سنی ھے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

تم نے ہر ذرے میں برپا کردیا طوفان شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ !

علی اختر کے کلام « اسرار » اور «انوار» دونوں مجموعوں کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ سنجیدہ اور متوازن شعر کہتے تھے اور افکار عالیہ کو پیش کرنے کے خواہاں تھے ، کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں .

اہل ہمت حلقۂ امواج میں رہتے نہیں رخ بدل دیتے ہیں، طوفانوں کا خود بہتے نہیں
(اپنے بچے سے آخری باتیں)

مختصر یہ کہ علی اختر کی شاعری میں ہیجان ہے نہ طوفاں ، بولی ٹھولی ہے نہ محاورہ بندی ، سوقیانہ پن ہے نہ ابتذال ، نعرہ بازی ہے نہ گروہ بندی ، ہلکا سا فلسفۂ حیات ہے ' متین لب و لہجہ ہے ، غزلوں اور رومانی نظموں میں وہی آہنگ وہی، انداز اور وھی آب و رنگ ھے جو ان کی سنجیدہ اور فلسفیانہ نظموں میں ھے .

راے انیل پرشاد جلیل

دکھنی انوار سہیلی

دکھنی اردو کا ایک قابل قدر ترجمہ

ارف| مولانا حسین واعظ کاشفی کی شہرۂ آفاق حکایاتی تصنیف « انوار سہیلی » کو
۔وستان میں جس وسیع پیمانہ پر قبول عام بخشا گیا وہ کتاب انوار کی عالم گیر
۔ولیت و اشاعت کی تاریخ کا گراں قدر جزو ہے اور اس کا اعتراف پادشاہ اکبر
۔ ابوالفضل علامی سے لےکر استاد براؤں، انسائیکلوپیڈیا برطانیکا، ڈاکٹر گیان چند
۔ پروفیسر آربری تک سب ہی نے کیا ہے۔ [1] ہندوستان میں اس سنسکرت
صل کتاب کی حدِ اعلی « پنچ تنتر » اور اس کے ان گنت علاقائی تراجم کے ہوتے
ئے بھی انوار سہیلی کو جو شہرہ و قبول حاصل ہوا اس کا بڑا ثبوت خود اس کے
بدد دیسی تراجم بہم پہنچاتے ہیں یہ ترجمے نہ صرف کتاب مذکور کی مزید
رت و مقبولیت کا موجب ہوئے بلکہ اپنی اپنی زبانوں کے ادب میں بھی خصوصیت
۔ کئے جاتے ہیں۔ ان کے منجملہ اردو تراجم اس اعتبار سے نمایاں اہمیت کے
مل ہیں کہ السنۂ ہند میں انوار سہیلی کے تمام تر مطبوع و مشہور ترجموں میں
، تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔

انوار سہیلی کے ان اردو ترجموں میں سے اس وقت دکن کے ایک قابل قدر
جمہ « دکھنی انوار سہیلی » [2] کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ ہماری رائے میں یہ

مولانا کاشفی کے حالات اور انوار سہیلی کے عالم گیر آوارۂ شہرت و قبول عام کی تاریخ پر راقم جو تحقیقی
مقالہ لکھ رہا ہے، زیر نظر مضمون اس کے تراجم والے باب کا ایک حصہ ہے چونکہ کتاب انوار
کے شہرہ و قبول کی تفصیلات دیگر ابتدائی ابواب سے متعلق ہیں اس لئے یہاں پر مذکور علما کے حوالے
درج کرنا چنداں ضروری نہیں سمجھا گیا اس تعلق سے دکھنی انوار سہیلی کے تعارف میں جو چند سطور
لکھی گئی ہیں وہ بھی مقالہ کے اس حصہ کے مستقل مضمون کی حیثیت میں ہی مرتب کرنے کے سبب
سے ہیں تاکہ مضمون کا پس منظر واضح رہے
محمد ابراہیم بیجاپوری ثم مدراسی۔ دکھنی انوار سہیلی، مدراس ۱۸۲۴ ع
جناب راے انیل پرشاد، جلیل، خیرت آباد، حیدرآباد (دکن)

رجمہ اس لئے قابل قدر ہے کہ دکن میں اس نے اپنے محدود سبب ترجمہ کو
جاوز کرتے ہوئے اپنی اصل ضخیم فارسی تصنیف کی شہرت کو چار چاند لگائے
ور اس طرح بجائے خود انوار سہیلی کے مضامین و حکایات کے قبول عام کی
سند کی حیثیت حاصل کی، علاوہ ازیں اس کی اہمیت کا ایک اور پہلو یہ بھی
ے کہ صاحب ترجمہ میاں محمد ابراہیم کو ان کے مصنفہ دل چسپ اور پر معنی
دیباچہ کی روشنی میں ابتدائی دکنی ادبا کے درمیان قابل لحاظ مقام عطا کرتا ہے،
ور اسی مقدمہ کی صورت میں دکھنی ادب کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔

دکھنی انوار سہیلی میاں ابراہیم آف ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ ارباب نثر اردو کے تذکرہ نگار کے مطابق «دکن کے قدیم شعرا و مصنفین نے فارسی نظم و نثر کی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا کی اور اپنے محدود دایرہ میں ان کا جو کچھ بھی کارنامہ ہے اس کی پہلی منزل بھی ترجمہ کی ہے۔»[1] میاں ابراہیم اس منزل کی طرف جانے والے دکنی کاروانِ ادب کے رکن رکین تھے اور انھوں نے اپنی اس ادبی کاوش کے ذریعہ دکنی ادب کے اولین قافلہ کو خوش انجامی کے ساتھ سوئے منزل گام زن ہونے میں مقدور بھر مدد دی۔

مترجم کے حالات | «میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خان بن شیخ محمد بیجاپوری حمعدار دکھنی ہزار سواری»[2] نے اپنے حالات میں مقدمہ یا دیباچہ کا زیادہ حصہ وقف نہیں کیا ہے۔ علاوہ ازیں نہ ان کے دیگر ادبی آثار کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی کسی اور جگہ ان کا حال دیکھنے میں آیا۔ مولف «دکن میں اردو» نے اپنے ایک مختصر مضمون[3] میں اجمال کے ساتھ میاں ابراہیم کے حالات لکھے ہیں جب کہ تالیف مذکور کے مختلف گذشتہ ایڈیشنوں میں ان کے حالات زندگی کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوا کہ انہیں بعد میں کہیں ابراہیم کے احوال حاصل ہوئے۔ متوجہ کرنے پر مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ترجمہ کے دیباچہ کے حوالہ سے یہ صراحت فرمائی ہے کہ «میاں ابراہیم کے حالات ان کی کتاب کے دیباچہ میں موجود ہیں۔ باقی حالات بیجاپور کی کسی تاریخ سے حاصل ہوئے

---

۱ سید محمد: ارباب نثر اردو. حیدرآباد طبع ثانی ۱۹۳۷. ص ۳۸۱
۲ دکھنی انوار سہیلی ص ۵
۳ نصیرالدین ہاشمی. انوار سہیلی کا ایک قدیم اردو ترجمہ. سب رس، حیدرآباد، فروری ۱۹۵۲، ص ۹

ہیں۔ کس تاریخ میں داخلہ ہے مجھے اس وقت یاد نہیں۔»[1] موصوف نے «سب رس» میں مطبوعہ اپنے اس مضمون میں جس طرح میاں ابراہیم کا حال اختصار کے ساتھ لکھا ہے اور اپنے ایک مکتوب میں اس تعلق سے جس طرح صراحتیں کی ہیں ان کی بنا پر گمان اغلب ہے کہ خود بیجاپور کی اس تاریخ میں میاں ابراہیم کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں میں نے اس سلسلہ میں مدراس یونیورسٹی کے مولوی یوسف کوکن عمری کو لکھا تھا کہ ان کو اگر معلومات ہوں تو ایسا کریں۔ موصوف نے جواباً تحریر فرمایا کہ «مترجم کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ اگر کمپنی کے مختلف پرانے ریکارڈ تلاش کریں گے تو کچھ معلومات ضرور حاصل ہوجائیں گی۔»[2] اسی بنا پر میں نے مدراس ریکارڈس آفس سے بھی رجوع کیا۔ مگر وہاں سے بھی منفی جواب ملا جو آگے نقل کیا جائے گا۔

میاں ابراہیم کے بارے میں تحصیلہ محدود تر ہے علم و اطلاع کے سبب ان کے عہد حیات کے سنین بھی متعین نہ کئے جاسکے۔ بقول پروفیسر حامد حسن قادری یہ اردو کے اولین عہد کے مشہور ادیب «مرزا رجب علی بیگ کے ہمعصر ہیں»[3]

<u>مترجم میاں ابراہیم کا پیشہ</u>| باعتبار پیشہ یہ دو حیثیتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ابتداً تو انھوں نے اپنے نام اور ولدیت کے ساتھ پیشہ «جمعدار ہزار سواری» لکھا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ جو اضافہ کرتے ہیں کہ «میں ایک سردار نامدار پاس نگار تعلیم مامور ہوں»[4] اس سے یہ عیاں ہے کہ یہ یا کالج آف فورٹ سینٹ جارج میں مدرسی کے عہدہ پر فائز تھے یا پھر اپنے قریبی «برادر نامدار» کے ہاں خانگی طور پر تدریسی خدمت انجام دیتے تھے۔ بجائے کالج کے، دوسری صورت قرین قیاس ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں انگلستان کے نو آمد عہدہ داران کمپنی مقامی زبانیں سیکھنے کے لئے انگریزی سے شد بد واقف اساتذہ کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت کمپنی کی دو ملازمتیں (بحیثیت جمعدار دکنی ہزار سواری اور بطور معلم

---

۱ نصیرالدین ہاشمی، مکتوب مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۱

۲ محمد یوسف کوکن عمری، ریڈر شعبہ عربی و فارسی و اردو۔ مدراس یونیورسٹی مکتوب مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۶۱

۳ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، آگرہ ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۷

۴ دکنی انوار سہیلی ص ۹

کالج مذکور) نہیں کرسکتے تھے. تیسری اور زیادہ قوی وجہ یہ ہے کہ خود محمد ابراہیم نے اس تعلق سے اشارہ کیا ہے. چنان چہ ان کے اس اگلے بیان سے کہ «ان دنوں میں ان کی مزاج نازک فہم زبان دکھنی کی فہمیدگی پر مایل ہے اور اس غریب سے تیاری زبان پر سایل » [1] یہ بات ثابت ہوجاتی ہے.

رہا ان کا پیشۂ سپاہ گری، تو اس بارے میں انہوں نے صراحت کردی ہے کہ جمعداری ہزار سواری تھے. حیدرآباد میں آج کل جمعدار کی دفتری اصطلاح بالکل معمولی خدام کے لئے مخصوص ہے یعنی وہ زیادہ تنخواہ یاب چپراسی جو کسی اعلیٰ عہدہ دار کی پیشی میں رہتا ہو ؟ اور فوج میں بھی یہ کوئی ممتاز خدمت نہیں رہی، مگر میاں ابراہیم کے وقتوں میں یہ یقیناً ایک اچھا خاصہ عہدہ اور اعزاز رہا ہوگا کیوں کہ ایک جمعدار ایک ہزار سوار کے دستہ یا پلٹن کا ذمہ دار افسر ہوتا تھا حیدرآباد میں آصفی دور میں بھی جمعدار فوج کے ایک اونچے افسر کا نام تھا. اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ کس طرح ترقی کرتے ہوئے اس اونچی خدمت پر پہنچے. معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں میاں ابراہیم نے «آبائی پیشۂ سپاہ گری ترک کردیا تھا، مگر جمعداری کی خدمت باقی تھی » [2] جو شاید اعزازی رہی ہوگی.

دیگر حالات | میاں ابراہیم بیجاپور کے متوطن تھے، پھر کمپنی کی فوجی ملازمت کے سلسلہ میں مدراس میں قیام رہا جہاں ان کا یہ ترجمہ بھی شائع ہوا ؟ اس کے بعد شاید وہ پھر وطن چلے گئے، اور پھر انھوں نے وطن « بیجاپور کو ترک کرکے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی تھی » [3] یہ ان کی زندگی کا آخری دور رہا ہوگا اور شاید انھوں نے یہیں پر داعی اجل کو لبیک کہا. افسوس ہے کہ ان کی سپاہیانہ اور ادبی زندگی کے ان مختلف ادوار میں سے کسی کا حال دریافت نہوسکا. جمعدار ابراہیم کے ہاں جاگیر بھی تھی اور « ان کی یہ جاگیر ان کی آبائی تھی، کمپنی سرکار سے نہیں ملی تھی. » [4]

ان کے انتقال کے بارے میں قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے، چوں کہ اخیر میں وہ یہیں پر یعنی حیدرآباد میں اقامت پذیر ہوگئے تھے اس لئے اغلب یہی

---

۱ دکھنی انوار سہیل ص ۱۰

۲ ہاشمی سب رس، فروری ۱۹۵۲ ص ۹

۳ ایضاً

۴ ہاشمی خان: مکتوب مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۱

ہے. بقول مولوی ہاشمی صاحب « قراین سے تو یہی پایا جاتا ہے مگر یہ یقین نہیں کہا جاسکتا، ظاہر ہے کہ جب حیدرآباد میں سکوت اختیار کرلی تھی تو انتقال بھی یہیں ہوا ہوگا. » [۱]

دکھنی انوار سہیلی | مترجم کا مقدمہ پاکیزہ مطالب اور دلکش اسلوب بیان کے فیض خاص قدر و قیمت کا حامل ہے، مگر کتاب کے ترجمہ میں اس نے دکن کی عامیانہ بول چال کی زبان برتی ہے جو اس کے وقتوں میں مروج تھی. اسی وجہ سے یعنی زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی « لسانی اور ادبی پسماندگی » کے سبب یہ شمال میں معروف ہوسکا اور السنۂ ہند اور بالخصوص اردو میں کتاب انوار کے تراجم میں اپنا صحیح مقام و مرتبہ نہ پاسکا. پروفیسر سید محمد نے دکنی انوار سہیلی سے متقدم یعنی ابتدائی عہد کے مشہور دکنی ادب کی شمال کو عدم ترسیل کا پس منظر بتاتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ « شمالی ہند دکن کی ادبی سرگرمیوں سے بہت بڑی حد تک بےخبر تھا. » [۲] اردو ادب کے تئیں دکن کی خدمات سے شمالی ہند کی اس لاعلمی کی ایک بڑی وجہ موصوف نے رسل و رسایل کی مشکلات قرار دی ہیں. « ذرایع آمد و رفت کی قلت اور بُعد مسافت کی وجہ سے اہل دکن کی علمی ترقیاں اور ان کے ادبی کارنامے کوہ بندھیاچل سے آگے نہ جاسکے. نظم سے جو دلبستگی رہی اس کی وجہ سے شعرائے دکن کا کچھ نہ کچھ کلام وقتاً فوقتاً شمالی ہند والوں کی بھی ضیافت طبع کرتا رہا، مگر اہل دکن کی نثر سے شمالی ہند کو واقف ہونے کا موقع نہ ملا » [۳] موصوف کی یہ رائے دکن میں نثر اردو کے اولین ادبا اور ابتدائی عہد کی نثر نگاری سے متعلق ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ کافی بعد کے دور تک اس سمت کا اطلاق ہوتا ہے. چنانچہ محمد ابراہیم کی اس دکھنی انوار سہیلی کی شمال کو عدم ترسیل کے تعلق سے بھی ہماری یہ رائے ہے کہ اس میں اس کے کم تر ادبی معیار کے ساتھ آمد و رفت کے موانعات کو بھی مساوی دخل تھا. اگر اس کا کوئی نسخہ شمالی ہند پہنچا تھا تو بھی محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار

---

۱ ہاشمی صاحب: مکتوب مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۱

۲ ارباب نثر اردو ص ۵

۳ ایضاً

سے کم تر حیثیت کا ہونے کے سبب یہ شمال میں بار نہ پاسکا، درحالیکہ اس وقت تک شمالی ہند میں انوار سہیلی کا کوئی اردو ترجمہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ (واضح ہو کہ فقیر محمد گویا نے اپنا مشہور ترجمہ «بستان حکمت» زیر نظر دکنی ترجمہ کی اشاعت کے بارہ سال بعد ۱۸۳۶ع میں کیا تھا، اور ابراہیم سے پہلے دکن میں ہی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔)

ادبی مورخوں کے ہاں: اردو ادب کے کسی بھی مورخ یا کلیلہ و دمنہ کے سلسلہ تصانیف کی ادبی تاریخ کے تذکرہ نگاروں کے ہاں اس ترجمہ کا تفصیلی ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ [۱] نے اس کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کلیلہ و دمنہ کے سلسہ کی تصنیفات و تراجم کی اپنی طویل فہرست [۲] میں اس ذکر کرنے کے باوجود اس کی تفصیلات سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «لیکن اس کے بارے میں تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں» پروفیسر حامد حسن قادری [۴] نے نثر اردو پر اپنی بسیط تاریخ میں اس کا تذکرہ محض نصیر الدین ہاشمی کی «دکن میں اردو» کے حوالہ سے کیا ہے۔ تاہم چونکہ محمد ابراھیم نے یہ ترجمہ مدراس کے زعمائے کپمنی کی تحریک اور ان ہی کی سرپرستی میں کیا تھا اس لئے انیسویں صدی کے اواخر کے برطانی محقق اس سے ناواقف نہ رہے، چنانچہ جورف جیکبس [۵] نے پنچ تنتر کے سلسلہ کے عالمی ادب کے شجرہ میں اسے شامل کیا ہے جب کہ اسی شجرہ سے گویا کہ مشہور تر ترجمہ سے اس کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے نیز بلوم هارٹ [۶] نے بھی اپنے کیٹلاگ میں ایک غیر مطبوعہ متقدم دکنی ترجمۂ انوارِ سہیلی کے یوروپی نسخوں ذکر کرتے ہوئے میاں ابراھیم کے ترجمۂ کا حوالہ دیاہے۔ پنچ تنتر کے سلسلہ کے بین الاقوامی لٹریچر کے محقق اور فاضل پروفیسر ایڈگرٹن کا تو ذکر ہی کیا، انہوں نے

---

۱ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ نولکشور لکھنؤ، ۱۹۵۲ع حصہ نثر ص ۱۳
۲ گیان چند۔ اردو کی نثری داستانیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۴ع۔ ص ۵۲۹۔
۳ گیان چند۔ مکتوب مورخہ ۱۲، اپریل ۱۹۶۱۔
۴ داستان تاریخ اردو ص ۲۳۷۔
۵ Joseph Jacobs: Genealogical table, in his edition of the Moral Philosophie of Doni. 1888.9
۶ F. Blumhardt: Cat. of the Hindustani Mss. in the Library of the India Office 1926. P. 45

اپنے شجرہ میں انوارِ سہیلی کے تمام اردو تراجم کو عض شاوں کے حوالہ سے "Hindustani and Dakhni Versions, See chauvin" [1] لکھ کر اس طرح قلم انداز کردیا ہے جیسے یہ کسی اعتبار سے بھی ان کے نزدیک قابل ذکر نہ ہوں، گو ممکن ہے کہ خود شاون [2] نے بھی ان کا مختصر سا ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہو. براکلمن [3] بھی علی واصی کے ترکی «همایون نامه» کے سوا انوار سہیلی کے دیگر تراجم کا کوئی حال بیان نہیں کرتا ہے، اور شاید اسی ہی کی تقلید میں نیاز فتح پوری [4] نے اس کے تمام ہندوستانی تراجم کو ذکر سے خارج کردیا بالکل حال میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی [5] نے اس ترجمہ کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے کئی نسخے بمبئی (رزیڈنسی) کے علاقہ میں بھی پہنچے تھے

دکھنی انوارِ سہیلی کا سنِ ترجمۂ: افسوس ہے کہ وثوق اور قطعیت کے ساتھ اس کے سن ترجمہ کا پتہ نہ چل سکا، اور داخلی قراین یا کم از کم خارجی حوالوں کی عدم موجودگی میں یہ ممکن بھی نہ تھا. صرف سنِ اشاعت معلوم ہو سکا ہے ہے اور اسی کی بنا پر عہد ترجمہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے کتاب کے سرورق کے مطابق یہ مدراس میں ۱۸۲۴ میں شائع کی گئی تھی، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۸۲۰ تا ۱۸۲۴ کے درمیانی عرصہ میں کیا گیا ہوگا. چنانچہ سنِ اشاعت کی روشنی میں نصیر الدین ہاشمی [6] نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ترجمہ اس سے قبل کے کچھ عرصہ میں کیا گیا ہوگا. بلوم ہارٹ نے اس ترجمۂ کے ذکر میں لکھا ہے·

There is another Dakhni translation of the Anwar Suhaili, made by Munshi Muhammed Ibrahim Ibn Malik Husain Khan in A. H. 1237 (A. D. 1822) published at Madras, 1824. [7]

بلوم ہارٹ کے ماخذ سے ہم واقف نہیں، لیکن اس کے باوجود اس قیاس کی روشنی

---

۱ Edgerton Genealogical table in C H Tawney's Ocean of story, ED By Penzer. V 1925.

۲ V Chauvin Bibliographie des ouvrages arabes Vol II 1897. P. 13 F.

۳ Brockelmann Kalila & Dimna in Encyclopaedia of Islam V II 19271. P. P. 694-6918.

۴ نیاز فتح پوری: نگار معلومات نمبر جنوری ۱۹۰۸. کلیلہ و دمنہ. ص ۱۵

۵ نجیب اشرف ندوی: نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱. ہندوستانی سلکشن ص ۳۰

۶ ہاشمی صاحب: سب رس فروری ۱۹۵۲ ص ۹

۷ Blumehardt: op. cit.

ں کہ کتاب کی اشاعت سے دو چار سال پہلے ترجمہ کیاگیا ہوگا، بلوم ہارٹ کا دیا
ا یہ سن ترجمۂ قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔
اب کی ترتیب: دکنی انوارِ سہیلی کا آغاز ایک طویل منظوم حکایت سے ہوتا ہے۔
ں کا نصف اول باری تعالیٰ کی حمد پر مشتمل ہے، جس میں اس شعر گو مترجم
، مشہور مختصر سورۂ پاک «قل ھو اللہ احد» کی آیات کریمہ اور مطالبِ جلیلہ کی
اس پر خدائے بزرگ و برتر کی ثنا موروں کی ہے۔ چند ابتدائی اشعار
لاحظہ ہوں: (ص ۳)

سپاسِ خدا ہووے کیوں کر رقم
کہ ھی لال اوس جا زبانِ قلم
اگر اوس محل میں قلم ہو رواں
تو ہو لوح سے سادہ لوحی عیاں
ہو کیوں کر قلم بیاں برانگیختہ
کہ ہے طایر فکر پر ریختہ

س منظومہ کا دوم نصف ایک مزاحیہ مگر سبق آموز حکایت پر مشتمل ہے۔ اس
طویل نظم کے اختتامی اشعار یہ ہیں: (ص ۵)

سپاسِ الٰہی ہے امر رفیع
نہ ہووے کسو سے بغیر از شفیع
اگر ہو تو توفیق کا فتح باب
صلواۃ و سلامِ نبی ہے صواب
فصلو علیٰ سیدالمرسلین
علیٰ آلہ صحبہٖ اجمعین

اس کے بعد ہی مقدمہ بعنوان «سبب تالیف کتاب» شروع ہوتا ہے: «جب میں نے اپنا عجزو انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطابِ مستطاب پایا کہ اے میاں محمد ابراهیم .... » (ص ۵). اس دیباچے کے بھی دو حصے ہیں۔ کم و بیش پہلے نصف حصہ میں قاضی دل کے رو برو ایک دل چسپ مقدمہ پیش کیا گیا ہے جو با مقصد اور پر معنی ہی نہیں بلکہ ادبی خصوصیات سے بھی متصف

ہے۔ دیباچہ کے نصف ثانی میں مترجم نے اپنے مربی کا تعارف نثر اور صنعت توشیح میں اشعار لکھ کر کرایا ہے اور پھر سبب ترجمہ بیان کیا ہے۔

کتاب میں دکھنی تحریر کا آغاز (ص ۱۲) پر صاحب انوار کے مختصر ترین تعارف کے ساتھ ہوتا ہے۔ «(ملا حسین) ایسے عالم تھے کہ اب ہزتم میں بستی لے کو ڈھونڈے تو ایسے کوئی نہیں ملیں گے .... » اس کے بعد مترجم نے «حضرت ملا حسین بن علی الواعظ انوار سہیلی کا احوال لکھے ہیں سو یوں ہے» کے عنوان سے اسی صفحہ پر مولانا کے مقدمہ کی تلخیص پیش کی ہے۔ ترجمہ کا خاتمہ «ابیات» کے نام سے گیارہ نعتیہ اشعار لکھ کر کیا ہے۔ آخری شعر یہ ہے: (ص ۴۰۱)

حمد کے صدقے سوں قصہ تمام ہوا بر محمد صلوات و سلام

(ص ۴۰۳) سے «غلطنامہ ترجمہ انوار سہیلی کا» شروع ہوتا ہے، اور ص ۴۱۳ سے «دکھنی انوار سہیلی کی لغات کی ڈھنگ» دی گئی ہے جس پر اس کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اس ترجمہ کا سرپرست | اس ترجمہ کی تحریک اور سرپرستی کس نے کی، یہ کسی قدر پیچیدہ سوال ہے، اور سرورق کی واضح شہادت کے باوجود اس لئے پیچیدہ ہے کہ مترجم نے عالم خیال کے کنج عافیت میں حضرت دل سے اپنے «اعضائے بانکار» کے گرما گرم مباحث کو «عبارات فشنگ» کا پیکر عطا کرنے کی فکر میں اس موضوع کو اشاروں کنایوں کا نشانہ بنا کر رکھ دیا

سرورق سے پتہ چلتا ہے کہ مدراس کے کالج آف فورٹ سینٹ جارج کی مجلس انتظامی Board of Superintendence کے حکم سے یہ ترجمہ کیا گیا تھا، مگر مترجم نے اپنے مقدمہ میں نظمائے کالج کے کسی حکم نامہ کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ وہ اس تعلق سے ایک «سردار نامدار» کا حوالہ دیتا ہے جس کے ہاں وہ «بکار تعلیم» مامور تھا۔ اس ممدوح کا ذکر اس نے کافی جوش اعتقادی سے کیا ہے مگر اس کا نام وہ صنعت توشیح سے ظاہر کرتا ہے: «ان کا قامت زیبا لباس صفات سے آراستہ اور ان کا حال مصفا زیور فضل و کمال سے پیراستہ۔ ان کا نام صنعت توشیح سے ظاہر کرتا ہوں۔ ان ابیات کے سر حرف سے صاحبان ذہین کے روشن خدمت ہوگا۔

طاق ہے جس کی جگ میں عقل و ہنر اس کے اصطبل کا فلاطوں خر
ہمت اس کی سے ہو خجل حاتم ہے سخاوت کے ہات کی خاتم
مکنت اس کی ہے مکنت جمشید ہووے دولت زیادہ عمر مزید
آب و آتش ہیں اس کے دولت خواہ جس سے آداب پا ئے کسریٰ شاہ
سروری میں ہے وہ فریدوں جاہ بردباری لے اس کے پاس پناہ
ہات میں اپنے جب کہ لیوے تیغ مارے رستم کو بلکہ چیرے میغ
نوک جب جیبھ کی سخن پر آے [منہ میں محباں کے تھوک لپٹے جاے
رنگ آمیز گر ہو بر تصویر مانی آ ہوئے دست بوس پذیر]
یک ذرہ وہ کرے اگر ارشاد شیریں بن جاوے کوہ کن فریاد
مات ستّا دھریگا زید کے سر جب کہ آوے گا اپنی بازی پر
ہوش جاں تک کرے اگر می ناب کرے بہرام گور کو بے تاب
کانِ احساں و معدنِ اشفاق ہے عجب ذی مروت و اخلاق [۱]

صنعت توشیح سے عدم واقفیت کے سبب راقم میاں ابراہیم کے سرپرست سردار نامدار کا نام دریافت نہ کرسکا. جناب سلیم‌الرحمن نے مضمون کا مسودہ [۲] پڑھ کر یہ خیال ظاہر کیا کہ صنعت توشیح سے جو نام مربی کا نکلتا ہے وہ کچھ (Thomas Heine Mann) سے مشابہ ہے. اس زمانے میں ہندوستانی لوگ انگریزی نام بہت غلط سلط لکھتے تھے. اگر آپ اس زمانہ کے مدراس کے اہم انگریز عہدہ داروں کے نام نکال کر دیکھیں تو شاید کچھ مدد ملے [۳]. اس تعلق سے میں نے مولوی یوسف کوکن عمری کو لکھا مگر انہوں نے بھی اپنی عدم واقفیت کے سبب کمپنی کے ریکارڈس میں تلاش کرنے کے لئے کہا. «کمپنی کے افسر اور مترجم کتاب کے متعلق بھی کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں. مدراس کے پرانے

---

۱ دکھنی انوار سہیلی ص ۱۰

۲ صاحب مضمون ابراہیم کے صنعت توشیح کے سب اشعار کتاب کی خستہ حالت کی وجہ سے نقل نہ کرسکے اسلئے نام کا دوسرا اور تیسرا صحیح نہ پڑھے جاسکے. ہمارا خیال ہے کہ یہ کوئی فوجی افسر تھا. اس الگ (Surname) کے متعدد افسر مدراس میں تھے جو تین مصرعے بڑھائے گئے ہیں ان کو قوسین کے ذریعہ ظاہر کردیا گیا ہے. (ایڈیٹر)

۳ سلیم‌الرحمن مدیر ہفتہ وار نصرت لاہور. مکتوب مورخہ ۲۴-۱۰-۶۱ع

گزٹ اور اخبارات میں تلاش کیا جائے تو اس افسر کا نام مل جائے گا»[1]۔ سوئے اتفاق کہ ڈائرکٹر مدراس ریکارڈس آفس سے رجوع کرنے پر بھی کچھ مواد نہیں مل سکا اور معلوم ہوا کہ "The printed reference books available in this office have been examined but no information relating to Jamadar Munshi Ibrahim and Thomas Heine Mann referred to in your letter cited could be traced."[2]

اس ترجمہ کے محرکات: سر ورق پر مسطور ہے کہ یہ ترجمہ مدراس کے افسرانِ فوج Military Officers of the Madras Establishment کے لئے کالج آف فورٹ سینٹ جارج کی مجلس انتظامی کے حکم سے کیا گیا تھا بابائے اردو مرحوم نے بھی ایک جگہ یہ صراحت فرمائی تھی کہ میاں ابراھیم نے یہ ترجمہ حکم بورڈ آف سپرنٹنڈنٹس کالج فورٹ جارج مدراس برائے تعلیم عہدہ داران فوجی[3] کیا تھا۔

مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ میاں ابراہیم نے سبب تالیف کتاب میں اس جانب کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ترجمہ کے محرکات کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے فقط ایک سبب یعنی کالج کی مجلس نظما کا حکم نہیں تھا بلکہ چند دیگر عوامل تھے جن کی بنا پر مجلس انتظامی نے یہ حکم دیا۔ مقدمۂ کتاب میں مترجم کے بیانات اور دیگر آثار و شواہد سے اخذ کرکے ہم نے اس ترجمہ کے متعدد محرکات کا پتہ چلایا جن کی تفصیل ذیل میں ترتیب وار پیش کی جاتی ہے۔

صنعت توشیح سے اپنے مربی « سردار نامدار » (معروضہ طور پر طامس ہاین من) کا نام ظاہر کرکے محمد ابراہیم نے اس کے الطاف و عنایات اور نور انوار سہیلی کے ترجمہ کی تحریک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ «ان دنوں میں ان کی مزاج نازک فہم زبان دکھنی کی فہمیدگی پر مایل ہے اور اس غریب سے تیاری زبان پر سایل، پاس نمک مقتضی ہوا لہذا کہہ اٹھا کہ زبان میری دوست جانی اور سخن گوئی میں یگانۂ زمانی، فصاحت شعار اور بلاغت آثار، اور حضرت دل نے

---

۱ محمد یوسف کوکن عمری مدراس یونیورسٹی۔ مکتوب م ۳-۱۲-۶۱ع

۲ S. Chidambaram, Curator Madras Record Office D. O. No. 5192 D7/61-2 D/9-12-61.

۳ مولوی عبدالحق: اردو، حیدرآباد، جولائی ۱۹۲۲ میں مطبوعہ شیخ محمد اسمعیل پانی پتی کے مضمون (متعلق تراجم کتب کلیلہ و دمنہ) میں انوار سہیلی کے اردو ترجموں کی فہرست پر حاشیہ میں دکنی تراجم کے بارے میں تصریح ص ۴۰۵

اس کو اس غریب کے تحویل کیا تا کہ سرگوئیائی رہے لہذا دعا گو چاہتا ہے کہ فارسی انوار سہیلی کے تمہیدات مسلسل و نقلیات مفصل کو بعینہ زبان دکھنی میں ترجمہ کرے » (ص ۱۰). اس منزل پر اس کو اپنے مربی سردار نامدار کا سایۂ تشویق حاصل ہوا اور اس نے مترجم کی ہمت افزائی کی. « تب وہ صاحب عالی مناقب فرمائے کہ اس امر شایستہ و کار بایستہ (یعنی ترجمۂ انوار سے) سرداران ذی شان و حاکمان زماں کی خدمت میں باعث نام‌آوری ہوگی اور زبان مذکور بھی از سر نو زندگی پاوے گی. پس یہ ہیچمدان اس بات کو مغتنم سمجھا اور فرمایش سردار کی قبول کیا » (ص ۱۰ و ۱۱).

میاں ابراہیم کا ذوق ادب: « دعا گو چاہتا ہے کہ فارسی انوار سہیلی کے تمہیدات مسلسل و نقلیات مفصل کو بعینہ زبان دکھنی میں ترجمہ کرے ». یہ ہیں وہ الفاظ جن سے مترجم کے ادبی ذوق اور ناصحانہ اخلاقی لٹریچر سے اس کی دل چسپی کا بے‌ساختہ اظہار ہوتا ہے؛ اور یہی الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ ان کا ادبی ذوق و شوق ہی تھا جو کتاب انوار کو دکنی اردو میں منتقل کرنے کے لئے ان کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا. معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط ایک تحریک و تشویق کے منتظر تھے؛ چنانچہ جوں ہی ان کے سرپرست سردار نامدار کا « مزاج نازک فہم زبان دکھنی کی فہمیدگی پر مایل » ہوا، ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ اب دل پذیر و پر معنی افسانوں کے مجموعہ انوار سہیلی کو دکنی زبان کا قالب پہنائیں تاکہ ان کے ادبی ذوق کو اس سے تازگی ملے اور ان کا سرپرست بھی دکنی کی تحصیل کے سلسلہ میں اس سے استفادہ کرے. اپنی زبان دانی پر ان کو اس قدر ناز تھا کہ فاخرانہ کہتے ہیں « زبان میری دوست جانی اور سخن گوئی میں یگانۂ زمانی » تب ہی تو حضرت دل نے ترجمہ کا یہ کام ان کے تفویض کیا کہ لو اب اپنی « فصاحت شعار اور بلاغت آثار » قلم کاری اور قدرت زبان و بیان کے جوہر دکھاؤ. آگے ان کے مقدمہ کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جسے ملاحظہ کرکے ناظرین بخوبی اندازہ فرماویں گے کہ ان کی یہ خودستائی ان کی اپنی استعداد کے بارے میں مبالغ عام پر مبنی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ان کا حسن ظن تھا بلکہ وہ واقعی اس تعریف کے قابل تھے.

ان الفاظ اور طرز بیان کی بنا پر یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ « محمد ابراہیم

کو ادب سے خاص ذوق تھا ، اسی شوق کے مد نظر اس نے انوار سہیلی جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا » [1]. گو کہ مترجم کے اس شوق ادب کی شہادت میں ان کی کوئی اور شعری یا نثری تخلیق پیش نہیں کی جاسکتی ، یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کا یہ ادبی ذوق ہی اس ترجمہ کا بنیادی محرک تھا ۔

سردار نامدار کی ہمت افزائی : آثار و قراین سے جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس ترجمے کے لئے میاں ابراہیم کو عملاً ان کے سردار نامدار کی ہمت افزائی نے راغب کیا اور اس لحاظ سے اس کام کا نقطۂ آغاز یہی محرک تھا ۔ وہ چوں کہ « دکھنی کی فہمیدگی پر مایل » تھا اس لئے اسے مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلہ میں اس دل پسند حکایاتی کتاب کو دکھنی میں منتقل کروالے اور اس کا مطالعہ کرے ۔ جب اس نے ان حضرت کو خوشی آمادہ پایا اور اس پر ان کے جوہر زبان دانی کھلے تو پھر اس نے اس کام کو « امر شایستـــہ و کار بایستہ » کا نام دے کر محمد ابراہیم کو شوق دلایا اور یہ کہہ کر ان کی ہمت بڑھائی کہ اس سے ایک تو « سرداراں ذی شان و حاکماں زماں کی خدمت میں باعث نام آوری ہوگی » اور دوسرے اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ترجمہ فیض « زبان مذکور بھی از سر نو زندگی پاوے گی ۔ »

کالج آف فورٹ سینٹ جارج کی سرپرستی : یہاں ہمیں کچھ قیاس آرائی سے کام لینا ہوگا ، کیوں کہ میاں ابراہیم کا یہ مربی بالکل پردۂ اخفا میں ہے اور یہ معلوم ہوسکا کہ وہ کون شخص تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں کس حیثیت و پوزیشن کا مالک تھا ۔ گمان اغلب ہے کہ مترجم کا یہ بے نام سرپرست کمپنی مدراس یا کم از کم اس کالج میں کسی اعلیٰ عہدہ پر متمکن تھا ، اور واقعہ یہ ہے کہ محض اس قیاس کی بنا پر ہی « سرداران ذی شاں » کے سامنے ترجمہ و مترجم کی نام آوری کے عنوان سے مترجم کی ہمت افزائی سے لے کر ترجمہ کی اشاعت تک کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں ۔

ابراہیم کے سرپرست نے یہ باور کرا کے ان کی ہمت بندھائی کہ اس ترجمہ کے ذریعہ وہ اعیان حکومت کی خوشنودی حاصل کرسکیں گے ، اور پھر اس نے خود یا اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر کالج کی مجلس نظما میں تحریک

---

[1] ہاشمی صاحب : سب رس ، فروری ۱۹۵٦ ص ۹

کی اور اسے منظور کرایا کہ مدراس کی سپاہ کے لئے انوار سہیلی کو دکنی میں منتقل کرواکے سرکاری طور سے* شایع کیا جائے۔ اس طرح ایک ساتھ دو کام ہوگئے، یعنی میاں ابراہیم کے مربی نے ترجمہ کی اشاعت کا انتظام کرکے ان کی خوشی اور مالی منفعت کا سامان کیا اور اس ترجمہ کا فیض بھی عام کردیا۔

کالج کی سرپرستی کے حصول میں آسانی | مترجم کے سرپرست سردار نامدار کو اس ترجمہ کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے کالج کے انتظامی بورڈ کو راضی کرنے میں زیادہ مشکل درپیش نہ آئی ہوگی کیوں کہ اس وقت اس غرض کے لئے ایک بڑی اچھی اور معقول وجہ پہلے سے موجود تھی۔ وہ یہ کہ اس سے قبل برطانیہ میں ہندوستانی سول سرویس کے اعلیٰ امتحانات کے شرکت کنندگان کی فارسی استعداد اور معیار زبان دانی کا اندازہ قائم کرنے کی غرض سے ارباب کمپنی نے انوار سہیلی کے ضخیم متن کو شامل نصاب کیا تھا۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی یہ تصنیف کلیلہ و دمنہ کے سلسلہ کے لٹریچر میں زبان و بیان کے اعلیٰ اور مشکل معیار کے سبب خاصی معروف تھی، اور اسی لئے ارباب کمپنی کو یہ تحریک ہوئی کہ اس ادق تصنیف کو جو ایک خاصے پسندیدہ موضوع کی حامل بھی تھی اپنے اعلیٰ عہدوں کے امیدواروں کی زبان دانی کا معیار بنائیں اور اپنے مسابقتی امتحانات کے فارسی نصاب میں شامل کریں۔[۱]

پس جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے کل ہند سطح پر کتاب انوار کا مطالعہ اپنے عہدہ داروں کے لئے سرکاری طور پر لازم قرار دیا، تو کیوں نہ اس کو دکنی زبان میں منتقل کروا کے اس دکنی ترجمہ کو دکنی افواج میں عام کردیا جائے۔ اسی بنا پر مدراس میں کمپنی کے ارباب بست و کشاد یا کم از کم نظمائے کالج کو میاں ابراہیم کے ترجمہ کو سرکاری حیثیت دینے میں کچھ عذر نہوسکتا تھا۔

---

۱ الف: E. G. Browne - A Lit. Hist. of Persia, Vol III, Camb. 1928. p 504

ب: Brockel Mann - Op. Cit. P 696.

ج: Encycl. Brittanica - Bidpai, Fables of Vol. III, 1929, p 548

د. چناں چہ انوار سہیلی کا پہلا اور بہت عمدہ ٹائپ ایڈیشن ایسٹ انڈیا کمپنی کے منیجر سٹوارٹ کے اہتمام سے کلکتہ میں ۱۸۰۴ میں طبع ہوا۔ ناظرین یہ جان کر تعجب کریں گے کہ کمپنی کے مذکورہ لزوم نے ہی اس کتاب کو انگریزی داں دنیا سے متعارف کرایا اور اسی تعارف کے بعد انوار سہیلی نے یورپ کے فارسی دانوں میں ایک خاص مقبولیت حاصل کی اور مغربی زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کئے گئے۔

یہ ترجمہ عہدہ داران فوج کے لئے تھا یا دکنی سپاہ کے لئے | اوپر ہم نے «دکنی افواج» کے الفاظ استعمال کئے ہیں جب کہ کتاب کے سرورق کے بموجب یہ ترجمہ افسران فوج Military Officers کے لئے کیا گیا تھا، اور مولوی عبدالحق نے بھی قبل ازیں محولہ صراحت میں «برائے تعلیم عہدہ داران فوج» لکھا ہے

ہماری رائے میں یہاں «ملٹری آفیسرس» سے فوجی عہدہ دار مراد لینا درست ہوگا، گو کہ اس کے لفظی معنی یہی ہیں. ہم سمجھتے ہیں کہ درحقیقت اس سے محض عام سپاہ مراد ہیں نہ کہ افسران فوج. اس اختلافی خیال کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اصل ترجمہ کی عبارت بالکل ہی معمولی اور ادنیٰ طرز کی ہے. اور یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ فوج کے عہدہ دار صاحبان کے لئے اس قدر آسان بلکہ عامیانہ اسلوب نگارش کے ترجمہ کی ضرورت تھی جب کہ برعکس اس کے مترجم کا مختصر سا دیباچہ یا مقدمہ بہت اچھی اور صاف زبان میں ہے. زبان و بیان اور مطالب دونوں کے ہی اعتبار سے یہ دیباچہ معمولی سپاہ کے فکر و فہم کے بس کا شغل نہیں معلوم ہوتا. چوں کہ محمد ابراہیم نے اپنا مقدمہ فقر و درویشی کا شوق اور ادب سے ذوق رکھنے والوں کی پسند خاطر کے پیش نظر لکھا تھا اور ترجمہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے معیار مطالعہ کے مطابق کیا تھا اس لئے اغلب ہے کہ یہاں پر ملٹری آفیسرس سے مراد عام دکنی سپاہ ہیں نہ کہ کمپنی کی فوج کے عہدہ دار.

کتاب کا انتخاب | جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا ہے، کتاب کا آغاز ایک طویل نظم سے ہوتا ہے جو بالترتیب حمد و ثنا اور ایک مراجعہ مگر نصیحت آمیز حکایت پر مشتمل ہے. ان دونو حصوں کے چند ابتدائی اشعار درج ہیں.

سپاس خدا ہووے کیوں کر رقم | کہ ہے لال اوس جا زبان قلم
اگر اوس محل میں قلم ہو رواں | تو ہو لوح سے سادہ لوحی عیاں
ہو کیوں کر قلم یاں برانگیختہ | کہ ہے طایر فکر پر ریختہ
ہوا جب سے قائم صمد لا علم | زباں کا مرے تب ہوا سر قلم
سرِ لَم یَلِد جب ہوا برقرار | کیا لشکر شرک یکسر مزار
وَلَم آ لگا جب کہ یُولد کے سات | دوئی سے بَری ہوگی اس کی ذات
ملا لَم یکن سے کُفُواً احد | ہوئی ذات یکتا پہ پوری سند (ص ۳)

حکایت کا آغاز ملاحظہ ہو :

ز اخبـــار دان کہن ہے بیاں لکھا ہے کوئی راوی باستاں
جہالت کے دریا کے تھے دو نہنگ ہدایت کے وادی کے تھے پاے لنگ
تھے غول بیابان مردم فریب انھوں سے تھا غول بیاباں کو زیب
تکاسل کے دفتر کے عنوان تھے تجاہل کے وادی کے شیطان تھے
انھوں کا ہوا بارے یک دن گزر جو یک مرغزار خوش آئین پر
وہ تھی جائے بس جاں فزا دل کشا وہ سبزی کا عالم وہ ٹھنڈی ہوا
وہ صحرا نہ تھا بلکہ تھا رشک باغ کہ دیکھے سے جسکے ہو روشن دماغ
وہاں تھا درخت ایک بس تازہ تر کمر بستہ استادہ ایک پاؤں پر
کہ تھا جس کے سائے کا دامن دراز چو دامان معشوق عـاشق نواز

اس کے بعد « سبب تالیف کتاب » کے زیر عنوان اولاً ایک دلچسپ مقدمہ کا حال لکھا ہے . اس عنوان سے مضمون یوں شروع ہوتا ہے ، « جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب پایا کہ اے میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خـان بن شیخ محمـد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری تو نے کہا کـہ اگر کسو نے مجھ سا فقیر زماں اور کسیف دوراں اس جہاں بے پایاں میں بغور تمام ملاحظہ کیجئے ....» ص ۵

اقتباسات درج ذیل ہیں۔

« خاکسار سراپا انکسار نے ہراساں ہراساں سرارادت آستانۂ مینونشاں پر حضرت دل کے رکھا اور بعد ھدیۂ دعا و نذر ثنا کے عرض کیا کہ اے علامۂ زماں و واقف رموزات کون و مکاں بندگان ولی فطرت و غلامان سراسر عقیدت کو اس قدر یارا نہیں کہ جناب شہنشاہاں و خدمت اوستادان میں جرات پرداز ہوں ... مگر تیغ سیاست گردن جاں سے باز رہے اور قلم عطوفت دفتر اماں پر نگاہ ساز ، تب بندۂ عبودیت کیش و غلام عقیدت اندیش اپنا بیان حال بارگاہ جاہ و جلال میں عرض کرے . حکم عالی منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہوا کہ ہم تجھکو جاں بخشی فرمائے ہاں حد سے تجاوز نہ کر اور حصر سے باہر نجا . تب عاصی کلید التماس سے طلسم دہن کو وا کرکے گوہر کان معروض کو آویزہ سماعت کیا کہ .... »

ص ٦ اس کے بعد ان کے تمام اعضا پوری قوت گویائی سے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر:

"تب حضرت دل نے سبھوں سے استفسار فرمایا کہ اے سلسلہ جنبان فساد و اے مایۂ عناد اس نے تم سے کیا بدی کیا جو تم اس کو یہاں تک کھینچوائے۔ ان سبھوں نے عرض کی کہ اس شخص نے ہم کو اپنی امورات سے باز رکھا اور مہر سکوت ہمارے لبوں پر دھرا۔ تب حضرت دل نے چشم جہاں بیں سے پوچھا کہ اے تماشہ کنندۂ کائنات تیرا کیا فعل تھا۔ اس نے عرض کی کہ اس کسیف کا یہی کام تھا کہ مہروشاں خورشید طلعت و پری پیکراں جادو فطرت کو دیکھ دکھا کر نفس تک سراغ پہنچانا اور اس کو لذت نفسانی چکھانا گوش نغمہ نیوش سے پوچھا کہ اے نیوشندۂ نغمات بول کہ تو کس کام پر مامور ہے۔ اس نے کہا کہ خداوند اس غلام کا یہی فعل ہے کہ نفس انا پرست کو خوشبوؤں سے برسر انا لانا اور مشتے متکبر بنانا زبان ندرت بیاں سے پوچھا کہ اے بیان کنندۂ معمات، بول کہ تیرا کیا عمل ہے۔ عرض کی کہ اے سرمایۂ عنایت یہ نحیف کسیف و ضعیف شبانہ روز نقش سے یوں ہی متکلم رہتی ہے کہ فلانے گھر ایسے محبوب دلکشا ہے اور فلانے پاس اتنا نقد گراں بہا، بایں حکمت چرائے و بآں تحویر اڑائے۔ لمس گلبدن سے پوچھا کہ تو کیونکر اوقات گزارتا ہے۔ اس نے با لحاح تمام کہا کہ اے رئیس مملکت ابدال غلام کا یہی کام ہے کہ محبوباں سمر فام کے بدن سے ملمس ہوکر نفس کو جوش بشاشت خروش میں لانا۔" ص ۸

"تب حضرت دل نے کمال غضب سے فرمایا کہ اے نمک حرامان بداطوار اے بدوضعان مردم آزار، حضور اعلیٰ کی ملازمت کیا اس ہی شرط سے اختیار کی تھی کہ نفس کی فرماں برداری بجا لاویں؟ تب آنکھ، عرض کی کہ نہیں بلکہ تماشے عجیب و غریب قدرت الٰہی کے مقدر کے نظروں سے گزرانتے رہیں۔ کان بہشت جاں کہا کہ غلام اس ہی کام پر مامور ہوا کہ اخبار و اخیار و موعظت نیک آثار خادمان سرکار کے گوش گزار کرتا رہے۔" ص ۸

اس کے بعد ناک، زبان اور بدن بھی اپنے اپنے فرائض منصبی کا اقبال کرتے ہیں اور پھر یہ سب نفس کو اپنی گم راہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ قاضی دل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ نفس سرکش کو زندان حوف ناف میں مقید کردیا جاے کہ «تا دم واپسیں صورت رہائی آینۂ خیال میں نہ دیکھے۔» ص ۹

مقدمہ کے اس طرح فیصل ہونے کے بعد مترجم سبب ترجمہ کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ سردار نامدار نے جب اس کی ہمت افزائی کی اور مترجم نے انوار سہیلی کو ترجمہ کرنے کا ارادہ کرلیا تو «زبان یکبارگی حوش ہول و ہراس سے چونک پڑی اور بول اٹھی کہ اے محمد ابراھیم یہ کیا تیری خام عقلی ہے، کیونکہ انوار سہیلی یک دریاے ہوش ربا ہے اور گلزار جاں فزا، جس کو کہ دانائی شامل ہو وہی اس کے غوامض کے گرداب سے نجات پاکر ساحل مراد پر پہنچے اور جس کو کہ بصارت کامل ہو وہی اس کے عرصۂ نزاکت گوناگوں کو طے کر کے منزل مقصود پر جا ٹھہرے' وہ کتاب بمشابۂ محبوب دل نشیں ہے اور اس کے نقلیات تمثیلاً مانند طرۂ گل رنگیں۔ اس کا ترجمہ زبان دکھنی میں دشوار ترین امورات کہا چاہئے۔» ص ۱۰

دکھنی طرز تحریر کے نمونہ کے طور پر ہم فقط مولانا کاشفی کا تعارف نقل کرتے ہیں: «(ملا حسین) ایسے عالم تھے کہ اب پر تم مین بتی لے کو ڈھونڈے تو ویسے کوئی نہیں ملیں گے۔ انوں نے ہمارے قرآن کی تفسیر یعنی تفسیر حسینی (مواہب علیہ) بھی بنائے۔ اس تفسیر کو بھے بڑے سب جان سوں اگلی سمجھتے ہیں۔ ان کو جتنا علم تھا ہوتاد کو کم ہونگا، ان کی چھاتی تھی سو ایک علم کا خزانہ تھا ہور ایک دریا کوزے میں کونڈے کی گئی تھی۔ ان کی ذات عالماں کی پادشاہ تھی، خدا اپنی قدرت سونچ ویسے بزرگ کو بنایا تھا، دنیا میں ایسے لوگ بہت اپروپ ہیں۔ ایسے لوگاں کی دنیا بھی اچھی ہوتی ہے ہور دین بھی سب سوں اگلا»۔ (ص ۱۲)

دیباچہ کی روشنی میں محمد ابراھیم کی ادبی صلاحیتوں کا جایزہ | ۱۹ویں صدی کے اوایل مین دکن کے جن ادب دوستوں نے عربی و فارسی زبان کے شہ پاروں سے اردو کے ادبی ذخیرہ کو مالا مال کیا ان میں انوار سہیلی کا مترجم نصیرالدین

ہاشمی کی نظر میں «خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے» [1]۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میاں ابراہیم ایک قابل نثار تھے اور انہیں خوش اسلوبی سے اپنے خیالات و جذبات کو اظہار بخشنے پر قادرانہ کمال حاصل تھا۔

میاں ابراہیم کے مصنفہ دیباچہ سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مترجم کے ذوق ادب اور تصنیفی صلاحیتوں کو کس درجہ اجاگر کرکے پیش کرتا ہے۔ مولوی ہاشمی صاحب کی صراحت کے مطابق ان کی کوئی اور تصنیف دستیاب نہیں ہوئی، مگر اس کے باوجود بقول موصوف انوار سہیلی کا یہ ترجمہ ہی ان کی قلمی کاوش کی جانچ و پرکھ کے لئے کافی ہے۔ یہ دیباچہ شاہد ہے کہ کسی ادبی کیریر کی عدم موجودگی میں بھی ابراہیم نے نثرنگاری میں کتنی دسترس بہم پہنچائی تھی، جہاں اس کا اسلوب نگارش لفظی میناکاری کے گل بوٹے کھلانے میں ان کی جولانی قلم کا اچھا نمونہ ہے وہیں اس کے مطالب میاں ابراہیم کے پاکیزہ درویشانہ خیالات کے آئینہ دار ہیں۔

مگر اس دیباچہ کے قطع نظر دکھنی انوار سہیلی اپنے عامیانہ اور خالص دکھنی اسلوب تحریر کے ساتھ ایک ناقد پر کتنا برحود غلط اثر قایم کرتی ہے اس کا اندازہ پروفیسر حامد حسن قادری کی رائے پڑھ کر ہوتا ہے۔ موصوف نے «دکن میں اردو» میں منقولہ ایک مختصر اقتباس درج کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے «یہ تحریر اسی دور کی تصانیف شمالی ہند کے مقابلہ میں کس قدر بےجوڑ معلوم ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ، دکنی محاورات اور طرز بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرین دکن باقر آگاہ وغیرہ کی عبارت سے بھی زیادہ قدامت آمیز ہے» [2]۔ پروفیسر حامد حسن کے اس تبصرہ کو میاں ابراہیم کے دیباچہ کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ادبی تنقید کم اور محض غلط فہمی زیادہ ہے۔ ایک ادبی تاریخ سے بمشکل چار چھے سطور کا اقتباس نقل کرکے یہ حکم لگادینا کہ یہ ایک بےجوڑ اور قدامت آمیز عبارت ہے، تنقیدی نقطہ نگاہ سے کس حد تک درست ہوسکتا ہے۔ فاضل ناقد نے اگر کسی قدر تلاش و جستجو

---

۱ سب رس: فروری ۱۹۵۲ع ص ۹

۲ داستان نثر اردو ص ۲۳۷

سے کام لے کر دکھنی انوار سہیلی کا ایک نسخہ حاصل کرکے مترجم کا مقدمہ ملاحظہ فرمایا ہوتا تو وہ یقیناً اس صریح غلط فہمی کا شکار نہوتے؛ کیوں کہ مترجم نے ترجمہ تو عامیوں کے لئے عامیوں کی ہی زبان میں کیا تھا مگر دیباچہ ادب سے ذوق اور فقر و درویشی کا شوق رکھنے والوں کے لئے لکھا تھا اور وہ ہی اس کی لایقِ ستایش ادبی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

ماخذ اور استفادہ:

محمد ابراہیم: دکھنی انوار سہیلی
سید محمد: ارباب نثر اردو
نصیرالدین ہاشمی: سب رس فروری ۱۹۵۲
حامدحسن قادری: داستان تاریخ اردو
رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو
گیان چند: اردو کی نثری داستانیں
جورف جیکبس: شجرہ تراجم پنچ تنتر
بلوم هارٹ: کیٹلاگ کتب انڈیا آفس
ایڈ گرٹن: پنچ تنتر کے عالمگیر تراجم کا شجرہ
براکلمن: انسایکلو پیڈیا آف اسلام
نیاز فتحپوری: نگار معلومات نمبر
نجیب اشرف ندوی: نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱
مولوی عبدالحق: اردو جولائی ۱۹۶۲ع
ای، جی براون: تاریخ ادبیات ایران، جلد ۳
انسایکلو پیڈیا برطانیکا ۱۹۵۹ع

مکاتیب گرامی:

ڈاکٹر گیان چند
مولوی نصیرالدین ہاشمی
جناب سلیم الرحمن، مدیر نصرت
مولوی محمد یوسف کوکن عمری
ڈایرکٹر مدراس ریکارڈس

مقالـــہ نمـا

مرتب:

عبدالحلیم ساحل

معـاونین.

سید مجاہد حسین حسینی

علاؤ الدین حیاڑے

محمد شعیب اعظمی

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱　ابوالحسن علی ندوی
ہندوستان کی روحانی تسخیر
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ مئی ۱۵-۲۵)
چشتی سلسلہ کے اکابر و شیوخ کا بیان ہے.

۲　ابومحفوظ الکریم
مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۱-۲۹)
حضرت عثمان کے جمع کردہ قرآن پاک کا تفصیلی ذکر ہے.

۳　ادارہ فیض الاسلام
صدیق کا جمال و جلال
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مئی)
دوسری قسط. حضرت سیدنا ابوبکر کے خطوط نقل کرکے ان کے ایمان، حسن سیاست اور خدا کی راہ میں ان کی مستقل مزاجی کا ذکر کیا ہے.

۴　اللہ بخش قریشی
اسلام میں عورت کا مقام
(فیض الاسلام راولپنڈی ۶۲ مئی)
سماجی حیثیت سے عورت کی مختلف حیثیتوں پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے.

۵　امتیاز علی خاں عرشی
طبقات الفقہاء
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۱۲۹-۱۳۹)
تاج الدین ابونصر کے طبقات الفقہاء الشافعیہ الوسطیٰ کا تنقیدی مطالعہ ہے.

۶　امین محمد تقی
لامذہبی دور کا علمی تاریخی پس منظر
(برہان دہلی ۶۲ اپریل و مئی)
مذکورہ مضمون کی پانچویں اور چھٹی قسط.

۷　ایل پرشاد خلیل
کیمیائے سعادت خجۃ الاسلام امام غزالی کے ادبی مقام و مرتبہ کا مطالعہ
(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مئی)
کیمیائے سعادت مصنفہ غزالی پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے.

۸　بشارت علی
مذہب، ثقافت، معاشرت پر

اسلامی تبصرہ
(عارف، لاہور ۶۲ مئی ۹-۲۸)

۹　جلال الدین عمری
خدا کی صفات
(زندگی رامپور ۶۲ اپریل و مئی)
دو قسطوں میں صفات اللہ پر سیر حاصل بحث کی گئی۔

۱۰　جیمس اے مشنر
اسلام اور اہل مغرب
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۴۱-۵۰)
ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔

۱۱　چودھری محمد اسمٰعیل
مسئلہ سود کا اسلامی حل
(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۵۰-۵۶)
سود کے مسئلہ کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۲　حسام اللہ شریفی
زوال امت کے اسباب
(عارف لاہور ۶۲ جون ۲۵-۳۲)
مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۳　سلطان مبین
رہبانیت کے شاخسانے
(زندگی رام پور ۶۲ جون)
خانہ داری اور رہبانیت کے عنوان سے شائع ہونے والے مقالہ کا تتمہ ہے۔

۱۴　سلطان مبین
خانہ داری اور رہبانیت
(زندگی رامپور ۶۲ اپریل)
ہندو دھرم میں رہبانیت کا نقطۂ آغاز اور اس کے رچاؤ، نیز اس کے سماجی نتائج سے بحث کی گئی ہے۔ کہیں کہیں اسلامی تعلیمات کی امتیازی شان بیان کی گئی ہے۔

۱۵　سید محمد الحسنی
دنیا اور آخرت
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۲۵-۳۴)
دنیا و آخرت کے بارے میں اسلامی نظریات پیش کئے ہیں۔

۱۶　شاہ محمد جعفر
مسلم خاندانی قوانین اور اسلام
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۵۱-۵۵)
عائلی کمیشن کی سفارشات سے متعلق ہے۔

۱۷　صدرالدین اصلاحی
مسلمان اور اسلامی نظام اجتماعی
(زندگی رام پور ۶۲ مئی)
اسلام کے نظام اجتماعی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۸　عبدالحمید صدیقی
دین میں سنت رسول کی اہمیت
(ترجمان القرآن ۶۲ جون)
حافظ ابن قیم رح کی تصنیف

اعلام الموقعین کے جزء اول کا ترجمہ کیا ہے۔

۱۹ ۔ عبدالحمید صدیقی

نبوت کی ضرورت

(ترجمان القرآن ۶۲ اپریل مئی و جون)

مذکورہ مقالہ کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسط

۲۰ عبدالرشید میاں

مقصد حیات

(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۔۔۲۳)

زندگی کے مقصد کو مذہبی نقطۂ نظر سے سمجھایا ہے۔

۲۱ علی ملک غلام

فقہی مسائل میں رواداری اور توسع

(فاران کراچی ۶۲ اپریل)

۲۲ علی ناصر زیدی

ہر تاجر اور دوکاندار کے لئے

(عارف، لاہور ۶۲ جون ۳۳۔۳۹)

اسلامی نکتۂ نظر سے تجارتی اصول سمجھائے ہیں۔

۲۳ غوری شبیر احمد خاں

خیام کا تذکرہ تفسیر کبیر میں

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۱۰۰ ۱۱۲)

ثابت کیا ہے کہ تفسیر کبیر میں خیام کا ذکر قدیم ترین نہیں ہے۔

۲۴ غوری شبیر احمد خاں

اسلام میں علم و حکمت کا آغاز

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ اپریل و مئی)

دوسری اور تیسری قسط۔

۲۵ وصل الرحمن

کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت کا تنقیدی جائزہ

(برہان ۶۲ مئی وجون)

مذکورہ مضمون کی چوتھی اور پانچویں قسط۔

۲۶ محمد عمر

ہمت تماشای مرزا قتیل

(برہان دہلی ۶۲ مئی و جون)

پہلی و دوسری قسط ہمت تماشای کا تعارف ہے یہ کتاب ہندوستانی مذاہب کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ مضمون مذکور میں اس کتاب کے باب اول کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

۲۷ محمد عزیر

سیرۃ النبی کی جھلکیاں

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۵۱۔۵۴)

۲۸ محمد اویس

قانون نصرت

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۳۲۔۳۹)

نصرت کے بارے میں اسلامی نظریات کی وضاحت کی ہے۔

۲۹ محمد فاروق

انسانی جبلتوں کا مطالعہ

(زندگی رام پور ۶۲ جون)

فرائڈ اور مارکس کے نظریات کو پیش کرنے کے بعد، ان کے نقائص

ظاہر کئے ہیں. بحث کے آخر میں بتایا
ہے کہ نفس انسانی کا مقصود، بلند
حقائق کے اصل سرچشمہ سے وابستگی
ہے۔

۳۰ محمد نجات اللہ صدیقی
اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں
(برہان ۶۲ مئی و جون)
مذکورہ مضمون کی پہلی قسط۔

۳۱ ندوی محمد حنیف
قرآن میں رمز و اشارہ کی چند
مثالیں
(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۲۴-۳۶)

۳۲ ندوی محمد حنیف
اسلام اور تصوف
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۷-۱۴)
تصوف کی ابتدا اور ارتقائی مدارج
کا ذکر ہے۔

۳۳ نعیم صدیقی
مطلق العنان اقتدار کے تحت مذہبی
مناصب
(ترجمان القرآن ۶۲ اپریل)
مذکورہ مقالہ کی ۸ ویں قسط۔

۳۴ یوسف سید محمد
جبر و قدر
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۱۵-۱۹)
مسئلہ جبر و قدر کی احادیث اور
اہمیت بتائی ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۳۵ ابو الحسن علی ندوی
مولانا احمد علی
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۱۳-۲۴)
مولانا احمد علی لاہوری کا مفصل
تذکرہ ہے۔

۳۶ ابو الحسن علی ندوی
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
(فاران کراچی ۶۲ اپریل ۳۵-۴۲)
عبدالرزاق ملیح آبادی اور ان کی
عربی دانی پر بحث ہے،

۳۷ ابو الحسن علی ندوی
حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۲۲-۳۱)
خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق
و صفات کا بیان ہے۔

۳۸ ابوذر باقی
ابن سینا
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۳۹-۵۰)
شیخ بو علی سینا کے متعلق کچھ
غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔

۳۹ ابو محفوظ الکریم معصومی
رسالہ عرام
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۶۲ جون ۷۳-۱۰۱)
مشہور عرب جفرافیہ داں مصنف

عرام بن الاصبغ کا تذکرہ ہے۔

۴۰ اختر رشید
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۳۵-۵۰)
پچھلی تیسری قسطوں سے متعلق ہے۔

۴۱ اختر رشید
مسلمان مورخین
(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۳۸-۴۹)
گذشتہ سے پیوستہ

۴۲ ارشد کاکوی
بابائے اردو کی شخصیت کے دو اہم پہلو
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۲۰-۲۵)
مولانا عبدالحق مرحوم کی چاق و چوبند طبیعت، نفاست پسندی، بذلہ سنجی اور بےباکی پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۳ اقبال احمد
سفیان بن سعید ثوری
(الفرقان لکھنؤ ۶۲ جون ۵۵-۵۶)
عہد عباسی کے ایک ولی خدا کا ذکر ہے۔

۴۴ ام۔ ہانی بیگم
کامی قزوینی
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۱۱۱-۱۲۲)
میر علاء الدولہ کامی قزوینی کا تذکرہ ہے۔

۴۵ بھٹاچاریہ شانتی رنجن
مشی تارینی چرن متر
(آجکل دہلی ۶۲ مئی ۳۸-۴۰)
فورٹ ولیم میں مشی تارینی چرن متر اور ان کے ہمعصروں کا تذکرہ ہے۔

۴۶ خواجہ راحت حسین
فتنہ تاتار کا خاتمہ، معرکہ عین جالوت
(ماراں کراچی ۶۲ جون ۳۲-۳۴)
تاتاری طاقت کا عروج و زوال بتایا ہے

۴۷ سید نعیم الدین
نفعی اور جہانگیر
(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۶۰ جون ۴۹-۵۵)
ترکی شاعر نفعی کا ذکر ہے جو اگرچہ ہندوستان کبھی نہیں آیا مگر اس نے ایک ہندوستانی بادشاہ کا قصیدہ کہا،

۴۸ شاہد حسین بخاری
بابائے اردو کے ساتھ چند لمحے
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۲۶-۲۹)

۴۹ شریفی محمد حسام اللہ
اسباب زوال امت
(ماراں کراچی ۶۲ مئی ۲۷-۳۸)
زوال امت کے اسباب بتائے گئے ہیں۔

۵۰ شکیل عبدالغفار
مولانا ابوالنصر (مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی)
(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۳-۷)

٥١ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف ، لاہور ، ٦٢ اپریل ١١-١٣)
حضرت خواجـــہ احمد گل صاحب رحمۃاللہ علیہ

٥٢ صابر مٹھیالوی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف ، لاہور ، ٦٢ جون ١١-١٧)
بابا سائیں حاور سہروردی رحمۃاللہ علیہ

٥٣ صباح الدین عبدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ
(جامعہ دہلی ، ٦٢ مئی ٣٩١-٣٩٩)
ایک طویل معلومات افروز مقـالہ کا آخری حصہ ہے .

٥٤ صباح الدین عدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علمـا اور مشائخ (مسلسل)
(حامعہ دہلی ، ٦٢ حون ٤٤٣-٤٥٦)

٥٥ ضیاءالحسن فاروقی
شیخ محمد عبدہ
(جامعہ دہلی ، ٦٢ جون ٤٥٧-٤٦٤)
مشہور مفکر و سیاست داں کا تذکرہ ہے

٥٦ عابدی پروفیسر رضی
غالب کی ہمہ گیر شخصیت
(نگار لکھنؤ ٦٢ مئی ٤٤-٤٨)
غالب کی فنکارانہ صلاحیت اور عظمت کا ذکر کیا ہے

٥٧ عبدالحکیم خلیفہ ڈاکٹر
رومی اور اقبال
(ثقافت لاہور ٦٢ اپریل ٧-١٢)
اقبال اور رومی کے مشترک اور مماثل نظریات پیش کئے ہیں

٥٨ فارق ڈاکٹر خورشید احمد
دارالکتب قاہرہ کی ایک قلمی تاریخ
(ثقافت لاہور ٦٢ اپریل ٥٦-٧١)

٥٩ فتح پوری فرمان
انیسویں صدی کا ایک تعلیمی مصلح
(ثقافت لاہور ٦٢ حون ٢٠-٣٧)
مولانا سید ظہورالاسلام کی رندگی اور تعلیمی خدمات سے متعلق ہے

٦٠ فتح پوری فرمان
قدیم اردو ڈرامہ کے ایک اہم فنکار
(نگار لکھنؤ ٦٢ مئی ٩-١٥)
صنف ڈرامہ میں سید عبداللہ فتح پوری کی خدمات کا تذکرہ ہے

٦١ قاضی محمد عدیل عباسی
حضرت مولانا احمد علی
(الفرقان لکھنؤ ٦٢ مئی ٥٠-٥٦)
مرحوم مولانا احمد علی لاہوری کے بارے میں ذاتی تاثرات کا اظہار ہے

٦٢ قریشی ڈاکٹر اکبر حسین
اقبال اور صوفیائے کبار
(فاران کراچی ٦٢ اپریل ٢٢-٢٦)

صوفیا سے اقبال کی عقیدت بتائی ہے

۶۳ محمد شمعون اسرائیلی

اہلی خراسانی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۶۹-۸۰)

مولانا اہلی ترشیزی خراسانی کا ذکر ہے

۶۴ محمد عبدالحلیل

مولانا عبدالماجد دریابادی

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۱۵-۲۱)

مولانا عبدالماجد کی حیات پر مجمل تبصرہ ہے

۶۵ محمد مسعود احمد

شیخ احمد سر ہندی (مسلسل)

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ اپریل ۳۵-۴۸)

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات اور اس کے بعد کا تذکرہ ہے

۶۶ محمد مسعود احمد

الجواہر الخمسہ

(برہان دہلی ۶۲ اپریل)

الجواہر الخمسہ (مصنفۂ شیخ محمد غوث گوالیاری) کے بارے میں تحقیق کی ہے کہ اصل کتاب فارسی میں تھی بعد میں شیخ صبغۃاللہ البروحی نے اسے عربی کا جامہ پہنایا ہے۔ شروع میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مختصر حالات پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے

۶۷ محمد منظور نعمانی

مولانا عبدالشکور فاروقی

(الفرقان لکھنؤ ۶۲ مئی ۴۰-۴۹)

مولانا مرحوم سے متعلق ذاتی تاثرات کا بیان ہے

۶۸ مختارالدین احمد

محمود بن علی الاستادار

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۱۲۳-۱۴۶)

آٹھویں صدی ہجری کے جمال الدین محمود بن علی بن اصغر عیسہ السودونی استادار الظاہری عمائد مصر کا ذکر ہے

۶۹ مسعود محمد الیاس

اقبال کی گھریلو زندگی

(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۳۲-۴۴)

اقبال کی زندگی ایک خادم کی زبان سے بیان کی گئی ہے

۷۰ مومن محی الدین

ملک جوینی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۱۴۰-۱۶۴)

علاءالدین عطا ملک جوینی کا ذکر ہے

۷۱ ندوی محمد حنیف

مشہور متصوفین

(ثقافت لاہور ۶۲ مئی ۵۷-۶۹)

چند مشہور صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے

۷۲ نذیر احمد

میر جمال الدین حسین انجوی شیرازی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۱۷-۴۸)

فرہنگ جہانگیری کے مولف کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

۷۳ نسیم احمد فریدی
تجلیات مجدد الف ثانی
(الفرقان لکھنؤ ٦٢ اپریل ٤٩-٥٦)
شیخ سرہندی کے چند مکاتیب کا
اردو ترجمہ ہے۔

۷۴ نسیم احمد فریدی
تجلیات مجدد الف ثانی
(الفرقان لکھنؤ ٦٢ جون ١٣-٢١)
حضرت سرہندی کے مکاتیب کا
اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۷۵ احمد آتش
ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ
(مجلہ اسلامیہ علی‌گڑھ ٦٠ جون ١٤٧-١٦٢)
ترکی کے قسطموبی (اناطولیہ)
کے کتب خانہ عمومی کا تعارف ہے۔

۷۶ اشرف حسینی
مامون الرشید
خاندانِ بنی عباس کا جلیل القدر
فرمانروا
(عارف لاہور ٦٢ اپریل ٣٣-٣٦)
مامون الرشید کے مختصر حالات

۷۷ انوار احمد سوپاروی
مہاراشٹر کا قدیم تاریخی پس منظر
(صبح امید بمبئی ٦٢ مئی ١١-١٣)
مختصراً تاریخ مہاراشٹر پر روشنی
ڈالی ہے۔

۷۸ ایوب‌خاں
ایک عوامی آئین
(حام وکراچی ٦٢ آئین نمبر ١١-١٩)
پاکستان کے نئے آئین پر ایک
نشریہ ہے۔

۷۹ رزاقی شاہد حسین
انڈونیشیا کا عہد قدیم
(ثقافت لاہور ٦٢ مئی ٣٧-٤٣)
عہد قدیم میں مختلف مذاہب اور
قوموں کے اثرات بتائے ہیں۔

۸۰ رشید الدین
حیدرآباد (ایک قدیم اور
عظیم شہر)
(آجکل دہلی ٦٢ مئی ١٧-٢٢)
حیدرآباد کی ادبی، تاریخ اور
تہذیبی اہمیت بتائی ہے۔

۸۱ صباح الدین عبدالرحمن
ہندوستان کے سلاطین علماء اور
مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر
(معارف اعظم‌گڈھ ٦٢ اپریل، مئی، جون)
مذکورہ مضمون کی تین قسطیں

۸۲ صباح الدین عبدالرحمان۔
عہد مغلیہ کے شاہی خزانے کے۔
جواہرات

(نگار لکھنؤ جون ٦٢ ص ۱۸۔٦۱)
شاہی خزانوں کے جواہرات کی
تاریخ مفصل بیان کی ہے۔
۸۳ عباس طالب
دو نٹھے ست ـــ قوم اور کلچر
(صبح نو، پٹنہ ٦۲ جون -۸۔)
تاریخ و سیاست کے حوالوں سے
قومیت اور کلچر کی مذمت کی ہے۔
۸۴ غلام حسین
تاریخ اورینٹل کالج
(اورینٹل کالج میگزین لاہور، ٦۲ فروری ۱-۱۱)
۸۵ غلام حسین
تاریخ اورینٹل کالج حصہ دوم
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ٦۲ مئی ۱۱۹۔۱۹۲)
اورینٹل کالج کے نامور اساتذہ کا
تذکرہ ہے۔
۸٦ غوری شبیر احمد خاں
تتمہ صوان الحکمۃ کا سال تصنیف
(فروغ اردو لکھنؤ ٦۲ اپریل ۳۴۔۳۷)
تاریخی حوالہ جات سے ثابت کیا
ہے کہ تتمہ چہار مقالہ قزوینی سے بھی
پہلے کی کتاب ہے۔
۸۷ قاضی اطہر مبارک پوری
نارحیل سے نخیل تک
(معارف اعظم گڑھ ٦۲ اپریل مئی جون)
مضمون مذکور کی دوسری، تیسری
اور چوتھی قسط
۸۸ محمد مجیب
مغربی دنیا پر ایک نظر
(جامعہ دہلی ـــ ٦۲ اپریل ۲۳۱۔۲۳۷)
یوروپین لوگوں کے مذہبی سماجی
نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔
۸۹ مقبول احمد
مسعودی کی عجائب الدنیا
(مجلہ اسلامیہ علی گڑھ ٦۰ جون ص ۱۰۲۔۱۱۰)
عجائب الدنیا کے نسخۂ علی گڑھ
کا بیان ہے۔

ادب تنقید لسانیات

۹۰ آصف جاوید
بابائے اردو کی ایک تقریر
(قومی زبان کراچی ٦۲ اپریل ۱٦۔۱۹)
مولانا عبدالحق مرحوم کی ایک
تقریر پیش کی ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۵۸
میں اسلامیہ کالج میں کی تھی۔
۹۱ آفتاب اختر
فردوسی کا عہد اور اس کی ادبی
خصوصیات
(برہان دہلی ٦۲ مئی)
محمود غزنوی کی علم پروری اور اس
کے درباری شعراء نیز ان کے ادبی
رجحانات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔
۹۲ ابوعلی
مولانا آزاد کی یاد
(ادیب علی گڑھ ٦۲ جون ۴۔۱۵)

اپنی ذاتی ڈائری سے مولانا آزاد مرحوم کے متعلق بہت ہی معلومات افروز باتیں پیش کی ہیں

۹۳ احتشام احمد ندوی

فن موازنہ

(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۳۸۔۴۲)

فن موازنہ پر مسلسل تبصرہ کرتے ہوئے اس فن کے عناصر ادبی روایات شعر کے محرکات کی اہمیت بتائی ہے۔

۹۴ احتشام احمد ندوی

فن موازنہ

(ادیب علی گڑھ ۶۲ مئی جون ۳۸۔۴۰)

آٹھویں قسط میں جودت شعر سے بحث کی ہے۔

۹۵ احمد اسحاق نعمانی

عبدالحق کی نثر

(ادیب ۶۲ مئی جون ۳۴۔۳۷)

بابائے اردو کی نثر نگاری کی خصوصیات کا تاریخی، فنی اور نفسیاتی جائزہ ہے۔

۹۶ اسرار احمد سہاروی

علامہ اقبال مرحوم کے بعض تصورات

(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ مئی جون ۲۹۔۳۲)

اقبال کے بعض تصورات مثلاً نیرواں جنت اور ابلیس وغیرہ پر تنقید کی ہے

۹۷ اسلوب احمد انصاری

المیہ کیا ہے

(جامعہ دہلی ۶۴ اپریل ۳۲۹۔۳۴۹)

ڈرامہ میں المیہ کی اہمیت اور اس کی ماہیت پر بحث کی ہے۔

۹۸ اکبر نقوی

واہی کی ظرافت نگاری

(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل مئی ۲۵۔۳۰)

وفا نقوی واہی کی ظرافت نگاری ہمارے آزاد جمہوری نظام، بعض فکری مسائل اور انسان کی کمزوریوں پر کڑی تنقید ہے۔

۹۹ الطاف الہی انصاری

اکبر الہ آبادی بحیثیت اسلامی شاعر

(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۴۳۔۴۶)

۱۰۰ امیر حسن عابدی

کامی شیرازی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ جون ۵۶۔۴۲)

مثنوی فتح نامہ نور جہاں بیگم کے مصنف کا ذکر ہے

۱۰۱ امین چند شرما

اکبر ۔ ایک مطالعہ

(نوائے ادب، بمبئی، ۶۲ اپریل ۵۷۔۶۵)

۱۰۲ انیس سلطانہ

جگر اور تصور حسن و عشق

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون ۳۱۔۳۷)

۱۰۳ بابائے اردو

مقدمہ مسافر حجاز

(قومی زبان، کراچی ۶۲ مئی ۱۶۔۱۸)

مولوی عبدالحق مرحوم کا ایک غیر

شائع شدہ مقدمہ پیش کیا ہے

۱۰۴ بریلوی عبادت
فراق کی غزل
(ماہ نو، کراچی ۶۲ اپریل ۲۹-۳۳)
فراق کی غزل کے جمالیاتی ق
پر بحث کی ہے

۱۰۵ بشیر محمود
ادب - تنقید حیات
(ساقی کراچی ۶۲ اپریل)
ادب، زندگی اور تنقید کے بارے
میں مختلف زاویہ ہائے نظر پیش کئے ہیں۔
اور ثابت کیا ہے کہ ایک ادیب در حقیقت
ادب کے پردے میں انسانی زندگی کا
نقاد ہوتا ہے

۱۰۶ بہراد فاطمی
ذکر بیتاب
(صبح نو پٹنہ، ۶۲ جون ۱۳-۱۶)
شاد عظیم آبادی کے ایک شاگرد بیتاب
کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ان کے
دور کی ادبی مجالسوں کا ذکر کیا ہے

۱۰۷ بیدار عابد رضا
حسرت
(برہان دہلی ۶۲ اپریل، مئی)
اردوئے معلی مرتبہ حسرت کے مضامین
کی تفصیلات قسط ۱۰ اور ۱۱

۱۰۸ بیدار عابد رضا
ایک جوئے کہستان کی موج رواں
تیسری قسط
(ماہ نو کراچی اپریل ۱۵ ۲۱)
اقبال کے چند اور گہر پارے

۱۰۹ بیگم مصباح الدین
دکھنی ادب کو اجاگر کرنے والی
ہستیاں
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۲-۴۳)
دکھنی ادب پر تحقیق کرنے والوں
کے نام گنائے ہیں

۱۱۰ پرشارتھی شاکر
پنجابی کے صوفی شعراء
(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۲-۳۷)
پنجابی شاعری اور ادب سے متعلق ہے

۱۱۱ تلوک چند محروم
میری ادبی زندگی اور شاعری
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ جون -۱۳)
شاعر نے خود اپنی حیات و افکار کا
جائزہ لیا ہے

۱۱۲ ٹونکی جوہر
اردو کی نایاب مثنویاں
(نگار لکھنؤ ۶۲ جون ۹-۱۴)
اردو کی نایاب مثنویوں کا تفصیلی
تذکرہ ہے

۱۱۳ جاوید نہال
محتشم کاشانی
(صبح نو پٹنہ ۶۲ جون ۹-۱۲)
محتشم کاشانی کے مختصر حالات لکھتے
ہوئے اس کے کلام کا سرسری تنقیدی
جائزہ لیا ہے

۱۱۴ جاوید نہال
نساخ کا ایک صاحب دیوان شاگرد
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل، مئی ۱۱-۱۴)
نساخ کے ایک غیر معروف شاگرد پروفیسر قاضی عبدالحمید صاحب حمید کا تعارف کرایا ہے

۱۱۵ جاوید نہال
ہمایوں کی شاعری
(جام نو کراچی ۶۲ مئی ۱۱-۲۲)
مغل تاجدار شہنشاہ ہمایوں کی فارسی کا جائزہ ہے

۱۱۶ چاند پوری کوثر
سہرا
(آجکل دہلی ۶۲ اپریل ۱۰-۱۴)
سہرے کی ادبی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت بتائی ہے

۱۱۷ چودھری سبحان علی
تذکرہ بزرگان اسلام
(عارف لاہور ۶۲ مئی ۱۳-۱۴)
حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۸ حسین اعجاز
غالب کا تنقیدی شعور
(آجکل دہلی ۶۲ جون ۳-۹)
غالب کے تنقیدی شعور کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے

۱۱۹ خالدی محمد یونس
آثار تیموری
(آجکل دہلی ۶۲ جون ۲۷-۳۲)
اردو زبان کی نشو و نما میں تیموریوں کی خدمات اور سرپرستی کا تذکرہ ہے۔

۱۲۰ خان سید احمد
تہذیب کیا ہے
(ثقافت لاہور ۶۲ اپریل ۴۶-۵۰)
تہذیب کی بنیادی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

۱۲۱ خواجہ حسن نظامی
لاہور میں یوم اقبال
(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ اپریل ۱۸-۱۹)
خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے باہمی تعلقات بیان کئے ہیں۔

۱۲۲ خورشید احمد شفقت اعظمی
فانی کی یاسیاتی شاعری
(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ اپریل ۴۲-۵۲)
ثابت کیا ہے کہ فانی کی غزلوں کو مرثیہ کا مترادف سمجھنا چاہئے۔

۱۲۳ دانش بریلوی
ادب و تنقید
(ادیب علی گڑھ ۶۲ ۳۵-۳۷)
ادب و تنقید کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔

۱۲۴ رانا بھگوانداس
پانچ نامور ہندو شعرا
(صبح امید بمبئی ۶۲ مئی ۱۹-۲۱)
دو صدی قبل مہاراشٹر کے پانچ نامور ہندو شعرا یعنی شاداں، شاد، رنگیں، داغ، دزہ وغیرہ کا تذکرہ۔

۱۲۵ رئیس اجمیری
مخمور سعیدی
(صبح نو پٹنہ ۶۲ مئی ۲۱-۲۴)
راجستھان کے ایک مقبول عام شاعر کا تعارف کرایا ہے۔

۱۲۶ ساقی الحسینی
غالب کا ذہنی ارتقاء
(حلم نو کراچی ۶۲ جون ۲۰-۲۶)
غالب کے کلام کو ان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

۱۲۷ سبزواری شوکت
فروغ شمع سخن
(ماہ نو کراچی ۶۲ اپریل ۳۴-۳۹)
مجوزہ اردو لغت کے نمونے پر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۱۲۸ سخاوت میرزا
حضرت سید قبول بادشاہ رح حیدرآبادی اور داغ دہلوی
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۲۳-۳۶)
ایک مشہور بزرگ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کا داغ کے حق میں دعا فرمانا بتایا ہے۔

۱۲۹ سلام مچھلی شہری
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں
(قومی زبان کراچی ۶۲ مئی ۲۲-۲۴)
شاگرد داغ متین مچھلی شہری کا ایک خط سلام مچھلی شہری کے نام۔

۱۳۰ سلام مچھلی شہری
میرا خیال — روزنامچے کے چند اوراق
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۳۰-۳۳)

۱۳۱ سہاروی اسرار احمد
علامہ اقبال اور روایت
(داران کراچی ۶۲ مئی ۱۹-۲۳)
اقبال کی شاعری میں روایت کی اہمیت اور اثر کی مثالیں دی ہیں۔

۱۳۲ سیال امیرحسن
شاعری میں موسیقی
(ماہ نو کراچی ۶۲ جون ۶-۱۵)
شاعری میں موسیقی کا عنصر اور اس کا دخل اور اثر ظاہر کیا ہے۔

۱۳۳ سید حسن
بیاض باسطی
(مجلہ علوم اسلامیہ علیگڑھ ۶۰ دسمبر ۲-۲۴)
سیدہ علی خان باسطی کی بیاض کا ذکر ہے۔

۱۳۴ سید شمیم احمد
اقبال کا طریقۂ تصوف
(ساقی کراچی ۶۲ اپریل)
اقبال پر تصوف شروع سے غالب تھا، نیز ان کا طریقۂ تصوف بہت صاف اور نکھرا ہوا تھا، اس لحاظ سے ان کے تصوف میں انفرادیت تھی۔

۱۳۵ سید محمد حسنین
کلام شاد اور جناب قاضی عبدالودود
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل - مئی ۲۰-۲۷)
تفصیل سے بتایا ہے کہ جناب

قاضی عبدالودود کے ہاتھوں کلام شاد
کی تدوین و اشاعت سے شاد عظیم آبادی
خوش نہ تھے۔

۱۳۶ محمد حسین
انشائیہ، ایک صنف ادب
(ساقی کراچی ۶۲ مئی)
انشائیہ کی ماہیت پر بحث کی ہے
اور بتایا ہے کہ وہ نثری ادب کا ایک جزو
اور بالغ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔

۱۳۷ سید محمود حسن قیصر
سید عبد اللہ جائسی لندنی
(نوائے ادب بمبئی ۶۱ اپریل ۳۹-۵۶)
سید عبد اللہ جائسی نے یورپین
ممالک میں ہندوستانی ادب کی اشاعت
میں حصہ لیا۔ مضمون نگار نے ان کے
حالات قلمبند کئے ہیں۔

۱۳۸ سید نعیم الدین
بروصہ کے کتب خانے
(علوم علی گڑھ ۶۱ جون ۱۶۵-۱۸۰)
بروصہ کے کتب خانوں کے چند
فارسی مخطوطات کا ذکر ہے۔

۱۳۹ شفیق النساء بیگم
شاعر حسن
(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۹-۱۴)
ولی دکنی کی شاعری پر تبصرہ
ہے۔

۱۴۰ شفیق النساء بیگم
محمد قلی قطب شاہ ـــ شخصیت اور
فن کے چند پہلو
(سب رس ۶۲ اپریل)
محمد قطب شاہ کی لسانی خدمات
کا تذکرہ اور اس کی شاعری کی ہمہ گیری
اور خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔

۱۴۱ شفیق النساء بیگم
شیر علی افسوس
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مئی و جون ۳۱-۴۵)
افسوس کی تصنیف آرائش محفل
کا تذکرہ ہے۔

۱۴۲ شوق سمت پرکاش
فراق سے ایک ملاقات
(آجکل دہلی ۶۲ مئی ۳۴-۳۷)
فراق کی شاعری کا نقطۂ نظر بتا
گیا ہے۔

۱۴۳ شہلا عاصمہ
شیفتہ کی شاعری
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۶۰-۰)
تنقیدی مضمون ہے۔

۱۴۴ صدیقی آمنہ
جدید شاعری کا المیہ
(ماہ نو کراچی ۶۲ جون ۱۶-۹)

۱۴۵ صوفی ضیاء الحق
عربی ادب
(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۶۲ مئی ۱-۵)
عربی ادب سے متعلق چند بیانات
اور ان کی تحقیق ہے۔

۱۴۶ طالب کشمیری
سرمایۂ کلام غالب

(نوائے ادب بمبئی ۶۲ اپریل ۲۱-۲۹)
شعر و شاعری کی حقیقت سے متعلق مشہور نقادوں کی رائیں پیش کرنے کے بعد کلام غالب کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا ہے۔ (باقی)

۱۴۷ طہیر ناشاد، دربھنگوی
ایک آفتابِ تازہ۔ اویس احمد دوراں
(صبح نو پٹنہ ۶۲، مئی ۲۵-۳۱)
کلکتہ کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کا تعارف کرایا ہے۔

۱۴۸ عابد رضا بیدار
اقبال کی ایک نظم پر بحث
(جامعہ دہلی ۶۲ اپریل ۳۵۳-۳۶۰)
اقبال کی ایک نظم «نصیب ما زجہان است بقدر ہمت ما» مطبوعہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۱۹ پر کرنل بھولا ناتھ کی تنقید ہے۔

۱۴۹ عابد رضا بیدار
بابائے اردو کا رسالہ افسر
(قومی زبان کراچی ۶۲ اپریل ۹-۱۵)
رسالہ افسر کا تعارف کراتے ہوئے اس سے مولانا عبدالحق کے دو مضامین پیش کئے ہیں۔

۱۵۰ عابد حسین
غزل کا مستقبل
(جامعہ دہلی ۶۲ مئی ۲۸۷-۲۹۰)
ایک نشریہ ہے۔

۱۵۱ عبدالستار صدیقی
حرف ق
(علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ جون ۱-۱۶)
معرب لفظوں میں حرف «ق» کی اہمیت واضح کی ہے۔

۱۵۲ عبدالرحمن صاحب طارق
احادیث نبوی اور علامہ اقبال
(عارف لاہور ۶۲ اپریل ۱۵-۱۷)
احادیث سے متعلق اقبال کے عقیدے سے بحث کی ہے۔

۱۵۳ عبدالودود
اقبال، سہیل اور اردو قصیدہ نگاری
(ادیب علی گڑھ ۶۲ اپریل ۲۶-۳۴)

۱۵۴ عثمان صدیقی
خیام اردو
(ادیب علی گڑھ ۶۲ مئی و جون ۱۶-۲۵)
جوش ملیح آبادی کے کلام کا جائزہ ہے۔

۱۵۵ عثمان غنی عراقی
«سنت ہمالہ» - پرویز شاہدی کی قومی نظم
(شاعر بمبئی ۶۲ اپریل و مئی ۳۱-۳۳)
پرویز شاہدی کی نظم «ست ہمالہ» پر تبصرہ ہے۔

۱۵۶ علیم اللہ حالی
اردو شاعری کے نئے عناصر
(اشارہ پٹنہ ۶۲ اپریل)
اشتراکی ادب اور زندگی کے نئے مسائل نے اردو شاعری کو کس درجہ متاثر اور اسے کس نئی راہوں سے روشناس

کرایا ہے ان راہوں سے محبت کی ہے۔

۱۵۷ غبار یاور

شاعری میں موزونیت

(جام نوکراچی ۶۲ جون ۱۵-۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اوزان و قوافی اعلیٰ شاعری کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں لیکن شعر کی بنیاد نظم کے کسی نہ کسی اسلوب پر رکھے بغیر چارہ نہیں۔ صرف مسلسل بغاوت اور تجربات ہمیں ان سے چھٹکارہ دلاسکتے ہیں۔

۱۵۸ غبار یاور

عبد العزیز شاویش

(تعمیر انسانیت لاہور ۶۲ اپریل ۹-۱۶)

ایک مصری مفکر، شاعر و رہنما کا تعارف کرایا ہے۔

۱۵۹ غوری شبیر احمد

علم المثلثات

(علہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۲ جون ۱-۱۸)

البیرونی سے پہلے علم المثلثات کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۶۰ غوری شبیر احمد

علامہ اقبال اور مسئلہ زماں

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ جون)

مسئلہ زماں کے سلسلے کی اہم کڑیوں کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ فلاسفۂ یونان، متکلمین اور اکابر علماء کے تدریجی خیالات بھی ذکر کئے ہیں۔

۱۶۱ غوری شبیر احمد

عمر خیام کی رباعیاں

(فروغ اردو لکھنؤ ۶۲ مئی ۷-۲۵)

خیام کے بارے میں حضرت ناطق گلاؤٹھی کے اعتراضات کا جواب ہے۔

۱۶۲ غلام رسول مہر

آزاد بلگرامی

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ مئی)

عبد الرزاق صاحب قریشی کے مقالہ سید آزاد بلگرامی (مطبوعہ معارف مارچ ۱۹۶۲) پر استدراک۔ بعض اشعار کی صحت اور ان کی ترتیب پر اشارے کئے ہیں۔

۱۶۳ غلام مصطفےٰ خاں

دیوان ظہیر اور اس کا مصنف

(معارف اعظم گڑھ ۶۲ اپریل)

ظہیر فاریابی سے جو فارسی دیوان منسوب کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں تحقیق کی ہے کہ وہ دیوان در اصل ظہیر اصفہانی کا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی ثبوت پیش کئے ہیں۔ کئی اشعار بطور نمونہ لکھے ہیں۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ظہیر اصفہانی بہت اونچے درجے کا شاعر نہ تھا۔

۱۶۴ فارانی فضل کریم

مسکرات اور صحت

(ثقافت لاہور ۶۲ جون ۵۰-۶۵)

منشیات کے استعمال، فوائد نقصانات اور دنیا میں رواج کا تفصیلی

تذکرہ ہے ۔

۱۶۵ فتحپوری نیاز

قصائد مومن میں عنصر تعرل

(نگار لکھنؤ ۶۲ اپریل ۲۸-۳۴)

۱۶۶ فتحپوری نیاز

مبالعہ ، طىر و مزاح فارسی شاعری میں

(نگار لکھنؤ ۶۲ اپریل ۱-۲۲)

فارسی شاعری میں مبالعہ ، طىر و مزاح کے عناصر کی مثالیں دی ہیں

۱۶۷ فتحپوری نیاز

ابوالهذیل معتزلی امام کی مناظرانہ فراست

(نگار لکھنؤ ۶۲ مئی ۲۷-۲۹)

ابو الهذیل معترلی کی مناظرانہ صلاحیتوں کا دلچسپ تذکرہ ہے ۔

۱۶۸ محمد فضل الرحمں ندوی

مثنوی مظهر البرکات

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۸۱-۹۹)

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی ایک عربی مثنوی کا تذکرہ ہے ۔

۱۶۹ فضل الرحمن ندوی

چہار صد ایراد بر کلام آزاد

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۹۳-۱۲۰)

غلام علی آزاد بلگرامی پر ملا باقر آگاہ کی کتاب عثرات آزادیہ یعنی « چہار صد ایراد بر کلام آزاد » کا تذکرہ ہے ۔

۱۷۰ فیاض الدین حیدر

میرزا فاخر مکین

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۴۸-۵۷)

میرزا فاحر مکین کو ان کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا ہے ۔

۱۷۱ فیضی سید

دیوانۂ آتش ہوا

(ماہ نو کراچی ۶۲ مئی ۶-۸)

قاصی ندر الاسلام کی انقلابی شاعری کا تذکرہ کیا ہے ۔

۱۷۲ قاصی عبد الودود

محرق قاطع برہاں

(نوائے ادب بمبئی ۶۲ اپریل ۵-۱۲)

محرق قاطع برہان مصنفۂ میرسعادت علی کا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے ۔

۱۷۳ قاصی عبد الودود

غالب کا کلیات نظم فارسی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۰ دسمبر ۱-۲۶)

غالب کے کلیات نظم فارسی کے قدیم ترین موجودہ نسخے پر تبصرہ ہے ۔

۱۷۴ قاصی عبد الودود

فرہنگ ابوحفص سغدی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ، ۶۰ جون ۹-۱۶)

شہرود کے موجد ابوحفص اور فرہنگ ابو حفص کے مصنف حقیقی کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے ۔

۱۷۵ قاضی عبد الودود

دیوان نجیب الدین جرباذقانی

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۶۱ دسمبر ۷۹-۹۲)

عہد سلجوقیہ کے ایک شاعر کا انتخاب کلام ہے ۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تازہ پیشکش

دیوانِ عزلت

گجرات کے ایک قدیم اور مایۂ ناز اردو شاعر

کا نایاب دیوان

جسے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، کے رفیق

جناب عبدالرزاق قریشی

نے بڑی تحقیق اور کاوش سے مرتب کیا ہے

شروع میں مرتب کا ۱۸۰ صفحہ کا عالمانہ مقدمہ درج ہے

کتاب ادبی پریس کے نہایت
خوب صورت نسخ ٹائپ میں چھپی ہے

ضخامت ۱۸۲ + ۲۱۶ قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ :
ادبی پبلشرس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸